اُردو فکشن پر تقسیمِ ہند کے اثرات

(تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)

مقالہ برائے پی ایچ ڈی

شعبۂ اُردو
جامعۂ کراچی، کراچی

مقالہ نگار:

سمیرا بشیر

نگراں:

جناب ڈاکٹر یونس حسنی

ڈاکٹر یونس حسنی

پروفیسر (ایڈجنکٹ)، شعبۂ اُردو، جامعۂ کراچی
فون نمبر: ۷-۹۲۴۳۱۳۱ توسیع: ۲۲۸۷

سابق صدر شعبۂ اُردو، جامعۂ کراچی
سابق مدیر اعلیٰ، اُردو لغت بورڈ، کراچی

تاریخ: ۲۱/ اپریل ۲۰۰۴ء

تصدیق کی جاتی ہے کہ آنسہ سمیرا بشیر نے ''اُردو فکشن پر تقسیمِ ہند کے اثرات (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)'' کے عنوان سے یہ مقالہ میری نگرانی میں خود تحریر کیا ہے۔ مواد کی فراہمی، ترتیب، اخذِ نتائج اور زبان و بیاں کے لحاظ سے یہ مقالہ اس لائق ہے کہ پی ایچ ڈی کی سند کے لیے پیش کیا جا سکے۔

فلیٹ بی - اے ون ٹیرس، دہلی کالونی نمبر ۲، گزری روڈ، کراچی ۷۵۶۰۰ فون: ۵۳۷۴۹۶۱

ای میل unushasany@hotmail.com

خلاصہ

خلاصہ

مقالے کا موضوع ''اُردو فکشن پر تقسیم ہند کے اثرات'' ہے۔ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے پہلے دو باب میں برصغیر کے سیاسی، سماجی اور مذہبی پس منظر تحریکِ پاکستان، تقسیم ہند اور اس کے بعد کے حالات کو بیان کیا گیا ہے۔ جب کہ تیسرے چوتھے اور پانچویں باب میں اُردو افسانوں اور ناولوں پر تقسیم ہند کے اثرات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

پہلے باب کا عنوان ''تقسیم ہند سے قبل برصغیر کا سیاسی، سماجی اور مذہبی پس منظر'' ہے۔ اس باب کے تین حصے ہیں:

حصہ الف میں برصغیر کے سیاسی تاریخ کو بیان کیا گیا ہے۔ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد، محمد بن قاسم سے لے کر مغلیہ خاندان کی حکم رانی اور اسی دوران انگریزوں کی آمد اور ہندوستان کی سیاست میں ان کی مداخلت اور مغلوں کی کم زوریوں سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان پر قبضہ کرنے تک کے حالات کو مختصراً بیان کیا گیا ہے تا کہ ہندوستان میں قوموں کی آویزش کے اسباب واضح ہوسکیں۔

حصہ ب میں ہندوستان کے سماجی حالات بیان کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ توجہ ہندوؤں کی ذات پات کے نظام پر دی گئی ہے۔ ذات پات کی سختیوں کے نتیجے میں اسلام، جین مت، بدھ مت، سکھ مت، کبیر پنتھی، سناتن دھرمی اور آریا سماجی کی مذہبی تعلیمات کا مختصر جائزہ اور ان مذاہب کے فروغ کو بیان کیا گیا ہے۔

اسی حصے میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہب، ثقافت اور زبان کے فرق کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

حصہ ج میں ۱۸۵۷ء کے بعد ہندو مسلم اختلافات اور مسلمانوں کا ہندوؤں اور انگریزوں کے خلاف جدوجہد اور حصول پاکستان کی کوششوں کے آغاز کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی مختلف تحریکوں کے بارے میں تفصیل سے لکھا گیا ہے۔

دوسرے باب ''برصغیر کی تقسیم اور دو مملکتوں کا قیام'' میں تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں مسلمانوں کی طویل جدوجہد کے بعد تقسیم ہند اور قیامِ پاکستان کا ذکر کیا گیا ہے اور اس دوران انگریزوں اور ہندوؤں کی مسلمانوں کے ساتھ مختلف مکاریوں

بالخصوص لارڈ ماؤنٹ بیٹن، لیڈی ماؤنٹ بیٹن اور نہرو کی سازباز سے قبل از وقت ملک کی تقسیم کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس باب کے چار حصے ہیں:

پہلے حصے ''فسادات'' میں ہندو مسلم فسادات کا ذکر کیا گیا ہے قبل از وقت تقسیم سے ملک میں بڑے پیمانے پر ہندو مسلم فسادات برپا ہوئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کی خواتین کو اغوا کر کے ان کی بے حرمتی کی گئی خواتین کی تجارت بھی کی گئی۔ یہ تمام واقعات اس کے پہلے حصے میں تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

دوسرے حصے ''مہاجرت'' میں تقسیم کے بعد ہجرت کے المیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ہجرت کے دوران مسلمانوں اور ہندوؤں کو پاکستان اور ہندوستان جانا پڑا۔ ہجرت کے دوران لاکھوں افراد شہید اور زخمی ہوئے، بعض مسلمان بھوک اور کنوؤں کے زہریلے پانی کی وجہ سے مرے، بہت سے لوگ اپنے خاندان والوں سے بچھڑ گئے۔ خواتین اغوا اور بے آبرو کی گئیں بعض خواتین نے اغوا اور بے آبرو ہونے کے خوف سے کنوؤں میں چھلانگیں لگائیں۔ یہ تمام دردناک واقعات بڑے مفصل انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔

تیسرے حصے ''آزاد ریاستوں کے الحاق کا مسئلہ'' میں آزاد ریاستوں کے الحاق کے سلسلے میں پیش آنے والی مختلف دشواریوں کو پیش کیا گیا ہے۔

اس باب کے آخر میں تقسیم اور قیامِ پاکستان کے بعد ''مقامی آبادی کے رویے اور آبادکاری کے مسائل'' کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ مسائل مہاجر کیمپوں سے لے کر کلیم داخل کروانے، ملازمت اور جائیداد وغیرہ کے حصول کے سلسلے میں پیش آنے والے مسائل کے بارے میں ہیں۔

تیسرا باب ''اُردو افسانے پر فسادات کے اثرات'' ہے۔ اس باب کے بھی چار حصے ہیں:

پہلے حصے ''ترقی پسند تحریک کا نقطۂ نظر'' میں ترقی پسند تحریک کا تعارف اور تقسیمِ ہند کے بعد ترقی پسندوں کے نظریات اور تحریروں پر سیاسی اثرات، قیامِ پاکستان کی مخالفت اور ملک کی تقسیم کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے اسی حصے میں ترقی پسندوں کی ان سرگرمیوں پر حکومت کی پابندی کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

دوسرے حصے ''حلقۂ اربابِ ذوق سے متعلق افسانہ نگاروں کا رویہ'' میں حلقۂ اربابِ ذوق کا تعارف اور اس سے وابستہ افسانہ نگاروں اور تقسیمِ ہند کے بارے میں ان کے نظریات اور فسادات کے موضوع پر لکھے گئے افسانوں کا مختصراً تجزیہ کیا گیا ہے۔

تیسرے حصے ''رومانیوں کا رویہ'' میں رومانی تحریک اور رومانی افسانہ نگاروں کے افسانوں پر تبصرہ کیا گیا ہے اور تقسیمِ ہند اور فسادات کے موضوع پر لکھے گئے ان کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

چوتھے حصے ''موضوعات'' میں فسادات کے موضوع پر لکھے گئے مختلف افسانوں کو چار موضوعات، قتل و غارت گری، انسانی اقدار کی پامالی ۔اغوا اور آبرو ریزی، قربانی کا جذبہ اور نفسیاتی اثرات میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان کا نفسیاتی اور تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔مختلف موضوعات سے متعلق جن افسانہ نگاروں کے افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ان میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، بلونت سنگھ، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، مہندر ناتھ، خواجہ احمد عباس، رام لعل، رامانند ساگر، شوکت صدیقی اور اشفاق احمد شامل ہیں۔

''قتل و غارت گری'' کے موضوع میں فسادات اور ہجرت کے دوران ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک دوسرے کو مختلف طریقوں سے قتل کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔اس سلسلے میں کرشن چندر کے افسانوں ''پشاور ایکسپریس''، ''اندھے''، ''لال باغ'' اور ''امرت سر آزادی سے پہلے'' خواجہ احمد عباس کے افسانے ''اجنتا''، مہندر ناتھ کے افسانے ''انسان کی لاش''، شوکت صدیقی کے افسانے ''تانیتا''، منٹو کے افسانے ''گورمکھ سنگھ کی وصیّت'' اور ان کے افسانچوں کے مجموعے ''سیاہ حاشیے'' کے افسانچوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

''انسانی اقدار کی پامالی — اغوا اور آبرو ریزی'' میں فسادات، ہجرت اور اپنے اپنے ملکوں میں جانے کے بعد بھی خواتین کے ساتھ کی جانے والی مختلف زیادتیوں کو پیش کیا گیا ہے۔اس سلسلے میں سعادت حسن منٹو کے افسانے ''شریفن''، ''کھول دو''، ''عزت کے لیے''، ''ڈارلنگ''، ''۱۹۱۹ء کی ایک بات''، مہندر ناتھ کے افسانے ''پاکستان سے ہندوستان تک''، بلونت سنگھ کے افسانے ''تعمیر''، ''پہلا پتھر'' رامانند ساگر کے افسانے ''بھاگ ان بردہ فروشوں سے'' میں خواتین کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں اور ان کی شخصیت پر ان کے گہرے نفسیاتی اثرات کو بیان کیا گیا ہے۔

''قربانی کا جذبہ'' میں فسادات کے دوران انسیت کے مظاہر پر توجہ دی گئی ہے۔ہجرت اور فسادات کے دوران بعض ہندو اور مسلمان ایسے بھی تھے جنھوں نے ان حالات میں خود کو نفرت کی تعصب کے زہریلے جذبات سے بچائے رکھا اور ایک دوسرے کی جان، مال اور عزت و آبرو بچانے کی ہر ممکن کوشش کر کے انسان ہونے کا حق ادا کر دیا۔اس سلسلے میں احمد ندیم قاسمی کے افسانے ''پرمیشر سنگھ'' عصمت چغتائی کے افسانے ''جڑیں'' کرشن کے افسانے ''ایک طوائف کا خط'' بلونت سنگھ کے افسانے ''لمحے'' اور ''کالے کوس'' منٹو کے ''آخری سلیوٹ''، ''سہائے'' خواجہ احمد عباس کے افسانے ''میری موت'' رام لعل کے افسانے ''ایک شہری پاکستانی'' کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

افسانوں کے چوتھے موضوع ''نفسیاتی اثرات'' میں فسادات اور ہجرت کے نفسیاتی اثرات کے بارے میں تحریر کیے گئے افسانوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس سلسلے میں راجندر سنگھ بیدی کے افسانے ''لاجونتی''، حیات اللہ انصاری کے افسانے ''شکر گزار آنکھیں''، منٹو کا ''ٹیٹوال کا کتا''، رام لعل کا ''نئی دھرتی پرانے گیت'' کرشن چندر کے افسانے ''جیکسن'' کا نفسیاتی تجزیہ پیش کیا

گیا ہے۔

چوتھے باب کا عنوان ''اُردو ناول پر فسادات کے اثرات [پلاٹ، فضا اور کرداروں کا تجزیہ]'' ہے۔ اس باب میں ان ناولوں کے پلاٹ، فضا اور کرداروں کا جائزہ لیا گیا ہے، جو فسادات اور تقسیمِ ہند کے نتیجے میں لکھے گئے ہیں اس سلسلے میں قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' اور ''میرے بھی صنم خانے'' کا انتخاب کیا گیا ہے۔ دونوں ناولوں کا موضوع ماضی پرستی ہے اور ان ناولوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی نوجوان نسل کا تقسیم کے نتیجے میں مشترکہ کلچر کے بکھرنے کے نفسیاتی اثرات کو پیش کیا گیا ہے۔

خدیجہ مستور کے ناول ''آنگن'' میں کرداروں کے ذریعے تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں مسلم لیگ اور کانگریس کے مختلف رویّوں کو دکھایا ہے، اور اس تحریک سے وابستہ عام عوام کی ذاتی زندگیوں میں آنے والی تبدیلیوں اور گھریلو فضا کی تلخیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ عبداللہ حسین کا ناول ''اداس نسلیں'' پہلی جنگِ عظیم سے لے کر قیامِ پاکستان کے ابتدائی دنوں تک اہم سیاسی واقعات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس سلسلے میں عبداللہ حسین نے تحریکِ پاکستان، ہندو مسلم فسادات، ہجرت، قیامِ پاکستان اور اس کے بعد معاشرے کی ناانصافیوں کو بیان کیا ہے۔

رامانند ساگر کے ناول ''اور انسان مر گیا'' میں فسادات کی ہولناکیوں، قتل و غارت گری، بھوک پیاس اور خوف سے لوگوں کے مر جانے، بھوک پیاس اور جانے بچانے کے لیے لوگوں کے خودغرض ہو جانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح خواتین کی بے حرمتی اور بازیاب ہونے والی خواتین کی سماجی حیثیت پر بھی خاص توجہ دی ہے۔ رامانند ساگر نے ان تمام واقعات میں خود کو غیر جانب دار ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے لیکن بعض واقعات اور مکالمے سے ان کے دل میں چھپا ہوا تعصب ظاہر ہو گیا ہے۔

کرشن چندر کے ناولٹ ''غدّار'' میں بھی فسادات اور ہجرت کے دوران ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک دوسرے کو وحشیانہ طریقے سے قتل کرنے ایک دوسرے کے گھروں کو آگ لگانے یا قبضہ کرنے، خواتین کو اغوا اور بے آبرو کرنے کے واقعات بیان کیے ہیں۔ متعصب مسلمانوں اور ہندوؤں کے علاوہ انھوں نے ایسے انسان دوست ہندوؤں اور مسلمانوں کے رویے کو بھی جنھوں نے ایک دوسرے کو ہر طرح کا تحفظ دیا۔

عصمت چغتائی کے ناول ''معصومہ'' میں تقسیم ہند کے نتیجے میں معاشی مسائل کا شکار ہونے والی خاندان کی نوجوان لڑکی کے طوائف بن جانے کا ذکر کیا گیا ہے۔

بلونت سنگھ کے ناولٹ ''کالے کوس'' میں فسادات کے دوران نفرت اور تعصب کے جذبات کو قابو رکھ کر ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کا ایک دوسرے کو تحفظ دینے اور منزل تک پہنچانے میں مدد کرنے کا ذکر ہے۔

پانچویں باب میں ''تقسیم اور فسادات کے بعد فکشن کا فضا'' کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب کے بھی دو حصے ہیں:

پہلے حصے ''افسانے کی فضا'' میں ان افسانوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے جن میں تقسیمِ ہند کے بعد کے مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔

دوسرے حصے ''ناول کی فضا'' میں ان ناولوں کا تجزیہ کیا گیا ہے جو تقسیمِ ہند کے بعد مہاجرین کے مختلف مسائل کے بارے میں ہیں۔ ان افسانوں اور ناولوں میں مہاجر کیمپوں کی حالت، ہندوؤں اور سکھوں کے ظلم کے بعد مقامی آبادی کا تحقیر آمیز رویہ، قدم قدم پر دھوکے، متروکہ جائیداد کے حصول اور کلیم فارم داخل کرانے کے سلسلے میں اثر و رسوخ وغیرہ کا استعمال اور ناانصافیاں، ذریعۂ معاش کے سلسلے میں پیش آنے والی مشکلات اور اس کے نتیجے میں نوجوان لڑکوں کی بے راہ روی اور خواتین کا مکروہ پیشوں کو اختیار کرنے وغیرہ کا نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے۔

ان مادّی مسائل کے علاوہ کچھ افسانوں اور ناولوں میں مہاجرین کے روحانی کرب پر بھی توجہ دی گئی ہے۔ روحانی دکھوں کے حوالے سے مہاجرین کا سب سے بڑا دکھ بچھڑے ہوؤں اور وطن کی یادیں تھیں، جن سے دامن چھڑانا ان کے اختیار میں نہ تھا۔ دوسرا دکھ بازیافتہ خواتین کا اپنے گھر والوں اور رشتے داروں کی نفرت کو برداشت کرنا تھا ان مسائل کے بارے میں لکھے گئے افسانوں اور ناولوں کو بھی اس باب میں شامل کیا گیا ہے۔

اس باب کے پہلے حصے میں تقسیمِ ہند کے بعد افسانے کی فضا کا جائزہ لیا ہے اور قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، شوکت صدیقی، سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، سیّد محمد اشرف اور احمد اشعر کے افسانوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ جن افسانہ نگاروں نے تقسیمِ ہند کے بعد مسائل پر توجہ دی ہے ان میں سب سے اہم نام قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کا ہے۔ اس باب میں قرۃ العین حیدر کے افسانے ''جلاوطن''، ''پت جھڑ کی آواز'' اور ''حسب نسب'' کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ''جلاوطن'' اور ''پت جھڑ کی آواز'' کا موضوع ماضی پرستی ہے۔ افسانے کے کردار اپنے وطن اور ساتھیوں کے یادوں میں کھوئے ہوئے ہیں۔ جب کہ ''حسب نسب'' میں تقسیم کے بعد چھمی بیگم کی زندگی میں آنے والی مختلف تبدیلیوں خاص طور پر معاشی مسائل بیان کیا گیا ہے۔ انتظار حسین کے افسانے ''اُستاد'' اور ''قیوما کی دکان'' کا موضوع بھی ماضی پرستی ہے اور اس حوالے سے افسانے کے کردار اپنے اُستاد، ساتھیوں اور محلّے والوں اور دکان داروں کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کو یاد کر رہے ہیں۔ شوکت صدیقی کے افسانے ''اندھیرا اور اندھیرا'' اور ''ہفتے کی شام'' میں مہاجرین کے معاشی مسائل اور اس کے نفسیاتی اثرات پر توجہ دی گئی ہے۔ سیّد اشرف کا افسانہ ''ڈار سے بچھڑے'' مہاجرین کی ہندوستان دیکھنے کی شدید خواہش اور اس خواہش کی تکمیل میں پیش آنے والے مسائل کے بارے میں ہے۔ احمد اشعر کا افسانہ ''اپنا گھر'' میں موجودہ دور میں ہندوستان کی عوام کی پاکستان کے بارے میں غلط فہمیوں اور پاکستان عوام کا اپنے وطن ہندوستان سے محبت کے بارے میں ہے۔

تقسیمِ ہند کے بعد لکھے جانے والے جن ناولوں کو اس باب میں شامل کیا گیا ہے۔ ان میں شوکت صدیقی کا ناول

''خدا کی بستی''، خدیجہ مستور کا ناول ''زمین'' قرۃ العین حیدر کا ناولٹ ''ہاؤسنگ سوسائٹی''، قدرت اللہ شہاب کا ناولٹ ''یا خدا'' انتظار حسین کا ناول ''بستی'' شامل ہیں۔

''خدا کی بستی'' پاکستان کے ابتدائی مسائل کے بارے میں ہے۔اس ناول میں شوکت صدیقی نے تقسیم ہند کے بعد ہندوؤں کی جائیداوں پر بلا استحقاق قبضہ کر کے اپنی حیثیت بدلنے اور بلند کرنے، بے روزگاری کی وجہ سے نوجوانوں کے بے راہ روی کا شکار ہونے اور تنہا اور کم زور خواتین کی بے بسی کا فائدہ اٹھانے والوں اور معاشرے کے طبقاتی نظام کا بڑی جرأت سے ذکر کیا ہے۔

خدیجہ مستور نے ناول ''زمین'' میں مہاجر کیمپوں کی حالت، غلط کلیم داخل کروا کر اپنی حیثیت بدلنے بعض مہاجرین کا نئے ملک میں آ کر تنگ دستی کا شکار ہونے اور معاشرے کے اعلیٰ طبقے کے ظلم کا نشانہ بننے کا ذکر کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے ناولٹ ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' میں بھی تقسیم ہند کے نتیجے میں مہاجرین کی زندگی میں آنے والی تبدیلیوں کو بیان کیا گیا ہے۔بعض مہاجرین کا غلط کلیم داخل کروا کر ترقی کی تمام منازل طے کرنا اور بعض مہاجرین کا ہندوستان میں پُرآسائش زندگی گزارنے کے بعد پاکستان میں مختلف مسائل کا شکار ہونے کا ذکر کیا ہے۔

ناولٹ ''یا خدا'' میں قدرت اللہ شہاب نے مہاجر کیمپوں کی بدنظمی اور خواتین کی اپنوں کے ہاتھوں تباہ ہونے کی نشان دہی کی ہے۔

انتظار حسین کے ناول ''بستی'' کا موضوع ماضی پرستی ہے۔ ماضی پرستی کے حوالے سے انتظار حسین ناول میں مہاجرین کے پھر سے ہندوستان جا کر آباد ہونے کی اُمید پر زندہ رہنے اور نئے ملک میں مسلمانوں کی مختلف پارٹیوں کے اختلافات اور لڑائی جھگڑوں پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔

❁ ❁ ❁

SUMMARY

SUMMARY

Theme of the thesis: Effect of Urdu fiction on the Partition of Hind. The thesis comprises of five chapters. In the first two chapters, the political, social and religious backround of Pakistan movement, division of Hind and the oftermath or cirumstanecs thereafter are dascribed. Whereas in the third, fourth and fifth chapter, an investigative and critical anaysis of the effect of partition of Hind, on Urdu fiction and novel, has been made.

The first chapter is entitled: ”تقسیمِ ہند سے قبل برِصغیر کا سیاسی، سماجی اور مذہبی پس نظر“ It is about pilitical, social and religious backround of the seb - contiont and makesup three sections.

SECTION A:

In this section, the political history of the sub-continent has been described. It tells about the advent of Muslim in sub - cont, the rulevship of Mohd bin Qasim towasds the reign of Mughal dynasty, and simultaneoussly the arrival of the British and their interference in the politics of Hindostan and taking contreo over India by tahnig under avwantage if Mughals weaknesses. All these events have been friefly doscribed so that reasos of nations in indostan may be ancilyseed.

SECTION B:

In sec. B the cultural conditions of Hindostan are varrated. In this regard, the coste system of the Hindus is focussed of with emphasis. As a conseqence of tha atrocitied of the cast system, a brief analysis has been made ro describe how Islam, Jainiem, Bhaddism, Sikhism Kabir Panthi, sanatun Dharami and Aryan culture flourished.

In the same section, the differences between the religious, Sultare and Language of the Hindus and Muslim has been closly described.

SECTION C:

In Sec. C, the Hindu Muslim differences after 1857, and the streggle of the Muslim against the Hindus and the English, and efforts in the making of Pakistan are mentioned in detail. In this regard, a detailed account of the different Hindu and Muslim movements has

been given.

In the Second chapter, "برِصغیر کی تقسیم اور دو مملکتوں کا قیام", the division of Hindu after the long and antiriag struggle of the Muslim and the establishment of Pakistan has been mentioned. And during this periot, the various canning and unjust behaiour of the Hindus and the English towards the Muslim, especially the conspiraccy of Lord Mount batten, Lord Mountbatten and the Hindus in the early untimely division of the country are presented. This chapter conists of four parts. In the first part, Hindu Muslim riots are mentioned which outbroke an a large scale as a result of an early partition of the country. The Hindus and the Muslim devised new methods to murder each other, they set house an fire, confiscated properties abducted each others women and molested them. The women were traded as well. All these gruesome events have been described in a detailed account.

In the second part, Mohajrat, the tragedies of migration after the partition are narrated. During the migration, the Muslims had to go to Pakistan and Hindus had to go to India. Meanwhile, millions were martyred and wounded. Several Muslims died of hunger or by drinking the poisonous water of wells. Many peple got separated from their family members. Women were kidneapped and raped. Many of them, fearing rape or kidnapping, jumped in the wells and thus killed the members. All there painful/ heartrendcring events are written in great detail.

In the third part, the difficulties faced/ encountered by the free/ independent states in the matters of partition are presented.

In the end of this chapter, the division of Hind and the behaviour and the problems of refuges of the local population are presnted. These problems reange from problems faced in migration camps to submission of claims, retrival of job and property etc.

The third chapter is "اُردو افسانے پر فسادات کے اثرات" [Effects of riots on Urdu Fiction.]

This chapter also comprises of four sections. In the first part, introduction to Tarqi Pasand movement, and political effects of views and write up of the opposition of the establishment of Pakistan and the attempt to condemn the division of the country are analyzed in deatil. In the same part, the government's ban on these activities of the is also mintioned.

The Second part is an introduction of the contemporaries. It also includes a brief ------- of the fiction writers in regard to partition of Hind and the short stories written on the theme of riots.

In the third part a commentary is conducted on the romantic movement of fiction

written on the topic of partition of Hind and riots has been focussed/ presented. In the fourth part, the fiction written and divided into four themes, namely murder massacre, violation of human values, kidnapping a molestation and the sentinent of sacrifice and psychological effects, their psychological and critical analysis has been made.

The fiction written by various writers on different topics, and whose work is included are saadat Hassan Manto, Krishan Chander, Balwant Singh, Rajinder Singh Bedi, Ismat Chughtai, Ahmed Nadeem Qasmi, Mahinder Nath, Ahmed Abbas, Ram Lal, Raman and Segur, Shaukart Siddiqui and Ashfaque Ahmed.

On the theme of murder during migration, a reference has been made about the methods devised to kill the Hindus and the Muslims. In this connection, Krishan Chander's short stories 'Peshawar Express', 'Andhe' ,'Lal Begh', 'Amirtsar Azadi se Pehle', Ahmed Abbas's. 'Tantia, Manto's 'Gormal Singh ki Wariyst' and a some of the short stories of his fiction (Siyah Hashiyay are anyaylsed. Under the theme, violation of human values [''انسانی اقدار کی پامالی۔ اغوا اور آبروریزی'']

Kidnapping and molestation, riots, migration and even on returning to their native lands, different atrocities and justice toward women is presented. In this regards Saadat Hasan Manto's stories 'Shareefan', 'Khol do', 'Izat Ke Life', 'Darteing' '1919 Ke Ek Baat', 'Taamir', Pehal Pathar, Ramanand Sagar's 'Bhag in Barda Faroshon Se, the cruetties done to these women and their deep psycological effect on their personalities explained. During Hijrat and communal riost, there were several Hindus and Muslims who kept them selves aloof.

From the bitter sentiments of hatred and fanaticism and proved their worth by trying to safeguard each other's life, property and self respect. In this regard, Ahmed Nadeem Qasmi's fiction 'Permeshar Singh' Ismat Chughtais 'Jarren', Krishan Chander's 'Ek Tawaif Ka Khat', Balwant Singh's 'Lamhe' and 'Kale Kaus', Manto's 'Aakhir Salute' Sahay an Ram Khalawan Ahmed Abbas's 'Meri Maut', Ram Laal's 'Ek Shehri Pakistani' are analyzed.

In the fourth theme of fiction, the fiction written with respect to riots and migration is examined. In this regard, Rajinder Singh Bedi's 'Laj Wanti' Hayat Ullah Ansari's 'Shukr Guzar Aankhen' 'Manto's 'Tayaqan' Ram Lal's 'Nai Dharti Puraney Geet' Krishan Chander's 'Jackson' are presented with a psychological analysis.

The fourth chapter is entitled: ''اُردو ناول پر فسادات کے اثرات [پلاٹ، فضا اور کرداروں کا تجزیہ]''.
In this chapter, the category, plot and environment of these novels is examined, which have been written as a consequence of the partition of Hind.

In this respect, Qurat ul Ain's novels 'Aag Ka Darya' and 'Mere bhi Sanam Khaney' are chosen. The theme of both the novels is an adoration of past and in these novels, the psyclolagical effects due to the dispersal of a common culture and its influence on the youth of the Hindus and Muslims has been described. In Khadija Ma stoor's novel 'Aangan', the different attitudes of Muslim League and congress in the Pakistan movement are depicted through charaterization. The changes brought about in the lives of those commoners associated with Pakistan movement, and the bitterness on their home front is narrated. Abdullah Hussain's novel 'Urdu Naslain' interprets the important political events from the first world war to the initial period of the establishment of Pakistan. In this connection, Abdullah Husain has analysed the Pakistan movement, Hind Muslim communal riots, migration, establishment of Pakistan and the injustices of the society.

In Ramandand Sagar's novel, 'Aur Insan Mar Gaya' facts like the terror of communal riots, mass massacre, the fear of starvation and the selfishness of the common man avoid hunger and thirst are mentioned.

Similarly, topics such as the molestation of women and the social status of women being retrieved are focussed in particular. Ramanand Sagar has ventured to express himself neutral while defining these happenings. But at times, his concealed fanaticism is revealed in some events and dialogues.

In Krishan Chander's novelette 'Ghadaar' also during migration the and communal riots, events of brutal killings of Hindus and Muslims, setting houses on fire or trespassing houses, kidnapping and rape of women etc have been described. A part from fanatic Hindus and Muslims, he has mentioned the behaviors of these humanitarian Hindus & Muslims who provided all sorts of protection to each other.

In Ismat Chughtais novel, 'Masooma', a young girl of a family is portrayed, who as a consequence of financial problems because of the partition of Hind, takes to prostitution.

In Balwant Singh's novelette, 'Kaaley Kaus' a suppression of evil sentiments of hatred and fanaticism and assisting the Hindus, Sikhs and Muslims to reach their distention has been mentioned.

In the fifth chapter, "تقسیم اور فسادات کے بعد فکشن کا فضا" an analysis has been made.

This chapter also comprises of two parts. In the first part, those fictions are described in which problems after the partition of Hind are presented. Where as, in the second part, an analysis of those novels has been made which deals with the various problems of the

migrations after the partition of Hind.

In these fictions and novels, the condition of migratory camps, derogatory/ insulting attitude of the local people after the cruelties of Hindus and Sikhs, deception all around, injustices and use of power and influence in the submission of claim forms and retrieval of abandoned property, problem encountered in procuring jobs, and as a result the of young boys, and the adoption of loathus some amount of attention has been focussed on the spiritual sufferings of the migrators. With reference to their spiritual distress, the greatest misery of the migratiors was the reminiscence of the separated and the homeland, getting rid of which was beyond their control. Another sorrow was that of the women tolerating the hatred and indifference of their families and relatives after their return from the kidnap. The novels and fiction written about these problems have been included in the same chapter.

In the first part of this chapter the temperament of fiction after the partition has been examined and an analysis of the fiction of Quratulain, Intizar Hussain, Shaukat Siddiqui, Saadat Hassan Manto, Ahmed Nadeem Qasmi, Sayed Mohd Ashraf and Ahmed Ashar have been presented.

The most important name, among those fiction writers who concentrated on problems after the partition, is that of Quratulain Haider and Intazar Hussain. In this chapter, Quratulain's fiction 'Jila Watan', 'Pattghar Ki Awaz' have a theme of adoration of the past. The characters are lost in the memories of their native land and companions, where as, in 'Hasb Nasb', the different changes in Chami Begum's life brought about after the partition, especially financial problem are narrated.

Intizar Hussain's fiction 'Ustad our Qauuma' has the theme of love of the past. With reference to this theme, the characters recall the time spent with their ustad, companions and shopkeepers. Manto's fiction, 'Toba Tek Singh' expressed Bishan Singh's passionate love with Toba Tak Singh. In Shaukat Siddiqui's fiction 'Andhera aur Andhera' and 'Hafte Ki Sham' the financial problems of the migrators is and their psychological effects are given attention. Ahmed Nadeem Qasmi's 'Kapas ka Phool' is an anecdote of the separation of a young girl and an old woman after the 1965 war. It also tells how the old woman returns the young girl's kindness. Khadija Mastoor's short story 'Lala'e Sehra' presents an analysis of a young girl's suppression of her wishes, becoming the patron of the household and after wards facing the psychological complications, Sayyed Ashrag's 'Dar Se Bhichre' is about the migrators deep desire to see Hindustan and the problems faced in the fulfilment of this desire. In Ahmed

Ashar's 'Apna Ghar', the novels which have been included in this chapter are of the current times and afther the partition.

Those novels include shaukat Siddiqui's 'Khuda Ki Basti' Khadija Mastoor's 'Zameen' Quratulain's novelette 'Housing Society', Qudrat Ullah Shahab's novelette 'Yah Khuda', Intizar Hussian's
'Basti'.

'Khuda ki Basti' is related to the initial problems of Pakistan. Shaukat Siddiqui has mentioned the people's attempt to change or establish status, the youth being victimized due to joblessness, and people taking urdu advantage of women's helplessness.

In 'Khuda ki Basti' Suaukat Siddiqui has mentioned about the class systam with a sheer boldness.

In her novel 'Zameen' K. Mastoor refers to the miserable condition of the Mahajir Camps, raising their social status by registering fake claim forms, the migrator's victimization of poverty and of the cruelties of the upper class.

Quratulain's novelette 'Housing Society' also focusses on the change brought about in the migrator's life as a result of partition. She discusses the different events e.g. gain og social status by registesing fack claims and the migrator's victization of different problems in Pakistan after living a Luxarious life in Hindostan.

In his novelette 'Yah Khuda' Qudrat ullah Shahab lighlight the class in migrator's camps, and the destruction of women by their own people.

The theme of Intezar Hussain's novel 'Basti' is love of the past. With reference to this sentiment, the author has expressed his deep regrest over the migrator's desire to return and settle back in Hindostan, the Muslim disputes and differences in political parties.

❀❀❀

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ O

ترتیب

بابِ دوم ۹۵

برِصغیر کی تقسیم اور دو مملکتوں کا قیام

بابِ سوم ۱۲۹

اُردو افسانے پر فسادات کے اثرات

بابِ چہارم ۳۱۹

اُردو ناول پر فسادات کے اثرات

[پلاٹ ،فضا اور کرداروں کا تجزیہ]

بابِ پنجم ۴۴۳

تقسیم اور فسادات کے بعد فکشن کی فضا

دادی امّاں کے نام

جو فسادات اور ہجرت کے کرب سے گزر کر منزل تک پہنچیں۔
خدا اُن کی مغفرت کرے۔ (آمین ثم آمین!)

لہو میں ڈوب کے پہنچے ہیں جو کنارے تک
وہ جانتے ہیں کہ یہ راہ کس قدر تھی کٹھن

پیش لفظ

پیش لفظ

ہندوستان میں ہندو مسلم اختلافات تو جنگِ آزادی کے بعد ہی سے شروع ہو گئے تھے قیامِ پاکستان سے پہلے ہندو اور مسلمان کئی بار متحد ہوئے لیکن یہ اتحاد زیادہ عرصے تک قائم نہ رہتا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دونوں قوموں کے اتحاد میں کمی آتی گئی اور نفرت اور تعصب اور بدگمانیاں بڑھتی گئیں اور جب ہندو مسلم اتحاد کی کوئی صورت نہ رہی تو تقسیمِ ہند کا واقعہ پیش آیا۔

ہندوستان کی تقسیم کے لیے جون ۱۹۴۸ء کی تاریخ مقرر کی گئی تھی لیکن اس موقع پر بھی ہندوؤں اور انگریزوں نے آپس میں ساز باز کر کے مقررہ تاریخ سے پہلے ہی تقسیمِ ہند کا اعلان کر دیا۔ یہ ذہن میں رہنا ضروری ہے کہ تقسیم کے فارمولے کے تحت پاکستان جن علاقوں پر مشتمل تھا وہ برِ صغیر کے ہر اعتبار سے پس ماندہ اور بے سروسامانی والے علاقے تھے۔ انتظامی بندوبست، تعلیم اور اقتصادیات کے اعتبار سے یہ انتہائی پس ماندہ اور معاشرتی اعتبار سے قدیم قبائلی روایات کے حامل علاقے تھے جن میں حکومتی مشنری بھی برائے نام تھی۔ تقسیم کے اعلان کے ساتھ ہی ملک میں تباہی مچ گئی۔ لاکھوں مسلمانوں نے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی۔ ہجرت کا یہ عمل نہایت تکلیف دہ اور دہشت ناک تھا۔ لاکھوں کی تعداد میں مہاجرین وحشیانہ طریقوں سے مارے گئے۔ لاکھوں خواتین اغوا اور بے آبرو کی گئی۔ فسادات اور ہجرت کے دوران بچھڑنے والوں کی تعداد بھی کم نہ تھی۔ جو لوگ زندہ بچ گئے وہ اپنی جائیدادوں اور اثاثوں سے محروم ہو چکے تھے۔ آزاد ملک میں انھیں معاشی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ مہاجر کیمپوں سے لے کر جائیداد کے حصول تک انھیں حق اور انصاف نہ مل سکا۔ ایک طرف معاشی مسائل تھے اور دوسری طرف بچھڑنے اور مرنے والوں اور پرانے وطن کی یاد نے انھیں ہر دم اداس رکھا۔ غرض یہ کہ آزادی تو مل گئی لیکن نہ تو اس کی خوشی منانا نصیب ہوئی اور نہ ہی مسائل حل ہو سکے۔ یہ صورتِ حال سرحد کے دونوں طرف تھی۔

ان غیر معمولی مسائل کو مہاجرین کے علاوہ مقامی لوگوں نے بھی محسوس کیا اور ہمارے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں نے فسادات اور ہجرت کے دوران پیش آنے والے حادثات کو اپنے افسانوں اور ناولوں کا موضوع بنایا اور بہت سے یادگار افسانے اور ناول لکھے۔ اس موضوع پر لکھے جانے والے بعض افسانوں اور ناولوں کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ ان حقائق

کے پیشِ نظر یہ خیال ہوا کہ ''اُردو فکشن پر تقسیمِ ہند کے اثرات'' کے موضوع سے ایک تحقیقی مقالہ لکھا جائے اور بتایا جائے کہ اس انسانیت سوز عہد میں ہمارے افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں نے کس طرح اس عہد میں انسانیت کی شمع روشن رکھی اور اپنی تحریروں سے انسانیت کے فروغ اور درندگی و بربریت کی تحقیر کا کام لیا۔

مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلے باب کا عنوان ''تقسیم سے قبل برِصغیر کا سیاسی، سماجی اور مذہبی پس منظر ہے اور اس باب میں برِصغیر کی سیاسی، سماجی اور مذہبی تاریخ، مسلمانوں کے عروج و زوال اور ان حالات کو پیش کیا گیا ہے جن کی وجہ سے ایک علیحدہ مسلم مملکت کی ضرورت پیش آئی۔

دوسرے باب کا عنوان ہے ''برِصغیر کی تقسیم اور دو مملکتوں کا قیام'' ہے اور اس باب میں برِصغیر کی تقسیم کے بعد فسادات، ہجرت، مقامی آبادی کے رویّے اور آبادکاری کے مسائل کے علاوہ آزاد ریاستوں کے الحاق کے مسئلے کو بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

تیسرے باب کا عنوان ''اُردو افسانے پر فسادات کے اثرات'' ہے۔ اس باب میں ترقّی پسند حلقے اور حلقۂ اربابِ ذوق اور رومانی افسانہ نگاروں کے ہندو مسلم فسادات کے بارے میں نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اسی باب میں فسادات پر لکھے جانے والے افسانوں کو چار موضوعات، قتل و غارت گری، انسانی اقدار کی پامالی، اغوا و آبرو ریزی، قربانی کا جذبہ اور نفسیاتی اثرات میں تقسیم کر دیا ہے اور ان افسانوں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

چوتھے باب کا عنوان ''اُردو ناول پر تقسیمِ ہند اور فسادات کے اثرات'' ہے۔ اس باب میں تقسیمِ ہند اور فسادات کے موضوع پر لکھے جانے والے ناولوں کے کردار، پلاٹ، اور فضا کا جائزہ لیا گیا ہے اس سلسلے میں قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' اور میرے بھی صنم خانے''، خدیجہ مستور کے ''آنگن''، عبداللہ حسین کا ''اداس نسلیں''، عصمت چغتائی کے ناول ''معصومہ''، کرشن چندر کے ناولٹ ''غدار''، بلونت سنگھ کے ناولٹ ''کالے کوس''، اور راما نند ساگر کے ناول ''اور انسان مر گیا'' کا انتخاب کیا گیا ہے۔

پانچویں باب کا عنوان ''تقسیم اور فسادات کے بعد اُردو فکشن کی فضا'' ہے۔

اس باب میں پہلے تقسیمِ ہند کے بعد اُردو افسانے کی فضا کی ذکر کیا گیا ہے اس سلسلے میں منٹو، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، شوکت صدیقی، سیّد محمد اشرف، امراؤ طارق اور احمد اشعر کے افسانوں کی فضا کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد تقسیمِ ہند کے ناول کی فضا کا جائزہ لیا گیا ہے اور شوکت صدیقی کے ناول ''خدا کی بستی''، خدیجہ مستور کے ناول ''زمین''، قدرت اللہ شہاب کے ناولٹ ''یا خدا''، قرۃ العین حیدر کے ناولٹ ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' اور انتظار حسین کے ناول ''بستی'' کی فضا

کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

پانچ ابواب مکمل کرنے کے بعد محاکمہ پیش کیا گیا ہے۔

مقالے کے انتخاب سے لے کر اس کی تکمیل تک میرے نگران محترم ڈاکٹر یونس حسنی صاحب نے میری بھرپور رہنمائی کی اور اپنی مصروفیات کے باوجود مقالہ لکھنے کے دوران مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازتے رہے۔ اور اپنی ذاتی لائبریری سے مجھے کئی کتابیں پڑھنے کے لیے دیں۔ اس کے لیے میں ہمیشہ تہِ دل سے ان کی ممنون اور شکرگزار رہوں گی۔

مواد کی تلاش میں مجھے مختلف لائبریوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس سلسلے میں مجھے بیشتر کتابیں ''محمود حسین لائبریری'' جامعۂ کراچی سے دستیاب ہوئیں کتابوں کی تلاش اور فراہمی میں لائبریرین محترم محمد رفیق صاحب، حنیف صاحب، محترمہ تسنیم کوثر صاحبہ، اور لئیق صاحب وغیرہ نے میری ہر ممکن مدد کی۔

انجمنِ ترقی اُردو کی لائبریری کے لائبریرین سید محمد معروف صاحب سے بھی مجھے کئی رسائل اور کتابیں دستیاب ہوئیں ان کا شکریہ بھی مجھ پر قرض تھا۔

غالب لائبریری سے مجھے کچھ نادر رسائل ملے جن کی تلاش میں مجھے محترم نسیم صاحب کا تعاون حاصل رہا۔

مقالے کی تکمیل میں صدر شعبۂ اُردو ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب نے گہری دل چسپی لی اور میری ہمت بڑھائی ان کے علاوہ ڈاکٹر صدیقہ ارمان صاحبہ، پروفیسر سحر انصاری، ڈاکٹر مہ جبیں اور پروفیسر تنظیم الفردوس نے بھی ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی اور مقالے کی تکمیل کا شدت سے انتظار کیا، ان سب کا بہت شکریہ۔

اساتذۂ کرام کے علاوہ حافظ عبدالحفیظ عباسی صاحب کی حوصلہ افزائی اور دعاؤں نے مجھے کبھی مایوس نہ ہونے دیا اور میں اپنا کام خوداعتمادی اور یقین کے ساتھ کرتی رہی ان کے علاوہ امراؤ طارق صاحب، مختار اجمیری صاحب، شہزاد منظر مرحوم اور میری سہیلیوں عالیہ حسن، فرزانہ شریف اور صفیہ بہادر نے بھی میری حوصلہ افزائی کی۔ عامر انصاری صاحب نے مقالے کی کمپوزنگ کی۔ ان سب کا شکریہ! میرے گھر والوں نے بھی مقالے کی تکمیل میں دل چسپی لی اور مجھے ہر طرح کی سہولتیں فراہم کیں جس سے کام کرنا میرے لیے آسان ہو گیا۔ میں اپنے والدین کی دعاؤں اور بہن بھائیوں کے تعاون کے لیے ان کی شکرگزار ہوں کہ ان کے بغیر یہ کام مکمل ہونا مشکل تھا۔

سمیرا بشیر

کراچی

۳۱ر مارچ ۲۰۰۴ء

❀ ❀ ❀

بابِ اوّل

تقسیم سے قبل

برِّصغیر کا سیاسی، سماجی اور مذہبی پس منظر

باب اوّل

تقسیم سے قبل برِّصغیر کا سیاسی، سماجی اور مذہبی پس منظر

الف: سیاسی حالات

ہندوستان سے عربوں کے تعلّقات زمانۂ جاہلیت سے تھے۔ ان تعلّقات کی نوعیت تجارتی تھی۔ عرب تاجر مالابار کے ساحل سے تجارتی لین دین کیا کرتے تھے۔ اسلام آنے کے بعد بھی یہ لین دین جاری رہا۔ ظہورِ اسلام کے بعد عربوں میں جو تبدیلیاں آئی تھیں، ہندوستان کے لوگ اُن سے کسی نہ کسی حد تک ضرور واقف ہوں گے۔

ہندوستان سے مسلمانوں کا باقاعدہ رابطہ ۷۱۱ء میں محمد بن قاسم کے حملے سے شروع ہوا۔ محمد بن قاسم کے یہاں آنے کا مقصد مسلم تاجروں کو راجا داہر کی قید سے رہائی دلانا تھا۔ یہ تاجر سیلون سے آئے تھے اور بصرہ جا رہے تھے۔ ان تاجروں کا بحری جہاز جب دیبل کے ساحل پر پہنچا تو یہاں کے ڈاکوؤں نے ان کا سامان لوٹنے کے بعد انھیں قید کر لیا۔ جب یہ خبر بصرہ کے گورنر حجاج بن یوسف کو پہنچی تو اُس نے راجا داہر سے اِن قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ جب راجا داہر نے حجاج بن یوسف کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا تو حجاج بن یوسف نے اپنے سترہ سالہ داماد محمد بن قاسم کو سامانِ جنگ اور سات ہزار سپاہیوں کے ساتھ دیبل پر حملے کے لیے بھیجا۔

> تین دن کے کشت وخون کے بعد عرب سپاہیوں نے تلواریں میان میں کر کے شہر کو امان دی۔ مقامی حاکم بچ کر نکل گئے مگر عسکری جوان بے تعداد مارے گئے۔ ہزاروں قید ہوئے۔ بڑے مندر ہی کی مرلیاں سات سو تھیں جو بتوں کی پرستاری سے نکل کر مسلمانوں کی کنیزی میں داخل ہوئیں، یعنی برہمن مسلمان ہو گئے اور سرکاری عہدوں پر بحال رہے... چار ہزار عرب دیبل میں

بسائے گئے۔عرب قیدی نہ صرف آزاد ہوئے، بلکہ اسی شہر میں بڑی عزت حرمت سے آباد ہوئے۔☆۱

اپنی کامیابی کے بعد محمد بن قاسم نے تمام قیدیوں کو رہا کیا، اور وہاں کے مسلم اور غیر مسلم دونوں باشندوں سے دوستانہ رویّہ اختیار کیا۔غیر مسلموں کو بھی مذہبی آزادی دی۔ یہاں کی رعایا جو راجا داہر کے ظالمانہ رویّے سے تنگ آچکی تھی۔انھوں نے جب محمد بن قاسم کا دوستانہ رویّہ اور مسلمانوں میں اخوت اور برابری دیکھی تو وہ اسلام سے بہت متاثر ہوئے اور بیش تر ادنیٰ ذات کے ہندوؤں نے اسلام قبول کیا، اور محمد بن قاسم کے ساتھی بن گئے۔سندھ فتح کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے دوسرے شہروں پر بھی قبضہ کرلیا۔

محمد بن قاسم کی فتوحات کا سلسلہ ابھی جاری تھا کہ اسے واپس بصرہ جانا پڑا۔جہاں اموی حکم راں سلمان بن عبدالملک نے حجاج بن یوسف اور اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ ذاتی دشمنی کی وجہ سے انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔اپنے ساتھیوں کے ساتھ محمد بن قاسم بھی مارا گیا۔

محمد بن قاسم جب تک یہاں رہا اُس نے پورے سندھ کو فتح کرنے کے علاوہ نیرون کوٹ، ملتان، سیم، بہمن آباد اور اروڑ پر قبضہ کرلیا تھا۔

محمد بن قاسم کے بعد اگر چہ اِس علاقے پر مسلمان حکم راں رہے مگر قرامطہ کے آجانے کے باعث اس کی شکل ہی بگڑ گئی۔دسویں صدی میں لاہور کے راجا جے پال اور غزنی کے امیر سبکتگین میں لڑائی کے بعد سبکتگین کو کامیابی حاصل ہوئی اور اس نے لاہور، کابل اور پشاور پر قبضہ کرلیا۔

> سبکتگین نے لغمان سے پشاور تک تمام ملک پر قبضہ کرلیا۔اس مقبوضہ علاقے میں پٹھان، افغان اور خلجی آباد تھے۔انھوں نے سبکتگین کی اطاعت کی اور اکثر اسلام لے آئے۔☆۲

سبکتگین کی وفات کے بعد محمود غزنوی تخت نشین ہوا۔اس نے پہلے بدخشاں اور ترکستان کو فتح کیا۔اس کے بعد دریائے سندھ کے مغربی علاقے کو فتح کیا، اور پھر محمود غزنوی کے حملوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

۱۰۲۲ء میں محمود نے پنجاب پر راست اپنی حکومت قائم کردی، اور قنوج، کالنجر اور گجرات تک کہ وہ راجا اس کے باج گزار تھے جن کو اس نے میدانِ جنگ میں زیر کیا تھا۔

محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے۔۱۰۰۱ء سے ۱۰۳۰ء تک محمود غزنوی گوالیار، نگر کوٹ، کوہستان، کالنجر، روہیل کھنڈ، لاہور، ملتان، بھنڈا، تھانیسر، سومنات اور سندھ پر قبضہ کیا، اور ہندوؤں کو نہ تو جبراً مسلمان کیا اور ان کے صرف وہی مندر منہدم کیے جو انھوں نے کسی سازش کے لیے مرکز بنائے تھے۔

محمود کے مرنے کے بعد ہندوستان میں باہمی اختلافات کی وجہ سے زیادہ عرصے تک حکومت نہ کر سکے، اور خاندان غوری نے ان کی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھا کر اپنی حکمرانی کا آغاز کیا۔

اس طرح محمود غزنوی کے بعد ہندوستان میں غیر ملکی مسلم حکمرانوں کی حکومت کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ایک خاندان کے زوال کے بعد دوسرے خاندان کا عروج شروع ہو جاتا ہے۔

اگر چہ یہ حکمراں ہندوستان سے تعلق نہیں رکھتے تھے لیکن مسلمان تھے اور انھوں نے نہ صرف مسلم حکومت قائم کی، بلکہ یہاں اسلام کی تبلیغ بھی کی اور مسلم تہذیب وثقافت کے اثرات بھی ڈالے۔

یہ حکمراں خاندان اس ترتیب سے آئے۔

خاندان غزنوی	۹۹۸ء تا ۱۰۳۰ء
خاندان غوری	۱۱۷۶ تا ۱۲۰۶ء
خاندانِ غلاماں	۱۳۰۶ تا ۱۲۹۰ء
خاندان خلجی	۱۲۹۰ تا ۱۳۲۱ء
خاندان تغلق	۱۳۲۱ تا ۱۴۱۲ء
سیدوں کی حکومت	۱۴۱۴ تا ۱۴۲۱ء
خاندان لودھی	۱۴۵۱ تا ۱۵۲۶ء

ان حکمرانوں کے علاوہ محمد بن قاسم سے ابراہیم لودھی تک ۸۱۴ سال تک ہندوستان کے تمام حصّوں میں کبھی منتشر اور کبھی مرکزی یک جہتی کی صورت میں اسلامی حکومت پھیلی۔ اس کے علاوہ صوفیاے کرام کے مختلف سلسلوں میں اسلام کی تبلیغ ہوئی اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اسلام پھیلا اور مذہبی اثرات کے علاوہ اپنی تہذیب کے اثرات بھی ڈالے۔

مغلوں کی حکومت:

مغلیہ دورِ حکومت کا آغاز بابر سے ہوا۔

بابر نے ابراہیم لودھی کے زمانے ہی میں ہندوستان کے تمام مغربی علاقے پر قبضہ کرلیا تھا، لیکن ابراہیم لودھی کی ناانصافیوں اور ظلم سے اس کی عوام اور خاندان والے بھی تنگ آ گئے تھے آخر دولت خاں لودھی نے بابر کو ہندوستان پر حملہ کی دعوت دی۔

۱۵۲۶ء میں بابر آخر اس نے ابراہیم لودھی کو پانی پت کے میدان میں شکست فاش دی۔ ☆۳

اور یوں پانی پت کی لڑائی جیتنے کے بعد بابر تخت نشین ہوا، اور مغلیہ دور کا آغاز ہوا۔ یہ مغلیہ دور حکومت سوا تین سو سال تک قائم رہا، اور یہی ہندوستان کی تاریخ کا سنہرا دور تھا۔ جب ہندوستان ساری دنیا میں سونے کی چڑیا کہلایا، اور یورپی اقوام سارے ہندوستان میں عمل دخل کے لیے دوڑ پڑیں اور رفتہ رفتہ یہاں کی سیاست میں مداخلت کرنے کے بعد ہندوستان پر قابض ہو گئیں۔

مغلیہ حکومت نے عروج وزوال کا مزا چکھا۔ غیر مسلموں پر حکومت کر کے عروج کا زمانہ بھی دیکھا اور اپنے آخری دور میں انگریزوں اور ہندوؤں کے محکوم بھی بنے۔ مغلیہ سلطنت نے اکبر، جہاں گیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے عہد میں اپنا انتہائی عروج دیکھا تھا لیکن اورنگ زیب کے جانشینوں کے ہاتھوں مغلوں کا زوال شروع ہوا۔

تمام مغل شہنشاہ مختلف ادوار میں مختلف عرصے کے لیے اس ترتیب سے آئے۔

ظہیر الدین بابر　　۱۵۲۶ء تا ۱۵۳۰ء

نصیر الدین ہمایوں　　۱۵۳۰ء تا ۱۵۴۰ء اور دوسری بار ۱۵۵۰ تا ۱۹۵۶ء

شیر شاہ سوری　　۱۵۴۰ء تا ۱۹۴۵ء

جلال الدین اکبر　　۱۵۴۶ء تا ۱۶۰۵ء

نور الدین جہاں گیر　　۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۷ء

شہاب الدین محمد شاہ جہاں　　۱۶۲۸ء تا ۱۶۵۶ء

اورنگ زیب عالمگیر ۱۶۵۶ء تا ۱۷۰۷ء

مزید بادشاہ اورنگ زیب کے بعد کم زور بے اختیار حکم راں ہیں جو اس ترتیب سے حکم راں ہوئے۔

۱۔ بہادر شاہ اوّل　　۱۷۰۷ء تا ۱۷۱۲

۲۔ جہاں دار شاہ　　۱۷۱۳ء تا ۱۷۱۳

۳۔ فرخ سیَر　　۱۷۱۳ تا ۱۷۱۹ء

۴۔ رفیع الدرجات　　چند ماہ کی حکومت

۵۔ رفیع الدولہ　　چند ماہ کی حکومت

۶۔ محمد شاہ　　۱۷۱۹ تا ۱۷۴۸ء

۷۔ احمد شاہ　　۱۷۴۸ تا ۱۷۵۴ء

۸۔ عالمگیر ثانی　　۱۷۵۴ تا ۱۷۵۹ء

۹۔شاہ عالم ثانی		۱۷۵۹ تا ۱۸۰۶ء

۱۰۔اکبر شاہ ثانی		۱۸۰۶ تا ۱۸۳۰

۱۱۔بہادر شاہ ظفر		۱۸۳۰ تا ۱۸۵۷

مغلیہ دورِ حکومت کا پہلا بادشاہ بابر زیادہ عرصے تک حکومت نہ کر سکا۔لودھی کو شکست دینے کے بعد بابر صرف چار سال تک زندہ رہا،لیکن ان چار برسوں ہی میں اس نے عظیم مغلیہ سلطنت کی بنیاد استوار کر دی۔

بابر کی وفات ۱۵۳۰ میں وفات پائی اور اس کی جگہ ہمایوں تخت نشین ہوا۔

شیر شاہ نے ہمایوں کو شکست دے کر ۱۵۴۰ء میں ایران کی طرف بھگا دیا اور خاندانِ سُور کی بنیاد ڈالی۔

اس طرح ہمایوں کے بعد شیر شاہ سوری نے پانچ سال تک حکومت کی،لیکن ان کے زوال کے بعد دوبارہ ۱۵۵۰ء تک ۱۵۵۶ء تک ہمایوں نے حکومت کی۔

ہمایوں کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے جلال الدین اکبر کا دورِ حکومت شروع ہوا۔

اکبر کا شمار ان حکم رانوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے دور میں نظامِ حکومت کو نظم و نسق سے چلایا اور بڑی کام یابی حاصل کی۔اپنی سلطنت کی توسیع کی اور دشمنوں کو اپنی قوت کے بل بوتے پر دبایا۔

اکبر نے اپنے دورِ حکومت میں ملک میں صنعت و تجارت،زراعت،فوجی نظام،علم و ادب فن مصوری اور موسیقی ہر میدان کو ترقی دی اور اسے نئے سرے سے منظم کیا۔جس سے ملک اور قوم کی خوش حالی اور استحکام میں مثبت تبدیلی آئی۔

> اکبر ۱۵۵۶ء میں تخت نشین ہوا،اور ۱۵۶۰ء میں بیرم خان کی معزولی کے بعد حاکمِ خود مختار ہوا۔ ۱۵۶۱ء میں مالوہ فتح ہوا۔۱۵۶۴ء میں گونڈوانہ مغلیہ سلطنت میں شامل ہوا۔۔اس میں چتوڑ اکبر کے ہاتھوں فتح ہوا۔اگلے سال کالنجر اور تھنبور کے مشہور قلعے مغلوں کے قبضے میں آئے۔۱۵۷۰ میں جسلمیر اور بیکانیر کے راجاؤں نے اطاعت قبول کی۔۱۵۷۲ء میں ٹکرائی کی جنگ کے بعد بنگال پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔☆۴

اکبر نے ملک اور قوم کو جہاں مستحکم اور خوش حال کیا وہاں مسلمانوں کے مذہب اور تہذیب کو نقصان بھی پہنچایا۔جس میں اکبر کے خوشامدی اور اسلام دشمن مشیروں ابوالفضل اور فیضی نے اکبر کا ساتھ دیا۔

> اکبر(اور اس کے خوشامدی درباریوں)نے جو نظام ترتیب دیا تھا،انگریز مورخین اسے ”دینِ الٰہی“ کا نام دیتے ہیں۔☆۵

یہ مذہب اسلام،سکھ مت،عیسائیت،جین مت،بدھ مت،مجوسیت اور ہندو مت کے مختلف اصولوں کا مجموعہ تھا جس

سے ہر مذہبی فرقے کو تکلیف پہنچی، لیکن سب سے زیادہ نقصان مسلم علما کو پہنچا۔

سب سے پہلے داڑھیوں پر آفت ہوئی۔ پھر دربار میں سجدہ یا زمین بوس کی رسم لازمی قرار پائی، ریشمی لباس اور اعتدال سے شراب نوشی جائز قرار دی گئی۔ تخت کے گرد کتے اور سور قیمتی جھولیں پہنا کر بٹھائے جانے لگے۔ سرکاری مدارس میں عربی تعلیم موقوف علومِ عقلی پڑھانے کا حکم ہوا۔ شمسی سال اور زرتشتی عیدیں رائج کی گئیں۔ سلام کے بجائے ''اللہ اکبر'' جواب میں ''جلّ جلالہ'' کی رسم جاری ہوئی۔☆۶

اِس صورتِ حال میں حضرت مجدد الف ثانی نے اس مذہب کے خلاف شدید ردِّ عمل کیا اور ان کی اصلاح کا سلسلہ عہدِ جہاں گیری تک جاری رہا۔

اکبر کے بعد جہاں گیر نے بھی اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلنا شروع کر دیا، لیکن بعض معاملات میں تبدیلیاں کیں۔ مثلاً زمین داروں کو ان کی زمینیں واپس کر دیں اور دینِ الٰہی کے بعض اصولوں کو ختم کر دیا۔

اس نے عہدِ اکبری کے بیش تر قواعد جو شرعِ اسلام کے خلاف تھے موقوف کر دیے۔☆۷

اس سلسلے میں حضرت مجدد الف ثانی کی کوششیں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ کیوں کہ جہاں گیر نے اپنے والد کی طرح ہندو عورت سے شادی بھی کی اور لوگوں کو سجدہ تعظیمی کے لیے مجبور بھی کیا اسی لیے حضرت مجدد الف ثانی کی تحریک عہدِ جہاں گیری تک جاری رہی۔

جہاں گیر کے بعد شاہ جہاں نے اپنے دور میں ملکی استحکام اور خوش حالی کے لیے علم ثقافت، تجارت، زراعت، صنعت و حرفت کارخانوں اور اعلیٰ تعلیمی نظام کی طرف توجہ دی، لیکن ان کی توجہ کا اصل مرکز اسلام تھا۔ شاہ جہاں نے غیر اسلامی رسوم کو ختم کیا ور ملک میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنے میں دل چسپی لی، اور غیر مسلموں کے مذاہب کا بھی احترام کیا۔

جہاں گیر کے زمانے میں عام لوگوں کے لیے درباری سجدہ برقرار تھا۔ شاہ جہاں نے اسے موقوف کر دیا وہ شرع کے مطابق مقدمات فیصل کرتا اور علما و فضلا کا بھی بڑا قدر دان تھا۔ نماز روزے کا پابند تھا۔☆۸

...لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ تمام ملک سے مذہبی بے قاعدگیاں دور ہو گئی تھیں۔☆۹

شاہ جہاں کے بعد اورنگ زیب عالمگیر کا دورِ حکومت شروع ہوتا ہے ۱۶۵۸ء سے شروع ہو کر ۱۷۰۷ء میں اپنے اختتام کو پہنچا۔

اپنے دورِ حکومت میں اورنگ زیب نے سب سے زیادہ توجہ اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنے کی طرف دی، اور ان

اسلامی روایات کو دوبارہ زندہ کیا جن کو اکبر نے خاص طور پر اور کسی حد تک جہاں گیر اور شاہ جہاں نے ختم کر دیا تھا اورنگ زیب نے تمام غیر اسلامی رسوم کو بالکل ختم کر دیا اور رعایا کو شرع کا پابند بنانے کے لیے محتسب مقرر کیے۔

> عالمگیر کو ان رسوم کے موقوف کرنے میں خاصی دشواری پیش آئی جن کا تعلق بادشاہ کی ذات یا درباری تکلّفات سے تھا۔ کیوں کہ ان کی بدولت صدہا افراد کی پرورش ہوئی تھی۔ اکثر شاہی کارخانوں کو اسی خیال سے بحال رکھنا پڑا۔ تاہم زمین بوس یا "سری ٹیک" کی بدعت اور درشن کی رسم متروک کر دی گئی۔ مصوری، موسیقی، شاعری، حتیٰ کہ وہ تاریخ نویسی تک جو ابوالفضل کے زمانے سے بادشاہوں کی مدح خوانی کا پیرایہ بن گئی دربار سے رخصت کر دی گئی۔☆۱۰
> زکوٰۃ کی باضابطہ وصولی کا انتظام کیا گیا اور غالباً سب سے آخر میں غیر مسلم رعایا پر دوبارہ جزیہ لگایا گیا۔☆۱۱

اورنگ زیب عالمگیر کی اسلام سے محبت کو انگریز مورخوں نے تعصب کہا ہے اور غیر مسلموں سے جزیہ لینے پر اعتراض کیا۔ جب کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ:

> جزیہ صرف اہلِ استطاعت لوگوں سے لیا جاتا تھا... بالفاظ دیگر فقط بیوپاری، سیٹھ، ساہوکار، زمیں دار، خوش حال اہلِ حرفہ اور کاری گر جزیے کی زد میں آتے تھے۔☆۱۲

اورنگ زیب نے اکبر کی طرح ہندوؤں کو ہر میدان میں زیادہ اہمیت تو نہ دی تھی لیکن ان کے ساتھ کسی قسم کی ناانصافی بھی کی تھی۔ انھوں نے سرکاری عہدوں سے ہر بے ایمان آدمی کو بے دخل کر دیا تھا ان میں اگر ہندو بھی شامل ہوں تو متعصب کہنا سراسر غلط ہے۔

اورنگ زیب کا زمانہ بڑی حد تک بغاوتوں کا زمانہ تھا جن میں ہندو مرہٹوں، راجپوتوں، سکھوں، جاٹوں، ستنامیوں اور پشتونوں کی بغاوتیں شامل ہیں، اورنگ زیب نے ان کا ڈٹ کا مقابلہ کیا، لیکن پھر بھی نیم خودمختار راجپوت خودمختار ریاستیں قائم کرنے میں کام یاب ہو گئے۔ اسی طرح مرہٹوں نے بھی کئی بار مختلف علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ خاص طور پر شیواجی جب تک زندہ رہا مغلوں سے لڑتا رہا اسے کئی بار کام یابی بھی حاصل ہوئی لیکن مغلوں نے دوبارہ اسے شکست دے دی۔ غرض یہ کہ عالمگیر جب تک زندہ رہا دشمنوں کا مقابلہ کرتا رہا۔

اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہو گئی تھی۔ جس کے ذمّے دار اورنگ زیب عالمگیر کے جانشیں تھے جو عالمگیر کی وفات کے بعد حصول تخت کے لیے آپس میں لڑ پڑے۔ ان کی نااتفاقی سے مرہٹوں، جاٹوں، ہندوؤں، راجپوتوں اور سرکش مسلمان صوبے داروں کو بغاوت کرنے کا موقع مل گیا۔

اگرچہ اورنگ زیب عالمگیر نے اپنی زندگی ہی میں سلطنت کو اپنے جانشینوں میں تقسیم کر دیا تھا، لیکن اورنگ زیب کی وفات کے بعد انھوں نے آپس میں لڑنا شروع کر دیا۔ جس میں معظم کو کامیابی ہوئی، لیکن اپنی بے جا فیاضی اور رحم دلی کی وجہ سے نظامِ سلطنت کو کامیابی سے نہ چلا سکا اور وہ ''شاہِ بے خبر'' کہلایا۔

اس کے زمانے میں پہلے راجپوتوں اور پھر سکھوں کے سرگروہ بندہ بیراگی نے مغلوں کے علاقے کو لوٹا۔ ☆۱۳

راجپوتوں کے ساتھ تو معظم نے صلح کر لی لیکن سکھوں نے بندہ بیراگی کی قیادت میں سرہند اور سہارن پور میں لوٹ مار اور قتل و غارت کرنے کے بعد دونوں شہروں کو فتح کر لیا۔

بہادر شاہ اوّل کی وفات کے بعد ''جہان دار شاہ'' ۱۷۱۳ء میں تخت نشین ہوا لیکن عیش و عشرت اور نااہلی کی وجہ سے صرف چند ماہ حکومت کر سکا، اس کے بعد فرخ سیَر نے اسے قتل کر دیا۔ اس کے بعد فرخ سیَر نے تخت و تاج سنبھالا۔ فرخ سیَر کسی قدر سمجھ دار اور قابل حکم راں تھا۔

...لیکن اس کے زمانے میں مسلمان امرا کے دو فریق ہو چکے تھے۔ ایرانی اور تورانی (شیعہ اور سنی) ان کے اختلافات نے اسلامی حکومت کا خاتمہ کر دیا... حکومت کو ضعف اس لیے بھی پہنچا کہ فرخ سیَر کو تخت سیّد برادران (امیر الامرا سیّد حسین علی اور قطب الملک سیّد عبداللّٰہ) کی مدد سے ملا تھا۔ وہ بادشاہ کی حیثیت ''شاہِ شطرنج'' سے زیادہ نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ ☆۱۴

سیّد برادران نے فرخ سیَر کی مدد تو کی لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ فرخ سیَر نے ان کی محکومیت قبول نہیں تو سیّد برادران نے مرہٹوں کو اپنے ساتھ ملا کر اپنی طاقت کو بڑھایا۔

اُن سے وعدہ کیا کہ بادشاہ سے تمھیں چوتھ اور سردیش مکھی کا فرمان لے دوں گا چناں چہ وہ ان کا لشکر لے کر دہلی کی طرف چلا۔ فرخ سیّد معزول کر دیا گیا اور مرہٹوں کو دکن میں چوتھ اور سردیش مکھی کا اجازت مل گئی۔ ☆۱۵

فرخ سیَر کے بعد رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ کو بھی سیّد برادران نے تخت نشین کرایا، لیکن وہ چند ماہ سے زیادہ حکومت نہ کر سکے اور ان چند مہینوں میں بھی وہ سید برادران کے محکوم بنے رہے۔

...جب تورانی امرا نے ان بھائیوں (سید برادران) کے مظالم دیکھے تو انھیں قتل کر دیا۔ ☆۱۶

اور اس طرح مغلیہ خاندان کو سیّد برادران سے نجات مل گئی۔

کئی دو روزہ بادشاہوں کے بعد محمد شاہ تخت نشین ہوا جو ۱۷۱۹ء سے ۱۷۴۸ء تک حکم راں

رہا۔☆۱۷

محمد شاہ نے سید برادران سے تو نجات حاصل کر لی لیکن عیش وعشرت میں پڑ کر اپنی ذمّے داریوں سے غافل ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں امرا نے خود مختار ریاستیں قائم کر لیں۔

> اس کے زمانے میں نواب آصف الدولہ نے امور سلطنت کی اصلاح کی کوشش کی، لیکن جب رنگیلے بادشاہ نے یہ گوارا نہ کیا تو نظام الملک مایوس ہو کر ۱۷۲۴ء میں دکن چلا گیا۔ وہاں حکومت آصفیہ کی بنیاد ڈالی اور اسلامی حکومت کی تباہی و بربادی سے جو کچھ بچ سکتا تھا، اسے محفوظ کر لیا۔☆۱۸

اس کے بعد مغلوں کی حکومت کا رعب و دبدبہ اور وقار روز بروز بگڑنے لگا ان حالات میں جاٹوں اور مرہٹوں نے بغاوتیں کیں۔

> ...اور بڑا ظلم یہ ہوا کہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ آ گیا۔ اس نے دل کھول دہلی کو لوٹا اور قتل عام کیا اور دہلی کا خزانہ خالی اور فوج منتشر کر کے واپس چلا گیا۔☆۱۹

محمد شاہ کی کم زوریوں اور عیاشیوں سے فائدہ اٹھا کر شمال سے پٹھانوں اور جنوب سے مرہٹوں نے بھی بغاوت کر دی اور پنجاب میں بہت بد نظمی پھیل گئی خاص طور پر نادر شاہ کے حملے کے بعد پنجاب بالکل تباہ و برباد ہو گیا۔ اور سکھوں نے بھی تنگ آ کر آزاد اور خود مختار ریاستیں قائم کرنا شروع کر دیں۔

> ... چناں چہ بنگال میں علی وردی خان، دکن میں نظام الملک اور اودھ میں برہان الملک سعادت خان عملی طور پر خود مختار ہو گئے۔☆۲۰

محمد شاہ ہی کے زمانے میں شاہ ولی اللہ نے اپنی اصلاحی تحریک کا آغاز کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں ان کا اہم کارنامہ قرآن شریف کا فارسی زبان میں ترجمہ کرنا ہے تا کہ لوگ قرآن کی تعلیمات کو سمجھ سکیں اور پھر ان پر عمل کریں انھوں نے معاشرے کی اصلاح کے لیے بہت سی تصانیف لکھیں جن کا مقصد معاشرے کی اصلاح کرنا تھا۔ اس زمانے میں شیعہ سنی اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ شاہ ولی اللہ نے ان کی اصلاح کے لیے بھی تصانیف لکھیں جس میں انھوں نے غیر جانب داری سے مذاہب کے فقہی مسائل کے بارے میں وضاحت کی۔

۱۷۴۸ء میں محمد شاہ کی وفات کے بعد احمد شاہ کا دورِ حکومت ۱۷۴۸ء سے ۱۷۵۴ء تک رہا۔ ان کے دور میں بھی نظام حکومت افراتفری کا شکار رہا، اور مسلمانوں کے مختلف فرقوں بالخصوص شیعہ سنی اختلافات شدّت اختیار کر گئے۔

> ایرانیوں کا سرگروہ برہان الملک ...اور تورانیوں کا سرگروہ نظام الملک کا پوتا شہاب الدین جس

نے مرہٹوں کو اپنے ساتھ گانٹھ کر طرح طرح کے مظالم کیے ۱۷۵۴ء میں احمد شاہ کو اندھا کیا اور
اس کی جگہ عالمگیر ثانی کو تخت پر بٹھایا...ایرانی اور افغان امرا نے احمد شاہ ابدالی سے شہاب الدین
اور اس کے ساتھیوں کی شکایت کی۔☆۲۱

عالمگیر ثانی نے ۱۷۵۴ء سے ۱۷۵۹ء تک حکم رانی کی۔ عالمگیر ثانی کے دور میں بھی احمد شاہ ابدالی نے حملے کیے جس میں اسے کبھی کام یابی اور کبھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، لیکن ان حالات کے نتیجے میں سلطنتِ مغلیہ کا نظام درہم برہم ہو گیا اور سکھوں اور مرہٹوں کی طاقت میں اضافہ ہو گیا۔

عالمگیر ثانی کے دور میں نواب بنگال سراج الدولہ کے درمیان جنگِ پلاسی کا عظیم سانحہ پیش آیا۔ اس جنگ میں میر جعفر نے سراج الدولہ کے ساتھ غدّاری کی اور لارڈ کلائیو کے ساتھ مل گیا۔ جنگ میں مسلمانوں کی ناکامی کے بعد بنگال انگریزوں کے قبضے میں آ گیا، اور انھوں نے میر جعفر کو بطور انعام بنگال کا نواب بنا دیا اور اس کے عوض میں ۲۵ پرگنے اور ایک کروڑ روپیہ اور قیمتی انعامات لیے اور جب میر جعفر میں تحائف دینے کی سکت نہ رہی تو میر جعفر کی جگہ میر قاسم کو نواب بنگال بنا دیا۔

جنگِ پلاسی کے بعد انگریزوں نے مغلوں کی کم زوریوں کو اچھی طرح بھانپ لیا تھا اور انھوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں خود مختار ریاستیں قائم کرنا شروع کر دیں۔

۱۷۴۳ء میں انھوں نے سندھ پر قبضہ کیا، ۱۷۹۹ء میسور پر، ۱۸۱۷ء تک مرہٹوں کی آزاد حکومتیں
ختم کر دیں، ۱۷۴۹ء میں سکھوں کو شکست دے کر پنجاب کا الحاق کیا اور ۱۸۵۲ میں اودھ
کا۔☆۲۲

عالمگیر ثانی کے بعد شاہ عالم ثانی کا دورِ حکومت ۱۷۵۹ء سے ۱۸۰۲ء تک رہا، عالمگیر ثانی سے شاہ عالم ثانی کے دور تک ملک کے اقتدار میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور انگریزوں نے تیزی سے ملک پر اپنا تسلّط قائم کیا۔

شاہ عالم ثانی کے دور میں میر قاسم اور مغلوں کی متحدہ فوج انگریزوں کے درمیان ۱۷۶۴ء میں جنگِ بکسر ہوئی۔ جس میں میر قاسم کے شکست کھانے کے بعد انگریزوں نے میر جعفر کو دوبارہ نواب بنا دیا اور اس سے ایسے احکامات جاری کروائے جن کی رو سے انگریزوں کو بغیر محصول کے تجارت کرنے کی اجازت مل گئی، اور الٰہ آباد، کڑہ کے علاقے بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے میں آ گئے، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی انگریزوں کے سپرد کرنی پڑی اور خود ''۲۶'' لاکھ روپے کا پنشنر ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد شاہ عالم ثانی نے مرہٹوں کے ساتھ اتحاد کر لیا جس کے نتیجے میں انگریزوں نے شاہ عالم کی پنشن بند کر دی۔

شاہ عالم ثانی کے بعد عبدالمظفر سراج الدین محمد ''بہادر شاہ ظفر'' کے لقب سے تخت نشین ہوئے ان کا دور شروع ہونے تک مغلیہ سلطنت تیزی سے زوال پذیری کی طرف بڑھ رہی تھی۔ برائے نام بادشاہ اور انگریزوں کے پنشن خوار ہونے

کے باوجود ان ے شاہانہ رکھ رکھاؤ میں کوئی کمی نہ آئی۔

بہادر شاہ ظفر کے دور کے سب سے اہم واقعہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی ہے۔جس کے پیچھے بہت سے مذہبی، سیاسی اور سماجی اسباب تھے۔جن کے خلاف مسلمانوں اور ہندوؤں نے بغاوت کی۔ان کی اس جرأت مندی کو انگریزوں نے ہندوستانیوں کی غدّاری کہا۔

جنگ کا اختتام ناکامی پر ہوا اور مغل حکومت نے اپنے زوال کا آخری مرحلہ بھی طے کر کے سلطنت کو انگریزوں کے حوالے کر دیا، اور پورے ملک پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

انگریزوں کی آمد:

برِصغیر میں مختلف زمانوں میں مختلف اقوام تجارت کی غرض سے آئیں۔

ابتدا میں عرب ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آئے تھے اور ان کا ہندوستان میں آنے کا مقصد صرف تجارت کرنا تھا۔یہاں کی سیاست سے انھیں کوئی دل چسپی نہ تھی اور نہ ہی ہو سکتی تھی۔عربوں کی تجارت کا مرکز مالا بار تھا۔اس زمانے میں مالا بار کی تجارت نے بہت ترقّی کی۔

> عربوں کی تجارت سے متاثر ہو کر یونانی اور یورپی اقوام نے ہندوستان سے اپنے تجارتی تعلّقات قائم کر لیے۔۱۴۹۹ء میں تجارتی سامان سے لدے ہوئے بحری جہازوں کے ساتھ واسکوڈی گاما کی لزبن سے واپسی نے ہندوستان سے یورپی ربط و ضبط کے دور کا آغاز کیا۔☆۲۳

اس کے بعد یہاں یورپی تاجروں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا پہلے تو ان یورپی اقوام نے ہندوستان سے اپنے تعلّقات جوڑے پھر یہاں پر قابض ہونے اور ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کی۔

یورپی اقوام میں سے سب سے پہلے پرتگالی ہندوستانی میں تجارت کی غرض سے آئے:

> ایک قلیل عرصے ہی میں پرتگالیوں نے گوا میں اپنی بود و باش کے لیے ایک مرکز قائم کیا۔☆۲۴

ہندوستان کی سمندری تجارت میں پرتگالیوں کا ایک سو سال تک قبضہ رہا،لیکن وہ یہاں اپنی سلطنت قائم نہ کر سکے اور نہ ہی ہندوستان کی سیاست میں حصّہ لے سکے۔انھوں نے صرف چند ساحلی بستیوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ان کے قبضہ میں ''گوا'' کا علاقہ تھا۔

سترھویں صدی میں پرتگالیوں کے بحری اور تجارتی اقتدار کو زوال آنا شروع ہو گیا۔اس کی کئی وجوہات تھیں،لیکن اہم

وجہ ان کا مسلمانوں کے ساتھ متعصبانہ رویہ اور عیسائی مذہب کی تبلیغ تھا۔

۱۶۳۲ء میں شہنشاہ شاہ جہاں نے ہگلی کے پرتگالیوں کی کارروائیوں کا قلع قمع کیا اور انھیں بنگال بدر کیا۔

پرتگالیوں کے زوال کا ایک اہم سبب اسپین اور پرتگال کا الحاق ہے جب اسپین ولندیزیوں اور انگریزوں کے ساتھ لڑ رہا تھا تو اس وقت پرتگال کو بھی اس لڑائی میں نقصان اُٹھانا پڑا۔ انگریزوں اور ولندیزیوں نے پرتگالیوں کو ہندوستان کی بندرگاہ سے نکال دیا۔

''سترھویں صدی کے وسط تک ایشیائی تجارت پرتگالیوں کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔''

انگریزوں اور ولندیزیوں نے مل کر پرتگالیوں کو ہندوستان سے نکالا تھا لیکن یہ زیادہ عرصہ مل کر نہ رہ سکے اور دونوں قوموں نے اپنی الگ الگ تجارتی کمپنیاں بنائیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی:

تمام یورپی تجارتی کمپنیوں کے مقابلے میں ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' نے زیادہ ترقی کی۔ ان کی کام یابی کی اصل وجہ ان کی محنت یا ذہانت نہ تھی، بلکہ مغلوں کی کمزوریاں اور ان میں اتحاد اور تنظیم کا فقدان کمپنی کی کام یابی کا سبب بنا۔

لندن کے تاجروں کی درخواست پر ۳۱ردسمبر ۱۶۰۰ء کو ملکہ الزبتھ نے شاہی فرمان کے ذریعے ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کو پندرہ سال کے لیے ہندوستان سے باضابطہ تجارت کی اجازت دی۔ ☆۲۵

ملکہ کے فرمان کا مقصد قوم کی ترقی، ملک کی فلاح، جہازوں کی تعمیر اور ذرائع آمدورفت کی توسیع قرار دیا۔ ☆۲۶

انگریزوں نے جہاں گیر کے زمانے میں ہندوستان میں تجارتی کوٹھیاں بنانا شروع کر دیں تھیں۔ انھوں نے سب سے پہلے سورت میں تجارتی کوٹھی قائم کی۔ اس کے بعد جیمز اول نے تھامس کی جہاں گیر کے دربار میں بھیجا۔

اس مدت میں شاہی فرمان کی رو سے انگریزوں کی تجارتی کمپنی کو سورت میں فیکٹری اور اس کے اردگرد فصیل بنانے کی اجازت مل گئی۔ ایک دوسرے فرمان کی رو سے جہاں گیر نے انگریزی کمپنی کو اپنی سلطنت میں تجارت کرنے کی اجازت دے دی۔ چناں چہ اس زمانے میں آگرہ، اجمیر، احمد آباد اور بھڑانچ میں انگریزوں کی تجارتی کوٹھیاں قائم ہو گئیں۔ ☆۲۷

اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہوئی تو ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان حالات سے بھرپور

فائدہ اُٹھایا کیوں کہ مرکزی حکومت تباہ ہوکر بالکل برائے نام رہ گئی تھی۔ایسٹ انڈیا کمپنی کے علاوہ یہاں کوئی اور یورپی کمپنی بھی نہ رہی تھی۔

اس طرح انگریزوں کا جب کوئی مدِ مقابل نہ رہا تو انھوں نے ان حالات سے فائدہ اُٹھایا اور یہاں کے سیاسی معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا۔ یہاں کے حکم رانوں کو بڑی ہوشیاری سے ایک دوسرے سے لڑایا، اور بالآخر مغلیہ سلطنت پر قابض ہو گئے۔انھوں نے ایک طرف تو مغلوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا اور دوسری طرف سراج الدولہ، حیدرعلی اور ٹیپو سلطان کی شکست کے بعد بنگال، بہار، اڑیسہ اور سرنگاپٹم پر بھی قبضہ کرلیا۔

مسلمان انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہوتے رہے، اور ایک وقت ایسا آیا جب مسلمانوں کو انگریزوں کی طاقت کو تسلیم کرنا پڑا۔انگریزوں نے اپنی طاقت بڑھانے کے لیے مسلمانوں پر ہر طرح کی سختیاں کیں اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے ہندوؤں، سکھوں اور مرہٹوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا مسلمان جو پہلے ہی کم زور ہو چکے تھے ان تینوں طاقتوں کا مقابلہ کرنا ان کے لیے بہت مشکل ہو گیا تھا۔

انگریزوں نے اپنی طاقت کو ابھارنے کے لیے مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی اور معاشرتی معاملات میں حد سے زیادہ دخل اندازی شروع کر دی اور ان سے ایسے کام کروانے شروع کر دیے جو ان کے مذہبی نظریات کے خلاف تھے۔کچھ عرصہ تک تو مسلمان سب کچھ برداشت کرتے رہے لیکن بعد میں ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کا واقعہ پیش آیا جس میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد مغلیہ سلطنت پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

اس طرح وہ انگریز جو ہندوستان میں پندرہ سالہ تجارتی معاہدے کے لیے آئے تھے یہاں کے حکم راں بن گئے۔

جنگِ پلاسی ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ، ۱۷۹۰ء اور ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کو میسور کی جنگوں میں شکست ہوئی اور پھر ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر کو شکست ہوئی۔

یہ تینوں جنگیں ایک صدی یعنی ۱۷۵۷ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک کے عرصے میں ہوئیں۔یہ دور مغلوں کے زوال کا تھا جو ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد شروع ہوا۔جس کے ذمّے دار اورنگ زیب کے نااہل اور عیاش جانشین ہیں۔

سراج الدولہ کی شکست:

صوبہ بنگال اورنگ زیب کی وفات کے بعد عملی طور پر خود مختار ہو گیا تھا۔۱۷۲۵ء سے ۱۷۳۰ء تک صوبے دار شجاع الدین یہاں کا حاکم رہا۔اس کے بعد اس کا بیٹا سرفراز خان صوبے دار بنا لیکن علی وردی خان نے ۱۷۴۰ء میں شکست دینے کے بعد ۱۷۵۶ء تک بنگال، بہار، اور اڑیسہ کا حکم راں رہا۔علی وردی خان نے بنگال کی اقتصادی، سماجی اور سیاسی حالت کو

بہتر بنایا، لیکن مرہٹوں کے بار بار حملے سے تنگ آ کر انگریزوں سے معاہدہ کرلیا اور ۱۲ لاکھ چوتھ اور اڑیسہ کا صوبہ انگریزوں کو دے دیا لیکن انگریزوں کو قلعہ بندیاں بنانے سے روکے رکھا۔

علی وردی خان کے انتقال کے بعد سراج الدولہ تخت نشین ہوا۔ انگریزوں نے سراج الدولہ کی تخت نشینی کے موقع پر رسمی تحائف نہیں بھیجے۔ ان کے اس رویّے سے ان کے دل میں تعصب اور نفرت کا جذبہ ظاہر ہوتا ہے۔

انگریز سراج الدولہ کے خلاف سازشوں میں شریک تھے۔

> کمپنی کے ملازم تاجرانہ مراعات سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے، سراج الدولہ کے خزانے پر کمپنی کی ان بداعمالیوں کا بہت برا اثر پڑا۔ انگریزوں نے کلکتہ کے نواب کو اجازت کے بغیر مستحکم کرنا شروع کر دیا۔ انگریزوں نے ڈھاکہ کے دیوان راج بلب کے بیٹے کرشن داس کو اپنے ہاں پناہ دی... کیوں کہ اس کا باپ ڈھاکے کا دیوان ہونے کی صورت میں انگریزوں کے لیے بے حد مفید ہوسکتا تھا۔ ☆۲۸

ان حالات میں سراج الدولہ نے ایک سچے محبِ وطن اور حاکم ہونے کی حیثیت سے انگریزوں کی سرکاری کاموں میں مداخلت کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔

> انگریزوں کو اپنی مملکت سے باہر نکالنے کے لیے سراج الدولہ قاسم بازار کی فیکٹری پر حملہ آور ہوا، اور پھر مرشد آباد پر بھی قبضہ کرلیا۔ ☆۲۹

جب اس بات کی خبر کلائیو کو پہنچی تو انھوں نے کلکتہ پر دوبارہ قبضہ کرلیا اور ہندوؤں سے بھی اتحاد کرلیا۔ اَمی چند نامی ایک ہندو تاجر نے میر جعفر سے سازباز کی اور سراج الدولہ کی معزولی کا منصوبہ بنایا۔

۱۷۵۷ء میں جنگِ پلاسی شروع ہوئی جس میں کلائیو کی فوج اور نواب سراج الدولہ کی فوج کا میر جعفر کی قیادت میں مقابلہ ہوا۔ میر جعفر نے منصوبے کے مطابق غداری اور جنگ میں حصہ لینے کے بجائے تماشائی بن کر کھڑا رہا۔ صرف چند سپاہی انگریزوں سے مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے جب کہ بیش تر مسلمان فوجی اس صورتِ حال سے حیران اور خوف زدہ ہو گئے اور جنگ میں حصہ نہ لے سکے، اور انگریزوں سے شکست ان کا مقصد بن گئی۔

> کلائیو نے ہندو سیٹھوں کے ذریعے نواب بنگال کے سپہ سالار اور افواج میر جعفر کے ساتھ سازش کر کے، جنگِ پلاسی میں سراج الدولہ کو شکست دی۔ اس کو قتل کیا اور غداری کے انعام میں میر جعفر کو بنگال کا نواب بنا دیا۔ ☆۳۰

انگریزوں نے میر جعفر کو اپنے وعدہ کے مطابق بنگال کا نواب بنا دیا لیکن میر جعفر نے نواب بننے کے بعد انگریزوں کا

ماتحت ہوگیا۔ انگریزوں نے اس سے بھاری رقمیں اور قیمتی انعامات لینا شروع کر دیے۔ انگریزوں کو جب یقین ہوگیا کہ اب خزانہ خالی ہوگیا ہے تو انھوں نے میر جعفر کو ۱۷۶۰ء میں معزول کر دیا اور اس کی جگہ میر قاسم کو نواب بنا دیا اور اس سے رقمیں وصول کرنا شروع کر دیں۔

جنگِ پلاسی میں انگریزوں کی فتح بہتر اسلحہ، اعلیٰ تدبیر، بہتر طریقِ جنگ یا شجاعت کی وجہ سے نہیں، بلکہ انگریزوں کی مکاری اور سازشوں کا نتیجہ تھی۔

اس فتح نے بنگال کو مکمل طور پر انگریزوں کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس کے ساتھ انگریزوں کو مسلمانوں کی غدارانہ ذہنیت اور ملّت فروشی کا بھی اندازہ ہوگیا اور اس کے بعد انگریزوں نے ہر لڑائی میں یہ حربہ استعمال کر کے فتح و کامرانی حاصل کی۔

ٹیپو سلطان کی شکست:

بنگال میں مسلم حکومت کی تباہی کے ساتھ ساتھ انگریزوں کی نگاہ دکن پر بھی تھی۔ کیوں کہ انگریز پہلے پہل مدراس ہی میں آئے تھے۔ دکن میں میسور کا بیدار مغز حکمراں حیدر علی انگریز حکومت کا سب سے بڑا رقیب تھا۔ حیدر علی نے میسور کی دونوں جنگوں میں مرہٹوں اور نظام دکن کی غداری کی وجہ سے شکست کھائی۔ ۱۷۸۰ء میں میسور کی دوسری جنگ جاری تھی لیکن حیدر علی کا انتقال ہوگیا۔

حیدر علی کی وفات کے بعد ٹیپو سلطان نے خود کو انگریزوں سے مقابلے کے لیے تیار کیا۔ ٹیپو سلطان اپنے والد حیدر علی کی طرح بہادر اور انگریزوں کا مخالف تھا۔ ایک طرف وہ فرانسیسیوں سے رابطے میں تھا تو دوسری طرف ملکی قوتوں سے معاملات کر رہا تھا۔ مگر نظام دکن اور مرہٹے اس کا ساتھ دینے کو تیار نہ تھے۔ اور ان ہی کی غداری کے سبب بالآخر ٹیپو سلطان کو شکست ہوئی۔

میسور کی تیسری لڑائی ۱۷۸۹ اور ۱۷۹۰ کے درمیان لڑی گئی۔ ☆۳۱

جنگ کا آغاز اس وقت ہوا جب ۱۷۸۸ء میں ٹیپو سلطان نے نظام سے گنتر کا علاقہ لے لیا تو نظام نے انگریزوں سے درخواست کی کہ گنتر کے کچھ علاقے ٹیپو سے لیے جائیں تو انگریزوں کی متحدہ کی مدد کی اور یہ بات ٹیپو سلطان کے لیے ناقابلِ قبول تھی لہٰذا اس نے انگریز اور نظام کی متحدہ افواج سے جنگ کی ٹھان لی۔

جنگ کے شروع میں تو ٹیپو سلطان نے انگریزوں کی متحدہ فوج کا ڈٹ کا مقابلہ کیا لیکن بعد میں وہ انگریز، نظام اور مرہٹوں کی فوج کا مقابلہ نہ کر سکا اور ٹیپو سلطان کو انگریزوں سے صلح کرنی پڑی۔ انگریزوں نے اس شرط پر جنگ بند کی کہ سرنگا پٹم کا نصف علاقہ انگریزوں کو دے دیا جائے گا۔

۲۳ فروری ۱۷۹۲ء کو 'معاہدہ سرنگا پٹم' ہوا۔ جس کی دو شرائط یہ تھیں:

۱۔ ٹیپو سلطان متحدہ طاقتوں (انگریز، نظام، مرہٹوں) کو چھ کروڑ روپیہ تاوانِ جنگ ادا کرے گا جس میں تین کروڑ نقد اور تین کروڑ کے عوض نصف ریاست دے گا۔

۲۔ تاوانِ جنگ کی ادائیگی تک ٹیپو سلطان اپنے دو بیٹے یرغمال کے طور پر انگریزوں کی تحویل میں دے گا۔☆۳۲

شرائط کی تکمیل کے بعد ریاست کا نصف حصّہ مسلمانوں اور نصف حصّہ انگریزوں کے حصّہ میں آیا۔ یہ انگریزوں کی بہت بڑی کامیابی تھی۔

مالا بار، کورگ ڈنڈی گل اور بارہ محل کے اضلاع انگریزوں کے قبضے میں آئے میسور کا جنوب مشرقی حصّہ نظام کو ملا۔ میسور کا شمال مغربی علاقہ مرہٹوں کے ہاتھ آیا۔☆۳۳

بظاہر تو انگریزوں نے اپنی شرائط منوانے کے بعد صلح کر لی تھی لیکن ان کے دل میں اب بھی مسلمانوں کے لیے حسد اور کینہ موجود تھا، اور وہ ٹیپو سلطان کو نقصان پہنچانے کے لیے منصوبے بنا رہے تھے ٹیپو سلطان بھی ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس لیے انھوں نے انگریزوں کو ملک سے نکالنے کے لیے کوششیں جاری رکھیں۔

۱۷۹۸ء میں ولزلی کمپنی کے مقبوضات کا گورنر جنرل بن کر آیا۔

وہ اپنے ساتھ پٹ کا قانون بھی لایا تھا اس کو تاریخ میں ''ذیلی تنظیم'' کا نام دیا گیا۔ اس میں اہم نکات یہ تھے:

۱۔ ہندوستانی ریاستیں اپنی فوج ختم کر دیں ان کی جگہ انگریزی فوجیں رکھی جائیں۔

۲۔ انگریز فوج کے مصارف ریاستیں برداشت کریں۔

۳۔ انگریزی فوج کے مصارف ریاستیں برداشت کریں۔

۴۔ کسی غیر برطانوی فرد کو اپنے ہاں ملازمت نہ دی جائے۔☆۳۴

ان شرائط سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز مسلمانوں کو سلطنت سے بالکل بے دخل کرنا چاہتے ہیں۔ ٹیپو سلطان جیسے جرأت مند اور حب وطن کے لیے ان شرائط کو ماننا ممکن نہ تھا جب ٹیپو سلطان نے ان شرائط کو ماننے سے انکار کیا ولزلی کو یہ بات سخت ناگوار گزری اور اس نے ٹیپو سلطان کے خلاف جنگ کرنے کا منصوبہ بنایا۔

بہادر شاہ ظفر کی شکست:

اورنگ زیب کی وفات کے بعد شاہ عالم اوّل سے لے کر عالمگیر ثانی تک جتنے بھی بادشاہ گزرے وہ پریشان حال

ہونے کے باوجود خود مختار سمجھے جاتے تھے۔شاہ عالم ثانی کے زمانے سے لے کر مغل حکومت کی تاریخ زوال تک، ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔جس کے مطابق مغل حکمراں انگریزوں کے پنشن خوار بن گئے۔شاہ عالم ثانی اکبرشاہ ثانی اور پھر اس کے بعد بہادر شاہ ظفر نے بھی انگریزوں کے پنشروں کی حیثیت سے اپنی برائے نام حکومت کو چلایا۔

بہادر شاہ ظفر کی حیثیت سے اگر چہ ایک پنشن خوار کی لیکن عوام ان کی حیثیت جاننے کے باوجود بادشاہ کی عزت کرتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر نے اپنی کم مائیگی کے باوجود رہن سہن کے طور طریقوں میں شاہانہ روش اختیار کی اور ان اخراجات کے پورا کرنے کے لیے اس نے پہلے قرض اور پھر نذرانوں کا سہارا لیا، لیکن پھر بھی ملک کی ترقی اور استحکام کے لیے کچھ نہ کرسکا حالاں کہ انھیں انگریزوں سے کافی پیسا ملتا تھا۔

> فقط ایک لاکھ روپیہ ماہوار تو سرکارِ انگریز سے آتا تھا اور کسی قدر پرگنات ومحلات وتہہ بازی، کرایہ کی دکانیں، آمدنی دباغات سے وطہول ونزول وغیرہ کی آمدنی تھی، من کل الوجود سوالاکھ روپیہ تصوّر کر لینا چاہیے۔☆۳۵

اس کے باوجود بادشاہ کے اخراجات پورے نہ ہوتے تھے اور اسے امرا اور عوام سے بھی قرضے لینے پڑے، اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ:

> بادشاہ کے قرض مانگنے سے لوگ اس قدر پریشان ہوگئے تھے کہ اپنی دولت مندی کا اظہار کرتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں بادشاہ قرض نہ مانگ لیں۔☆۳۶

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے پیچھے ایک زبردست جوش اور جذبہ کارفرما تھا، اس لیے کہ اس بغاوت کا براہ راست تعلق ہندوستان کی تہذیبی، سماجی اور اقتصادی اور مذہبی زندگی سے تھا۔ ملک کے مختلف طبقوں نے اپنے اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے اس بغاوت میں حصہ لیا تھا۔اس انقلاب میں فوجی طبقہ کے علاوہ حکمراں طبقہ، ملازم پیشہ لوگ اور علما بھی انگریزوں کے خلاف متحد ہوگئے۔

بقولِ تھامس رو:

> دختر کش راجپوت، کٹر برہمن، متعصب مسلمان اور عیش پسند تو ندوالا من چلا مرہٹہ، سبھی اس جہاد میں شامل ہوگئے۔ گائے کا قاتل اور گائے کا پجاری، خنزیر سے کراہیت رکھنے والا اور خنزیز کا گوشت کھانے والا، لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ کا کلمہ پڑھنے والا اور برہم کے منتروں کو گنگنانے والا، سبھی نے مل کر بغاوت کی۔☆۳۷

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کا واقعہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی انگریزوں کے خلاف شدید نفرت اور اختلافات کا نتیجہ تھا۔ جس کی کئی وجوہات تھیں جو کمپنی کے اختیارات میں اضافہ کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئیں، اور بالآخر ہر شعبہ میں ہندوستانی

انگریزوں سے پیچھے رہ گئے۔

مغلوں کے دورِحکومت میں سرکاری زبان فارسی تھی لیکن انگریزوں نے اپنا تسلّط قائم کرنے کے بعد فارسی کی جگہ انگریزی زبان کو سرکاری زبان قرار دے دیا اور فیصلہ کیا کہ انگریزی ہی کو ذریعۂ تعلیم بنانا چاہیے۔ اگر چہ دیسی زبان میں بھی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت تھی لیکن:

> مشرقی زبانوں کی درس گاہوں کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا کہ اگر کچھ طالب علم ان میں خود آئیں تو انھیں روکا نہ جائے، لیکن دورانِ تعلیم ان طلبہ کی مالی امداد نہ کی جائے۔☆۳۸

انگریزوں نے اپنی زبان کی ترویج کے لیے ایک اور چال یہ چلی کہ ملازمت حاصل کرنے ے لیے انگریزی زبان جاننا ضروری قرار دیا۔ ہندوستانیوں اور خاص طور پر مسلمان جو ہندوؤں بہ نسبت انگریزی سے زیادہ ناواقف تھے، کے لیے انگریزوں کا یہ فیصلہ بہت نقصان دہ ثابت ہوا، کیوں کہ ہندو اپنے آباو اجداد کے پیشے کو اختیار کرتے تھے۔ برہمن، ویش، کھتری اور شودروں کو اپنے موروثی پیشے کو ہی اختیار کرنا ہوتا تھا۔

انگریزی زبان کی ترویج کے ساتھ انھوں نے عیسائی مذہب کی بھی تبلیغ شروع کر دی اور عیسائی پادری صرف اپنے مذہب کی تبلیغ ہی نہ کرتے، بلکہ ہندو اور مسلمان کے مذہب کا بھی مذاق اُڑاتے۔

> مشنری اسکول شہروں اور دیہاتوں میں اکثریت سے کھولے گئے اور انگریز حکام ترغیب دیتے تھے کہ لوگ اپنے بچّوں کو ان میں بھیجیں۔ مذہبی کتابوں میں امتحان ہوتا تھا اور کم عمر بچّوں سے اس قسم کے سوالات کیے جاتے تھے۔ تمھارا خدا کون ہے؟ تمھارا نجات دلانے والا کون ہے؟ اور بچے عیسائی مذہب کے موافق جواب دیتے تھے اس پر ان کو انعام ملتا تھا۔☆۳۹

عیسائی مذہب کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ انگریزوں نے ہندو مت کی بعض رسمیں بھی ختم کر دیں تھیں جن میں ستی کی رسم اور ہندوؤں کو چھوت چھات اور ساتھ کھانے پینے بیوہ کی دوسری شادی کی اجازت دینا تھا۔

مذہبی معاملات کے علاوہ سیاسی اور مالی طور پر بھی انگریز مستحکم ہونے کی وجہ سے مسلمانوں اور ہندوؤں کو بہت پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ سندھ اور پنجاب پر قبضہ کرنے کے بعد اودھ پر بھی انگریزوں نے اپنا قبضہ جما لیا۔ اس طرح اودھ کے لوگ بھی انگریزوں کے مخالفین میں شامل ہو گئے۔

تجارت کی نوعیت بھی یکسر بدل گئی۔ ۱۸۱۳ء تک ہندوستان زیادہ مال برآمد کرنے والا ملک تھا لیکن اب درآمد کرنے والا ملک بن گیا۔ ہندوستان میں انگلستان کی چیزیں زیادہ نظر آنے لگیں جو برائے نام تجارتی ٹیکس دینے کے بعد ہندوستان میں بھیجی جاتیں جب کہ ہندوستان سے کوئی بھی چیز دوسرے ملکوں میں نہ بھیجی جاتی اگر بھیجی جاتی تو بہت کم قیمت پر۔ اس طرح تاجر

طبقہ بھی انگریزوں سے ناخوش ہوگیا۔

فوج کو اپنی تنخواہ اور شرائطِ ملازمت کے متعلق شکایتیں تھیں۔

مندرجہ بالا اسباب کے علاوہ جنگِ آزادی کے اور بھی کئی اسباب تھے جس کی وجہ سے ہندوستانی عوام جنگ کے لیے مجبور ہوئی۔

جنگ کی ابتدا اس وقت ہوئی جب ہندو اور مسلمان فوجیوں کو مبینہ طور پر گائے اور سور کی چربی والے کارتوس استعمال کرنے پر مجبور کیا گیا۔ یہ بات چوں کہ مسلمانوں اور ہندو دونوں کے مذہبی عقائد کے خلاف تھی اس لیے ان کے انکار کرنے کے باوجود انگریزوں نے اپنی بات منوانی چاہی تو ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگا اور اپنے مذہب کے دفاع کے لیے انھیں بغاوت کرنا پڑی۔

> ہنگامے کی ابتدا تو تقریباً ۲۶ فروری ۱۸۵۷ء کو ہو چکی تھی یعنی اس وقت جب بیرک پور کی ۱۹ نمبر پلٹن نے چربی والے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کردیا۔ ۲۶ مارچ ۱۸۵۷ء کو منگل پانڈے کے خون میں جوش آیا اور اس نے میجر ہڈسن کو گولی کا نشانہ بنایا اور ساتھ ہی لیفٹنٹ واگھ کو بھی ختم کر دیا۔ اپریل کے مہینے میں میرٹھ، انبالہ اور لکھنؤ وغیرہ میں بہت سے انگریزوں کے مکانات جلا دیے۔☆۴۰

ان واقعات کا انگریزوں پر کوئی اثر نہیں ہوا اور انگریز ہندو اور مسلمانوں کو وہی کارتوس استعمال کے لیے، دیتے رہے جو ہنگامے کا باعث بنے تھے۔

ایک بار پھر ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان جھگڑا ہوا اور دونوں مخالفین اپنے اپنے مقصد کی کامیابی کے لیے مقابلہ کرتے رہے۔

بہادر شاہ ظفر ان تمام ہنگاموں سے بےخبر تھے۔ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کی صبح کو جب انقلابی شاہی قلعے کے باہر جمع ہوئے تاکہ بہادر شاہ ظفر کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کریں اور اپنی قیادت کے لیے آمادہ کریں۔

بہادر شاہ ظفر اپنی کم زوریوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ انگریزوں کے خلاف ایسا قدم نہیں اُٹھانا چاہتے تھے جس کا انجام مسلمانوں کی تباہی و بربادی پر ہو۔ فوج کی بغاوت انھیں محض نادانی اور جذباتی فیصلہ لگا انھوں نے اپنی تقریر میں کہا:

> سنو بھائی! مجھے بادشاہ کون کہتا ہے، میں تو فقیر ہوں، ایک تکیہ بنائے ہوئے اپنی اولاد کے لیے بیٹھا ہوں۔ یہ بادشاہت تو بادشاہوں کے ساتھ گئی... میں تو ایک گوشہ نشین آدمی ہوں مجھے ستانے کیوں آئے ہو! میرے پاس خزانہ نہیں کہ میں تم کو تنخواہ دے سکوں گا میرے پاس فوج نہیں کہ میں تم کو امداد کروں گا۔ میرے پاس ملک نہیں کہ تحصیل کر کے تمھیں نوکر رکھوں گا میں

کچھ نہیں کر سکتا، مجھ سے کسی طرح کی توقع استطاعت کی نہ رکھو۔ ☆۴۱

فوج کے اصرار پر بادشاہ کو ان کی بات ماننی پڑی لیکن بہادر شاہ ظفر کے تمام اندیشے درست ثابت ہوئے، اور مسلمانوں کو شکست کا سامنا پڑا۔ جس کے نتیجے میں وہ جان مال اور اپنی سلطنت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

دراصل جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء بلا سوچے سمجھے اور غیر منظم انداز میں شروع ہوئی جنگ لڑنے کے لیے انقلابیوں کے پاس جوش و جذبہ تو تھا لیکن نہ تو ان کا کوئی رہنما تھا اور نہ ہی جنگ لڑنے کے لیے ان کے پاس جدید ہتھیار تھے۔

جنگ کرنے والے سارے انقلابی سچے محبِ وطن نہ تھے، بلکہ بعض انگریزوں کے جاسوس تھے اور کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس غرض سے جنگ میں شامل ہوئے تھے کہ لوٹ مار کر سکیں۔ مسلمان جو پہلے ہی سے کم زور تھے۔ اس میں جب غدار شامل ہو گئے تو بدنظمی اور بڑھ گئی۔ بادشاہ کی مالی حالت جاننے کے باوجود فوجی بار بار تنخواہوں کا مطالبہ کرتے۔ انھیں اپنے فرض سے زیادہ اپنی تنخواہ کی فکر تھی۔ جنگ کے بیش تر شریک اپنی اپنی خواہشات کے اسیر تھے، اور مختلف مذہبی اور سیاسی گروہ اپنی اپنی من مانی کر رہے تھے ان میں رابطے کا فقدان تھا۔

یہی وجہ ہے کہ اس انقلابی تحریک کا انجام ناکامی پر ہوا۔

جنگ میں ناکامی کے بعد مسلمانوں پر ہر قسم کے ظلم ڈھائے گئے۔ بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر کے رنگون بھیج دیا جہاں بہت اذیت ناک زندگی گزارنے کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

❀ ❀ ❀

ب: جنوبی ایشیا کی معاشرتی ساخت

رعایا کے مختلف طبقات:

سرزمین ہندوستان میں مختلف زمانوں میں بھیل گونڈ، کال منگول، دراوڑ، آریا، یونانی، یوجی، ہن، مسلم اور یورپی اقوام آ کر آباد ہوئیں۔ یہ اقوام اپنے ساتھ اپنا مذہب، تہذیب اور تمدن بھی لے کر آئیں۔ ان اقوام نے یہاں آباد ہونے کے بعد نہ صرف ہندو اقوام کے مذہبی اور تہذیبی اثرات کو قبول کیا، بلکہ ہندوؤں پر بھی اپنے مذہبی اور تہذیبی اثرات ڈالے۔ اس کے علاوہ ہندومت کے خلاف تحریکیں بھی چلیں جس کے نتیجے میں جین مت، بدھ مت وجود میں آئے۔

ہندوؤں نے جب محسوس کیا کہ ان کے بعض مذہبی عقائد، رسوم و رواج اور سخت پابندیوں کے باعث لوگ بدھ اور جین دھرم کو قبول کرتے جا رہے ہیں تو ہندومت نے اپنے سخت رویّہ میں لچک پیدا کی اور ذات پات کے شدید بندھنوں کو کچھ اس طرح نرم کیا کہ بدھ اور جین مت ہندو دھرم کا حصہ بن گیا۔ بعد میں جب مسلمان حملہ آور ہندوستان میں داخل ہوئے تو یہی مسئلہ دوبارہ پیدا ہوا۔ مسلمانوں کے توحید کے عقیدے، مساوات اور حقوق العباد پر عمل کے نتیجے میں بکثرت لوگ اسلام قبول کرنے لگے چناں چہ ہندو دھرم نے ایک بار پھر برہمو سماج، آریا سماج، کبیر پنتھی اور دیگر شکلوں میں اسلامی عقائد کے لیے نرم گوشے پیدا کیے اور یوں ہندو دھرم کو اسلام کی مؤثر یلغار سے محفوظ رکھا۔

یورپین اقوام کی جنوبی ایشیا میں آمد کے موقع پر عیسائی مبلغوں کی مساعی کی روشنی میں جب یہی صورتِ حال پیدا ہوئی تو ہندو دھرم کو ایک بار پھر اپنے موقف اور نظام پر نظرِ ثانی کرنی پڑی۔

آریا مذہب، یا ہندومت (ویددھرم):

ہندومت کا شمار دنیا کے قدیم ترین مذاہب میں ہوتا ہے، جو آریا قوم کا مذہب تھا۔ آریاؤں سے پہلے ہندوستان میں دراوڑی قوم آباد تھی۔ یہ لوگ بھی بتوں کی پوجا کرتے تھے لیکن ذات پات کی تفریق سے آزاد تھے۔

جب آریا ہندوستان میں آئے تو دراوڑی اقوام میں خاص ضعف پیدا ہو چکا تھا۔ اس لحاظ سے وہ غالباً دوسری ہزار دیں صدی قبلِ مسیح کے نصف اوّل میں آئے ہوں گے اور شمال ہند میں پھیل

گئے ہوں گے۔ ☆۴۲

ابتدا میں آریا مذہب سیدھا سادہ تھا یہ لوگ مختلف مظاہر قدرت کی پوجا کرتے تھے، اور مختلف مظاہر قدرت کو مختلف کاموں کا دیوتا مقرر کیا ہوا تھا، مذہبی رسوم بہت زیادہ ہوتی تھیں انھیں یاد رکھنا چوں کہ مشکل تھا اس لیے یہ کام ''پروہتوں'' کے ذمے ہوتا تھا۔

آریاؤں کا تعلق ہندومت سے تھا ان کی مذہبی تعلیمات کے لیے مختلف تصانیف تھیں ان کی یہ کتابیں ''وید'' کہلاتی تھیں۔

آریاؤں کے مذہبی ارتقا میں ویدوں کی تصنیف سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے وید کے لفظی معنی ''مقدس علم'' کے ہیں ویدوں میں قربانی اور عبادت کا ذکر ہے وید چار ہیں: رگ وید، سام وید، یجر وید، سام وید۔ ☆۴۳

ہندوؤں کے نزدیک یہ چاروں کتابیں الہامی کتابیں ہیں جو آریا رشیوں پر نازل ہوئیں الہامی کتابیں سمجھنے کی وجہ سے ہندو ان کتابوں کو مقدس کتابیں کہتے ہیں۔

ہندوؤں میں تصوّرِ خدا:

آج جو لوگ ہندو کہلاتے ہیں ان میں دوسو سے زیادہ فرقے ہیں اور دیومالا بے شمار دیویوں اور دیوتاؤں پر مشتمل ہے۔ ان میں چھوٹے اور بڑے دیوتا موجود ہیں اور ان کی بڑائی کے حساب سے ان دیوتاؤں کو کم اور زیادہ اختیارات حاصل ہیں۔

رِگ وید میں مختلف دیوتاؤں کا ذکر کیا ہے اور انھیں مختلف درجے دیے گئے ہیں:

...مثلاً آگ کا دیوتا اگنی تھا، اندر بارش کا اور گرج کا دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح ہوا اور آسمان کے بھی جداگانہ خدا تھے جو علی الترتیب وایو اور ورونا کہلاتے تھے۔ ان کے یہاں دیوتاؤں کی مورت بنانے کا رواج نہ تھا۔ ☆۴۴

ویدک دور میں مظاہر فطرت کی عبادت کی جاتی تھی، لیکن بعد میں اس میں تبدیلی کر دی گئی، اور ہندوؤں کے تین بڑے خدا یعنی برہما، وشنو اور شیو مقرر ہوئے۔

ہندوؤں کی آسمانی کتابوں کی رُو سے ابتدا میں صرف ایک روحِ عالم تھی جسے ''تری مورتی''، یعنی ایک خدا میں تین (تثلیث) کہا جاتا تھا۔ (۱) برہما: خالق (۲) وشنو: جلانے والا، پالنے والا۔ (۳) شیو: مارنے والا، فنا کرنے والا۔ ☆۴۵

ہندومت کے مطابق:

برہما نے سب سے پہلے وجودِ منو کی تخلیق کی۔منو کے سر سے سب سے اعلیٰ اور سب سے پاک لوگ ’’پروہت‘‘ گرو پیدا ہوئے جو برہمن کہلائے منو کے بازوں سے سورما اور جنگجو پیدا ہوئے جو کشتری کہلائے پھر منو کے پیٹ اور زانو سے ’’ویش‘‘ تجار اور سوداگر پیدا ہوئے اور منو کے پیروں سے شدر، غلام، کمین اور خدمت کرنے والے لوگ پیدا ہوئے۔☆۴۶

ہندو حیات بعد الموت پر یقین رکھتے تھے۔رگ وید میں انھوں نے اس عقیدہ کو واضح انداز میں بیان کیا ہے:

جو لوگ دنیاوی زندگی میں دیوتا کی عزت کرتے ہیں وہ نیک ہیں اور مرنے کے بعد مردوں کے بادشاہ ’’یاما‘‘ کی ماتحتی میں وہ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوں گے۔☆۴۷

ہندوؤں کا ایک اور عقیدہ یہ بھی ہے کہ:

برہما نے سارے دیوتاؤں کو پیدا کیا جو اس زمین پر اپنے اپنے خاندانوں کے ساتھ رہا کرتے تھے۔اس کے بعد برہما نے انسانوں کو پیدا کیا اور دیوتا اس زمین کو چھوڑ کر دوسری دنیا میں چلے گئے۔البتہ تینوں اصلی دیوتا موجود ہیں بیویاں دنیا میں موجود ہیں۔ان کی پوجا کرتے اور ان کی رضامندی حاصل کر کے انسان خوش رہ سکتا ہے وہ مرنے کے بعد جب دوسرے جنم میں جائے گا تو اسے کوئی تکلیف نہیں اٹھانی پڑے گی، اور پھر دوسرے جنم میں بھی اچھے کام کیے تو مرنے کے بعد روحِ اعظم سے مل کر اس میں انضمام پا جائے گا، جیسے سمندر میں پانی کا قطرہ مل کر اپنی ہستی ختم کر دیتا ہے، اور اس طرح ’’مکتی‘‘ یعنی نجات پا جائے گا۔☆۴۸

برہما عہد میں ہندومت میں پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں، گھٹیا اور سطحی قسم کے خیالات میں اضافہ ہوا۔قربانی کا طریقہ اتنا پیچیدہ ہو گیا کہ اسے یاد رکھنا عام انسان کی بس کی بات نہ رہا، قربانی کی حیثیت سحر فسوں سی ہو گئی۔

نتیجتاً ماہرین کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جو بہت با اقتدار تھا اس نے خود کو ’’انسانی دیوتا‘‘ ہونے کا دعویٰ کر دیا۔پھر سحر و افسوں کی مقبولیت نے اس گروہ کے اقتدار میں اضافہ کر دیا۔☆۴۹

برہمن عہد میں پڑھنے لکھنے کا رواج نہ تھا۔پڑھے لکھے لوگ عام طور پر ’’برہمن‘‘ ہی ہوا کرتے تھے۔اس خصوصیت کی وجہ سے برہمنوں میں احساسِ برتری شدت اختیار کر گیا اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب بادشاہ بھی ان کی حاکمیت تسلیم کرنے بھی مجبور ہو گئے۔

ابتدا میں دیگر رعایا کی طرح بادشاہوں کے ماتحت اور دست نگر تھے، لیکن بتدریج حصولِ اقتدار میں کامیاب ہو گئے۔بادشاہ بھی ان کے زیرِ اثر آ گیا۔☆۵۰

ویدک عہد میں ذات پات کا نظام اٹوٹ قرار دے دیا گیا۔ ذات کو موروثی حیثیت حاصل ہوگئی۔ برہمنوں نے اپنی برتری کو مذہبی رنگ دے دیا۔ مذہبی تعلیمات پر ایمان لانا ہر ہندو کا فرض تھا لیکن ویدوں کو سننے کا حق صرف برہمن کو حاصل تھا۔ ذات پات کی تقسیم سے ادنیٰ اور اعلیٰ عوام میں جو فرق پیدا ہوا اس سے سب سے تکلیف ادنیٰ ذات کے ہندوؤں اور خواتین کو ہوئی۔

> اس معاشرے میں عورت کو مرد کی ملکیت تصوّر کیا جاتا لیکن وہ مرد کی میراث کی حق دار نہ تھی، بلکہ اس کی حیثیت ایک جائیداد جیسی تھی جس کو مرد اپنی خواہشات کے مطابق تصرف میں لاتا اور سب سے بڑا ظلم یہ تھا کہ کوئی فرقہ برہمن کے برابر نہ تھا لیکن اگر برہمن کسی بھی ذات کی عورت کا ہاتھ پکڑ لے تو وہ اس کی ملکیت ہو جاتی تھی۔☆۵۱

ہر طبقے کے فرد کا مندر الگ تھا، اور ایک طبقے کا فرد دوسرے طبقے کے مندر میں نہیں جا سکتا تھا۔ ہندو عقیدے میں جہاں دیوتاؤں اور دیویوں کی پوجا کی جاتی تھی۔ وہاں وہ اپنے گھٹیا خیالات کے مطابق انسان کے جنسی اعضا کو بھی مقدس جان کر اس کی پرستش کرتے تھے۔

> عورت اور مرد کے اعضائے تناسل کی پوجا کی جاتی اور ان اعضا کو مقدس تصوّر کیا جاتا۔ یہاں تک کہ سال میں ایک مرتبہ خاص موقع پر تمام لوگ اکٹھے ہوتے اور اپنی جنسی تسکین کی تکمیل کے لیے مذہب کے نام پر سب کچھ کر ڈالتے اور اس دوران ماں، بہن اور بیٹی کے کسی رشتے کا کوئی خیال نہ رکھا جاتا۔☆۵۲

ذات پات کی تفریق اور دوسری رسموں میں پیچیدگی کی وجہ سے ادنیٰ ذات کے لوگوں میں پروہت اور برہمنوں کے خلاف نفرت اور بیزاری کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ اس کے ردِعمل میں اپنشد (یعنی راز و نیاز کی باتیں) کی فلسفیانہ کتابیں تحریر کی گئیں۔ اس طرح نویں اور آٹھویں صدی قبلِ مسیح میں ایک نئی روحانی زندگی کا آغاز ہوا۔

جین مت:

''اُپنشد'' کی تعلیمات میں کچھ نظریات تو نئے تھے، لیکن بیش تر تصورات برہما ہی کے تھے اپنشد کی فلسفیانہ اور پیچیدہ تعلیمات کی وجہ سے لوگوں نے اس کی بھی مخالفت کی۔ اس طرح اپنشد کے ردِعمل کے طور پر ''جین مت'' وجود میں آیا۔ اپنشد اور برہمنیت کے خلاف جن مصلحین نے تحریکیں چلائیں اور اپنے نظریات پیش کیے ان میں وردھمان کا نام قابلِ ذکر ہے جسے اس کے پیروکار مہاویر (بڑا ویر) کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

جین اپنے مذہب کو بہت قدیم بتاتے ہیں ان کے مذہبی رہنما تِرتھنکر کہلاتے ہیں اپنے مذہب کے بارے میں جینیوں کا کہنا ہے:

ان کا مذہب کروڑہا سال سے موجود ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ چوبیس ترتھنکر (پیغمبر) گزرے ہیں۔ سب سے پہلا آدی ناتھ اور سب سے آخری مہابیر سوامی (۵۴۰ ق م تا ۴۶۷ ق م) ہیں۔☆۵۳

اس مذہب کا نام ان صوفیوں (جینا) پر رکھا گیا جنھوں نے اپنی تمام خواہشات پر قابو پالیا تھا۔☆۵۴

پہلے پہل مہاویر نے ایک مرتاض گروہ نِرگرنتھ (بندھنوں سے آزاد) کی مشقوں پر عمل کیا۔ مسلسل ریاضتوں، مراقبوں اور سخت مشقوں کے بعد اس نے اپنے راز کو پالیا۔

لوگوں میں جین مت مقبول ہونے کی بنیادی وجہ ذات پات کی پابندیوں سے آزادی تھی۔

مہابیر ذات کی تفریق اور بت پرستی پر عقیدہ نہیں رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک عبادت اور قربانی کے ذریعے کوئی نیکی نہیں حاصل کی جا سکتی۔ ان کے یہاں نروان کے حاصل کرنے کا ذریعہ نیک عملی ہے، لیکن نیک بننے کے لیے کسی خارجی چیز کی ضرورت نہیں، بلکہ اس کے محرکات خود انسان کے اندر موجود ہیں۔☆۵۵

مہابیر نے اپنی مذہبی تعلیمات میں زندگی کو مصائب کا سرچشمہ بتایا اور ہر مصیبت کا اصل سبب خواہشات کو بتایا، نجات اور جنت حاصل کرنے کے لیے خود کو خواہشات سے پرہیز کرنے کی تلقین کی۔

مہابیر نے ترکِ خواہشات کے علاوہ جین مت کے مندرجہ ذیل پانچ اصول بتائے:

اوّل: یہ کہ کسی ذی روح کو قتل نہ کیا جائے۔ کسی کو زبان یا ہاتھ سے تکلیف نہ پہنچائی جائے۔

دوم: چوری سے پرہیز کیا جائے۔

سوم: جھوٹ سے باز رہا جائے۔

چہارم: پاک دامنی کی زندگی بسر کی جائے اور نشی اشیا کے استعمال سے باز رہا جائے۔

پنجم: کسی چیز کی لالچ یا تمنا نہ کی جائے۔☆۵۶

ہر جینی راہب کے لیے ان اصولوں کی پابندی لازمی ہوتی ہے۔ یہ سادہ تعلیمات ہندو تعلیمات سے بے تعلّق ہیں اور ان کا منبع وید نہیں جینی رشیوں کے اقوال ہیں۔

جین مت میں تمام اصولوں کے مقابلے میں اصول اہنسا پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے یعنی کسی جان دار کو قتل کرنا گناہ قرار دیا گیا ہے۔اس لیے گوشت کھانا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

... چناں چہ جینی پانی کو چھان کر پیتے ہیں، ننگے پاؤں پھرتے ہیں اور چلتے وقت زمین کو صاف کرتے جاتے ہیں۔مُنہ پر کپڑا رکھتے ہیں تا کہ کوئی جان دار چیز اندر نہ چلی جائے۔مہاویر نے اس معاملے میں اس قدر غلو کیا کہ اس نے کہا کہ نباتات اور جمادات میں بھی روح موجود ہے اور انھیں بھی تکلیف کا احساس ہوتا ہے۔☆۵۷

جین مت میں تصورِ خدا نہ تھا، بلکہ تخلیقِ کائنات کے بارے میں ان کا نظریہ تھا کہ:

کائنات ابدی ہے۔ اس کا وجود بے شمار دائروں میں منقسم ہے۔ ہر دائرے میں عروج (اُتسر پنی) اور زوال (اَوَسر پنی) کے ادوار ہوتے ہیں۔ ہر دور اپنے آخری دور کی مانند ہوتا ہے اور اس میں چوبیس تِرتھنکر اور بارہ آفاقی شہنشاہ (چکرورتن) آتے ہیں مجموعی طور پر تریسٹھ عظیم انسان (سالک عظیم) باقاعدہ وقفوں سے، ہر دائرے کے دوران آکر رہتے ہیں۔☆۵۸

جینی روحوں پر یقین رکھتے ہیں۔کائنات کی روحوں کے بارے میں ان کا کہنا ہے:

مہاویر کے مرنے کے بعد جین مت دو گروہوں میں تقسیم ہو گیا۔

شمالی علاقوں میں پیچھے رہ جانے والے راہبوں کے رہنما ستھول بھدر نے قحط کی گڑ بڑ اور تکلیفوں کے پیشِ نظر اپنے پیروکاروں کو سفید لباس پہننے کی اجازت دے دی۔ یہاں سے جین مت کے دو فرقے وجود میں آ گئے۔ ایک دِگمبر (خلد پوش یعنی ننگے) اور دوسرا سویمبرا یعنی سفید پوش۔☆۵۹

جین مت اپنے سخت اصولوں کی وجہ سے ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں نہ پھیل سکا۔

جین مت کے نظریات کے مطابق ان اصولوں پر عمل نہ کرنے کی صورت میں نجات حاصل کرنا ممکن نہیں۔اور خاص طور پر مکمل نجات حاصل کرنے کے لیے جینی راہب کا برہنہ رہنا لازمی قرار دیا گیا ہے۔

سخت اصولوں کی وجہ سے جینی کوئی پیشہ اختیار کرنے سے قاصر ہیں، مثلاً:

وہ زراعت سے اِس لیے پرہیز کرتے تھے کہ زمین پر ہل چلانے سے حشرات الارض کے ہلاک ہو جانے کا اندیشہ تھا۔بھٹی کے کام سے اس لیے ان کو دور رہنا پڑتا تھا کہ اس سے بھی غیر مرئی

جراثیم ہلاک ہوجاتے ہیں۔☆۶۰

اگر ان اصولوں پر مکمل عمل کیا جائے تو نہ صرف کاروبارزندگی معطل ہوجائے، بلکہ انسان بھوک سے مرجائیں جین مت کے ہاں پیدائش اور موت کے رسم ورواج وہی ہیں جو ہندومت میں رائج ہیں۔

جین مت میں خدا کا تصوّر موجود نہیں تھا لیکن جب لوگوں نے اس تصوّر کو زیادہ پسند نہ کیا تو جینیوں نے مہاویر کا مجسمہ بنا کر مندر میں رکھ دیا اور اسی طرح پوجا شروع کر دی جیسے ہندو اپنے دیوتاؤں اور دیویوں کی کرتے ہیں۔

جین مت ہندومت میں اصلاح کے زعم میں وجود میں آیا تھا اور اس کی بنیادیں بڑی حد تک ہندومت سے مختلف ہیں لیکن ہندوؤں کے خلاف تحریکِ اصلاح چلاتے چلاتے جین مت بھی ہندومت کی شکل اختیار کر گیا۔موروثی پوجا عام ہوگئی اور ویدک دھرم کی بہت سی چیزیں جینیوں میں داخل ہوگئیں یوں جین مت کو ہندو دھرم ہی کا ایک روپ سمجھا جانے لگا۔

بدھ مت:

جین مت کی طرح بدھ مت بھی ہندومت کی متعصبانہ اور غیر ضروری تعلیمات کے خلاف ردِعمل تھا جو لوگوں میں بہت مقبول ہوا۔

> چھٹی اور پانچویں صدی قبلِ مسیح میں برہمنیت کی بالادستی اور فوقیت کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک اصلاحی تحریک اٹھی۔ یہ تحریک اپنے عروج پر پہنچ کر بدھ مت کا روپ اختیار کر گئی جو اس کے بانی ''بدھ'' کے نام سے موسوم ہوئی۔☆۶۱

بدھ مت کی ابتدا ہندوستان سے ہوئی، لیکن بعد میں اس مذہب نے ہندوستان سے باہر چین، جاپان، تبت، تھائی لینڈ، برما، نیپال، بھوٹان اور سری لنکا میں اپنے پیروکار پیدا کر لیے۔

بدھ مت کی مقبولیت کی بنیادی وجہ ذات پات کی تفریق اور کثرت پرستی کے جھوٹے عقیدے کا خاتمہ تھا۔ بدھ مت نے برہمن اور شودر کو ایک ہی نظر سے دیکھا اور عوام کو مساوات کا سبق دیا۔ گوتم نے ادنیٰ اور اعلیٰ کی تعریف انسان سے نہیں، بلکہ اس کے کردار سے کی، اور اپنے اس جہاں کو یوں بیان کیا۔

> لوگ مختلف صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں، لیکن ادنیٰ اور اعلیٰ کے فرق کی بنیاد کسی خاص خاندان یا ذات میں پیدا ہونے کے باعث نہ ہونا چاہیے، بلکہ یہ تمیز انسان کے گذشتہ زندگی کے اعمال کے مطابق ہوتے ہیں۔ اگر اس نے پچھلے جنم میں نیک کام کیے ہیں تو وہ اس جنم میں اعلیٰ درجے کا مستحق ہے اور اگر پچھلی زندگی میں بداعمالیوں کا وہ شکار رہا ہے تو اسے ادنیٰ طبقے سے

تعلّق رکھنا چاہیے۔ گوتم کا کہنا ہے کہ خلوص اور محبت کی زندگی بسر کر کے ہر کس و ناکس اعلیٰ ترین نجات یعنی ''مکتی'' حاصل کر سکتا ہے۔ ذات پات اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتے اور نہ ہی اسے کسی قسم کی مدد پہنچاتے۔☆۶۲

گوتم بدھ نے ذات پات کے علاوہ کثرت پرستی کی اتنی شدّت سے مخالفت کی کہ سرے سے خدا ہی سے انکار کر دیا اور کہا:

خدا اگر ہے بھی تو وہ ان ہی کے قوانین کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے جن میں کہ دوسرے انسان جکڑے ہوئے ہیں۔ خدا بھی انسان کی طرح مجبور اور مقصود ہے۔☆۶۳

تصوّرِ خدا سے انکار کی وجہ سے بدھ مت میں عبادت کا بھی تصوّر موجود نہیں اور نہ ہی اس مذہب کی رو سے عبارت یا قربانی وغیرہ سے گناہ بخشے جا سکتے ہیں۔

بدھ مت میں عبادت اور قربانی کے علاوہ توبہ اور کفارہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے کیوں کہ اس مذہب کی رو سے گناہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک اخلاقی قوانین کی خلاف ورزی کرنا اور دوسرا گناہ جہالت یعنی حقائق سے ناواقفیت، ان دونوں قسم کے گناہوں کا ازالہ توبہ سے ممکن نہیں، بلکہ افراد کی زندگی میں بنیادی تبدیلیوں کے ذریعے ہی ان خرابیوں کو دور کیا جا سکتا ہے۔☆۶۴

گوتم بدھ نے ہندوؤں کی ویدوں کے الہامی ہونے سے انکار کر دیا۔

انھوں نے چاروں ویدوں میں سے صرف تین رگ وید، سام وید، یجر وید کا ذکر کیا ہے۔☆۶۵

یہ وہ بنیادی اختلافات تھے جو ہندو اور بدھ دھرم کے درمیان تھے، اور جن کے باعث بدھ مت اور ہندو مت دو الگ دھرم ہو گئے۔

جین مت کی طرح گوتم بدھ نے بھی انسانی زندگی کو مصائب کا سرچشمہ قرار دیا۔ ان مصائب کی وجوہات اور نجات کا راز جاننے کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے گوتم نے ایک دن اپنی بیوی اور بچّے کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لی۔

بالآخر گوتم بدھ نے انسانی مصائب و آلام میں سے مندرجہ ذیل تین بنیادی مصائب کو بیان کیا:

۱۔ رنج و الم۔ جن سے انسان آئے دن دوچار ہوتا رہا ہے جن میں بیماری، بڑھاپا اور موت بہت اہم ہیں۔

۲۔ عارضی زندگی یا انیکا (Annica) یعنی دنیا فانی ہے۔ ہر چیز بدلتی رہتی ہے، اور کوئی چیز اپنی حالت پر برقرار نہیں رہتی۔

۳۔ غیر حقیقی یا اناتھا (Annatha) عدم ثبات اور فنا سے بھی بڑھ کر یہ مصیبت ہے کہ تمام چیزیں غیر حقیقی ہیں۔ کیوں کہ اگر حقیقی ہوتیں تو فنا نہ ہوتیں۔☆۶۶

دنیا کے مصائب جاننے کے بعد گوتم بدھ نے بدھ مت کے عقائد کی بنیاد چار حقائق پر رکھی:

۱۔ دنیا کی مصیبت

۲۔ دنیا کی مصیبت کی جڑ

۳۔ دنیا کی مصیبت کو معلوم کرنے کا طریقہ

۴۔ دنیا کی مصیبت معلوم ہو جانا۔☆۶۷

ان حقائق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے گوتم بدھ نے زندگی کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کی تو نتیجہ کے طور پر کچھ حقائق سامنے آئے جسے ''بدھ مت کی صداقتیں'' کہا جاتا ہے۔

گوتم نے زندگی کی چار اعلیٰ صداقتیں (آریا ستیہ) بتلائی ہیں جو یہ ہیں:

۱۔ زندگی دکھ ہے۔

۲۔ دکھ کا سبب خواہشات ہیں۔

۳۔ خواہشات سے خود کو بچایا جا سکتا ہے۔ ۴۔ اس کے لیے نہ گھور تپیا (سخت ریاضت) کی ضرورت ہے اور نہ ہی عیش پرستی کی، بلکہ شٹ مارگ (درمیانی راستہ) اختیار کرنا چاہیے۔☆۶۸

گوتم کے خیال کے مطابق انسان نہ صرف اپنی زندگی میں، بلکہ موت کے بعد بھی مصیبتوں میں گھرا رہتا ہے، اور دوسرے وجود میں منتقل ہو کر دوبارہ پیدا ہوتا ہے، اور پھر دوبارہ زندگی کے مسائل اور مصائب میں الجھ جاتا ہے۔ اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

گوتم نے مصائب کی وجہ خواہشات کو بتایا اور ان خواہشات سے بچنے کے لیے درمیانی راستہ اختیار کرنے کی تلقین کی اور درمیانی راہ اختیار کرنے کے لیے بھی اس نے مندرجہ ذیل آٹھ اصول مقرر کیے:

۱۔ صحیح علم و عقیدہ

۲۔ صحیح راہ

۳۔ صحیح کلام

۴۔ صحیح عمل

۵۔ صحیح سلوک

۶۔صحیح کوشش

۷۔صحیح یادداشت

۸۔صحیح غور وفکر☆۶۹

نروان حاصل کرنے کے لیے جہاں اور بہت سے اصولوں کی پابندی کرنی پڑتی ہے وہاں عام زندگی گزارنے کے لیے بھی خاص طریقے اختیار کرنا پڑتے ہیں۔ایسے لوگوں کو تنہا زندگی گزارنے پر زور دیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ خوراک اور لباس کے معاملات میں بھی سادگی کی تاکید کی گئی ہے۔

الغرض زندگی کی ہر آسائش اور خوشی کو خیر باد کہنا پڑتا ہے۔بدھ مت میں راہبانہ زندگی اختیار کرنے والوں کے لیے کہا گیا ہے:

> وہ معاشرتی زندگی کو خیر باد کہہ دیں اور ایسے لوگوں سے تعلق رکھیں جو تارک الدنیا ہوں،خوراک لباس اور عادات میں سادگی اپنائیں،کسی طرح کی زیب وزینت اختیار نہ کریں۔جنگلوں اور غاروں میں سکونت پذیر ہوں۔سر اور داڑھی بالکل صاف کروا دیں۔خوراک بھیک مانگ کر حاصل کریں۔☆۷۰

اگرچہ بدھ مت نے ہندومت کی خامیوں کی وجہ سے اسے نیچا دکھا دیا تھا۔خاص طور پر اشوک اور اس کے جانشینوں کی تبلیغ اور بدھ مت کو قومی درجہ دینے سے بدھ مت بہت تیزی سے پھیلا۔ہندوستان میں مختلف قوموں کی آمد سے ان کی تہذیب وتمدن کا اثر بدھ مت پر بھی ہوا اور کنشک نے بدھ مت میں بہت سے تبدیلیاں کر دیں جس کے نتیجے میں بدھ مت دو فرقوں انہیان (چھوٹی گاڑی) اور مہایان (یعنی بڑی گاڑی) میں تقسیم ہو گیا۔مہایان کی تعلیمات ہندومت کی تعلیمات سے بہت ملتی جلتی تھیں۔ویسے بھی بدھ مت کوئی نیا مذہب نہ تھا، بلکہ گوتم بدھ نے ہندوؤں کی ویدوں اور اُپنشدوں کی تعلیمات میں کچھ تبدیلیاں کر کے اسے "بدھ مت" کا نام دے دیا تھا۔

رفتہ رفتہ ہندومت نے بدھ مت کو اپنے اندر جذب کرنا شروع کر دیا۔مہایان فرقہ بننے کے بعد بدھ مت کی اصل شکل بدل گئی اور بدھ مت اور ہندومت کے امتیازی نشانات ختم ہو گئے۔اس عرصے میں ہندومت نے اپنے مذہب کی خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کی تاکہ جو لوگ جین مت اور بدھ مت اختیار کر رہے ہیں وہ ہندومت کو نہ چھوڑیں۔

اس کے ساتھ "شنکر اچاریہ" نے بھی ۷۸۸ء تا ۸۲۰ء میں نہایت منظم طور پر اس مذہب کی مخالفت کی۔اس مذہب کے ماننے والوں پر مظالم کے پہاڑ توڑے گئے۔ان حالات کے پیشِ نظر ان کی بھاری اکثریت دوسرے ملکوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئی۔یہی وجہ ہے کہ بدھ مت آج ہندوستان سے باہر زیادہ ہے مؤثر طور پر موجود ہے۔اور کچھ لوگ اپنی جان بچانے کے لیے

جین مت میں داخل ہو گئے۔ جس کی طرف برہمنوں کا رویہ ظالمانہ نہ تھا، گیارہوں صدی عیسوی تک بدھ مت اُڑیسہ اور کشمیر تک محدود ہو کر رہ گیا۔ کشمیر میں بھی اس کا خاتمہ ۱۱۰۲ء میں ہو گیا (ملہار) میں البتہ مسلمانوں کی آمد (بارھویں صدی) تک باقی رہا۔ اس کے بعد یہ تقریباً ہندوستان کی سرزمین سے محو ہی ہو گیا۔

اس طرح بدھ مت اپنی فرقہ بندیوں اور ہندو مت کی نئی شکل بننے نیز شنکراچاریہ کے ظالمانہ رویے کی وجہ سے اپنا عروج کھو بیٹھا۔ بدھ مت کے زوال کے ساتھ ہی مسلمان برِصغیر آئے تو برِصغیر میں بدھ مت کے سنبھلنے کی گنجائش نہ رہی کیوں کہ مسلمانوں کی آمد کے بعد برِصغیر میں اسلام پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔

ادنا ذات کے ہندو:

ذات پات سے مراد ہندو معاشرے کی وہ تقسیم ہے جس سے پورا ہندو معاشرہ چار حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ہندو معاشرے کی یہ چار ذاتیں بنیادی طور پر آریا اور دراوڑی نسل کی ظاہری شکل وصورت کی تفریق سے وجود میں آئیں۔

ہندو سماج میں سب سے اعلیٰ ذات برہمن اور سب سے ادنیٰ ذات شودر تصور کی جاتی تھی۔

شودر ہندوستان کے قدیم باشندے تھے۔ انھیں معاشرے میں حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور ذات کی زندگی گزارنا ان کا مقدر بن چکا تھا۔ ویدک عہد میں ذات پات کا نظام قائم ہو چکا تھا۔ ''رگ وید'' میں ذاتوں کی تقسیم کا ذکر کیا گیا ہے۔

ذاتوں کی یہ تقسیم بے لچک اور اٹوٹ تھی۔ اعلیٰ ذاتوں یعنی برہمن، کشتری اور ویش آپس میں مل سکتے تھے لیکن شودروں سے کسی بھی ذات کے لوگ ملنا پسند نہ کرتے تھے۔ ان ذاتوں سے تعلق رکھنے والوں کی مختلف ذمّے داریاں تھیں۔ منوشاستر میں ذاتوں کی ان ذمّے داریوں کو یوں بیان کیا ہے:

> برہمنوں کے لیے وید کی تعلیم اور خود اپنے اور دوسروں کے لیے دیوتاؤں کو چڑھاوے دینا اور دان لینے دینے کا فرض قرار دیا۔　　(باب اوّل)
>
> چھتری کو اس نے حکم دیا کہ خلقت کی حفاظت کرے، دان دے، چڑھاوے چڑھائے، وید پڑھے اور شہواتِ نفسانی میں نہ پڑے۔　　(باب اوّل ۸۹)
>
> ویش کو اس نے حکم دیا کہ مویشی کو سیوا کرے، دان دے چڑھاوے چڑھائے، تجارت لین دین اور زراعت کرے۔　　(باب اوّل ۹۰)
>
> شودر کے لیے قادرِ مطلق نے صرف ایک ہی فرض بنایا ہے، وہ ان تینوں کی خدمت کرنا ہے۔

(باب اوّل ۹۱)

شودر ہندو معاشرے کا مظلوم اور حقیر ترین طبقہ تھا۔ اس کے لیے مندر، اسکول، کنویں، محلّے اور چشمے الگ ہو گئے تھے۔ وہ اچھی غذائیں نہیں کھا سکتے تے اور نہ ہی انھیں پُر آسائش زندگی گزارنے کا حق حاصل تھا۔ غرض وہ ہر اس چیز سے محروم تھے جو اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے لیے تھیں۔

آریا سماج کی تینوں اعلیٰ ذاتوں کے لوگ جنیو پہنتے تھے، لیکن شودروں کو جنیو پہننے کی اجازت نہ تھی۔ اصل میں تینوں اعلیٰ ذات کے لوگ دویجا یعنی دو پیدائش والے کہلاتے ہیں۔ ☆۱۷

شودروں کو عام زندگی میں بہت محتاط رہنا پڑتا تھا اور اس بات کا خیال رکھنا پڑتا تھا کہ اُن سے کوئی ایسا کام نہ ہو جائے جو برہمنوں کو ناپسند ہو۔ اپنی حیثیت اور اپنے اصولوں سے ہٹ کر کچھ کرنے کی صورت میں انھیں مختلف سزائیں دی جاتیں۔

شودر جس عضو سے برہمن کی ہتک کرے وہی عضو اس کا کاٹ دیا جائے۔

(منو۲:اتھروید ۱۹:۲۲:۲۱:، ۵، ۱:۶)

وید سننے پر دونوں کانوں میں سیسہ ڈال دو، پڑھنے میں زبان کاٹ دو، یاد کرنے پر اس کے دل کو چیر دو۔

(میمانسا کی شرح میں شنکر رامانج اور مادھو آچاریہ نے لکھا ہے)

شودر کو نیک صلاح نہیں دینی چاہیے۔

(منو۴: ۸۰ رگ وید، ۸: ۷۰: ۱۱، ۲: ۱۲: ۴ وغیرہ)

ہندو دھرم میں ذات پات ایک ایسا آہنی بندھن ہے کہ ہر ذات کا آدمی جس ذات میں جنم لیتا ہے مرتے دم تک اسی میں رہتا ہے۔ منو لکھتا ہے:

نیچی ذات والا! اونچی ذات والے کا پیشہ اختیار کرے تو راجا اس کی دولت چھین کر اسے ملک سے باہر نکال دے۔

(منو۱۰: ۹۶، رگ وید، ۳: ۵۳)

اپنی ذات میں شادی جائز ہے۔

(منو۳: ۴۳، ۳، ۱۲، رگ وید، ۱۰: ۱۷ :۲ نرکت ۲: ۱۳)۔ ☆۱۸

برہمن کو اگر ضرورت ہو تو وہ کسی گناہ کے بدلے اپنے غلام شودر کا مال بر جبر لے سکتا ہے۔ اس غصب سے اس پر کوئی جرم عائد نہیں ہوتا۔ کیوں کہ غلام صاحب جائداد نہیں ہو سکتا۔ اس کی کُل املاک مالک کا مال ہے۔

ویدوں کے علاوہ ہندو سمرتیوں میں بھی ان چاروں ذاتوں کی تقسیم کا ذکر ہے اور ہر ذات کی ذمے داریاں اور پیشے وہی ہیں جن کو ویدوں میں بیان کیا گیا ہے، لیکن ویدوں کے مقابلے میں تقریباً تمام سمرتیوں میں ذات پات کے نظام میں کسی حد تک لچک پائی جاتی ہے اور مشکل حالات میں کچھ شرائط کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک ذات کے لوگ دوسری ذات کا پیشہ اختیار کر سکتے ہیں اور ہر ذات کا آدمی اپنے سے نچلی ذات کا پیشہ اختیار کر سکتا ہے۔

سماج کے ناروا سلوک کی وجہ سے شودر برہمنوں اور دوسروں اعلیٰ ذات کے لوگوں سے متنفر تھے لیکن انھیں اس نفرت کے اظہار کی آزادی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے جب مہابیر اور گوتم بدھ نے جین اور بدھ مت کے ذریعے ہندو مت میں پائے جانے والی کثرت پرستی اور ذات پات کی تفریق کے خلاف اصلاحی تحریک چلائی تو ادنیٰ ذات کے ہندوؤں نے اس تحریک کو بہت سراہا اور ذات پات کی قید سے تحریک چلائی تو ادنیٰ ذات کے ہندوؤں نے اس تحریک کو بہت سراہا اور ذات پات کی قید سے رہائی حاصل کرنے کے لیے جین مت اور بدھ مت میں شامل ہونے لگے، اور جین مت اور بدھ مت کو پھولنے پھلنے کا موقع دیا۔

اس لیے ہم یقین سے یہ بات کہہ سکتے ہیں معمولی ذات سے تعلق رکھنے والے شودروں نے جین مت اور بدھ مت کی بنیاد رکھنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

اسلام:

یوں تو برِ صغیر میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ عرب تاجروں کی ہندوستان سے تجارت کے باعث زمانہ قدیم سے شروع ہو چکا تھا لیکن اسلام کی تبلیغ کا آغاز محمد بن قاسم نے ۷۱۱ء میں سندھ فتح کرنے کے بعد کیا۔

عظیم فاتح ہونے کے باوجود محمد بن قاسم اور اس کے مسلمان ساتھیوں کا ہندوؤں کے ساتھ بہت دوستانہ رویّہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ محمد بن قاسم نے جب اسلام کی تبلیغ شروع کی تو ہندوؤں نے بہت خوشی سے اسلام قبول کیا اور خاص طور پر یہ سندھ میں رہنے والے ادنیٰ ذات کے شودر اسلام کی تعلیمات سے بہت متاثر ہوئے۔

یوں تو مذہب اسلام کی تمام تعلیمات قابلِ تعریف اور تعصب سے پاک ہیں لیکن جو تعلیمات اسلام کی مقبولیت اور پسندیدگی کا باعث بنیں وہ توحید، عدل و مساوات اور یوم آخرت پر یقین رکھنا ہے جس دن انسان اپنے تمام اعمال کے حساب کتاب کے بعد جنت یا جہنم میں جائے گا۔

''توحید'' سے مراد ایک خدا پر یقین رکھنا ہے جو تمام صفات کا مالک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں خدا کے ''۹۹'' (ننانوے) صفاتی نام تحریر کیے گئے ہیں۔ دنیا کی ہر چیز کو خدا نے ہی پیدا کیا ہے، وہی سب کا مالک ہے۔ دنیا کا ہر کام خدا ہی کے حکم سے ہوتا ہے، دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے لیے پہلی شرط کلمۂ طیبہ کا دل سے اقرار کرنا ہے جو یہ ہے:

''لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ ۔''

ترجمہ: ''اللّٰہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللّٰہ کے رسول ہیں ۔''

خدا کے ساتھ کسی کو اور شریک بنانے والا مشرک کہلاتا ہے، اور قرآن میں مشرک کو سخت سزا کے لائق کہا ہے، جیسا کہ کلمہ شہادت میں مسلمان گواہی دیتا ہے:

''اَشھدُ اَن لا الٰہ الا اللّٰہ وَحدہٗ لاشریکَ لہٗ وَ اَشھدُ اَنَّ محمداً عَبدُہٗ وَرسولہٗ۔''

ترجمہ: میں گواہی دیتا ہوں کہ اللّٰہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ۔ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللّٰہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں ۔

اسلام کلمہ طیبہ کے اقرار کے بعد ہر شخص کو مساوی حقوق فراہم کرتا ہے ۔ یعنی زندہ رہنے، روزی کمانے، جائیداد رکھنے، شادی اور سماجی حیثیت میں سب یکساں ہیں ۔ اس کے برخلاف، جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے، ہندومت میں تعدد خدا ہے ۔ ہندومت میں ابتدا میں ہر چمک دار چیز کو خدا سمجھا، اور بعد میں انھوں نے ہر کام کے لیے جدا جدا خدا معین کر دیے جو دیوتا کہلاتے تھے اور دیوتاؤں کی بیویاں دیویاں کہلاتی تھیں ۔

مثلاً برہما، خالق (۱) وشنو ۔ جلانے والا اور (۲) شیو مارنے والا ۔ فنا کرنے والا ۔ (۳) لیکن میں ویدک دھرم کی ناپسندیدگی کے سبب برہمنوں نے ویدک دیوتاؤں میں بنیادی تبدیلی کی چناں چہ اس تبدیلی کے نتیجے میں ہندو دھرم میں تین بڑے خدا یعنی برہما، وشنو اور شیو کو ملا کر ایک بڑے دیوتا کا درجہ دے دیا گیا، اور ایک انسانی جسم پر تین سر لگا کر اس کی تجسیم کی گئی ۔ جب کہ مسلمانوں کی مقدس کتاب قرآن میں سورۂ اخلاص، میں خدا کی وحدانیت کو بہت واضح انداز میں بیان کیا ہے:

کہو، اللّٰہ ایک ہے (۱) اللّٰہ بے نیاز ہے (۲) نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کی اولاد ہے (۳) اور اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے ۔

تمام اسلامی تعلیمات میں ''مساوات'' کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے ۔ جس کے ذریعے صدیوں کے مظلوم اور ٹھکرائے ہوئے لوگوں کو نئی زندگی مل گئی ۔

ہندومت کی طرح اسلام میں ذات پات کی تفریق سے انسان کو اعلیٰ یا ادنیٰ فرقوں میں تقسیم نہیں کیا جاتا، بلکہ خدا اور رسولؐ کی نظر میں تمام انسان برابر ہیں، اور سب آدمؑ کی اولاد ہیں ۔ حضورؐ نے اپنے مشہور خطبے حجتہ الوداع میں ارشاد فرمایا:

''اے لوگو! تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور ہر آدم کا وجود مٹی سے بنایا گیا ہے، نہ عربی کو کسی عجمی پر، کسی گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں ہے، ہاں اگر کسی بات پر فضیلت و برتری کا مدار ہے تو وہ تقویٰ ہے ۔''

برِصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندو معاشرہ رنگ و نسل کی بنیاد پر چار مختلف ذاتوں میں بٹا ہوا تھا لیکن مسلمانوں نے اسلامی تعلیمات کے مطابق ادنیٰ ذات کے شوروں کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کیا، اور برہمنوں اور شودروں کے باہمی فرق کو ختم کیا۔ مسلمانوں کی اس صفت سے ہندو بکثرت دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اے لوگو! ہم نے تم (سب) کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو مختلف قومیں اور خاندان بنا دیا ہے کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو، بے شک تم میں سے پرہیزگارتر، اللہ تعالیٰ کے نزدیک معززتر ہے، بے شک اللہ خوب جاننے والے ہے پورا خبر دار ہے۔ (''الحجرات'':۱۳)

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے اسلامی معاشرے میں انسان کو اگر فضیلت یا برتری اس کے اعلیٰ کردار، نیکیوں اور اچھے اعمال سے حاصل ہوتی ہے تاکہ اس کی ظاہری خوب صورتی یا سرخ و سفید رنگ سے۔

اس کے ساتھ اسلام کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اسلام میں زندگی کے تمام معاملات عدل و انصاف سے حل کیے جاتے ہیں امیر اور غریب یا آقا اور غلام سب کے لیے اسلام نے ایک جیسی سزا اور ایک جیسی جزا مقرر کی ہے جب کہ ہندو معاشرے میں برہمنوں، کھشتریوں، ویشوں اور شودروں کے لیے ان کی ذات کے لحاظ سے سختی یا نرمی کی جاتی ہے۔ ایک ہی گناہ کے بدلے میں مختلف ذات کے افراد کو مختلف سزائیں دی جاتی تھیں۔ اس معاملے میں بھی سب سے مظلوم طبقہ ادنیٰ ذات کے شودر تھے۔ ہندو مت کے قانون کی کتاب منوسمرتی میں تحریر ہے:

اگر کسی محفوظ یا غیر محفوظ برہمن، کھشتری یا ویش عورت سے کوئی شودر مرد زنا کرے تو شودر کا عضوِ تناسل قطع کرنا، تمام دولت چھین لینا اور قتل کی سزا دینی چاہیے۔☆۴۳

اگر ویش کسی محفوظ برہمی سے زنا کرے تو:

اسے ایک سال تک جیل خانے میں قید کیا جائے اور اس کے بعد اس کا سب مال چھین لیا جائے، اور اسی جرم میں کشتری، ہزار بن ڈنڈ (سزا) دے... اگر کشتری یا ویش شوہر وغیرہ برہمی سے جماع کرے تو کشتری پانسو بن اور ویش دو ہزار میں دے... شوہر وغیرہ سے محفوظ برہمی کے ساتھ جماع کرنے والے برہمن کو ہزار بن دینے کی سزا ہے۔ برہمی کی خواہش سے جماع کرنے والے برہمن کو پانسو بن ڈانڈ دینا چاہیے۔ (۸/ ۳۷۸) ☆۴۴

جب کہ اسلام زنا کے مجرم چاہے وہ امیر ہو یا غریب مرد ہو یا عورت دونوں کے لیے ایک جیسی سزائیں تجویز کی ہیں۔

قرآن میں ہے:

''زانی عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔'' (''النور'':۲)

اسلامی معاشرے میں قتل کا بدلہ قتل ہے چاہے یہ بدلہ اپنے آقا یا بادشاہ سے لیا جائے اپنے ہم پلہ ساتھی سے یا کسی عزیز یا رشتے دار سے سب کو ایک ہی جیسی سزا دی جائے گی، ارشادِ خداوندی ہے:

...اور اس نفس کو قتل نہ کرو جس کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے، مگر حق کے ساتھ۔

قتل کے بارے میں رسول اللہ ؐ نے فرمایا:

جو شخص اپنے غلام کو قتل کر دے یا اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دے، ہم اس شخص کو قتل کر دیں گے اور اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیں گے۔

قرآن میں ہے کہ شہادت دینے والا ہر حالت میں سچی گواہی دے خواہ وہ گواہی کسی بڑے خاندان کے فرد کے خلاف ہو، خواہ اس کے اپنے عزیز کے خلاف ہو، اپنے بہن بھائی یا ماں باپ کے خلاف ہو قرآن میں ہے:

تم شہادت کو نہ چھپاؤ جو اسے چھپائے گا اس کا دل گناہ گار ہے۔ (''البقرۃ'':۲۸۳)

جب کہ ہندو دھرم کے مطابق منو ہے:

جہاں سچ بولنے سے برہمن، کشتری، ویش، شودر قتل ہوتا ہو وہاں جھوٹ سچ سے بھی زیادہ بہتر ہے۔ ☆۵۷

اسلامی مساوات کے اس مختصر سے جائزے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہے کہ اسلام کی رو سے ہم سب کا خدا ایک، رسولؐ ایک اور قرآن بھی ایک ہے، اور ہم سب خدا کے بندے، رسول کی امت اور آدمؑ کی اولاد ہیں اور آپس میں سب برابر ہیں چاہے ہمارا تعلق کسی بھی قوم، خاندان، قبیلے یا ذات سے ہو اگر ہم سے کوئی اعلیٰ ہے تو وہ اپنے نیک اعمال اور حسنِ سلوک سے ہے۔

حدیث نبوی ہے:

تم میں سے بہترین مسلمان ہے وہ جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرا مسلمان محفوظ رہے۔

روز آخرت پر یقین رکھنا بھی ایسی اسلامی تعلیم جو دوسرے مذہب سے تعلق رکھنے والوں کو متاثر کرتی ہے۔ جس دن تمام انسانوں کو ان کے اچھے اور برے اعمال کے صلے میں جزا یا سزا کے طور پر جنت یا جہنم میں بھیجنے کا فیصلہ سنایا جائے گا۔

خدا انسان کے ہر عمل سے باخبر ہے، خدا اور انسان کے درمیان کوئی پردہ نہیں وہ دلوں کے بھید تک بہت اچھی طرح جانتا ہے۔

''اور جس نے نیک کام تو اپنے ہی لیے کیا اور جس نے برائی کی تو اس کا وبال اسی پر آئے گا'' ہر انسان فطرتاً چاہتا ہے کہ اُسے اُس کے اعمال کا صلہ ملے۔ جب اسے اس بات کا یقین ہوتا ہے وہ مرنے کے بعد قیامت کو دوبارہ زندہ ہو گا تو وہ

اس کوشش میں لگ جاتا ہے کہ کب زندگی کے تمام معاملات احکامِ خدا کے مطابق طے کرے اور وہ ہر کام سوچ سمجھ کر کرتا ہے گویا یہ عقیدہ انسانی کردار میں بنیادی تبدیلی لاتا ہے۔

ہندو مت میں بھی جنت، جہنم اور حیات بعد الموت کا تصور موجود ہے لیکن اس کے بارے میں ان کے نظریات اسلام سے بہت مختلف ہیں۔ مثلاً وید میں مکتی یعنی نجات کا ذریعہ ہندوؤں کے نزدیک دیوتاؤں اور دیویوں کی پوجا کرنا، قربانی دینا وغیرہ شامل ہے قدیم اپنشد میں ''تپیا'' اور نئے تپیا میں ''یوگ'' کو ذریعے نجات کہا گیا۔ اس سلسلے میں ایک فلسفۂ تناسخ روح کا ہے جس کے بارے میں ان کا کہنا ہے:

> ہر روح دنیا میں بار بار مختلف جونوں میں پیدا ہوتی ہے، نیک روحیں اچھی جون اور بری جون میں جنم لیتی ہیں۔ یعنی یہ ہوسکتا ہے کہ ایک چور چوہے کا روپ دھار لے اور ایک خونی چیتے کا روپ دھار لے۔ پھر ضرورت کے مطابق سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں جنم بھگتنے کے بعد ممکن ہے کہ روح پھر سے انسانی مرتبے کو پہنچ جائے اور یہاں سے پاکیزہ زندگی کے فیض سے موت و حیات کے اس لامتناہی سلسلے سے آزاد ہو جائے۔ اس جنم و مرگ کے چکر سے نجات پا جائے اور برہما کے ساتھ اتصال پیدا کرے، یہ بہشتی زندگی ہے۔☆۷۶

اسلامی تعلیمات جو دوسرے مذاہب اور خاص طور پر ہندو مذہب کے لیے مقبولیت کا باعث نہیں خاص طور پر ادنیٰ ذات کے ہندو جن کی حیثیت اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے غلام ہونے کے سوا اور کچھ نہ تھی، اسلامی مساوات سے بہت متاثر ہوئے اور مسلمانوں کا اپنے ساتھ دوستانہ رویہ دیکھ کر اسلام قبول کر لیا۔

اس کے بعد انسان کے اچھے اور برے اعمال کے بدلے میں اسے جنت یا جہنم میں بھیجا جائے گا۔

اسلام کی بنیاد توحید، آخرت، رسالت اور ملائکہ پر ایمان لانے پر ہے۔ اسلام میں توحید کا جتنا واضح اور مکمل تصور موجود ہے آج دنیا کے کسی مذہب میں نہیں۔ اس طرح اگر چہ آخرت کا تصور ہر مذاہب میں ہے۔ مگر انتہائی مبہم۔

اسلامی عقائد پر یقین رکھنے کے علاوہ مسلمانوں کو خدا کی خوشنودی اور اپنی نجات کے لیے مندرجہ ذیل ارکان کی پابندی کرنی چاہیے۔

توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔

اسلام کا پانچواں رکن حج ہے۔ قرآن میں ہے:

''اور اللّٰہ کے لیے بیت اللّٰہ کا حج کرنا فرض ہے ان لوگوں پر جو وہاں تک پہنچنے کی قدرت واستطاعت رکھتے ہیں اور جو لوگ نہ مانیں تو اللّٰہ تعالیٰ بے نیاز ہے سارے جہاں سے۔''

ہندو مسلم عقائد کا مطالعہ کرنے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی عقائد میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کہ ایک حقیقت اور افسانے میں ہوتا ہے۔

ہندومت چوں کہ غیر الہامی مذہب ہے اس لیے اس کے مذہبی عقائد برہمنوں نے خود تراشے ہیں جس میں انسان کے کردار و اعمال کے مقابلے میں اس کی ذات کو زیادہ اہمیت حاصل ہے بت پرستی اور مندروں میں بے حیائی کے کام کرنا ان کے مذہبی فرائض میں سے تھے۔ یوں تو ہندومت کے تمام عقائد سطحی انصاف سے عاری اور باطل ہیں، لیکن ذات پات کا بندھن ایسی برائی ہے جس نے ادنیٰ ذات کے ہندوؤں کو ہندومت سے متنفر کر کے اسلام کی طرف راغب کیا۔

اسلام اپنی اعلیٰ اخلاقی تعلیمات، حق و انصاف کی وجہ سے دوسروں کو اپنے اندر سمونے کی خوبی رکھتا ہے۔ اسلام کے تمام تعلیمات عقائد انسانی فطرت کو سمجھ کر مقرر کیے گئے ہیں، اور زندگی کے تمام شعبوں کے بارے میں واضح، سادہ تعلیمات دی ہیں۔ اسلام میں جبر یا سختی نہیں، بلکہ قرآن کریم میں بار بار اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ فکر، عقل اور تدبر کی قوتوں کو استعمال میں لا کر اسلامی احکامات کے مطابق اپنی زندگی گزاریں۔

اسلام کی ہر تعلیمات مسلمانوں کے علاوہ ادنیٰ ذات کے ہندوؤں کے لیے تو کشش کا باعث تھیں لیکن اعلیٰ ذات کے ہندو یعنی برہمن نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے اثرات قبول نہ کر سکے، بلکہ ان کے دل میں مسلمانوں کے خلاف نفرت میں اضافہ ہو گیا۔ کیوں کہ مسلمانوں کی مذہبی کشش ہندوؤں کے مذہب و تہذیب کے لیے خطرہ بن گئی تھی۔

اب معاشرے میں ہندو مسلم دو متضاد قومیں اپنے اپنے مذہب کو فروغ دینا چاہتی تھیں۔ ہندو اکثریت کی بنیاد پر مسلمانوں پر حاوی ہونا چاہتے تھے، اور اپنے مذہب، تہذیب و ثقافت اور سنسکرت زبان کو قومی حیثیت دینا چاہیے تھے۔ جب کہ مسلمانوں کے نزدیک اپنے مذہب، تہذیب و تمدن اور اُردو زبان کو بچانے کا واحد حل تقسیمِ ہند یعنی ایک الگ مسلم مملکت کا قیام تھا۔

ہندوستان میں ہر زمانے میں مختلف قومیں آ کر آباد ہوتی رہیں، یہاں آباد ہونے کے بعد انھوں نے ایک دوسرے پر اپنے مذہبی اور تہذیبی اثرات ڈالے۔ دوسری قوموں کی طرح جب مسلمان ہندوستان میں داخل ہوئے تو انھوں نے بھی ہندوؤں پر اپنے مذہبی اثرات ڈالے۔ خاص طور پر مغلوں نے ہندوستان میں داخل ہونے کے بعد یہاں کے لوگوں سے تعلقات استوار کیے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے بچے ایک ساتھ پڑھنے لگے، مغلوں نے انھیں اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے ہندو خواتین سے شادیاں بھی کیں۔ اس طرح ہندو اور مسلمانوں کے درمیان میل ملاپ بڑھنے لگا اور انھیں ایک دوسرے کے مذہب کو سمجھنے کا بھی موقع ملا۔

اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ ہندوؤں اور خاص طور پر جنوبی ہندوستان کے ہندوؤں کو اس بات کا احساس ہوا کہ ان کے مذہب کو اصلاح کی ضرورت ہے اسلام کی تعلیمات اور خاص طور پر توحید، مساوات اور آخرت وغیرہ جیسی اعلیٰ تعلیمات کو

ہم اپنے مذہب میں شامل کر کے ہندو مت کو بہتر بنا سکتے ہیں، بلکہ بچا سکتے ہیں ورنہ اسلامی عقائد کے سیلاب میں یہ بہہ کر رہ جائیں گے اور بکثرت ہندو مسلمان ہو جائیں گے۔

چناں چہ ان اصلاحات کے نتیجے میں کبیر پنتھی، سکھ مت، سناتن دھرمی اور آریا سماج جیسے مذاہب وجود میں آئے۔

کبیر پنتھ:

اس مذہب کے بانی کبیر داس تھے۔ کبیر داس پندرھویں صدی کے صوفی شاعر تھے۔ یہ راما نند کے سب سے بڑے چیلے تھے۔ کبیر اپنے روحانی استفاضے کے لیے مسلمان پیروں اور مشائخ کے علاوہ ہندو سادھوں سے بھی ملے۔ اس طرح انھوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کی مذہبی تعلیمات کو ملا کر نئے مذہب کی بنیاد رکھی۔

''پنتھ'' کے معنی راستے کے ہیں۔ ''کبیر پنتھ'' یعنی کبیر کا راستہ، اور ''کبیر پنتھی'' کے معنی ہوئے وہ لوگ جو کبیر کے مسلک پر چلنے والے ہیں، یعنی کبیر کے پیروکار۔ ☆۷۷

کبیر نے اپنے مذہب میں ہندو اور اسلامی تعلیمات کو یکجا کر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو کسی ایک نقطے پر متفق کرنے اور ان کے درمیان اختلافات دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

کبیر نے اپنی تعلیمات میں سب سے زیادہ زور توحید پر دیا۔ کبیر کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے:

> خدا ایک ہے اس کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں، بت پرستی گم راہی ہے۔ ذات پات اور چھوت چھات اور فلسفے کی پیچیدگیاں سب خرافات ہیں ہندو اور مسلمان دونوں کو عرفانِ الٰہی کے حصول میں مصروف رہنا چاہیے اور آپس میں بھائی بھائی کی سی محبت رکھنی چاہیے۔ ☆۷۸

کبیر جب خدا کا ذکر کرتا تو اس سے مراد رام اور رب دونوں ہیں کبیر خدا کے لیے:

> رام، ہری، گوبند، برہما، سمرتھ، سائیں، ست پرش اور اللہ، خدا، صاحب بیچوں، رحیم، رحمٰن، کے الفاظ بلا تکلف استعمال کرتے ہیں۔ ☆۷۹

کبیر بڑے آزاد خیال تھے وہ قرآن اور وید دونوں کو پڑھتے تھے اور دونوں مذہبی کتابوں کا احترام کرتے تھے۔ اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر انھوں نے ذات پات کی سخت مخالفت کی۔ برہمنوں اور شودروں کو برابر قرار دیا۔ ادنیٰ ذات کے شودر چوں کہ برہمنوں سے تنگ آ چکے تھے۔ اس لیے وہ کبیر پنتھ میں شامل ہونے لگے۔

کبیر کی تعلیمات میں ہندو عقائد کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ تناسخ، کرما اور برہما سے متعلق عقائد کبیر نے اپنے مذہب میں شامل کیے۔ وہ ہندوؤں کی طرح دعا بھی مانگتا تھا ہے کہ جنم و مرگ کے چکر سے نجات پا لے۔

کبیر کے خیال کے مطابق:

تیرتھ اور مقدس دریاؤں میں اشنان بے معنی حرکات سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔☆۸۰

اس کے بارے میں انھوں نے یہ دلیل دی ہے:

نہائے دھوئے کیا ہو جو من میں میل سمائے

مین سدا جل میں رہے، دھوئے باس نہ جائے ☆۸۱

کبیر کا مذہب انسانیت کا مذہب تھا۔ انھوں نے اپنے مذہب میں وحدت الوجود، آپس میں پیار محبت، صداقت اور مساوات کا درس دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بہت سے حامی پیدا ہو گئے۔

کبیر کے حسبِ ذیل شاگرد ہوئے:

(۱) گرونانک (۲) سندرداس (۳) مون داس (۴) دادودیا

اِن میں گرونانک سب سے زیادہ اہم ہیں جنھوں نے سکھ مت کی بنیاد رکھی۔

سکھ مت:

کبیر کی تبلیغ و تعلیمات کا سب سے زیادہ اثر گرونانک پر ہوا، اور ہندو مت کی اصلاح کی اور مسلمانوں کی تعلیمات کو اپنے مذہب میں شامل کر کے سکھ مت کی بنیاد رکھی۔

کہنے کو تو سکھ مت ہندو اور اسلامی تعلیمات کا مجموعہ ہے لیکن جب ہم اس کا بغور مطالعہ کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سکھ مت میں سوائے چند ہندی عقائد کے تمام عقائد اسلامی تعلیمات سے اخذ کیے گئے ہیں۔

گرونانک نے سکھ مت میں توحید، مساوات کے علاوہ قرآن، روزِ آخرت، رسول پر ایمان نماز اور روزے پر اتنا ہی زور دیا ہے جتنا کہ اسلام نے اس کی حمایت کی ہے۔

کبیر کی طرح گرونانک نے بھی بت پرستی اور ذات پات کے نظام کو بے معنی اور پرتعصب قرار دیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو مل جل کر رہنے کی تاکید کی، اور کہا:

نہ کوئی ہندو ہے اور نہ کوئی مسلمان؛ سب بھائی بھائی ہیں۔☆۸۲

گرونانک ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور فاصلوں کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے ابتدا صوفیہ اور علما اور ہندوؤں کے سادھوؤں اور سنتوں کی صحبت میں اپنا وقت گزارا۔

اور پھر دونوں مذاہب کی تعلیمات کو یکجا کر کے سکھ مت کی بنیاد رکھی۔

پنجاب کے مشہور صوفیائے کرام شیخ اسماعیل بخاری، سیّد علی ہجویری، بابا فرید، علاءُالحق، جلال الدین بخاری، مخدوم جہانیاں اور دوسرے بزرگوں کی صحبت سے اپنی روحانی پیاس بجھائی۔☆۸۳

نانک نے مسلمانوں اور ہندوؤں کو توحید کی بنیاد پر یکجا کرنے کی کوشش کی، اور ایسی تعلیمات دینے سے اجتناب کیا جو مسلمانوں یا ہندوؤں کو ناگوار گزرے۔

گرو نے خدا کو یاد کرنے کے لیے کئی نام دیے ہیں۔ جن میں سے کچھ ہندوستانی روایات سے ماخوذ ہیں مثلاً ہری، گوبند، الکھ، کرنہار وغیرہ اور کچھ مسلم روایات سے متعلق ہیں جیسے اللّٰہ، خدا، رحیم، کریم، رب وغیرہ۔☆۸۴

گرونانک نے اپنی تمام تعلیمات میں سب سے زیادہ زور ''وحدانیت'' پر دیا۔

نانک کا تصورِ اللّٰہ یہ تھا کہ وہ نہ تو شخصیت کا مالک ہے اور نہ ہی صفات کا مالک۔ وہ اکیلا ہے نا قابلِ تقسیم اور نا قابلِ فہم، قیدِ زمان مکاں سے آزاد، لیکن ہر شے میں سمایا ہوا۔ اگر چہ اس کی تعریف ممکن نہیں تاہم اس کو کسی نام سے موسوم کرنا ضروری ہے۔☆۸۵

سکھوں کی مذہبی کتاب ''گرنتھ صاحب'' ہے۔

''گرنتھ'' کے معنی کتاب کے ہیں، جب کہ ''صاحب'' سردار کے معنی میں مستعمل ہے۔☆۸۶

ان خیالات پر غور کرنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ گرونانک کا تصورِ معبود ہندوؤں کے تصورِ معبود سے بالکل مختلف جب کہ مسلمانوں کے تصورِ معبود سے قریب ترین ہے خاص طور پر ساتواں نکتہ یعنی ''اجونی'' ہندوؤں کی بت پرستی اور معبودوں کی تجسیم کی منافی کرتا ہے۔

خدا کی وحدانیت کے علاوہ گرونانک تقدیرِالٰہی پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ جیسا کہ نانک نے کہا ہے:

کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے خدا کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ اس میں خدا کی مرضی کے مقابلے میں اپنی ذات، اپنی مرضی اور خواہش کو ختم کر کے راضی بہ رضا رہتے ہوئے ہی انسان خدا تک پہنچ سکتا ہے۔☆۸۷

انھوں نے خدا تک پہنچنے کے لیے انسان کو خواہشات سے بچنے اور ذکرِ الٰہی کرنے پر زور دیا۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ بنیادی چیز، جسے سکھ مت کا طریقِ عبادت بھی کہا جا سکتا ہے، ''نام سمرن'' ہے۔ ''نام سمرن'' گویا ذکرِ الٰہی ہے، جسے سکھ اصطلاح میں ''واہ گرو'' کہتے ہیں۔ یہ نام بار بار دہرایا جاتا ہے، اور ایک دین دار سکھ عام زندگی میں بھی ''واہ گرو'' کا ورد کرتا

رہتا ہے۔

''نام سمرن'' کا سب سے اہم اور مفید طریقہ ''کیرتن'' کی شکل میں ہے، جہاں با جماعت موسیقی کے ساتھ ''گربانی'' (گرنتھ میں جمع شدہ کلام) کا وِرد ہوتا رہتا ہے۔☆۸۸

اِس کلام کو لحن کے ساتھ پڑھا جاتا ہے جو لوگ لحن سے نہیں پڑھ سکتے وہ ادب سے بیٹھ کر سنتے ہیں۔

گرونانک خدا کی عبادت کرنے کے لیے ترک دنیا کرنے کے مخالفت تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس دنیا میں عام انسانوں کی طرح زندگی گزارتے ہوئے اور دنیا کے کام کاج کرتے ہوئے بھی خدا کو یاد کرنا کمالِ زندگی ہے۔

خدا تک پہنچنے کے لیے گرونانک نے ذکر الٰہی کے علاوہ ایسی تعلیمات پر زور دیا جو اسلامی تعلیمات سے ماخوذ ہیں مثلاً آپس میں پیار محبت، ایک دوسرے کی خدمت کرنا، ایمان داری کی روزی کمانا، نیک صحبت، انکساری اور خدا کی مخلوق سے ہمدردی جیسی صفات کو اپنانے عبادت جیسی اہمیت دی۔ وہ ہندوؤں سے کہتا ہے:

> مندروں سے جا کر بے معنی رسوم ادا کرنا اور گنگا کے پانی کو پوتر جاننا اور چار رویداور اٹھارہ پران اٹھائے پھرنا بالکل بے کار ہے۔ جب تک معرفت الٰہی حاصل نہ ہو جائے، اور مسلمانوں سے کہتا ہے کہ شفقت کو اپنی مسجد، خلوص کو اپنا مصلّی، عدل وانصاف کو اپنا قرآن بنا، حیا کو اپنی ختنہ، تہذیب کو اپنا روزہ، تقوے کو اپنا کعبہ، راستی کو اپنا مرشد اور عملِ نیک کو اپنی نماز بنا، جب جا کر تو مسلمان بنے گا، اور اللہ تجھے آبرومند بنائے گا۔☆۸۹

گرونانک نے ہندوؤں کی چار رویدوں اور قرآن کا بغور مطالعہ کیا، اور قرآن کو مکمل کتاب قرار دیا۔

> میں نے توریت، انجیل، زبور اور وید پڑھ کر اور سن کر دیکھ لیے ہیں۔ کتاب قرآن ہی دنیا کی ہدایت کے لیے خدا تعالیٰ نے منظور فرمائی ہے۔☆۹۰

نانک نے قرآن کے علاوہ رسالت نبوی اور ارکان اسلام پر بھی عمل کرنے کو ضروری قرار دیا ہے:

> سری گورگرنتھ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بابا صاحب نے اذان دی، لوگوں کو زکوۃ دینے اور روزے رکھنے کی تلقین کی، حج کیا۔☆۹۱

جہاں تک روزِ آخرت کا تعلق ہے تو گرونانک اس سلسلے میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے نظریات سے متفق ہیں۔ مسلمانوں کے عقیدے سے متاثر ہو کر گرونانک نے کہا، ''ایک دن آسمان، زمین، سورج، چاند، ستارے سب فنا کے پردے میں چلے جائیں گے۔ صرف خدا کی ذات باقی رہ جائے گی۔

جنت اور دوزخ کے بارے میں ان کا نظریہ یہ ہے کہ:

> قیامت کے دن وہ لوگ جن کے اعمال اچھے اور نیک ہوں گے بے فکر ہوں گے۔ وہی لوگ نجات پائیں گے۔ جن کی پشت پناہ حضرت نبی کریمؐ ہوں گے۔

مسلمانوں کے فلسفۂ آخرت اور ذریعۂ نجات کے علاوہ انھوں نے ہندوؤں کے کرم اور آواگون کے عقیدے کو بھی تسلیم کیا، اور کہا کہ انسان کے جیسے اعمال ہوں گے ان کے مطابق اگلے جنم میں اس کی تجسیم ہوگی، اور جب تک وہ خدا تک نہیں پہنچے گا وہ مختلف شکلوں میں دنیا میں آتا رہتا ہے۔

> جو لوگ اس وقت انسان کی شکل میں ہیں اگر انھوں نے خدا کی سچی بندگی کے ذریعے اس کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کا یہ موقع کھودیا تو پھر انھیں ۸۴ رلاکھ مختلف زندگیوں سے گزر کر جس میں بے جان چیزیں، نباتات، حشرات الارض اور حیوانات کے مختلف مدارج شامل ہیں۔ ایک بے انتہا طویل مدت کے بعد یہ موقع آئے گا کہ وہ پھر انسان کی حیثیت سے پیدا ہو کر اور خدا کی بندگی کے قابل بن سکیں۔

نانک نے ذات پات کی پابندیوں کو غیر ضروری قرار دیا، اور اپنے بارے میں کہا کہ میں چار ذاتوں میں کسی ذات سے متعلق نہیں ہوں۔ اور کہا:

> نانک تو ان لوگوں کے ساتھ ہے جو غریبوں میں غریب پیدا ہوئے ہیں۔ نہیں، بلکہ ان لوگوں میں سے ہے جو ادنیٰ سے بھی ادنیٰ ہیں۔ وہ بھلا بڑوں کی کیا برابری کرسکتا ہے؟ ہاں، اے پروردگار! جہاں تو حقیر لوگوں کو دیکھتا ہے وہاں تیری نگاہِ کرم بھی ان کا انعام ہے۔☆۹۲

یوں تو سکھ مت ہندی اور اسلامی تعلیمات کا مجموعہ ہے، پھر بھی بعض تعلیمات ایسی ہیں جو سکھ مت کو ہندو مت اور اسلام سے مختلف کر دیتی ہیں۔ ایک فرق یہ ہے کہ ہندو مت اور کبیر پنتھیوں کے برخلاف سکھ مت میں گوشت خوری کو ممنوع نہیں قرار دیا گیا، لیکن اس کے لیے شرط یہ رکھی گئی ہے کہ:

> جانور ایک ہی وار میں (جھٹکا) قتل کر دیا جائے۔☆۹۳

> ایک اور فرق یہ ہے کہ سکھوں کی عبادت کے لیے نہ تو مسجد ہوتی ہے اور نہ مندر، بلکہ گردوارے ہوتے ہیں۔ سکھوں کے گردواروں میں بت نہیں ہوتے، البتہ بتوں کی جگہ گرنتھ صاحب کو استعمال کیا جاتا ہے۔☆۹۴

سکھوں کی ایک خاص شناخت ان کے پانچ ککے (کاف) ہیں جن کا استعمال ہر سکھ مرد کے لیے ضروری ہے۔ وہ پانچ ککے مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) کیس (۲) کنگھا (۳) کچ (۴) کڑا (۵) کھنڈا، یعنی کرپان۔☆۹۵

سکھوں کے اس تصوّر سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ سکھ مت اسلامی تعلیمات سے کس قدر متاثر تھے۔ دسویں گرد ''گرو گوبند سنگھ'' کو آخری انسانی گرو سمجھنے کا تصوّر ختم نبوت سے متاثر ہونے ہی کا نتیجہ ہے۔

ست نام:

اس فرقے کے بانی ایک مشہور ہندو سادھو''بیر بھان'' تھا۔

''بیر بھان'' بڑا موحد تھا، خدا کو ست نام (حقیقت) سے پکارتا تھا۔

خدا کی ذات پر یقین رکھنے کے علاوہ ذات پات کے خلاف تھا، اور دوسری اسلامی تعلیمات سے بھی متاثر تھا۔

اس فرقے کی تعلیمات ہندی بھاشا میں ہیں۔ ان کے مجموعے کا نام ''پوتھی'' ہے۔☆۹۶

ست نامیوں کے مراکز دہلی (رہتک) آگرہ، فرخ آباد، مرزا پور، یوپی اور راجپوتانہ میں جے پور میں ہیں۔ ستنامی بھی نہ مورتی پوجا کے قابل ہیں نہ ذات پات کو تسلیم کرتے ہیں، نہ مذہبی رسوم ادا کرتے ہیں۔ یہ ہندومت کی اسلام سے اثر پذیری کی ایک اور شکل رہی ہے۔

مسلمانوں کے بعد ہندوستان میں یورپی اقوام مثلاً انگریز، پرتگالی اور فرانسیسیوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

ان یورپی اقوام کا مذہب عیسائیت تھا۔ ہندومت ایک غیر الہامی مذہب ہے۔ اس لیے ہر زمانے میں اس میں تبدیلیاں ہوتی رہیں ہیں۔ زمانہ قدیم میں ہندومت کی اصطلاح کے نتیجے میں جین مت اور بدھ مت وجود میں آیا اور پھر جب مسلمان یہاں آئے تو ہندو اسلامی تعلیمات سے متاثر ہوئے اور پھر کبیر اور گرونانک نے ہندو اور مسلمانوں کی تعلیمات سے متاثر ہوئے اور پھر کبیر اور گرونانک نے ہندو اور مسلمانوں کی تعلیمات کو یکجا کر کے کبیر پنتھی اور سکھ مت کی بنیاد رکھی۔

ہندوؤں نے جب دیکھا دیگر مذاہب کے اثرات سے ہندومت میں تبدیلیاں آرہی ہیں۔ تو انھوں نے ہندومت کو عیسائیوں کے اثرات سے بچانے کے لیے اصلاحی تحریکیں چلیں اور اس کے نتیجے میں برہمو سماج اور آریا سماج وجود میں آئے۔

آریا سماج:

ہندوستان میں اسلام کے اثرات تو ہو ہی چکے تھے جس کے نتیجے میں بہت سی اونی ذات کے ہندو اسلام قبول کر چکے تھے عیسائیوں کی آمد کے بعد جب عیسائی مشنروں نے عیسائی مذہب کی تبلیغ شروع کی تو ہندو ایک بار پھر اپنے کو چھوڑ کر عیسائیت قبول کرنے لگے۔ یہاں تک ان کی تعلیمات کے اثر اور اپنشد کے نظریات کو ملا کر ''برہمو سماج'' کی بنیاد رکھی گئی۔

شمالی ہند میں ان رجحانات کے خلاف زبردست ردِعمل ہوا اور ایک فرقہ ایسا ہو گیا جس نے لوگوں کو ویددھرم کی طرف دعوت دی اور ویدوں کے اس اضافے کو برہمنوں نے ختم کر دینے کی کوشش کی یہ فرقہ ''آریا سماج'' کہلایا۔☆۹۷

آریا سماج کے بانی دیانند سرسوتی ہیں۔ یہ پہلے بہت کٹر ہندو تھے اور راہبانہ زندگی گزار رہے تھے، لیکن ایک واقعے نے ان کی سوچ بدل دی، اور انھوں نے ہندومت میں اصلاح کی ضرورت محسوس کی۔

شیوراتری کی تہوار کے موقع پر وہ [دیانند] شیو پوجا میں مصروف تھے کہ انھوں نے دیکھا کہ چوہا مورتی پر بیٹھا چاول کھا رہا ہے۔ انھوں نے سوچا کہ اگر شیو میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ اس حقیر جانور کو بھگا سکے تو پھر اس کی پوجا سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔☆۹۸

دیانند نے مذہب کی اصلاح کی غرض سے مختلف مذاہب کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ ۱۸۷۵ء میں دیانند نے آریا سماج کی بنیاد رکھی ان کا مقصد بت پرستی اور شرک کو دور کر کے ویدک مذہب کو زندہ رکھنا تھا۔ دیانند نے:

ہر مذہب کے عالموں سے مناظرے کیے اور ۱۹ کتابیں لکھیں۔☆۹۹

جن میں سے رگ وید آدی بھاشیہ بھومکا اور ستیارتھ پرکاش بہت مشہور ہیں۔

ان میں پہلی کتاب چار ویدوں کی تفسیر کا جائزہ ہے۔ ستیارتھ پرکاش کے چودھویں باب میں اسلام پر نہایت ہی ناروا حملے کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں سکھوں، جینیوں اور عیسائیوں کے واجب الاحترام ہستیوں کا تمسخر اُڑایا گیا ہے۔☆۱۰۰

دیانند نے اپنے مذہب میں بتوں کی پوجا اور ذات پات کی تمیز کو بے غیر ضروری قرار دیا، اور اس کے ساتھ ہی اوتار کے نظریات اور جانوروں کی قربانی کو ممنوع قرار دیا۔ مردوں کی نذر و نیاز اور ان کی زیارت کو ضعیف الاعتقادی کا نام دیا۔

ویدک سماج کا نعرہ ہے کہ ''ویدک تعلیم کی طرف لوٹو۔''

دیانند کے ہندوؤں کی کل شاستروں کو سوائے چار ویدوں کے مسترد کر دیا اور ویدوں کی شرحوں پر نکتہ چینی کی ویدکی بے شمار تعلیمات اور اس کی شرحوں کے بیش تر مطالب کو ماننے سے بھی انکار کر دیا۔

''ان کا کہنا ہے کہ ویدوں میں تناسخ اور کرم کا عقیدہ موجود ہے۔ وہ حقیقت سے بعید ہے۔ دیانند نے جدید ایجادات کو ویدوں کے ذریعے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔''

آریا سماج نے ہندومت کی جن تعلیمات کو رد کیا۔ اس میں ذات پات کی تفریق اور بیواؤں کو دوسری شادی نہ کرنے کو غلط قرار دیا اور بیواؤں کو دوسری شادی کرنے کی اجازت دی۔

انھوں نے برہمنوں کے اس خیال کی دھجیاں اُڑا دیں کہ وید صرف برہمن پڑھ سکتے ہیں۔ آریا سماج کی تعلیم کے مطابق معاشرے کے ہرفرد چاہے اس کا تعلق کسی بھی ذات سے ہو وید پڑھنے کی اجازت رکھتا ہے۔

آریا سماج کی ممبر بننے کے لیے ہر ممبر کا اپنی آمدنی میں ایک فی صد سماج کو دینا ضروری ہے کیوں کہ اس مذہب میں خدمت کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ آریا سماج کے چودہ اصولوں کو قبول کرنا بھی ضروری ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱) خدا ہر چیز کا مالک ہے۔
۲) صحیح علم کا منبع اللہ کی ذات ہے۔
۳) خدا رحمٰن، رحیم، سچا، عادل، ازلی، ابدی، حاضر اور غیر فانی ہے۔ اس لیے اس کی عبادت جائز ہے۔
۴) علم کی صحیح کتابیں وید ہیں۔ آریا سماج کا فرض ہے کہ وہ ویدوں کو پڑھے اور ان کی تعلیم دے۔
۵) جھوٹ کی مذمت کرنی چاہیے اور سچ کہنے پر آمادہ کرنا چاہیے۔
۶) ہر کام میں خیر یعنی اچھائی اور شر یعنی برائی کو ملحوظ رکھا جائے۔
۷) لوگوں کے ساتھ ہر حال میں بھلائی کرنا، آریا سماج کا بنیادی مقصد ہے۔
۸) انسان کی روحانی، اخلاقی اور معاشرتی حالت بہتر بنانے کی اشد ضرورت ہے۔
۹) ہر فرد کی خوبیوں کی قدر کرنی چاہیے۔
۱۰) ہر ایک کے ساتھ عدل کرنا چاہیے۔
۱۱) ہر ایک سے محبت کا سلوک روا رکھنا چاہیے۔
۱۲) علم کو پھیلا کر جہالت کو فتح کرنا چاہیے۔
۱۳) اپنی خوش حالی میں دوسروں کو شریک کرنا چاہیے۔
۱۴) ذاتی نیکی پر مطمئن نہیں ہونا چاہیے، بلکہ معاشرتی بہبود میں حصہ لینا چاہیے۔☆۱۰۱

دیانند نے اگرچہ خدا کی وحدانیت کو تسلیم کیا ہے لیکن ان کی توحید ناقص ہے۔ ایک طرف تو انھوں نے کہا ہے کہ بے شمار دیوا اور دیوتاؤں کی عبارت سے بہتر ہے کہ ایک ہی خدا کی عبادت کی جائے؛ لیکن دوسری طرف ان کا کہنا ہے کہ روح اور مادّہ بھی غیر مخلوق ہیں۔

تہذیب وثقافت کے مسائل:

مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہبی عقائد میں بہت فرق ہے۔ یہی مذہبی اختلافات ہندو مسلم ثقافت پر بھی اثر انداز

ہوئے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سیاسی رنگ اختیار کر گئے اور مسلمانوں کو ایک الگ ملک کی ضرورت پیش آئی۔

ہندوؤں میں پائے جانے والے ذات پات کے فرق نے ہندو مسلم ثقافت میں اختلافات پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ہندو معاشرے میں ادنیٰ ذات کے لوگ یعنی شودروں کے الگ محلّے ہوتے تھے اور ان کا کام اعلیٰ ذات کے لوگوں کی خدمت کرنا اور وہ کام کرنا تھا جنھیں ادنیٰ ذات کے لوگ کمتر سمجھتے تھے۔ قانونی اور عدالتی فیصلے بھی ذات پات کو مدِ نظر رکھ کر کیے جاتے تھے۔

> جرائم اور ان کی سزا کی اہمیت بلحاظ نقصان کے نہیں دی جاتی جو اُن سے منتج ہوں، بلکہ بلحاظ مجرم یا مظلوم کی ذات کے۔ مثلاً برہمن کو کسی حالت میں بھی ویسی سزا نہیں دی جاتی جیسی اور ذات کے اشخاص کو۔ ☆۱۰۲

جب کہ اسلام میں ''مساوات'' پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اس لیے اسلامی معاشرے میں سب مسلمان مل کر رہتے ہیں اور زندگی کے تمام معاملات عدل و انصاف سے نبھائے جاتے ہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی تہوار بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ مسلمانوں کے دو مذہبی تہوار ہیں۔ عیدالفطر ماہِ رمضان کے تیس روضے رکھنے کے بعد یکم شوال کو منائی جاتی ہے۔ جب کہ عیدالاضحیٰ حضرت ابراہیمؑ کی سنت کی یاد میں منائی جاتی ہے۔

جب کہ ہندوؤں میں دو قسم کے تہوار منائے جاتے ہیں، فصلی اور مذہبی۔

> بسنت، بیساکھی اور لوہڑی فصلی تہوار ہیں جو فصل کاٹنے اور بونے پر منائے جاتے تھے۔ ☆۱۰۳

ہندو ساون کی پانچویں کو ماگ پنچمی کا تہوار مناتے تھے۔

> ہولی کا تہوار وسنتی دیوی کی یاد میں منایا جاتا تھا۔ شیو یاتری ماگھ کی چاند کی چودھویں رات کو منایا جاتا تھا، اور اس پر چوبیس گھنٹے کا برت رکھا جاتا تھا۔ چیت کی نویں کو برہمنوں کا تہوار ہوتا تھا۔ درگا دیوی کے اعزاز میں ''درگا پوجا'' کا تہوار منایا جاتا ہے۔ دسہرے کے تہوار پر رام کے بن باس، اس کے مصائب اور راون کی شکست کے واقعات کو ناٹک کی صورت میں دکھاتے تھے، اور راون کا بہت بڑا پتلا بنا کر اسے آگ لگائی جاتی تھی۔ دیوالی کی رات کو چراغاں کیا جاتا تھا، اور مٹھائی تقسیم کی جاتی تھی یہ تہوار اس دن کی یادگار ہے جب رام بن باس کاٹ کر فاتحانہ ایودھیا میں واپس لوٹے۔ ☆۱۰۴

اگر چہ ہندوؤں نے مسلمانوں کے تہذیبی اثرات کی وجہ سے شلوار قمیض اور لمبی چولیاں وغیرہ پہننا شروع کر دیں تھیں

لیکن ہندوؤں کا اصل لباس خواتین کے لیے ساڑھیاں اور مردوں کے لیے دھوتی تھا۔ کیوں کہ مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندو کپڑے سینے سے ناواقف تھے اس لیے ہندو خواتین اپنے گرد ساڑھی لپٹ لیتیں اور مرد دھوتی باندھ لیتے تھے۔

دھوتی کے علاوہ بعض مرد:

دو انگل دھجی آگے رکھ کر اپنی کمر میں دو ڈورے باندھ لیتے ہیں یعنی لنگوٹی، یا ایسے پاجامے پہنتے ہیں جن میں بے اندازہ روئی بھری ہوتی ہے۔☆۱۰۵

ہندوؤں میں سر پر پگڑی، پاؤں میں جوتا اور بدن پر سیے ہوئے کپڑے پہننے کا رواج مسلمانوں کی آمد کے بعد عام ہوا۔ اسلام چوں کہ بے حیائی کی سخت ممانعت کرتا ہے اس لیے مردوں اور عورتوں کو ستر ڈھانپنے کی تلقین کرتا ہے، مسلمان عورت کا ستر سر سے لے کر پیر تک ہوتا ہے جب کہ مرد کا ستر ناف سے لے کر گھٹنے سے ذرا اوپر تک ہوتا ہے۔ اس لیے مسلمان مرد اور عورتیں شلوار قمیض یا ایسا لباس پہنتی ہیں جس سے ان کا ستر چھپ جائے جب کہ خواتین گھر سے باہر نکلتے وقت اور نامحرم مرد سے پردہ کرتی ہیں۔

خوراک کے معاملے میں بھی ہندوؤں اور مسلمان کے لوازمات مختلف ہیں۔ ہندو بدھ اور جین مت کے اثرات سے گوشت خوری سے پرہیز کرتے ہیں۔ امرا اور غربا دونوں سبزیاں وغیرہ کھاتے ہیں۔

ہندوؤں کے برخلاف مسلمان سبزیوں کے علاوہ حلال جانوروں کا گوشت بھی کھاتے ہیں لیکن ہندوؤں کے محلّوں میں، جہاں ہندو زیادہ تعداد میں ہوتے تھے، مسلمانوں کو بھی گوشت خوری سے پرہیز کرنا پڑتی تھی۔

اسلامی قوانین کے مطابق شادی کے لیے لڑکی اور لڑکے کا عاقل و بالغ ہونا اور باہم رضامند ہونا ضروری ہے۔ اسلام نے شادی کے لیے رنگ و نسل یا ذات پات کو بے معنی قرار دیا ہے یہاں تک کہ اسلام نے عورت کو اپنے تحفظ کے لیے اپنے غلاموں اور مردوں کو بے حیائی سے بچنے کے لیے کنیزوں اور لونڈیوں سے نکاح کی اجازت دی ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

اور تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمھاری لونڈیوں اور غلاموں میں جو نیک ہوں۔ ان کے نکاح کر دو۔ اگر وہ نادار ہوں گے تو اللّٰہ ان کو غنی کر دے گا۔

مسلمان مرد اہلِ کتاب عورت سے بھی شادی کر سکتا ہے۔ مرد کو چار شادیاں اور عورت کو طلاق یا شوہر کی موت کے بعد شادی کی اجازت ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کی صورت میں عورت مرد سے خلع لے سکتی ہے جب کہ مرد بھی عورت کو طلاق دے سکتا ہے۔ بیوہ کو شادی کی اجازت ہے۔ جب کہ ہندو معاشرے میں نکاح کی رسوم برہمن ادا کرتے ہیں۔ ہندو معاشرے میں شادی کے معاملات میں ذات پات کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔

اسلام نے شرم و حیا کو عورت اور زیور اور مرد کی زینت کہا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

مومن لغو باتوں اور بے ہودہ کاموں سے پرہیز کرتے ہیں۔
قرآن پاک نے مردوں اور عورتوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی نگاہوں کو نیچا رکھیں۔
یہی وجہ ہے کہ مسلمان ان تعلیمات پر عمل کرنے کی وجہ سے پاکیزہ اور نیک زندگی گزارتے ہیں۔
اور معاشرے سے ہر قسم کی برائی دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اسلامی معاشرے کے برعکس ہندو معاشرہ بے حیائی اور فحاشی کے لحاظ سے دنیا کا بدترین مذہب ہے جہاں عبادت گاہوں میں بھی زنا جیسا بدترین فعل انجام دیا جاتا ہے اور ایسا کرنا ہندوؤں کے نزدیک عبادت ہے۔ ہندو پروہتوں نے لوگوں کو اس بات کا یقین دلا رکھا تھا کہ جو بھی اپنی بیٹی کو دیوتا کے بھینٹ کرے گا سورگ میں جائے گا۔ چناں چہ راجے اور امرا اپنی بیٹیاں مندروں کے لیے وقف کر دیتے تھے۔

ہندو عورتیں بھی عصمت فروشی اور ناچ گانے کے پیشے کو برا نہیں سمجھتی، بلکہ بہت خوشی سے یہ پیشہ اختیار کرتی ہیں۔
سومناتھ کے مندروں میں ہزاروں دیوداسیاں یہ شرم ناک کاروبار کرتی ہیں۔☆۱۰۶

ہندوؤں نے اپنے مندروں کی دیواروں پر جنسی ملاپ کے آسن پوری تفصیل سے دکھاتے تھے جنھیں دیکھ کر وہاں جانے والے لوگوں کی ہوس اور شہوانی جذبات بھڑک اُٹھتے تھے، اور پھر ان جذبات کی تسکین کے لیے مندروں میں ناچنے والی لڑکیاں ہر وقت موجود ہوتی تھیں۔

اس طرح ہندو مندروں میں عبادت کے نام پر عصمت فروشی کا کاروبار کرتے تھے۔
عصمت فروشی کی یہ کمائی پروہتوں کی جیب میں جاتی تھی۔☆۱۰۷

اپنے کاروبار کو چمکانے کے لیے اور لوگوں کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لیے ہندو پروہت دیوتاؤں کی جنسی بے راہ روی کے قصے اس انداز میں سناتے جیسے کہ انھوں نے بہت نیکی کا کام کیا ہے، اور پھر عام لوگ بھی دیوتاؤں کی پیروی کرنے کے لیے ان برائیوں کو دہراتے اور فحش پیشوں کو تقویت ملتی۔

ہندو معاشرے میں ''نیوگ'' کے نام سے بھی زنا کیا جاتا ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب میں سے ہندومت ہی ایسا نرالا مذہب ہے جس میں کسی نہ کسی شکل میں زنا کا نام تبدیل کر کے زنا کی اجازت دی جاتی ہے۔

ہندومت میں ایسے شادی شدہ مرد اور عورتیں یا بیوہ عورتیں اور رنڈوے مرد، جن کی اولاد نہ ہوسکتی ہو، اولاد کی خواہش پوری کرنے کے لیے غیر مرد یا غیر عورت کے پاس جا سکتے ہیں، یعنی زنا کر سکتے ہیں لیکن زنا کا یہ فعل ''نیوگ'' کہلائے گا۔ کنواری لڑکی اور لڑکے کا نیوگ نہیں ہوسکتا۔ نیوگ جیسی گھٹیا رسم پوری کرنے کے لیے بھی ہندو ذات پات کا خیال رکھتے ہیں۔
یہ بھی ضروری ہے کہ ویش عورت ویش، کھشتری اور برہمن مرد کے ساتھ اور کھشتری عورت،

کھشتری اور برہمن مرد کے ساتھ اور برہمن عورت صرف برہمن مرد کے ساتھ نیوگ کر سکتی

ہے۔☆۱۰۸

ہندو اس شرم ناک فعل پر شرمندہ نہیں ہوتے کیوں کہ ان کے نزدیک ''نیوگ'' گناہ نہیں، بلکہ ایک جائز اور مذہبی فعل ہے۔ وید شاستروں کے فرمان کے مطابق:

> نیوگ میں زنا کاری اور شرم نہ ماننی چاہیے اور نیوگ کا علان ہونا چاہیے۔ مرد اور عورت کی رضامندی ضروری ہے جب عورت مرد کا نیوگ ہونا ہو تب اپنے خاندان میں عورتوں اور مردوں کے سامنے ظاہر کریں۔☆۱۰۹

مسلمانوں کے برعکس ہندو معاشرے میں بچّوں کو تو دفن کر دیا جاتا ہے جب کہ بالغ مرد یا عورت کو جلا دیا جاتا ہے۔

جادو بھی ہندی تہذیب کا ایک اہم جز ہے اور اسے مذہبی اور سماجی لحاظ سے بہت اہمیت حاصل ہے۔ ''اتھروید'' میں جادو اور منتروں کو ہی بیان کیا گیا ہے۔

ہندو معاشرے میں نفع اور نقصان دونوں کے لیے جادو اور منتروں کا سہارا لیا جاتا ہے اور اس کی اہمیت کے پیشِ نظر بہت سے لوگ اس گناہ کو بطورِ پیشہ اختیار کرتے ہیں اور جادو کی رسوم ادا کرنے کے لیے مردوں کی اور جانوروں کی ہڈیاں اکٹھی کی جاتی ہیں۔

اسلامی معاشرے کے برخلاف ہندو معاشرے میں ویدوں کی تعلیمات کے مطابق عورت کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور عورت کو معاشرے کی کمتر اور ناقابلِ اعتبار مخلوق کا درجہ دیا ہے۔

قدیم ہندو مت میں عورت کو مرد کی ملکیت کہا ہے۔ شودروں کی طرح ہندو عورتیں بھی اپنے معاشرے کا مظلوم طبقہ ہیں۔ لڑکی کی پیدائش کا ذکر اتھروید میں نہایت حقارت سے کیا گیا ہے۔ سوک سپ تھتی میں لکھا ہے۔

> عورتوں کے حربے یہ ہیں: دھوکا دینے والی باتیں، مکر، قسمیں کھانا، بناوٹی جذبات کا اظہار کرنا، جھوٹ موٹ کے آنسو بہانا۔ بناوٹی مسکراہٹ، لغو دکھ درد کا اظہار کرنا، اور بے معنی خوشی، بے اعتنائی، بے معنی سوالات کرنا، خوشحالی اور ادبار سے بے نیازی نیک و بد میں تمیز نہ کر سکنا، عشاق کی طرف نگاہِ غلط انداز میں دیکھنا۔☆۱۱۰

> ہندو مت نے عورتوں پر بہت سے فرائض تو عائد کیے ہیں لیکن حقوق کو بالکل اہمیت نہیں دی گئی۔

> گیتا میں عورت اور شودر کو پاپ یونی (گناہِ قالب) قرار دیا گیا ہے۔☆۱۱۱

ہندو مت نے عورت کو کم عقل، دھوکے باز، مشتبہ عصمت والی، مستقل محبت کے لیے غیر مستحق قرار دینے کے بعد اس

کے لیے مندرجہ ذیل قوانین مرتب کیے:

۱)عورت اور شودر کو مال سے محروم کیا گیا ہے۔

۲)لڑکی باپ کی جائیداد کی وارث نہیں۔

۳)کسی عورت کو خاوند کی حکومت نہیں مل سکتی۔

۴)بیوہ کو جائداد کی فروخت کا کوئی اختیار نہیں۔

۵)نکاح ثانی کی ممانعت ہے۔

۶)خلع کی ممانعت ہے۔

۷)عورت کا وجود صرف اس لیے ہے کہ بچے دے اور ان کی پرورش کرے اور امورِ خانہ داری میں مصروف رہیں۔

۸)طفولیت میں لڑکی کو باپ کے تابع رہنا چاہیے، جوانی میں شوہر یا بیٹوں کا۔☆۱۱۲

ہندو معاشرے میں عورت نہ تو بیوہ ہونے کی صورت میں دوسری شادی کر سکتی ہے اور نہ ہی طلاق لے سکتی ہے۔

بیوہ کی شادی ہندوؤں کے نزدیک مہا پاپ تھی، بیوہ کے لیے دو ہی راستے تھے۔شوہر کی نعش کے ساتھ ستی ہو جانا یا بیوگی کی مصیبت زدہ زندگی گزارنا۔☆۱۱۳

اسلام نے جہاں زندگی کے ہر شعبے میں عدل و انصاف کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اصول و قوانین مقرر کیے ہیں وہاں جب حقوق العباد کی بات کی جاتی ہے تو معاشرے کے تمام افراد کو برابر کے حقوق دیے جاتے ہیں۔

معاشرے کے دیگر افراد کی طرح خواتین کے فرائض کے علاوہ ان کے حقوق مردوں کے حقوق سے کم نہیں ہیں اسلام نے عورت کو بحیثیت ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کے بہت اعلیٰ مقام دیا ہے ماں کے بارے میں حدیثِ مبارکہ ہے:

''جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔''

اور ماں کی فرمانبرداری اور خدمت کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

جب کہ بیٹی کی پیدائش کو باعثِ رحمت قرار دیا ہے۔

اسلام نے شوہر اور بیوی کے حقوق میں توازن کیا۔اللّٰہ تعالیٰ نے عورت کو مرد کے برابر عزت کا مستحق قرار دیا ہے:

''اور عورتوں کے بھی مردوں پر اسی طرح حقوق ہیں جس طرح مردوں کے عورتوں پر البتہ مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ حاصل ہے۔'' (۲:۲۲۸)

یہ درجہ محض گھر کا انتظام ایک زیادہ باہمت، حوصلہ مند اور قوی شخصیت کے سپرد کرنے کے لیے ہے۔عورتوں پر ظلم روا

رکھنے کے لیے نہیں۔

نبی کریمؐ نے بیویوں کے ساتھ حسن سلوک کو خیر اور اچھائی کا معیار بتایا اور کہا:

''تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ اچھا ہے۔''

بیوی کی نزاکت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس پر تربیتِ اولاد، اپنی عصمت وعفت اور شوہر کی امانت کی حفاظت کی ذمّے داریاں عائد کیں۔عورتوں کے فرائض کے بارے میں ارشادِ خداوندی ہے:''نیک بیویاں وہ ہیں جو اطاعت گزار ہیں، اپنے شوہر کی عدم موجودگی میں ان کے مال، دولت اور عزت کی حفاظت کرتی ہیں۔'' (۳۴:۴)

اسلام نے عورت کو ہر حیثیت سے وراثت کا حق دار قرار دیا ہے۔ ناگزیر حالات میں شوہر کو حق طلاق حاصل ہے، اور بیوی کو بھی حق خلع دیا ہے اور شوہر کی وفات اور طلاق کی صورت میں مرد کی طرح عورت کو بھی دوسری شادی کی اجازت دی ہے۔

ہندو اور مسلمانوں کی ثقافت کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں ثقافتی لحاظ سے کوئی بھی قدر مشترک نہیں ہے۔

اصل میں ہندومت غیر الہامی مذہب ہے۔اس لیے اس کی تعلیمات بھی برہمنوں نے خود گھڑی ہوتی ہیں۔ برہمنوں نے جو مذہبی کتابیں تحریر کیں ہیں ان کے تعلیمات اور اصول وقوانین ایسے ہیں جن سے برہمنوں کو فائدہ پہنچتا ہے چاہے وہ تعلیمات بے حیائی کی ہوں، ذات پات کی تقسیم کی ہوں، جرم کی سزا کے بارے میں ہوں یا موت کی رسموں کے بارے میں، عدل ومساوات سے عاری ہیں۔

ان تعلیمات میں انسانی حقوق، عزت نفس اور انصاف کو کوئی دخل نہیں۔ان اصولوں کو کوئی دیوانہ یا وحشی صفت انسان تو مان سکتا ہے، لیکن عقل ایسے مذہب کو قبول نہیں کر سکتی۔

اسلامی معاشرے میں سارے رسم ورواج قران اور حدیث کے مطابق ترتیب دیے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں زندگی کے تمام معاملات عدل ومساوات نبھائے جاتے ہیں معاشرے کے تمام افراد آپس میں بھائی بھائی بن کر رہتے ہیں اور امیر وغریب کا فرق کوئی حیثیت نہیں رکھتا، ہر انسان دوسرے کے حقوق اور عزتِ نفس کا خیال رکھتا ہے اور اپنی ذمّے داریوں کو ایمان داری سے پوری کرتا ہے۔ الغرض اسلامی معاشرہ اخلاقی لحاظ سے بہت بلند ہے اور ان صفات کے وجہ سے دوسروں کو اپنی طرف راغب کرتا ہے۔

اسلامی تہذیب اللّٰہ کی وحدانیت، آخرت کی جواب دہی، انبیا کی لائی ہوئی تعلیمات کی بنیاد پر استوار ہے۔

اس میں سادگی، پاکیزگی ومزاحمت، عدم مساوات اخوت و دردمندی کی بڑی اہمیت ہے یہ مسلم تہذیب میں عدل واحسان، رشتے داروں کے حقوق، پڑوسیوں کے حقوق یتامیٰ ومساکین کی امداد پر غیر معمولی زور ہے، اور نفس انسانی کی ہر

قسم کی بے اعتدالی اور افراط وتفریط سے روکا گیا ہے۔

اب یہ بالکل مسلّم بات تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مقام اتصال کہیں نہیں تھا اس لیے ایک ملک کی سیاسی زندگی میں دونوں کی یکجائی اور اتفاق ضروری تھا۔

زبان کا مسئلہ:

جب ہم تقسیمِ ہند کے پس منظر کا جائزہ لیتے ہیں تو اس مطالعے کی کئی وجوہات نظر آتی ہیں ان وجوہات میں سے زبان کا مسئلہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔

مذہب، تہذیب اور زبان کسی بھی ملک اور اس کی قوم کی خاص پہچان ہوتی ہیں۔ اس لیے ہر قوم اپنے مذہب، تہذیب اور زبان کی حفاظت کرتی ہے۔

مسلمانوں کو بھی جب اپنا مذہب، تمدن اور زبان وغیرہ غیر محفوظ نظر آئے تو انھیں اس کے بچاو کے لیے ایک الگ مسلم مملکت کی ضرورت پیش آئی۔

برِصغیر میں اُردو زبان کی حیثیت مختلف ادوار میں مختلف رہی ہے۔

مغلوں کے زمانے میں جب فارسی سرکاری زبان تھی اس زمانے میں بھی علاقائی زبان کے اثرات اور خاص طور دربارِ دہلی کے تعلق سے معیاری زبان کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔

> سترھویں اور اٹھارویں صدی میں یہ زبان جو فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی اور فارسی لفظوں اور ترکیبوں سے بھرپور تھی۔ ترقی کر کے ادبی زبان بن گئی اور یہ کھڑی بولی کہلانے لگی۔ ☆۱۱۴

مسلمانوں نے کھڑی بولی کو اپنایا اور اسے ترقی دی۔ انیسویں صدی میں شمالی ہند میں کھڑی بولی اُردو زبان کی حیثیت سے مقبول ہو چکی تھی۔ جب کہ:

> مغربی ہند کے علاقوں میں بہت سے ہندوؤں نے اٹھارویں صدی میں کھڑی بولی میں لکھنا شروع کیا تو اس رجحان کو بھی قائم رکھا، جو یہ اپنی دیسی زبان، ہندی اور سنسکرت لفظوں کی طرف تھی اور دیسی دیوناگری رسم الخط اختیار کیا، اس طرح وہ زبان وجود میں آئی جسے ہندی کہتے ہیں۔ ☆۱۱۵

واقعہ یہ ہے کہ کھڑی بولی سے اُردو اور ہندی دو زبانیں وجود میں آئیں۔

جنگِ پلاسی میں انگریزوں کی فتح کے بعد جب ان کی مقبوضات میں اضافہ ہوا تو انھوں نے فارسی کی جگہ اُردو کو سرکاری

حیثیت دینے کا سوچا، اور انگریزوں نے خود بھی اُردو زبان کو سیکھنے کی طرف توجہ دی اور فارسی زبان بہت سی مشہور داستانوں کا اُردو زبان میں ترجمہ کروایا، اور مقصد کو پورا کرنے کے لیے ایک کالج قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔

> چناں چہ فورٹ ولیم کالج میں، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہلِ کاروں کی تربیت کے لیے قائم ہوا تھا، ایک ادبی شعبہ اس غرض سے تشکیل دیا گیا کہ آسان اُردو میں کتابیں لکھوائی جائیں تاکہ وہ مشترکہ زبان، جو فارسی آمیز اُردو سے ممیز کرنے کے لیے ہندوستانی کے نام سے موسوم کی گئی ہے، نمونے کا کام دے سکے۔ ہندوستانی کو ہندوؤں میں مقبول کرنے کے لیے فورٹ ولیم کالج میں کچھ ہندو مصنفین بھی رکھے گئے اور ان کی کتابیں دیوناگری رسم الخط میں شائع کی گئیں۔ جس سے شمالی ہند کے بہت سے ہندو آشنا تھے۔☆۱۱۶

۱۸۲۹ء میں انگریزوں کی لسانی حکمت عملی تبدیل ہوگئی اور انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ فارسی کے بجائے اُردو نہیں، بلکہ انگریزی کو سرکاری زبان بنایا جائے گا۔

انگریزوں کی اس حکمت عملی کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں رہنے والے لوگ زبان کے ذریعے انگریزی تہذیب کو اپنائیں، چناں چہ میکالے کے چارٹر کے مطابق، انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا۔

> ۷/مارچ ۱۸۳۵ء کو ایک دستور تیار کیا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ سرکاری روپیہ صرف انگریزی تعلیم پر خرچ کیا جائے گا۔☆۱۱۷

انگریزوں کی اس پالیسی سے تعلیمی حلقوں میں بے اطمینانی پھیل گئی۔

آخر کار انگریزی زبان کو ہی سرکاری حیثیت حاصل ہوگئی۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں شکست کے بعد ہندوستانی مسلمان بری طرح پس چکے تھے۔ اب مسلمانوں کو ہندو اور انگریز دونوں سے مقابلہ کرنا تھا۔ جنگِ آزادی میں انگریزوں نے اپنے حمایتی ہندوؤں اور مسلمانوں کو اعلیٰ انعامات اور عہدوں سے نوازنے کا وعدہ کیا تھا۔ جب اسے عملی طور پر پورا نہ کیا گیا تو ہندوؤں اور مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف احتجاج کیا۔ اس احتجاج کے نتیجے میں انھیں سزائیں دی گئیں اور انگریزوں کے اس رویے نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد ہونے پر مجبور کر دیا۔

> ۱۸۸۵ء میں ہیوم کی مساعی سے پونہ میں کانگریس کی بنیاد رکھی گئی۔☆۱۱۸

کانگریس کے قیام کے بعد ہندو چاہتے تھے کہ اپنی اکثریت کی بنیاد پر مسلمانوں سے زیادہ اختیارات اور اعلیٰ عہدے حاصل کریں۔ ان اختیارات کو بڑھانے کے سلسلے میں اُردو زبان کی جگہ ہندوؤں نے سنسکرت کو قومی زبان کا درجہ دینے کا ارادہ ظاہر کیا۔

یوں تو انیسویں صدی کے آغاز ہی سے اُردو زبان کے استعمال پر ہندوؤں کی جانب سے مخالفت شروع ہوگئی تھی، لیکن بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی حالات میں تیزی سے تبدیلی آئی۔ اُردو کی مخالفت کی وہ شورش، جو انھوں نے ۱۸۶۷ء میں بنارس میں شروع کی تھی، ۱۸۶۸ء میں دوبارہ شروع کی گئی اور یہ مطالبہ کیا گیا:

بجائے اُردو زبان اور فارسی رسم الخط کے ہندی بھاشا اور دیوناگری رسم الخط سرکاری دفاتر میں رائج کیا جائے۔☆۱۱۹

بالآخر ۱۸/اپریل ۱۹۰۰ء کو میکڈانیل نے ایک ریزولیوشن شائع کیا اور:

بعض سرکاری اغراض کے لیے ہندی بھاشا اور دیوناگری رسم الخط کے استعمال کی اجازت دے دے۔☆۱۲۰

اس طرح اُردو اور ہندی کا تنازع شروع ہوا۔ ہندو مختلف دلائل سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ سنسکرت زبان ہی کو ہندوستان کی سرکاری زبان ہونا چاہیے جب کہ مسلمان اُردو زبان اور فارسی رسم الخط کو سرکاری زبان کی حیثیت دینا چاہتے تھے۔

اس سلسلے میں گاندھی نے کہا کہ اُردو اور ہندی الگ الگ نہیں، بلکہ ایک ہی زبان ہیں۔

اُتری ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دونوں ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ ان زبانوں میں فرق پڑھے لکھے لوگوں نے پیدا کیا۔ پڑھے لکھے ہندو اپنی ہندی میں سنسکرت ملا دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے مسلمان اسے سمجھ نہیں سکتے۔ اس طرح لکھنؤ کے مسلمان اپنی اُردو میں فارسی ملا دیتے ہیں اور اسے ہندوؤں کے سمجھنے کے لائق نہیں رکھتے۔ عام لوگوں کے لیے یہ دونوں زبانیں اجنبی ہیں۔☆۱۲۱

تحریری کاموں کے بارے میں انھوں نے کہا ہندو دیوناگری اور مسلمان اُردو زبان ہی استعمال کریں گے، لیکن بہت سے ہندو ایسے بھی ہیں جو اُردو زبان لکھ اور بول سکتے ہیں اور بہت سے مسلمان ایسے بھی ہیں جو دیوناگری جانتے ہیں۔

اور آخر میں وہی زبان زیادہ مقبول ہوگی جس کے سمجھنے والے اور لکھنے والے زیادہ ہوں گے۔

جس لکھاوٹ میں زیادہ طاقت ہے وہ زیادہ بڑے پیمانے پر استعمال ہوگی اور اس طرح قومی لکھاوٹ بن جائے گی۔☆۱۲۲

گاندھی نے اپنے ان خیالات سے خود کو غیر جانب دار ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ گاندھی جانتے تھے ہندو اکثریت میں ہیں اس لیے اگر تمام مسلمان اُردو بولیں تو بھی ہندی زبان کے حامی زیادہ تعداد میں ہوں گے اور

یہ اکثریت مسلمانوں کی شکست اور ہندوؤں کی جیت کا باعث بنے گی۔

جب کہ مسلمانوں کا کہنا تھا کہ اُردو زبان سے پوری ہندوستانی قوم چاہے وہ مسلمان ہو یا ہندو ہوں واقف ہیں۔ حتیٰ کہ انگریزوں کے لیے بھی اب اُردو زبان اجنبی نہیں رہی اس کا ثبوت فورٹ ولیم کالج ہے۔

اُردو زبان میں فارسی الفاظ اس وقت شامل ہوئے جب مغلوں کا دور شروع ہوا کیوں کہ اس وقت سرکاری زبان فارسی تھی اور لوگ اس زبان سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔

> اُردو میں فارسی زبان کو داخل کرنے کا کام مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں نے کیا تھا، اور اس سے ان کا مقصد اپنے مسلم آقاؤں کو خوش کرنا تھا۔☆ ۱۲۳

ہندی اور اُردو زبان کا جو تنازع ۱۸۶۷ء میں شروع ہوا تھا۔ تقسیم پاکستان کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ہے، بلکہ بنارس کے واقعے کے بعد ہی مسلمانوں کو اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ ہندو اور مسلمان کبھی بھی دوستانہ انداز یا ایک قوم کی حیثیت سے ساتھ نہیں رہ سکتے۔

اِس تنازع کے بعد ہی سرسیّد جیسے صلح پسند انسان نے بھی مسلمانوں اور ہندوؤں کو الگ الگ قوم کہا، اور یہ نظریہ پیش کیا:

> ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ ان کا مذہب، تمدن اور نظریہ حیات جدا ہے۔ اس لیے قومیں مل کر زیادہ عرصہ ساتھ نہیں رہ سکیں۔☆ ۱۲۴

سرسیّد کے انتقال کے بعد نواب محسن الملک علی گڑھ کالج کے آنریری سیکرٹری منتخب ہوئے اب نواب محسن الملک ہی مسلمانوں کے رہنما تھے۔

> مسلمانوں کے جذبات کا صحیح اندازہ کر کے انھوں نے ۱۳ رمئی ۱۹۰۰ء کو علی گڑھ ٹاؤن ہال میں ایک عام جلسہ کیا اور ''اُردو ڈیفنس ایسوسی ایشن'' قائم کی۔☆ ۱۲۵
>
> نواب محسن الملک کی اس جرأت پر میکڈانیل کو بہت غصہ آیا۔
>
> اس کے باوجود ۱۸ راگست ۱۹۰۰ء کو لکھنؤ میں مسلمانوں کا مجوزہ نیابی جلسہ منعقد کیا۔☆ ۱۲۶

سرانیٹونی میکڈانیل نے ایک بار پھر محسن الملک کی اس حرکت پر ناراضگی کا اظہار کیا اور اس کے ردِعمل کے طور پر ایک جلسہ طلب کیا جو علی گڑھ ٹرسٹیوں پر مشتمل تھا۔ اس جلسے میں مسلمانوں پر یہ الزام لگایا گیا:

> اس تحریک کی تائید میں کالج کے طلبہ سے پروپیگنڈے کا کام لیا گیا اور اساتذہ، آنریری سیکرٹری اور بعض ٹرسٹیوں نے نمایاں حصہ لیا۔ بالآخر انھوں نے یہ دھمکی دی کہ اگر یہ طریقہ جاری رہا تو کالج کو گورنمنٹ سے جو امداد ملتی ہے وہ بند کر دی جائے گی ...بعض اضلاع کا دورہ کر کے مسلمان

رئیسوں کو تنبیہ کی کہ اگر انھوں نے اُردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کی تائید کی تو ان کے لیے اچھا نہ ہوگا۔☆۱۲۷

کالج کے تحفظ اور بہتری کے لیے نواب محسن الملک نے استعفیٰ دے دیا۔

مسلمانوں نے محسن الملک کے اس استعفیٰ کو مسلم قوم کے لیے مصیبت قرار دیا، اور اس سے استعفیٰ واپس لینے کی درخواست کی جو محسن الملک نے اس شرط پر منظور کی کہ اپنی معیاد ملازمت ختم ہونے کے بعد وہ دوبارہ کالج کے آنریری سیکرٹری کا عہدہ قبول نہیں کریں گے۔

۱۹۰۲ء میں مسلمانوں کی درخواست پر ان کو یہ بھی کرنا پڑا۔

تمام کوششوں کے باوجود یہ ہوکر رہا کہ اُردو کے ساتھ ایک حد تک ہندی زبان اور ناگری رسم الخط سرکاری کارروائی میں داخل ہوگیا۔

زبان کے اس تنازع نے دوقومی نظریہ کے احساس میں شدت پیدا کی، جس کی بنیاد پر علیحدہ ملک کی سیاست کا دور شروع ہوا اور مسلمانوں نے اپنے مذہب اور تہذیب کے بچاؤ کے لیے آزاد مسلم مملکت کے قیام کی جدوجہد کی۔

❀ ❀ ❀

ج: تقسیمِ ہند کی طرف پیش قدمی ــــ دوقومی نظریہ

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ ملکہ وکٹوریہ کی حکومت کا دور شروع ہوا۔

> یکم نومبر ۱۸۸۵ء کو ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے ایک اعلان شائع ہوا، جس میں والیانِ ملک، زمین داروں اور عوام کو بڑی تشفیاں دی گئیں، اور یہ یقین دلایا گیا کہ مذہب کے معاملے میں حکومت بالکل غیر جانب داری اور رواداری اختیار کرے گی اور سرکاری عہدے، ہر مذہب اور ملّت کے ہندوستانیوں کی دسترس کے اندر رہوں گے، بشرطیکہ ان میں وہ کام کرنے کی لیاقت اور صلاحیت ہو۔ ☆۱۲۸

اس اعلان کو عملی شکل نہ دی گئی جس سے ہندوستانی قوم اور خاص طور پر مسلمانوں کی مایوسی میں اضافہ ہوا، اور وہ ایک غیر مستحکم اور شکست خوردہ قوم بن کر رہ گئے۔

ان مایوس کن حالات میں سرسیّد نے مسلمانوں کو حوصلہ دیا اور انھیں ان تکلیف دہ حالات سے نکالنے کے لیے اپنی کوشش کا آغاز کیا۔

> سرسیّد نے تمام ذاتی مفادات کو پس پشت ڈال کر ایک بڑا جرأت مندانہ اقدام کیا اور ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' لکھ کر انگریزوں کو متنبہ کیا کہ کھسیانی بلی کی طرح کھمبا کھسوٹنے کے بجائے اپنے گریبان میں مُنہ ڈالو۔ بغاوت کے اسباب ہندوستانیوں کی سرکشی میں ڈھونڈنے کے بجائے اپنی حکمتِ عملی میں تلاش کرو۔ اپنی دوسری تصنیف ''لائل محمڈن آف انڈیا'' میں انھوں نے انگریز حکم رانوں کا تعارف ایسے مسلمانوں سے کرایا جو غدر کے پرآشوب دور میں بھی حکومت کے وفادار رہے تھے۔ اس طرح گویا مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کے غصّے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ ☆۱۲۹

سرسیّد نے ہندوستانی قوم کے لیے جو کچھ بھی کیا اس میں جذبات کے بجائے عقل اور دور اندیشی سے کام لیا۔ انگریزوں کے دل سے جذبۂ تعصب نکالنے اور مسلمانوں کو انگریزی زبان اور جدید تعلیم حاصل کرنے کی طرف راغب کرنے کی

کوشش کی۔

ملک کے حالات ایک بار پھر تشویش ناک ہو گئے:

قانونِ اسلحہ نافذ کیا گیا اور بڑی سختی کے ساتھ۔ ملک میں قحط پڑے۔ پولیس بڑی درشت تھی اور اس کے اختیارات نہایت وسیع تھے۔ زرعی اراضی کے بندوبست میں بڑی بے قاعدگیاں تھیں۔ جس سے زمیں دار اور کاشت کار دونوں پریشان تھے۔ عوام میں افلاس بہت تھا۔☆۱۳۰

ہندو اور مسلمانوں کے دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا جذبہ بیدار ہو گیا۔

اس پر مسٹر ہیوم کو یہ خیال پیدا ہوا کہ کوئی ایسا نظام چلانا چاہیے، جس کے ذریعے سے ہندوستانیوں کے دلوں کا بخار نکلتا ہے، تاکہ وہ خفیہ سازشوں کی طرف مائل نہ ہوں۔☆۱۳۱

چناں چہ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔☆۱۳۲

کانگریس کے قیام کے کچھ عرصے تک تو ہندوؤں کا رویّہ مسلمانوں کے ساتھ رہا لیکن بعد میں کانگریس میں اکثریت رکھنے کی دلیل دے کر مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی شروع کر دی جس کا مقصد انگریزوں کی خوشنودی حاصل کر کے اعلیٰ عہدوں اور ملازمتوں کا حصول تھا۔ انگریز ہندوؤں کی اس روش سے خوش تھے کیوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے متنفر دیکھنا ان کی دلی خواہش تھی۔

۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں سے اُردو زبان اور فارسی رسم الخط کے موقوف کرانے میں کوشش کرائی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھا جائے۔☆۱۳۳

انگریزوں نے ہندوؤں کی اس خواہش کو پورا کیا۔

۱۸/اپریل ۱۹۰۰ء کو ایک ریزولیوشن شائع کیا جس میں بعض سرکاری اغراض کے لیے ہندی بھاشا اور دیوناگری رسم الخط کے استعمال کی اجازت دے دی۔☆۱۳۴

اس واقعے کے بعد مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ ہندو اور مسلمان الگ الگ مذہب رکھنے کی وجہ سے مختلف خیالات اور تہذیب و تمدن رکھتے ہیں اس لیے ان کے درمیان اختلافات کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔

بیسویں صدی کی ابتدا ہی سے مسلمانوں میں شعور اور آگہی کی وجہ سے ہندوؤں اور انگریزوں سے نفرت کا جذبہ شدت اختیار کر گیا تھا۔ انگریزوں نے مسلمانوں کے دل سے اپنے خلاف نفرت ختم کرنے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات بڑھانے کے لیے تقسیم بنگال کا اعلان کیا۔

کرزن نے غور وغوض کے بعد ایک اسکیم پسند کی جس کی رو سے بنگال مغربی اور مشرقی بنگال میں تقسیم ہو گیا۔ مغربی بنگال میں ہندوؤں کی اکثریت رہی اور مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی۔ ☆۱۳۵

تقسیم بنگال کی جہاں مسلمانوں نے بہت پذیرائی کی وہاں ہندوؤں نے نہ صرف اس کی مخالفت کی، بلکہ تنسیخِ بنگال کا مطالبہ بھی کیا۔

یہ احتجاج نئے صوبے کے قیام ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۱ء تک جاری رہا۔ ☆۱۳۶

کانگریس کے اس احتجاج سے مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف منظم ہونے کے لیے سیاسی تنظیم اور سیاسی وحدت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس لیے ۱۹۰۶ء میں ڈھاکے میں نواب وقارالملک کی صدارت میں ''آل انڈیا مسلم لیگ'' قائم ہوئی جس کا مقصد مسلمانوں کے سیاسی حقوق و مفادات کی نگہداشت کرنا تھا۔ ☆۱۳۷

مسلم لیگ کے قیام کے بعد مسلمان سیاسی میدان میں آ چکے تھے اور انھوں نے حکومت سے اپنے مطالبات منوانے شروع کر دیے تھے ان کا سب سے بڑا مطالبہ ''جداگانہ انتخاب'' کا تھا جو منٹو مارلے اسکیم کے تحت مان لیا گیا، لیکن مسلمان تنسیخ بنگال کو نہ روک سکے۔

اکثریت کے غیر معمولی دباو کے زیرِ اثر ۱۹۱۱ء میں حکومت نے تنسیخِ تقسیمِ بنگال کا اقدام واپس لے لیا۔ ☆۱۳۸

مسلمانوں کو تنسیخِ تقسیمِ بنگال کا فیصلہ سخت ناگوار گزرا۔ ابھی یہ صدمہ باقی تھا کہ جنگِ عظیم اوّل شروع ہو گئی جس میں مسلمانوں کو برطانوی حکومت نے جبراً اپنی فوج میں شامل کیا۔

جنگِ عظیم اوّل ۱۴/اگست ۱۹۱۷ء کو شروع ہوئی تھی۔ ☆۱۳۹

جنگِ عظیم کی وجہ سے ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں فوج میں شامل ہونے کی وجہ سے بہت سے ہندوستانی فوجی جنگ میں مارے گئے اور بہت سے زخمی بھی ہوئے اس کے ساتھ ہی اپنی زمینوں اور کھیتوں سے محروم ہونا پڑا، اور انگریزوں نے صنعتی میدان میں بہت ترقی کی۔

اس جانی اور مالی نقصان نے ہندو اور مسلمانوں کو حکومتِ برطانیہ کے خلاف متحد ہونے پر مجبور کر دیا۔

۱۹۱۶ء میں لکھنؤ پیکٹ پر دونوں پارٹیوں کے عہدے داروں نے دست خط کر دیے۔ اس پیکٹ کا مقصد ہندوستان کو ڈومینین کا درجہ دلانا تھا۔ ☆۱۴۰

برطانوی حکومت کے خلاف نفرت کے جذبے سے دو اور جماعتیں وجود میں آئیں۔

۱۹۱۷ء میں ہوم رول لیگ کے نام سے دو جماعتیں وجود میں آئیں۔☆۱۴۱

برطانوی حکومت نے ان جماعتوں کے نمائندوں اور حامیوں کو گرفتار کرلیا۔

نومبر ۱۹۱۸ء میں جنگِ عظیم کا خاتمہ ہو گیا۔☆۱۴۲

جنگِ عظیم کا اختتام انگریزوں کی کام یابی پر ہوا۔حکومت برطانیہ نے ہندوستانیوں سے وعدہ کیا تھا کہ جنگ میں کام یاب ہونے کی صورت میں انھیں چند مراعات دی جائیں گی لیکن انھوں نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا۔جس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچی ،اور انگریزوں کے خلاف نفرت کا جذبہ شدت اختیار کر گیا۔

حکومت برطانیہ نے ان کے احتجاج کو دبانے کے لیے ایک نئی سیاسی سرگرمی شروع کی۔

۱۹۱۸ء میں رولٹ ایکٹ کے اصولی نفاذ نے اس کی ابتدا کی۔☆۱۴۳

اس کے باوجود ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنی سیاسی سرگرمیاں جاری رکھیں،اور ان سے جو کچھ ہو سکا انھوں نے کیا۔

ان حالات میں گاندھی جی نے ۱۹۱۹ء کے شروع میں ''ستیہ گرہ'' کی تحریک شروع کی،اس تحریک کے افتتاح کے طور پر ملک بھر میں ہڑتال کی گئی۔☆۱۴۴

جب لوگ جلیاں والا باغ میں اجتماعی جلسہ منعقد کرنے کے لیے جمع ہوئے تو ان پر مشین گنوں سے گولیاں برسائیں گئیں۔☆۱۴۵

جلیاں والا باغ کے حادثے کا ذمّے دار جرنل ڈائر تھا جس میں اُس نے ہندوستانیوں کو اس سفاکانہ طریقے سے مارا جسے تاریخ ہندوستان میں ہمیشہ یاد رکھا جائے۔

رولٹ ایکٹ کے نفاذ اور اس حادثے نے ہندوستانی اور خاص طور پر مسلمانوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا وہ اپنے حقوق کے لیے ایک بار پھر کھڑے ہو گئے اور مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی نے تحریکِ خلافت کا آغاز کیا۔۵ جولائی ۱۹۱۹ء کو بمبئی تحریکِ خلافت کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔گاندھی بھی اس تحریک میں شامل تھے۔ان کا مطالبہ یہ تھا کہ ترکوں کے ساتھ صلح کی جائے اور ان کی خلافت کو برقرار رکھا جائے اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں ترک موالات کی تحریک شروع کرنے کا اعلان کیا۔

چناں چہ ۳۱ راگست ۱۹۲۰ء کو ترکِ موالات تحریک شروع کر دی گئی۔☆۱۴۶

ہندوؤں اور مسلمانوں نے تحریکِ ترکِ موالات اور تحریکِ خلافت کو کام یاب بنانے کے لیے اقتصادی بائیکاٹ کیا، ملازمتوں اور تعلیمی اداروں کو خیر باد کیا،لیکن پھر بھی ان تحریکوں کا انجام ناکامی پر ہوا۔

تحریکِ خلافت جب عروج پر تھی تو مصطفیٰ کمال پاشا نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد خلافت کے خاتمے کا اعلان کر

دیا۔اس اعلان کے نتیجے میں ہندوستانی مسلمانوں کی تحریکِ خلافت مضحکہ خیز نظر آنے لگی اور اتحاد بین المسلمین کے جذبے کو بھی سخت صدمہ پہنچا۔

تحریکِ ترکِ موالات سے مسلمانوں کو بہت تکلیف پہنچی ہندو قوم سے مسلمانوں کا اعتماد اُٹھ گیا اور اس تحریک کی وجہ سے جو اتحاد قائم ہوا تھا وہ ہندوؤں کی خود غرض ذہنیت اور تعصبانہ رویے کی وجہ سے ختم ہو گیا اور ہندو مسلم فساد ایک بار پھر شدت اختیار کر گئے۔

> لالہ لاجپت رائے نے ہندو سنگھٹن کی تحریک نکالی۔اس کے پروگرام میں قواعد، پریڈ، لکڑی اور تلوار وغیرہ کی مشقیں تھیں اور یہ سب مسلمانوں سے لڑنے کے لیے ☆ ۱۴۷

ان تحریکوں نے مسلمانوں کی نفرت کو ہوا دی اور ان کے دل میں ہندوؤں کے لیے ذرہ برابر بھی جگہ نہ رہی ان کے باہمی اختلافات روز بروز بڑھنے لگے،اور مسلمانوں کی جان اور مال دونوں محفوظ نہ رہیں۔

> ان اختلافات اور جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے یہ تجویز پیش کی گئی کہ ایک متفقہ آئین کا مسودہ پیش کیا جائے جو ہندو اور مسلم دونوں کی تہذیب وتمدن اور مذہب کی حمایت کرے، لہٰذا ۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن کے چرچے نے اس تعطل کو توڑا۔ ☆ ۱۴۸

یہ سائمن کمیشن بعد میں نہرو رپورٹ کی شکل اختیار کر گیا اور:

> ۱۹ رمئی ۱۹۲۸ء کو نہرو رپورٹ منظرِ عام پر آئی تو اس کے بعد اس کے مختلف پہلوؤں پر یونٹی کانفرنسوں میں بحث مباحثہ جاری رہا۔ ☆ ۱۴۹

نہرو رپورٹ میں صرف ہندوؤں کے مفادات کی بات کی گئی تھی اس لیے یہ رپورٹ رد کر دی گئی۔

> اس ابتدائیے کے بعد قائدِ اعظم محمد علی جناح نے وہ قرارداد برائے منظوری پیش کی جسے قائدِ اعظم کے چودہ نکات کا نام دیا جاتا ہے۔ ☆ ۱۵۰

کانگریس کو قائدِ اعظم کے ۱۴ نکات منظور نہ تھے۔کیوں کہ قائدِ اعظم نے ان نکات میں نہرو رپورٹ کے برخلاف مسلمانوں کو مرکزی اسمبلی میں ۳/۱ نشستوں اور مختلف صوبوں میں مسلمانوں کو ان اکثریت کے مطابق نمائندگی کا مطالبہ کیا۔تمام اقلیتوں جن میں مسلمان بھی شامل تھے کے حقوق حاصل کرنے کا مطالبہ وغیرہ۔ظاہر ہے ان مطالبات میں کانگریس کو اپنا مفاد نظر نہیں آیا لہٰذا ان نکات کی مخالفت کرنا لازمی بات تھی۔

اب مسلمان بھی کانگریس کے ارادوں کو بھانپ چکے تھے،کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلاف روز کا معمول بن چکے تھے ان حالات میں علّامہ اقبال ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد میں اپنا خطبہ پیش کیا جس میں انھوں نے دو قومی نظریہ پیش کیا۔

شمال مغربی ہندو مسلم ریاست کی تشکیل کم از کم مجھ کو شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کی آخری منزل معلوم ہوتی ہے۔☆۱۵۱

ہندو مسلم اختلافات روز بروز بڑھتے جا رہے تھے۔ان اختلافات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے لارڈ ڈارون نے ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو گول میز کانفرنس کے انعقاد کی تجویز پیش کی، اور علامہ اقبال کا ۱۹۳۰ء کا اعلان گول میز کانفرنس کے شور وغل میں گم ہو گیا۔☆۱۵۲

۱۲ ر نومبر ۱۹۳۰ء کو پہلی گول میز کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی۔☆۱۵۳

اس کانفرنس میں مسلمانوں اور ہریجنوں کے لیے جداگانہ طریقہ انتخاب کو رائج کرنے کا فیصلہ کیا گیا،لیکن گاندھی کو ہریجنوں کے جداگانہ انتخاب کی تجویز پسند نہ آئی اور کانفریس کے لیڈروں نے ہنگامہ آرائی شروع کر دی اس وجہ سے انھیں گرفتار کر لیا گیا لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہے۔

نومبر ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی۔☆۱۵۴

دوسری بار بھی گاندھی نے جداگانہ طریقہ انتخاب پر اعتراض کا اظہار کیا،اور اس طریقہ انتخاب کو ختم نہ کرنے کی صورت میں جان کی بازی لگانے کی دھمکی دی۔گاندھی کا اصل مقصد یہ تھا کہ ملک میں جداگانہ انتخابات نہ ہوں اور کانگریس ہی واحد سیاسی پارٹی ہو جو اقلیتوں کے حقوق کا فیصلہ کرے۔

برطانوی وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ نے ۱۴ اگست ۱۹۳۲ء کو ہندوستان کی اقلیتوں کے مسائل حل کرنے کے لیے ایک اعلان شائع کروایا۔یہ اعلان کمیونل ایوارڈ کے نام سے مشہور ہے اس ایوارڈ میں اقلیتوں کو جداگانہ انتخابات کی رعایت دے دی گئی۔☆۱۵۵

مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کا حق قائم رہا اور ان کے ساتھ یورپین،سکھ،اینگلو انڈین اور ہندوستانی عیسائیوں کے لیے بھی وہ منظور ہوا۔☆۱۵۶

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فاصلے بڑھتے گئے وہ ایک ملک میں رہنے کے باوجود مذہبی اور تہذیبی لحاظ سے فرق رکھتے تھے اور یہی فرق ان کے اختلافات کا سبب تھا۔

۱۹۳۳ء میں کیمبرج کے طالب علم چوہدری رحمت علی نے پاکستان کا منصوبہ بنایا تھا۔جس میں موجود ہندوستان کے پانچ مسلم اکثریت والے صوبوں کو ملا کر پاکستان بنایا جائے۔یہ صوبے پنجاب،شمالی مغربی سرحدی صوبہ،سندھ اور بلوچستان تھے۔☆۱۵۷

مسلم لیگ نے چوہدری رحمت علی کی اس تجویز کو خاص اہمیت نہ دی اور اسے ایک نوجوان کے جذبات فیصلے سے زیادہ

کچھ اور نہ سمجھا۔

۱۹۳۵ء میں انڈیا ایکٹ نافذ ہوا۔ جس کے تحت صوبائی حکومتیں چند تحفظات کے تحت اس ایکٹ کے مطابق جداگانہ طریقہ انتخاب تسلیم کرلیا گیا۔

۱۹۳۵ء کا انڈیا ایکٹ مسلمانوں کو اور دوسری اقلیتوں کو مطمئن نہ کر سکا اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس ایکٹ کے مطابق تمام اقلیتوں کو صرف چند تحفظات سے نوازا گیا تھا، دوسرے یہ کہ اگر وہ انتخابات میں جیت بھی جائے تو وہ گورنر اور گورنر جنرلوں کے پابند رہتے۔

غرض ۱۹۳۷ء میں اس ایکٹ کی رُو سے انتخابات ہوئے۔ ☆۱۵۸

اور ان انتخابات میں کانگریس کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔ اپنی کامیابی کے نشے میں وہ دوسروں کے حقوق بالکل بھول گئے، اور مسلمانوں سمیت تمام اقلیتوں کو زبردستی اپنی تہذیب وتمدن میں ڈھالنے کی کوشش شروع کردی۔

''کانگریس کی وزارتیں قائم ہوتے ہی ہندوؤں نے یہ سمجھ لیا کہ ان کا راج آ گیا۔ یوپی میں، بہار میں اور ہندو اکثریت کے دوسرے صوبوں میں اذان پر، نماز پر، قربانی پر، محرم کے جلوس پر روک ٹوک اور حملے اپنے غلبے کے مظاہرے کے لیے انھوں نے ضروری قرار دے دیا۔

پولیس نے ان ہنگاموں سے لاپروائی اختیار کی، اور وہ دباتی بھی تھی تو مسلمانوں ہی کو۔ خود کانگریسی حکومت نے سرکاری عمارتوں پر کانگریس کے جھنڈے لگوا دیے۔ بندے ماترم کو قومی ترانہ قرار دیا۔ سرکاری اسکولوں میں کانگریس کے جھنڈے کی سلامی جاری کی۔

کانگریسی حکومتوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ مسلمانوں کو یہ محسوس کرایا کہ ان کی رائے اور مرضی کوئی چیز نہیں، ان کو اس ملک میں ہندوؤں کے تابع ہو کر رہنا ہوگا۔ ☆۱۵۹

کانگریس کو وزارت سنبھالے ہوئے ابھی دو ہی سال ہوئے تھے کہ:

ہٹلر نے یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ ☆۱۶۰

اور دوسری جنگِ عظیم کا آغاز ہوا۔ دو ہی دن بعد برطانیہ اور فرانس ہٹلر کے خلاف میدانِ جنگ میں کود پڑے۔

برطانوی حکومت نے دوسری جنگِ عظیم میں بھی پہلی جنگِ عظیم کی طرح ہندوستانی قوم کو جنگ لڑنے کے لیے مجبور کر دیا اور ہندوستانی قوم کو برطانوی حکومت کو شکست سے بچانے کے لیے اپنی جان، مال اور عزت کو داو پر لگا دیا، لیکن ان کے دل میں برطانوی حکومت کے لیے نفرت اور بیزاری کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ یہ نفرت اور بیزاری ہندو اور مسلمان دونوں کے دلوں میں تھی اور دونوں نے اس کا اظہار بھی کیا۔

...اور ۱۹۴۰ء کی بمبئی کانگریس میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں کہا گیا تھا کہ اگر حکومت برطانیہ جنگ کے بعد ہندوستان کو آزاد کرنے اور وقتی طور پر حکومت میں انھیں مؤثر اختیارات دینے کو تیار ہو جائے تو کانگریس اس کی مدد کرے گی... جب کہ سبھاش چندر بوس اور ان کے ساتھی کسی شرط پر بھی حکومت برطانیہ کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار نہ تھے۔ ☆۱۶۱

اس طرح کانگریس دو گروپوں میں تقسیم ہو گئی اور سبھاش چندر بوس اور اس کے ساتھیوں نے جنگِ عظیم دوم میں برطانیہ کے حریف جاپان کے حامی بن گئے۔

مسلمان جو ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے نتیجے میں پہلے ہی پس چکے تھے جنگِ عظیم دوم میں زبردستی شامل ہوئے۔ اب مسلمانوں کو اپنے لیے ایک علیحدہ مسلم مملکت کی ضرورت پیش آئی ہندوؤں اور انگریزوں کی غلامی سے نجات کے لیے انھیں اس سے بہتر کوئی اور صورت نظر نہیں آئی۔

آخر ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کا ریزولیشن نے مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونک دی اور انھوں نے اپنی تہذیب و ثقافت اور کلچر کے بقا کے لیے علیحدہ خطے کا مطالبہ کیا تا کہ وہ ہندو اکثریتی علاقہ سے الگ رہ کر جس قدر بھی مسلمانوں کی تہذیب و تمدن بچا سکیں، بچالیں۔ اس ریزولیشن کا خلاصہ یہ ہے:

مسلمانوں کے نزدیک کوئی آئین قابلِ منظوری نہ ہوگا جب تک مسلمانوں کے لیے شمال و مغرب اور شمال و مشرق میں ایسے خطے نہ بنا دیے جائیں جن میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہو۔ وہ خطے کامل آزاد ہوں گے اور جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت میں ہوں گے وہاں ان کا مذہب، کلچر، سیاست اور دیگر حقوق بذریعہ قوانین محفوظ کیے جائیں۔ ☆۱۶۲

اور اس آزاد خطے کا نام پاکستان تجویز کیا گیا۔

برطانوی حکومت نے ۱۹۴۰ء کی قرارداد منظور کر لی لیکن کانگریس کو ملک کی تقسیم منظور نہ تھی۔ کانگریس نے مسلمانوں کے دل سے علیحدہ ملک کی خواہش کو نکالنے کے لیے کبھی انھیں دوست بن کر یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ پاکستان ایک غریب ملک ہوگا اور وہاں صنعتی ترقی کے مواقع کم ہوں گے اور مسلمانوں کے دل میں بددلی اور مایوسی پیدا کرنے کی پوری کوشش کی، لیکن مسلمانوں کی سچی لگن اور مستقل مزاجی کے آگے ہندوؤں کی کوششیں ناکام ہو گئیں، تو کانگریس نے ایک اور مہم شروع کر دی۔

اگست ۱۹۴۲ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے وہ قرارداد منظور کی جس میں برطانوی حکومت سے ہندوستان چھوڑنے کا مطالبہ کیا گیا تھا، اور جس کی بنا پر ہندوستان میں وہ انقلابی تحریک شروع ہوئی تھی جسے ''۹ اگست ۱۹۴۲ء کی جدوجہد'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ☆۱۶۳

برطانوی حکومت نے کانگریس کی اس تحریک کی مخالفت کی اور سزا کے طور پر کانگریس کے نمائندوں کو گرفتار کرلیا۔
ان گرفتاریوں کے بعد کانگریس اور برطانوی حکومت کے درمیان فسادات شروع ہو گئے دونوں نے ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی حالات کو معمول پر لانے کے لیے:

سراسٹیفورڈ کرپس کی سرگردگی میں ۲۲مارچ ۱۹۴۳ء کو ''کرپس مشن'' ہندوستان میں آیا۔☆۱۶۴

مسلم لیگ نے ''کرپس مشن'' کو اس لیے مسترد کردیا کہ اس میں پاکستان کے قیام کا واضح طور پر اعلان نہیں کیا گیا تھا۔ جب کہ کانگریس نے کرپس مشن کو اس لیے مسترد کردیا تھا کہ صوبوں کو خود مختاری کا اختیار دے کر بھارت کے اتحاد پر کاری ضرب لگائی تھی۔

راجا گوپال اچاریہ نے کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین مسائل کی مفاہمت کے لیے مارچ ۱۹۴۴ء میں ایک فارمولا پیش کیا۔☆۱۶۵

اس فارمولے میں قائدِ اعظم اور گاندھی کے درمیان گفتگو ہوئی دونوں نمائندوں نے اپنے اپنے مطالبات منوانے کی کوشش کی۔ قائدِ اعظم نے علیحدہ وطن کا مطالبہ اور گاندھی نے متحدہ ملک کے قیام کو اہمیت دے رہے تھے لیکن بالآخر قائدِ اعظم اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو گئے۔

الٰہ آباد کے اجلاس میں کانگریس نے یہ تجویز دوبارہ نامنظور کردی گئی اور اس کی جگہ یہ قرارداد منظور کی گئی:
کانگریس کوئی ایسی اسکیم منظور نہیں کرے گی، جس میں ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کا خیال ہو۔☆۱۶۶

اس طرح ہندو مسلم فسادات پھر شروع ہو گئے۔ لارڈ ویول نے ان اختلافات کو ختم کرنے کے لیے دونوں کے درمیان ایک کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔

۱۵رجون ۱۹۴۵ء کو دن کے گیارہ بجے وائسر یگل لاج شملہ میں کانفرنس منعقد ہوئی۔☆۱۶۷

شملہ کانفرنس میں کرپس مشن کی تجاویز کو دوبارہ دہرایا گیا اور مسلم لیگ اور کانگریس کو اس پر عمل کرنے کا مشورہ دیا گیا، لیکن دونوں طرف سے اس مشورہ پر عمل نہیں کیا گیا۔ اس طرح شملہ کانفرنس بھی ناکام ہو گئی۔
شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد انگلستان میں نئے انتخابات ہوئے۔ اس میں چرچل کو شکست ہوئی اور لیبر حکومت برسراقتدار آئی اور کلمینٹ ایٹلی وزیرِ اعظم ہوئے جب کہ لارڈ پتھک لارنس وزیرِ ہند مقرر ہوئے۔

اگست ۱۹۴۵ء کو لارڈ ویول نے اعلان کیا کہ ہز مجسٹی کی حکومت اور صوبائی حکومتوں سے مشورے کے بعد مرکزی اور صوبائی مجالسِ مقننہ کے انتخابات، جس قدر جلد ممکن ہوگا، منعقد کیے جائیں

گے۔☆۱۶۸

انتخابات منعقد ہوئے اور یکم جنوری ۱۹۴۶ءکو ان کے نتائج کا اعلان کر دیا گیا۔☆۱۶۹

ان انتخابات میں مسلم لیگ کو شان دار کام یابی حاصل ہوئی۔

مسلمانوں نے پوری یکسوئی کے ساتھ مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں سو فی صدی کام یابی حاصل کی جو پارلیمنٹری تاریخ کی مثالی فتح تھی اور صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں ۴۹۵ر میں ۴۴۶ر نشستیں حاصل کیں۔☆۱۷۰

مسلمانوں کی یہ کام یابی اس بات کا ثبوت ہے کہ بیش تر ہندوستانی مسلمان مسلم لیگ کو ہی اپنی نمائندہ جماعت سمجھ کر اس کا ساتھ دیتے تھے۔

عام انتخابات کے بعد حکومت برطانیہ نے تین ممبران پر مشتمل ایک کابینی وفد (کیبنٹ مشن) ہندوستان بھیجا تاکہ مسلم لیگ اور کانگریس جو اپنے اپنے مطالبے پر قائم ہیں۔قیامِ پاکستان تک کسی ایک نکتے پر متفق ہو جائیں۔

یہ وزرائے ثلاثہ چھٹے یوم پاکستان پر یعنی ۲۳ر مارچ ۱۹۴۶ء کو کراچی کی طیران گاہ پر اترے۔

''کیبنٹ مشن'' نے وائسرائے ایگزیکٹو کونسل اور ہندوستانی قائدین سے گفت و شنید کی جس سے معاملہ کی خاطر خواہ تحقیق ہو سکے۔☆۱۷۱

کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں سے گفت و شنید کرنے کے بعد وفد نے اپنی سفارشات کا اعلان کیا۔کابینہ مشن کا منصوبہ دو حصّوں پر مشتمل تھا۔طویل المقاصد اور دوسرا فوری اقدامات سے متعلق تھا۔

کانگریس اور مسلم لیگ نے دوسرے حصّے کو تسلیم کر لیا۔

وائسرائے مسلم لیگ اور کانگریس کو یہ تجویز پیش کی کہ جب تک ہندوستان کی تقسیم نہیں ہو جاتی ایک عبوری حکومت تشکیل کی جائے جس میں اہم سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کو وزارت دی جائے گی۔وائسرائے نے اپنا منصوبہ اس طرح بیان کیا۔

ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ فوری طور پر ایسے انتظامات کیے جائیں جن کی روشنی میں اہلِ ہندوستان ملک کے آئندہ دستور کے بارے میں فیصلہ کر سکیں اور ایک عبوری حکومت بلا کسی تاخیر کے فوراً قائم کر دی جائے تاکہ اس وقت جب تک نیا دستور قائم نہیں ہوتا برطانوی ہند کا نظم و نسق چلا سکے۔☆۱۷۲

مسلم لیگ نے عبوری حکومت کی تجاویز کو رد کر دیا کیوں کہ مسلم لیگ اپنی ساری کوششیں الگ وطن کے حصول کے لیے کرنا چاہ رہی تھی۔

۲؍ستمبر ۱۹۴۶ءکو عارضی حکومت بنی۔ ☆۱۷۳

لیکن مسلم لیگ اس میں شامل نہ ہوئی اور ہندو مسلم اختلافات اپنی جگہ قائم رہے ان اختلافات کی وجہ سے دونوں کے درمیان نفرت اور فاصلے بڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ دونوں فرقوں کے لوگوں نے مشتعل ہو کر ایک دوسرے پر حملے اور مذہب کی توہین کرنا شروع کر دی۔

چناں چہ اس صورتِ حال کو معمول پر لانے کے لیے مسلم لیگ کو اپنے موقف کو بدلنا پڑا۔
اور ۱۵؍اکتوبر ۱۹۴۶ کو مسلم لیگ نے بھی عارضی حکومت میں شمولیت اختیار کر لی۔ ☆۱۷۴

اس کے بعد وائسرائے نے قائدِ اعظم اور پنڈت جواہر لال نہرو کے ایک ساتھ گفتگو کے لیے مدعو کیا، دونوں نے اپنی اپنی آرا بیان کیں۔ اس کے بعد وائسرئے نے اپنا آخری فیصلہ یوں پیش کیا۔

ایگزیکٹو کونسل میں ۱۴؍ارکان ہوں گے۔ پانچ لیگ کے، چھ کانگریس کے، جس میں سے
ایک پس ماندہ اقوام کا نمائندہ شامل ہو، ایک سکھ، ایک ہندوستانی عیسائی یا پارسی۔ ☆۱۷۵

کانگریس نے وزارتِ تعلیم میں ایک بار پھر سیاسی چال چلی اور وزارتِ خزانہ مسلم لیگ کو دی تاکہ یہ ثابت کر سکے کہ جو جماعت ایک محکمہ نہیں سنبھال سکتی وہ ایک حکومت کیسے چلا سکتی ہے۔

عجیب اتفاق ہے کہ مسلم لیگ کو اس سے قبل بجٹ بنانے کا کوئی تجربہ نہ تھا لیکن لیاقت علی خان نے غریب آدمی کا بجٹ پیش کر کے بڑے بڑے صنعت کاروں پر بھاری ٹیکس عائد کر دیے۔ جس سے کانگریسی لیڈر حیران رہ گئے۔

ابوالکلام آزاد نے اِس حقیقت کو یوں بیان کیا:

I will be remembered that this was due entirely to sardar Patel who in his anxiety to retain the home protfolio offered finance to the Muslim League.

There were some very able and senior Muslim officers in the Finance department who gave every possible help to Liaqat Ali Khan. With their advice Liaqat Ali Khan able to reject or delay every proposal put up by the congress members of the executive council. Sardar Patel discovered that though he was home member he could not creat the post of a chaprasi without Liaqat Ali's concurence the Congress member of the Council were at a loss and did not know what to do.۱۷۶☆

چناں چہ مسلمانوں کی ذہانت اور کوششوں نے اپنا رنگ دکھایا اور کانگریس اور حکومتِ برطانیہ کو مسلم لیگ کے حق میں

اپنا فیصلہ سنانا پڑا۔

> ۲۰ رفروری ۱۹۳۸ء کومسٹر ایٹلی وزیر اعظم برطانیہ نے کہا کہ ’ملکۂ معظم کی حکومت یہ بات واضح کردینا چاہتی ہے کہ حکومت کا یہ ارادہ ہے کہ جون ۱۹۴۸ء سے پہلے پہلے ذمّے دار ہندوستانی ہاتھوں میں اقتدار منتقل کرنے کے لیے ضروری اقدامات کیے جائیں۔☆۱۷۷

اس کے بعد لارڈ ویول کو انگلستان واپس بلالیا گیا اور ان کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا گیا۔

> تین جون ۱۹۴۷ء کو برطانوی وزیر اعظم نے برِصغیر سے برطانوی حکومت واقتدار کے خاتمے کے لیے ایک منصوبے کا اعلان کیا۔☆۱۷۸

انھوں نے اپنے منصوبے کو اس طرح بیان کیا۔

> ملکۂ معظم کی گورنمنٹ اس کے لیے تیار ہے کہ جون ۱۹۴۸ء سے بھی قبل مرتبہ نوآبادی کی بنیاد پر ایک یا دو وارث مختار مجاز یا مختاران مجاز کو اس فیصلے کے مطابق اختیار منتقل کردے جو منصوبے کے تحت میں کیا جائے گا۔☆۱۷۹

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اس منصوبے پر مسلم لیگ اور کانگریس دو جماعتیں متفق تھیں، لیکن اس کے باوجود لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تقسیمِ ہند کی تاریخ کو بدل دیا۔ اس تبدیلی سے کانگریس کو تو کوئی تکلیف نہیں پہنچی لیکن مسلم لیگ کے لیے نیا منصوبہ کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں تھا:

> لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ۴رجون کو اخباری نمائندوں کی کانفرنس میں پہلی مرتبہ حکومتِ برطانیہ کے اس ارادے کا اعلان کیا کہ جون ۱۹۴۸ء تک نہیں، بلکہ ۱۵راگست ۱۹۴۷ء تک اختیارِ حکومت منتقل کردیا جائے گا۔☆۱۸۰

چناں چہ ۱۴راگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی تشکیل عمل میں آئی اور مسلمانوں نے ہندوؤں سے آزادی کا جو خواب دیکھا تھا وہ پورا ہو گیا، لیکن یہ آزادی اپنے ساتھ خوشیاں کم اور غم زیادہ لے کر آئی۔ جتنے ہنگامے آزادی حاصل کرنے کے لیے ہوئے تھے اس سے زیادہ فسادات ہجرت کے دوران ہوئے۔ قتل وغارت، لوٹ مار، عصمت دری اور آتش زنی کے ایسے شرم ناک واقعات پیش آئے کہ ان واقعات کے ذمّے دار افراد کو انسان کہنا انسانیت کی توہین ہوگی۔ ہجرت کے دوران بیش تر لوگ مارے گئے اور جو بچ گئے وہ روحانی طور پر زخمی ہو گئے۔ ان زخموں کو بھرنے کے لیے ایک وقت لگا۔

غرض تقسیمِ ہند سے ایک ملک کی تقسیم نہیں ہوئی، بلکہ خاندان، یادیں اور تہذیب بھی تقسیم ہو کر رہ گئے۔

تقسیم کے وقت جو قتل وغارت گری، اغوا اور آبرو ریزی کا بازار گرم ہوا۔ ایسی وحشت کہ قصبے کے قصبے اور محلّوں کے

محلّے تباہ و برباد کر دیے گئے۔ ریلیں زندہ انسانوں کو لے کر جاتیں اور منزل پر مردے پہنچتے۔

مگر اس سے زیادہ افسوس ناک پہلو آبروریزی کے واقعات تھے جن سے کم از کم دو نسلیں متاثر ہوئیں اور جس کے زخموں کا اندمال بمشکل ہی ہو سکا۔

مرے کا صبر آ جاتا ہے مگر زندہ بچہ کھو جائے تو زندگی بھر ماں باپ اس کے لیے پریشان ہی رہتے ہیں اور یوں زندگی انتظار میں کٹتی ہے۔

تقسیم نے انسانوں کو اس قسم کے نفسیاتی معاشرتی اور معاشی مسائل سے دوچار کیا۔ اہلِ قلم نے اس پر خامہ فرسائی کی اور یہی ہمارا موضوعِ تحقیق ہے۔

❁ ❁ ❁

حوالہ جات:

☆۱　''تاریخِ مسلمانانِ پاکستان و بھارت'' (جلد اوّل)، سیّد ہاشمی فرید آبادی، انجمنِ ترقیٔ اُردو پاکستان، کراچی، مئی ۱۹۸۷ء، ص ۸۳

☆۲　''سلطان محمود غزنوی''، ڈاکٹر محمد ناظم، بحوالہ: ''پاکستان ناگزیر تھا''، سیّد حسن ریاض، شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، اشاعتِ ششم، ۱۹۹۲ء، ص ۹

☆۳　''پاکستان منزل بہ منزل''، شریف الدین پیرزادہ، گلڈ اشاعت گھر، کراچی، سنہ ندارد، ص ۱۸-۱۷

☆۴　''رودِ کوثر''، شیخ محمد اکرام، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، چھٹی بار ۱۹۷۵ء، ص ۲۴

☆۵　''رودِ کوثر''، محولہ بالا، ص ۱۱۹

☆۶　''تاریخِ مسلمانانِ پاکستان و بھارت'' (جلد اوّل)، محولہ بالا، ص ۴۶۸

☆۷　''رودِ کوثر''، محولہ بالا، ص ۱۲۰

☆۸　''رودِ کوثر''، محولہ بالا، ص ۴۴۲

☆۹　''رودِ کوثر''، محولہ بالا، ص ۴۲۳

☆۱۰　''تاریخِ مسلمانانِ پاکستان و بھارت'' (جلد اوّل)، محولہ بالا، ص ۵۴۹

☆۱۱　''تاریخِ مسلمانانِ پاکستان و بھارت'' (جلد اوّل)، محولہ بالا، ص ۵۵۰-۵۴۹

☆۱۲　''تاریخِ مسلمانانِ پاکستان و بھارت'' (جلد اوّل)، محولہ بالا، ص ۵۵۰

☆۱۳　''رودِ کوثر''، محولہ بالا، ص ۵۹۸

☆۱۴　''رودِ کوثر''، محولہ بالا، ص ۵۹۸

☆۱۵　''رودِ کوثر''، محولہ بالا، ص ۵۹۸

☆۱۶　''رودِ کوثر''، محولہ بالا، ص ۵۹۹-۵۹۸

☆۱۷　''رودِ کوثر''، محولہ بالا، ص ۵۹۹

☆۱۸　''رودِ کوثر''، محولہ بالا، ص ۵۹۹

☆۱۹　''رودِ کوثر''، محولہ بالا، ص ۵۹۹

☆۲۰　''رودِ کوثر''، محولہ بالا، ص ۵۹۹

☆۲۱ ''رودِکوثر''،محولۂ بالا،ص ۵۹۹

☆۲۲ ''پاکستان ناگزیر تھا''،محولۂ بالا،ص ۱۹

☆۲۳ ''تحریکِ آزادی میں اُردو کا حصّہ''، ڈاکٹر معین الدین عقیل، انجمنِ ترقی اُردو پاکستان، کراچی، ۱۹۷۶ء، ص ۱۸

☆۲۴ ''تحریکِ آزادی میں اُردو کا حصّہ''، محولۂ بالا،ص ۱۹

☆۲۵ ''تحریکِ آزادی میں اُردو کا حصّہ''، محولۂ بالا،ص ۲۰

☆۲۶ ''کمپنی کی حکومت''، باری، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۶۹

☆۲۷ ''کمپنی کی حکومت''، محولۂ بالا،ص ۷۰

☆۲۸ ''کمپنی کی حکومت''، محولۂ بالا،ص ۴-۱۰۳

☆۲۹ ''کمپنی کی حکومت''، محولۂ بالا،ص ۱۰۴

☆۳۰ ''پاکستان ناگزیر تھا''، محولۂ بالا،ص ۱۸

☆۳۱ ''تحریکِ آزادی میں اُردو کا حصّہ''، محولۂ بالا،ص ۴۱

☆۳۲ ''تحریکِ آزادی میں اُردو کا حصّہ''، محولۂ بالا،ص ۴۱

☆۳۳ ''کمپنی کی حکومت''، محولۂ بالا،ص ۱۰۴

☆۳۴ ''تحریکِ آزادی میں اُردو کا حصّہ''، محولۂ بالا،ص ۲۹

☆۳۵ ''بہادر شاہ ظفر''، اسلم پرویز، انجمنِ ترقی اُردو ہند، دہلی، ص ۵۵

☆۳۶ ''بہادر شاہ ظفر''، محولۂ بالا،ص ۶۵

☆۳۷ ''سینٹرل انڈیا ڈیورنگ دی ریبلین آف 58-1857، تھامسن لو، بحوالہ: ''انقلاب ۱۸۵۷ء''، مرتبہ: پی سی جوشی، ترقیٔ اُردو بیورو، نئی دہلی، دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۳ء، ص ۱۵

☆۳۸ ''جہاتِ جہدِ آزادی''، ڈاکٹر معین الدین عقیل، الوقار پبلیکیشنز، لاہور، مارچ ۱۹۹۸ء، ص ۲۶۹

☆۳۹ ''پاکستان ناگزیر تھا''، محولۂ بالا،ص ۲۴

☆۴۰ ''بہادر شاہ ظفر''، محولۂ بالا،ص ۱۲۰

☆۴۱ ''بہادر شاہ ظفر''، محولۂ بالا،ص ۱۲۶

☆۴۲ ''تاریخِ مذاہب''، رشید احمد، قلات پبلشرز، کوئٹہ، تیسرا ایڈیشن ۱۹۷۹ء، ص ۱۱۶

☆۴۳ ''تاریخِ مذاہب''، محولۂ بالا،ص ۱۱۷

☆۴۴ ''تاریخِ مذاہب''،محولہٗ بالا،ص۱۸-۱۱۷

☆۴۵ ''پاکستان منزل بہ منزل''،محولہٗ بالا،ص۸

☆۴۶ ''تاریخِ مذاہب''،محولہٗ بالا،ص۱۲۰

☆۴۷ ''تاریخِ مذاہب''،محولہٗ بالا،ص۱۲۰

☆۴۸ ''ادیان و مذاہب کا تقابلی مطالعہ''،ڈاکٹر عبدالرشید، طاہر سنز، کراچی، طبعِ اوّل ۱۹۸۶ء،ص۵۴-۵۳

☆۴۹ ''تاریخِ مذاہب''،محولہٗ بالا،ص۱۲۱

☆۵۰ ''تاریخِ مذاہب''،محولہٗ بالا،ص۱۲۲

☆۵۱ ''ادیان و مذاہب کا تقابلی مطالعہ''،محولہٗ بالا،ص۱۷۹

☆۵۲ ''ادیان و مذاہب کا تقابلی مطالعہ''،محولہٗ بالا،ص۱۸۰

☆۵۳ ''تاریخِ مذاہب''،محولہٗ بالا،ص۱۲۶

☆۵۴ ''تاریخِ مذاہب''،محولہٗ بالا،ص۱۲۶

☆۵۵ ''تاریخِ مذاہب''،محولہٗ بالا،ص۱۲۸۶

☆۵۶ ''تاریخِ مذاہب''،محولہٗ بالا،ص۱۲۷

☆۵۷ ''ہندوصنمیات''،مہر عبدالحق، بیکن بکس، ملتان، بار اوّل ۱۹۹۳ء،ص۵۱۸

☆۵۸ ''ہندوصنمیات''،محولہٗ بالا،ص۵۱۵

☆۵۹ ''ہندوصنمیات''،محولہٗ بالا،ص۱۳-۱۳/

☆۶۰ ''تاریخِ مذاہب''،محولہٗ بالا،ص۱۱۳۰

☆۶۱ ''پاکستان منزل بہ منزل''،محولہٗ بالا،ص۹

☆۶۲ ''تاریخِ مذاہب''،محولہٗ بالا،ص۲۹۵

☆۶۳ ''تاریخِ مذاہب''،محولہٗ بالا،ص۲۹۴

☆۶۴ ''تاریخِ مذاہب''،محولہٗ بالا،ص۲۹۴

☆۶۵ ''تاریخِ مذاہب''،محولہٗ بالا،ص۲۹۵

☆۶۶ ''تاریخِ مذاہب''،محولہٗ بالا،ص۲۹۷

☆۶۷ ''ادیان و مذاہب کا تقابلی مطالعہ''،محولہٗ بالا،ص۱۷۲

☆۶۸ ''تاریخِ مذاہب''،محولۂ بالا،ص ۲۹۷

☆۶۹ ''ادیان و مذاہب کا تقابلی مطالعہ''،محولۂ بالا،ص۷۳-۱۷۲

☆۷۰ ''ادیان و مذاہب کا تقابلی مطالعہ''،محولۂ بالا،ص۱۷۴

☆۷۱ ''تعارفِ مذاہبِ عالم''،ایس ایم شاہد،نیو بک پیلس،لاہور،ص۲۱۱

☆۷۲ ''مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ''،چودھری غلام رسول،علمی کتاب خانہ،لاہور،۱۹۹۴ء،ص۱۳۱-۱۳۰

☆۷۳ ''مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ''،محولۂ بالا،ص ۱۴۷

☆۷۴ ''مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ''،محولۂ بالا،ص ۱۴۷

☆۷۵ ''مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ''،محولۂ بالا،ص ۱۴۸

☆۷۶ ''تعارفِ مذاہبِ عالم''،محولۂ بالا،ص۱۰۲۰

☆۷۷ ''تاریخِ ادبِ ہندی''،ڈاکٹر وقار احمد رضوی،آگہی پبلی کیشنز،کراچی۱۹۹۳ء،ص ۴۷

☆۷۸ ''تعارفِ مذاہبِ عالم''،محولۂ بالا،ص ۲۵۷

☆۷۹ ''تعارفِ مذاہبِ عالم''،محولۂ بالا،ص ۲۵۷

☆۸۰ ''تاریخِ مذاہب''،محولۂ بالا،ص۱۴۴

☆۸۱ ''تاریخِ ادبِ ہندی''،محولۂ بالا،ص ۴۷

☆۸۲ ''تاریخِ مذاہب''،محولۂ بالا،ص۱۴۵

☆۸۳ ''مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ''،محولۂ بالا،ص ۲۰۱

☆۸۴ ''تعارفِ مذاہبِ عالم''،محولۂ بالا،ص ۲۶۸

☆۸۵ ''تاریخِ مذاہب''،محولۂ بالا،ص۱۴۵

☆۸۶ ''تعارفِ مذاہبِ عالم''،محولۂ بالا،ص ۲۶۷

☆۸۷ ''تعارفِ مذاہبِ عالم''،محولۂ بالا،ص ۲۶۸

☆۸۸ ''تعارفِ مذاہبِ عالم''،محولۂ بالا،ص ۲۷۱

☆۸۹ ''تعارفِ مذاہبِ عالم''،محولۂ بالا،ص ۲۶۷

☆۹۰ ''مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ''،محولۂ بالا،ص ۲۰۳

☆۹۱ ''تعارفِ مذاہبِ عالم''،محولۂ بالا،ص۲۷۲

☆۹۲ ''تمدّنِ ہند پر اسلامی اثرات''، ڈاکٹر تارا چند، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۲۸۳

☆۹۳ ''تاریخِ مذاہب''، محولۂ بالا، ص ۱۴۶

☆۹۴ ''تاریخِ مذاہب''، محولۂ بالا، ص ۱۴۶

☆۹۵ ''تاریخِ مذاہب''، محولۂ بالا، ص ۱۴۶

☆۹۶ ''مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ''، محولۂ بالا، ص ۲۰۷

☆۹۷ ''تاریخِ مذاہب''، محولۂ بالا، ص ۱۴۸

☆۹۸ ''تاریخِ مذاہب''، محولۂ بالا، ص ۱۴۸

☆۹۹ ''مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ''، محولۂ بالا، ص ۲۱۷

☆۱۰۰ ''مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ''، محولۂ بالا، ص ۲۱۷

☆۱۰۱ ''تعارفِ مذاہبِ عالم''، محولۂ بالا، ص ۹۲-۲۹۱

☆۱۰۲ ''تعارفِ مذاہبِ عالم''، محولۂ بالا، ص ۲۲۶

☆۱۰۳ ''تعارفِ مذاہبِ عالم''، محولۂ بالا، ص ۲۳۰

☆۱۰۴ ''تعارفِ مذاہبِ عالم''، محولۂ بالا، ص ۳۱-۲۳۰

☆۱۰۵ ''مسلم ثقافت ہندوستان میں''، عبدالمجید سالک، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، طبع سوم ۱۹۸۲ء، ص ۲۶

☆۱۰۶ ''تعارفِ مذاہبِ عالم''، محولۂ بالا، ص ۲۳۰

☆۱۰۷ ''تعارفِ مذاہبِ عالم''، محولۂ بالا، ص ۲۳۰

☆۱۰۸ ''تعارفِ مذاہبِ عالم''، محولۂ بالا، ص ۱۱۸

☆۱۰۹ ''تعارفِ مذاہبِ عالم''، محولۂ بالا، ص ۱۱۷

☆۱۱۰ ''تعارفِ مذاہبِ عالم''، محولۂ بالا، ص ۲۲۹

☆۱۱۱ ''تعارفِ مذاہبِ عالم''، محولۂ بالا، ص ۱۵۶

☆۱۱۲ ''مذاہبِ عالم کا تقابلی مطالعہ''، محولۂ بالا، ص ۱۲۰

☆۱۱۳ ''مسلم ثقافت ہندوستان میں''، محولۂ بالا، ص ۲۸

☆۱۱۴ ''جہاتِ جہدِ آزادی''، محولۂ بالا، ص ۲۶۶

☆۱۱۵ ''جہاتِ جہدِ آزادی''، محولۂ بالا، ص ۶۷-۲۶۶

☆۱۱۶ ''جہاتِ جہدِ آزادی''، محولۂ بالا، ص ۲۶۷

☆۱۱۷ ''جہاتِ جہدِ آزادی''، محولۂ بالا، ص ۲۶۹

☆۱۱۸ ''پاکستان منزل بہ منزل''، محولۂ بالا، ص ۳۲

☆۱۱۹ ''پاکستان ناگزیر تھا''، محولۂ بالا، ص ۴۶

☆۱۲۰ ''پاکستان ناگزیر تھا''، محولۂ بالا، ص ۴۶

☆۱۲۱ ''گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ''، ترجمہ: عشرت علی صدیقی، اُردو اکیڈمی اتر پردیش، ص ۱۶۱

☆۱۲۲ ''گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ''، محولۂ بالا، ص ۱۶

☆۱۲۳ ''تحریکِ آزادی میں اُردو کا حصہ''، محولۂ بالا، ص ۸۲۱

☆۱۲۴ ''تحریکِ آزادی میں اُردو کا حصہ''، محولۂ بالا، ص ۸۱۰

☆۱۲۵ ''پاکستان ناگزیر تھا''، محولۂ بالا، ص ۴۷

☆۱۲۶ ''پاکستان ناگزیر تھا''، محولۂ بالا، ص ۴۷

☆۱۲۷ ''پاکستان ناگزیر تھا''، محولۂ بالا، ص ۴۷

☆۱۲۸ ''پاکستان ناگزیر تھا''، محولۂ بالا، ص ۳۹

☆۱۲۹ ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، ڈاکٹر یونس حسنی، انجمنِ ترقیٔ اُردو پاکستان، کراچی، طبع اوّل ۱۹۷۶ء، ص ۸۹

☆۱۳۰ ''پاکستان ناگزیر تھا''، محولۂ بالا، ص ۳۱

☆۱۳۱ ''پاکستان ناگزیر تھا''، محولۂ بالا، ص ۳۱

☆۱۳۲ ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، محولۂ بالا، ص ۹۱

☆۱۳۳ ''پاکستان ناگزیر تھا''، محولۂ بالا، ص ۴۱

☆۱۳۴ ''پاکستان ناگزیر تھا''، محولۂ بالا، ص ۴۶

☆۱۳۵ ''پاکستان ناگزیر تھا''، محولۂ بالا، ص ۴۹ – ۴۸

☆۱۳۶ ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، محولۂ بالا، ص ۹۴

☆۱۳۷ ''پاکستان ناگزیر تھا''، محولۂ بالا، ص ۵۴–۵۳

☆۱۳۸ ''میری کہانی''، پنڈت جواہر لال نہرو، بحوالہ: ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، محولۂ بالا، ص ۹۳

☆۱۳۹ ''پاکستان ناگزیر تھا''، محولۂ بالا، ص ۶۴

☆۱۴۰ ''اُردو ناول اور تقسیمِ ہند''،عقیل احمد،موڈرن پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی،طبعِ اوّل ۱۹۸۷ء،ص ۲۱

☆۱۴۱ ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''،محولہ بالا،ص ۹۳

☆۱۴۲ ''اپنی کہانی''،ڈاکٹر راجندر پرشاد،بحوالہ:''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''،محولہ بالا،ص ۹۳

☆۱۴۳ ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''،محولہ بالا،ص ۹۴

☆۱۴۴ ''قومی جدّ و جہد کے ڈھائی سو سال''،اسرار احمد،مشمولہ:ماہ نامہ''آجکل''،دہلی،جنگِ آزادی نمبر،اگست ۱۹۵۷ء،ص ۱۲

☆۱۴۵ ''قومی جدّ و جہد کے ڈھائی سو سال''،محولہ بالا،ص ۱۲

☆۱۴۶ ''حیاتِ محمد علی جناح''،رئیس احمد جعفری''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''،محولہ بالا،ص ۹۶

☆۱۴۷ ''پاکستان ناگزیر تھا''،محولہ بالا،ص ۱۵۰

☆۱۴۸ ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''،محولہ بالا،ص ۹۹

☆۱۴۹ ''تاریخِ پاکستان''،محمد علی چراغ،سنگِ میل پبلیکیشنز،لاہور،جولائی ۲۰۰۱ء،ص ۲۴۷

☆۱۵۰ ''تاریخِ پاکستان''،محولہ بالا،ص ۲۵۱

☆۱۵۱ ماہ نامہ''چراغِ راہ''،کراچی،نظریۂ پاکستان نمبر،۱۹۶۰ء،ص ۱۸۷

☆۱۵۲ ماہ نامہ''چراغِ راہ''،کراچی،محولہ بالا،ص ۱۸۸

☆۱۵۳ ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''،محولہ بالا،ص ۱۰۰

☆۱۵۴ ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''،محولہ بالا،ص ۱۰۱

☆۱۵۵ ''تاریخِ پاکستان''،محولہ بالا،ص ۲۶۳

☆۱۵۶ ''تاریخِ پاکستان''،محولہ بالا،ص ۲۶۳

☆۱۵۷ ''اُردو ناول اور تقسیمِ ہند''،محولہ بالا،ص ۲۵-۲۴

☆۱۵۸ ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''،محولہ بالا،ص ۱۰۱

☆۱۵۹ ''قومی تہذیب کا مسئلہ''،ڈاکٹر عابد حسین،بحوالہ:''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''،محولہ بالا،ص ۱۰۲

☆۱۶۰ ''اپنی کہانی''،ڈاکٹر راجندر پرشاد،بحوالہ:''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''،محولہ بالا،ص ۱۰۲

☆۱۶۱ ''اپنی کہانی''،ڈاکٹر راجندر پرشاد،بحوالہ:''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''،محولہ بالا،ص ۱۰۳

☆۱۶۲ ماہ نامہ''چراغِ راہ''،کراچی،محولہ بالا،ص ۱۹۰

☆۱۶۳ ''قومی جدّ و جہد کے ڈھائی سو سال''،محولہ بالا،ص ۱۴-۱۳

☆۱۶۴ ''اُردو ادب آزادی کے بعد''، اعجاز حسین، بحوالہ: ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، محولۂ بالا، ص۱۰۴

☆۱۶۵ ''تاریخِ پاکستان''، محولۂ بالا، ص۳۲۹

☆۱۶۶ ''اُردو ادب آزادی کے بعد''، اعجاز حسین، بحوالہ: ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، محولۂ بالا، ص۱۰۵

☆۱۶۷ ''پاکستان ناگزیر تھا''، محولۂ بالا، ص۳۵۵

☆۱۶۸ ''پاکستان منزل بہ منزل''، محولۂ بالا، ص۲۸۵

☆۱۶۹ ''پاکستان منزل بہ منزل''، محولۂ بالا، ص۲۸۶

☆۱۷۰ ماہ نامہ ''چراغِ راہ''، کراچی، محولۂ بالا، ص۱۹۲

☆۱۷۱ ''پاکستان منزل بہ منزل''، محولۂ بالا، ص۲۸۶

☆۱۷۲ ''پاکستان منزل بہ منزل''، محولۂ بالا، ص۲۸۶

☆۱۷۳ ''اپنی کہانی''، ڈاکٹر راجندر پرشاد، بحوالہ: ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، محولۂ بالا، ص۱۰۷

☆۱۷۴ ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، محولۂ بالا، ص۱۰۷

☆۱۷۵ ''پاکستان ناگزیر تھا''، محولۂ بالا، ص۴۱۴

☆۱۷۶ "India Wins Freedom," Maulana Abul Kalam Azad, P.197

☆۱۷۷ ''پاکستان منزل بہ منزل''، محولۂ بالا، ص۳۱۱

☆۱۷۸ ''پاکستان منزل بہ منزل''، محولۂ بالا، ص۱۲-۳۱۱

☆۱۷۹ ''پاکستان ناگزیر تھا''، محولۂ بالا، ص۵۰۸

☆۱۸۰ ''پاکستان ناگزیر تھا''، محولۂ بالا، ص۵۱۶

بابِ دوم

برِّصغیر کی تقسیم اور دو مملکتوں کا قیام

باب دوم

برِ صغیر کی تقسیم اور دو مملکتوں کا قیام

الف: فسادات

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں سے شکست کھانے کے بعد سے لے کر اگست ۱۹۴۷ء تک ہندو اور مسلمان کئی بار انگریزوں کے خلاف متحد ہوئے اور کئی مواقع ایسے بھی آئے جب ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مختلف نظریات کی وجہ سے اختلافات ہوئے یہ اختلافات کبھی مذہبی، کبھی تہذیبی وثقافتی، کبھی لسانی اور کبھی سیاسی اختلافات کی وجہ سے پیدا ہوئے اور بارہا ان اختلافات نے فسادات کی شکل بھی اختیار کی۔ جس میں جانی اور مالی نقصان ہوا۔ اختلافات کا بنیادی سبب ہندوؤں کی مکارانہ ذہنیت اور قول وفعل میں تضاد تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو ہندوؤں کی خود غرضانہ ذہنیت کا اندازہ ہوتا گیا، اور جب ہندوؤں نے ۱۹۴۶ء میں عبوری حکومت کے قیام میں مسلمانوں کے ساتھ کیے گئے وعدوں کی خلاف ورزی کی تو ہندو مسلم فسادات ایک بار پھر چھڑ گئے اور جب دونوں اقوام میں تجدید وفا کا امکان نہ رہا تو برطانوی وزیرِ اعظم لارڈ اٹیلی کو مسلمانوں کی الگ مملکت کے قیام کا مطالبہ ماننا پڑا۔

> On Februray 20th, 1947, His Magesty's Government announced their intention of transferring power in British India to Indian hands by June 1948.1☆

جون ۱۹۴۸ء کے لیے کیے گئے منصوبوں میں تقسیمِ ہند کے علاوہ پاکستان کے حصے میں آنے والے علاقوں کا بھی فیصلہ کر دیا گیا۔ جس کے مطابق مسلم اکثریت والے علاقے پاکستان کے حصے میں آئیں گے اور وہ علاقے جہاں ہندو اور مسلمان

دونوں موجود ہیں یا وہ ریاستیں جن کا حکم راں مسلمان اور وہاں کے لوگ ہندو ہیں، یا جہاں ہندو حکم راں اور عوام مسلمان ہیں وہاں کے لوگوں کی رائے لے کر ان کی تقسیم کا فیصلہ کیا جائے گا۔

> بنگال اور پنجاب کی مجالس قانون ساز سے کہا جائے گا کہ ان میں سے ہر ایک اپنا اجلاس دو حصّوں میں کرے، ایک حصّہ مسلم اکثریت والے اضلاع کے نمائندوں کا ہو اور دوسرا باقی صوبے کے نمائندوں کا ہر مجلس قانون ساز کے دونوں حصّوں کے ارکان کو جن کی نشستیں الگ الگ ہوں گی یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ اس مسئلے پر اپنی رائے دیں کہ صوبے کی تقسیم ہونی چاہیے یا نہیں۔☆۲
>
> اگر ان دو حصّوں میں سے کسی حصّے کی معمولی اکثریت نے بھی تقسیم کی موافقت میں رائے دی تو تقسیم کر دی جائے گی، اور اس کے لیے انتظامات بھی کر دیے جائیں گے۔☆۳

اسی طرح سندھ کے بارے میں بھی فیصلہ کر دیا گیا:

> سندھ کی مجلس قانون ساز (اپنے یورپی ارکان کو مستثنیٰ کر کے) اپنے اجلاس میں فیصلے کرے گی کہ موجودہ مجلس دستور ساز میں شریک ہونا چاہتے ہیں یا نئی مجلس دستور ساز میں صوبہ سرحد میں موجودہ مجلس قانون ساز کے انتخاب کنندگان سے اس پر استصواب کیا جائے گا کہ وہ کون سی مجلس دستور ساز میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ اس مسئلے پر اظہارِ رائے کا موقع بلوچستان کو بھی دیا جائے گا۔☆۴

صوبہ آسام میں غیر مسلموں کی تعداد زیادہ تھی، لیکن اس کے ضلع سہلٹ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اس کے لیے یہ مطالبہ کیا گیا:

> اگر بنگال کے دو ٹکڑے کیے جائیں تو ضلع سہلٹ کو مسلم بنگال سے ملا دیا جائے گا، لہٰذا یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ بنگال کو تقسیم کر دینا چاہیے اور گورنر جنرل کی نگرانی میں اور صوبہ آسام کی حکومت کے مشورے سے سہلٹ کے باشندوں سے استصواب رائے کیا جائے کہ آیا وہ صوبہ آسام سے وابستہ رہنا چاہتے ہیں یا مشرقی بنگال۔ نئے صوبے میں شامل ہو جانا چاہیے۔ اگر رائے شماری سے یہ معلوم ہوا کہ سہلٹ کے باشندے صوبہ مشرقی بنگال سے ملحق ہونا پسند کرتے ہیں۔ تو حدود معین کرنے والا کمیشن مقرر کیا جائے گا۔☆۵

اگر چہ وزیرِ اعظم لارڈ ایٹلی نے تقسیم ہند کا فیصلہ کر دیا تھا اور علاقوں کی تقسیم کے بارے میں بھی سارے منصوبے تیار

کر لیے تھے، لیکن ہندو اور انگریز دونوں تقسیمِ ہند کے خلاف تھے۔ اس لیے تقسیمِ ہند کا فیصلہ کر لینے کے باوجود دونوں نے دل سے اس فیصلے کو قبول نہیں کیا تھا، اور وہ آخری وقت تک تقسیمِ ہند کو روکنے کی کوشش کرتے رہے، لیکن جب ناکام رہے تو انھوں نے آخری تدبیر آزمائی کہ ملک کو اصل تاریخ سے دس ماہ قبل تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ تکلیفیں اٹھانی پڑیں اور مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑے، اور پاکستان ایک شکست خوردہ ملک کہلائے۔

لارڈ ویول نے بذاتِ خود لارڈ ایٹلی کو تقسیمِ ہند کے لیے ۳ رجون ۱۹۴۸ء کی تاریخ مقرر کرنے کا مشورہ اس سبب سے دیا تھا کہ ساری کارکردگی متاثر نہ ہو جائے۔ اس بات سے گاندھی اور نہرو بھی واقف تھے لہٰذا انھوں نے وزیرِاعظم لارڈ ایٹلی اور دوسرے اراکین کو خط لکھے اور لارڈ ویول کی جگہ کسی اور وائسرائے کو مقرر کرنے کی تجویز پیش کی۔ ایٹلی نے یہ تجویز قبول کر لی اور وائسرائے ویول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے کا عہدہ دیا۔ مارچ ۱۹۴۷ء میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے وائسرائے کا عہدہ سنبھالا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے بنانے کے بعد نہرو اور کرشنا مینن کے درمیان خفیہ ملاقاتیں ہوئیں اور انھوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے تقسیمِ ہند کی تاریخ کو تبدیل کروالیا جائے۔ حالاں کہ وائسرائے بننے کے بعد:

> ۱۵ ر اپریل ۱۹۴۷ء کو قائدِ اعظم سے پہلی ملاقات کے دوران لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جون ۱۹۴۸ء تک اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہو جانے پر زور دیا تھا۔☆۶

لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندو قائدین کی رضا کے لیے اپنے وعدے پر قائم نہ رہے اور انھوں نے تقسیمِ ہند کی مقررہ تاریخ کو بدل دیا۔ نہرو اور کرشنا مینن نے اپنی بات منوانے کے لیے لیڈی ماؤنٹ بیٹن کی دوستی کو استعمال کیا۔ اس سے قبل انھوں نے لارڈ ویول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو اسی مقصد کی تکمیل کے لیے وائسرائے بنوایا تھا تاکہ آئندہ دنوں میں لیڈی ماؤنٹ بیٹن کی دوستی کا سہارا لے کر لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے اپنے مطالبات منوائے جائیں۔ لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے بھی نہرو کی دوستی کا پاس رکھا اور ۷ ار مئی کی شام کو جب نہرو اور کرشنا مینن، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو اپنا منصوبہ سنانے کے لیے آئے تو انھوں نے لیڈی کی سفارش حاصل کی۔

> اسی رات کو وائسرائے کی قیام گاہ پر ایک ضیافت کے دوران لیڈی ماؤنٹ بیٹن ان کے [نہرو کے] قریب آئیں...اور چپکے سے [نہرو کے] کان میں کہا، انھوں نے اسے منظور کر لیا۔☆۷

اس طرح لیڈی ماؤنٹ بیٹن کی مدد سے نہرو اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے، اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تقسیمِ ہند کی نئی تاریخ کا اعلان کر دیا۔

۴ رجون ۱۹۴۷ء کو پہلی بار ماؤنٹ بیٹن نے ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ اقتدار کی منتقلی

فی الواقع ۱۵ راگست کو عمل میں آئے گی۔☆۸

یعنی اس فیصلہ کا اعلان کرنے کے صرف دو ماہ بعد ہندوستان کو تقسیم کرنا تھا۔ حالاں کہ اس بات سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور ہندو قائدین بھی اچھی طرح واقف تھے کہ اس مختصر عرصہ میں تقسیمِ ہند کے انتظامات مکمل نہ ہو سکیں گے۔

مسلمانوں کو اپنی تباہی بہت قریب نظر آ رہی تھی۔ مسلمانوں نے اس تاریخ کو تبدیل کروانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ ناکام رہے۔

> مسلم لیگ کے لیڈر نے واقعی اس کے لیے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے التجائیں کیں کہ انتقالِ اختیار کے لیے جون ۱۹۴۸ء کی تاریخ قائم رکھیں اور اس کو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کرنا تباہی کا موجب ہوگا۔☆۹

لارڈ ماؤنٹ بیٹن پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا اور مسلم لیگ کو یہ فیصلہ قبول کرنا پڑا؛ اس کے سوا ان کے پاس کوئی اور راستہ بھی نہ تھا کیوں کہ:

> لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے واقعی دھمکی دی تھی کہ وہ ملک کو اختلال یا ہندو کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کے حوالے کر دیں گے۔☆۱۰

جب کوئی غیر ذمے دار عمل کے لیے تیار ہو جائے اور وہ صاحبِ اختیار بھی ہو، تو اس سے کچھ بعید نہیں ہوتا۔

تقسیمِ ہند کی تاریخ مقرر کرنے کے باوجود بیش تر کانگریسی لیڈروں کا خیال تھا کہ پاکستان زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکے گا اور تقسیم شدہ ملک پھر سے ایک ملک ہو جائے گا۔

ہندوؤں اور کانگریسیوں کا یہ ایک عام عقیدہ تھا کہ تقسیم قائم نہیں رہ سکے گی، یا یہ کہ پاکستان جلد ہی ختم ہو جائے گا اور ہندوستان ایک بار پھر کانگریس کے ماتحت ایک متحدہ ملک ہوگا۔

ان ہی حالات میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کو قیامِ پاکستان کا اعلان کر دیا لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کراچی میں پاکستان کی قومی اسمبلی میں انتقالِ اقتدار کے فرائض ادا کیے اور قائدِ اعظم محمد علی جناح پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بنے۔

قبل از وقت تقسیم سے مسلمانوں کو آزادی کی وہ خوشی حاصل نہ ہوئی جو ایک ملک کی آزادی پر ہونی چاہیے تھی۔ خوشیوں کے بجائے ہر طرف آنسو، آہیں اور سسکیاں تھیں۔ لوگوں کو نہ صرف اپنے صدیوں پرانے وطن کو چھوڑ کر نئے ملک میں جانا پڑا، بلکہ ہجرت کے دوران بیش تر لوگ شہید ہو گئے اور جو بچ گئے انھیں ہجرت کے علاوہ مرنے والوں کا دکھ بھی سہنا پڑا۔ بچوں کو ان کی ماؤں کے سامنے مارا گیا، لاکھوں خواتین اغوا اور بے آبرو کی گئیں جن کو بعد میں ان کے گھر والوں نے بھی قبول نہ کیا۔ غیرت مند خواتین نے اپنی عزت بچانے کی خاطر کنوؤں میں کودنے سے بھی دریغ نہ کیا۔

غرض قبل از وقت تقسیم نے زندگی کے سارے نظام کو درہم برہم کر دیا۔ بقولِ ابوالکلام آزاد:

The country was free but before thr people dould fully enjoy the sence of libration and victory they woke up to find that a great tragedy accompaind freedom.11☆

ہندوؤں اور سکھوں نے قتل و غارت گری اور اغوا و آبرو ریزی کی وارداتیں سب سے زیادہ صوبہ پنجاب میں کیں۔

مغربی پنجاب میں مسلمانوں نے نہیں، سکھوں نے اور ہندوؤں نے ۲ مارچ ۱۹۴۷ء سے خون ریزی شروع کی تھی اور مسلمانوں کو حفاظت خود اختیاری کے لیے ان کا مقابلہ کرنا پڑا تھا... اس پر قائدِ اعظم کی طرف سے تقاضے اور تنبیہات تھیں کہ تمھارے درمیان جو اقلیتیں تھیں ان کی حفاظت کرو، اور نہایت اشتعال کے باوجود مسلمان قائدِ اعظم کے احکام کی تعمیل کرتے رہے۔☆۱۲

مسلمانوں کے برعکس سکھوں نے شرومنی اکالی دل اور اکالی سینا دو پرائیوٹ نوجوں کی تنظیم کی اور نہنگ سکھوں کی جمعیتیں مرتب کیں:

پنجاب کے دیہات، قصبات اور شہروں میں وسیع پیمانے پر اشتعال انگیز پروپیگنڈا کیا۔ نہایت اہتمام کے ساتھ روپیہ فراہم کیا۔ مختلف مقامات پر تلواریں، کرپانیں، بھالے اور بم بنانے کے کارخانے قائم کیے، سکھ ریاستوں سے اور دوسرے مقامات سے آتشیں اسلحہ مہیا کیا۔☆۱۳

دسمبر ۱۹۴۲ء تک راشٹریہ سیوک سنگھ کے قاتلوں اور لٹیروں کی تعداد پنجاب میں دس ہزار تھی، لیکن جنوری ۱۹۴۷ء میں بڑھ کر ۴۷ ہزار ہو گئی۔

ہندو اور سکھ قاتلوں نے مسلمانوں پر ظلم کرنے کے لیے بھی مختلف طریقے اختیار کیے، یو پی، سی پی اور مشرقی پنجاب کے مسلمانوں نے پاکستان آنا چاہا تو ان کے گھروں میں آگ لگا دی ان کی جائیدادیں ضبط کر لیں اور پاکستان آنے والے قافلوں پر حملے شروع کر دیے۔ راستے میں کنوؤں میں زہر ملا دیا تا کہ بے سرو سامان افراد کو پانی میسّر نہ ہو سکے اور اگر پیئیں تو موت کا شکار ہو جائیں۔

ہندوستان کا مرکز دلّی بھی ظلم و تشدد کی آماجگاہ بن گیا۔ وہ دلّی جو مغلوں کے زمانے سے کبھی اجڑتا اور کبھی بستا تھا جس کے بارے میں میر نے کہا تھا:

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں ہندوؤں اور سکھوں نے مل کر ایک بار پھر دتی کو لوٹا، اور کئی مسلمانوں کو کلمہ گوئی کی سزا کے طور پر مارا گیا۔

پرانی دہلی کی گرین مارکیٹ جہاں ہزاروں مسلمان پھل اور سبزی فروش رہتے تھے نذرِ آتش کر دی گئی۔ نئی دہلی میں ہمایوں کے مقبرے کے قریب لودھی کالونی پر ہندو غنڈوں نے حملہ کر دیا اور چن چن کر مسلمانوں کو شہید کیا گیا۔ شاید ہی کسی گھر سے کوئی فردِ زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکا ہو... سکھوں نے انتباہ کر دیا کہ مسلمانوں کو پناہ دینے والوں کے گھر جلا دیے جائیں گے۔ چناں چہ ہندوؤں، سکھوں، پارسیوں اور عیسائیوں نے اپنے مسلمان ملازموں کو گھر سے نکال کر فسادیوں کے حوالے کر دیا۔ ☆۱۴

دہلی سے باہر جانے کے تمام راستے بند تھے ریل کے اسٹیشنوں پر، ٹرینوں میں، پختہ سڑکوں پر، ہر جگہ ان کے قتل کا انتظام تھا۔ انتقام لینے والوں نے جہاں قتل و غارت کے اور بہت سے طریقے اختیار کیے تھے وہاں گھروں اور ٹرینوں کو بھی آگ لگائی۔

لاہور، امرت سر، شیخوپورہ کے پورے علاقے جل رہے تھے اور فی الحقیقت پنجاب کے بہت سے شہروں سے شعلے اُٹھ رہے تھے۔ دیہات میں مسلح گروہ لوٹ رہے تھے، جلا رہے تھے، قتلِ عام کر رہے تھے اور زنا بالجبر۔ ہزاروں عورتیں اُٹھائی گئیں جن کو ان کے رشتے داروں نے پھر کبھی نہ دیکھا۔ پنجاب کی سرحدی فوج، جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں تھے (غیر مسلم اکثریت میں) اور برطانوی افسروں کے زیرِ کمان تھے امن قائم رکھنے میں ناکام رہی۔ ☆۱۵

انگریز اور ہندو شروع ہی سے تقسیمِ ہند کے خلاف تھے، تقسیمِ ہند کے اعلان کے ساتھ ہی انھوں نے مسلمانوں پر ظلم و ستم، قتل و غارت گری، لوٹ مار، خواتین کی آبرو ریزی شروع کر دی اس طرح مارچ ۱۹۴۷ء ہی سے ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے تھے جو قیامِ پاکستان کے بعد تک جاری رہے۔

شروع میں تو مسلمان خاموش رہے لیکن مسلمانوں کی خاموشی نے ان کے حوصلے اور بلند کر دیے اور امرت سر کے اکالیوں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت شہر کے مختلف چوراہوں میں بڑے اشتعال انگیز نعرے لگائے۔

جو مانگے گا پاکستان
اس کو دیں گے قبرستان
نہیں بنے گا پاکستان

بن کے رہے گا خالصتان ☆۱۶

سکھ یہ نعرے لگاتے ہوئے بازار کے چوراہے پر پہنچے اور لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کے لیے تقریریں کیں۔ مسلمانوں نے جب سکھ اکالیوں کو مسلمانوں کے خلاف نعرے لگاتے دیکھا تو مسلمانوں نے بھی جواباً نعرہ لگایا:

بن کے رہے گا پاکستان

لے کے رہیں گے پاکستان ☆۱۷

سکھوں سے مسلمانوں کا یہ پرعزم اور جرأت مندانہ نعرہ برداشت نہ ہو سکا اور انھوں نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ ہندوؤں اور سکھوں کے ظلم و ستم کو دیکھ کر:

اسلامیانِ امرت سر کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور انھوں نے بھی ''خون کا بدلہ خون'' کا نعرہ لگا دیا۔ ☆۱۸

اور اس کے ساتھ ہی مسلمانوں نے خود کو مقابلے کے لیے تیار کرنے کے لیے عسکری تربیت لینی شروع کر دی۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کی ٹرینوں کو آگ لگائی اور بار ہا ٹرینوں کو روک کر لوگوں کو قتل کیا، جب مسلمان انتقام لینے پر اترے تو انھوں نے بھی سکھوں اور ہندوؤں کی ٹرینوں کو آگ لگائی اور اس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو قتل بھی کیا۔ اس طرح ہندو مسلم کے درمیان فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا جو قیامِ پاکستان کے بعد تک جاری رہا۔

قیامِ پاکستان سے پہلے ہجرت کے دوران اور قیامِ پاکستان کے بعد بھی جب ہندوؤں اور سکھوں نے مشرقی پنجاب اور بنگال میں رہنے والے مسلمانوں کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا اور ان کی جان، مال اور عزت سے کھیلا تو:

امرت سر کے چند منچلوں نے لاہور کے مسلمانوں کے لیے امرت سر سے روزانہ لاہور جانے والی بابو ٹرین کے ایک ڈبے میں چوڑیاں اور مہندی رکھ کر بھیج دی جس سے یہ مراد تھی کہ زندہ دلانِ لاہور بھی مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کا بدلہ لینے کے لیے کمر بستہ ہوں۔ ☆۱۹

مغربی پاکستان میں رہنے والے لوگوں کو جب مشرقی پنجاب سے مسلسل مسلمانوں کے قتل و غارت اور عورتوں کی بے حرمتی کی خبریں آتی گئیں اور جب وہ اسٹیشنوں پر لٹے ہوئے مسلمانوں کو دیکھتے تو ان کے جذبات قابو میں نہ رہتے اور ان میں جذبۂ انتقام شدت اختیار کر جاتا، لہٰذا مسلمانوں نے بھی مغربی پاکستان سے ہجرت کرنے والے ہندوؤں اور سکھوں سے مشرقی پنجاب میں ہونے والے ظلم کا بدلہ لیا۔

ہندوؤں اور سکھوں سے انتقام کا یہ سلسلہ مغربی ہندوستان میں بھی جاری تھا۔

ایک روز بمبئی کی کالبہ دیوی روڈ کے مندر سے کالبہ دیوی کی ارتھی کا سالانہ جلوس نکلا۔ جلوس کے

شرکا اس ارتھی کو ہندو رسم و رواج کے مطابق سمندر کی نذر کرنے جا رہے تھے۔ جب یہ جلوس محمد علی روڈ پر پہنچا تو بمبئی کے چند مسلمان نوجوانوں نے ٹیکسی میں سوار ہو کر اس جلوس کے شرکا پر گولیاں برسائیں جس کے نتیجے میں متعدد ہندو ہلاک اور زخمی ہو گئے...کٹڑہ کرم سنگھ کے شیر دل مسلمانوں نے ہندوستان کی غیر منصفانہ تقسیم کے غم و غصّے میں نمک منڈی کے قریب ہندوؤں کی لکڑی کی بہت بڑی مارکیٹ جلا ڈالی۔ اس خوف ناک آتش زدگی کے شعلوں نے چڑے والے چوک، گلی لاہوریاں، گلی مولوی شاہ محمد تا اسلامیہ ہائی اسکول خزانہ گیٹ، اور حکیموں والے بازار کے علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس دوران مسجدِ رحمانیہ بھی اس آتش زدگی کی زد میں آ گئی۔ چناں چہ اس مسجد کو آگ سے بچانے کے لیے مسلمانوں نے اردگرد کی دُکانیں مسمار کر دیں۔ ☆۲۰

❀ ❀ ❀

ب: ہجرت

''لڑاؤ اور حکومت کرو'' انگریزوں کا پسندیدہ اصول ہے۔ انھوں نے اسی اصول کو اپناتے ہوئے برِصغیر سے مغلوں کی صدیوں پرانی حکومت کو زوال تک پہنچایا اور آخر کار اپنی حکومت قائم کرنے میں کام یاب ہو گئے۔ برِصغیر پر اپنا تسلّط قائم کرنے کے بعد بھی انگریزوں نے اس اصول کو اپنائے رکھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے جب بھی متحد ہونے کی کوشش کی تو انگریزوں نے ایسا شوشہ چھوڑا جو ہندو مسلم فساد کا باعث بنا۔ اسی اصول کو مدِّنظر رکھتے ہوئے انگریزوں اور ہندوؤں نے مل کر تقسیم کو نہ صرف مقررہ تاریخ سے پہلے کر دیا، بلکہ حد بندی کمیشن کو بھی اچانک بدل دیا، اور یہی وہ دو بنیادی اور غیر منصفانہ تبدیلیاں تھیں جو ۱۹۴۷ء کے فسادات کا باعث بنیں۔

۳۰ رجون ۱۹۴۷ء کو وائسرائے نے بنگال اور پنجاب کے لیے حد بندی کمیشن مقرر کر دیے تھے لیکن بعد میں وائسرائے اور ہندوؤں نے مل کر حد بندی کمیشن کے فیصلے کو بدل دیا۔

ہندوؤں نے سکھوں کو اپنا حامی بنانے کے لیے انھوں نے یہ لالچ دیا کہ صوبہ پنجاب میں مسلم اکثریت والے علاقے اس صورت میں انھیں دیے جا سکتے ہیں اگر وہ مسلمانوں کو ان کی اکثریت والے علاقوں سے نکال دیں۔ ناسمجھ اور کم عقل سکھ ہندوؤں کی جھوٹی اور مکّارانہ باتوں میں آ گئے اور انھوں نے مسلمانوں کو ان کے علاقوں سے نکالنے کے لیے ہر ناجائز اور شرم ناک اور ظالمانہ طریقہ اختیار کیا۔

> ''راج کرے گا خالصہ'' کے تصوّر میں سکھ پاگل ہو چکے تھے اور انسانیت کی تمام حدوں کو پار کر چکے تھے۔ سکھوں نے ہندوؤں کے فریب میں آ کر مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر سفاکیت اور بربریت کے پہاڑ توڑنے شروع کر دیے، انگریز گورنر کی تحریک پر تین دن کے اندر پنجاب کو مسلمانوں سے خالی کرا لیا گیا۔☆۲۱

۳ راگست ۱۹۴۷ء کو لارڈ سیریل ریڈکلف کے تحت بنائے گئے تھے باؤنڈری کمیشن کی رپورٹ پیش کر دی یہ رپورٹ ریڈکلف رپورٹ کہلاتی ہے۔

> اِس ایوارڈ میں گورداس پور، بٹالہ، فیروز پور اور جالندھر کے مسلم اکثریت والے علاقے

ہندوستان کے حوالے کردیے گئے۔☆۲۲

ملک کی یہ تقسیم بے شک غیر منصفانہ تھی جس سے ہندو اور انگریز بھی اچھی طرح واقف تھے اصل حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوؤں اور انگریزوں نے مل کر یہ تقسیم پاکستان کو غیر مستحکم اور غریب ملک بنانے کے لیے کی تھی اس کے علاوہ انگریزوں کا مقصد یہ بھی تھا کہ ملک کی تقسیم امن وامان کے ساتھ نہ ہو، بلکہ ہندو مسلم فسادات جاری رہیں۔ دونوں قومیں ایک دوسرے کو نقصان پہنچائیں اور ان کی باہم دشمنی ہمیشہ برقرار رہے۔

ساری صورتِ حال جانتے ہوئے بھی مسلمانوں کو یہ تقسیم قبول کرنا پڑی۔ اس موقع پر قائدِ اعظم نے اپنی تقریر میں کہا:

> ہندوستان کی تقسیم اب آخری و قطعی طور پر ہو چکی ہے بلاشبہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس عظیم اور خود مختار مسلم سلطنت کی ساخت میں سخت بے انصافیاں کی گئیں۔ ہمیں امکانی حد تک دبایا گیا اور محدود کیا گیا اور ہم پر جو آخری ضرب لگائی گئی ہے وہ باؤنڈری کمیشن کا فیصلہ ہے یہ ایک غیر منصفانہ نا قابلِ فہم، بلکہ مکروہ فیصلہ ہے، لیکن یہ غلط ہو۔ غیر منصفانہ ہو، مکروہ ہو۔ یہ عادلانہ فیصلہ نہ ہو، بلکہ سیاسی فیصلہ ہو۔ بہر حال ہم اس کی پابندی کا وعدہ کر چکے ہیں۔ لہٰذا ہم پر اس کی پابندی واجب ہے ہمیں ایک آبرو دار قوم کی طرح اس کو قبول کر لینا چاہیے۔☆۲۳

> ۱۸راگست ۱۹۴۷ء کے روز عید الفطر تھی۔ اس روز خوف وخطر کی فضاؤں میں جالندھر کے مسلمان ہزاروں کی تعداد میں عید کی نماز ادا کرنے کے لیے عید گاہ میں جمع تھے ابھی پہلی رکعت میں سجدہ ریز ہوئے ہی تھے کہ ہندوؤں سکھوں نے تلواروں، گنڈاسوں، برچھوں اور بندوقوں سے مسلح ہو کر ان پر حملہ کر دیا اور آن واحد میں سیکڑوں مسلمانوں کے سر تن سے جدا کر دیے جو اس وحشیانہ حملے سے جان بچا کر عید گاہ سے بھاگ نکلے بھالوں کی نوک پر دھر لیا۔ اس طرح جالندھر کی عید گاہ لاشوں سے بھر گئی اس کے بعد سکھا نند ڈپٹی کمشنر کی سربراہی میں فرقہ پرست ہندو سکھ طے شدہ پروگرام کے مطابق جالندھر کے آسودہ حال اور ذی اثر مسلمانوں کے گھروں سے زبردستی پردہ نشین عورتوں کو گھیر کر عید گاہ تک لائے۔ یہاں ان کے برقعے اور ان کی چادریں ہی سروں سے نہ اتاریں، بلکہ ان کے لباس اتار کر انھیں ننگا کر دیا اور ان کو حکم دیا کہ وہ اپنے مردوں کو عید کی مبارک باد کہیں اور قیامِ پاکستان کی خوشی میں ان کی لاشوں کے آس پاس رقص کریں۔☆۲۴

علاقوں کی تقسیم کے علاوہ دیگر معاملات میں بھی نا انصافی کی گئی فوج کی تقسیم میں بھی جانب داری

سے کام لیا گیا نیز جنگ میں استعمال کیا جانے والا سامان بھی ہندوؤں کے حصّے میں آیا۔ افواج اور فوجی سامان ایسی بری طرح تقسیم ہوا کہ پاکستان کے حصّے میں جو کچھ بحری بیڑے کے نام سے وہ بحری بیڑا نہ تھا اور جو فضائی بیڑے کے نام سے آیا وہ فضائی بیڑا نہ تھا رہی فوج تو جب وہ مختلف مقامات سے جمع ہو کر پاکستان پہنچی تو اس میں آدمی تھے مگر اسلحہ نہ تھا۔ ☆۲۵

باونڈری کمیشن میں تبدیلی کے نتیجے میں ہندوستان کے حصّے میں جو علاقے آئے وہ ترقی یافتہ اور بڑے شہر تھے، اور ان شہروں میں لوگوں کو ذریعۂ معاش اختیار کرنے کے مواقع بھی آسانی سے مل جاتے تھے۔

پنجاب میں عارضی تقسیم بھی غیر منصفانہ تھی، لیکن آخری فیصلہ تو اس حد سے بھی آگے بڑھ گیا، اور اس نے ہمارے ذرخیز ترین قطعات زمین بھی کاٹ کے ڈال دیے۔ سب سے زیادہ شدید ضرب ضلع گورداس پور پر پڑی ہے۔ جس کی دو تحصیلیں گورداس پور اور بٹالہ جس میں مسلمان ۱ء۵۱ رفی صدی اور ۶ء۵۵ رفی صدی کی اکثریت میں تھے، پٹھان کوٹ کی تحصیل ساتھ ہی ہندوستان میں شامل کر دی گئیں، اور پاکستان سے بٹالہ جیسا بہترین مسلم صنعتی شہر چھین لیا گیا۔ ضلع لاہور کا ایک حصّہ بھی توڑ لیا گیا۔ ریڈکلف نے یہاں تو دیہات وار سرحدی خط کھینچنے کی تکلیف گوارا کر لی لیکن امرت سر کی تحصیل بجنالہ کو بالکل بھول گئے جس میں ۶۰ فی صدی مسلم اکثریت تھی، اور اس کا علاقہ بھی ضلع لاہور سے ملحق تھا۔ زیرہ اور فیروز پور کی تحصیلیں بھی جن میں واضح مسلم اکثریت ''رسل و رسائل کے سلسلے میں خلل'' کے بہانے سے الگ کر دی گئیں۔ ☆۲۶

غرض اس غیر منصفانہ تقسیم سے نہ صرف پاکستان کا رقبہ کم ہو گیا، بلکہ لوگوں کو اچانک ہجرت کی مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا جس کی وجہ سے مسلمان اپنی جان، مال اور عزت سب سے محروم ہو گئے۔ پنجاب کے مخصوص علاقوں کے علاوہ گرد و نواح کے علاقے بھی ان حادثات کی لپیٹ میں آ گئے۔ ان علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں کو سکھوں اور ہندوؤں کے ظلم کا نشانہ تو بننا ہی پڑا، لیکن جب یہ لوگ پاکستان میں آئے تو یہاں بھی انھیں کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑا جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ پاکستان سے ہندوستان جانے والوں کی تعداد کم تھی جب کہ ہندوستان سے پاکستان آنے والے مہاجرین کی تعداد بہت زیادہ تھی اور پاکستان کے پاس وسائل کم اور آبادی زیادہ اور رقبہ کم تھا۔

اس طرح مسلمان اپنے ملک میں سکھ اور چین کی جس آخری اُمید پر آئے تھے اس پر بھی پانی پھر گیا زخمی اور پس ماندہ مہاجرین ایک بار پھر مسائل میں الجھ کر رہ گئے۔ بیش تر لوگوں کو مالی لحاظ سے وہ حیثیت دوبارہ نہ ملی جس کے وہ متمنی اور اہل تھے۔ جب کہ یہاں پر پہلے سے قیام پذیر لوگوں نے ۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ فسادات کو سنہرا موقع سمجھتے ہوئے پاکستان سے

جانے والے سکھوں اور ہندوؤں کے گھر بار کو مالِ غنیمت سمجھ کر اس پر قبضہ کیا اور اپنی مالی حالت بدل ڈالی۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مشرقی پاکستان سے آنے والے مہاجرین طبقے سے تعلق رکھتے تھے اسے مدِنظر رکھتے ہوئے ان رہائش اور روزگار کا انتظام کیا جاتا ہے لیکن 'ایسا کیوں نہ ہوا؟' کے جواب میں ہمیں اسی تاریخی اور سیاسی حقیقت کو دہرانا پڑتا ہے کہ ملک کی غلط اور قبل از وقت تقسیم امن اور امان قائم کرنے راہ میں سب سے بڑی رکاوٹیں ثابت ہوئی۔ بقول شاعر:

دل کا اجڑنا سہل سہی، بسنا سہل نہیں ظالم

بستی بسنا کھیل نہیں، بستے بستے بستی ہے

ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں سے قیامِ پاکستان کا جو انتقام لیا اس کا سب سے زیادہ اثر خواتین پر پڑا۔ انھیں نہ صرف قتل کیا گیا، بلکہ قتل کرنے سے پہلے بے آبرو کیا گیا۔ گویا بہت سی خواتین نے عزت لٹنے سے پہلے ہی خودکشی کر لی لیکن جو خواتین بچ گئیں انھیں ہندوؤں اور سکھوں نے مالِ غنیمت جانا۔

ہزاروں مسلمان دوشیزاؤں کو ہندو سکھ غنڈوں نے مالِ غنیمت سمجھ کر تاش کے پتوں کی طرح آپس میں بانٹ لیں اور ایک ایک مغویہ کے ساتھ شراب کے نشے میں دھت ہو کر ان درندوں نے جو وحشیانہ سوک کیا اس کے تصور کرتے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اس بات کا اعتراف ننکانہ صاحب کے مقام بابا گرونانک کے استھان پر ہندوستان سے آنے والے سکھ یاتری نے خود کیا۔

> گرو معاف کرے! ہم اُس وقت وحشی بن گئے تھے۔ ہم دس دس سکھوں نے بیک وقت ایک ایک مظلوم لڑکی کو بے آبرو کیا۔ ہمیں اس وقت تخریب اور درندگی کے سوا کچھ نہ سوجھتا تھا۔ ہم نے معصوم اور مظلوم بچوں کو کرپانوں کی نوک پر اٹھا اٹھا کر مارا... ہم نوجوان عورتوں کو چھانٹ کر الگ کر لیتے اور باقی بچوں، بوڑھوں اور بوڑھی عورتوں کو گھروں میں بند کر کے آگ لگا دیتے۔ جب انسانی جسم جلتے تو ہمیں کئی بوتلوں کا نشہ ہوتا۔ ہم قہقہے لگاتے اور اتنا بھنگڑا ڈالتے کہ ہمارے کیس کھل کر رہ جاتے اور پھر نوجوان لڑکیوں کے ساتھ چوہے بلّی کا کھیل کھیلتے۔ ☆۲۷

جو عورتیں بازیاب ہو کر آئیں انھیں ان کے گھر والوں نے بھی قبول نہ کیا۔ ظلم بھی عورتوں پر ہوا اور نفرت بھی ان ہی سے کی گئی۔ اس طرح بازیاب ہونے والی خواتین کو اپنے اور پرائے دونوں کے دیے ہوئے دکھوں کو سہنا پڑا۔ وہ والدین، بہن بھائی اور عزیز رشتے دار جو اپنے لڑکیوں کی بے گناہی کے چشم دید گواہ تھے۔ انھوں نے بھی ان کے دکھوں کو نہ سمجھا۔ وقت بھی ان کے زخموں کا مرہم نہ بن سکا، اور ان زخموں کے ذمّے دار لوگ کچھ بھی ہوں کم از کم انسان کہلانے کے مستحق نہیں ہو

سکتے ۔ایسے ہی لوگوں کے بارے میں بہادر شاہ ظفر نے کہا تھا:

ظفرؔ، آدمی اس کو نہ جانیے گا، ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

غرض تقسیمِ ہند کے دوران ہونے والے فسادات کے نتیجے میں جہاں مسلمانوں کو اپنے قیمتی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑا وہاں زندہ رہنے والوں کو بھی اپنے صدیوں پرانے وطن، صدیوں پرانے ساتھیوں اور اپنے قیمتی اثاثوں کو بھی چھوڑنا پڑا۔ اس کے ساتھ جب وہ ہجرت کے بعد نئے ملک میں آئے تو بھی انھیں سکھ اور چین نصیب نہ ہو سکا ایک طرف تو انھیں پرانے وطن کی یادوں اور مرنے والوں کے غم نے بے چین رکھا تو دوسری طرف مغربی پاکستان میں انھیں نئے ماحول، بے سروسامانی، غربت و افلاس نے ان کے زخموں پر نمک چھڑکنے میں اہم کردار ادا کیا۔

❁ ❁ ❁

ج: آزاد ریاستوں کے الحاق کا مسئلہ

قیامِ پاکستان کے بعد بھی بعض علاقوں کے الحاق کا مسئلہ باقی تھا۔ یہ علاقے آزاد ریاستیں تھیں جن میں کشمیر، جونا گڑھ، حیدر آباد دکن، اور مانادور شامل ہیں۔

کشمیر:

کشمیر میں ۸۰ رفی صد مسلمان تھے۔ جغرافیائی لحاظ سے بھی پاکستان اور کشمیر علاقے ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں اور کئی سو میل تک دونوں کی سرحدیں ملی ہوئی ہیں۔ کشمیر کے تمام دریا پاکستان میں بہتے ہیں تمام تجارتی شاہ راہیں بھی پاکستان سے گزرتی ہیں۔ کشمیر ایک آزاد ریاست تھی اور اسے یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ پاکستان یا ہندوستان جس ملک سے بھی چاہے الحاق کر لے۔

> ...اس کے باوجود لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ریڈکلف کے ساتھ ساز باز، کر کے بھارت کے لیے کشمیر میں جانے کا راستہ اس طرح پیدا کیا کہ بعض وہ علاقے جن میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، کاٹ چھانٹ کر مسلمانوں کو دے دیے۔ ☆۲۸
>
> [دراصل] ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۸۶ء میں صرف ۷۵ رلاکھ روپے کے عوض پوری ریاست جموں و کشمیر مہاراجا گلاب سنگھ ڈوگرا کے ہاتھ بیچ ڈالی۔ کشمیری اس حکومت سے مسلسل بیزار رہے۔ یہ ایسی ظالم اور جابر تھی کہ اس نے واقعی کشمیریوں کا خون چوسا اور ان کو صرف بیگاری مزدور بنا کر رکھا۔ ☆۲۹

اس بات سے مہاراجا اچھی طرح واقف تھا کہ کشمیر کے مسلمان لازماً پاکستان کے ساتھ الحاق کرنا چاہیں گے۔ اس نے مسلمانوں کو اس کام سے باز رکھنے کے لیے اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے ساتھ یہ معاہدہ کیا کہ جو حالات اور تعلقات ہیں وہ بدستور قائم رہیں۔ یعنی Stand Still Agreement کا مشورہ دیا۔

ایک طرف تو مہاراجا نے مسلمانوں سے Stand Still Agreement کیا اور دوسری طرف کشمیری عوام پر قتل د

غارت کی وارداتیں شروع کروادیں، اور انھیں ہندوستان سے الحاق کرنے کے لیے مجبور کیا گیا۔

ان حالات سے مجبور ہو کر پونچھ اور دوسرے مقامات کے مسلمانوں نے مہاراجا کی حکومت کے خلاف علَمِ بغاوت بلند کیا اور جموں وکشمیر کی خودمختاری کا اعلان کر دیا، جس کے نتیجے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیانِ جنگ چھڑ گئی اور بہت سے مسلمانوں کو ہجرت کر کے پاکستان میں آنا پڑا۔ دیگر مہاجرین کی طرح کشمیری مہاجرین نے بھی ہجرت کے دوران کئی تکالیف اور پریشانیوں کا سامنا کیا۔

> ۵رنومبر کی صبح کو جموں شہر میں مہاراجا کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا کہ تمام مسلمان تخلیۂ ریاست کے لیے فی الفور تیار ہو جائیں کیوں کہ پاکستان نے انھیں اپنے پاس بلایا ہے۔ اعلان کے ساتھ انھیں یہ بھی ہدایت دی گئی کہ وہ پریڈ کے میدان میں جمع ہو جائیں۔ اگلے روز پولیس نے جس کی بارکیں میدان سے ملحق تھیں۔ محصور مسلمانوں کی جبریہ تلاشی لی گئی اور انھیں ہر شے سے محروم کر دیا اس کے بعد مسلمانوں سے کہا گیا کہ انھیں اب سچیت گڑھ لے جایا جائے گا، لیکن اس کے برعکس انھیں کٹھوعہ روڈ پر ٹھہرا کر لاریوں سے اترنے کا حکم دیا گیا مسلح فوج کے پہرے میں پہلے جوان لڑکیوں کو لواحقین سے جدا کیا گیا۔ اس کے بعد ہندوؤں اور سکھوں کے مسلح ہجوم کو حملے کا اشارہ کیا گیا۔ ۴ ہزار مسلمانوں میں سے صرف نو سو شدید زخمی حالت میں بمشکل گرتے پڑتے سیالکوٹ پہنچ سکے۔ ☆۳۰
>
> اوائلِ اکتوبر میں سمبھا کے مقام پر اس کے ۱۴ر ہزار مسلمان باشندوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ محاصرہ کے دوران ہندو اور سکھ دستوں نے خوراک اور پانی کے تمام وسائل کو منقطع کر کے کربلا کا منظر پیدا کر دیا۔ اس کے باوجود تمام مسلمان بھوک اور پیاس کی تمام سختیوں کو صبر اور حوصلہ سے برداشت کرتے رہے۔ ۲۲ر اکتوبر کو مہاراجا خود سمبھا میں وارد ہوا اور اس کے فوراً بعد ریاستی افواج نے ہندو سکھ درندوں کی معیت میں قتلِ عام کا آغاز کر دیا۔ اس ۱۴ر ہزار کی پوری آبادی سے صرف ۱۵ر مجروح افراد سیالکوٹ پہنچے۔ ☆۳۱

جب لٹے پٹے مسلمان پاکستان پہنچے تو یہاں کے مسلمان اپنے کشمیری بھائیوں کی حالت زار دیکھ کر مشتعل ہو گئے اور ریاست کشمیر کو فتح کرنے کے لیے جنگ کی تیاریاں کرنے لگے۔

اس جنگ میں مسلمانوں کو فتح ہوئی وہ علاقے جو مہاراجا کی حکومت سے آزاد ہوئے تھے ان میں مظفرآباد، میرپور، راولہ کوٹ، باغ، کوٹلی وغیرہ شامل ہیں۔

اس کے بعد مسلمانوں نے مہاراجا سے کشمیر اور پاکستان کے الحاق کی درخواست کی جسے مہاراجا نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ باشندگانِ کشمیر کی رائے سے الحاق کا آخری فیصلہ ہوگا۔ لیاقت علی خان نے اس سلسلے میں یہ تجویز پیش کی:

> پورا مسئلہ بین الاقوامی رائے کی عدالت کے سامنے لایا جائے۔ ہم اس کے لیے تیار ہیں کہ اقوامِ متحدہ سے درخواست کریں کہ ریاست جموں و کشمیر میں وہ فوراً اس غرض سے اپنے نمائندے مقرر کریں کہ وہ جنگ، اور ریاست میں مسلمانوں پر جبر و تشدد بند کرائیں، بیرونی افواج کی واپسی کا انتظام کرائیں کہ استصواب رائے عامہ عمل میں آ جائے اور یہ اپنے ذمے لے لیں ریاست کے باشندوں کی آزاد مرضی معلوم کرنے کے لیے اپنی اور انتظام میں استصواب رائے عامہ کرائیں گے ہم یہ منظور کرنے کے لیے تیار رہیں کہ مانادور اور جوناگڑھ کے تنازع کا فیصلہ بھی اسی طرح کیا جائے۔☆۳۲

اس پر ہندوستان نے کہا کہ جنگ ختم کروانے کے لیے یہاں فوج کا رہنا ضروری ہے، اور شیخ عبداللہ کی حکومت غیر جانب دار حکومت ہے۔ لیاقت علی خان کا کہنا تھا کہ:

> اقوام متحدہ کے نمائندوں کو محض اس لیے آنا چاہیے کہ استصوابِ رائے عامہ کے متعلق مشورہ دیں۔☆۳۳

اس کے بعد ہندوستان نے یہ مسئلہ سلامتی کونسل میں پیش کر دیا۔

سلامتی کونسل نے ایک کمیشن مقرر کیا تاکہ دونوں ممالک کے رہنماؤں سے رائے لی جا سکے اور کشمیر میں رائے شماری کرانے کا طریقہ طے کیا۔ ۱۹۴۸ء میں جب کمیشن نے پاک و ہند کا دورہ کیا تو پاکستان نے ان کے ساتھ مکمل تعاون کیا جب کہ بھارت نے اس تنازع کو طول دینے کے لیے اس میں رکاوٹیں کھڑی کرنا شروع کر دیں۔ تنازع کو طول دیا جاتا رہا اور رائے شماری کے طریقے کو ناممکن بنانے کی بھرپور کوشش کی جاتی رہی۔

کشمیر کے الحاق کا مسئلہ اب تک جاری ہے ۱۹۴۷ء سے لے کر اب تک تین بار دونوں ممالک کے درمیان اس تنازع پر جنگیں ہو چکی ہیں اقوامِ متحدہ نے بھی ہمیشہ بھارت کا ساتھ دیا اور عین اس وقت، جب مسلمان فتح کے قریب ہوتے ہیں اقوام متحدہ جنگ کو ختم کروا دیتی ہے۔

جوناگڑھ:

ریاست جوناگڑھ ہندوستان کی ایک آزاد اور چھوٹی ساحلی ریاست تھی جو کراچی سے ۳۰۰ میل جانب جنوب واقع

تھی۔ اس کا رقبہ ۳،۳۷۷ مربع میل اور آبادی تقریباً سات لاکھ تھی ان کی آبادی کی اکثریت ہندو تھی اور حکم راں مہابت خان مسلمان تھا۔

ریاست کی پانچ بندرگاہیں تھیں جن میں سب سے بڑی بندرگاہ ویراویل کراچی کی بندرگاہ سے مربوط تھی اور دونوں بندرگاہوں کے تاجروں کے مابین تجارتی تعلقات قائم تھے۔

> آزادی کے فوراً بعد اس نے پاکستان سے الحاق کرنے کی پیش کش کی جوناگڑھ سے ملحق اور اس سے بھی چھوٹی ریاست مناودر کے حکم راں نے بھی پاکستان سے الحاق کرلیا۔ قائدِ اعظم نے ۵ ستمبر ۱۹۴۷ء کو ان دونوں ریاستوں کا الحاق منظور کرلیا۔ ☆ ۳۴

بھارتی عوام اور حکومت نے اس فیصلے پر شدید اعتراض کیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن جو قیامِ پاکستان کے خلاف تھا، اس موقع پر بھی بھارتی عوام اور حکومت کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا اور یہاں تک کہہ دیا:

> ریاست کے پاکستان سے الحاق کی بنا پر ہندوؤں سے سومنات کا مندر بھی چھین لیا جائے گا۔ ☆ ۳۵

بھارت حکومت کے پاس دوسری اہم دلیل یہ تھی:

> جوناگڑھ ہندو اکثریت کی ریاست ہے اور ہندوستان سے متصل ہے، اس لیے اسے پاکستان سے الحاق نہیں کرنا چاہیے۔ حکومت ہندوستان اس بات پر بھی مصر تھی کہ الحاق کے سوال کا فیصلہ استصواب کے ذریعے ہونا چاہیے جو ہندوستان اور جوناگڑھ کی حکومتوں کی مشترکہ نگرانی میں ہو لیکن پاکستان کا اس سے کوئی تعلق نہ ہو۔ ☆ ۳۶

استصواب سے پہلے ہی ہندوؤں نے اس مسئلے کو لڑائی جھگڑے اور غنڈہ گردی کے سہارے حل کرنے کی کوشش شروع کردی۔

''محاصرے اور حملوں نے اکتوبر ۱۹۴۷ء تک جوناگڑھ میں اتنی افراتفری پیدا کردی کہ نواب اپنے خاندان کے ساتھ کراچی آنے پر مجبور ہوگیا۔

> ۷ر نومبر کو ۲۰ر ہزار سپاہیوں کی ایک ''آزاد فوج'' جو بکتر بند گاڑیوں اور جدید ہتھیاروں سے لیس تھی۔ جوناگڑھ میں داخل ہوگئی۔۔۔دو دن کے بعد ہندوستان نے ساری ریاست کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ ☆ ۳۷

اس طرح بھارت حکومت جارحیت کے سہارے اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی۔

استصواب کی تجویز پر بعد میں عمل کیا گیا لیکن اس میں بھی سخت ناانصافی کی گئی اور یہاں پر ہتھیاروں کی طاقت سے لوگوں کو منوایا۔

> فروری ۱۹۴۸ء میں بھارت تلواروں کے سائے میں ریفرنڈم ہوا جس کے نتیجے میں تمام ووٹ بھارت کو ملے۔☆۳۸

اور ریاست جوناگڑھ ہندوستان میں شامل ہوگئی۔

حکومت پاکستان نے بھارت جارحیت اور بین الاقوامی اصولوں اور ضابطوں کی خلاف ورزی کرنے پر جوناگڑھ کا مسئلہ اقوام متحدہ میں بھی پیش کیا۔ بہت بحث مباحثے کے بعد یہ مسئلہ سلامتی کونسل کے حوالے کر دیا گیا، جو اَب تک حل نہیں ہو سکا۔

مناودر:

> تقسیمِ ہند کے منصوبے کے تحت اس ریاست کے حکم راں نے ۱۷ر ستمبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان سے الحاق کی درخواست کی۔ جسے قائدِ اعظم نے ۲۳ر ستمبر کو منظور کر لیا۔☆۳۹

بھارت جوناگڑھ کی طرح مناودر اور پاکستان کا الحاق بھی دیکھا نہ گیا، اور اس چھوٹی سی ریاست کو بھی بھارت کے ساتھ شامل کرنے کا تہیہ کیا اور پھر یہاں بھی ظلم اور جبر کے ہتھیار استعمال کرنا شروع کر دیے، اور بھارت نے اس ریاست پر بھی ۲۲ر اکتوبر کو فوج کشی کر دی، اور ریاست کے مسلمان حکم راں کو ریاست چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور بعد میں انھیں راج کوٹ منتقل کر دیا اور ریاست پر اپنا قبضہ جما لیا۔

حیدرآباد:

حیدرآباد ہندوستان کی سب سے اہم اور سب سے بڑی آزاد ریاست تھی۔ اس کا رقبہ ۸۲ر ہزار مربع میل اور آبادی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ تھی۔ اس کی اپنی کرنسی اور ڈاک ٹکٹ تھے۔ یہاں آبادی کی اکثریت ہندو تھی، لیکن یہاں کا حکم راں ''نظام'' مسلمان تھا۔

> ۳ر جون کے منصوبے کے اعلان کے بعد ''نظام'' نے یہ اعلان کیا کہ وہ نہ تو ہندوستان سے الحاق کرے گا اور نہ پاکستان سے۔ اسے اپنی ریاست کے ڈومینن کا درجہ حاصل کر لینے کی توقع تھی۔☆۴۰

> ...چناں چہ اس نے ۱۱ر جولائی ۱۹۴۷ کو ایک وفد وائسرائے کے پاس بھیجا۔☆۴۱

ماؤنٹ بیٹن نے ''نظام'' کے اس فیصلے کو منظور نہ کیا اور حیدرآباد اور ہندوستان کے الحاق پر زور دیا۔

نظام ہندوستان اور حیدرآباد کے الحاق کے خلاف تھا، اور ڈومینن کا درجہ نہ ملنے کی صورت میں پاکستان سے الحاق کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو جب اس بات کا پتا چلا تو اس نے پاکستان سے الحاق کی صورت میں چند ایسے جغرافیائی حقائق پیش کیے جو پاکستان اور حیدرآباد کے الحاق کی صورت میں تباہ کن نتائج پیش کرتے۔

مثلاً حیدرآباد سے سمندر تک کوئی راستہ نہ تھا اور یہ ریاست چاروں طرف سے ہندوستانی علاقوں سے گھری ہوئی تھی۔

ان حقائق کو جانتے ہوئے بھی نظام ہندوستان سے الحاق کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔

> لیکن دفاع، امورِ خارجہ اور مواصلات کے معاملات میں وہ ہندوستان کے ساتھ معاہدۂ اشتراک کر لینے پر آمادہ تھا۔ ☆۴۲

حکومت ہند نے الحاق پر اصرار کیا اور اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت قبول نہ کی۔

> ہندوستان اور حیدرآباد کے درمیان ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو اقرار نامہ طے ہوا۔ جس کے تحت ان کے موجودہ روابط سرِ دست برقرار رہنے تھے۔ ☆۴۳

> حکومت ہندوستان نے یہ دعویٰ کیا اس اقرار نامے کے تحت حیدرآباد کسی غیر ملک کے ساتھ کوئی تعلقات قائم نہیں رکھ سکتا۔ ☆۴۴

بعد میں سردار پٹیل نے نظام اور اس کے ساتھیوں کو اقرار نامے کی خلاف ورزی کے کرنے کے الزام میں بہت تنگ کیا۔

فرضی الزامات کی زد میں آنے پر بہت سے مسلمان بدرجۂ مجبوری ہجرت پر مجبور ہو گئے، اور ان کی جائیدادیں شرنارتھیوں میں تقسیم کر دی گئیں۔ بلا کسی روک ٹوک مسجدوں کی بے حرمتی کی گئی اور ان میں بیشتر کو مندروں میں تبدیل کر دیا۔

ایسے وہ تمام قوانین منسوخ کر دیے گئے جن سے کسی رخ سے بھی مسلم عبادت گاہوں کا تحفظ ہو سکتا تھا۔

حیدرآباد پر ہندوستانی حکومت کا دباؤ شدید تر ہوتا گیا اور انھوں نے فوجی تیاریاں بھی شروع کر دی گئیں پٹیل حیدرآباد کو جوناگڑھ کی تاریخ یاد دلا نا تھا۔ الغرض نظام کو الحاق کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔

> ۲۴ راگست کو حیدرآباد نے اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل میں شکایت دائر کی، لیکن اس سے پیشتر کہ سلامتی کونسل اس کی سماعت کا انتظام کرتی، ہندوستان نے فوجی طاقت سے حیدرآباد کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ ☆۴۵

حیدرآباد پر ہندوستانی فوجیوں کے حملوں کے نتیجے میں مسلمانوں پر وہ قیامت گزری جو ان سے پہلے مشرقی پنجاب

کے مسلمانوں پر گزر چکی تھی۔

ہندوستان کے فوجی حملے میں ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں۔ شہر حیدرآباد کو چھوڑ کر ہر جگہ مسلمانوں کے گھروں کو لوٹا گیا، جلایا گیا، لاکھوں افراد بے گھر ہوئے۔ جوان لڑکیوں اور عورتوں نے کنوؤں میں چھلانگیں لگا کر اپنی عصمت و آبرو کی حفاظت کی، مسجدوں کی بے حرمتی کی گئی حملہ آور افواج اور ان کے زیرِ پناہ کٹر فرقہ پرست ہندوؤں کی ٹولیوں نے عرصۂ دراز تک ایک ریاست میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم رکھا تھا۔☆۴۶

ریاست حیدرآباد پر ہندوستانی فوجیوں کے حملوں کا سلسلہ ابھی جاری تھا کہ قائدِ اعظم کا انتقال ہو گیا۔ مسلمانوں کے قائد کی وفات نے ہندوؤں کے حوصلے اور بلند کر دیے، اور ہندوؤں نے ایک بار طاقت کے زور سے حیدرآباد پر قبضہ کر لیا۔ ۱۳ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو ہندوستان کی افواج نے ریاست پر بھرپور حملہ کیا مختصر مزاحمت کے بعد حیدرآباد کی وج نے ۱۷ستمبر کو ہتھیار ڈال دیے۔ رفتہ رفتہ ریاست کے حصے بخرے کر دیے گئے اور انھیں ہندوستان کے مختلف صوبوں کے ساتھ ضم کر دیا گیا۔ اور یہ آزاد ریاست بھارت کا حصہ بن گیا۔

حیدرآباد پر بھارتی قبضے کے بعد نظام کی حیثیت بالکل بدل گئی۔ منشی سے کیے ہوئے معاہدے کے مسترد ہوتے ہی ان کے سب شاہی اختیارات سلب کر لیے گئے ور جنرل چودھری نے حکم رانی سنبھال لی، اور سات پشتوں کا پشتی حکم راں اقتدار سے محروم ہونے کے بعد ایک قیدی بن کر رہ گیا۔

❀ ❀ ❀

د: مقامی آبادی کے رویّے اور آبادکاری کے مسائل

قیامِ پاکستان کے بعد مہاجرین کو نئے ملک اور نئے ماحول میں شدید اجنبیت کا احساس ہوا۔ اگرچہ پاکستان میں پہلے سے رہنے والوں نے انھیں حوصلہ دیا اور ان کے دکھوں کو بانٹنے کی کوشش کی، لیکن صدیوں پرانے وطن اور اس کی یادوں کو ان مہاجرین کے دلوں سے مٹانا ممکن نہ تھا۔

پاکستان کے پاس شروع میں وسائل کی بہت کمی تھی یہاں تک کہ روزمرہ کے عام کاموں سے لے کر سرکاری کام چلانے میں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا، لیکن محدود وسائل کے باوجود پاکستان عوام اور ان کے لیڈروں نے تمام امور کو خوش اسلوبی سے نبھانے کی ہر ممکن کوشش کی۔

پاکستان میں آنے والے مہاجرین کو ہجرت کی کئی صعوبتوں کو برداشت کرنا پڑا، ہجرت کے دوران لاکھوں لوگ مارے گئے، زندہ رہنے والوں کو بھی کئی مسائل اور تکلیف دہ حقائق کا سامنا کرنا پڑا۔

جب تبادلۂ آبادی شروع ہوا تو اس وقت بہت سے لوگ اسے ایک عارضی حادثہ سمجھتے تھے اور لوگوں کا خیال تھا کہ کچھ عرصے بعد یہ فسادات ختم ہو جائیں گے اور حالات معمول پر آ جائیں گے، لیکن جب ملک کے حالات روز بروز خراب ہوتے گئے تو لوگ ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے اور بہت سے لوگوں نے ایسے حالات میں ہجرت کی جب سکھ اور ہندو ان کے محلوں تک پہنچ چکے تھے اور پھر انھیں اتنی جلدی میں سب کچھ چھوڑنا پڑا کہ انھیں اپنی جان بچانے کے سوا کسی اور چیز کا ہوش نہ رہا۔

ہجرت کے دوران بہت سے لوگوں کو پیدل ہی پاکستان پہنچنا پڑا۔ وہ بالکل بے سروسامان تھے، اگر کسی کے پاس کچھ تھا بھی تو وہ راستے میں سکھوں اور ہندوؤں نے لوٹ لیا، اور ان کے پاس تن کے کپڑے کے سوا کچھ نہ رہا۔ یہ مسلمان ہر لحاظ سے ٹوٹ چکے تھے۔ انھوں نے اپنے معصوم بچّوں کے قتل، لاشوں کے ڈھیر اور عورتوں کی بے حرمتی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ایسے دردناک واقعات نے ان پر حزن وملال کی کیفیت طاری کر دی تھی جسے دور کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔

۱۰ر دسمبر ۱۹۴۷ء تک چار مہینوں میں ۴۲ر لاکھ ۸۰ر ہزار مہاجرین مغربی پاکستان میں پہنچے۔☆ ۴۷

مہاجرین کا پاکستان پہنچنے کے بعد سب سے اہم اور بنیادی مسائل خوراک، لباس اور رہائش کے تھے۔ مقامی آبادی

نے ان مہاجرین کی ہر ممکن مدد کی۔

> لاہور اور مغربی پنجاب کے دوسرے مقامات میں جونہی مہاجرین کی آمد شروع ہوئی۔ مقامی لوگوں نے آگے بڑھ کر خوراک اور کپڑے سے ان کی خاطر داری کی۔ ہر طرح کی مدد بہم پہنچائی اور ان کے مصائب کے ازالے میں مخلصانہ جوش کا مظاہرہ کیا۔ مقامی آبادی نے فراخ دلی سے قربانیاں دیں اور مہاجرین کو بحال کرنے کے لیے خوشی سے تکالیف برداشت کیں۔☆ ۴۸

قائدِ اعظم کو مہاجرین کی تباہی اور ان کے مسائل کا شدّت سے احساس تھا۔ قائدِ اعظم نے قیامِ پاکستان کے بعد اپنی تمام کوششیں مہاجرین کو بسانے کی طرف لگا دیں ان کے مسائل کو حل کرنا اور اچھی اور کامیاب زندگی گزارنے کے قابل بنانا ان کی زندگی کا مقصد بن گیا اس موقع پر انھوں نے کہا:

> اِس حادثۂ عظیم نے میرے قلب پر سخت چوٹ لگائی۔۔۔اِس وقت پاکستان کے لیے سب سے اہم مسئلہ مہاجرین کی آبادکاری کا ہے۔ مجھے کامل اُمید ہے کہ حکومتِ پاکستان اس مسئلے کو جلدی حل کرنے میں کامیاب ہوجائے گی جب تک ایک ایک مہاجر آباد نہیں ہو جاتا مجھے قرار نصیب نہیں ہوسکتا۔☆ ۴۹

قائدِ اعظم ان مہاجرین سے شدید ہمدردی کا احساس رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے مہاجرین کو حوصلہ دینے کے لیے انھیں اپنی دولت کہا۔

> مہاجرین پاکستان کے لیے بوجھ نہیں۔ یہ پاکستان کی دولت ہیں ان سے پاکستان کی دولت میں اضافہ ہوا ہے۔ حکومت پاکستان ان کے مصائب کو ختم کرنے کے لیے تکالیف اور مشکلات کا سامنا کرے گی۔☆ ۵۰

تقسیم ہند کے بعد پاکستان کو آزادی جیسی نعمت تو مل گئی، لیکن اس کے ساتھ ہی اسے معاشی، سماجی اور سیاسی مسائل سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ جس کی بنیادی وجہ ایک تو یہ تھی کہ پاکستان کے رقبہ کے مقابلے میں مہاجرین کی تعداد بہت زیادہ تھی جن کی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لیے جگہ اور پیسے دونوں کی کمی تھی۔ پاکستان کو ان تکلیف دہ حالات سے دوچار کرنے میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور ہندو لیڈروں نے اہم کردار ادا کیا۔ جب وہ تقسیم کو نہ روک سکے تو انھوں نے آخری حربہ یہ آزمایا کہ تقسیمِ ہند کی تاریخ کو بدل دیا۔ ظاہر ہے جو انتظامات دس ماہ میں کیے جا سکتے تھے، وہ دو ماہ میں کرنا ممکن نہ تھا۔

فلپ ہاورڈ نے اپنے ایک مضمون میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے خیالات کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ہاں، تقسیم آسانی سے روکی جا سکتی تھی۔ حکومت برطانیہ کو بس یہ کرنا چاہیے تھا کہ بہت عرصہ قبل

مرتبہ نو آبادی کی بنیاد پر اختیار حکومت ہندوستان کے حوالے کر دیتی۔ اگر اس جنگ شروع ہوتے ہی یہ کر دیا ہوتا تو مسلم لیگ اس قابل نہ ہوتی کہ کسی شمار میں آئے۔ اگر ۱۹۴۶ء میں کرپس مشن کام یاب ہو جاتا تو تقسیم نہ ہوتی۔☆۵۱

ہندو اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تقسیمِ ہند کے معاملے میں جہاں اور ناانصافیاں کیں وہاں جب اثاثوں کی تقسیم کا وقت آیا تو یہاں بھی مسلمانوں کو ان کے حق سے بہت کم دیا گیا۔

اثاثوں کی تقسیم کے سلسلے میں پاکستان اور بھارت کے نمائندوں پر مشتمل ایک سٹیرنگ کمیٹی قائم کی گئی پاکستان کی جانب سے چودھری محمد علی اور بھارت کی جانب سردار پٹیل اس کے رکن بنے۔ کمیٹی نے چار ارب روپے کے کیش بیلنس میں سے پچھتر کروڑ روپے پاکستان کو دینے کا فیصلہ کیا۔

بھارتی رہنما چوں کہ ہندوستان کی تقسیم کے حق میں نہ تھے اس لیے وہ پاکستان کو اس قدر تباہ و برباد کرنا چاہتے تھے کہ پاکستانی لیڈر تنگ آ کر تقسیم کا فیصلہ واپس لے لیتے، لہٰذا انھوں نے:

> پاکستان کی معیشت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے پچھتر کروڑ روپے میں سے صرف بیس کروڑ روپے نقد ادا کیے اور بقیہ رقم کی ادائیگی اس الزام کے ساتھ روک دی کہ پاکستان کشمیر کی جنگ میں مکمل طور پر ملوث ہے اور وہ ۵۵ کروڑ روپے کی بقیہ رقم سے اسلحہ اور گولہ بارود خرید کر اسے ہندوستان کے خلاف استعمال کرے گا۔☆۵۲

حکومت ہندوستان کی اس حرکت سے حکومت پاکستان اور عوام کے اعتماد کو ایک بار پھر ٹھیس پہنچی اور اصل رقم نہ ملنے کی وجہ سے مہاجرین کی امداد اور ملکی استحکام کے لیے تیار کردہ منصوبوں کی تکمیل میں بھی مزید دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مہاجرین کے مسائل حل کرنے کے لیے اگر روپے پیسے کی کمی تھی، لیکن حکومت پاکستان اور عوام کے دل میں مہاجرین کی مدد کرنے کا جذبہ زندہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے وسائل کے مطابق مہاجرین کی ہر ممکن مدد کی۔

ان کے لیے امدادی کیمپ لگائے جہاں انھیں خوراک، لباس اور ادویات وغیرہ فراہم کی جاتیں۔

مہاجر کیمپوں میں رہنے والوں کی تعداد جیسے جیسے اضافہ ہوتا گیا تو اس سے کیمپوں کی حالت ابتر ہوتی گئی اور خوراک، لباس اور دوسری چیزیں ضروریات کے مطابق کم پڑنے لگیں۔ کیمپوں میں گنجائش سے زیادہ لوگوں کو بھیجا جانے لگا جس سے کیمپوں میں گھٹن بڑھنے لگی، اور لوگوں نے جگہ کی تنگی اور خوراک وغیرہ کی کمی کے باعث آپس میں لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا۔ محدود وسائل کی وجہ سے کیمپوں کی تعداد میں اضافہ کرنا ممکن نہ تھا۔

کیمپوں میں رہنے والے بہت سے لوگ ہیضے کا بھی شکار ہوئے جس کی ایک وجہ تو پینے کے لیے صاف پانی نے ملنا تھا

اور دوسرے وجہ یہ تھی کہ لوگ رفع حاجت کے لیے کیمپوں سے زیادہ دور نہ جاتے جس سے کیمپوں کے آس پاس فضلات کے ڈھیر لگ گئے، اور فضا میں تعفن اور جراثیم پھیل گئے بہت سے لوگ جو ہندوؤں اور سکھوں سے بچ کر پاکستان پہنچ گئے تھے وہ ہیضے کے باعث ہلاک ہو گئے ہیضے کے علاوہ خوراک کی کمی اور ٹھنڈ کی وجہ سے بھی لوگ بخار اور نمونیے کا شکار ہو کر مرے۔

مقامی آبادی نے ان کے علاج معالجے کا انتظام کیا اس سلسلے میں میڈیکل کے طلبہ نے رضا کارانہ خدمات انجام دیں خواتین نے بھی اس موقع پر اہم کردار کیا۔

> غیر ملکی مشنری سوسائٹیوں نے بھی بالخصوص برطانیہ اور امریکا کی مشنری سوسائٹیوں کے کاروں نے بھی ان کیمپوں میں بڑی گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔☆۵۳
>
> ...کراچی میں بھی پریشان ڈاکٹروں نے دیکھا کہ آلات جراحی کے ضروری پرزے ہندو نکال کر لے گئے تھے۔ سامان اور تجربے سے نہیں، بلکہ صرف جوش اور ولولے سے پاکستانی ڈاکٹروں نے اسپتالوں کو اس قابل بنایا کہ زخمی، اعضا بریدہ اور لبِ دم مہاجروں کا معالجہ کریں جن کے ہجوم چلے آ رہے تھے۔☆۵۴

مشرقی پنجاب سے ہجرت کرنے والے بیشتر مہاجرین نے مغربی پنجاب میں آ کر پناہ لی۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی مہاجرین کی آمد کا سلسلہ جاری رہا باوجود اس کے کہ مشرقی پنجاب میں قتل کیے جانے والے مسلمانوں کی تعداد لاکھوں میں پہنچ چکی تھی پھر بھی مہاجرین کی تعداد بھی کسی طرح کم نہ ہوتی تھی، اور ان تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔

> مغربی پنجاب سے جتنے تارکین وطن گئے تھے ان سے ۱۷ لاکھ سے زائد مہاجرین کو اس صوبے میں بسایا جانا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نئے آنے والے مہاجرین کے لیے میسّر زمینوں، فیکٹریوں اور دکانوں میں کمی ہوتی گئی۔ جنوری ۱۹۴۸ء کے بعد خوراک کی شدید کمی سے شہر اور دیہات سب کے سب متاثر ہوئے اور بحالیات کی مساعی میں بھی رکاوٹ پیش آئی۔☆۵۵

جس طرح بھی ممکن ہو ان کی ضروریات پوری کرنے کی کوشش کی گئی مہاجرین کو حوصلہ دیا گیا بچوں اور بالغوں کے لیے اسکول کھولے گئے اور پیشہ وارانہ تربیت کی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔

اگر چہ مسلمان مہاجرین کو کیمپوں میں پناہ مل گئی تھی اور کسی حد تک دوسری ضروریاتِ زندگی بھی پوری ہو رہی تھیں لیکن کوئی بھی انسان ساری زندگی کیمپوں میں گزارنا پسند نہیں کر سکتا مہاجرین کو ایک باعزت شہری کی طرح زندگی گزارنے کے لیے گھر اور ذریعے معاش کی ضروریات تھی اور ویسے بھی متروکہ جائیداد کا حصول ان کا حق تھا۔

وسطِ اکتوبر تک ضرورت محسوس کی گئی کہ مرکزی حکومت اور مغربی پنجاب کی ایک مشترکہ تنظیم قائم کی جائے مہاجرین کا مسئلہ سب سے زیادہ مغربی پنجاب کو درپیش تھا چناں چہ ''پاکستان پنجاب مہاجر کونسل'' کا قیام عمل میں لایا گیا... بعد میں شمال مغربی سرحدی صوبہ اور سندھ کے لیے بھی انھی خطوط پر مشترکہ مہاجر کونسلیں قائم کی گئی۔☆۵۶

پاکستان پنجاب مہاجر کونسل کا کام مختلف مسائل کو حل کرنا، مثلاً مہاجرین کو مختلف علاقوں میں لے جا کر آباد کرنا، اراضی کی تقسیم، صنعتی اداروں، دکانوں اور مکانوں کو الاٹ کرنا اور کرایہ کی شرح متعین کرنے کے اصول وضع کرنا تھا، اس کے ساتھ ذریعۂ معاش کا بندوبست کرنا اس سلسلے میں بنکاری، تجارت اور زراعت کے پیشے کو بحال کرنے کے اقدامات کرنا تھا، ان اہم کاموں کے علاوہ مغویہ عورتوں، مردوں اور بچوں کو بازیاب کرنا اور مقدّس مقامات کی حفاظت بھی ان کی ذمے داریوں میں شامل تھا۔

مغربی پاکستان کے گورنر سر فرانس موڈی نے مہاجرین کے تمام مسائل کو منظم طریقے سے حل کرنے کی کوشش کی، لیکن ہر محکمے میں عملے کی باعث کام کی انجام دہی میں تاخیر اور دشواری کا سامنا کرنا پڑتا۔ عملے کی کمی ایک دم سے پورا کرنا بھی ممکن نہ تھا پنجاب کی مختلف وزارتوں کے مابین حدود کار کے تعین میں جھگڑے پیدا ہو گئے۔

وزیر صنعت اس بات پر مصر تھا کہ متروکہ صنعتی اداروں سے متعلق ہر کام اس کے دائرہ اختیار میں آتا ہے متروکہ اراضی کے بارے میں تمام مسائل پر وزیرِ مال سے مشورہ کرنا ضروری تھا... مکانوں اور دکانوں کی تقسیم کی انتظامی مشینری وزیر اعلیٰ مغربی پنجاب نے اپنے ماتحت رکھی تھی۔ ایک اور پیچیدگی یہ ہوئی کہ متروکہ املاک کی حرص نے اضلاع میں کئی سرکردہ لوگوں کے ایمان متزلزل کر دیے اور یہ غاصب کسی نہ کسی وزیر کے دامن میں پناہ ڈھونڈتے تھے... مختلف وزارتوں کے فرائض واختیارات کے بارے میں اس انتشار سے یہ آفت آئی کہ ہر ڈپٹی کمشنر نے اپنے ضلع میں کسی باقاعدہ قانون کے بغیر جو چاہا کر ڈالا پاکستان پنجاب مہاجرین کونسل کو بہت زور لگانا پڑا تا کہ یہ افراتفری ختم ہو جائے اور کام باضابطگی سے چلے۔☆۵۷

بیش تر مہاجرین کاشت کار تھے اور سب سے اہم مسئلہ ان مہاجرین کو ہندوؤں اور سکھوں کی متروکہ اراضی الاٹ کرنا تھا تا کہ لگائی ہوئی فصلیں وقت پر کاٹی جا سکیں اور گندم کی کاشت کی جا سکے۔

پنجاب کے مختلف حصّوں میں زمین کی زرخیزی کے لحاظ سے کہیں صرف اچھی اور کہیں بہت اچھی فصل تیار ہوتی ہے۔ لائل پور اور منٹگمری کے نوآبادعلاقے، جو نہروں سے سیراب ہوتے ہیں، مغرب کی جانب بارانی

علاقے کے مقابلے میں کہیں زیادہ زرخیز ہیں۔ ہر شخص اس نو آباد اضلاع میں الاٹمنٹ کو خواہاں تھا لیکن اتنی زمین مہیا نہیں تھی چناں چہ منٹگمری میں پولیس اور مہاجرین کے ایک گروہ کے درمیان خاصی شدید جھڑپ ہوئی۔ یہ مہاجرین زبردستی اُن زمینوں پر آباد ہونا چاہتے تھے جو اُن سے پہلے آنے والوں کو الاٹ کی جا چکی تھیں۔☆۵۸

اصل میں تقسیمِ ہند سے قبل تجارت، صنعت اور دفتری کاموں میں ہندو ہی چھائے ہوئے تھے جو اجناس مغربی پاکستان کے حصے میں آنے والے علاقوں میں اعلیٰ قسم اور وافر مقدار میں پائی جاتی تھیں وہ مغربی پاکستان درآمد کی جاتی تھیں ہندوستان کے علاقوں میں پائی جانے والی چیزیں برآمد کی جاتی تھیں۔

تقسیم سے پہلے سارا برِّصغیر ایک تجارتی منڈی کی حیثیت رکھتا تھا اور مغربی پنجاب کے تجارتی دھارے زیادہ تر مشرق کی سمت ہی پہنچتے تھے مثلاً امرت سر ایک بہت بڑا تجارتی مرکز تھا۔ گندم اور کپاس دو ہی فصلیں تھیں۔ گندم مشرقی پنجاب، دہلی اور ان سے بھی آگے جنوبی علاقوں میں برآمد کی جاتیں تھیں کپاس ریل کے ذریعے بمبئی اور احمد آباد کے پارچہ بافی کے کارخانوں میں بھیجی جاتی تھیں، ان اجناس کے عوض صنعتی مراکز سے کپڑا اور دوسری مصنوعات مغربی پاکستان آتی تھیں۔

تقسیم ہند اور اس کے دوران ہونے والے وحشت ناک فسادات نے ان تجارتی تعلقات کو ختم کرنے کا باعث بنے، لیکن حکومت پاکستان نے دوسرے ممالک سے تجارتی تعلقات قائم کیے اور رفتہ رفتہ دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں بھی ترقی کی۔

مہاجر دست کاروں کی اعانت کے لیے حکومت پاکستان نے تین کروڑ روپے کی سرمائے سے مہاجرین کی بحالیاتی مالیاتی کارپوریشن قائم کی۔ دست کاروں کو خاص نو آبادیوں میں بسانے کی کوشش کی گئی۔☆۵۹

مہاجرین کی آبادکاری کے سلسلے میں صوبہ پنجاب کو سب سے زیادہ بھاگ دوڑ کرنی پڑی لیکن مہاجرین کی بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ سے لاکھ کوشش کے باوجود حکومت پاکستان اور عام عوام انھیں مکمل طور پر مطمئن نہ کر سکی، اور مغربی پنجاب کے علاوہ اس کے آس پاس کے علاقوں کے مسلمان مہاجرین نے بھی صوبہ پنجاب ہی کی طرف رخ کرنا شروع کر دیا تھا۔

شمال مغربی سرحدی صوبہ کے لوگوں نے مسلمان مہاجرین کو اپنے صوبے میں پسند نہ کیا اور جو مہاجرین ان کے صوبے میں گئے انھیں واپس لوٹا دیا اور خود غیر مسلموں کے چھوڑے ہوئے املاک پر اپنا قبضہ جمالیا۔

ان حالات میں مرکزی حکومت نے ”۲۷ اگست ۱۹۴۷ء کو فرمان جاری کیا۔

جس کے مطابق پنجاب کی کثیر آبادی کو پاکستان کے مختلف حصوں میں منتقل کرنے کا یہ منصوبہ پیش کیا گیا۔

مغربی پنجاب کے کیمپوں میں جو مہاجرین بڑی بے تابی سے آبادکاری کے منتظر ہیں، ان میں سے ۲ لاکھ کو سندھ میں

آباد کرنا چاہیے۔ایک لاکھ کو شمال مغربی سرحدی صوبہ میں اور ایک لاکھ کو بہاول پور، خیر پور اور بلوچستان ایجنسی میں۔

صوبۂ سرحد اور بلوچستان میں زیادہ مہاجرین کو پناہ نہ مل سکی۔ جب کہ صوبہ سندھ میں بہت سے مہاجرین نہ صرف آباد ہوئے، بلکہ انھیں ذریعۂ معاش بھی آسانی سے مل گیا۔اس طرح مہاجرین کی آبادکاری کے سلسلے میں سندھ دوسرے نمبر پر تھا۔

> مئی ۱۹۴۸ء تک اس صوبے میں تقریباً ڈھائی لاکھ مہاجر داخل ہو چکے تھے۔اس صوبے سے کثیر تعداد میں غیر مسلم ہندوستان گئے تھے۔اس لیے پنجاب سات لاکھ سے بے خانماں افراد کو سندھ بھیج دیا گیا۔فروری ۱۹۵۰ء میں پھر ہنگامے شروع ہو گئے اور کافی مسلمانوں نے جودھ پور کے راستے سے سندھ کا رخ کیا۔☆۶۰

مغربی پاکستان میں تارکین وطن نے ۹۶/لاکھ ایکڑ کی زرعی زمین چھوڑی تھی۔اس کا کچھ حصہ بنجر اور بے آباد تھا اور کچھ حصہ مقامیوں کے قبضے میں تھا۔مہاجرین کے حصوے میں ۵۶/لاکھ ایکڑ اراضی آئی جو ۱۵/لاکھ کاشت کار مہاجر کنوں کے لیے ازحد ناکافی تھی۔

مہاجرین کی مناسب آبادی کے لیے مزید آب پاشی کے منصوبوں کی ضرورت تھی جنھیں زرعی ترقی کے اس جامع پروگرام کا لازی جز بنانا۔

کراچی کو صنعتی مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی جس سے یہاں آباد ہونے والے مہاجرین کی تعداد میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ ''چناں چہ اس شہر میں رہائش، آب رسانی، بجلی اور دوسری تمدنی سہولتوں کے وسائل پر بار بہت بڑھ گیا۔کئی نئی آبادیاں مثلاً لالوکھیت، ناظم آباد اور لانڈھی وغیرہ تعمیر کی گئیں، لیکن ضروریات پھر بھی پوری نہ ہو سکیں۔

غرض سندھی عوام نے مہاجروں کو اپنے صوبے میں بسانے کے لیے ہر ممکن مدد کی، اور ایسی خودغرضانہ بات کبھی نہ سوچی کہ سندھی عوام ہونے کے ناطے سندھ کی زمینوں، مکانوں یا ملازمتوں پر صرف سندھی عوام کا حق ہے، بلکہ سندھی عوام نے زخم خوردہ مہاجرین کے لیے اپنے چھوٹی بڑی بستیوں سے لے کر بڑی جائیداروں اور زمینوں کے دروازے کھول دیے۔سندھی عوام کے اس حسن سلوک کی بدولت پنجاب کی طرح سندھ میں بھی روز بروز مہاجرین کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا، اور ایک وقت ایسا آیا جب:

> سندھی خود اپنے ہی شہر میں آبادی کے لحاظ سے نصف سے بھی کم رہ گئے۔☆۶۱

مہاجرین کی امداد اور آبادی کے سلسلے میں خواتین نے بھی خاص کردار ادا کیا۔ مادرِ ملّت فاطمہ جناح ان مددگار خواتین کی قیادت کر رہی تھیں۔

فاطمہ جناح کے ایما پر ایک ریلیف کمیٹی تشکیل دی گئی جس کا کام پاکستان اور ہندوستان کے کیمپوں میں لوگوں کی امداد

کرنا تھا:

> اوائلِ اکتوبر میں ریلیف کمیٹی کی تین ممبران خواتین بیگم یعقوب شاہ، بیگم شعبان، اور بیگم انصاری کو سندھ کے مہاجرین کے حالات کا مطالعہ کرنے کے لیے سندھ کے دورے پر بھیجا گیا۔ انھوں نے حیدرآباد، سندھ، لاڑکانہ، نواب شاہ، شکارپور اور جیکب آباد کا دورہ کیا۔ مہاجرین کو روپیہ اور کپڑے فراہم کیے اور مقامی باشندوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے مہاجر بھائیوں سے تلطف آمیز سلوک کریں۔☆۶۲

ریلیف کمیٹی کی ممبران خواتین نے مہاجر خواتین کی آبادکاری کے علاوہ ان کی ملازمت کا بھی انتظام کیا۔ خواتین کا ان کی صلاحیتوں کے مطابق مختلف اداروں میں تقرر کر دیا گیا، اور وہ خواتین جو کوئی ہنر وغیرہ نہیں جانتی تھی ان کے لیے بھی بندوبست کیا گیا۔

> فاطمہ جناح مہاجرین کی آبادکاری کی عملی جدوجہد کے سلسلے میں کراچی میں کئی انڈسٹریل اور ویلفیر ادارے کھولنے کی طرف متوجہ ہوئیں تاکہ خواتین کو سلائی اور بہت سے دستی کام سکھائے جائیں۔ جس سے وہ اپنا روزگار خود پیدا کر سکیں۔☆۶۳

مقامی آبادی اور سیاسی رہنماؤں کی مخلصانہ کوششوں کا نتیجہ تھا کہ گوناگوں مسائل کے شکار مہاجرین کافی حد تک سنبھل گئے۔

بدقسمتی سے ایسے لوگوں کی بھی کمی نہ تھی جنھوں نے مہاجرین کی مدد کرنے کے بجائے اپنی مالی حالت بدلنے کے لیے ان تکلیف دہ حالات کو سنہرا موقع جانا، اور ہندوؤں اور سکھوں کی چھوڑی ہوئی جائیدادوں پر خود قبضہ کر لیا اس طرح بیش تر مستحق اور ضرورت مند مہاجرین اپنی اصل حیثیت سے محروم ہو گئے۔ ہندوستان میں شاہانہ اور پرشکوہ زندگی گزارنے والے بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جنھیں ہجرت کرنے کے بعد فقیرانہ زندگی گزارنی پڑی۔ اس کی بنیادی وجہ ایک تو یہ تھی کہ مہاجرین کی تعداد اتنی زیادہ تھی اور روز بروز ان کی تعداد میں اضافہ بھی ہو رہا تھا، لیکن اس سے بھی اہم وجہ یہ ہے کہ مہاجرین کی آبادکاری اور ان کی متروکہ جائیداد کی بحالیات کرنے والی انتظامیہ میں بھی سب لوگ ایمان دار اور مہاجرین کے ساتھ مخلص نہ تھے، اور ایسے لوگوں نے مہاجرین کے لیے کوئی بھی قابلِ قدر کام انجام نہ دیا، بلکہ وہ اپنی خواہشات کے غلام بن کر رہ گئے۔

اس شرمناک حقیقت کو فاطمہ جناح نے ”مہاجر کلیم ہولڈرز“ کی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے یوں بیان کیا:

> متروکہ املاک کا ایک بڑا حصہ ابھی تک پوشیدہ رکھا گیا ہے اور اس بارے میں کوئی اعلان نہیں کیا گیا۔ عوام یہ جاننے کا حق رکھتے ہیں کہ ہندو جو املاک یہاں چھوڑ کر گئے ہیں ان کی مالیت اور تفصیل کیا ہے اور ان کی تقسیم کیوں کر کی گئی ہے۔ الاٹمنٹ کا تمام کام خفیہ طریقے سے ہو رہا ہے

اور کسی یکساں اصول پر عمل نہیں کیا جاتا۔ حالاں کہ جانب داری اور اقربا پروری کے امکانات کو روکنے کے لیے ضروری تھا کہ کوئی ایک اصول بنا کر اس پر سختی سے عمل کیا جاتا۔☆۶۴

بدقسمتی سے ایسا نہ ہوا اور بہت سے مہاجرین نے متروکہ جائیداد کے حصول کے لیے جو کلیم فارم وغیرہ داخل کرائے تھے، انھیں ان کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ شہری اور زرعی دونوں اقسام کی متروکہ املاک کا ایک بڑا حصہ ایسے لوگوں کو دے دیا گیا جن کا کوئی حق یا دعویٰ نہیں بنتا تھا۔

ہزاروں مکان اور دُکانیں، سیکڑوں صنعتی ادارے اور لاکھوں ایکڑ زرعی زمین ایسے لوگوں کے قبضے میں ہے جو انصاف کے کسی بھی معیار سے اس کے مستحق نہیں ہیں۔ مہاجرین کے کلیموں کے فیصلے میں تاخیر کا ایک اور برا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ متروکہ املاک کے مکانات، دکانیں، فیکٹریوں اور زمینوں کے درست یا غلط استعمال کے نتیجے میں ان کی مرمت کی طلب ہو جانے کی بنا پر ان کی قدر و قیمت میں کمی ہو رہی ہے...حکومت کی بے یقینی اور آئے دن تبدیلی ہو جانے والی پالیسی کی بنا پر مہاجر الاٹیوں کو آخرکار جو جائیداد الاٹ کی جائے گی وہ ان کے لیے اس قدر مفید نہیں رہے گی جس قدر دوسری صورت میں ہوتی کیوں کہ ان کی قدر و قیمت میں بہت کمی واقع ہو چکی ہوگی۔☆۶۵

الغرض ہندوستان سے ہجرت کرنے والے مہاجرین کو زندگی کے ہر شعبے میں کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ مہاجرین ہندوستان میں جو جائیداد وغیرہ چھوڑ کر آئے تھے انھیں اس کے مطابق کچھ نہ ملا۔ انھیں کم کو ہی زیادہ سمجھ کر حالات سے سمجھوتا کرنا پڑا۔

اس کے برعکس موقع پرستوں اور منصب پرستوں کی بن آئی اور دونوں نے اپنی خودغرضانہ کوششوں سے نو دولتیوں کے طبقے کو جنم دیا۔ جن کا نہ کوئی ماضی تھی اور نہ اعلیٰ تہذیبی قدریں تھیں۔ اس دور میں منافقت اور انسانی فطرت کے تضاد کا جو مظاہرہ کیا گیا۔ اس کی مثال تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔

تقسیمِ ہند کے بعد مہاجرین کی زندگی میں جو جو حادثات پیش آئے ان حادثات نے زندگی کے ہر شعبے میں اس کے اثرات ڈالے۔ فسادات کی ہولناکیوں اور فرقہ دارانہ بنیاد پر تباہی و بربادی نے عوام کے اندر جو مایوسی اور اعصابی اضمحلال پیدا کر دیا تھا اس نے انسانی نفسیات پر گہرے اثرات ڈالے۔

ہندوستان کی اجتماعی زندگی میں تقسیم، فسادات، ہجرت یا دیسی ریاستوں اور زمیں داری کے خاتمے نے ہلچل پیدا کر دی تھی لیکن یہ تبدیلی اتنی اہم نہیں تھی جتنی اہم وہ تبدیلی تھی جو سماجی، ذہنی اور جذباتی رشتوں کے ٹوٹنے سے انسان کے دل و

دماغ اور سوچ وفکر میں ہوئی تھی جس نے انسان کو ایک نفسیاتی مریض بنا کر رکھ دیا تھا۔

ویسے بھی یہ انسانی فطرت ہے کہ چاہے اسے زندگی کی کتنی ہی مادّی سہولتیں اور آسائشیں میسر ہوں جب تک اسے روحانی خوشیاں حاصل نہ ہوں ساری مادّی آسائشیں بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔گو مہاجرین کو ان کی متروکہ جائیداد نہ ملنے کی وجہ سے ان کی مالی حیثیت بدل گئی تھی، لیکن جائیداد واملاک سے بھی زیادہ قیمتی اثاثہ اپنے پرانے وطن ساتھیوں اور عزیزوں کی یادیں تھیں۔ یہ مہاجرین کسی کو بے آبرو ہوتے ہوئے کسی کو مرتے، اور کسی کو روتے ہوئے چھوڑ کر آئے تھے۔ یہ تکلیف دہ مناظر ان کے ذہنوں پر نقش ہو چکے تھے جن کو مٹانا ان کے بس میں نہ تھا۔ وہ ساتھی، بہن بھائی اور عزیز جس کے ساتھ انھوں نے زندگی کا ایک حصہ گزارہ تھا۔ وہ یا تو ان سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے تھے اور کچھ بچھڑ گئے تھے بچھڑنے والوں کے بارے میں یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ زندہ یا نہیں؟ اور اگر زندہ ہیں تو کس حال میں ہوں گے اور کیا وہ ان سے کبھی دوبارہ مل سکیں گی؟ یہ ایسے سوال تھے جو انھیں ہر وقت بے چین رکھتے تھے اور وہ اپنے بچھڑوں کو یاد کرنے کے سوا کچھ اور نہیں کر سکتے تھے۔

مغویہ اور بازیافتہ خواتین کا مسئلہ اور بھی زیادہ سنگین تھا۔ بہت سے لوگ ایسے تھے جنھوں نے اپنی بیٹیوں کے مرنے کی دعائیں کی تاکہ ان کی عزت محفوظ رہے۔ بازیافتہ خواتین کے کرب کی تو کوئی انتہا ہی نہ تھی یہ خواتین بہت ہی تکلیف دہ مراحل طے کرنے کے بعد جب اپنوں سے جا کر ملتیں تو ان کے ماں اور بہن بھائی انھیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتے اور وہ خود بھی ان کے سامنا کرنے سے کتراتیں۔ اسی نفرت، حقارت اور شرمندگی کے سبب بہت سی عورتوں نے ہندوستان ہی میں رہنا مناسب سمجھا اور بعض نے اپنے مذہب تک کو بدل لیا۔ بہت سے والدین ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنے بوجھ اور ذمّے داریوں کو کم کرنے کے لیے اپنے نوکروں تک سے اپنی بیٹیوں کی شادیاں کیں۔

❁ ❁ ❁

حوالہ جات:

☆1 "India Wins Freedom," Maulana Abul Kalam Azad, P.270-71

☆۲ ''قائدِ اعظم اور اُن کا عہد''، رئیس احمد جعفری، مقبول اکیڈمی، لاہور، س ن، ص ۶۴۱

☆۳ ''قائدِ اعظم اور اُن کا عہد''، محولہٴ بالا، ص ۶۴۱

☆۴ ''جدّ وجہدِ پاکستان''، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ترجمہ: ہلال زبیری، شعبہٴ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۹۰ء، ص ۴۱۵

☆۵ ''قائدِ اعظم اور اُن کا عہد''، محولہٴ بالا، ص ۶۴۳

☆۶ ''دی اسٹیٹ آف پاکستان''، ایل ایف رشبروک ولیمز، بحوالہ: ''پاکستان منزل بہ منزل''، محولہٴ بالا، ص ۳۳۶

☆۷ ''دی ٹرانسفر آف پاور اِن انڈیا''، وی پی مینن، بحوالہ: ''پاکستان منزل بہ منزل''، محولہٴ بالا، ص ۳۲۷

☆۸ ''دی ٹرانسفر آف پاور اِن انڈیا''، وی پی مینن، بحوالہ: ''پاکستان منزل بہ منزل''، محولہٴ بالا، ص ۳۳۷

☆۹ ''دی میکنگ آف پاکستان''، رچرڈ سائمنڈس، بحوالہ: ''پاکستان ناگزیر تھا''، محولہٴ بالا، ص ۵۱۹

☆۱۰ ''دی میکنگ آف پاکستان''، رچرڈ سائمنڈس، بحوالہ: ''پاکستان ناگزیر تھا''، محولہٴ بالا، ص ۵۱۹

☆۱۱ "India Wins Freedom," Maulana Abul Kalam Azad, P.224

☆۱۲ ''پاکستان ناگزیر تھا''، سیّد حسن ریاض، شعبہٴ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، اشاعتِ ششم ۱۹۹۲ء، ص ۵۴۰

☆۱۳ ''پاکستان ناگزیر تھا''، محولہٴ بالا، ص ۵۳۰

☆۱۴ ''جب امرت سر جل رہا تھا''، خواجہ افتخار، خواجہ پبلشرز، لاہور، طبعِ چہارم اگست ۱۹۸۳ء، ص ۲۴۹

☆۱۵ ''جب امرت سر جل رہا تھا''، محولہٴ بالا، ص ۹۵

☆۱۶ ''جب امرت سر جل رہا تھا''، محولہٴ بالا، ص ۹۶

☆۱۷ ''جب امرت سر جل رہا تھا''، محولہٴ بالا، ص ۹۶

☆۱۸ ''جب امرت سر جل رہا تھا''، محولہٴ بالا، ص ۱۳۵

☆۱۹ ''جب امرت سر جل رہا تھا''، محولہٴ بالا، ص ۱۹۲

☆۲۰ ''جب امرت سر جل رہا تھا''، محولہٴ بالا، ص ۱۹۳ اور ص ۱۹۵

☆۲۱ ''پاکستان کی قیمت''، منشی عبدالرحمان، جاوید اکیڈمی، ملتان، طبعِ اوّل جون ۱۹۸۳ء، ص ۲۰

☆۲۲ ''پاکستان منزل بہ منزل''، محمد علی چراغ، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص۲۳۲

☆۲۳ ''پاکستان کی قیمت''، محولہٴ بالا، ص۱۴۶

☆۲۴ ''جب امرت سر جل رہا تھا''، محولہٴ بالا، ص۹۱-۲۹۰

☆۲۵ ''دی میکنگ آف پاکستان''، رچرڈ سائمنڈس، بحوالہ: ''پاکستان ناگزیر تھا''، محولہٴ بالا، ص۵۲۶

☆۲۶ روزنامہ ''پاکستان ٹائمز''، بحوالہ: ''پاکستان کی قیمت''، محولہٴ بالا، ص۱۴۵

☆۲۷ ''پاکستان کی قیمت''، محولہٴ بالا، ص۳۳۳

☆۲۸ ''پاکستان ناگزیر تھا''، محولہٴ بالا، ص۵۴۸

☆۲۹ ''پاکستان ناگزیر تھا''، محولہٴ بالا، ص۵۴۸

☆۳۰ ''پاکستان کی قیمت''، محولہٴ بالا، ص۳۲۸

☆۳۱ ''پاکستان کی قیمت''، محولہٴ بالا، ص۳۲۹

☆۳۲ ''پاکستان ناگزیر تھا''، محولہٴ بالا، ص۵۵۰

☆۳۳ ''پاکستان ناگزیر تھا''، محولہٴ بالا، ص۵۵۰

☆۳۴ ''ظہورِ پاکستان''، چودھری محمد علی، مکتبہٴ کارواں، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص۳۳۱

☆۳۵ ''تاریخِ پاکستان''، زاہد حسین انجم، نیو بک پیلس، لاہور، ص۴۸

☆۳۶ ''ظہورِ پاکستان''، محولہٴ بالا، ص۳۳۲

☆۳۷ ''ظہورِ پاکستان''، محولہٴ بالا، ص۳۳۳

☆۳۸ ''تاریخِ پاکستان''، محولہٴ بالا، ص۴۸

☆۳۹ ''تاریخِ پاکستان''، محولہٴ بالا، ص۴۸-۴۷

☆۴۰ ''ظہورِ پاکستان''، محولہٴ بالا، ص۳۳۴

☆۴۱ ''ظہورِ پاکستان''، محولہٴ بالا، ص۳۳۴

☆۴۲ ''ظہورِ پاکستان''، محولہٴ بالا، ص۳۳۵

☆۴۳ ''ظہورِ پاکستان''، محولہٴ بالا، ص۳۳۵

☆۴۴ ''زوالِ حیدرآباد کی اَن کہی داستان''، مشتاق احمد خان، آفتاب عالم پریس، لاہور، طبعِ اوّل جون ۱۹۸۶ء، ص۲۳۷

☆۴۵ ''ظہورِ پاکستان''، محولہٴ بالا، ص۳۳۷

☆۴۶ ''سقوطِ حیدرآباد''، ڈاکٹر معین الدین عقیل و ڈاکٹر عمر خالدی، بہادر یار جنگ اکادمی، کراچی، طبع اوّل ستمبر ۱۹۹۸ء، ص ۱۵

☆۴۷ ''ظہورِ پاکستان''، محولہٗ بالا، ص ۳۱۴

☆۴۸ ''ظہورِ پاکستان''، محولہٗ بالا، ص ۳۱۴

☆۴۹ ''حیاتِ قائدِ اعظم''، چودھری محمد خان عزیز، مقبول اکیڈمی، لاہور، ص ۷۴-۶۷۳

☆۵۰ ''حیاتِ قائدِ اعظم''، محولہٗ بالا، ص ۶۷۹

☆۵۱ روزنامہ ''ڈان'' کراچی، ۳۰ رجون ۱۹۶۹ء، بحوالہ: ''پاکستان ناگزیر تھا''، محولہٗ بالا، ص ۵۴-۵۵۳

☆۵۲ ''تاریخِ پاکستان''، محولہٗ بالا، ص ۳۷

☆۵۳ ''ظہورِ پاکستان''، محولہٗ بالا، ص ۳۱۷

☆۵۴ ''جناح کری ایٹر آف پاکستان''، ہیکٹر بولائتھو، بحوالہ: ''پاکستان ناگزیر تھا''، محولہٗ بالا، ص ۵۲۷

☆۵۵ ''ظہورِ پاکستان''، محولہٗ بالا، ص ۳۱۷

☆۵۶ ''ظہورِ پاکستان''، محولہٗ بالا، ص ۳۱۵

☆۵۷ ''ظہورِ پاکستان''، محولہٗ بالا، ص ۳۱۶

☆۵۸ ''ظہورِ پاکستان''، محولہٗ بالا، ص ۱۸-۳۱۷

☆۵۹ ''ظہورِ پاکستان''، محولہٗ بالا، ص ۳۲۰

☆۶۰ ''تاریخِ پاکستان''، محولہٗ بالا، ص ۴۴

☆۶۱ ''آزادی اور عوام''، احمد سلیم، نگارشات، لاہور، ص ۱۲۰

☆۶۲ ''فاطمہ جناح، حیات و خدمات''، آغا حسین ہمدانی، قومی کمیشن برائے تحقیقِ تاریخ و ثقافت، اسلام آباد، طبعِ اوّل ۱۹۷۸ء، ص ۱۱۵

☆۶۳ ''فاطمہ جناح، حیات و خدمات''، محولہٗ بالا، ص ۶۱

☆۶۴ ''مادرِ ملّت کا جمہوری سفر''، از ہر منیر، فرنٹیر پوسٹ پبلیکیشنز، اشاعتِ اوّل ۱۹۹۳ء، ص ۲۴۱

☆۶۵ ''مادرِ ملّت کا جمہوری سفر''، محولہٗ بالا، ص ۴۳-۲۴۲

بابِ سوم

اُردو افسانے پر فسادات کے اثرات

باب سوم

اُردو افسانے پر فسادات کے اثرات

الف: ترقّی پسند تحریک کا نقطۂ نظر

۱۹۳۶ء میں ترقّی پسند تحریک کا آغاز ایک انقلاب کی صورت میں رونما ہوا۔ جس کی بنیاد سجاد ظہیر نے رکھی۔ سجاد ظہیر کے علاوہ ایم ڈی تاثیر، محمد علی، ڈاکٹر ملک راج آنند، ڈاکٹر جیوتی گھوش اور اقبال سنگھ نے اس تحریک کی بنیاد رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔

> اپریل ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں اس انجمن کا پہلا اجلاس منشی پریم چند کی صدارت میں ہوا۔ اس انجمن کا مقصد ادب اور دوسرے فنونِ لطیفہ کو عوام سے قریب لانا تھا۔ اسے نسلی تعصب اور فرقہ پرستی کے اثر سے دور رکھنا اور اسے حقیقی زندگی کا عکاس بنانا تھا۔ ساتھ ہی مستقبل کی تعمیر کا ذریعہ بھی بنانا تھا۔ ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ہمارے ادیب قدیم روایات کی حفاظت کریں اور موجودہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کو ادب کا موضوع بنائیں... مثلاً ہماری سیاسی غلامی، سماجی انحطاط، مفلسی اور جہالت وغیرہ۔ ☆۱

ترقّی پسند تحریک مخصوص مقاصد اور اصولوں کو مدِ نظر رکھ کر تشکیل دی گئی تھی یہی وجہ ہے کہ ترقّی پسند ادیبوں نے اپنی تحریروں میں تخیلی اور تصوّراتی خیالات کی جگہ معاشرے کے تلخ حقائق کو بیان کیا۔ ترقّی پسند تحریک کا مقصد غریب اور مظلوم طبقے کے مسائل کو بیان کرنا اور اعلیٰ طبقے اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف آواز اُٹھانا تھا۔ کارل مارکس کے نظریے کو فروغ دینا تھا۔

اس تحریک کو ادیبوں اور شاعروں کی ایک بڑی تعداد نے قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اس میں شامل ہوگئے۔ مثلاً منشی پریم چند،

مجنوں گورکھ پوری، فیض احمد فیض، کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، ن م راشد، اختر حسین رائے پوری، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، احتشام حسین، علی سردار جعفری، حیات اللہ انصاری، رشید جہاں، سجاد ظہیر، جوش ملیح آبادی، حسرت موہانی، نیاز فتح پوری، قاضی عبدالغفار، فراق گورکھ پوری، اسرارالحق مجاز، جاں نثار اختر، اختر الایمان، معین احسن جذبی، مخدوم محی الدین، سلام مچھلی شہری وغیرہ کے علاوہ علامہ اقبال، ٹیگور اور مولوی عبدالحق نے بھی اس تحریک کو سراہا۔

ترقی پسند افسانہ نگاروں نے قدیم اور جدید روایت کے امتزاج سے افسانے تخلیق کیے۔ انھوں نے یہ افسانے مندرجہ ذیل رجحانات کو مدِ نظر رکھ کر تخلیق کیے:

۱۔ حقیقت پسندی کا رجحان جس کی مختلف صورتیں اس دور کے افسانے میں ملتی ہیں۔ جیسے دیہاتی زندگی کے مرقعے، شہری زندگی کی تصویر کشی، رومانی حقیقت نگاری، اشتراکی حقیقت نگاری، نفسیاتی حقیقت نگاری، جنسی کش مکش کا بیان، سیاسی رجحان۔

۲۔ بین الاقوامیت۔

۳۔ فن اور تکنیک میں نئے تجربے کی کوششیں۔ ☆۴

تقسیمِ ہند کے بعد ترقی پسند افسانہ نگاروں نے ان موضوعات اور رجحانات کے علاوہ ۱۹۴۷ء کے فسادات، ہجرت اور اس کے نفسیاتی اثرات کو بھی اپنے افسانوں کے موضوعات میں شامل کرلیا۔

فنی تکنیک، موضوعات اور اس کی اہمیت کے لحاظ سے اس کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

پہلا دور ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۰ء تک کا ہے۔ جس میں ترقی پسند تحریک تجرباتی دور سے گزر رہی تھی۔

دوسرا دور ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۷ء تک کا ہے۔ یہ دور سیاسی اور سماجی لحاظ سے اہم تبدیلیوں کا دور تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب انگریز سامراج اپنے اختتام کے آخری مراحل طے کر رہا تھا جب کہ ہندو اور مسلمان سیاسی لیڈر اپنے اپنے سیاسی نظریات منوانے اور ایک دوسرے کو زیر کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے۔ اس دور میں ترقی پسند افسانہ نگاروں نے معاشرے میں ہونے والی سیاسی اور سماجی کش مکش کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور اس دور میں ترقی پسند تحریک نے تیزی سے ترقی کے مراحل طے کیے۔

تقسیمِ ہند کے ساتھ ہی ترقی پسند تحریک کا دوسرا دور ختم ہوا۔

ترقی پسند افسانہ نگاروں میں اس دور میں جو افسانے لکھے وہ افسانے موضوع اور مقصد کے لحاظ سے خالصتاً ترقی پسند افسانے تھے۔

اس سلسلے میں جن افسانوں کو شہرت حاصل ہوئی ان میں پریم چند کا افسانہ ''کفن''، غلام عباس کا ''آنندی''، محمد مجیب

کا ''کیمیا گر''، راجندر سنگھ بیدی کا ''گرم کوٹ'' کرشن چندر کا ''ٹوٹے ہوئے تارے''، احمد علی کا ''ہماری گلی''، حیات اللہ انصاری کا ''آخری کوشش'' اور سعادت حسن منٹو کا ''ہتک'' اور ''نیا قانون'' شامل ہیں۔

ان افسانوں میں اخلاقی پستی، جنسی بے راہ روی، غربت وافلاس اور معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں کو بیان کیا گیا ہے۔

ترقّی پسند تحریک کا تیسرا دور ۱۹۴۷ء کے بعد شروع ہو کر اس تحریک کے زوال پر ختم ہوا۔

یہ دور ترقّی پسند تحریک کے لیے اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس دور میں ترقّی پسند افسانے میں نئے موضوعات کا اضافہ کیا گیا۔ اسی دور میں بہت سے نئے لکھنے والوں نے اس تحریک میں شمولیت اختیار کی۔ ایک اور اہم تبدیلی یہ رونما ہوئی کہ اس تحریک میں ادب کی جگہ سیاست آ گئی جو اس کے زوال کا باعث بنی۔

تقسیمِ ہند کے نتیجے میں جہاں عام لوگوں نے ہجرت کی وہاں ادیب اور شاعر بھی ہجرت کے کرب سے بچ نہ سکے۔ بعض افسانہ نگار تو ہندوستان ہی میں رہ گئے اور بعض نے پاکستان کو اپنا وطن مان لیا، بہت سے افسانہ نگار ایسے بھی تھے جنھوں نے اس حادثے کے بعد لکھنا ترک کر دیا۔

تقسیمِ ہند کے نتیجے میں جن افسانہ نگاروں نے پاکستان سے ہجرت کی۔ ان میں سعادت حسن منٹو، غلام عباس، اختر حسین رائے پوری، احمد علی، احمد ندیم قاسمی، عزیز احمد، ممتاز مفتی، ممتاز شیریں، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، اے حمید، قدرت اللہ شہاب، ابوالفضل صدیقی، محمد حسن عسکری، شوکت صدیقی اور اشفاق احمد شامل ہیں۔

ان افسانہ نگاروں میں سے بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے تقسیمِ ہند سے کچھ عرصہ قبل لکھنا شروع کیا تھا، بعد میں بھی انھوں نے لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان افسانہ نگاروں میں شوکت صدیقی، اشفاق احمد، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، جیلانی بانو، قدرت اللہ شہاب، اے حمید، ابوالفضل صدیقی شامل ہیں۔ ان کے ابتدائی افسانوں کو اتنی شہرت حاصل نہ ہوئی جتنی کہ تقسیم کے بعد لکھے جانے والے افسانوں کو ہوئی۔

تقسیم کے بعد پرانے افسانہ نگاروں میں سے احمد علی، علی عباس حسینی، مجنوں گورکھ پوری، حجاب امتیاز علی، اختر انصاری اور محمد حسن عسکری نے لکھنا بند کر دیا۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم صرف جغرافیائی تبدیلیوں کا سبب نہ بنی، بلکہ اس تقسیم کے نتیجے میں بہت سی سیاسی اور سماجی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

یوں تو فسادات کا سلسلہ تقسیمِ ہند سے قبل شروع ہو گیا تھا لیکن ہجرت کے دوران ہی فسادات شدت اختیار کر گئے جگہ جگہ قتل و غارت گری، لوٹ مار اور خواتین کی آبروریزی کے واقعات پیش آئے۔ ان تکلیف دہ حادثات کی وجہ سے ملک کی

آزادی کی وہ خوشی نہ منائی جا سکی جو اتنی بڑی کامیابی پر منائی جانی چاہیے تھی۔

ملک کی تقسیم کے بعد سیاسی مسائل تو کافی حد تک حل ہو گئے، لیکن سماجی، معاشی اور نفسیاتی مسائل ابھر کر سامنے آئے۔ لوگوں کو نہ صرف اپنے صدیوں پرانے وطن کو چھوڑنا پڑا، بلکہ اپنے عزیزوں، رشتے داروں اور بچپن کے ساتھیوں کو بھی چھوڑنا پڑا۔ اپنے آزاد ملک میں آنے کے باوجود انھیں نئے ماحول اور نئی جگہ میں شدید اجنبیت کا احساس ہوا۔ وطن اور ساتھیوں کی یادوں کے علاوہ ہجرت کے دوران انھوں نے ایسے تکلیف دہ مناظر دیکھے تھے جو انھیں ہر وقت اداس رکھتے اور ایسے لوگ زندہ رہ کر بہت کرب ناک اور تکلیف دہ حالات کا مقابلہ کر رہے تھے ان کے پاس سب سے قیمتی سرمایہ ماضی کی یادیں اور تصورات تھے جن میں وہ غرق ہو کر رہ گئے تھے، اور ان ساری کیفیات نے انھیں ذہنی کش مکش میں مبتلا کر دیا تھا۔

اس سارے کرب میں صرف عام لوگ ہی مبتلا نہ ہوئے، بلکہ شاعر اور ادیب بھی اس دکھ سے بچ نہ سکے۔ شاعروں نے اپنی شاعری اور افسانہ نگاروں نے ان مہاجرین کے سماجی، معاشی اور نفسیاتی مسائل کو سمجھا اور محسوس کیا اور پھر اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

۱۹۴۷ء کے فسادات کوئی معمولی صورتِ حال تھی۔ اس صورتِ حال کی وجہ سے لوگوں پر قیامتیں گزر گئیں تاریخ میں ایسے الم ناک واقعات کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ ان فسادات کو افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ بعض افسانہ نگاروں نے تو اس موضوع پر کئی کئی افسانے لکھے اور بعض افسانہ نگاروں نے ایک آدھ ہی افسانہ لکھا۔

سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے فسادات کے موضوع پر کئی افسانے لکھے۔ ہم فرداً فرداً ان کا جائزہ لیتے ہیں۔

حیات اللّٰہ انصاری:

حیات اللّٰہ انصاری نے فسادات کے موضوع پر دو افسانے ''شکر گزار آنکھیں'' اور ''ماں بیٹا'' لکھے۔ یہ دونوں افسانے اگرچہ فسادات کے موضوع پر ہیں لیکن ان افسانوں میں حیات اللّٰہ انصاری نے انسان دوستی کا سبق دیا ہے۔ اپنے افسانے ''شکر گزار آنکھوں'' میں انھوں نے ایک ایسی مسلمان دلہن کا ذکر کیا ہے جو ہندوؤں کی ہوس کی نشانہ بننے سے پہلے اپنے شوہر کے سامنے مرنے کو ترجیح دیتی ہے اور اس خواہش کی تکمیل کے لیے وہ ہندو بلوائیوں کی بہت منتیں کرتی ہے۔ آخر ایک بلوائی کو اس پر ترس آ جاتا ہے اور وہ اس کی یہ خواہش پوری کر دیتا ہے۔ مرنے کے بعد دلہن کی آنکھوں میں اسے تشکر کے جذبات نظر آتے ہیں جو اسے ساری زندگی فسادات کے دوران قتل و غارت گری کرنے کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔

اسی طرح ان کا افسانہ ''ماں بیٹا'' بھی ایک تنہا مسلمان عورت اور ایک تنہا رہ جانے والے ہندو لڑکے کے بارے میں

ہے۔ یہ دو رتنہا افراد اپنے اپنے رشتے سے بچھڑنے کے بعد تمام تعصبات کو بھلا کر ایک ماں بیٹے کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔

کرشن چندر:

منٹو کے بعد کرشن چندر ایسے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے آزادی کے بعد بھی لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا، اور مختلف موضوعات پر افسانوں کے کئی مجموعے لکھے۔ ان مجموعوں کے علاوہ ''فسادات'' کے دوران ہونے والے وحشت ناک حادثوں کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں صرف تقسیمِ ہند اور ہجرت کی وجہ سے صدیوں سے ساتھ رہنے والے ہندو مسلم ساتھیوں، پڑوسیوں، ساتھ پڑھنے والے ہندو مسلم طالب علموں کے بچھڑنے کا غم تھا، بلکہ دونوں قوموں کے درمیان جو نفرت اور تعصب پیدا ہو گیا تھا انھیں اس بات کا بے حد دکھ تھا۔

اس دکھ کی ایک وجہ یہ بھی نظر آتی ہے کہ کرشن چندر کا تعلق چوں کہ پنجاب سے تھا، اور تقسیمِ ہند کا نقصان سب سے زیادہ پنجاب ہی کو اُٹھانا پڑا تھا ہجرت قتل و غارت، لوٹ مار اور خواتین کی بے حرمتی کے زخم سب سے زیادہ پنجاب ہی کی عوام کو لگے تھے۔ کرشن چندر نے یہ سارے دردناک واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ ان پر ان واقعات کا گہرا اثر ہونا یقینی تھا۔

فرقہ وارانہ فسادات سے متأثر ہو کر نہ صرف کرشن نے خود لکھا، بلکہ دیگر فن کاروں کو بھی لکھنے کی ترغیب دی۔ بلونت سنگھ نے اس بات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا:

> ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران جب کہ میں مسوری میں عارضی طور پر قیام پذیر تھا، ڈانٹ سے پُر اُن کا ایک محبت نامہ صادر ہوا۔ شکایت یہ تھی کہ میں نے ابھی تک فسادات کے موضوع پر کچھ لکھا کیوں نہیں؟ میں نے جواب دیا کہ جس صورتِ حال پر آپ افسانے لکھ رہے ہیں میں سر دست اس صورتِ حال سے گزر رہا ہوں۔ ☆۳

تقسیمِ ہند کے بعد جب ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشیدگی بڑھ گئی تو اس دور میں بھی کرشن نے پاکستان میں رہنے والے ساتھی اور ادیبوں سے تعلق منقطع نہ کیا اور اس کے لیے ہر قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار رتھے۔ کرشن اپنے ساتھیوں اور لاہور سے شدید محبت کا ذکر کرتے ہوئے قدوس صہبائی لکھتے ہیں:

> کرشن چندر بڑی مستعدی اور خلوص کے ساتھ پاکستانی ادیبوں سے رابطہ قائم کیے ہوئے تھے۔ وہ اس پر آشوب زمانے میں بھی لاہور کا ایک چکر لگانا چاہتا تھا۔ لاہور اس کی تربیت گاہ اور مادرِ علم تھا۔ لاہور سے کرشن چندر کا گہرا لگاؤ تھا۔ لاہور کے دوستوں کو وہ اس طرح یاد کرتا تھا۔ جس طرح بھائی، بھائی کو اور ماں باپ کو بچے یاد کرتے ہیں۔ دوستوں نے اس کی لاہور جانے کی

خیال کی مزاحمت کی اور حالات کی ناہمواری اور خطرناکی کی وجہ سے کرشن دل مسوس کر رہ گیا۔☆۴

تقسیمِ ہند کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو نفرت،تعصب اور دوری پیدا ہوگئی تھی کرشن نے ان تکلیف دہ حالات پر بہت دکھ درد محسوس کیا، اور اپنی تحریروں کے ذریعے ان اختلافات کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

فسادات کے واقعات کو ذہن میں رکھتے ہوئے انھوں نے ''ہم وحشی ہیں'' کے نام سے چھ افسانوں پر مشتمل ایک مجموعہ شائع کروایا۔ جس میں ''اندھے''، ''امرت سر''، ''پشاور ایکسپریس''، ''ایک طوائف کا خط''، ''لال باغ'' اور ''جیکسن'' شامل ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا افسانہ ''تین غنڈے'' بھی قابلِ ذکر ہے۔

افسانہ ''لال باغ'' اس لحاظ سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں فسادات کے دوران ہونے والے قتل و غارت گری کے ان واقعات کا ذکر کیا گیا ہے جس کے عوض کرائے کے قاتل ابتدا میں پچاس روپے اور حالات زیادہ خراب ہونے کے بعد ایک مسلمان کے قتل کے عوض پچیس روپے کمانے لگ گئے تھے اور ایک مسلمان کی قیمت ۲۵ اور کبھی ۵۰ روپے ہوگئی تھی۔

اس افسانے کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ان جرائم پیشہ افراد کا بھی ذکر کیا گیا ہے جنھوں نے ۱۹۴۷ء کے فسادات کو سنہرا موقع جانتے ہوئے لوٹ مار، اسمگلنگ،عورتوں کی تجارت جیسے ذلیل کاروبار سے خوب نفع کمایا۔

''لال باغ'': اس افسانے میں کرشن چندر نے ان جرائم پیشہ افراد کا ذکر کیا ہے جنھوں نے ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران پیدا ہونے والے ناسازگار حالات اور افراتفری سے خوب فائدہ اٹھاتے ہوئے لوٹ مار اسمگلنگ اور عورتوں کی تجارت جیسے گھناؤنے کاروبار سے خوب نفع کمایا۔

ان ہی مجرموں میں سے ایک عادی مجرم کرشن کور ہے جو جرائم کی دنیا میں ''دادا'' کے نام مشہور ہے۔ وہ غنڈوں کی ایک جماعت بنا لیتا ہے۔ عام لوگوں کے سامنے وہ ایک سرمایہ دار اور معزز شہری ہے۔ جب فسادات شروع ہوتے ہیں تو کرشن کور سے حوصلہ اور دادملتی،شہر کے مختلف سرمایہ داران غنڈوں کو ایک قتل کے بدلے ۵۰ روپے دیتے ہیں۔ حالات زیادہ خراب ہونے کے بعد جب قتل و غارت گری بڑھ جاتی ہے اور عام ہندو بھی مسلمانوں کو قتل کرنے سے نہیں چوکتے تو ان غنڈوں کا معاوضہ پچاس روپے سے کم ہوکر ۲۵ روپے رہ جاتا ہے۔

کرشن کا یہ افسانہ اس بات کی دلیل ہے کہ فسادات کے دوران انسانی زندگی کی قیمت پہلے پچاس روپے تھی اور پھر اس سے بھی کم ہوگئی۔ قاتلوں نے انسانوں کو قتل کر کے اپنا پیٹ پالا۔ ایسے جارحانہ اور وحشت ناک فعل کو انسانیت کی موت، کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا۔

''ایک طوائف کا خط'': یہ افسانہ فسادات پر لکھے گئے تمام افسانوں سے موضوع اور ان کی اہمیت کے لحاظ سے منفرد اور

ایک اہم افسانہ ہے۔

یہ افسانہ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں ایک طوائف یہ جانتے ہوئے بھی کہ معاشرہ انھیں شدید نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے پنڈت نہرو اور قائدِ اعظم کو ایک خط لکھی ہے جس میں ایک مسلمان لڑکی بتول اور ایک گیارہ سالہ ہندو لڑکی بیلا کا ذکر کرتی ہے۔جن کے والدین فسادات کے دوران ہلاک ہو چکے ہیں وہ بیلا کو ایک دلال سے تین سو روپے میں اور بتول کو پانچ سو روپے میں خرید چکی ہے،لیکن وہ ان لڑکیوں کو اپنے مکروہ پیشے سے بچانا چاہتی ہے۔ان کی زبان سے اور چہرے پر لکھی گئی کرب ناک داستان سن کر طوائف کا دل پسیج جاتا ہے۔ان لڑکیوں نے کم سنی ہی سے ایسے مناظر اور واقعات دیکھ لیے ہیں جس نے ان کے ذہن اور سوچ کو بہت آگے تک پہنچا دیا ہے۔قحبہ خانے میں آنے والوں کو دیکھ کر ان کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں دیکھ کر طوائف کو بہت تکلیف ہوتی ہے اور وہ انھیں جلد سے جلد قحبہ خانے سے نکالنے کے لیے نہرو اور قائدِ اعظم کو خط لکھتی ہے۔بیلا کے تحفظ کی ذمّے داری وہ قائدِ اعظم کو سونپتی ہے کیوں کہ بیلا کو راول پنڈی میں بے سہارا کرنے والے مسلمان تھے جب کہ بتول جس کا تعلق لدھیانہ کے ایک مسلمان گھرانے سے تھا جس کی تمام بہنوں اور خود بتول کو ہندو نے اپنی ہوس کا نشانہ بنا چکے تھے اب نیم پاگل ہو چکی تھی۔اس زندہ لاش کو پناہ دینے کی ذمّے داری اس نے نہرو کے سپرد کی۔

کرشن چندر کا یہ منفرد افسانہ ایک عام انسان کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ دوسری بدنصیب خواتین کی طرح ان دو لڑکیوں پر کتنی قیامتیں گزری ہوں گی ایک طوائف جو عام طور پر محبت اور رحم کے جذبات سے عاری ہوتی ہے اس کا دل بھی موم ہو گیا۔

سعادت حسن منٹو:

سعادت حسن منٹو ان افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں جنھوں نے ۱۹۴۷ء کے فسادات کے نتیجے میں ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی۔منٹو نے بذاتِ خود ہجرت اور فسادات کی تکالیف برداشت کی تھیں شاید اسی لیے انھوں نے مہاجرین کے دکھ کو بہتر طور پر سمجھا اور ان کے دکھوں اور مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

> منٹو کی خوبی یہ ہے کہ جو باتیں اس کے یہاں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے ان میں بھی زندگی کی حقیقت کا کوئی نہ کوئی رخ اور اس کی اصلیت کا کوئی نہ کوئی پہلو ہوتا ہے زندگی کے مختلف حقائق تک اس کی نظریں بڑی بے باکی اور دراکی کے ساتھ پہنچتی ہیں اور ان کو پوری طرح نمایاں کر دیتی ہیں منٹو نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اس کے رنگا رنگ پہلوؤں کو شدّت سے محسوس کیا ہے اور اس لیے انسانی زندگی اور اس کے مختلف حقائق اپنے تمام تنوعات کے ساتھ اس کے افسانوں میں ملتے ہیں۔☆۵

''جنس'' منٹو کا پسندیدہ موضوع ہے۔ تقسیمِ ہند سے قبل لکھے جانے والے ان کے بیش تر افسانے اس موضوع پر لکھے گئے ہیں۔ تقسیم کے بعد بھی انھوں نے فسادات کے دوران ہونے والے جنسی تشدد اور خواتین کی کی بے حرمتی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

> ان افسانوں میں بلا امتیاز ظالموں کو ظالم اور مظلوموں کو مظلوم دکھایا گیا ہے۔ منٹو بنیادی طور پر انسان دوست ادیب ہیں۔ اس لیے وہ (اس بات کا امتیاز رکھے بغیر کہ ظالم کس مذہب اور عقیدے کا ہے) اس کو ظالم کہا ہے اسی طرح مظلوم بھی بلا امتیاز رنگ و نسل مظلوم ہے۔ ☆۶

فسادات کے موضوع پر لکھے جانے والے منٹو کے افسانوی مجموعوں میں ''سیاہ حاشیے''، ''نمرود کی خدائی''، ''یزید''، ''خالی بوتلیں'' اور ''خالی ڈبے'' قابلِ ذکر ہیں۔

افسانوں کے ان مجموعوں میں سے ''کھول دو''، ''شریفین'' اور ''ٹھنڈا گوشت'' میں منٹو نے جنسی تشدد اور اس کے نفسیاتی اثرات کو بیان کرنے میں کسی قسم کی پردہ پوشی نہیں کی۔ اس سے ان افسانوں میں اتنی سچائی اور اثر پیدا ہو گیا ہے کہ ۱۹۴۷ء کی تاریخ پڑھے بغیر ہی اس وقت کے حالات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے، بلکہ تاریخ تو صرف اعداد و شمار محفوظ رکھتی ہے۔ جب کہ منٹو نے انسانی جذبات و احساسات میں فسادات سے رونما ہونے والی تبدیلیوں کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔

''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' منٹو کے نمائندہ افسانوں میں سے ایک ہے۔ اس افسانے میں منٹو نے ایک ایسے سکھ زمیں دار کی کہانی لکھی ہے جو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اپنے وسیع و زرخیز کھیت چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا لیکن جب تقسیمِ ہند کے بعد اسے مجبوراً پاکستان سے ہجرت کرنے کی وجہ سے اپنے کھیتوں اور زمینوں کو چھوڑنا پڑا تو وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا۔

۱۹۴۷ء کے فسادات کے موضوع پر لکھے جانے والے ان نمائندہ افسانوں کے علاوہ ان کے افسانے ''دیکھ کبیرا رویا''، ''موذیل''، ''وہ لڑکی'' اور ''ہرنام کور'' میں بھی فسادات کی ہولناکیوں اور ہندو مسلم نفاق کو بیان کیا گیا ہے۔

۱۹۴۷ء کے فسادات کے علاوہ منٹو نے انگریز سامراج اور تقسیمِ ہند سے قبل ہندو مسلم فسادات کے المیوں پر بھی افسانے لکھے۔

> فسادات سے پہلے افسانوں میں جلیاں والا باغ کے حادثے کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ان افسانوں میں ''آتش پارے''، ''تماشہ''، ''دیوانہ شاعر'' وغیرہ شامل ہیں جن میں اس واقعہ کے ضمن میں سامراج کے خلاف جوان منٹو کی انقلابی روح تڑپتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ☆۷

اسی طرح تقسیمِ ہند کے بعد جب آزاد ریاستوں حیدرآباد دکن، جوناگڑھ، مناودر اور کشمیر کے الحاق کا مسئلہ پیش آیا تو اس سلسلے میں بھی ہندو اور انگریزوں نے مل کر ان ریاستوں پر قبضہ کرلیا۔

ایک حساس ادیب اور ایک پاکستانی شہری کی حیثیت سے منٹو نے بھی اس ناانصافی اور بے ایمانی کو شدت سے محسوس کیا۔ چناں چہ ۱۹۴۸ء میں جب کشمیر کے الحاق کے سلسلے میں جنگ ہوئی تو منٹو نے کشمیر کی یادوں، امنگوں اور وہاں کی تہذیب و ثقافت کے حوالے سے تین افسانے ''آخری سیلوٹ''، جھوٹی کہانی'' اور ''ٹیٹوال کا کتا'' تحریر کیے۔ واضح رہے کہ منٹو کشمیرالاصل تھے۔

> جب پاکستان کے لوگوں کو بھوکا مارنے کی خاطر دریاؤں کے رخ موڑنے کی باتیں ہوتی ہیں پانی بند کرنے کی دھمکیاں ہی نہیں دی جاتیں، عملی اقدامات بھی کیے جاتے ہیں اس وقت (کشمیر کے موضوع پر لکھنے والا) پہلا پاکستانی ادیب سعادت حسن منٹو ''یزید'' ایسا افسانہ لکھتا ہے۔ ☆۸

عصمت چغتائی:

۱۹۴۷ء کے فسادات سے عصمت چغتائی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ اگرچہ انھوں نے تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان میں ہجرت نہیں کی، لیکن ان کے بہت سے ساتھی، بہن بھائی اور ان کے بعض ہم عصر ادیب تقسیمِ ہند کے نتیجے میں ان سے بچھڑ گئے۔

> فسادات کا سیلاب اپنی پوری خباثتوں کے ساتھ آیا اور چلا گیا، مگر اپنے پیچھے زندہ مردہ اور سسکتی ہوئی لاشوں کے انبار چھوڑ گیا۔ ملک کے دو ٹکڑے نہیں ہوئے جسموں اور ذہنوں کا بھی بٹوارا ہو گیا۔ قدریں بکھر گئیں۔ انسانیت کی دھجیاں اڑ گئیں گورنمنٹ کے افسر، دفتروں کے کلرک مع میز کرسی، قلم دوات اور رجسٹروں کے مالِ غنیمت کی طرح بانٹ دیے گئے اور جو کچھ اس بٹوارے کے بعد بچے ان پر فسادات نے دستِ شفقت پھیر دیا جن کے جسم سالم رہ گئے ان کے دلوں کے حصے بخرے ہو گئے ایک بھائی ہندوستان کے حصے میں آیا تو دوسرا پاکستان کے۔ ماں ہندوستان میں تو اولاد پاکستان میں۔ میاں ہندوستان میں تو بیوی پاکستان میں خاندانوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ زندگی کے بندھن تار تار ہو گئے۔ یہاں تک کہ بہت سے جسم تو ہندوستان میں رہ گئے اور روح پاکستان چلی دی۔ ☆۹

تقسیمِ ہند کے تقریباً اٹھائیس انتیس سال بعد جب عصمت پاکستان آئیں تو وہ خود اور ان کے عزیز اور ساتھی ایک دوسرے کو دیکھ کر بے حد جذباتی ہو گئے۔ اپنی آپ بیتی میں انھوں نے، اس بات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> چوتھی اکتوبر کو علی گڑھ اولڈ ایسوسی ایشن نے عصرانہ دیا۔ یہ بڑی دل چسپ میٹنگ رہی۔ بڑی دیر

> تک تو ہم ایک دوسرے کو پہچان پہچان کر گلے ملتے رہے...خوب خوب پرانی صحبتوں کے ذکر ہوئے... یہاں ہم نے نہ علم و ادب کی باتیں کیں نہ علامتی ادب کی تفسیر پر مغز مارے، نہایت چھچھوری اور پھوہڑ قسم کی گپیں ماریں۔ بچّوں کی طرح ایک دوسرے کے مُنہ میں مٹھائی ٹھونسی اور قہقہے لگائے۔ محفل بکھری تو جی بھاری ہو گئے، اور آنکھیں بھیگ گئیں۔ یوں بچپن بار بار لوٹ کر کب آتا ہے۔☆۱۰

پاکستان سے واپس جاتے وقت وہ پہلے سے زیادہ جذباتی اور افسردہ ہو گئیں۔

> ایئرپورٹ پر پہنچانے کے لیے بہت سے لوگ آئے۔ بمبئی پکار رہا تھا اور کراچی روک رہا تھا۔ ایسا لگتا ہے ایک دنیا چھوڑ کر دوسری دنیا کو جا رہی ہوں...وہ جلسے، وہ مشاعرے، وہ یادوں کی سجانے والی باتیں، ان کی تعبیر کب ملے گی؟ وہ بہن بھائی جو پاکستان میں دفن ہیں ان سے ناتا کیسے توڑوں۔☆۱۱

تقسیمِ ہند کے نتیجے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فاصلے اور نفرتیں روز بروز بڑھتی گئیں اور صدیوں سے ساتھ رہنے والے ہندو اور مسلمان جن کی تہذیب و تمدن ایک دوسرے میں ضم ہو چکی تھی۔ وہ پھر سے تقسیم ہو گئی اور انھیں مجبوراً ایک دوسرے کو چھوڑنا پڑا۔ ان سب احساسات کو عصمت نے اپنے افسانوں میں بیان کیا۔

ان افسانوں میں ’’جڑیں‘‘، ’’میں چپ رہا‘‘، ’’میرا بچہ‘‘ اور ’’ہندوستان چھوڑ دو‘‘ شامل ہیں۔

ان افسانوں میں عصمت نے تقسیمِ ہند کے نتیجے میں ہونے والے ہندو مسلم تعصب اور نفرت کو غیر جانب داری اور بے باکی سے بیان کیا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی:

راجندر سنگھ بیدی کرشن اور منٹو کے ہم عصر تھے۔ تقسیمِ ہند کے بعد انھوں نے افسانے لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا لیکن کرشن اور منٹو کے مقابلے میں بہت کم لکھا۔

فسادات کے موضوع پر انھوں نے ’’لاجونتی‘‘ کے نام سے صرف ایک افسانہ لکھا جو فسادات پر لکھے جانے والے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے۔ اس افسانے میں بیدی نے ایک مغویہ عورت کی نفسیات اور معاشرے میں ایسی عورتوں کے ساتھ نفرت اور تحقیر آمیز رویّے کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ مغویہ عورتوں کے جذبات و احساسات اور سماج کی تنگ نظری واضح ہو جاتی ہے۔

قرۃ العین حیدر:

قرۃ العین حیدر کو اُردو افسانہ میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ انسان کی تہذیب وتمدّن کا ارتقا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زندگی میں آنے والی مختلف تبدیلیاں وغیرہ قرۃ العین کے افسانوں کا خاص موضوع ہے۔

تقسیمِ ہند کے بعد جب برِصغیر کی تہذیب بھی ہندو مسلم تہذیب میں تقسیم ہوگئی، زندگی اور عزت بچانے کی خاطر لوگوں کو مجبوراً صدیوں پرانا وطن چھوڑنا پڑا۔ سب کچھ اتنی افراتفری میں ہوا کہ کسی کو سوچنے کا موقع نہ ملا، کسی کی عزت محفوظ نہ رہی، کوئی زندگی سے محروم ہوگیا۔ کسی کی جائیداد لٹ گئی جس سے اس کی سماجی حیثیت بدل بھی گئی۔ امیر غریب اور غریب امیر ہو گئے۔ غرض زندگی کے سارے نظام درہم برہم ہوگئے۔ ان ہی مسائل کو قرۃ العین حیدر نے اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔

> تقسیمِ ہند کے کرب سے خود محترمہ بھی گزری ہیں اس لیے انھیں اس کا بلاواسطہ تجربہ ہے۔ وہ پاکستان میں سالوں رہ کر پھر ہندوستان آ گئیں۔ ☆۱۲

اس لیے انھوں نے خود لوگوں کے حالات کا بغور جائزہ لیا۔ لوگوں کے مسائل کو سمجھا اور انھیں لوگوں پر گرنے والی قیامتوں کا احساس ہوا۔

اس کا ثبوت ان کے افسانے ''جلاوطن''، ''ڈالن والا''، ''پت جھڑ کی آواز'' اور ''یاد کی اِک دھنک جلے'' ہیں۔

ان افسانوں میں قرۃ العین ماضی کی سہانی یادوں میں غرق نظر آتی ہیں، جب وہ اپنی ساتھیوں کے ساتھ تھیں۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے دشمن نہیں تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی تہذیب اور مذہب کا احترام کرتے تھے۔ لوگ ایک دوسرے سے بچھڑے نہ تھے اور اسی وجہ سے زندگی بہت خوب صورت تھی جو تقسیمِ ہند کے بعد اپنا حسن کھو بیٹھی۔

''جلاوطن'' میں انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات اور تعصبانہ ذہنیت کو بیان کیا ہے۔

احمد ندیم قاسمی:

احمد ندیم قاسمی کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے تقسیمِ ہند سے کچھ عرصے قبل، لکھنا شروع کیا تھا۔ ان کے افسانوں کا موضوع عام طور پر دیہاتی زندگی اور اس کے مسائل، جاگیرانہ نظام اور اس کی خرابیاں اور طبقاتی کش مکش ہوتا ہے۔ تقسیم سے قبل بھی انھوں نے جو افسانے لکھے وہ ان ہی موضوعات پر لکھے گئے تھے۔ تقسیمِ ہند کے نتیجے میں انھوں نے بھی ہجرت اور فسادات کی مصیبتوں کو ''نیا فرہاد''، ''اندمال''، ''کفن دفن''، ''ارتقا''، ''تسکین''، ''فساد''، ''میں انسان ہوں'' اور ''جب بادل امنڈ آئے'' شامل ہیں۔ ''پرمیشر سنگھ'' ایسا افسانہ ہے جس کا شمار احمد ندیم قاسمی ہی کے بہترین افسانوں میں نہیں، بلکہ

فسادات کے موضوع پر لکھے جانے والے اُردو کے بہترین افسانوں میں ہوتا ہے۔

خاص طور پر ان کا افسانہ ''پرمیشر سنگھ'' انسان دوستی کی بہترین مثال ہے۔ اس افسانے کا سب سے اہم کردار پرمیشر سنگھ ایک گم شدہ مسلمان بچّے اختر کو اس نیت سے پالنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنے گم شدہ بچے کرتار سنگھ کی کمی پوری کر سکے، لیکن وہ اپنے اس مقصد میں اُس وقت نا کام ہو جاتا ہے جب ایک طرف تو اس کی بیوی اور بیٹی اختر کو کرتار سنگھ کی جگہ نہیں دیتیں اور دوسری طرف اختر پرمیشر سنگھ کی محبت کے باوجود اپنی ماں کو بھولنے میں نا کام ہو جاتا ہے۔ آخر میں پرمیشر سنگھ اختر، اپنی بیوی اور بیٹی کی خاطر اپنی خواہش کو قربان کر دیتا ہے اور اختر کو پاکستان کی سرحد تک خود پہنچا کر آتا ہے اور اس نیک مقصد کی تکمیل کے دوران اپنی جان بھی گنوا دیتا ہے۔

شوکت صدیقی:

شوکت صدیقی نے تقسیمِ ہند سے قبل افسانے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ غریبوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیاں، امیر کا منفی رویّہ اور دولت کے سہارے ناجائز کو جائز بنانا اور اسی قسم کے دوسرے موضوعات کو انھوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ لکھنؤ کی تہذیب اور ماحول بھی ان کے افسانوں کی نمایاں خصوصیات میں شامل ہیں اور تقسیم ہند سے پہلے لکھے جانے والے افسانوں میں ان عناصر کو بھی مدِ نظر رکھا گیا تھا۔

جب ہندوستان تقسیم ہوا تو انھیں بھی ہجرت کرنی پڑی، ہجرت اور فسادات کے تکلیف دہ حقائق ان سے چھپے ہوئے نہیں انھوں نے لوگوں کو لٹتے اور مرتے ہوئے دیکھا تھا۔

تقسیمِ ہند کے بعد بھی انھوں نے افسانے لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ فسادات اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کو انھوں نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔

''ڈھل چکی رات''، ''تانتیا''، ''یہ بیمار''، ''ہفتے کی شام'' اور ''اندھیرا اور اندھیرا'' فسادات کے موضوع پر لکھے گئے افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں ''اندھیرا اور اندھیرا'' اور ''ہفتے کی شام'' موضوع اور فن کے لحاظ سے بہترین افسانے ہیں۔

''اندھیرا اور اندھیرا'' ایک طویل افسانہ ہے جس میں انھوں نے تقسیمِ ہند کے بعد مہاجرین کے ساتھ پیش آنے والے مختلف مسائل اور مقامی لوگوں کے رویّے کو بہت باریک بینی سے بیان کیا ہے جو ان کے تجربے اور گہرے مشاہدے کا ثبوت ہے۔

اسی طرح ''ہفتے کی شام'' میں بھی انھوں نے ہندوستان سے ہجرت کرنے والے ایک ایسے خاندان کا ذکر کیا ہے، جن کی کفالت کا واحد سہارا ان کی بیٹی عائشہ ہے جو بہت سخت محنت کر کے اپنے گھر والوں کا پیٹ پالتی ہے لیکن معاشرے کے تنگ

نظر لوگ اس کی عظمت کو سلام کرنے کے بجائے اس کے کردار پر شک کرتے ہیں اور اس فکر میں عرق رہتے ہیں کہ آخر اس کے پاس پیسے آتے کہاں سے ہیں۔ ان ہی حالات کا مقابلہ کرتے کرتے ایک دن عائشہ سڑک پار کرتے ہوئے مر جاتی ہے۔

قدرت اللّٰہ شہاب:

قدرت اللّٰہ شہاب نے تقسیمِ ہند کے نتیجے میں پاکستان سے ہجرت کی اور عام عوام کی صدیوں پرانے وطن ماحول، ساتھیوں اور عزیزوں سے بچھڑنا پڑا۔ فسادات کے الم ناک واقعات نے انھیں اپنے ناولٹ اور افسانے کا موضوع بنانے پر مجبور کر دیا۔ ’’اور عائشہ آ گئی‘‘ فسادات کے موضوع پر لکھا گیا افسانہ ہے۔ اس افسانے میں ’’عائشہ‘‘ اپنے باپ کو ہمیشہ برے کام کرنے سے بچا دیتی ہے۔ کیوں کہ عائشہ کا باپ جب بھی کسی غلط کام کو کرنے کا منصوبہ بناتا ہے جو اسے ایک دم اپنی عائشہ کا خیال آ جاتا ہے کہ اسے اس کے غلط ارادوں کے بارے میں پتا چل گیا تو اس کی چھپی ہوئی منافقت اور ریاکاری عائشہ کے سامنے ظاہر ہو جائے گی۔ یہی عائشہ جب ۱۹۴۷ء کے فسادات میں اپنے گھر والوں سے بچھڑ جاتی ہے تو عائشہ کے باپ کو کافی حد تک اس بات کی آزادی حاصل ہو جاتی ہے اب وہ ایک بیٹی کا باپ نہیں اس لیے اب اس کے سب کچھ جائز ہے لیکن ایک دن عائشہ بازیاب ہو کر اپنے گھر آ جاتی ہے اور اس کے باپ کے سارے ارمان ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔

رام لعل:

رام لعل کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے افسانوں کے کئی مجموعے لکھے ان کے افسانوں کے کردار عام طور پر سیدھے سادے ہوتے ہیں خواتین کے مختلف مسائل، ان کی مجبوریاں، کمزوریاں اور معاشرے میں ان کے ساتھ ہونے والے ظلم، عورت کی وفا اور ایثار عام طور پر رام لعل کے افسانوں کے موضوع ہوتے ہیں۔

فسادات کے نتیجے میں انھیں پاکستان سے ہجرت کرنا پڑی جس کا انھیں بے حد دکھ تھا اور وہ ساری زندگی پاکستان میں گزارے ہوئے دنوں کو بھول نہ سکے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہونے والے فسادات کا انھیں بے حد دکھ تھا۔ جس زمانے میں ہندو مسلم فسادات عروج پر تھے اور ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو مارنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانا چاہتے تھے ان حالات پر رام لعل نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

> گولیاں انسانوں پر نہیں، رام لعل پر چلائی گئی ہیں چھری انسانوں کی پیٹ پر نہیں، بلکہ رام لعل پر پھینکی گئی ہے۔☆۱۳

فسادات کے موضوع پر انھوں نے جو بھی افسانے لکھے اس میں نئے ملک کی اجنبیت کا احساس اور فسادات کے

دوران خواتین کے ساتھ ہونے والے ظلم وستم اور زیادتیاں بیان کی گئی ہیں۔

اس موضوع پر ان کے اہم افسانے ''ایک شہری پاکستانی''، ''اُکھڑے ہوئے لوگ''، ''قبر''، ''نصیب جلی''، ''ایک اور پاکستانی''، ''اللہ کی بندی''، ''نئی فصل کا ایک ٹرک بھرے بازار میں''، ''تین بوڑھے''، ''میں زندہ رہوں گا''، ''تلاشِ گم شدہ''، ''زہر تھوڑا سا'' اور ''آبلہ'' شامل ہیں۔ ان افسانوں میں ''آبلہ''، ''اُکھڑے ہوئے لوگ''، ''اللہ کی بندی'' اور ''ایک اور پاکستانی'' موضوع اور فن کے لحاظ سے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

افسانہ ''آبلہ'' میں ایک متعصب جوان ایک عورت اور اس کے بچے کو قتل کرنے کی نیت سے ان کے گھر جاتا ہے، لیکن عورت کو پریشان اور بچے کو روتا دیکھ کر اس کا ضمیر جاگ جاتا ہے اور اسے اپنے آپ سے اتنی نفرت محسوس ہوتی ہے کہ جو گولی اس عورت اور بچے پر چلائی تھی اپنے لیے استعمال کر لیتا ہے۔

''اُکھڑے ہوئے لوگ'' میں تقسیمِ ہند کے بعد ایک شخص مغربی پنجاب سے بریلی اپنی بیوی کے ساتھ ہجرت کر کے آتا ہے لیکن وہ مغربی پاکستان کو فراموش کرنے اور بریلی سے مانوس ہونے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ تو وہ بریلی سے ''چنڈی گڑھ'' منتقل ہو جاتا ہے لیکن یہاں بھی وہ اور اس کی بیوی اپنے ماضی کو ہر لمحے یاد کرتے ہیں جب کہ ان کے بچے جو ہندوستان میں پیدا ہوتے ہیں وہ اپنے والدین کے برعکس بریلی اور چنڈی گڑھ دونوں جگہوں پر ہنسی خوشی زندگی گزارتے ہیں۔

''ایک شہری پاکستانی'' کا موضوع فساد پر لکھے جانے والے افسانوں سے منفرد ہے۔ تقسیمِ ہند کے نتیجے میں سرسوتی اپنے شوہر بلدیو سے بچھڑ کر اپنے والدین کے ساتھ مہاجر کیمپ پہنچتی ہے۔ جہاں ان کی ملاقات سندرداس سے ہوتی ہے۔ سندرداس ان لوگوں کی جان بچانے اور مکان وغیرہ حاصل کرنے میں بہت مدد کرتا ہے۔ سرسوتی کے ماں باپ اس سے بہت متاثر ہوتے ہیں اور بلدیو کو مردہ اور سرسوتی کو بیوہ سمجھ کر سندرداس اور سرسوتی کی شادی کر دیتے ہیں جب سندرداس اور سرسوتی دو بچوں کے ماں باپ بن جاتے ہیں تو اچانک ایک دن بلدیو آ جاتا ہے، بلدیو جس کے والدین فساد کے دوران مر جاتے ہیں سرسوتی اور اس کے ماں باپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے لیکن نہ تو سرسوتی اور نہ ہی اس کے ماں باپ بلدیو کو قبول کرتے ہیں۔ سندرداس بلدیو کو عدالت میں جانے کا مشورہ دیتا ہے لیکن عدالت جانے سے پہلے ہی بلدیو دوبارہ پاکستان لوٹ جاتا ہے۔

بلونت سنگھ:

بلونت سنگھ کا شمار اُردو کے بڑے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے بلونت سنگھ کا تعلق چوں کہ پنجاب سے تھا۔ اس لیے ان کے افسانوں میں پنجاب کا ماحول، رومان، حقیقت نگاری، لوگوں کا اکھڑپن اور زندہ دلی نظر آتی ہے ان کے اُردو افسانوں میں بھی پنجابی زبان کے الفاظ اور محاورات بھی بکثرت نظر آتے ہیں۔

انھوں نے اپنے افسانوں میں عام طور پر درمیانے طبقے کے گھریلو مسائل کو بیان کیا ہے۔ فسادات کے موضوع پر انھوں نے جو افسانے لکھے ہیں۔ اس میں انھوں نے انسان دوستی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار فسادات کے دوران انسانوں کے وحشی بن جانے پر افسوس کر رہے ہیں اور ایسے دردمند کردار مسلمان بھی ہیں اور سکھ بھی۔ انھوں نے ایک دوسرے کو تحفظ بھی دیا اور ایک دوسرے کی جانیں بھی بچائیں اور انھیں ہجرت اور فسادات کی تلخیوں سے بچالیا۔ فسادات کے موضوع پر انھوں نے ''پہلا پتھر''، ''کالے کوس''، ''دیہلے — ۳۸'' اور ''تعمیر'' جیسے عمدہ اور منفرد افسانے لکھے۔

''تعمیر'': اس افسانے میں بلونت نے انسان دوستی کی بہترین مثال دی ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ خیر اور شر کا مادّہ ہر انسان میں ہوتا ہے لیکن حالات اسے کبھی خیر اور کبھی شر کے تابع کر دیتے ہیں۔ افسانے کا اہم کردار ایک ایسا شخص ہے جس کی بیوی اور بچے فسادات کے دوران ہلاک ہونے جاتے ہیں۔ افسانے کا دوسرا کردار ایک ایسی لڑکی ہے جس کا شوہر فسادات کے دوران مر چکا ہے اور اب وہ ایسے لوگوں کے قبضے میں ہے جو اسے کال گرل بنا دیتے ہیں۔ ایک روز افسانے کا مرد کردار اس لڑکی کو تیس روپے کے عوض ایک رات کے لیے ہوٹل میں بلاتا ہے لڑکی کو اس کا دلال زبردستی چھوڑ جاتا ہے لیکن جب لڑکی مسلسل روتی ہے تو وہ مرد لڑکی سے اس کی گذشتہ زندگی کے بارے میں پوچھتا ہے اس کی کہانی اور آنسو اس کی معصومیت اور اپنے پیشے سے نفرت کو ظاہر کر دیتے ہیں اور مرد اسے ہمیشہ کے لیے اپنا لیتا ہے۔

''دیہلے — ۳۸'': اس افسانے میں بلونت سنگھ نے فسادات کے بعد مہاجرین کے ساتھ پیش آنے والے بنیادی مسائل مثلاً خوراک اور رہائش کا مسئلہ، مفلسی اور بے روزگاری جیسے مسائل کو بیان کیا ہے۔ موضوع منظر نگاری اور پلاٹ ہر لحاظ سے یہ ایک بہترین افسانہ ہے۔

افسانے کا اہم کردار بسا کھا سنگھ ہے جو پاکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان جاتا ہے وہ اور اس کے بیوی بچے ہجرت اور فسادات کی تباہ کاریوں سے تو بچ جاتے ہیں لیکن ہندوستان پہنچنے کے بعد انھیں قدم قدم پر کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بسا کھا سنگھ اور گھر کے تمام افراد مسائل اور نا اُمیدی کی دلدل میں دھنستے جاتے ہیں۔ بسا کھا سنگھ اپنے تمام مصائب بدھ سنگھ کو بتا کر بوجھ ہلکا کر لیتا ہے لیکن وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ بدھ سنگھ کبھی اس کی مالی امداد بھی کرے لیکن اس کی یہ اُمید کبھی پوری نہیں ہوئی اور ایک دن جب وہ عام دنوں کے مقابلے میں زیادہ نا اُمید اور افسردہ ہوتا ہے تو وہ بدھ سنگھ کے پاس جا کر اپنا مسئلہ بیان کرتا ہے تو وہ ہمیشہ کی طرح بسا کھا سنگھ کو واہگرو کی پاٹھ کرنے کا مشورہ دیتا ہے اس کے بعد بسا کھا سنگھ کو ۱۴۴ سو روپے میں خریدا ہوا پستول دکھاتا ہے۔ جسے دیکھ کر بسا کھا سنگھ بہت حیران بھی ہوتا ہے اور اسے اس بات کا دکھ بھی ہوتا ہے کہ اگر بدھ سنگھ چاہتا تو ان پیسوں سے پستول خریدنے کے بجائے اس کی مالی امداد کر دیتا ہے۔ پستول دیکھ کر اس پر دحشت طاری ہو جاتی ہے اور وہ جو پستول دیکھنے کے لیے ہاتھ میں لیتا ہے اُسی سے بدھ سنگھ کو قتل کر دیتا ہے۔

''پہلا پتھر'': بلونت سنگھ نے اس افسانے میں معاشرے میں عورت کے ساتھ ہونے والے ظلم وستم اور عورت کی محبت کو بیان کیا ہے اور یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عورت چاہے اپنوں کے درمیان ہو یا غیروں کے۔ ہر جگہ غیر محفوظ اور مردوں کی تفریح کا ذریعہ ہے۔

افسانے کا کردار لالہ دیوی داس فسادات کے نتیجے میں اپنی تین بیٹیوں کے ساتھ ہجرت کر کے ہندوستان کے شہر جالندھر آتا ہے۔ یہ تینوں لڑکیاں فسادات اور ہجرت کے دوران تو مسلمانوں کی ہوس کا شکار ہونے سے تو بچ جاتی ہیں لیکن ہندوستان میں آ کر وہ جس سکھ کی حویلی میں رہائش اختیار کرتے ہیں۔ وہاں ان لڑکیوں پر وہ ساری قیامتیں گزرتی ہیں جو فسادات کے دوران ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کی عورتوں پر گزاری تھیں۔ نتیجتاً دیوداس کی ایک بیٹی خودکشی کر لیتی ہے، دوسری بیٹی کی کسی معمولی شخص کے ساتھ شادی کر دی جاتی ہے لیکن وہ بے عزت ہونے کے بعد اپنے محبوب کی جھوٹی محبت کے فراموش کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے اور سل کے مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ جب کہ تیسری بیٹی جو نابینا ہے اس سے سب تفریح لینے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اس کا عاشق سچا ثابت ہوتا ہے اور اسے ایک دن اپنا لیتا ہے۔

''لمحے'': بلونت سنگھ کا یہ افسانہ ان کے دوسرے افسانوں کی طرح بلند پایہ تو نہیں لیکن موضوع کے لحاظ سے منفرد ہے۔ اس افسانے میں ایک لڑکا فسادات جیسے وحشت ناک حالات میں بھی محض اس لیے بس میں سفر کرنے کا ارادہ کرتا ہے کہ بس میں بیٹھی خوب صورت خواتین کو دیکھ سکے۔ بس میں اسے ایک خوب صورت عورت نظر آتی ہے جب وہ اس سے بے تکلف ہونے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ عورت اسے اپنی تکلیف دہ داستان سناتی ہے کہ کیسے فسادات کے دوران ہلاک ہوئے اور وہ خود بھی ایک ٹانگ سے معذور ہو گئی۔ یہ کہانی سننے کے بعد مسافر کو شرمندگی محسوس ہوتی ہے کہ وہ ان حالات میں بھی کن بے ہودہ کاموں میں اُلجھا ہوا ہے اور اپنے گناہ کے کفارہ کے طور پر وہ اس عورت کو سفر پورا ہونے کے بعد اسے بحفاظت اس کے گھر چھوڑ کر آتا ہے۔

''کالے کوس'': اس افسانے کا موضوع بھی ''انسان دوستی'' ہے۔ اس افسانے میں بلونت سنگھ نے پھلوار سنگھ اور گاماں (مسلمان) کی سچی دوستی کو بیان کیا ہے ان کی یہ سچی محبت ہندو مسلم فسادات کی وجہ سے بھی نفرت یا تعصب میں تبدیل نہیں ہوتی۔ پھلوار سنگھ اپنے مسلمان دوست گاماں کو ہندوستان کی سرحد پار کرانے میں مدد کرتا ہے اور انھیں ہجرت کے دوران ہونے والے وحشت ناک حالات کا شکار ہونے سے بچا لیتا ہے، اور اس طرح بلونت سنگھ نے آگ اور خون کی ہولی اور انسان کی درندگی کے دوران انسانیت کی روشن چنگاری کی نشان دہی کی ہے۔

خواجہ احمد عبّاس:

خواجہ احمد عبّاس کا شمار اُردو کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں میں مقصدیت اور افادیت کا غلبہ

صاف نظر آتا ہے۔ خواجہ احمد عباس ایک حساس افسانہ نگار ہونے کے علاوہ ایک جرأت مند صحافی بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں جرأت، بے باکی اور گہرا مشاہدہ جیسی خصوصیات پائی جاتی ہے۔

سماجی زندگی کی کشمکش اور انسانی نفسیات ان کے افسانوں کے خاص موضوعات ہیں انھوں نے جس موضوع پر بھی افسانے لکھے بہت جرأت، بے باکی اور سچائی سے لکھے لیکن ان کے یہ بے باکی منٹو اور عصمت کی بے باکی سے بالکل مختلف اور پریم چند کی شائستگی اور سچائی سے بہت قریب ہے۔

اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے انھوں نے خود کہا ہے:

> پریم چند کی کتابوں سے میں نے سیکھا کہ ادب میں صرف رومان اور فرار ہی نہیں ہوتا، بلکہ انسانی زندگی کی سچی عکاسی بھی ہوتی ہے۔☆۱۴

جب ۱۹۴۷ء کے فسادات ہوئے تو پرانے وطن سے شدید محبت نے انھیں پاکستان جانے سے روک لیا، اور انھوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے ظلم وستم کو دیکھتے ہوئے بھی ہندوستان میں رہنا پسند کیا۔ جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے:

> جب ۱۹۴۷ء کا بٹوارا ہوا تو اس وقت میری ماں اور بہنیں پانی پت میں تھیں اور میں بمبئی میں جب مغربی پنجاب کے زخم خوردہ ہندو سکھ شرنارتھیوں کے بعد پانی پت میں مسلمانوں کا رہنا مشکل ہوگیا تو وہ سب پاکستان ہجرت کی تیاری کرنے لگے تو میری ماں پر بھی دوسرے عزیز رشتے داروں نے دباؤ ڈالنا شروع کردیا کہ وہ ان کے ساتھ پاکستان چلیں اور مجھے بھی لکھیں کہ میں بمبئی سے کراچی آجاؤں مگر انھوں نے صاف انکار کردیا کہ ''ہم اپنا وطن نہیں چھوڑیں گے۔ میرے بیٹے نے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس فیصلے پر میں اس کے ساتھ ہوں۔'' ☆۱۵

۱۹۴۷ء کے فسادات میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں سب کو متعصب اور ظالم کہتے ہیں انھوں نے لوگوں کو بھی انسان دوستی کا سبق دیا اور خود بھی عملی زندگی میں اس کی کئی مثالیں پیش کیں۔

انھوں نے فسادات کے موضوع پر جو افسانے لکھے ہیں ان میں بھی انسان دوستی کو ہی افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔

فسادات کے موضوع پر انھوں نے ''اجنتا''، ''میجر رفیق مارا گیا''، ''اُردو''، ''میری موت''، ''واپسی کا ٹکٹ''، ''شکر اللہ'' کا جیسے اعلیٰ افسانے لکھے۔

ان افسانوں میں ''میری موت'' اپنے موضوع، اسلوب اور پلاٹ کے لحاظ سے فسادات پر لکھے جانے والے بہترین

افسانوں میں سے ایک ہے۔

''میری موت'': اس افسانے میں خواجہ احمد عبّاس نے ایک مسلمان کردار شیخ برہان الدین کا ذکر کیا ہے جسے بچپن سے سکھوں سے نفرت ہے زمانہ طالب علمی میں بھی وہ سکھوں کے لطیفوں سے بہت محظوظ ہوتا ہے اور رہن سہن کے طریقوں سے نفرت بھی کرتا ہے۔ جب ۱۹۴۷ء کے فسادات ہوتے ہیں سکھ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر ظلم ڈھاتے ہیں جس سے وہ سکھوں سے پہلے سے بھی زیادہ متنفر ہو جاتا ہے اور اپنی بیوی بچّوں کو بحفاظت پاکستان پہنچا دیتا ہے، لیکن خود اس ارادے سے دہلی میں رک جاتا ہے کہ اپنا سامان لے کر جائے۔

اسی عرصے میں اس کے پڑوس میں ایک سکھ اپنی بیوی بچّوں کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان سے ہندوستان آتا ہے۔ شیخ برہان اس سے ہر وقت خوف زدہ رہتا ہے۔ ایک دن سردار جی ایک جلوس کے ساتھ شیخ برہان کے گھر کا رُخ کرتا ہے لیکن دوسرے سکھوں کے حملے سے پہلے ہی وہ مسلمان کو اپنے گھر میں پناہ دے دیتا ہے اور جو محض دکھاوے کے لیے اس کے گھر کا سامان وغیرہ لوٹتا ہے وہ بھی اس کی امانت سمجھ کر اسے لوٹا دیتا ہے۔ شیخ برہان آخری وقت تک یہی سمجھتا ہے کہ سردار جی اسے قتل کرنے کی خاطر یہ ڈرامہ کر رہے ہیں لیکن جب شیخ برہان کو اپنے گھر میں چھپانے کی وجہ سے دوسر سکھ سردار جی کو گولی مارتے ہیں تو سردار جی اسے مرنے قبل یہ بتا دیتے ہیں کہ جب میں نے پنڈی سے ہندوستان ہجرت کی تھی تو ایک مسلمان ''غلام رسول'' نے میری اور میرے گھر والوں کی جان بچائی تھی آج میں نے تمھاری جان بچا کر وہ قرض اتار ہے۔

سردار جی کی اس قربانی کا شیخ برہان پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے اور اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ گولی لگنے سے سردار جی تو مر ہی گئے لیکن ان کی اس قربانی نے مجھے بھی مار دیا، اور اسے اپنی سکھوں کے خلاف سوچ جس میں تعصب کے سوا کچھ اور نہ تھا پر بہت افسوس ہوا۔

خواجہ احمد عبّاس نے اپنے اس افسانے میں انسان دوستی کا پیغام دیا ہے، اور اس افسانے کے ذریعے انھوں نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ فسادات جیسے تعصبانہ حالات میں جب ہندوؤں اور مسلمانوں نے کبھی تعصب کی وجہ سے اور کبھی انتقاماً ایک دوسرے کو قتل کیا ان حالات میں بھی ایسے فرشتہ صفت لوگ موجود تھے جنھوں نے نفرت، تعصب اور انتقام جیسے منفی جذبات کو دل میں جگہ نہ دی اور ایک دوسرے سے مذہبی، لسانی اور تہذیبی فرق رکھنے کے باوجود ایک دوسرے کو ہر طرح کا تحفظ دیا۔

> جب یہ افسانہ اُردو میں چھپا تو کسی سکھ نے اس کا نوٹس نہیں لیا لیکن جب یہ الٰہ آباد کے ہندی رسالے ''مایا'' میں چھاپا گیا تو سکھوں نے بڑا واویلا مچایا۔ بات عدالتی کارروائی تک جا پہنچی جس کی پیروی کے لیے خواجہ احمد عبّاس لکھنؤ تک آئے تو انھیں اس وقت کی گورنر مسز سروجنی نائیڈو نے بلا بھیجا جو خود بھی انگریزی کی ایک بین الاقوامی شہرت کی شاعرہ تھیں۔ انھوں نے

عبّاس صاحب کو ایسی کہانی لکھنے پر سخت سست کہا انھی کی مداخلت سے معاملہ رفع دفع ہوا اور عبّاس صاحب نے اس کہانی کا اصل عنوان ''سردار جی'' بدل کر ''میری موت'' رکھ دیا تھا جو اس کے موضوع کے اعتبار سے زیادہ مناسب اور suggestive تھا۔☆۱۶

''اجنتا'': اس افسانے میں غلام عبّاس نے ایک ہندو صحافی نرمل اور اس کے مسلمان دوست احمد کا ذکر کیا ہے۔ جنھیں ہندو مسلم تعصب سے سخت نفرت ہے۔ اس نفرت اور تعصّب کو ختم کرنے کے لیے یہ دونوں ساتھی شانتی دل کے نام سے ایک سماجی تنظیم کی بنیاد رکھتے ہیں، لیکن ان کا مقصد پورا نہیں ہوتا اور شانتی دل کے تمام کارکن سوائے احمد کے ہندو تھے، اور ان کارکنوں کا مطالبہ تھا کہ وہ اس واحد مسلمان کارکن کو بھی شانتی دل سے برطرف کر دیں تو اس صورت میں وہ لوگوں سے چندہ جمع کریں گے۔ نرمل کو نہ چاہتے ہوئے بھی یہ سب کچھ کرنا پڑا۔ اس کے باوجود شانتی دل نے ملک میں امن و امان قائم کرنے کے بجائے مسلمانوں کے علاقوں میں قتل و غارت اور عورتوں کی بے حرمتی کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان حالات سے نرمل کو بہت تکلیف پہنچی اور وہ شدید ذہنی الجھاد کا شکار ہو گیا اپنی دوست کے مشورہ پر وہ اجنتا چلا جاتا ہے لیکن وہاں جا کر بھی اسے فسادات کے دوران ہونے والے واقعات پریشان رکھتے ہیں اور اسے محسوس ہوتا ہے کہ لوگوں کو ابھی اس کی ضرورت ہے اور وہ دوبارہ بمبئی میں لوٹ آتا ہے۔

ترقّی پسندوں کا سیاسی رویّہ:

تقسیمِ ہند کے نتیجے میں ترقّی پسند افسانہ نگاروں نے نہ صرف اپنے افسانوں میں نئے موضوعات کا اضافہ کیا، بلکہ اپنی تحریک کے منشور اور رجحانات میں بھی کئی تبدیلیاں کیں جس سے ترقّی پسند تحریک ادبی تحریک کے بجائے سیاسی تحریک نظر آنے لگی، اور ترقّی پسند تحریک کا یہی سیاسی رنگ بالآخر اس کے زوال کا سبب بنا۔

جس زمانے میں ترقّی پسند تحریک کا آغاز ہوا وہ زمانہ انگریز اقتدار کا تھا۔ جس سے ہندو اور مسلمان دونوں بیزار تھے اور اس سے نجات حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔ ترقّی پسند تحریک کا مقصد بھی برطانوی اقتدار سے عوام کو نجات دلانا، انھیں ان کے حقوق دلانا اور معاشرے سے ناانصافی غربت اور ظلم و ستم کا خاتمہ کرنا تھا۔ یہ مقاصد اگرچہ سیاسی نوعیت کے تھے لیکن چوں کہ اس زمانے میں ترقّی پسند مصنفین حق پر تھے اس لیے سب نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور مولوی عبدالحق، علاّمہ اقبال اور مولانا حسرت موہانی جیسی نام وَر شخصیات نے بھی اس تحریک میں شمولیت اختیار کی۔

کوئی بھی ادیب اپنی تحریروں میں جو کچھ لکھتا ہے وہ اس زمانے کے حالات و واقعات کا عکس ہوتی ہیں۔ یہ حالات و واقعات سیاسی، سماجی، نفسیاتی یا معاشی کسی بھی نوعیت کے ہو سکتے ہیں ادیب کو اپنے خیالات اور احساسات کو شائستگی سے بیان کرنے کی

اجازت ہوتی ہے لیکن اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ ادیب کسی بھی موضوع پر لکھے اس کی ادبی حیثیت بگڑنی نہیں چاہیے۔

ترقی پسند تحریک کی ابتدا چوں کہ سیاسی اور سماجی مسائل کو مدِّنظر رکھ کر کی گئی تھی اور ترقی پسند افسانہ نگاروں نے جو بھی افسانے لکھے ان میں سیاسی اور ادبی دونوں رنگ جھلکتے ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد ترقی پسند افسانہ نگاروں نے فسادات کے موضوع پر کئی افسانے لکھے جو اس زمانے کے حالات و واقعات کی نشاں دہی کرتے ہیں اسی عرصے میں ترقی پسندوں نے ملک کے سیاسی نظام پر نکتہ چینی شروع کر دی۔ اگر چہ تقسیمِ ہند سے قبل لکھے جانے والے افسانوں میں بھی سیاست کو افسانوں کا موضوع بنایا گیا تھا، لیکن بعض چیزیں انتہا پر اپنی ساری خوب صورتی کھو دیتی ہیں۔ یہ صورت تقسیمِ ہند کے بعد ترقی پسند تحریک میں پیدا ہو گئی۔

تقسیمِ ہند سے قبل ترقی پسند ادیب برطانوی سامراج کے ظلم و ستم اور ناانصافیوں کو ختم کر کے ملک میں امن، خوشحالی اور انصاف لانا چاہتے تھے لیکن تقسیمِ ہند کے بعد کے ناخوشگوار حالات کے بعد ترقی پسندوں نے نئی حکومت کو اپنی تنقید کا نشانہ بنالیا۔

اور ۶ رستمبر ۱۹۴۷ء کو ایک ادبی کانفرنس میں ترقی پسند افسانہ نگاروں نے اپنی تحریروں میں ادب کی جگہ سیاست کو نمایاں کرنے کے لیے کئی تجاویز پیش کیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

اوّل: امن، آزادی جمہوریت اور اقلیتوں کا تحفظ۔

دوم: اُردو کو پاکستان میں ذریعہ تعلیم بنانے کی ضرورت۔

سوم: تہذیبی اور تعلیمی مہم۔

چہارم: ہندوستان اور پاکستان کا تہذیبی اشتراک۔

پنجم: انڈین یونین کے ادیبوں کو پیامِ تہنیت۔

ششم: پناہ گزینوں کا مسئلہ اور جاگیرداری نظام کے خاتمے کی فوری ضرورت۔ ☆۱۷

دراصل جس زمانے میں یہ تجاویز پیش کی گئی وہ قیامِ پاکستان کے ابتدائی ایام تھے، اور عوام کو آزادی کی بھاری قیمت ادا کرنے کے باوجود کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑا ظاہر ہے یہ مسائل چند دنوں یا چند ہفتوں میں حل نہیں کیے جاسکتے تھے۔ انھیں حل کرنے کے لیے وقت درکار تھا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ پاکستان کا بننا غیر ضروری یا مصیبتوں کو دعوت دینا تھا، بلکہ اس کی اہم وجہ ہندوستان کی مقررہ تاریخ جون ۱۹۴۸ء سے دس ماہ قبل اور اچانک تقسیم کا اعلان کرنا تھا تاکہ مسلمان پوری طرح سنبھل نہ سکیں، وہ الگ ملک کے فیصلے پر شرمندہ ہوں اور انھیں تقسیمِ ہند کا فیصلہ واپس لینا پڑے۔ ہندوؤں اور انگریزوں کے اس سارے منصوبے کو ترقی پسند جانتے ہوئے بھی انجان بن گئے اور انھوں نے قیامِ پاکستان کے بارے میں یہ رائے قائم کی ہے کہ یہ آزادی نہیں، یہ پاکستان اور ہندوستان کے سرمایہ دار اور جاگیردار طبقے کو آزادی ملی ہے عوام کو لوٹنے کے لیے۔

ترقی پسند افسانہ نگاروں نے فسادات کے موضوع پر افسانے لکھنے کے لیے چند اصول بنا لیے اور ادبی تخلیقات جو انسان کے اپنے احساس و خیالات سے وجود میں آتی ہیں وہ بھی طے شدہ فارمولے کے مطابق لکھے جانے لگے۔ اگرچہ فسادات کے موضوع پر لکھے جانے والے افسانے حقیقت سے قریب ہیں لیکن بعض افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں جانب داری سے کام لیا ہے اور ویسے بھی ترقی پسند افسانہ نگاروں کا افسانے لکھنے کا اصل مقصد ادب تخلیق کرنے کے بجائے سیاسی پروپیگنڈا تھا اور لوگوں کے دلوں میں یہ بات ڈالنا تھا کہ پاکستان کا بننا فساد کی جڑ ہے۔ ممتاز شیریں نے ترقی پسندوں کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے غالباً درج ذیل اصولوں کو پیشِ نظر رکھا ہوگا:

۱) انگریزوں کی سامراجی حکومت نے نفرت و نفاق کا بیج بویا۔

۲) تقسیم اور پاکستان کا بننا فساد کی جڑ ہے۔

۳) ان فسادات میں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کا قصور برابر کا بتایا جائے اور سب یکساں ذمے دار ٹھہرائے جائیں۔

۴) افسانوں میں انتہائی غیر جانب داری دکھانے کی کوشش کی جائے۔

۵) آخر میں اس موہوم سی اُمید پر الاپ کہ یہ نفرت مٹ جائے گی، لوگ محسوس کریں گے کہ وہ صرف انسان ہیں اور پھر ایک نیا انسان جنم لے گا۔☆۱۸

تقسیمِ ہند سے قبل ہندو اور مسلمان دونوں انگریزوں سے نجات حاصل کر کے آزاد زندگی گزارنے کے متمنی تھے۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ان کی یہ خواہش پوری ہوگئی لیکن تقسیمِ ہند کے اعلان کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کو ہندوستان اور پاکستان میں جانے کے لیے بہت سی تکلیفیں برداشت کرنا پڑیں۔ بہت سے لوگ منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی ہلاک ہو گئے بیش تر لوگوں کو ہجرت کے دوران موت کو گلے لگانا پڑا اور ایسے لوگ بھی تھے جنھیں پاکستان پہنچنے کے بعد کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ حالات ایسے تھے کہ لوگوں کو آزادی کی خوشی منانے کا موقع نہ ملا اور اس موقع پر ترقی پسندوں نے یہ رائے قائم کی:

آزادی خاک و خون میں غلطاں تھی اور اپنے ساتھ جو اُجالا لائی تھی وہ داغ داغ تھا۔☆۱۹

آج ہمارے ملک پر نیم سرمایہ دارانہ اور نیم جاگیردارانہ نظام رائج ہے۔☆۲۰

تقسیم سے پہلے اور بعد کے سماجی حالات میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔☆۲۱

یہ سیاسی خیالات ترقی پسند مصنّفین کے زوال کا سبب بنیں کیوں کہ یہ خیالات ایسے تھے جو کسی سیاسی پروپیگنڈے سے کم نہ تھے۔ حکومت کو اس بات کا خدشہ تھا کہ عوام پر بھی ان منفی خیالات کا اثر نہ ہو جائے۔

ترقی پسندوں کے نظریات اور سرگرمیوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے حکومت نے ان پر یہ الزام لگائے:

اوّل تو ان کا کہنا تھا کہ ترقّی پسند ادیب فرقہ وارانہ خانہ جنگی کے بارے میں جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ ادب نہیں پروپیگنڈا ہے۔ دوسری بات انھوں نے یہ کہی کہ ترقّی پسند ادیب خود فرقہ پرستی کا شکار ہیں مثلاً کرشن چندر کے افسانوں کے متعلق یہ کہا گیا کہ ان میں ہندوؤں کے ساتھ جانب داری برتی گئی ہے خواجہ احمد عبّاس کے ایک افسانے کے بارے میں کہا گیا کہ اس میں سکھوں پر حملہ ہے۔ یہ افسانہ ضبط کرلیا گیا، اور آخر میں ترقّی پسند مصنفین پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ اس مملکت کے ''وفادار'' نہیں جہاں کے وہ تھے۔☆۲۲

ترقّی پسند مصنفین نے اپنے اوپر لگائے جانے والے الزامات کو غیر ضروری قرار دیا اور ہر الزام کو مختلف دلائل سے غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔ سجاد ظہیر نے ترقّی پسندوں پر لگائے جانے والے الزامات کی اس طرح وضاحت کی ہے۔

پہلے الزام کے جواب میں انھوں نے کہا:

اگر ہمارے گھر میں یا ہمسائے میں آگ لگ جائے اور اسے بجھانے کے لیے زور زور سے آواز دے کر لوگوں کو جمع کیا جائے اور آتش زدگی کے خطرے سے انھیں آگاہ کیا جائے تو اس فعل کو پروپیگنڈا ضرور کہیں گے۔ ترقّی پسند مصنفین نے ایسا پروپیگنڈا کرنے سے کبھی گریز نہیں کیا، بلکہ ان کا طرۂ امتیاز ہی یہ ہے کہ وہ عوام کو آنے والے خطروں سے آگاہ کرتے رہیں۔☆۲۳

دوسرے الزامات کو بھی انھوں نے بے بنیاد قرار دیا اور اپنی تخلیقات کو ادبی، حقیقی اور فرقہ پرستی سے پاک کہا۔

ترقّی پسندوں کے لیے فرقہ واریت کا الزام بھی نیا نہ تھا۔ دونوں طرف سے فرقہ وار ہمیشہ سے ان پر یہ الزام لگاتے ہیں۔ جس زمانہ فرقہ واریت جنون کی حد تک پہنچ جائے اور معمولی انسانی اقدار بھی فراموش کردی جائیں۔ ظاہر ہے ایسے میں تمام وہ لوگ، جو انسانیت، تہذیب اور حب وطن کے نام پر امن، وآشتی کی کوشش کریں گے ضرور معتوب کیے جائیں۔ تاہم ہمیں اس بات کا یقین تھا کہ اپنی قوم کی شریف ترین روایات کا اظہار کرنے کی ہم کوشش کر رہے تھے۔ نہ کہ وہ لوگ جو اپنی جانب کی زیادتی اور بہمیت پر پردہ ڈال کر دوسرے فرقے کو شیطانی رنگ میں پیش کرتے تھے۔☆۲۴

فرقہ وارانہ فسادات اور ان کے آغاز کے موضوع پر جو ادبی تخلیق ہوئی اس میں سے بھی بہترین ترقّی پسند مصنفین ہی کی نگارش ہے، اور اگر پاسندگی حاصل ہے تو ان ہی کی نظموں اور ان ہی کے لکھے ہوئے افسانوں اور مضامین کو۔☆۲۵

تیسرے الزام پر سجاد ظہیر سمیت تمام ترقی پسندوں نے سخت اعتراض کیا اور اس پر بہت بحثیں ہوئیں، اور انھوں نے اس الزام کا جواب بھی بہت غصّے اور سختی سے ان کے الفاظ میں دیا۔

> اہلِ اقتدار، ان کے ملازموں اور ان کے خوشامد کرنے والوں کی طرف سے ہم پر یہ الزام مضحکہ خیز تھا۔ اس لیے کہ ان میں سے اکثر اپنے وطن اور قوم سے وفاداری کا اظہار ۱۴راگست ۱۹۴۷ء سے ہی شروع کیا تھا۔ اس سے پہلے ان کی وفاداری اور چاہتیں اغیار کے ساتھ تھیں! تاریخ کا پہیہ گھومتا رہے گا اور آخر وہ دن آئے گا جب دیارِ وطن میں ان کی اور ہماری دونوں کی وفاداری پرکھی جائیں گی، اور اس وقت سب اپنی جزا اور سزا کو پہنچیں گے اور وہی فیصلہ سچا اور قطعی ہوگا۔☆۲۶

سجاد ظہیر کے یہ جوابات حکومت کو مطمئن نہ کر سکے، اور ترقی پسند مصنّفین نے اپنی سرگرمیوں اور نظریات میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کی۔

> اِس لیے حکومت نے ''سویرا''، ''نقوش'' اور ''ادبِ لطیف'' پر، جو تحریک کے ترجمان تھے، پابندی عائد کر دی۔☆۲۷

حکومت کے علاوہ بہت سے ترقی پسند مصنّفین کو بھی ان کے نئے رجحانات پر اعتراض تھا۔ ۶ردسمبر ۱۹۴۷ء کی کانفرنس میں نئے رجحانات کے اعلان کے بعد، ڈاکٹر تاثیر، مولانا صلاح الدین احمد، پطرس بخاری، میاں بشیر احمد، شیر محمد اختر، یوسف ظفر، قیوم نظر اور شورش کاشمیری ترقی پسند مصنّفین سے علیحدہ ہو گئے۔

اس طرح ترقی پسند تحریک کا قیامِ پاکستان سے پہلے عروج پر پہنچ کر پاکستان بننے کے بعد زوال کی جانب تیزی سے بڑھنے لگی، اور اتنی منظم اور مضبوط تحریک اپنی غلطیوں اور ضد کی وجہ سے حکومت اور خود اس تحریک کے ارکان کے لیے مشکوک ہوگئی اور یہ تحریک اپنے مخالفوں اور حمایتیوں کے لحاظ سے دو حصّوں میں تقسیم ہوگئی۔

ان دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کے خیالات اور نظریات کو غلط ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی مثلاً محمد حسن عسکری، صمد شاہین اور ممتاز شیریں جو ترقی پسند تحریک سے علیحدہ ہو چکے تھے۔ ترقی پسندوں کے نظریات کی مذمت کی، اور انھوں نے ادبی تخلیقات میں مذہب، وطن پرستی اور تہذیب سب کو اہمیت دی۔ جب کہ ترقی پسند حکومت اور دوسرے مخالفین سے ٹکر لینے کو تو تیار رہتے لیکن اپنی ضد چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔

ان کا خیال تھا:

> ادیب عوام کا وفادار ہے اور حکومت یا سرزمینِ وطن سے وفاداری زمانہ جہالت کی یادگار ہے۔☆۲۸

سجاد ظہیر کی طرح علی سردار جعفری نے بھی قیامِ پاکستان سے قبل اور بعد میں ہونے والے فسادات کو تاریخ کے بھیانک اور ہولناک حادثے اور اس کے ساتھ ہی قیامِ پاکستان کی حمایت کرنے والوں کی ایک ایک بات کی دل کھول کر مخالفت کی اور کہا:

ایک گروہ ایسا تھا جس نے ان فسادات کا خیر مقدم کیا، اور خونریزی کو اس خون سے تعبیر کیا جو بچے کی ولادت کے وقت ماں کے رحم سے جاری ہوتا ہے۔ (ممتاز شیریں)۔ بعض لوگوں نے فسادات کا فرقہ وارانہ تجزیہ کر کے کسی ایک فرقے یا مذہب کے لوگوں کو موردِ الزام قرار دے دیا۔ (ایم اسلم)۔ کسی نے ان ہولناک واقعات سے بھی جنسی لذت کا سامان فراہم کیا۔ (سعادت حسن منٹو)۔ لیکن ترقی پسند ادیبوں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ فرقہ وارانہ فسادات کے سیاسی اور سماجی اسباب دریافت کرنے کی کوشش کی اور درندگی کے اس اندھیرے میں بھی انسانیت کی شمع کی ٹمٹماتی ہوئی لو ڈھونڈ لی۔ ☆۲۹

محمد حسن عسکری نے ادیب کے لیے وطن کی وفاداری کو ضروری قرار دیا اور صمد شاہین نے ایسے پاکستانی ادب کی تخلیق پر زور دیا جس میں پاکستانی کلچر کی بھرپور عکاسی اور مذہبی تصوّرات کی آمیزش ہو۔ ☆۲۷

علی سردار جعفری نے محمد حسن عسکری کے اس نظریے کی نہ صرف مخالفت کی، بلکہ انھیں غدّار اور موقع پرست جیسے القاب سے بھی نوازا اور اس کی وضاحت اس طرح کی:

پاکستان کی تقسیم کے بعد حسن عسکری پر جو ادب کے سماجی کردار کے منکر تھے یکا یک اسلام اور پاکستان کا ایسا شدید دورہ پڑا کہ انھوں نے یہ مطالبہ کر دیا کہ ''تمام ادیبوں کو حکومت اور ریاست کا وفادار ہونا چاہیے اور لطف یہ کہ وہ تمام مطالبہ کرتے جا رہے تھے اور یہ کہتے جا رہے تھے کہ ادیب کی دو شخصیتیں ہوتی ہیں ایک ادیب کی اور دوسری شہری کی۔

محمد حسن عسکری کے ان خیالات کو علی سردار جعفری نے ان کی ایک ایسی چال سمجھا جس سے وہ ترقی پسندوں کو بدنام کرنا چاہتے تھے، اس بات کو انھوں نے ان الفاظ میں ثابت کرنے کی کوشش کی۔

حسن عسکری کو معلوم تھا کہ کوئی ترقی پسند ادیب حکومت اور ریاست سے وفاداری کا اعلان نہیں کرے گا۔ ایسی صورت میں وہ یہ ثابت کر سکیں گے کہ ترقی پسند ادیب پاکستان کے غدّار ہیں اور غدّاروں کی جگہ یا تو جیل میں ہے یا پاکستان کے باہر جلاوطنی کے عالم میں۔ اس طرح رجعت پرست اور انحطاطی ادب کے لیے میدان صاف ہو جائے گا۔ ☆۳۱

ادیب کو ریاست اور حکومت کا وفادار ہونے کے بارے میں احتشام حسین نے بھی غیر ضروری قرار دیا اور انھوں نے ادیب اور عوام کے درمیان مضبوط تعلق کو زیادہ اہمیت دی۔ ان کا خیال تھا:

> اچھے ادیب کا انسان دوست ہونا ضروری ہے۔ حکومت دوست ہونا ضروری نہیں ہے۔ وہ حکومت سے غدّاری کرسکتا ہے، عوام سے غداری نہیں کرسکتا۔ ☆۳۲

حکومت اور ترقّی پسند افسانہ نگاروں کے درمیان افسانوں کے موضوعات، سیاسی پروپیگنڈا، نئے رجحانات اور حکومت اور ریاست سے وفاداری وغیرہ جیسے مسائل کے علاوہ اُردو زبان کے نفاذ کے سلسلے میں بھی اختلافات پیدا ہوگئے۔

قیامِ پاکستان کے بعد اُردو کو پاکستان کی اور ہندی کو ہندوستان کی سرکاری زبان قرار دیا گیا۔

ترقّی پسندوں کو اس بات پر اعتراض تھا۔ انھوں نے ہندوستان اور پاکستان میں ہندی اور اُردو زبان کے رائج ہونے کو بے بنیاد قرار دیا اور اسے بھی انگریزوں کی ایک ایسی چال کہا جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفرت اور فاصلے بڑھانے کا سبب بنی۔ بقولِ سجاد ظہیر:

> تقریباً آٹھ سال سے اُردو اور ہندی زبان کی دو دھارائیں اس علاقے میں بہہ رہی تھیں حالانکہ ان دو زبانوں کی بنیاد ایک تھی اور ان کی نحوی ساخت تقریباً یکساں تھی، الفاظ کا ذخیرہ بھی ان میں کافی حد تک مشترک تھا لیکن ان کے رسمِ خط اور الفاظ، طرز اور ان کی روایتوں میں فرق بھی تھا۔ انگریزی عہد میں انگریز حکمرانوں نے اس فرق کو اور زیادہ بڑھانے کی کوشش کی، اور ان فرقہ پرست عناصر نے اس کام میں ان کی مدد کی۔ ☆۳۳

ترقّی پسندوں نے زبان کے بارے میں جو نظریہ پیش کیا وہ بھی حکومت کے نظریات سے بالکل مختلف تھا۔

> ہندی اور اُردو ایسی زبانیں تھیں جنھیں بین الصوبائی حیثیت حاصل تھی۔ انھیں یقینی ہر صوبے میں پھیلانا چاہیے جس کا جی چاہے اُردو سیکھے اور جس کا جی چاہے ہندی۔ جن علاقوں کی زبانیں اُردو یا ہندی نہیں ہیں۔ وہاں کی علاقائی زبانیں ان صوبوں یا ریاستوں کی قومی زبان ہونا چاہیے۔ ☆۳۴
>
> صوبے کا سرکاری کام اور تعلیم ان ہی علاقائی زبانوں میں ہونا چاہیے۔ ہندی اور اُردو وہاں بھی پڑھائی جائے، لیکن جبریہ طور پر نہیں۔ اتحاد بالجبر کے ہم قائل نہیں تھے۔ اس لیے کہ یہ طریقہ اتحاد کا نہیں، بلکہ بین القوامی جھگڑے اور فساد برپا کرنے کا ہے۔ کسی غیر زبان کو ایک قوم پر مسلّط کرنا غیر جمہوری فعل ہے۔ ☆۳۵

اب رہ گیا ہندوستانی بولنے والے علاقے کا سوال۔ ہم کہتے تھے کہ اس علاقے میں اُردو اور ہندی کو سرکاری طور سے

مساوی حقوق حاصل ہوں۔

غرض یہ کہ حکومت اور ترقی پسندوں کے درمیان نظریات کی جنگ چھڑ گئی۔ دونوں کے نظریات ایک دوسرے کی ضد تھے۔حکومت نے ملک اور قوم کی بھلائی کے لیے مدِ نظر رکھ کر مختلف قانون اور نظریات پیش کیے تھے،لیکن ترقی پسند مصنفین نے ہندو لیڈروں اور ادیبوں کی خوشنودی کے لیے حکومتِ پاکستان کے بنائے ہوئے پورے سیاسی نظام کی خلاف ورزی کی۔

> تصادم اور تشدد کی اس فضا میں ترقی پسند تحریک کی پہلی کل پاکستان کانفرنس نومبر ۱۹۴۹ء میں منعقد ہوئی،اور اس میں جو نیا منشور منظور کیا گیا۔اس میں سرمایہ داری نظام توڑ کر اشتراکی نظام کے لیے جدوجہد تیز تر کرنے کا عہد کیا گیا زوال اور تہذیبی انحطاط کے اسباب،نوآبادیاتی نظام میں تلاش کیے گئے۔☆۳۶

اس نئے منشور کے مطابق ترقی پسندوں نے اپنے حامیوں کو جمہوریت کا خیر خواہ اور غیر جانب دار ادبا کو ترقی پسندوں کا دشمن اور ساتھ ہی جمہوریت،انسانیت کا بھی دشمن قرار دیا،اور بحیثیت ادیب انھیں جھوٹا اور مکار قرار دیا،اور ان کی تخلیقات کو ایسی تخلیقات کہا جو انسان کو آگے لے جانے کے بجائے نہ صرف پیچھے لے جاتی ہیں، بلکہ انھیں پست ہمتی،وہم اور اخلاقی پستی میں مبتلا کر دیتی ہے۔

جب کہ اپنے بارے میں ترقی پسندوں کا خیال تھا:

> آج ہمارے ادب میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ترقی پسند اور رجعت پسند ادبی رجحانات زیادہ صفائی اور شدت سے ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہے ہیں۔اس کش مکش میں اس جدوجہد کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو پاکستان کے محنت کش...اور دوسرے مظلوم طبقے،سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کو توڑ کر اس کی جگہ جمہوری اور اشتراکی نظام قائم کرنے کے لیے کر رہے ہیں۔☆۳۷

اس کے علاوہ انھوں نے اپنی ادبی روایات کو بھی سراہا اور اس میں آنے والی تبدیلیوں کو وقت اور حالات کا تقاضا کہا۔

اسی منشور میں ترقی پسندوں نے ایک تجویز کے مطابق:

> غیر ترقی پسند ادیبوں اور رسالوں سے قطع تعلق کر لیا گیا اور تحریک کے رسائل میں غیر ترقی پسند ادبا کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔☆۳۸

۱۹۴۹ء کی کانفرنس کے منشور میں ایک تجویز یہ بھی پیش کی گئی کہ علاقائی زبانوں کو ریاستی زبان کا درجہ دینے کے لیے جدوجہد شروع کی جائے۔

اس کانفرنس کے منشور کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تقسیمِ ہند کے بعد ترقی پسند تحریک اپنی ادبی حیثیت تو کھو چکی تھی لیکن اب ترقی پسند کے غیر ترقی پسندوں اور حکومت کے ساتھ اختلافات شدّت اختیار کر چکے تھے۔ ان میں ادب اور سیاست، ادیب اور جانب داری اور ادب اور مذہب جیسے موضوعات پر بحث چھڑ گئی، اور ترقی پسند مصنفین کی خود پسندی اپنی انتہا کو پہنچ گئی، اور بقول ڈاکٹر انور سدید:

> اِن مسائل نے اتنی گھن گرج پیدا کی کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کو حکومت نے سیاسی جماعت قرار دے دیا۔☆۳۹

اسی حقیقت کو احمد راہی نے اپنے رسالے ''سویرا'' کے اداریے میں یوں بیان کیا ہے:

> انجمن کے ۱۹۴۹ء کے منشور میں بعض پہلو ایسے تھے جن کی بنا پر انجمن ادبی حدود سے تجاوز کر گئی اور حکومت نے اسے سیاسی جماعت قرار دے دیا۔☆۴۰

۱۹۴۹ء کے منشور کے نتیجے میں کئی ترقی پسند مصنفین کو بھی گرفتار کیا گیا۔ انجمن کے آرگنائزنگ سیکرٹری عبداللہ ملک، راولپنڈی سے حسن طاہر، عاطف جلالی اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۹۵۰ء میں انجمن ترقی پسند کے ایک اہم رکن ابراہیم جلیس کو پبلک سیفٹی ایکٹ میں گرفتار کر کے سینٹرل جیل کراچی میں بھیج دیا گیا۔

۹ر مارچ ۱۹۵۱ء میں راولپنڈی میں لیاقت علی خان کے تختہ الٹانے کی سازش میں فوجی افسران کے علاوہ سجاد ظہیر اور فیض احمد فیض کو بھی گرفتار کیا گیا۔

''راولپنڈی سازش'' کے اعلان کے ساتھ ہی حکومت کے علاوہ، صحافی اور عام لوگ بھی ترقی پسندوں کے خلاف ہو گئے۔ اخبارات میں اور خاص طور پر ''ڈان'' اور ''مارننگ نیوز'' میں ان کے خلاف خوب لکھا گیا:

> پاکستان کے ترقی پسندوں کو سندھ کے صحرا تھرپارکر کی گرم ریت پر ڈال کر گھسیٹا جائے تاکہ یہ کیفرِ کردار تک پہنچیں۔☆۴۱

اسی سازش کے ردِعمل میں کئی اور ترقی پسند مصنفین کو بھی گرفتار کیا گیا۔

> پہلے کراچی شاخ کے جنرل سیکرٹری ممتاز حسین گرفتار کیے گئے اور فوراً ہی بعد ریاض، احمد ندیم قاسمی، سبطِ حسن، حسن عابدی، ظہیر کاشمیری، احمد علی خان، ظہیر بابر، حمید اختر، اور عبداللہ کی گرفتاری کی خبریں ملیں۔☆۴۲

۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۲ء کے نصف آخیر تک انجمن سے متعلق گرفتار شدہ اراکین جیلوں میں رہے پھر کسی کو آٹھ اور کسی کو نو ماہ بعد سیفٹی ایکٹ کے رہا کر دیا گیا۔ ان رہا ہونے والوں میں ممتاز حسین، ریاض روفی اور ابراہیم جلیس شامل تھے۔

۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۲ء کے ابتدائی ماہ تک جب ترقی پسند ناکامیوں اور شک وشبہات میں پھنس گئے اور انھیں اپنے بچاؤ کا کوئی اور راستہ نظر نہ آیا تو انھوں نے کراچی میں ۱۹۵۲ء میں ایک اور کانفرنس منعقد کی جس کے دو اجلاس ہوئے ایک کی صدارت مولوی عبدالحق نے اور ۱۳؍ جولائی کے دوسرے اجلاس میں مولانا عبدالحمید سالک نے صدارت کی فراوض انجام دیے۔ کانفرنس میں پاکستان کے تمام ترقی پسند نمائندوں نے شرکت کی۔

اس کانفرنس میں پہلے احمد ندیم قاسمی نے ۱۹۴۹ء سے لے کر ۱۹۵۲ء تک کے دوران ترقی پسندوں کی تمام کارکردگیوں کا ذکر کیا۔ وہیں ماضی میں ان غلطیوں کا بھی کھلے دل سے اعتراف کیا گیا تھا جو سرزد ہو چکی تھیں۔☆۴۳

دوسرے دن اجلاس میں ''ادیب کی ذمّے داری'' پر مجتبیٰ حسین، حسن منظر، حسن طاہر اور سلیم احمد نے مقالات پڑھے۔ جس میں انھوں نے ادیبوں کی ذمّے داریوں کو واضح کرتے ہوئے کہا:

> انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایک ادبی جماعت ہے اور اس کا تعلق کسی سیاسی جماعت سے نہیں۔ ترقی پسند ادیب ادب کو زندگی، کا ترجمان اور معمار سمجھتے ہیں اور اس بات کے مدعی ہیں کہ اختلافی اور ادبی مسائل کو بحث واستدلال کے ذریعے طے کیا جائے...ترقی پسند تحریک اپنے ادب عالیہ کی صحت مند روایات کی حامل ہے اور انھیں زندگی کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتے ہیں ہم اپنے ماضی کے ثقافتی اور ادبی ورثے کو آنکھ بند کر کے قبول کرنے کے بجائے تنقید اور تحقیق کی روشنی میں پرکھتے ہیں۔☆۴۴

۱۹۵۲ء کی اس کانفرنس میں اپنا منشور پیش کرنے اور اپنی تمام غلطیوں کا اعتراف کرنے کے بعد بھی ترقی پسندوں کو چین نہ آیا اور انھوں نے ایک پریس کانفرنس بلائی:

> اس پریس کانفرنس کا مقصد صحافیوں اور دانشوروں سے یہ اپیل کرنا تھا کہ حکومت پر زور دیا جائے کہ وہ انجمن کو سیاسی تنظیم قرار دینے کا فیصلہ واپس لے لے اس لیے کہ یہ ایک خالص انجمن ہے اور کسی سیاسی پارٹی کی تابع نہیں۔☆۴۵

ترقی پسند اپنے اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے حکومت نے ان کا منشور تو منظور کر لیا، لیکن ترقی پسند تحریک اور غیر سیاسی تحریک ماننے سے انکار کر دیا۔

چناں چہ جب ۱۹۵۴ء میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگائی گئی تو ترقی پسند تحریک کے اراکین کا بھی احتساب کیا اور اسے بھی غیر قانونی قرار دیا گیا۔

ب: حلقۂ اربابِ ذوق سے متعلق افسانہ نگاروں کا رویّہ

حلقۂ اربابِ ذوق ایک ایسی تحریک تھی جس نے ترقّی پسندوں کی مقصدیت، مادّی ضروریات اور زندگی کے تمام خارجی پہلوؤں کے برعکس انسانی زندگی کے داخلی پہلو مثلاً مادّیت کی جگہ روحانیت، جذباتیت اور نفسیاتی پہلوؤں کو اہمیت دی۔ اپنے مقاصد اور رجحانات کے لحاظ سے ان دونوں تحریکوں میں بہت فرق ہے، لیکن یہ تحریکیں ایک دوسرے کی مخالفت میں نہیں چلائی گئیں تھیں۔ تاہم یہ تحریکیں تقریباً ایک ہی زمانے میں چل رہی تھیں۔

حلقۂ اربابِ ذوق کی تحریک نہ تو کسی سیاسی ردِّعمل کا نتیجہ تھی اور نہ ہی ترقّی پسند تحریک کی اہمیت کو کم کرنے یا ختم کرنے لیے چلائی تھی، بلکہ یہ ایک خالص ادبی تحریک تھی، اور اس تحریک سے تعلّق رکھنے والوں کی تخلیقات ان کے روحانی کرب یا روحانی خوشی کا نتیجہ تھیں۔ ادیب اور شاعر اپنی تخلیقات ادبی محفلوں میں پڑھ کر سناتے تھے۔ جس پر تنقید کرنے کی سب کو اجازت تھی۔

> ۲۹ اپریل کو نصیر احمد جامعی نے اپنے چند دوستوں جن میں نسیم حجازی، تابش صدیقی، محمد فاضل، اقبال احمد، محمد سعید، عبدالغنی، شیر محمد اختر وغیرہ شامل تھے۔ جمع کیا اور ایک ادبی محفل منعقد کی۔ اس محفل میں نسیم حجازی نے ایک طبع زاد افسانہ پڑھا دوستوں نے اس افسانے پر گفتگو کی۔ ادبی خدمت کے اس سلسلے کو جاری رکھنے کے لیے ایک مجلس قائم رکھنے کا منصوبہ بنایا گیا اور عام طور پر اس کا نام 'مجلسِ داستاں گویاں' رکھا گیا۔ ☆۴۶

ابتدا میں مجلس داستاں گویاں میں صرف محفل شعروسخن تک محدود تھی، لیکن رفتہ رفتہ مجلس کے احباب میں اضافہ ہوتا گیا اس کے ساتھ شاعری افسانے بھی مجلس میں سنائے جانے لگے، اور مجلس میں آنے والوں کی تعداد میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔

> مجلس داستاں گویاں کی ابتدائی نو مجالس کے بعد جب اس کے پاؤں مضبوطی سے جمنا شروع ہو گئے تو اس کا نام ''حلقۂ اربابِ ذوق'' رکھ دیا گیا۔ ☆۴۷

> تحریک کا نام حلقۂ اربابِ ذوق رکھنے کے بعد اس کے اغراض ومقاصد میں اضافے پر بھی غور کیا گیا۔ اغراض ومقاصد، قواعد وضوابط اور حلقۂ اربابِ ذوق کو کامیاب بنانے کے لیے اور اراکین کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لیے مختلف تجاویز یکم اکتوبر ۱۹۳۹ء کے جلسے میں طے پا گئیں۔ ☆۴۸

یہ تجاویز مندرجہ ذیل تھیں جن کو قیوم نظر نے پیش کیا:

اوّل: اُردو زبان کی ترویج واشاعت۔

دوم: نوجوان لکھنے والوں کی تعلیم وتفریح۔

سوم: اُردو لکھنے والوں کے حقوق کی حفاظت۔

چہارم: تنقید ادب میں خلوص اور بے تکلفی پیدا کرنا۔

پنجم: اُردو ادب وصحافت کے لیے سازگار ماحول کو صاف کرنا۔☆۴۹

قیوم نظر کے علاوہ ڈاکٹر محمد باقر نے بھی حلقۂ اربابِ ذوق کے طریق کار پر جو روشنی ڈالی ہے وہ بھی اپنی جگہ بہت اہم ہیں جن کی ترتیب کچھ اس طرح سے ہے:

۱۔ حلقۂ اربابِ ذوق کا کوئی مستقل صدر نہیں ہوگا۔

۲۔ حلقۂ اربابِ ذوق کا صرف ایک مستقل سیکرٹری ہوگا۔

۳۔ رکن بننے کے لیے کوئی چندہ یا فیس نہیں لے جائے گی۔

۴۔ ہر سال کے لیے ایک سیکرٹری چنا جائے گا۔

۵۔ حلقے کی رکنیت محدود رکھی جائے گی، اور حلقے کے رکن کو اختیار ہوگا کہ جس کو چاہے حلقے کا رکن بنائیں لیکن حلقے کے اجلاس ہر اس مرد اور عورت کے لیے کھلے ہوں گے جس کو اجلاس میں شامل ہونے کی دعوت دی جائے گی۔

۶۔ حلقے کا جلسہ ہر ہفتے ایک رکن کے مکان پر ہوگا جس کے ذمّے سب کو چائے پلانا ہوگا۔

۷۔ حلقے کی ہر نشست میں کچھ نظمیں اور مضامین پڑھے جائیں گے جس کو سننے کے بعد اس پر بے لاگ تنقید کی جائے گی اور مضمون نگار یا شاعر کا فرض ہوگا کہ وہ ناراض ہونے کے بجائے خوش دلی سے ناقدین یا معترضین کی تنقید واعتراض کو سنے اور اس کا جواب دے۔

۸۔ حلقے کی کارروائی کو حتی الوسع مشتہر کیا جائے گا۔☆۵۰

کسی بھی تحریک کو کام یابی سے چلانے کے لیے نظم وضبط بھی اتنا ہی اہم ہوتا ہے جتنے ضروری اصول وقواعد ہوتے ہیں۔حلقۂ اربابِ ذوق جس شخصیت نے مضبوط اور کام یاب بنایا وہ میرا جی ہیں۔

میرا جی کے بعد دوسرا اہم نام مولانا صلاح الدین احمد کا ہے جنھوں نے حلقۂ اربابِ ذوق کے پھولنے پھلنے میں اہم کردار ادا کیا ان کے بعد قیوم نظر اور یوسف ظفر حلقے کو ترقی دینے والوں میں سے ہیں میرا جی کو حلقۂ اربابِ ذوق میں متعارف

کروانے کا سہرا قیوم نظر کے سر ہے۔ میرا جی حلقے میں شامل ہونے سے قبل مشرقی اور مغربی ادب کا مطالعہ کر چکے تھے اور ان کے ادبی مضامین رسالہ ''ادبی دنیا'' میں شائع ہوتے رہتے تھے۔

میرا جی کے حلقے میں شامل ہونے کے بعد اس کی روایت میں بھی تبدیلیاں آئیں اور جدید ادب نے اپنا رنگ جمانا شروع کر رہا۔

اپنی ترقی اور اہمیت کے لحاظ سے حلقۂ اربابِ ذوق کو مندرجہ ذیل ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

پہلا دور: ابتدا سے میرا جی کی شمولیت تک (اپریل ۱۹۳۹ء سے اگست ۱۹۴۰ء تک)

دوسرا دور: میرا جی کی شمولیت سے اُردو شاعری پر تنقید کے اجرا تک (اگست ۱۹۴۰ء سے دسمبر ۱۹۴۰ء تک)

تیسرا دور: دسمبر ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان تک۔

چوتھا دور: آزادیِ پاکستان ۱۹۴۷ء سے مارچ ۱۹۷۲ء میں حلقۂ اربابِ ذوق کی تقسیم تک۔

پانچواں دور: مارچ ۱۹۷۲ء سے زمانہ حال ۱۹۷۵ء تک۔☆۵۱

ان ادوار میں سے ابتدائی دو ادوار تحریک کے تعارفی ادوار تھے۔ ان میں تحریک کی تشکیل قواعد وضوابط اور اس کے مقاصد کو پیش کیا گیا، اور مجالس میں تخلیقات کے نت نئے تجربات کیے گئے۔

حلقۂ اربابِ ذوق کا تیسرا دور ایک اہم دور ہے۔ اس دور میں یہ تحریک ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد تیزی سے ترقی کے مراحل طے کر رہی تھی۔ اس کے اغراض و مقاصد واضح ہو چکے تھے اور اس تحریک میں شمولیت اختیار کرنے والوں کی تعداد میں بھی بدن اضافہ ہو رہا تھا یہاں تک کہ ترقی پسند ادبا نے بھی حلقے کی مجالس میں شرکت کرنا شروع کر دی، لیکن دل میں ترقی پسند ادبا حلقۂ اربابِ ذوق کے لیے حاسدانہ جذبات رکھتے تھے۔

حلقۂ اربابِ ذوق خالصتاً ادبی تحریک تھی، اور اس تحریک سے تعلق رکھنے والے ادیبوں نے تحریروں کا مقصد بھی ادب تخلیق کرنا تھا۔ یا یہی وجہ ہے کہ حلقۂ اربابِ ذوق سے تعلق رکھنے والے ادیبوں کی تحریروں میں زندگی کے معاشی، طبقاتی یا سماجی مسائل کے بجائے انسان کی داخلی اور نفسیاتی الجھنوں کو بیان کیا گیا ہے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک مادّی آسائشوں سے زیادہ انسان کی روحانی خوشیاں اس کے سکون اور اطمینان کا سبب بنتی ہیں۔

''ترقی پسند تحریک'' اور ''حلقۂ اربابِ ذوق'' میں بنیادی فرق یہی ہے کہ ترقی پسند ادبا نے مارکسی نظریات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے معاشرے سے طبقاتی نظام کے خلاف آواز اُٹھانا چاہتے تھے۔ مقصد کی تکمیل میں ترقی پسد ادیب اتنا مگن ہوئے کہ ان کی تحریریں غریب عوام کا نعرہ بن کر رہ گئیں اور ادبی فضا بالکل دب کر رہ گئی۔

جب کہ ''حلقۂ اربابِ ذوق'' کے مصنفین کی تحریروں کا مقصد ہی ادب تخلیق کرنا تھا۔ وہ ''ادب کو سماجی اور سیاسی

مسائل بیان کرنے کا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے، بلکہ وہ ''ادب'' کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ ادب کی شکل نہ بگڑتی اور ان کی تحریریں ادب کا فن پارہ ہی معلوم ہوتیں۔

اگر چہ ترقی پسند تحریک اور حلقۂ اربابِ ذوق کی تحریک ایک ہی دور میں شروع ہوئیں اور دونوں کے مقاصد بھی جدا جدا تھے حلقۂ اربابِ ذوق کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کی مجلسوں میں حلقے کے علاوہ ترقی پسند ادیبوں سمیت ہر ادیب کو شرکت کرنے کی اجازت تھی وہ نہ صرف اپنی تحریریں پڑھ کر سنا سکتے تھے، بلکہ دوسروں کی تحریروں پر تنقید و تبصرہ بھی کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ''حلقۂ اربابِ ذوق'' نے جلد ہی مقبولیت حاصل کر لی اور حلقے کے مصنفین کی تعداد میں بھی اضافہ ہونے لگا، اور ترقی پسند مصنفین انھیں اپنا حریف سمجھنے لگے۔

> ... چناں چہ اس دور میں حلقے کے خلاف ردِ عمل کی شدید لہر ابھری اور اسے اپنے عہد کی مضبوط ترقی پسند تحریک کا سامنا کرنا پڑا۔ بالفاظ دیگر یہ دو نظریات کی پختگی اور معاصر تحریکوں سے تصادم کا دور تھا۔☆۵۲

اس دور میں مجلسوں میں پڑھی جانے والی نظموں کے مجموعوں کو بھی شائع کیا جو دوسرے اداروں کو ناگوار گزرا اور انھوں نے بھی حلقۂ اربابِ ذوق کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے اپنے مجموعے بھی شائع کیے لیکن حلقے کی اہمیت اپنی جگہ قائم رہی اور حلقۂ اربابِ ذوق نے اپنے رفقا کے علاوہ ''اکثر ترقی پسند شعرا کی وہ نظمیں بھی جو خیال اور کسی اسلوب کی رعنائی کی مظہر ہوتیں اپنے مجموعوں میں شامل کر لی جاتیں۔ حلقہ کی اس روش نے اس تحریک کی بے تعصبی اور غیر جانب داری کا تأثر پیدا کیا۔

> اسی زمانے میں ایک اور گروہ نے سر اُٹھایا۔ یہ ہیئت پرست، ابہام اور جنس پرست ادیب تھے۔ جن کے مشہور نمائندے میراجی، یوسف ظفر، ممتاز مفتی، مختار صدیقی وغیرہ تھے۔ یہ ذہین اور ہوشیار لکھنے والے تھے جو یورپ کے انحطاطی ادب سے متأثر تھے، اور شعور کے بجائے تحت الشعور اور لاشعور اور معنویت اور مواد کو چھوڑ کر ہیئت اور اسلوب پر زور دیتے تھے۔ یہ لوگ کھلم کھلا ترقی پسند تحریک کے مخالف تھے، اور اس کا اعلان کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی ایک الگ انجمن ''حلقۂ اربابِ ذوق'' کے نام سے قائم کر لی تھی جو لاہور اور دہلی تک محدود تھی لیکن ترقی پسند تحریک سے زیادہ منظم تھی۔☆۵۳

حلقۂ اربابِ ذوق نے ہر قسم کی تنقید کی اجازت دے رکھی تھی۔ اس لیے انھوں نے علی سردار جعفری کے ان خیالات پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے بارے میں منفی سوچ رکھنے اور ترقی پسند تحریک سے وابستگی رکھنے کے باوجود اس دور میں کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی، فیض احمد فیض، دیویندر ستیارتھی، ظہیر کاشمیری، ہنس راج رہبر اور کنہیا

لال کپور نہ صرف حلقے میں مضامین پڑھتے رہے، بلکہ متذکرہ ادبا نے حلقے کے جلسوں میں صدارتیں بھی قبول کیں۔

اسی دور میں حلقۂ اربابِ ذوق کے ادبی رجحانات پر بھی زور دیا گیا اور زندگی کے مختلف داخلی پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا۔

> ... چناں چہ اس دور میں جس بحث نے سب سے زیادہ اہمیت حاصل کی وہ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث تھی، اور اس بڑے مسئلے کے جلو میں جن متعدد مباحث نے سر اُٹھایا ان میں ادب اور جمالیات، اظہار یا ابلاغ، جذبہ اور خیال کی اہمیت، ادب اور صحافت، ادب اور پروپیگنڈا، جبلّتِ مرگ، شاعری میں ابہام کا مسئلہ، جدید شاعری اور نفسیات وغیرہ کو اہمیت حاصل ہے۔☆۵۴

حلقۂ اربابِ ذوق کا تیسرا دور اس لحاظ سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اس دور میں حلقے کی شاخیں دلّی، بمبئی اور کراچی میں قائم ہوئیں، اور محمد حسن عسکری، تابش دہلوی، اکرام قمر، اختر الایمان اور مختار صدیقی نے حلقے کو ترقی دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ اگر چہ میراجی کی قیادت کی وجہ سے حلقۂ اربابِ ذوق نے صنفِ شاعری میں زیادہ ترقی کی لیکن حلقۂ اربابِ ذوق نے شاعری کے علاوہ افسانے اور تنقید کو بھی اہمیت دی، اور حلقے کی مجالس میں فن کاروں نے ان تینوں اصناف سے متعلق اپنی اپنی تخلیقات پیش کیں۔

اور یوں حلقۂ اربابِ ذوق کی جڑیں شاعری میں میراجی کی وساطت سے اور افسانے میں مولانا صلاح الدین احمد کی وساطت سے ''ادبی دنیا'' میں اتری ہوئی تھیں۔

حلقۂ اربابِ ذوق کے ابتدائی افسانہ نگاروں میں شیر محمد اختر، کرشن چندر، مہندر ناتھ، اوپندر ناتھ اشک اور راجندر سنگھ بیدی شامل ہیں، لیکن سوائے شیر محمد اختر کے تمام افسانہ نگاروں نے جلد ہی حلقے کی ہم عصر تحریک یعنی ترقی پسند تحریک میں شمولیت اختیار کر لی۔ شیر محمد اختر نے نفسیات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ شیر محمد اختر کے بعد اسی دور میں محمد حسن عسکری، عزیز احمد، ممتاز مفتی، ممتاز شیریں وغیرہ کا بھی اضافہ ہوا۔

ممتاز مفتی کا شمار اُردو افسانے کی دنیا میں نمائندہ افسانہ نگاروں میں کیا جا سکتا ہے ''نفسیات ان کے افسانوں کا خاص موضوع ہے۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید نے کہا ہے کہ:

> ان کا فن اظہار اور گریز کی ان کیفیتوں سے عبارت ہے جو پیدا تو زیرِ سطح ہوتی ہیں لیکن بیرونی سطح تلاطم بپا کرتی ہیں۔☆۵۵

ان کا پہلا افسانہ ''جھکی جھکی آنکھیں'' تھا۔ ان افسانوں کے علاوہ ''احسان علی''، ''کھونٹ والا بابا''، ''سوپور کی کھڑکی'' اور ''جوار بھاٹا'' وغیرہ افسانوں میں زندگی کی نفسیات اور اس کے مسائل کو بیان کیا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی

تخلیقات میں نکھار آ تا گیا لیکن انھوں نے اپنا موضوع نفسیات، لاشعور اور انسان کی چھپی ہوئی کیفیات ہی رکھا۔ممتاز مفتی نے نفسیات کے ساتھ ساتھ جنسیات کو بھی اہمیت دی اور فرائڈ سے متاثر ہو کر تحلیلِ نفسی اور نفسِ لاشعور کے نظریے کو بڑی فنی مہارت سے اپنے افسانوں میں پیش کیا۔☆۵۶

اس سلسلے میں ان کے افسانے ''اَن کہی''، ''چپ'' اور ''دودھیا سویرا'' اچھے افسانوں میں سے ہیں۔

لاشعور، نفسیاتی اور ذہنی کش مکش کے سلسلے میں ان کا افسانہ ''آپا'' خاص شہرت کا حامل ہے۔جس میں انھوں نے ایک ایسی خاموش طبع لڑکی کا ذکر کیا جو اپنے اندر کی کیفیات کا اظہار کرنے سے ہمیشہ قاصر رہتی ہے اگر چہ اس کی خاموشی اس کے بعض احساسات کو کسی حد تک واضح کر دیتی ہیں لیکن پھر بھی اصل بات کی کسی کو بھی خبر نہ ہو سکی اور دل کی بات دل ہی میں رہ گئی۔اس کے برعکس ایک شوخ اور باتونی لڑکی نے اپنے خلوص اور محبت میں ملاوٹ کے باوجود افسانے کے ہیرو کا دل جیت لیا۔

تقسیمِ ہند کے بعد بھی حلقے کے چوتھے دور میں بھی ممتاز مفتی نے افسانے لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔فسادات کے موضوع پر ان کا افسانہ ''سورج سنگھ'' ایک خوب صورت افسانہ ہے جو انسان دوستی کا سبق دیتا ہے۔اس افسانے کا مرکزی کردار سورج سنگھ اپنے بیٹے کو محض اس وجہ سے مار دیتا ہے کہ اس نے ایک مسلمان خاندان کے افراد کے قتل میں حصّہ لیا تھا سورج سنگھ فسادات کے دوران ہونے والی ہولناکیوں اور خون ریزیوں سے اس قدر بیزار اور متنفر ہو جاتا ہے کہ وہ انسانوں کی بہ نسبت ایک کتے کو زیادہ اہمیت دینے لگتا ہے اور اسے اپنا دوست بنا لیتا ہے۔

محمد حسن عسکری نے بھی زندگی کی نفسیاتی الجھنوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ان کے افسانوں کے کردار عام طور پر قنوطیت پسند، پیچیدہ اور غیر صحت مند ہوتے ہیں۔عسکری نے اپنے افسانوں میں معاشرے کی الجھنوں سے زیادہ افراد کی ذاتی الجھنوں کو اہمیت دی ہے۔

عزیز احمد ایک اچھے نقاد ہونے کے علاوہ ایک اچھے افسانہ نگار بھی تھے۔ان کے افسانے زبان اور بیان دونوں لحاظ سے منفرد ہیں۔زندگی کے مختلف واقعات جس میں انھوں نے زندگی کے مختلف ادوار کو بیان کیا ہے۔ان واقعات کو انھوں نے مختصر اور جامع انداز میں بیان کر کے اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کر دیا ہے۔اس سلسلے میں ان کے افسانے ''تصورِ شیخ'' اور ''مدن سینا اور صدیاں'' قابلِ ذکر ہیں۔

''مدن سینا اور صدیاں'' میں انھوں نے مختلف صدیوں اور مختلف ممالک کی داستانوں کو بیان کیا ہے اور زمان و مکان دونوں کی وسعتوں کو سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی ہے ان داستانوں میں عاشق، معشوق اور رقیب کا تکون موجود ہے اس میں مرکزی حیثیت عورت کو حاصل ہے۔

قدیم روایات کے علاوہ انھوں نے جدید دور کے تقاضوں، انسانی زندگی کے مسائل اس کے دکھ اور اوس کی خوشیاں

سب کو بیان کیا ہے ''تیری دلبری کا بھرم'' اور ''مثلّث'' ان کے ایسے ہی افسانے ہیں جو جدید دور کی نمائندگی کرتے ہیں۔ تقسیمِ ہند کے بعد بھی انھوں نے افسانے لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا ان کا افسانہ ''کالی رات'' فسادات کے موضوع پر لکھے جانے والے افسانوں میں خاص مقام رکھتا ہے اس افسانے میں ایک نو بیاہتا جوڑا ریل گاڑی میں فسادیوں کے ظلم کا شکار ہو جاتا ہے شوہر اور بیوی کے باہم مشورے کے بعد شوہر اپنی بیوی کو اس کی عزت و ناموس بچانے کی خاطر گولی کے وار سے اس کی جان لے لیتا ہے، اور پھر خود کو بھی موت کے حوالے کر دیتا ہے۔

کہانی کے لحاظ سے یہ افسانہ حیات اللّٰہ انصاری کے فسادات ہی کے موضوع پر لکھے جانے والے افسانے ''شکر گزار آنکھیں'' سے بہت ملتا جلتا ہے۔

عزیز احمد کے دیگر اہم افسانوں میں ''جھوٹا خواب''، ''جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں''، ''زرّیں تاج''، ''جادو کا پہاڑ''، ''خدنگِ جستہ'' اور ''آبِ حیات'' ایسے افسانے ہیں جن میں کرداروں کی اندرونی کیفیات، منظر نگاری اور واقعات سب کو نئے اور دلکش انداز میں بیان کیا گیا۔

> عزیز احمد کا فن یہ ہے کہ وہ موجودہ شخصیات یا تاریخی کردار اور علامات کو اپنے زمانے کے جذبات و احساسات کے ساتھ اپنی فنی چابک دستی کے ساتھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ روایت کا سلسلہ در سلسلہ، ان کی گہرائیاں اور اس کی وسعت سمٹ کر زمانہ حال تک آ جاتی ہے۔☆ ۵۷

ممتاز شیریں بھی عزیز احمد کی طرح ایک اچھی نقاد اور افسانہ نگار تھیں۔ انھوں نے مغربی ادب کا وسیع مطالعہ کیا تھا۔ اس لیے ان کے افسانوں میں مغربی ادب کا اثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ان کے ابتدائی افسانے رومانی ہیں۔

ان کے افسانوں میں مغربی ادب کے اثرات کی وجہ سے انفرادیت اور نیا پن نظر آتا ہے فرائیڈ کی تحلیلِ نفسی اور جنس کو انھوں نے اپنے افسانوں کے موضوعات میں شامل کیا ہے جنسی بے راہ روی کو انھوں نے معاشرے کی ناانصافیوں کا غربت کا افلاس کا ردِ عمل کہا ہے اس کی عمدہ مثال ان کا افسانہ ''آئینہ'' ہے جس میں ایک بوڑھی عورت سے ناآسودہ حالات اور پریشانیوں سے تنگ کر آ کر ایک غیر اخلاقی پیشہ اختیار کر لیتی ہے اور اخلاق سے گرا ہوا یہی پیشہ اس کی پہچان اور روزی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

ممتاز شیریں نے اپنے افسانوں میں ''عورت'' کی معاشرے میں حیثیت اور اس کے کردار کو ایک نفسیاتی انداز میں بیان کیا ہے۔

ممتاز شیریں قنوطیت پسند نہیں تھیں یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے کے کردار بھی روشن خیال ہیں ممتاز شیریں کا کہنا تھا کہ انسان چاہے تو اپنے اندر کے ولن کو تحلیلِ نفسی کے ذریعے مار سکتا ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار سیدھے سادھے پڑھے لکھے علم و ادب سے دل چسپی رکھنے والے ہوتے ہیں۔ جن کی داخلی زندگی اور شعور میں چھپے ہوئے جذبات و احساسات کو انھوں

نے کسی مبالغے کے بغیر بیان کیا ہے اس کے ساتھ ہی ان کی زبان بھی کردار کے ماحول کے مطابق استعمال کی ہے۔
سہ بُعدی تکنیک جو افسانوی ادب میں ایک نیا اضافہ ہے ممتاز شیریں اس میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہیں۔
''میگھ ملھار'' اور'' دیپک راگ'' سہ بُعدی افسانوں کی بہترین مثالیں ہیں۔

حلقے کا چوتھا دور تقسیمِ ہند کے بعد سے لے کر ۱۹۷۲ء تک کا ہے۔ یہ دور کئی لحاظ سے بہت اہم ہے۔ اس دور میں حلقہ ارباب ذوق کے اراکین نے اُردو افسانہ، اُردو شاعری اور اُردو تنقید میں تقسیمِ ہند کے موضوع پر تخلیقات پیش کیں۔
فسادات کے دوران ہونے والے تمام دردناک واقعات کو انھوں نے بھی شدّت سے محسوس کیا اور انھوں نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا وہ ان تکلیف دہ واقعات کے کرب اور تکلیف کا نتیجہ تھا نہ کہ کسی سیاسی پروپیگنڈا یا تقسیمِ ہند کے فیصلے کو غلط ثابت کرنے کی کوشش۔

میراجی کے انتقال کے بعد حلقے کا نظم وضبط پہلے جیسا نہ رہا، اور حلقے کے قدم اکھڑنا شروع ہو گئے تھے لیکن اس کے باوجود قیامِ پاکستان کے بعد حلقے کی شاخوں میں اضافہ ہوا۔ آزادی کے بعد حلقے میں کئی نئے لوگ بھی شامل ہوئے اور ترقی پسند تحریک جب زوال کی جانب بڑھنے لگی تو بہت سے ترقی پسند مصنفین نے بھی حلقے کی جانب رخ کیا۔

> ترقی پسند تحریک میں انتشار کی بنا پر ادب کے وسیع میدان میں صرف حلقے کی تحریک ہی سرگرمِ عمل تھی۔ چناں چہ اس کی لمبی مقبولیت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اور کراچی، ڈھاکہ، راول پنڈی، گجرانوالہ، منٹگمری اور کیمبرج وغیرہ جہاں جہاں بھی حلقے کے ارکان گئے۔ اس کی شاخیں قائم ہوتی گئیں۔☆۵۸

> میراجی کے انتقال کے بعد حلقے کا نظم وضبط پہلے جیسا نہ رہا اور حلقے کے قدم اکھڑنا شروع ہو گئے تھے۔ ... چناں چہ بعض شاخوں نے مرکز سے الحاق ضروری نہ سمجھا اور کئی ایک نے حلقے کی پیروی نہ کی۔☆۵۹

> اور ان اراکین نے حلقے کو ترقی دینے کے بجائے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش شروع کر دی۔ ... چناں چہ شیر محمد اختر اور قیوم نظر کے سامنے انتظار حسین کی نئی نسل نے انفرادیت کا علم بلند کیا اور ناصر کاظمی کے رخصت ہونے سے قبل انور سجاد میدانِ عمل میں آ گئے۔ ان کی موجودگی میں پہلے سعادت سعید اور شاہد محمود ندیم اور سراج منیر کی آوازیں حلقے میں گونجنے لگیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب تین چار نسلیں ایک ہی میز کے گرد مسئلے کا تاگہ سلجھانے کے لیے بیٹھتیں تو عمر، تجربے اور مطالعے کے تفاوت نے مجادلے کی فضا پیدا کر دی، اور لوگوں کو بجا طور پر اعتراض ہوا کہ نئے ادبا

ان کے جائز احترام کو ملحوظ نہیں رکھتے۔☆۶۰

وسیع القلبی جو حلقۂ اربابِ ذوق کی ایک مثبت اور نمایاں خصوصیت تھی۔ اس کی جگہ احتجاج اور کینے نے لے لی۔ اگر کسی رکن کی تحریر کردہ تخلیق پر تنقید کی جاتی تو اسے یہ بات سخت ناگوار گزرتی اسی طرح اگر کسی رکن کے خلاف تادیبی کارروائی کی جاتی تو حلقے کی مجالس میں شرکت کرنے سے گریز کرنے لگتا اور یہ رویہ صرف چند دن کے لیے نہیں، بلکہ طویل عرصے تک اختیار کیا جاتا۔

ترقی پسند تحریک کے زوال کے سفر کے ساتھ ہی ترقی پسند مصنفین نے حلقے کی مجالس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے دوست کا روپ اختیار کر کے حلقے کے حالات کس مزید بگاڑنے کی کوشش کی اور حلقے کی ادبی شکل بگاڑنے کے لیے اس کی مجالس میں ادبی مضامین یا دوسری تخلیقات کی جگہ سیاسی موضوعات پر اپنی تخلیقات کو پیش کرنا شروع کر دیا۔

> ترقی پسند ادبا کی حلقے میں شرکت سے حلقے کے مزاج میں نمایاں تبدیلی آنا شروع ہوگئی اور ادب میں افادیت کے سوال پر بحث کا رخ ترقی پسند نظریات کی طرف جھکانے کی کوشش شروع ہوگئی۔☆۶۱

حلقے کے اراکین ان کی چال کو سمجھ نہ سکے اور نہ صرف اپنی مجالس میں ان کا اسی طرح خیر مقدم کرتے رہے جیسے کہ دوسری ادبی شخصیات کا کرتے تھے، بلکہ ان کے رنگ میں بھی ڈھلنا شروع ہو گئے۔

حلقے کے مصنفین نے بھی ملک کے سیاسی حالات اور مسائل میں دل چسپی لینا شروع کر دی اور ۱۹۴۷ء کے فسادات کے نتیجے میں ملک میں جو مسائل پیدا ہوئے مثلاً مہاجرین کی آبادکاری کے مسائل، ملازمت کے مسائل، خوراک اور لباس اور اسی قسم کے کئی معاشی اور سماجی مسائل کے علاوہ نفسیاتی مسائل جن میں سب سے اہم مسئلہ خواتین کی بازیابی کے بعد معاشرے میں ان کی حیثیت اور فسادات کے دوران ان پر ہونے والے ظلم کو اپنی مجالس میں زیرِ بحث لانا شروع کر دیا تھا۔ حکومت کو بھی حلقے کے ساتھ کرنے اور دکھی عوام کے مسائل حل کرنے کی تجاویز پیش کی گئیں۔ اُردو زبان اور اس کے مستقبل کو بے حد اہمیت دی گئی اور حلقۂ اربابِ ذوق میں اس بارے میں غور و فکر کیا جانے لگا کہ اُردو زبان کے سلسلے میں کیا کیا جائے؟ اور کس طریقے سے کیا جائے۔ اس سلسلے کا پہلا مضمون ۲۱ ستمبر کو یوسف ظفر نے پڑھا۔ عنوان تھا: ''پاکستان میں اُردو اور حلقۂ اربابِ ذوق۔'' ☆۶۲

> ۲۳ نومبر ۱۹۴۷ء کو یوں لگتا ہے کہ حلقے کے دانشوروں میں زندگی لوٹ رہی ہے وہ خالی خولی لذت انگیز تحریری دائروں سے نکل کر کچھ عملی کام کرنا چاہتے ہیں وہ عملی کام اُردو زبان کے لیے ہو، مہاجرین کے لیے ہو یا ان بچھڑی ہوئی بے گناہ اغوا شدہ اور ستم رسیدہ حاملہ عورتوں کے لیے جو پاکستان میں لوٹنے والی ہیں یا لوٹ رہی ہیں۔☆۶۳

ان موضوعات کو حلقے کے ادیبوں نے اہمیت دی اور ۲۸ نومبر ہی کی مجلس میں ظہیر کاشمیری نے فرقہ وارانہ جنگ میں

ادب کے فرائض کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ ادیبوں کو فسادات کے دوران ہونے والے حادثات اور قیامِ پاکستان کے بعد ابتدائی مسائل پر بھی لکھنا چاہیے کیوں کہ یہ کام بھی ادبا کی ذمّے داریوں میں شامل ہے۔

مجلس کے صدر ظہیر کاشمیری کا خیال تھا کہ ادیب کا فرض ہے کہ:

وہ انسانیت کے اصولوں پر قائم رہے۔ خواہ حکومتِ وقت کے قانون اس کے اصولوں کے مطابق ہوں یا مخالف۔☆۶۴

اور ایسا نہ کرنے والے ادیبوں کو انھوں نے غیر مخلص ادیب اور ان کی تخلیقات کو بھی محض دکھاوا کہا۔

قیوم نظر جو حلقہ اربابِ ذوق کے ابتدائی اور اہم ارکان میں سے تھے۔ انھوں نے فسادات کے دوران خواتین پر ہونے والے ظلم وستم کو سب سے اہم مسئلہ قرار دیا، اور مستقبل میں بازیاب ہونے والی خواتین کے ساتھ معاشرے کے تحقیر اور نفرت آمیز رویّے پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

موجودہ دور میں بہت سی عورتیں اغوا کی جاچکی ہیں۔ جب وہ واپس ہوں گی تو ظاہر ہے کہ ان کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کیا جاچکا ہوگا... اس لیے اب ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا سماج ایسی عورتوں یا بچّوں کو برداشت کرے گا؟ اور اگر نہیں کرے گا تو ادیب کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ ان ستم زدہ عورتوں اور بے گناہ بچّوں کے لیے سماج میں جگہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔☆۶۵

حلقے کے ادیبوں نے اپنے محدود وسائل اور ذاتی مسائل کے باوجود مہاجرین کے مسائل حل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مہاجرین کے مسائل کے علاوہ اُردو زبان کی ترویج پر بھی خصوصی توجہ دی گئی، لیکن انھیں حکومت سے اس بات کا گلہ بھی تھا کہ وہ اِن کے ساتھ تعاون نہیں کر رہی۔ بقولِ ناصر کاظمی:

اہلِ وسائل نے وسائل اپنی مٹھی میں رکھے اور مسائل ہمارے کھاتے میں ڈال دیے۔☆۶۶

۲۹ راگست ۱۹۴۸ء کو ''ہمارا ادیب تقسیم سے پہلے ___ تقسیم کے بعد'' کے موضوع پر تفصیلی گفتگو ہوئی جس میں اُردو زبان کے بہتر مستقبل اور اس کی حیثیت کو قائم رکھنے کے لیے تجاویز پیش کی گئیں۔

ہند اسلامی کلچر کا سب سے بڑا کارنامہ اُردو ہے، تقسیم کے بعد اسے انڈیا سے دیس نکالا مل گیا ہے۔ اب اُردو کو پاکستان میں اپنا گھر بنانا ہے... اس کے لیے پاکستان کے نئے ادیبوں اور نقادوں کی ذہنی کاوشیں بھی درکار ہوں گی۔ ہمیں اُردو کی روایت کو ہندوستان سے اٹھا کر پاکستان میں لانا ہوگا۔☆۶۷

''تقسیم سے قبل اور بعد کے اُردو ادب'' کے موضوع پر ۷ مئی ۱۹۵۰ء کو ایک پھر حلقے کے اراکین نے بحث چھیڑی۔ اس جلسے میں بحث کی صدارت الطاف گوہر نے کی اور دیگر اراکین میں انتظار حسین، پروفیسر حمید احمد خان، رحمٰن مذنب وغیرہ شامل تھے۔ انھوں نے اس موضوع پر اپنی اپنی آرا کا اظہار کیا۔ مثلاً پروفیسر حمید احمد خاں نے اس بحث سے متعلق یہ سوال اُٹھایا:

> تقسیم سے پہلے اور بعد کے ادب میں کیا ایسی باتیں آ ئی ہیں جن کی وجہ دونوں میں امتیاز کیا جا سکے؟ ☆۶۸

انتظار حسین کا کہنا تھا:

> پہلے تو ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ آیا تقسیم ملک کے بعد کوئی ادب تخلیق بھی ہوا ہے؟ ☆۶۹

رحمٰن مذنب نے ادب پر سیاسی اثرات کو، جو تقسیمِ ہند کے بعد پیدا ہوئے، وقت اور حالات کا تقاضا کہا اور اپنے خیالات اس طرح پیش کیے:

> موجودہ سیاسی حالات کچھ ایسی صورت اختیار کر گئے ہیں کہ ہمارے ادیب اور شاعرات سے توجہ نہیں ہٹا سکتے۔ سیاست ادب پر حاوی ہو چکی ہے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ ہم تخلیقِ ادب کو نظر انداز کر کے دوسری راہیں اختیار کریں۔ ☆۷۰

ایسے اراکین بھی موجود تھے جو ادب کو سیاست سے ملانا نہیں چاہتے تھے اور ادب کو ادب ہی رہنے دینا چاہتے تھے۔ اُردو زبان کا مسئلہ ایسا مسئلہ تھا جس پر حلقے کے تمام اراکین اپنی کوششیں اپنا مقصد پورا ہونے تک جاری رکھنا چاہتے تھے۔ یہ بات بھی کسی شک وشبہ کے بغیر کہی جا سکتی ہے کہ حلقے کی فضا ادبی کم اور سیاسی زیادہ ہو گئی تھی۔ حلقے پر سیاسی اثرات روز بروز بڑھتے گئے، اور حلقۂ اربابِ ذوق دور چہارم کے آخر میں دو حصّوں میں تقسیم ہو گئی، اور حلقے کے پانچویں دور میں سیاسی اور ادبی حلقے کے الگ الگ اراکین کی حیثیت سے ادبا نے اپنا تخلیقی کام اپنے نقطۂ نظر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تحریر کیا۔

> ادبی حلقے کا موقف یہ تھا کہ زندگی سے لپٹ جانے کے باوجود اُدب اُدب ہی رہتا ہے۔ چناں چہ ادب کسی سیاسی نقطۂ نظر سے پرکھنے کے بجائے ادب کے نقطۂ نظر سے ہی پرکھنا چاہیے۔ اس کے برعکس سیاسی حلقے کا خیال تھا کہ حلقے نے دنیا کو کسی بھی فعال معاشرتی موضوع کو شجرِ ممنوعہ نہیں سمجھا... سیاسی حلقۂ اربابِ ذوق نے ابتدائی تین سالوں (۷۵-۱۹۷۲ء) میں حلقے کی قدیم روایت کو توڑنے اور اقدار کی نئی نوعیتوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کی... چناں چہ عزیز الحق نے تبدیلی کے اس عمل کو تیز تر کرنے میں انقلابی کردار ادا کیا۔ ☆۷۱

سیاسی حلقۂ ارباب ذوق کا نظریہ مارکسی نظریہ کی نقل تھا۔ اسی دور میں ملک کے سیاسی حالات ایسے ہو گئے تھے کہ اس

لیتے ہیں۔☆۴۷

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حلقے کے اراکین نظریاتی اختلافات رکھنے کے باوجود ایک دوسرے سے بالکل لاتعلق نہ ہو سکے انھیں مصلحتاً ہی سہی لیکن ایک دوسرے کی محفلوں میں شریک ہونا پڑا، اور مصلحت کے تحت کیے جانے والے کام سیاست ہی کا ایک انداز ہوتے ہیں اس لیے یہ بات کہنا درست ہے کہ ادبی حلقے پر بھی تھوڑے سے سیاسی اثرات پیدا ہو گئے۔ جس سے ادبی حلقے اور سیاسی حلقے کے فرق میں بھی کمی آ گئی۔

اب ہم حلقۂ اربابِ ذوق کے ان افسانہ نگاروں کا ذکر کریں گے جنھوں نے حلقے کے دورِ چہارم یعنی ۱۹۴۸ سے ۱۹۷۲ء کے درمیانی عرصے میں لکھا۔ یہ دورِ تقسیمِ ہند کے بعد کا تھا۔ بہت سے افسانہ نگاروں نے تقسیمِ ہند کے بعد بھی ہندوستان میں رہنے کو ترجیح دی۔ بعض پاکستان آ گئے اور کچھ افسانہ نگار ایسے بھی تھے جنھوں نے آزادی کے بعد لکھنا چھوڑ دیا۔ کچھ افسانے نگار ایسے بھی تھے جنھوں نے تقسیمِ ہند سے کچھ عرصہ قبل لکھنا شروع کیا۔

جن افسانہ نگاروں نے آزادی سے کچھ عرصہ قبل لکھنا شروع کیا اور بعد میں بھی لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان میں انتظار حسین، انور سجاد، اشفاق احمد، بانو قدسیہ اور الطاف فاطمہ وغیرہ شامل ہیں۔

ان افسانہ نگاروں کے علاوہ بعض ایسے افسانہ نگار بھی تھے جن کا تعلق ترقی پسند تحریک سے تھا، ترقی پسند تحریک کے زوال کے بعد اور بعض اختلافات کی وجہ سے حلقے میں شامل ہو گئے۔ ان میں منٹو، قرۃ العین حیدر۔

تقسیمِ ہند کے نتیجے میں ملک میں صرف سیاسی تبدیلیاں ہی رونما نہیں ہوئیں، بلکہ ملک کے معاشی، سماجی اور تہذیبی عوامل میں بھی بہت سی تبدیلیاں آئیں ان مختلف تبدیلیوں کے نتیجے میں عوام بالخصوص مہاجرین کی شخصیت پر گہرے اثرات پڑے ہیں۔ جنھیں معاشرے کے تمام افراد کے علاوہ حلقۂ نے بھی کیا ان ادبا میں حلقے کے ادبا بھی شامل ہیں جنھوں نے مہاجرین کی نفسیاتی کیفیات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ نفسیاتی الجھنوں کا مطالعہ کرتے ہوئے انھوں نے صرف انسانی رشتوں کے بچھڑ جانے ہی کا افسوس نہیں کیا، بلکہ انھوں نے مہاجر عوام کی ایک تہذیب، ایک ماحول اور ایک فضا سے بچھڑنے کے کرب کو بہت اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔

سعادت حسن منٹو:

سعادت حسن منٹو کا شمار اُردو ادب کے بڑے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ۱۹۱۲ء سے ۱۹۵۵ء تک افسانے لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ تقسیمِ ہند کے بعد جب وہ ہجرت کر کے پاکستان آئے تو یہاں حلقۂ اربابِ ذوق کی لاہور شاخ سے وابستہ ہو گئے، اور حلقے کی کئی مجالس میں اپنے افسانے پڑھ کر سنائے، اور جب تک زندہ رہے حلقے کے لیے اپنی تخلیقات پیش

کرتے رہے۔ جن میں ''موذیل''، ''ممی''، ''بابو گوپی ناتھ''، ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اور ''بادشاہت کا خاتمہ'' کو شہرت حاصل ہوئی۔

ان افسانوں کے علاوہ ڈاکٹر یونس جاوید نے بھی حلقے کے جلسوں میں پڑھے جانے والے ان کے افسانوں کی ایک مختصر سی فہرست بیان کی ہے، جو مندرجہ ذیل ہے:

۳؍ستمبر ۱۹۵۰ء: ''ننگی آوازیں''، ۲۴؍ستمبر ۱۹۵۰ء: ''خالد میاں''، ۸؍اکتوبر ۱۹۵۰ء: ''مجید کا ماضی''، ۷؍جنوری 1951ء: ''بسم اللہ، خود فریب''، ۱۲؍اگست 1951ء: ''مرلی کی دھن''، ۲۴؍اکتوبر ۱۹۵۱ء: ''۱۹۱۹ کی ایک بات''، ۴؍نومبر ۱۹۵۱ء: ''تین گولے۔'' ☆۷۵

اس مختصر فہرست میں سے ''۱۹۱۹ کی ایک بات'' اور ''تین گولے''، فسادات کے موضوع پر لکھے گئے افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں منٹو نے صرف ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران ہونے والے قتل و غارت اور لوٹ مار کے واقعات کو ہی بیان نہیں کیا، بلکہ اس میں فرد کے نفسیاتی پہلوؤں داخلی پہلوؤں کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے منٹو کے افسانے حلقۂ اربابِ ذوق کے اصل موضوع یعنی انسانی فطرت، اس کی جذباتی اور نفسیاتی کیفیات کو اس کی خارجی پہلوؤں سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

منٹو کو ان کے نفسیاتی مطالعے اور جنسی واقعات کی بے جا تکلیفات کی وجہ سے حلقے کے اراکین نے بھی انھیں جنس زدہ افسانہ نگار قرار دیا۔

۱۹۵۰ء میں منٹو کے افسانے ''ننگی آوازیں'' پر جمیل الدین عالی نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

> افسانے کا موضوع مستحسن ہے۔ اگرچہ سماج کے خاص طبقے کی غربت کی وجہ سے ذہنی الجھنوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاہم پیش کش غیر اخلاقی ہے، اور اس مفید مقصد کو ختم کر دیتی ہے جو افسانہ نگار کے پیشِ نظر تھا۔ ☆۷۶

سعادت حسن منٹو نے اعتراض کی معقولیت کو تسلیم کیا اور کہا کہ وہ اس خامی کو دور کر دیں گے۔ ☆۷۷

اسی طرح ڈاکٹر سعید نے بھی منٹو کی افسانہ نگاری پر تنقید کرتے ہوئے کہا:

> منٹو ڈاکٹر فرائڈ کی تصانیف سے متاثر ہیں۔ ڈاکٹر فرائڈ نے اپنے ملک کے جنس زدہ لوگوں کی حالت بیان کی ہے اور جب وہ تصانیف یہاں پہنچیں تو ہم نے اس کے نظریات کو اپنے معاشرے میں سمونے کی کوشش کی نتیجتاً وہاں کا گھٹیا قسم کا ادب یہاں پھیل گیا... حالاں کہ شاید وہ جنس کو بھی صحیح طور پر نہیں سمجھ سکے۔ ان کے نزدیک جنس کا بھدا پہلو ہی رہا۔ ☆۷۸

تقسیمِ ہند کے بعد منٹو حلقۂ اربابِ ذوق کے باقاعدہ رکن بن گئے، اور اپنی تخلیقات کے ذریعے حلقے کی خدمت کرتے رہے۔ خاص طور پر ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۴ء کے دوران انھوں نے حلقے کے لیے کئی افسانے لکھے۔

انتظار حسین:

اس سلسلے میں سب اہم نام انتظار حسین کا ہے۔انتظار حسین خود بھی ہجرت کے کرب سے گزر رہے تھے۔اس لیے انھوں نے مہاجرین کے اس کرب اور خلا کو صحیح معنوں میں سمجھا جو کسی عزیز،صدیوں پرانی جگہ سے یا ماحول کو چھوڑنے سے پیدا ہوتا ہے۔

فسادات کے موضوع پر انھوں نے ''شہرِ افسوس'' اور ''گلی کوچے'' کے نام سے افسانوی مجموعے لکھے ہیں۔ان مجموعوں میں انھوں نے جو افسانے لکھے ہیں ان میں وہ اپنے ماضی کے مختلف گوشوں میں کھوئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ان افسانوں میں ''قیوما کی دکان''،''اُستاد''،''ایک بن لکھی رزمیہ''،''فجا کی دکان''،''دوسرا راستہ''،''اپنی آگ کی طرف''،''وہ جو دیوار نہ چاٹ سکے''،''اندھی گلی''،''شہرِ افسوس''،''وہ جو کھوئے گئے''،''شہادت''،''خرید حلوا بیسن کا'' اور ''اجودھیا'' جیسے افسانے شامل ہیں۔ان افسانوں میں وہ ماضی کی یادوں میں کھوئے ہوئے نظر آتے ہیں۔اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے انھوں خود کیا ہے:

> میرے افسانے تو میری کربلا ہیں۔میرے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکے ہیں اور پوری کربلا میں بکھرے ہوئے ہیں۔خود میرے لیے یہ مسئلہ ہیں کہ میں اس دلِ لخت لخت کو کیسے جمع کروں اور کیسے زندگی میں اپنے آپ کو ظاہر کردوں،اپنے تئیں بروے کار لاؤں۔☆۷۹

ان کے بیش تر افسانوں میں ماضی ہی کا ماتم کیا گیا ہے۔جس کی وجہ سے ان کے افسانے یکسانیت کا شکار ہو گئے ہیں، اور ان افسانوں میں موضوعات کا تنوع نہیں ہے،لیکن اس کے باوجود انھوں نے انسان کے وہ مختلف احساسات اور جذبات جو کسی کے بچھڑنے کی وجہ سے ہوتے ہیں انھیں بیان کرنا انتظار حسین ہی کا کمالِ فن ہے۔

> انسان کس طرح گرد و پیش کے ماحول سے محبت کرتا ہے؟ حالات کی تبدیلی اس کی جذباتی اور ذہنی کیفیت کس طرح متاثر کرتی ہیں؟ ماحول کی انقلابی کیفیت کا اس کے مزاج پر کیا اثر ہوتا ہے؟ تہذیبی اور معاشرتی انتشار کے ہاتھوں پیدا ہونے والے صورتِ حال کس طرح اس کے دل میں داغ بن جاتی ہے؟ صدیوں کی روایتوں کے متزلزل ہو جانے کے باعث نئے ماحول میں کس طرح وہ اپنے آپ کو اکھڑا اکھڑا محسوس کرتا ہے؟ ماضی کے مٹ جانے کا احساس کی وجہ سے اس کے دل میں کس طرح آگ سلگتی ہے؟ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کس طرح زندہ رہنے کی تمنا کو باقی رکھتا ہے؟ اس کی ایک شمع سی اس کی زندگی میں فروزاں رہتی ہے۔☆۸۰

اپنے افسانوں میں انتظار حسین نے صرف بچھڑنے والوں ہی کو یاد نہیں کیا، بلکہ ماضی کے ان راستوں،جگہوں،گھر

سے قریبی بازاروں،گلیوں،عبادت گاہوں سب کا ذکراس طرح کیا ہے جیسے وہ سب بھی ان کے پرانے مانوس اور بے تکلف دوست ہوں۔اس سلسلے میں ان کے افسانے''قیوما کی دکان''،''اُستاد''اور''شہرافسوس'' قابلِ ذکر ہیں۔

اشفاق احمد:

اشفاق احمد بھی تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان آ گئے۔انھوں نے تقسیمِ ہند سے کچھ عرصہ قبل لکھنا شروع کیا تھا۔تقسیمِ ہند کے بعد بھی انھوں نے افسانے لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ان کا شماران افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے افسانوں میں دیہاتی ماحول کو بہت اچھی طرح عکاسی کی ہے۔اپنے افسانوں میں جب کسی دیہاتی ماحول کو بیان کرتے ہیں تو وہ اس کے لیے جوالفاظ اورلب ولہجہ استعمال کرتے ہیں وہ بھی پنجاب کے دیہاتی ماحول کے عین مطابق ہوتا ہے۔

دیہاتی ماحول کے علاوہ انھوں نے رومانی اور زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق بھی متعدد افسانے لکھے۔ان کے رومانی افسانے صرف عاشق اور معشوق کی محبت تک محدود نہیں، بلکہ تمام انسانی رشتوں کو انھوں نے اپنی اپنی جگہ اہم قرار دیا ہے۔ان کے افسانوں کے مجموعے''ایک محبت سوافسانے''اور''اجلے پھول'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں جن میں ''شب خون''،''امی''،''اجلے پھول'' وغیرہ شامل ہیں، جواُردوافسانوں میں خوب صورت اضافہ ہیں۔فسادات کے موضوع پر ''گڈریا'' ان کا مشہور افسانہ ہے۔

انورسجاد:

۱۹۶۰ء کے بعد جن لوگوں نے علامتی افسانے لکھے ان میں انورسجاد کا نام سب سے اہم ہے۔ستم زدہ افسانوں کے مسائل کو انھوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ان کے افسانوں کا موضوع عام طور پر جبر اور احتجاج ہوتا ہے۔وہ اپنے افسانوں میں زندگی کے تمام مسائل بیان کرتے ہیں۔یہ مسائل سیاسی،سماجی،معاشی،اقتصادی اورجنسی ہر قسم کے ہو سکتے ہیں۔ان مسائل سے معاشرے میں کچھ تبدیلیاں آتی ہیں مثلاً ملک کے سرمایہ دار طبقے کو انھوں نے ظالم اور جابر کہا ہے اورانورسجاد نے اپنے افسانوں میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سرمایہ دار طبقے کا رویہ کئی مسائل مثلاً ملک کے مایوس کن سیاسی حالات، برسرِ اقتدار حکمرانوں کی کجروی، جبریت،فسطائیت،علاقائیت، جنگ کا خوف،موت کا خوف طبقاتی کش مکش،جنسی بےراوی،انسانی داخلاتی اقدار کا زوال،ریاکاری اور مفاد پرستی جیسے منفی رجحانات جنم لیتے ہیں۔

انورسجاد نے اپنی ہرتخلیق میں اپنے مقصد کو بیان کرنے کے لیے استعاروں اور علامتوں کا استعمال کیا ہے جواُن کے مرکزی خیال سے گہرا واسطہ رکھتی ہیں،لیکن ان استعاروں اور علامتوں کو سمجھنے کے لیے گہرے مطالعے اور مشاہدے کا ہونا

ضروری ہے؛ مثلاً سرمایہ دارانہ نظام کے لیے انھوں نے ''زندان'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جس سے غریب عوام نجات حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ان کے افسانوں کے ناموں سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے زندگی کے مختلف مسائل کو کس طرح علامتوں سے تشبیہ دی ہے۔ انھوں نے مختلف مسائل کو بعض بیماریوں مثلاً ''مرگی''، ''کارڈیک دمہ''، ''گینگرین''، ''کینسر'' وغیرہ سے تشبیہ دی ہے۔

جو کہانی کار تخلیقی زبان کو مؤثر انداز میں استعمال نہیں کرسکتا وہ ایک ایسے عجوبے بچّے کو جنم دیتا ہے
جو تھوڑی دیر بعد مر جاتا ہے اور مرتبان اِس کی قسمت بن جاتی ہے۔☆۸۱

یوں تو انھوں نے فرقہ وارانہ تفریق پر کئی افسانے لکھے۔ ''چوراہا''، ''استعارے'' اور ''آج'' ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں جو عصرِ حاضر کی تصویر ہیں۔

۱۹۴۷ء کے فسادات کے موضوع پر انھوں نے صرف ایک افسانہ ''نہ مرنے والا'' کے نام سے لکھا۔ اس افسانے میں ہندو مسلم فسادات کا ذکر کیا ہے۔ جس کا ذمّے دار انھوں نے انگریزوں کو ٹھہرایا ہے۔ اس افسانے میں ہندو اور مسلم دو کرداروں کا فرقہ وارانہ تعصّب کی بنیاد پر جھگڑا ہو جاتا ہے اور ایک کردار دوسرے کردار کو قتل کر دیتا ہے جسے وہ ساری زندگی بھلا نہیں پاتا اور اس کا ضمیر اسے ساری زندگی پریشان رکھتا ہے۔

❀ ❀ ❀

ج: رومانیوں کا رویّہ

''رومانیت'' کی اصطلاح ہمارے ہاں Romanticism کے ترجمے کے طور پر رائج ہے جس کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ یہ کلاسیکیت کا ردِّعمل ہے، اِس لیے بغاوت، تخیّل کی فراوانی اور بے لگامی، جذبات کی بے اعتدالی، ماورائیت، شدید داخلیت، الم پسندی، انتہا پسندی اور ایک مخصوص نغمگی رومانیت کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

یورپ میں رومانیت کی ابتدا تحریکِ اصلاح کے بعد ہوتی ہے۔ صنعتی انقلاب، انقلاب فرانس اور رومانیت دراصل ایک ہی ذہنی کیفیت کے آفریدہ ہیں۔

انگریزی میں رومانی تحریک ۱۷۸۰ء سے شروع ہو کر ۱۸۳۰ء پر ختم ہوتی ہے مغرب میں رومانیت کلاسیکیت کے ردِّعمل کی صورت میں پیدا ہوئی۔ ☆۸۲

سیّد عابد علی عابد نے انگلستان کے مختلف شعرا، ناقدین اور ادبا کے حوالے سے رومانیت کی تحریک کو مندرجہ ذیل خصوصیات کا حامل قرار دیا ہے:

(۱) جذباتیت (۲) مناظر فطرت سے دل چسپی (۳) ماضی اور خصوصاً قرونِ وسطیٰ سے دل چسپی (۴) تصوف (۵) انفرادیت پسندی (۶) نوکلاسیکی رجحانات اور ہر طرح کے قوانین سے بغاوت (۷) دیہاتی زندگی سے دل چسپی (۸) مناظرِ فطرت میں غیر منظم، عجیب و غریب اور وحشی عناصر سے دل چسپی (۹) تخیّل کی مکمل آزادی جو بعض اوقات بے راہ روی بن جاتی ہے (۱۰) ان کوائف اور مظاہر سے لگاؤ جو فطرت سے قریب تر ہیں، ان سے قطع نظر کہ ان میں شائستگی کا عنصر موجود ہے کہ نہیں (۱۱) انسانی حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد کا جذبہ (۱۲) حیوانات کی زندگی سے دل چسپی (۱۳) جذباتی المیت (۱۴) ناول نویسی میں جذبات نگاری۔ ☆۸۳

رومانی تحریک ادبا میں بہت مقبول ہوئی اور انھوں نے اسے پھلنے پھولنے کے ہر ممکن مواقع فراہم کیے۔

رومانوی ادب کے مختلف عناصر نے آگے چل کر فطرت نگاری، تاثریت، علامتیت، اور اظہاریت وغیرہ کی تحریکوں کو جنم دیا جو کسی نہ کسی صورت میں آج تک جاری ہے۔ ☆۸۴

اُردو ادب رومانی تحریک اُردو ادبا کی مغربی رومانیت سے دل چسپی ہی کا نتیجہ نہیں، بلکہ یہ سرسیّد کی ٹھوس عقلیت اور جامد اجتماعیت پر مبنی علی گڑھ تحریک کا ردِ عمل بھی تھی۔

علی گڑھ تحریک ایک انقلابی تحریک تک۔ جس کا مقصد جدید علوم اور تہذیب کو فروغ دینا تھا، لیکن جہاں اس تحریک کے حمایتی موجود تھے وہاں اس کے مخالفین ادبا نے اس کے خلاف ردِ عمل کو رومانی تحریک کی صورت میں انیسویں صدی کے ربع آخر میں پیش کیا۔

اُردو شاعری اور اُردو نثر میں رومانی عناصر بڑی تیزی سے اثر انداز ہوئے اور ابتدائی نثر نگاروں میں میر ناصر علی، محمد حسین آزاد اور عبدالحلیم شرر شامل ہیں۔ یہ ادبا سرسیّد ہی کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

> سرسیّد کی عقلیت کے خلاف رومانوی ردِ عمل ان کی زندگی میں ہی ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اہم بات یہ ہے کہ رومانیت کا یہ عنصر کسی مخصوص خطے سے وابستہ نہیں تھا۔ اس کا دائرہ عمل پورے خطے میں پھیلا ہوا تھا، چناں چہ رومانیت کا ایک زاویہ محمد حسین آزاد کی صورت میں ارضِ لاہور سے ابھرا، رومانیت کی نمود اور تحریک کو میر ناصر علی نے دہلی میں کروٹ دی اور رومانی اندازِ نظر کی بیش تر تصنیفات شرر نے لکھنؤ میں پیش کی۔☆۸۵

ان رومانی ادبا میں محمد حسین آزاد اور عبدالحلیم شرر کی رومانی تصنیفات ان کی جذباتی اور تخیلی کیفیات کا عکس ہیں۔ مثلاً آزاد کی ''نیرنگِ خیال'' تخیلات اور رنگین فضا کی عمدہ مثال ہے جو ان کے رومان رجحان اور داخلی کیفیات کو بھی ظاہر کرتی ہیں۔ اس طرح شرر نے اپنے رومانی ناولوں کے ذریعے مسلمانوں کے شان دار ماضی اور اس کے جاہ و جلال کو یاد کیا ہے اس سلسلے میں ان کے ناول ''حسنِ انجیلنا''، ''منصور موہنا''، ''فلورا فلورنڈا'' اور ''یوسف و نجمہ'' وغیرہ نمایاں ہیں۔

محمد حسین آزاد اور عبدالحلیم شرر کے برخلاف میر ناصر علی نے رومانی موضوع کے حوالے سے جو کچھ بھی لکھا وہ سرسیّد کی تحریروں کی مخالفت میں لکھا۔

> انھوں نے ''تہذیب الاخلاق'' کے مقابلے میں ''تیرھویں صدی''، ''فسانۂ ایام'' اور ''صلائے عام'' وغیرہ رسائل جاری کیے اور ان میں زبان کی خوبی کو خیال پر ترجیح دینے کی کوشش کی۔ چناں چہ انھوں نے علی گڑھ تحریک کی خشک کلاسیکت کو نثر کی شاعری میں تبدیل کیا اور ادب کی خارجی مادّیت کا رخ داخل کی رومانیت کی طرف موڑ دیا۔☆۸۶

غرض یہ کہ ان رومانی مصنفین نے اپنی تخلیقات میں حقائق کی جگہ تخیل و تصوّرات اور دل کی باتوں کو اہمیت دی۔

اُردو کے ابتدائی رومانی ادب میں داستان، مثنوی اور غزل میں رومانی عناصر موجود ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ

ساتھ اُردو ناول، تنقید اور افسانوں میں بھی رومانیت کی جھلک نظر آنے لگی۔

رومانی تحریک کو فروغ دینے میں اس دور میں نکلنے والے ادبی رسائل نے بھی اہم کردار ادا کیا۔

> روزناموں میں زمیندار، اور ہفت روزہ پرچوں میں الہلال، دھوم مچائے ہوئے تھے ماہنامہ ادبی پرچوں میں زمانہ، مخزن، نظام المشائخ، ادیب، تمدن، صلائے عام، دلگداز، الناصر اور العصر ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ لکھنے کو ناول، افسانہ، تنقید، تحقیق، عملی مضامین اور مذہبی مقالات سبھی لکھے جا رہے تھے، لیکن ہر قسم کی تحریر کہیں عشقِ حقیقی کے پردے میں اور کہیں عشقِ مجاز کے رنگ میں رومان پرور انشا پردازی میں دبی ہوئی تھی۔ ☆ ۸۷

ان رسائل کے علاوہ ''نگار''، ''نقاد''، ''ہمایوں'' اور ''رومان'' بھی ایسے رسائل ہیں جنھوں نے رومانی تحریک کو ترقی دینے میں نمایاں خدمات پیش کیں۔

ان تمام رسائل میں سے مخزن ایسا رسالہ ہے جسے شیخ عبدالقادر نے رومانی تحریک کے فروغ اور اُردو زبان کی نشو و نما اور ترقی کے لیے شائع کرنا شروع کیا تھا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئے۔

> جب اپریل ۱۹۰۱ء میں مخزن کا اجرا ہوا، اور اس نے روشِ عام سے ہٹ کر جذبہ اور تاثر کو ملکوتی زبان میں پیش کرنا شروع کیا تو اس عہد کے بیش تر نو جوان ادبا مخزن کی طرف متوجہ ہو گئے اس دور میں جو ادبا مخزن کے صفحات سے نمایاں ہوئے ان میں اقبال، ابوالکلام آزاد سجاد حیدر یلدرم، آغا شاعر قزلباش، ظفر علی خاں، مرزا محمد سعید، خوشی محمد ناظر، غلام بھیک نیرنگ، مہدی افادی، لطیف الدین احمد، خواجہ حسن نظامی اور شیخ عبدالقادر کے اسما بے حد اہم ہیں۔ ان ادبا نے اُردو زبان کو ایک خاص قسم کی لطافت سے آشنا کیا اور طاقت وَر متخیلہ کے بل بوتے پر رومانی تصوّرات کو فروغ دیا۔ ☆ ۸۸

ان ادبا کے علاوہ کئی اور بھی ایسے قابلِ قدر ادبا ہیں جنھوں نے ادب میں رومانی فضا کو نہ صرف قدر کی نگاہ سے دیکھا، بلکہ اسے ترقی کی منازل طے کروانے میں معاون اور اہم کردار ادا کیا۔ اس طرح ترقی پسند تحریک کے آغاز تک اُردو ادب میں رومانی ادبا کا ایک گروہ پیدا ہو چکا تھا۔ جس نے اُردو نثر اور شاعری کی مختلف اصناف پر رومانی نقوش مرتسم کیے:

> اس دور کے نثر نگاروں میں ہمیں ابوالکلام آزاد، نیاز فتحپوری، ل۔ احمد، سلیمان ندوی، سجاد حیدر، عبدالحق، عبدالقادر، حسن نظامی، پطرس، خلیقی، عبدالماجد، سلطان حیدر بخش، رشید احمد صدیقی، مسعود حسن رضوی، احمد شجاع، عظیم، شوکت تھانوی، ملاّ رموزی، مہدی افادی، سجاد انصاری،

ناصر علی اور فرحت دہلوی وغیرہ کی شخصیتیں نظر آتی ہیں، اور شاعری میں اس دور کے نمائندے
اقبال، حسرت، فانی، اصغر، شاد، ظفر علی، عزیز اور صفی لکھنوی وغیرہ ہیں۔ حفیظ، اختر شیرانی اور جگر
بھی اسی گروہ میں شامل کیے جاسکتے ہیں۔ ☆۸۹

گذشتہ اوراق میں رومانی تحریک کی تاریخ اور تجزیے کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ رومانی تحریک نے نوجوان ادبا کو بہت جلد اپنی جانب مائل کرلیا، اور یورپ کی طرح ہندوستان میں بھی اس تحریک کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ رومانی ادبا نے صنفِ شاعری اور نثر کی مختلف اصناف میں اپنی تخلیقات کے اعلیٰ نمونے پیش کیے، اور اپنی تحریروں کے ذریعے رومانی تحریک کو پھولنے پھلنے کا موقع دیا۔

جہاں تک رومانی تحریروں میں ماحول اور فضا کا تعلق ہے تو بعض ادبا نے تو مغربی ادب کی پوری پوری تقلید کی جب کہ بعض ادبا نے مغرب کی رومانیت کو بھی قبول کیا لیکن مشرقی تہذیب وتمدن سے بھی کنارہ کشی اختیار نہ کی، اور اپنی تحریروں میں مشرقی ماحول کو زیادہ جگہ دی۔

اُردو میں رومانی تحریک کا دورِ عروج بیسویں صدی کے ربع چہارم تک پھیلا ہوا ہے، اس دور میں
زندگی کو ایک خاص انداز میں ڈھالنے، خوابوں کی دنیا میں رہنے اور محرومیوں سے محبت کرنے کا
رجحان پیدا ہوا۔ ☆۹۰

رومانی تحریک میں شمولیت اختیار کرنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا، اور بہت سے ایسے ادبا جو بعد میں ترقی پسند تحریک میں شامل ہوگئے تھے انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز رومانیت ہی سے کیا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب رومانی ادبا نے حقیقی زندگی اور اس کی تلخیوں کو بالکل بھلا دیا اور وہ صرف خوابوں اور خیالوں کی دنیا کے باسی بن کر رہ گئے تو ایسا وقت بھی آ گیا جب ان کی رومانیت بھی کھوکھلی سوچ اور لفاظی کے سوا کچھ بھی نہ رہی۔ اس منفی تبدیلی سے رومانی تحریک کی ادبی اہمیت بھی متاثر ہوئی۔

اسی عرصے میں حلقۂ اربابِ ذوق اور ترقی پسند تحریک کا بھی آغاز ہو گیا، اور ادبا نے اپنی ادبی کاوشوں کا رخ ترقی پسند تحریک اور حلقۂ اربابِ ذوق کی طرف موڑ دیا۔

بلاشبہ رومانی تحریک کے اثرات کو سب سے زیادہ ترقی پسند تحریک نے سمیٹا اور ادب میں فیض،
جاں نثار اختر، اسرالحق مجاز، مخدوم محی الدین، کرشن چندر، علی سردار جعفری وغیرہ کا طلوع ہوا تو
انھوں نے ابتدا میں رومانیت کے قیمتی اثاثے کو ہی استعمال کرنے کی کوشش کی۔ ☆۹۱

ان شاعروں اور افسانے نگاروں نے ابتدا میں رومانی تخلیقات پیش کیں اور ان کی تحریروں کو لوگوں نے پسند کیا اور

انھیں شہرت بھی حاصل ہوئی۔

> ترقی پسند تحریک کے علم برداروں میں بہت ہی مقتدر ادیب خود بھی رومانیت اور رومانی بے راہ روی سے متاثر ہیں۔ کرشن چندر قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، رضیہ سجاد ظہیر اور سعادت حسن منٹو رومانیت سے کسی نہ کسی حیثیت سے متاثر ہوئے۔☆۹۲

جہاں تک رومانی افسانہ نگاروں کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں ابتدائی افسانہ نگار سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھ پوری کے نام خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں میں مجنوں اور نیاز فتح پوری انگریزی ادب سے جب کہ سجاد حیدر یلدرم نے ترکی ادب سے متاثر ہو کر اُردو میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔

بقولِ آلِ احمد سرور:

> انیسویں صدی کے آخر میں زندگی برائے ادب کا جو سنہرا نظریہ آسکر وائلڈ اور پیٹر نے انگلستان میں پیش کیا تھا۔ اس کا عکس اُردو میں ادبِ لطیف کے ان نمائندوں (نیاز فتح پوری اور سجاد حیدر یلدرم) کے یہاں نظر آیا۔ اس میں ایک خود پسندی، ایک انانیت اور ضاعانہ پختگی کے ساتھ ساتھ ایک ذہنی تعیش بھی ہے۔ یہ لوگ دراصل شاعر تھے جو افسانہ کی سرحد میں آزادانہ گھس آئے تھے۔ انھیں قصے کی تنظیم اور کردار کے ارتقا سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔☆۹۳

ان افسانہ نگاروں کے علاوہ سلطان حیدر جوش، اعظم کریوی، سدرشن، حجاب امتیاز علی، قاضی عبدالقادر، حامد اللہ افسر، سجاد انصاری نے بھی رومانی افسانہ نگاری کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

اب ہم اُردو ادب کے رومانی افسانہ نگاروں کے افسانوں کی فنی خصوصیات اور موضوع کے لحاظ سے مختصر تجزیہ کریں گے۔

سجاد حیدر یلدرم:

سجاد حیدر یلدرم کا شمار اُردو کے ابتدائی افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے افسانہ نگاری کا آغاز ترکی زبان کے افسانوں کا اُردو زبان میں ترجمہ سے کیا۔ ان کے تمام افسانے رومانی ہیں جس میں انھوں نے مختلف رومانی عناصر کو بیان کیا ہے۔

سجاد حیدر یلدرم نے اپنے افسانوں میں زندگی کے تلخ حقائق، اور سیاسی نظام کی خرابیوں کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل کی جگہ زندگی کے مثبت پہلوؤں اور زندگی میں پیار محبت کے جذبے کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے ادب اور زندگی کے رشتے کو تسلیم تو کیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی اعتراف کیا:

> سجاد حیدر نے ایک سچے فن کار کی طرح یہ نعرہ بلند کیا کہ ادب اور ادیب کو زندگی کے ان جھگڑوں سے

کوئی سروکار نہیں جن میں پھنس کر ادیب کو مصلح اور ادب کو پند و وعظ بننا پڑتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ادب اور زندگی کا رشتہ دائمی ہے لیکن زندگی میں سب کچھ ایسا نہیں کہ اسے ادب کا موضوع بنایا جاسکے۔ زندگی میں محبت کا نغمہ ہی صرف وہ نغمہ ہے جسے ادب اپنے سینے سے لگاتا ہے اور دل میں جگہ دیتا ہے۔☆۹۴

''خیالستان'' ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جس میں انھوں نے ادب برائے ادب کو مدِنظر رکھتے ہوئے سارے افسانے لکھے۔ ان کے یہ افسانے دلکش اور منفرد تشبیہات، رومانی فضا اور پیار محبت کے سچے جذبات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ''خیالستان'' کے افسانوں میں ''خارستان و گلستان''، ''نکاحِ ثانی''، ''سودائے سنگین''، ''حکایۂ لیلیٰ مجنوں'' اور ''چڑیا چڑے کی کہانی'' جیسے شاہ کار افسانے شامل ہیں۔

سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں عورت کو کائنات کی سب سے خوب صورت تخلیق قرار دیا ہے اور اس کے وجود کو دنیا کی رونق قرار دیا ہے۔ یہی چیز ان کے ہر افسانے میں نظر آتی ہے۔ ''خارستان اور گلستان'' کی نسرین نوش ہو یا ''نکاحِ ثانی'' کی پردہ پوش عورت، انھوں نے ہر روپ اور ہر انداز میں عورت کو فاتح عالم اور فاتح دل ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

یلدرم نے عورت کے وجود کو نہ صرف تسلیم کیا ہے، بلکہ اس کی جمالیاتی تحسین کی اور اسے مرد کی زندگی میں ایک محرک قوت قرار دیا تھا۔☆۹۵

یوں تو سجاد حیدر یلدرم کے تمام افسانے ہی رومانی فضا میں لکھے گئے ہیں لیکن ''خارستان و گلستان'' میں انھوں نے عورت اور مرد کی زندگی میں ایک دوسرے کی اہمیت اور کشش کو رومانی اور جذباتی انداز میں بیان کیا ہے۔

عورت مجسمِ جمال بن کر پورے افسانے پر چھا گئی ہے۔ عورت کی معصومیت، نزاکت، خوب صورتی، جذبۂ ایثار و وفا اور خدمت گزاری ایسی خصوصیات ہیں جن کی بدولت وہ دنیا کی رونق ہے اور اس کا وجود ناگزیر حیثیت رکھتا ہے۔ یلدرم افسانے میں منظر نگاری، موضوع، تشبیہات و استعارات، مکالمات اور کردار سب رومانی احساس و کیفیات کو اجاگر کرتے ہیں۔

عورت، عورت، عورت ایک بیل ہے جو خشک درخت کے گرد لپیٹ کر اسے تازگی اور زینت بخشتی ہے۔ وہ ایک دھونی ہے کہ محبت کی لپیٹ سے مرد کو گھیر لیتی ہے۔☆۹۶

نیاز فتح پوری:

نیاز فتح پوری کا شمار اُردو کے ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے رومانی افسانوں کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے ۱۹۶۲ء-۱۸۸۴ء تک کے عرصے میں افسانے لکھے۔ اپنی ادبی تخلیقات کو انھوں نے صرف رومانی افسانہ نگاری

ہی تک محدود نہیں رکھا، بلکہ:

نیاز کی رومانیت نے کئی سرچشموں سے فیض حاصل کیا اور ادب میں اس کا متنوع اظہار یوں ہوا کہ انھوں نے پہلے شاعری کی، پھر ناول اور افسانے لکھے اور جب نگار جاری کیا تو انھوں نے ادب اور زندگی کی تنقید کے علاوہ علمی موضوعات کو بھی رومانی نقاد کی طرح کھنگالنے کی کوشش کی۔☆۹۷

جہاں تک رومانی افسانہ نگاری کا تعلق ہے تو انھوں نے ابتدا میں انگریزی، فارسی اور ترکی زبان کے افسانوں کا ترجمہ کر کے افسانوی ادب کی دنیا میں قدم رکھا۔ انھوں نے ٹیگور کے تراجم بالخصوص ''گیتا نجلی'' کا ترجمہ خاص اہمیت کا حامل ہے، ترکی کی شاعری نگار بنتِ عثمان کی شاعری کے اثرات بھی ان کی تحریروں میں موجود ہیں۔

جب ان کے افسانوں اور دیگر اصناف کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی تحریروں پر انگریزی ادب کے مطالعہ اور رجحانات نے گہرے اثرات چھوڑے۔ انھوں نے مشرقی تہذیب وتمدن اور ماحول سے کنارہ کشی کر کے مغربی انداز اور ماحول کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔

نیاز کی رومانیت کی خصوصیت تخیل اور صرف تخیل سے عبارت ہے انھوں نے پرتو جمال کا مشاہدہ خود اپنی آنکھوں سے کرنے کی کوشش کی تو انھیں فطرت کا حسن کائنات کے ذرے ذرے میں بکھرا ہوا نظر آیا اور وہ اس سرسراتی کیفیت کو، جو محسوس تو کی جا سکتی ہے لیکن گرفت میں نہیں آتی، ادب میں پیش کرنے لگے۔☆۹۸

نیاز فتح پوری کے افسانوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے افسانوں میں زیادہ کردار نہیں ہوتے۔ ان کے افسانے پڑھ کر یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ انھوں نے کہانی سے زیادہ فلسفیانہ خیالات کو بیان کرنے پر توجہ دی ہے۔ اپنے وسیع مطالعے کی وجہ سے ان کے افسانوں میں علمی بحث بھی نمایاں نظر تی ہے۔ جیسا کہ ان کے بارے میں علی سردار جعفری نے کہا ہے:

نیاز فتح پوری کے افسانوں سے متعلق یہ نہیں معلوم کہ انھیں کہاں جگہ دینی چاہیے۔ کیوں کہ وہ ۳۰۰ قبلِ مسیح کے نیچے بات ہی نہیں کرتے اور اگر آج کل کا کوئی آدمی پیش کرتے ہیں تو وہ ہم جیسا نہیں ہوتا، کریکٹر کچھ اس قسم سے الجھا ہوتا ہے کہ خاک سمجھ میں نہیں آتا کہ کس قسم کا آدمی ہے۔☆۹۹

یلدرم، مجنوں گورکھ پوری اور سجاد انصاری کی طرح نیاز فتح پوری نے عورت کو مجسم حسن قرار دیا اور عورت کے حسن و جمال کو اپنی تحریروں میں خوب صورت تشبیہات اور استعارات کے ساتھ بیان کیا ہے، جیسا کہ انھوں نے اپنے افسانے ''نگارستان'' میں لکھا ہے:

عورت ایک رومانیت ہے قابلِ لمس نورانیت ہے، صاحبِ ناطق، ایک روشنی ہے جسے ہم چھو سکتے ہیں،
ایک حلاوت ہے جو ہاتھوں سے چکھی جاتی ہے ایک موسیقی ہے جو نگاہوں سے سنی جاتی ہے۔☆۱۰۰

سجاد حیدر یلدرم کے برعکس نیاز کی رومانیت شدید جذباتی اور ہنگامہ خیز انداز میں نظر آتی ہے، لیکن وہ محبوب کے حصول کو محبت کی منزل نہیں کہتے، بلکہ محبوب کے تصوّر ہی کو وہ محبت کی خوشی اور قرار سب کچھ سمجھتے ہیں۔

قاضی عبدالغفار:

قاضی عبدالغفار ان رومانی افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے رومانیت کو ایک نئے رجحان سے روشناس کریا اور اپنے افسانوں میں داخلیت کے علاوہ خارجیت کو بھی جگہ دی۔

قاضی عبدالغفار کے افسانے اس زمانے کی یادگار ہیں جب رومانی تحریک پر حقیقت نگاری کے اثرات پڑنا شروع ہو گئے تھے۔ انھوں نے انسان کے ظاہر سے زیادہ باطنی کیفیات اور انسان کی سیرت و کردار کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ ''لیلیٰ کے خطوط'' اور ''مجنوں کی ڈائری'' ان کی ایسی تخلیقات ہیں جس میں مشرقی اور مغربی تہذیب کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ سبطِ حسن نے ان کے بارے میں کہا ہے:

قاضی عبدالغفار کا ذہن مغربی لیکن دل مشرقی تھا۔☆۱۰۱

حقیقت نگاری کی طرف مائل ہونے کے باوجود ان کے افسانوں میں رومانیت کے مختلف عناصر جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ رومانیت سے مکمل طور پر علیحدہ نہیں ہو سکتے تھے۔

عبدالغفار کے ہاں رومانوی طرزِ نگارش کا تمام تر سرمایہ اپنے پورے شباب پر ملتا ہے۔ ان میں
جذباتی وفور ہے اور خوب صورت اور شدید تأثرات ہیں، زندگی سے بیزاری اور بغاوت ہے،
رومانوی سرمستی اور رنگینی ہے، لیکن اس کے اختتامیہ حصّوں میں بڑا توازن اور عقلیت ملتی ہے،
اور یہ اس دور کی رومانویت پر ایک اضافے سے کم نہیں۔☆۱۰۲

حجاب امتیاز علی:

حجاب امتیاز علی کے افسانوں کا اصل موضوع محبت ہے۔ ان کے افسانوں میں محبت اور تخیل کی فضا ایک سحر انگیز ماحول بنا دیتی ہیں۔ ان کے تخیلی کردار محبت اور ہمدردی کے جذبہ سے معمور نظر آتے ہیں۔ جذبہ محبت ان کے ہاں بغاوت کے بجائے فطری تقاضا نظر آتی ہے۔

> ان کا تصوّرِ محبت لطافتوں اور رعنائیوں کا مرقع جمیل ہے یہ وہ لرزاں کیفیت ہے جس کے تال پر حجاب کے کرداروں کے دل بیک لحمہ دھڑکتے ہیں اور دنیا کی حرکت کو روک دیتے ہیں۔ مجموعی طور پر حجاب کا رومانی تخیل ہے بے ساختہ اور تخلیقی ہے۔ ان کے کردار تخیلی ہونے کے باوجود انسانی ہمدردی کے جذبات سے معمور نظر آتے ہیں۔☆۱۰۳

یوں تو حجاب نے زندگی کے مصائب اور تکالیف کو بھی اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے لیکن انھوں نے زندگی کی مثبت قدروں اور تصوّراتی دنیا کو زیادہ اہمیت دی ہے، اور رومانی افسانہ نگار ہونے کے باوجود انھوں نے رومانیت میں مشرقی ماحول اور تہذیب و تمدن کو زیادہ اہمیت دی۔

> حجاب امتیاز علی مشرقی پس منظر میں مغربی افکار لیے ہمارے سامنے آئیں۔ ان کی رومانیت ''بندۂ مومن'' کی طرح سادہ و معصوم ہے، اور جذباتی وفور سے سرشار۔☆۱۰۴

دوسرے افسانہ نگاروں کی طرح جب حجاب کے رومانی افسانوں کو بھی حقیقت پسند ادبا نے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھنا شروع کیا تو حجاب پر اس ردِّعمل کا کوئی اثر نہ ہوا اور انھوں نے اپنے اسلوب اور افسانوں میں رومانیت میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کی، اور زندگی کے مسائل اور حقائق پر خاص توجہ نہ دی۔

> ...مگر حجاب امتیاز علی اسی طرح اپنے رنگین بلور کے پنجرے میں بیٹھی روحی اور وسطی ایشیائی دوپہروں اور کرلاتی ہوئی ابابیلوں کے قصے کہتی رہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اور باہر سب کچھ ویسے کا ویسا ہو۔☆۱۰۵

جب رومانیت کی جگہ حقیقت پسندی نے لے لی تو حجاب کے رومانی افسانوں کی حیثیت اتنی ہی تیزی سے گری۔ موضوع، کردار، اسلوب ہر لحاظ سے ان کے افسانے بے جان اور بے معنی نظر آنے لگے، اور ان کا نام اُردو کے بڑے افسانہ نگاروں کی فہرست سے خارج کر دیا گیا۔

اُردو کے چند رومانی افسانہ نگاروں نے بھی ہندو مسلم فسادات کے موضوع پر افسانے لکھے۔ جس زمانے میں رومانی تحریک عروج پر تھی وہ زمانہ ۱۹۴۷ء کے فسادات سے پہلے کا زمانہ، لیکن اس زمانے میں ہندو مسلم قوموں کے درمیان تعصب پیدا ہو چکا تھا جو روز بروز دونوں قوموں کو ایک دوسرے سے متنفر کرنے میں اہم کردار ادا کر رہا تھا۔ شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں اسی زمانے میں چلائی گئی تھیں۔

اس لیے اس زمانے میں جن افسانہ نگاروں نے فسادات کے موضوع پر افسانے لکھے ان میں اسی ماحول کی عکاسی کی ہے جب ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کبھی نہ ختم ہونے والے فاصلے پیدا ہو گئے تھے۔

رومانی افسانہ نگاروں نے اپنی رومانی سوچ کے مطابق اس نفرت اور دوری پر دکھ کا اظہار کیا اور اپنے افسانوں میں جب فسادات کے موضوع کو چھیڑا تو اس پر سیاسی پروپیگنڈے اور سیاسی واقعات کا سایہ بھی نہ پڑنے دیا، بلکہ اپنے افسانوں کے ذریعے ہندو اور مسلم قوم کو امن اور دوستی کا پیغام دیا اور سیاسی شعور اور سیاسی مسائل کو ادب کے ذریعے پھیلانے کے بجائے ایک مصلح کا کردار ادا کیا۔

جن افسانہ نگاروں نے فسادات کے موضوع پر افسانے لکھے ان کی تعداد بہت کم ہے۔ سلطان حیدر بخش جوش، مجنوں گورکھ پوری، اعظم کریوی اور سدرشن ایسے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے فسادات کے موضوع پر لکھا تو ہے لیکن چند ایک افسانے لکھنے پر ہی اکتفا کیا ہے۔

سلطان حیدر جوش:

سلطان حیدر جوش کا شمار بھی اُردو کے ابتدائی رومانی افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے انھوں نے دو افسانوی مجموعے لکھے۔ ''فسانہ جوش'' ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ چھ افسانوں اور نو مضامین پر مشتمل ہے۔ جب کہ دوسرا مجموعہ ''فکرِ جوش'' چھ افسانوں اور چھ مضامین پر مشتمل ہے۔

''نابینا بیوی'' ان کا پہلا افسانہ ہے جو ۱۹۰۷ء میں ''مخزن'' میں شائع ہوا۔ ☆۱۰۶

ان کے افسانے پڑھ کر اور مضامین پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں مشرقی تہذیب و تمدن اور رسم و رواج سے محبت تھی۔ اس لیے انھوں نے عورت کی شرم و حیا کو بھی اس کا حسن اور زیور کہا۔ جوش مغربی تہذیب اور ماحول کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے وہ اپنی تحریروں کے ذریعے مغربی تہذیب پر طنز کرتے رہے۔

> جوش اپنا سارا زورِ قلم مغربیت کی تقلید کے خلاف آواز اُٹھانے میں صرف کر دیتے ہیں اور اصلاح کی دھن میں افسانے کے فن کو پسِ پشت ڈال کر سیدھے سیدھے تبلیغ پر اتر آتے ہیں۔ ☆۱۰۷

افسانہ نگاری میں ان کی اصلاحی کاوشوں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے سر سیّد کی طرح معاشرے کی اصلاح کا بیڑا اپنے سر اٹھا رکھا تھا۔

احتشام حسین نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

> جوش کے افسانوں پر علی گڑھ تحریک کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ ☆۱۰۸

جوش کی اصلاحی تحریروں اور مغربی معاشرے کے خلاف تبلیغ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ جوش

اگر چہ رومانی افسانہ نگار تھے لیکن اس کے باوجود انھیں سیاست سے بھی دل چسپی تھی اور اپنی تحریروں میں بھی انھوں نے سیاسی موضوعات کو جگہ دی۔

ملک کے سیاسی حالات سے دل چسپی رکھنے کی وجہ سے انھوں نے ہندو مسلم فسادات کے موضوع پر زیادہ تو نہیں لیکن چند ایک افسانے لکھے۔ ان افسانوں میں انھوں نے ہندو مسلم فسادات کا ذکر تو کیا ہے لیکن ان افسانوں میں انھوں نے ان فسادایت کے خلاف نفرت کا اظہار کیا اور انسانیت کی توہین قرار دیا۔

''کرسی اور ٹوپی'' اور ''جذبۂ کور'' فسادات کے موضوع پر لکھے جانے والے افسانے ہیں۔

''کرسی اور ٹوپی'' اگر چہ فسادات کے موضوع پر لکھے جانے والا افسانہ ہے لیکن اس افسانے میں بھی انھوں نے کہانی سے زیادہ اصلاح معاشرہ کا زیادہ خیال رکھا ہے یہی ہے کہ کہانی کسی انجام پر پہنچے بغیر ہی ختم ہوگئی۔

مولوی حیات اور ''میں'' اس افسانے کے خاص کردار ہیں عام زندگی میں مولوی حیات ایک مذہبی، پرہیزگار اور اسلامی اصواور قواعد کا پابند انسان ہے، لیکن اصل میں وہ انگریزوں کا فرمانبردار ہے اور اسی وجہ سے انگریز اسے اعلیٰ عہدے پر فائز کر دیتے ہیں۔

جب کہ دوسرا کردار ''میں'' مذہب کی بنیاد پر ہندو مسلم تفریق کو غیر ضروری قرار دیتا ہے۔ پورا افسانہ ان کرداروں کی بحث پر مشتمل ہے جو افسانے کا اختتام تک جاری رہتی ہے۔

''جذبۂ کور'' اس افسانے میں مسلمان کردار سلیم ہندو لڑکی جانکی کا شوہر ہے دونوں میں مذہبی اختلاف ہونے کے باوجود شدید محبت تھی۔

اس افسانے میں جوش نے محبت کو مذہب سے زیادہ طاقت وَر قرار دیا ہے، اور بظاہر ان کا مقصد یہ ہے کہ اگر محبت و آشتی سے کام لیا جائے تو مذہبی منافرت اور اس کے نتیجے میں فرقہ وارانہ فسادات کے پیدا ہونے کا سوال ہی نہیں، لیکن کیا ایسی محبت بھری فضا اور مذہب نا آشنا ماحول کسی معاشرے میں وجود میں آ سکتا ہے؟ یہ مزاج تمام انسانوں میں کس طرح پیدا کیا جائے؟ یہ بھی ایک رومانی خواب ہے جو ترقی پسندوں کے ''غیر طبقے وارانہ معاشرے'' کے وجود کی طرح ناقابلِ عمل ہے۔

مجنوں گورکھ پوری:

مجنوں گورکھ پوری کے افسانوں کا اصل موضوع محبت ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے مختلف افسانے لکھے ہیں۔ ان افسانوں کے کردار مختلف مسائل کا شکار نظر آتے ہیں عشق و محبت کے معاملات میں بھی عاشق اور معشوق کو ناکامی اور دکھ کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، اور اگر خوشی حاصل بھی ہوتی ہے تو لمحوں کے لیے جس کے بعد ساری عمر کے لیے افسوس اور پچھتاوے باقی

رہ جاتے ہیں۔

> انھوں نے عورت اور مرد کی محبت کے ایسے افسانے لکھے ہیں جن میں مردوں اور عورتوں نے مذہب، ملّت اور طبقاتی اونچ نیچ کے فرق اور اختلاف یا سماجی رشتوں کی نزاکت کی پروا کیے بغیر محبت کا رشتہ جوڑا ہے، لیکن سماج کے قانون ہمیشہ ان کی راہوں میں حائل ہوئے ہیں اور ان کی محبت کو حزن و غم یا مرگِ بے بسی پر ختم کیا ہے۔☆۱۰۹

ان کے افسانوں کے کردار مسلسل ناکامیوں کے بعد بے عمل اور مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں اس نفسیاتی ردِ عمل کو انھوں نے اپنے افسانوں میں خاص جگہ دی ہے ''سمن پوش''، ''شکست کے بعد''، ''بیگانہ''، ''خواب و خیال'' اور ''تم میرے ہو'' ان کے وہ افسانے ہیں جن کے کردار اپنے خوابوں کی تعبیر نہ پانے کے بعد یا تو نفسیاتی مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں یا پھر افسانے کا انجام ان کی موت پر ہوتا ہے۔ مجنوں کے افسانوں کے بعض کردار خودکشی کا بھی انتخاب کرتے ہیں۔

> یلدرم، حجاب امتیاز علی، نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھ پوری نے اُردو افسانے کو ایک ماورائی فضا میں محدود کر دیا تھا۔ ان کے کردار جذباتی ہیں۔ وہ ذرا سے واقعے پر اُبل پڑتے ہیں اور فلسفیانہ تقریریں کرنے لگتے ہیں۔ وہ چلنے پھرنے اور محبت کرنے سے زیادہ سوچنے کے عادی ہیں۔☆۱۱۰

مجنوں کی تحریروں میں فلسفیانہ خیالات و افکار نظر آتے ہیں جو ان کے افسانوں کو دوسرے افسانہ نگاروں سے ممتاز کرتے ہیں۔ محبت جو مجنوں کا پسندیدہ موضوع ہے، اس کے بارے میں بھی انھوں نے فلسفیانہ خیالات کا اظہار کیا ہے، اور محبت کی تقدیس کے قائل ہونے کے باوجود انھوں نے شادی، جو مشرقی معاشرے میں محبت کی منزل سمجھی جاتی ہے۔ غیر ضروری قرار دیا ہے۔

> شادی تو دنیا کا کاروبار ہے، اِسے محبت سے کیا سروکار ہے۔☆۱۱۱

مجنوں نے فرقے وارانہ موضوع پر بھی ایک افسانہ ''محبت کی قربانیاں'' کے نام سے لکھا۔ ہندو مسلم فسادات کے موضوع پر لکھے جانے والے افسانے میں ایک ہندو لڑکی اور مسلمان لڑکے کی محبت مذہبی تفریق کی وجہ سے ناکام ہو جاتی ہے۔

سدرشن:

سدرشن کا شمار اُردو کے ابتدائی افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے افسانے صرف فن کی خدمت کے لیے نہیں، بلکہ اصلاحِ معاشرے کے لیے بھی لکھے۔ اپنے افسانوں میں وہ نیکی اور بھلائی کی تلقین اور برائیوں سے بچنے کی تبلیغ کرتے ہیں۔
انھوں نے اپنے افسانوں کو صرف دیہاتی ماحول کے افسانوں تک محدود نہیں رکھا، بلکہ شہر کی زندگی اور اس کے مسائل

وغیرہ کو بھی انھوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ان افسانوں کے کرداروں کا تعلّق متوسّط طبقے کے ہندو خاندان سے ہے۔ان کرداروں کی جذباتی کیفیات کو بھی انھوں نے گہرے مطالعے کے بعد پیش کیا ہے۔زبان کی سادگی عام فہم انداز نے ان کے افسانوں کی خوبیوں میں اضافہ کر دیا ہے اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں انھوں نے افسانے لکھے۔

> سدرشن کے یہاں دیہاتی اور شہری دونوں کردار ملتے ہیں۔غریبی اور امیری کا تضاد، انسانی ضمیر کی بے چینی، سکون اور طمانیت ان کے افسانوں کے خاص موضوع ہوتے ہیں۔نیک انسان اور بد انسان کی زندگی ہی سدرشن کے افسانوں کی زندگی ہے۔☆۱۱۲

ہندو مت میں ذات پات کے فرق کی وجہ سے جو طبقاتی نظام قائم ہو چکا تھا اسے انھوں نے سخت ناپسند کیا۔اپنے افسانوں کے ذریعے انھوں نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان کی عظمت اور برائی اس کے کردار اور عمل کی وجہ سے ہوتی ہے اعلیٰ ذات پات کو انھوں نے بے معنی اور غیر ضروری قرار دیا۔انھوں نے انسانی جذبات اور اس کے عمل کو سب سے زیادہ اہمیت دی:

> ایک زمانے میں انھیں اُردو کا سب سے بڑا افسانہ نویس کہا جاتا رہا ہے۔☆۱۱۳

''سدا بہار پھول''، ''بہارستان''، ''چندن''، ''قوس و قزح''، ''سولہ سنگھار''، ''چشم و چراغ'' اور ''پھول وتی'' ان کے افسانوں کے مجموعوں کے نام ہیں۔

جہاں تک ہندو مسلم فرقہ وارانہ موضوع کا تعلّق ہے تو اس پر بھی انھوں نے ''پھول دتی'' کے نام سے ایک ہی افسانہ لکھا۔ان کا یہ افسانہ بھی ہندو ذات پات اور ساتھ ہی مسلمانوں اور ہندوؤں کے دوستانہ تعلّقات کو مذہبی اور سماجی لحاظ سے ناپسند کرنے والوں کے خلاف ایک طرح کا احتجاج ہے۔

اس افسانے کا اہم کردار پھول وتی ہے جو ایک مالی بسنت کی بیٹی ہے جس کی شادی بنارس کے راجا کے بیٹے سے ہو جاتی ہے لیکن اس سے پہلے اسے مختلف لوگ مختلف قسم کی تکلیفیں پہنچاتے ہیں لیکن وہ زندگی کے نشیب و فراز کا بہادری سے مقابلہ کرتی ہے اور سچائی اور ایمان داری کا دامن کبھی نہیں چھوڑتی، اور جن لوگوں سے اسے دکھ اور تکلیف پہنچتی ہے وہ ان سب کو معاف کر دیتی ہے جب پھول وتی کے دشمن اس پر چوری کا الزام لگا کر اسے شہر بدر کر دیتے ہیں تو چوہدری کمال اسے اپنے گھر پناہ دیتا ہے۔

ہندو اور مسلمان دونوں چوہدری کمال کی اس مہربانی کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ہندو چوہدری کمال کو اس بات کا طعنہ دیتے ہیں کہ اس نے مسلمان ہو کر ایک ہندو لڑکی کو پناہ دے کر اسلامی اصولوں کی خلاف ورزی کی ہے۔جب کہ ہندو پھول وتی کو یہ طعنہ دیتے ہیں کہ اس نے ایک مسلمان کے گھر میں پناہ لے کر ہندو عقائد کے خلاف قدم اٹھایا ہے۔

چوہدری کمال اور پھول وتی لوگوں کی مخالفت کی پروانہیں کرتے۔ چوہدری بھی اسے عزت کے ساتھ اپنے گھر میں پناہ دیتا ہے اور پھول وتی بھی اس کے خلوص کی قدر کرتی ہے۔

اس افسانے کو ہم فرقہ واریت کے موضوع پر لکھے جانے والے آئندہ افسانوں کی فہرست میں تو شامل نہیں کر سکتے۔ البتہ سدرشن کی رومانی سوچ اور فرقہ واریت سے نفرت کا اظہار ضرور کہہ سکتے ہیں۔

اعظم کریوی:

اعظم کریوی کا شماران افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے معاشرتی برائیوں کے خلاف آواز اُٹھائی۔ ان کے اصلاحی انداز میں پریم چند جیسی گہرائی تو نہیں لیکن پھر بھی جن حقائق اور مسائل کو انھوں نے بیان کیا ہے وہ بھی جرأت اور شدید احساس کو ظاہر کرتا ہے۔

اعظم کریوی نے بھی پریم چند، سدرشن کی طرح دیہاتی ماحول کی مختلف خصوصیات کو افسانوں میں بیان کیا ہے دیہاتی ماحول کے اعلیٰ وادنیٰ طبقوں کے آپس کے تعلقات، سرمایہ دارز میں داروں کا اپنے مزارعوں کے ساتھ سخت رویّہ اور ظلم وستم اور غریب دیہاتیوں کا صبر اور خاموشی سے سب کچھ سہہ جانا۔ وغیرہ ایسے تلخ حقائق ہیں جن کو اعظم کریوی نے افسانوں کے ذریعے دوسروں کو بتایا ہے۔

اِن تلخ حقائق کے علاوہ انھوں نے دیہات کی کئی خوب صورتیوں اور دلکشیوں کو بھی بیان کیا ہے جو دیہات ہی کی خاص سوغات ہیں۔ یہ خوب صورتیاں دیہاتی لوگوں کی سادگی اور معصومیت، دیہات کی رسمیں، لوگوں کا مل جل کر رہنا اور دکھ سکھ میں دوسروں کے کام آنا وغیرہ وہاں کے کرداروں کی ظاہری خوبیاں ہیں۔

اسی طرح دیہات کے سرسبز وشاداب کھیت، نہریں، ندیاں اور خوب صورت نظارے ہرے بھرے راستے افسانے کی فضا کو رومانی اور سحر انگیز کر دیتے ہیں۔

''پریم کی چوڑیاں''، ''کنول کے پھول''، ''دکھ سکھ''، ''دل کی باتیں''، ''روپ سنگھار'' ان کے افسانوں کے مجموعوں کے نام ہیں۔

فرقہ واریت کے موضوع پر انھوں نے ایک ہی افسانہ ''شیخ و برہمن'' لکھا ہے۔ ان کا یہ افسانہ دیہات میں رہنے والے ہندو اور مسلم گھرانوں کی باہمی محبت کے بارے میں ہے جنھیں مسلمان مولویوں اور ہندو پنڈتوں نے مذہب کی بنیاد پر ختم کرنے کی کوشش کی۔

''شیخ و برہمن'' میں شیخ منیر اور پنڈت دیاشنکر ایک دوسرے کے گہرے دوست ہیں۔ دونوں دوست ایک دوسرے

سے مشورہ کیے بغیر کوئی کام نہیں کرتے یہاں تک کہ پنڈت کے گھر میں جب نرائن کتھا ہوتی تو وہ سارے انتظامات شیخ ہی کے مشورے سے کرتا۔ اسی طرح جب شیخ منیر کے گھر میں میلاد شریف کرایا جاتا تو وہ بھی پنڈت سے صلح مشورہ ضرور کرتا۔ دونوں نے اپنے اپنے بیٹوں کی شادی میں ایک دوسرے کو گواہ بھی بنایا۔ دونوں کی محبت اور دوستی ان کے بیٹوں کو بھی ایک دوسرے کا دوست بنا دیتی ہے اور پنڈت اور شیخ کے مرنے کے بعد بھی ان کی یہ دوستی قائم رہتی ہے۔ اسی دوران شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع ہو جاتی ہیں گاؤں کے بے خبر لوگوں کو ایک دن شہر سے آیا ہوا پنڈت ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف اکسانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ دیہات کے ہندو اور سنگھٹن کی تحریک میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ہندوؤں کو اپنے خلاف ہوتا دیکھ کر مسلمان بھی ہندوؤں سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ پنڈت اور مولوی اپنے اپنے مذہب کی حفاظت اور بڑائی کے لیے ایک دوسرے سے الگ ہونے اور نفرت کرنے کو ہی بہترین عمل قرار دیتے ہیں۔

ایک دن ذرا سی بات پر شنکر کے بیٹے اور شیخ کے بیٹے کے ساتھیوں کا آپس میں جھگڑا ہو جاتا ہے اور دونوں مذہب کی خاطر جان کی بازی لگانے کو تیار ہو جاتے ہیں لیکن شیخ اور پنڈت کی بیویاں اپنے اپنے بیٹوں کی لڑائی ختم کروا دیتی ہیں، اور ہندوؤں اور مسلمانوں سے رو رو کر پہلے کی طرح محبت سے رہنے کی التجا کرتی ہیں جس سے دونوں فرقوں کے لوگوں کے دل پسیج جاتے ہیں اور وہ اپنی سوچ پر شرمندہ ہوتے ہیں اور پھر سے دوستوں کی طرح رہنا شروع کر دیتے ہیں۔

اس افسانے میں اعظم کریوی ایک رومانی افسانہ نگار کی حیثیت سے یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ انسان چاہے کسی بھی مذہب یا قوم سے تعلق رکھتا ہو اگر وہ پیار و محبت سے رہنا چاہے تو سارے فرق خود بہ خود ختم ہو جاتے ہیں۔

رومانی افسانہ نگاروں نے فسادات کے موضوع پر جو افسانے لکھے ہیں۔ ان افسانوں میں بھی اگرچہ ہندو مسلم تعصب اور نفرت کے نتیجے میں ہونے والے فسادایت کا ذکر کیا گیا ہے، لیکن وہ افسانے اس انداز میں لکھے گئے ہیں کہ وہ کہانی، کردار اور انجام ہر لحاظ سے فسادات کی فضا سے مطابقت نہیں رکھتے، بلکہ رومانی فضا کو برقرار رکھنے کے چکر میں وہ موضوع کا تقاضا پورا نہیں کر سکے، اور فسادات کے موضوع پر لکھے جانے والے افسانوں میں بھی تخیلی اور تصوّراتی کہانیوں کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہیں جس کی وجہ سے یہ افسانے بے وقت کی راگنی لگتے ہیں۔

❁ ❁ ❁

د: موضوعات

(۱) قتل و غارت گری:

جیسے جیسے تحریکِ پاکستان زور پکڑتی گئی ہندو مسلم اختلافات بھی بڑھتے گئے۔ قومیت کے احساس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے متنفر کر دیا تھا، اور صدیوں پرانے تعلّقات دشمنی میں تبدیل ہو گئے۔

تقسیمِ ہند کے اعلان کے ساتھ ہی ان اختلافات نے فسادات کی شکل اختیار کر لی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کو قتل کر کے نفرت کی آگ بجھائی۔ نفرت اور تعصب کے نشے میں انھوں نے انسانیت اور حیوانیت کے فرق کو بھی مٹا دیا۔

ہندو مسلم فسادات اور قتل و غارت گری پر ڈاکٹر شائستہ سہروری نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

> وہ ننھے بچّے جنھوں نے اپنے ماں باپ کو اپنی نظروں کے سامنے قتل ہوتے دیکھا تھا۔ جنھوں نے انسانیت کو بہیمیت کے آخری درجے پر گرتے دیکھا ہے۔ وہ بچّے جن کی ماؤں کی چھاتیاں ان کے سامنے کاٹی گئی ہیں اور مائیں جن کے بچّے ان کے آگے نیزوں پر اچھالے گئے ہیں کیا وہ کبھی خون کی نظروں کے سوا کسی اور نظر سے سوسائٹی کو دیکھ سکیں گے کیا کبھی پھر ان کے دلوں میں انسان کے رحم کا اعتبار پیدا ہو سکے گا۔ ☆۱۱۴

ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو قتل کرنے کے لیے صرف چاقو، کرپان یا گولیوں کا استعمال نہ کرتے، بلکہ کنوؤں میں زہریلا پانی ڈال دیا جاتا۔ ہجرت کے دوران بہت سے لوگ زہریلا پانی پی کر بھی مرے۔ بہت سے لوگ بھوک، پیاس، خوف اور صدمے سے بھی ہلاک ہوئے۔

ایسے لوگوں کی بھی کمی نہ تھی جن کے گھروں کو آگ لگائی گئی اور وہ اپنے گھروں کے ساتھ جل کر خود بھی راکھ ہو گئے۔

یہ تلخ حقائق افسانہ نگاروں سے چھپے ہوئے نہیں تھے۔ عوام کی طرح انھوں نے بھی قتل و غارت، ظلم و جبر اور انسان کے حیوان بن جانے پر افسوس کا اظہار کیا اور اس مسئلے کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

اس سلسلے میں سب سے اہم نام سعادت حسن منٹو کا ہے۔ انھوں نے قتل و غارت گری کے موضوع پر ''سیاہ حاشیے'' کے نام سے مختصر افسانچوں پر مشتمل ایک کتاب لکھی۔ جس میں افسانوں کے مختلف ظالمانہ رویّوں کو دکھایا گیا ہے۔

منٹو کے علاوہ کرشن چندر نے بھی ''ہم وحشی ہیں'' کے نام سے افسانوں کا مجموعہ پیش کیا جس کے بیش تر افسانوں میں انھوں نے انسان کے وحشی ہو جانے کا ذکر کیا ہے۔

مہندر ناتھ کے افسانوں کا مجموعہ ''پاکستان سے ہندوستان تک'' بھی ہندو مسلم فسادات کے موضوع پر لکھا گیا ہے، اور ان کے افسانوں کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔

اس کے علاوہ منٹو کا افسانہ ''۱۹۱۹ء کی بات'' اور ''گورمکھ سنگھ کی وصیت'' خواجہ احمد عباس کا ''اجنتا''، شوکت صدیقی کا ''تانتیا'' اشفاق احمد کا ''گڈریا'' اس سلسلے کے شاہ کار افسانے ہیں۔

جیکسن

کرشن چندر نے فسادات کے موضوع پر ''جیکسن'' نامی افسانہ لکھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام سے لے کر تقسیمِ ہند تک انگریز جتنا عرصہ بھی ہندوستان میں رہے انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف خوب بھڑکایا انھوں نے جب بھی متحد ہونے کی کوشش کی انگریزوں نے ان کے درمیان تفریق پیدا کی۔ ان کی نااتفاقی انگریزوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی اور انھوں نے طویل عرصے تک ہندوستان میں حکومت کی۔ انگریزوں کی اسی چال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کرشن چندر نے یہ افسانہ لکھا ہے۔

جیکسن، مولانا پیرزادہ اور نہال چند کھوکھری افسانے کے خاص کردار ہیں۔

افسانے کا کردار جیکسن پولیس میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہے۔ اس نے بیس سال تک ہندوستان میں ملازمت کی جہاں اسے زندگی کی ہر سہولت اور آسائش میسّر آئی لیکن اس کے باوجود وہ ہندوستان کی سرزمین، ماحول اور یہاں کے لوگوں سے متنفر تھا۔ جیکسن نے اپنی بیٹیوں کو تربیت بھی ایسے کی تھی کہ وہ مغربی ماحول اور مغربی لوگوں کو پسند کرنے لگی تھی، اور ہندوستان کے ماحول اور لوگوں سے انھیں بھی نفرت تھی۔ جیکسن ہندوستان اور ہندوستانی بیوی کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر انگلستان جانا چاہتا تھا، اور اس کی بیٹیاں بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر ہی چلنا چاہتی تھیں۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء میں چند روز باقی تھی اور جیکسن کو پتا چل گیا تھا کہ اب انگریزوں کی بادشاہت اپنے اختتام کو پہنچ گئی ہے، لیکن اب بھی جتنے دن باقی تھے وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانا چاہتے تھے۔

جو ہندو اور مسلمان انگریزوں کی سازشوں کا شکار ہوئے ان میں لاہور کے ہندوؤں کا لیڈر مہاشے نہال چند کھوکھری اور لاہور ہی کے ایک مولوی اللہ داد پیرزادہ بھی شامل تھے۔

مہاشے نہال چند کھوکھری بظاہر تو ہندوؤں کا لیڈر رہے، اور وہ جیکسن کے پاس لاہور میں رہنے والے ہندوؤں کی

ہندوستان میں ہجرت کے سلسلے میں مدد طلب کرنے آیا تھا لیکن جب اسے جیکسن سے کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا تو اس کی ہندو قوم سے ہمدردیاں سمٹ کر اپنی ذات اور خاندان والوں تک رہ گئیں۔

اگر ہم سب کی مدد آپ نہ کر سکتے ہوں تو میرے خاندان کو تو یہاں سے نکلوا دیجیے۔ میں ہوں، میری بیوی ہے، دولڑکے ہیں، ایک داماد ہے، میری لڑکی ہے اور ہمارا ریشمین کتا ہے۔ ہم لوگ ہوائی جہاز سے چلے جائیں گے یا ملٹری ٹرک سے، باقی لوگوں کو آپ ریل گاڑی سے یا پیدل یا جتھے کی صورت میں بھیج دیجیے، مگر ہمیں پہلے روانہ کر دیجیے۔☆ ۱۱۵

جیکسن نے بات کا رخ بدل کر مہاشے نہال چند کو مسلمانوں سے لڑنے اور مقابلہ کرنے کے لیے اکساتے ہوئے کہا:

آپ بھاگتے کیوں ہیں۔ جم کر مقابلہ کیوں نہیں کرتے۔ حرام زادے مسلموں کا... ہم آپ کی ضرور مدد کریں گے...لاہور پر دراصل ہندوؤں کا حق ہے...لاہور ہندوؤں نے بنایا...اس کی ساری رونق ہندوؤں کے دم سے ہے۔ وہی لاہور کے مالک ہیں، انھی کو اس میں رہنا چاہیے۔ مردوں کی طرح سے لڑیے مہاشے جی۔☆ ۱۱۶

مہاشے نہال چند اور اس کے ہندو ساتھی مسلمانوں کے چھروں اور رائفلوں سے خوف زدہ تھے جیکسن نے انھیں مسلمانوں سے لڑنے کا حوصلہ دیتے ہوئے کہا:

میں نے ٹیلی فون کرا دیا ہے ابھی اسلحہ جات کی بھری ہوئی ایک ملٹری لاری آپ کے ساتھ بھیجتا ہوں، اور ایک آدمی بھی جو آپ کے آدمیوں کو تربیت بھی دے سکے گا۔☆ ۱۱۷

اور یوں نہال چند نے جو بیس ہزار روپے لاہور سے امرت سر تک خیریت سے پہنچانے کے لیے جیکسن کو دیے تھے اس کے بدلے میں جیکسن نے اسے جدید ہتھیار اور اسلحے کا تحفہ دیا تا کہ اس اسلحے سے نہال چند خود بھی خطروں سے کھیلے اور مسلمان بھی زیادہ سے زیادہ تعداد میں مریں۔

نہال چند کے بعد مولانا اللہ داد پیرزادہ بھی جیکسن کے پاس اپنی ذاتی اغراض اور کسی حد تک مسلمانوں کی خوش حالی اور دفاع کے لیے آئے لیکن ان حالات میں دونوں کو مذاق سوجھ رہا تھا۔ جیکسن کا کہنا تھا:

''...اور تم کیا کہو گے۔ سنا ہے کہ آج کل ہر روز ایک نئی ہندو کنواری...اللہ دیتا ہے۔'' پیرزادہ مسکرا کر پیگ اپنی آنکھوں کے سامنے لایا۔☆ ۱۱۸

جواباً مولانا پیرزادہ نے بھی مذاق کرتے ہوئے کہا:

''...آج کل سنا ہے لاہور کے ہر پولیس کے سپاہی کے پاس لوٹ لیا ہے کہ اب سات پشتوں

کے لیے کافی ہوگا ... ان سنتریوں کا یہ حال ہے تو آپ کا تو گھر سونے کی اینٹوں کا ہونا

چاہیے۔'' ☆۱۱۹

مولانا کا اب مطالبہ تھا کہ ماڈل ٹاؤن میں رہنے والے ہندوؤں اور سکھوں کے گھروں پر اب مسلمانوں کا قبضہ ہو جانا چاہیے۔ ہندوؤں اور سکھوں کو لاہور سے نکالنے کے لیے چھرے اور چاقو نا کافی تھے۔ اب مسلمانوں کو اسلحے اور جدید ہتھیاروں کی ضرورت تھی جس سے ہندو اور سکھ لیس تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ماڈل ٹاؤن میں مسلمان تین بار حملہ کرنے کے باوجود ہندوؤں اور سکھوں کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ اب جیکسن سے مولانا پیرزادہ کا مطالبہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو بھی جدید ہتھیاروں اور اسلحہ جات کا بندوبست کر کے دے تا کہ وہ بھی ہندوؤں اور سکھوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکیں۔

نہال چند کھوکھری سے جھوٹی ہمدردیاں جتانے کے بعد جیکسن نے خود کو مولانا اللہ داد اور تمام مسلمانوں کا خیر خواہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

> ''...اسلحہ جات روپے کے بغیر نہیں مل سکتے۔ میرے پاس ہوتے تو میں نہ دے دیتا۔ مجھے تو ہندوستان میں نہیں پاکستان میں رہنا ہے۔ ہندوبنیوں سے مجھے کوئی محبت نہیں ہے اور پھر اسلام کی تعلیم ہمارے عیسائی مذہب سے ملتی جلتی ہے۔ عیسائی مسلمان کے ساتھ مل سکتا ہے لیکن ہندو کے ساتھ اس کا نباہ نہیں ہوسکتا۔'' ☆۱۲۰

مولانا اللہ داد جیکسن کی اس مکارانہ گفتگو سے بہت متاثر ہوا اور اس نے ایک مسلمان جاگیردار سے دین کے نام پر اور کفر کے خلاف جہاد کے لیے جو ۵۰ ہزار روپے لے تھے وہ اسلحہ خریدنے کے لیے جیکسن کو دے دیے۔

> ...مہاشے نہال چند کھوکھری، مولانا اللہ داد پیرزادہ تھوڑے سے وقفے کے بعد اپنے ہتھیار لیے مختلف سمتوں کو چل دیتے ہیں۔ دونوں دل ہی دل میں جیکسن کو اپنا دوست، مونس اور غمگسار سمجھتے ہیں، اور دونوں اس کے دوغلے اور ریاکارانہ کردار سے قطعاً ناواقف اور لاعلم ہیں۔ یعنی چالاکی، ہوشیاری اور عیاری میں دونوں جیکسن کے سامنے طفلِ مکتب ہیں۔ ☆۱۲۱

دوسروں کا تماشا دیکھنے والے خود بھی کبھی نہ کبھی تماشا ضرور بنتے ہیں۔ ایسا ہی جیکسن کے ساتھ بھی ہوا۔ اگرچہ جیکسن نے اپنی دونوں بیٹیوں کی اس طرح تربیت کی تھی کہ وہ اینگلو انڈین ہونے کے باوجود ہندوستانی ماحول اور ہندوستانی لوگوں سے نفرت کرتی تھیں۔ اس کے باوجود جیکسن کی بیٹی روزی دل کے ہاتھوں مجبور ہوگئی جب اسے ایک ہندو لڑکے آنند سے محبت ہوئی اس نے صرف آنند کو ہی دل سے قبول نہ کیا، بلکہ ہندی تہذیب و تمدن کو بھی ہمیشہ کے لیے اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔ جیکسن کو جب اپنی بیٹی کے خط کے ذریعے اس کے فیصلے کا علم ہوتو وہ اپنی توہین برداشت نہ کر سکا۔ روزی کے خط میں لکھے گئے الفاظ کسی چھرے

یا چاقو کے وار سے کسی پستول کی گولی سے کم نہ تھے۔اس صدمے کو برداشت کرنا جیکسن کے بس کی بات نہ تھی،اس نے خود کو گولی مار کر ہمیشہ کے لیے اس تکلیف دہ حقیقت سے نجات حاصل کر لی۔

امرت سر

کرشن چندر کا یہ افسانہ دو حصّوں پر مشتمل ہے:(۱) آزادی سے پہلے (۲) آزادی کے بعد۔

امرت سر ہندوستان کا وہ شہر ہے جہاں ۱۹۱۹ء میں ہندوؤں،سکھوں اور مسلمانوں نے مل کر انگریزوں کے خلاف جلیاں والا باغ میں آزادی کے حصول کی جد و جہد کی تھی اور اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا۔اسی شہر میں ۱۹۴۷ء میں انگریزوں کے خلاف متحد ہونے والے ہندو،سکھ اور مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔ان دو مختلف حقائق کو کرشن نے اس افسانے میں واضح طور پر بیان کیا ہے۔

(۱) آزادی سے پہلے

افسانے کے اس حصّے میں کرشن چندر نے ۱۹۱۹ء میں مسلمانوں،سکھوں اور ہندوؤں کے درمیان پائے جانے والے اتحاد و اتفاق کو بیان کیا ہے۔

اس سلسلے میں انھوں نے اوم پرکاش اور صدیق کی بے غرض اور مثالی دوستی کا ذکر کیا ہے جو ایک دوسرے کو صرف ایک ہمسائے کی حیثیت سے جانتے تھے،لیکن جب انگریزوں نے جلیاں والا باغ کے جلسے میں شریک ہندوؤں،سکھوں اور مسلمانوں پر حملہ کیا تو صدیق نے اوم پرکاش کی بالکل ایسے مدد کی جیسے وہ دونوں سگے بھائی یا جگری دوست ہیں اور ان دونوں کا تعلّق ایک ہی مذہب اور قوم سے ہے۔اگرچہ انگریزوں نے دونوں پر گولیاں چلائی تھیں،لیکن اوم پرکاش کی حالت زیادہ خراب تھی۔اس لیے صدیق نے پرکاش کو اپنے کندھے پر چڑھا کر اسے جلیاں والا باغ کی چہار دیواری سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کی وہ ایسا کرنے میں تو کام یاب ہو گیا لیکن وہ اوم پرکاش کی زندگی کو نہ بچا سکا۔

> اس نے اپنے بہتے ہوئے لہو اور اپنی نکلتی ہوئی زندگی کی فریاد بھی نہ سنی،اور اپنے رستے پر چلتا گیا...آج اس کی روح اس قدر امیر تھی کہ کٹڑہ فتح خان پر پہنچ کر اس نے سب سے کہا۔یہ لو ہیرے کی انگوٹھی،اور یہ دو ہزار کے نوٹ اور یہ ہے شہید کی لاش۔اتنا کہہ کر صدیق بھی دہیں گر گیا،اور شہر والوں نے دونوں کا جنازہ اس دھوم دھام سے اُٹھایا گویا وہ سگے بھائی تھے۔☆۱۲۲

اسی افسانے میں کرشن چندر نے چار خواتین کردار پارو،زینب،بیگم اور شام کور کا ذکر کیا ہے جو مذہب اور تہذیب کے لحاظ سے تو ایک دوسرے سے مختلف تھیں لیکن آپس کی محبت اور دوستی اور انگریزوں کے خلاف نفرت اور بغاوت کے جذبے نے

انھیں ایک کر دیا تھا۔ مردوں کی طرح یہ خواتین بھی انگریزوں کے خلاف لڑنے اور مرنے کے لیے تیار تھیں۔

۱۹۱۹ء میں جب ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان تعلّقات کشیدہ ہو گئے تھے اور کرفیو لگ چکا تھا۔ یہ چاروں خواتین سبزی خریدنے کے بعد جب واپس جا رہی تھیں تو کرفیو کا وقفہ ختم ہونے میں چند منٹ باقی تھے۔ یہ چاروں سہلیاں متفقہ فیصلے کے بعد ایک گلی میں گھس گئیں تا کہ محفوظ طریقے سے اپنے اپنے گھر پہنچ سکیں، لیکن گلی میں بھی ایک انگریز سپاہی نے باہر نکلنے کے لیے یہ شرط رکھی تھی:

گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی یہاں سے فی الفور نکل جاؤ۔☆۱۲۳

ان چاروں خواتین نے گھٹنوں کے بل جھک کر چلنے سے صاف انکار کر دیا کیوں کہ ان زندہ دل اور غیرت مند خواتین کو اپنی زندگی سے اپنی عزت نفس اور ملک کی عزت زیادہ عزیز تھی۔

ان کی نفسیاتی کیفیت کو کرشن چندر نے اپنے افسانے میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

...ان کی روحوں نے کہا، نہیں، آج تمھیں جھکنا نہیں ہے۔ آج صدیوں کے بعد وہ لمحہ آیا ہے جب سارا ہندوستان جاگ اٹھا ہے اور سیدھا تن کر اس گلی سے گزرتا ہوا دیکھ رہا ہے۔ سر اُٹھائے آگے بڑھ رہا ہے۔ آج اس گلی کا ذرّہ ذرّہ کسی کے قدوسی لہو سے روشن ہے۔ شام کور، زینب، پارو، بیگم آج تم خود اس گلی سے نہیں گزر رہی ہو۔ آج تمھارا دیس فخر سے سر اُٹھائے اس گلی سے گزر رہا ہے۔☆۱۲۴

اس افسانے کے ذریعے کرشن چندر یہ حقیقت بیان کر رہے ہیں کہ ۱۹۱۹ء میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے پاس اتحاد کی طاقت تھی جس کی وجہ سے ان کی سوچ اور خیال بھی ایک تھے۔ سب ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے، اور ملک کی شان اور آن انھیں اپنی جان سے بھی پیاری تھی۔

(۲) آزادی کے بعد

افسانے کا یہ حصہ افسانے کے پہلے حصے سے بالکل مختلف ہے۔ افسانے کے اس حصے میں کرشن چندر نے ۱۹۴۷ء کے ہندو مسلم فسادات کا ذکر کیا ہے۔ جب انگریز صدیوں سے ساتھ رہنے والے ہندو، مسلمان اور سکھوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ وہ ہندو، سکھ اور مسلمان جو کبھی ایک دوسرے کے دوست، ساتھی اور پڑوسی تھے اب ایک دوسرے کو صرف دشمن کی حیثیت سے دیکھ رہے تھے، اور ایک دوسرے کو لوٹنے، مارنے اور ایک دوسروں کی خواتین کی بے حرمتی کرنے میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ۱۹۱۹ء میں ہندوؤں اور سکھوں کی جو نفرت انگریزوں کے خلاف تھی وہ نفرت اور تعصب اب مسلمانوں کے حصے میں آ گئی تھی۔

کرشن چندر نے افسانے کے واحد متکلم کردار کے ذریعے ۱۹۴۷ء میں امرت سر کے سکھوں اور ہندوؤں کی ان زیادتیوں کو بیان کیا ہے جوانھوں نے امرت سر میں رہنے والے مسلمانوں کے ساتھ کیں۔ یہ ظلم وزیادتیاں صرف ان مسلمانوں کے ساتھ نہ گئیں جو امرت سر میں رہتے تھے، بلکہ وہ مسلمان بھی ہندوؤں اور سکھوں کی اذیتوں سے نہ بچ سکے۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان جارہے تھے۔ ہجرت کرنے والوں میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو قافلوں کی شکل میں پیدل ہی پاکستان کی طرف روانہ ہوگئے تھے، اور وہ لوگ بھی شامل تھے جوٹرینوں کے ذریعے امرت سر سے پاکستان جارہے تھے۔

ہجرت کے دوران مسلمان بچوں، عورتوں اور مردوں کو جن جن تکالیف اور مسائل کا سامنا کرنا پڑا ان تمام حقائق کو کرشن نے بلاجھجک اس افسانے میں بیان کردیا ہے۔

علاقوں کی تقسیم کے بعد دونوں حکومتوں کے مشترکہ فیصلے سے آبادیوں کے تبادلے کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ ہندوستان سے مسلمان مہاجرین کو پاکستان پہنچانے کے لیے ''ہندوستان اسپیشل'' کے نام سے ٹرین چلائی گئی۔ اسی طرح پاکستان میں بھی ہندوؤں کو ہندوستان پہنچانے کے لیے ''پاکستان اسپیشل'' چلائی گئی۔ بظاہر یہ ٹرینیں مہاجرین کو ان کے ملکوں میں محفوظ طریقے سے پہنچانے کے لیے چلائی گئی تھیں، لیکن اس کے باوجود ہندوؤں نے ''ہندوستان اسپیشل'' میں بیٹھے ہوئے مسلمان مہاجرین کو مختلف مسلمانوں نے ''پاکستان اسپیشل'' میں بیٹھے ہوئے ہندوؤں کو مختلف اسٹیشنوں پر روک کر انھیں قتل کیا اور ان کی خواتین کی بے حرمتی کی۔ کئی ہندو اور مسلمان اپنی اصل منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی ماردیے گئے۔

پاکستان اسپیشل پر اُردو کے موٹے حروف میں لکھا ہوا تھا، ''قتل کرنا پاکستان سے سیکھو۔''

ہندوستان اسپیشل پر ہندی میں لکھا تھا ''بدلہ لینا ہندوستان سے سیکھو۔'' ☆۱۲۵

واحد متکلم نے ہندوؤں اور سکھوں کی مسلمانوں کے ساتھ زیادتیوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک بوڑھی عورت کے کردار کو بیان ہے جس کے بیٹے کو سکھوں نے قتل کردیا تھا اور بہو کو سکھوں نے اغوا کرلیا تھا۔ اب بوڑھی عورت اور اس کا کم سن پوتا ایک دوسرے کا سہارا تھے۔ بوڑھی عورت کا پوتا پانی کے لیے رورہا تھا۔ بوڑھی عورت اپنے پوتے کو بار بار دلاسادے رہی تھی:

بیٹا پاکستان آئے گا تو پانی ملے گا۔ ☆۱۲۶

ایک سکھ رضا کار بوڑھی عورت اور اس کے پوتے کی بے بسی سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ وہ انھیں مزید اذیت دینے کے لیے پائیدان سے رستے ہوئے خون کو اپنے ہاتھ میں جمع کر کے بچے کے قریب لے گیا اور کہا:

''...لو پیاس لگی ہے تو یہ پی لو، یہ بڑا اچھا خون ہے مسلمان کا خون ہے۔'' ☆۱۲۷

ایسا نہیں تھا کہ امرت سر کے اسٹیشن پر پانی نہ تھا، بلکہ مسلمانوں کے ساتھ یہ مسئلہ تھا کہ انھیں ایک گلاس پانی کی قیمت ۱۰۰/روپیہ بھی ادا کرنا پڑتی۔ گویا:

پانی کی افراط ہوتے ہوئے بھی امرت سر کا ریلوے اسٹیشن مسلمانوں کے لیے کربلا بن گیا تھا۔☆۱۲۸

پانی ہندوستان میں بھی تھا اور پانی پاکستان میں بھی تھا، لیکن پانی کہیں نہیں تھا کیوں کہ آنکھوں کا پانی مرگیا تھا، اور یہ دونوں ملک نفرت کے صحرا بن گئے تھے...اس کے بیٹے پیاس سے بلک بلک کرمر رہے تھے، لیکن دل کے دریا سوکھ گئے تھے۔ اس لیے پانی تھا اور نہیں بھی تھا۔☆۱۲۹

فسادات کے دوران ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کی جائیداد اور چھوڑے ہوئے مال واملاک پر قبضہ کرلیا اور وہ لوگ بھی جو شرفا اور خاندانی لوگ کہلاتے تھے وہ بھی اپنی کم زوریوں کے ہاتھوں مجبور ہوگئے بڑی بڑی جائیدادوں سے لے کر عام استعمال کی چیزوں پر قابض ہونے کو انھوں نے قابلِ فخر بات سمجھا انھیں نہ خدا کا ڈر رہا اور نہ قانون کا۔ ہوس اور لالچ میں وہ بالکل دیوانے ہو چکے تھے۔ دیوانگی ہی کی حالت میں وہ بعض اوقات اپنے دوستوں اور ساتھیوں کی چیزوں پر بھی قبضہ کر لیتے۔

اس حقیقت کو کرشن چندر نے بھی اپنے اس افسانے میں بیان کیا ہے جن میں سے چند ایک مثالیں یہ ہیں:

''معاف کرنا آپاں سمجھا۔ کسی مسلمان دی گاے ہے۔'' ☆۱۳۰

''...تمھاری موٹر ہے؟ معاف کرنا پیارے، میں نے پہچانی نہیں۔ وہ محمد رزّاق کی دکان کے سامنے کھڑی تھی نا۔ میں نے سوچا، کسی مسلمان کی ہوگی۔'' ☆۱۳۱

جب انسان کی اپنی بنیادی ضروریات بھی پوری نہ ہوسکیں تو اس کے رویّے میں بھی تبدیلی آجاتی ہے اور وہ خودغرض اور بےحس ہوجاتا ہے۔ فسادات کے دوران بھی امدادی کیمپوں میں خوراک، لباس اور بستروں کی کمی نے بعض سگے رشتوں کے دلوں میں بھی ایک دوسرے کے لیے محبت اور ہمدردی کا جذبہ ختم کردیا تھا۔

مغربی پاکستان سے گیارہ افراد پر مشتمل ایک خاندان نے جس وقت ہجرت کی اس وقت ان کے پاس روپیہ پیسا اور زیورات بھی تھے لیکن جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے گئے افراد کی تعداد اور روپے پیسے میں بھی کمی آتی گئی، اور جب وہ ہندوستان کے امدادی کیمپ میں پہنچے اس خاندان کے دو افراد باقی بچے تھے۔ جن کے پاس اب آنسو بھی نہ بچے تھے یہ دو افراد آپس میں ماں بیٹا تھے۔ شدید سردی اور بخار کی حالت میں بھی دونوں کے پاس صرف ایک لحاف تھا جسے بچّے کی ماں نے اوڑھ رکھا تھا۔ لڑکا شدید بخار اور سردی سے کانپ رہا تھا جب اس کی ماں نے دم توڑا تو وہ اپنی ماں کے لیے ایک آنسو بھی نہ بہا سکا۔ کیوں کہ اس کے آنسو بہت پہلے خشک ہو چکے تھے۔

جیسے ہی اس کی ماں نے دم توڑا لڑکے نے فوراً ماں کا لحاف اپنے اوپر اوڑھا اور کیمپ کی دوسری جانب چل پڑا اسے اب صرف یہ خوف تھا کہ کوئی اس سے یہ لحاف نہ چھین لے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک رضا کار اس سے اس کی ماں کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے آیا جو مر چکی تھی شاید رضا کار سمجھ رہا ہو کہ لڑکا اپنی ماں کی موت سے بے خبر ہے، لڑکے نے گھبرا کر کہا،
''وہ میری ماں نہیں۔ یہ میرا لحاف ہے۔ میں اسے کسی کو نہ دوں گا۔ یہ لحاف میں اپنے ساتھ لایا تھا، نہیں دوں گا، نہیں!'' ☆۱۳۲

افسانے کا سب سے اہم کردار زینب کی ماں کا ہے۔ وہ زینب جس نے ۱۹۱۹ء کے حادثے میں اپنی ہندو اور سکھ سہیلیوں کے ساتھ مل کر ہندوستان کی عزت اور شان بڑھانے کے لیے اپنی جان قربان کر دی تھی، لیکن ۱۹۴۷ء کے فسادات میں ہندوؤں اور سکھوں نے پرانے تعلّقات کو فراموش کر دیا اور جہاں اور مسلمانوں کو جانی اور مالی نقصان پہنچایا وہاں زینب کے خاندان کو بھی نہ بخشا۔

واحد متکلم کو زینب کی ماں زخمی حالت میں ملی۔ واحد متکلم نے جب اس سے اس کا حال احوال پوچھا تو اس نے واحد متکلم اور اس کے سارے ہندو ساتھیوں کو بد عائیں دیتے ہوئے کہا:

''میں زینب کی ماں ہوں، میں پنجاب کی ماں ہوں، تم نے میری گود اجاڑی ہے۔ تم نے بڑھاپے میں میرا منہ کالا کیا ہے میری جوان بہوؤں، بیٹیوں کی پاک صاف روحوں کو جہنم کی آگ میں جھونکا ہے۔ میں ان سے پوچھوں گی کیا زینب اس آزادی کے لیے قربان ہوئی تھی۔'' ☆۱۳۳

اپنے دکھوں کی داستان سنانے کے بعد زینب کی ماں خود بھی مر گئی۔

کرشن یہ بات باور کرانا چاہتے ہیں جب عصبیت کی چادر آنکھوں پر چھا جائے تو انسان جانور بن جاتا ہے۔ وہی اقوام جو ۱۹۱۹ء میں شیر وشکر ہو کر رہ رہی تھی آخر کیا ہوا تھا کہ ۱۹۴۷ء میں وہ ایک دوسرے کی جان و مال اور عزت و آبرو کی دشمن ہو گئی تھیں۔

پشاور ایکسپریس

کرشن چندر نے اپنے اس مشہور افسانے میں ''پشاور ایکسپریس'' کی آپ بیتی کے ذریعے ہندو مسلم فسادات کو بیان کیا ہے۔

افسانے کے آغاز میں پشاور سے ہجرت کرنے والے ہندوؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ شرنارتھی پشاور ایکسپریس میں سفر کر رہے تھے۔ ان ہندو شرنارتیوں کو پشاور سے لے کر مشرقی پنجاب کی سرحد تک مختلف اسٹیشنوں پر مسلمانوں کے ظلم کا نشانہ بننا

پڑا۔منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی بہت سے ہندو اور سکھ بچے ،مرد اور بوڑھی عورتیں قتل کر دی گئیں جب کہ خوب صورت اور جوان عورتوں کو اغوا کر لیا گیا۔

پاکستان سے ہندوستان جانے والے ہندو اور سکھ اپنے اپنے گھر بار، زمینیں اور جائیدادیں چھوڑ کر آئے تھے۔ ہر اسٹیشن پر کبھی نئے شرنارتھیوں کی آمد سے ان کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا اور کبھی انھیں قتل کر دینے سے ان کی تعداد میں کمی آ جاتی۔

> حسن ابدال تک سب لوگ یونہی محزوں، افسردہ، یاس ونکبت کی تصویر بنے رہے۔حسن ابدال کے اسٹیشن پر بہت سے سکھ آئے ہوئے تھے پنجہ صاحب سے،لمبی لمبی کرپانیں لیے۔ چہروں پر ہوائیاں اُڑی ہوئیں۔بال بچے سہمے سہمے سے،ایسا معلوم ہوتا کہ اپنی ہی کرپانوں کے گھاو سے یہ لوگ خود مر جائیں گے۔☆۱۳۴

جو لوگ زندہ سلامت ٹرین میں موجود تھے وہ بھی مختلف حالات سے گزر کر آئے تھے بعض لوگ تو کسی بھی حادثے کے بغیر ہی بخیر و عافیت ٹرین میں آ کر بیٹھ گئے تھے اور بعض ایسے تھے جو نہ صرف اپنی قیمتی جائیدادیں اور زمینیں وغیرہ چھوڑ کر آئے تھے، بلکہ اپنے غیروں اور رشتے داروں سے بھی محروم ہو گئے۔

> ...کسی کا گھر جل گیا تھا۔کوئی صرف ایک قمیص اور شلوار میں بھاگا تھا کسی کے پاؤں میں جوتی نہ تھی، اور کوئی اتنا ہوشیار تھا کہ اپنے گھر کی ٹوٹی چارپائی تک اٹھا لایا تھا۔جن لوگوں کا واقعی بہت نقصان ہوا تھا وہ لوگ گم سم بیٹھے تھے...اور جس کے پاس کبھی کچھ نہ ہوا تھا۔وہ اپنی لاکھوں کی جائیداد کے کھونے کا غم کر رہا تھا اور دوسروں کو اپنی فرضی امارت کے قصے سنا سنا کر مرعوب کر رہا تھا اور مسلمانوں کو گالیاں دے رہا تھا۔☆۱۳۵

مسلمان دو سو ہندوؤں کی لاشیں ٹیکسلا اسٹیشن پر لائے اور بلوچی سپاہیوں سے کہا کہ انھیں بحفاظت ہندوستان پہنچا دو جب ان سپاہیوں نے لاشوں کو ریل گاڑی میں رکھ دیا تو ان کے سرغنہ نے کہا:

> ...دو سو آدمیوں کے چلے جانے سے ان کے گاؤں ویران ہو جائیں گے اور ان کی تجارت تباہ ہو جائے گی۔اس لیے وہ گاڑی سے دو سو آدمی اتار کر اپنے گاؤں لے جائیں گے۔چاہے کچھ بھی ہو۔وہ اپنے ملک کو یوں برباد ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔اس پر بلوچی سپاہیوں نے ان کا فہم و ذکا اور ان کی فراستِ طبع کی داد دی، اور ان کی وطن دوستی کو سراہا اور ... ہر ڈبے سے کچھ آدمی نکال کر مجمع کے حوالے کیے دو سو آدمی نکالے گئے۔☆۱۳۶

اگلے ہی لمحے مسلمانوں کے سرغنہ نے انھیں ایک لائن میں کھڑا کر کے فائرنگ کی۔مسلمانوں کے اس ناپسندیدہ فعل کو

کرشن چندر نے طنزیہ انداز میں بیان کیا ہے:

یہ ٹیکسلا کا اسٹیشن تھا۔

بیس اور آدمی گر گئے۔

یہاں ایشیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی تھی اور لاکھوں طالب علم اس تہذیب وتمدن کے گہوارے سے کسبِ فیض کرتے تھے۔

پچاس اور مارے گئے۔

ٹیکسلا کے عجائب گھر میں اتنے خوب صورت بت تھے، اتنے حسین سنگ تراشی کے نادر نمونے، قدیم تہذیب کے جھلملاتے ہوئے چراغ!

پچاس اور مار گئے۔

پس منظر میں سرکوب کا محل تھا اور کھیلوں کا مِنی تھیٹر اور میلوں تک پھیلے ہوئے ایک وسیع شہر کے کھنڈر ٹیکسلا کی گذشتہ عظمت کے

پُر شکوہ مظہر!

تیس اور مارے گئے۔

یہاں کنشک نے حکومت کی تھی اور لوگوں کو امن وآشتی اور حسن و دولت سے مالا مال کیا تھا۔

پچیس اور ختم ہوئے۔

یہاں بدھ کا نغمۂ عرفان گونجا تھا۔ یہاں بھکشوؤں نے امن وصلح وآشتی کا درسِ حیات دیا تھا۔

اب آخری گروہ کی اجل آ گئی تھی۔

یہاں پہلی بار ہندوستان کی سرحد پر اسلام کا پرچم لہرایا تھا مساوات اور اخوت اور انسانیت کا پرچم! ☆۱۳۷

اس اقتباس میں کرشن چندر نے ''پشاور ایکسپریس'' کے ذریعے مسلمانوں اور پاکستان کے شہر ٹیکسلا کا ذکر کیا ہے جہاں سے بدھ مت کا آغاز ہوا تھا جو امن وآشتی کا مذہب ہے، لیکن تقسیمِ ہند کے بعد اسی شہر میں مذہبی اور قومی تعصب کی بنا پر بہت سے لوگ جانی اور مالی نقصان سے دوچار ہوئے۔

راول پنڈی، گوجر خان، جہلم اور لالہ موسیٰ میں اغوا، قتل و غارت گری وغیرہ کے حادثات دیکھتے ہوئے ''پشاور ایکسپریس'' وزیر آباد آ پہنچی جہاں لوگ خوش باش اور ہنستے کھیلتے بیساکھی کا میلہ دیکھنے آئے تھے لیکن ۱۹۴۷ء میں بیساکھی کا میلہ

ان کے بہت سے آنسو، دکھ اور زخم لے کر آیا۔ وزیر آباد اسٹیشن پر سب سے زیادہ ظلم عورتوں پر ہوا۔

...وزیر آباد کا اسٹیشن لاشوں سے لپٹا ہوا تھا۔ شاید لوگ بیساکھی کا میلہ دیکھنے آئے تھے۔ لاشوں کا میلہ۔ شہر میں دھواں اُٹھ رہا تھا اور اسٹیشن کے قریب انگریزی بینڈ کی صدا سنائی دے رہی تھی۔ چند منٹوں میں ہجوم اسٹیشن پر آ گیا، آگے آگے دیہاتی ناچتے اور گاتے آ رہے تھے اور ان کے پیچھے ننگی عورتوں کا ہجوم تھا...ناچتے گاتے ہوئے مردوں کے نرغے میں تھیں۔ عورتیں ہندو اور سکھ تھیں اور مرد مسلمان تھے اور دونوں نے مل کر یہ عجیب بیساکھی منائی تھی۔ ☆ ۱۳۸

''پشاور ایکسپریس'' لاہور کے پلیٹ فارم نمبر ''ا'' پر رک گئی۔

پلیٹ فارم نمبر ۲ پر امرت سر سے آنے والی ریل گاڑی کھڑی تھی جو مسلمان مہاجرین کو ہندوستان سے لے آئی تھی۔ امرت سر سے آنے والی ریل گاڑی میں جتنے مسافروں کو بٹھایا گیا تھا اس میں سے چار سو آدی اور پچاس مرد کم تھے۔

...اس لیے یہاں پر بھی پچاس عورتیں چن چن کر نکال لی گئیں، اور چار سو ہندو مسافروں کو تہ تیغ کیا گیا تا کہ ہندوستان اور پاکستان میں آبادکاری کا توازن برقرار رہے۔ ☆ ۱۳۹

''پشاور ایکسپریس'' جب ہندوستان کی سرحد پر پہنچی تو حالات نے پلٹا کھایا اور جگہ جگہ مسلمانوں کی لاشیں نظر آئیں۔ قتل و غارت گری، لوٹ مار اور خواتین کو اغوا کرنے اور بے آبرو کرنے کا سلسلہ جاری تھا یہ تکلیف دہ مناظر دیکھ کر ہندو شرنارتھیوں کو خوشی اور اطمینان کا احساس ہوا اور انھیں اپنے زخم بھرتے ہوئے محسوس ہوئے۔

...اٹاری پہنچ کر تو مسلمانوں کی اتنی لاشیں ہندو مہاجرین نے دیکھیں کہ ان کے دل فرطِ مسرت سے باغ باغ ہو گئے۔ آزاد ہندوستان کی سرحد آ گئی تھی ورنہ اتنا حسین منظر کس طرح دیکھنے کو ملتا...امرت سر اسٹیشن پر...بھی مسلمانوں کی لاشوں کے ڈھیر کے ڈھیر تھے، اور ہندو جاٹ اور سکھ اور ڈوگرے ہر ڈبے میں جھانک کر پوچھتے تھے، کوئی شکار ہے؟ ☆ ۱۴۰

بعض مسلمان مہاجرین نے اپنی جان بچانے کے لیے اپنا بھیس بدلا اور خود کو ہندو ظاہر کیا، لیکن وہ اپنے عقیدے کو چھپا نہ سکے۔

ایک ڈبے میں چار ہندو برہمن سوار ہوئے...ان میں سے ایک کے دل میں کچھ شبہ سا ہوا۔ اس نے ایک برہمن سے پوچھا۔

''برہمن دیوتا کدھر جا رہے ہو؟''

''ہردوار تیرتھ کرنے''

''ہردوار جارہے ہو کہ پاکستان جارہے ہو۔''

''میاں اللّٰہ اللّٰہ کرو،'' دوسرے برہمن کے مُنہ سے نکلا۔

جاٹ ہنسا۔''تو اللّٰہ اللّٰہ کریں۔ او بتھا سیّاں۔فن کار مل گیا بھئی۔آ وہید اللّٰہ بیلی کریے۔'' اتنا کہہ کر جاٹ نے بلّم نقلی براہمن کے سینے میں مارا، دوسرے براہمن بھاگنے لگے۔ جاٹوں نے انھیں پکڑ لیا۔ ایسے نہیں براہمن دیوتا۔ ذرا ڈاکٹری معائنہ کراتے جاؤ۔ ہردوار جانے سے پہلے ڈاکٹری معائنہ بہت ضروری ہے ناں!۔☆۱۴۱

ڈاکٹر معائنے کے بعد کسی بھی نقلی برہمن کا زندہ رہنا ممکن نہ تھا۔

ہندوستان کی سرحد پر بھی مسلمان عورتوں کے ساتھ وہی سلوک کیا گیا جو پاکستان میں ہندو اور سکھ عورتوں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اس توہین و تذلیل پر ''پشاور ایکسپریس'' میں افسوس کا اظہار کیا گیا ہے:

...اسی وسیع میدان میں جہاں پنجاب کے دل نے ہیر رانجھے اور سوہنی مہیوال کی لافانی الفت کے ترانے گائے تھے۔ انھیں شیشم، سرس اور پیپل کے درختوں تلے وقتی چکلے آباد ہوئے پچاس عورتیں اور پانسو خاوند، پچاس بھیڑیں اور پانسو قصاب، پچاس سوھنیاں اور پانسو مہیوال۔ شاید اب چناب میں کبھی طغیانی نہ آئے گی۔ شاید اب کوئی وارث شاہ کی ہیر نہ گائے گا۔ شاید اب مرزا صاحباں کی داستانِ الفت و عصمت ان میدانوں میں کبھی نہ گونجے گی۔ لاکھوں بار لعنت ہو ان رہنماؤں پر، اور ان کی آئندہ سات پشتوں پر جنھوں نے اس خوب صورت پنجاب... کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔☆۱۴۲

اس اقتباس میں کرشن چندر نے ہندو اور سکھ مردوں پر طنز کی ہے۔ جنھوں نے تعصب کی وجہ سے عورتوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک اختیار کیا۔ اس خیال کی تائید کرتے ہوئے جگدیش چندر ودھاون نے کہا ہے:

...عصمت مآب بیبیاں شہوت پرست زانیوں اور قاتلوں کے ہتھے چڑھ گئیں پچاس عورتوں کے لیے پانچ سو زانی، ہندو علمبردار، صف باندھے اپنی اپنی باری کا انتظار کرنے لگے۔ ان حشر سامان گھڑیوں میں ان عورتوں پر جو گزری، قلم اسے بیان کرنے سے قاصر ہے۔☆۱۴۳

لدھیانہ میں ہندوؤں اور سکھوں نے محلّے محلّے اور گلی گلی جا کر مسلمانوں کے گھروں میں جا کر انھیں قتل کیا اور ان کی جائیدادوں اور مال و اسباب پر بھی قبضہ کیا۔

جس مسلمان مرد، عورتوں اور بچّوں کی لاشیں جمع ہو جاتی تو جاٹ، پٹھان اور ڈوگرے ان کی لاشوں کو نہروں میں

پھینک دیتے ان تمام فرائض سے سبکدوش ہو جاتے تو اس خوشی میں شراب پیتے۔

انبالہ اسٹیشن پر ایک ڈبے سے ہندوؤں نے ایک مسلمان ڈپٹی کمشنر، اس کی بیوی اور اس کے چھوٹے بچوں کو قتل کرنے کے بعد ان کی خوب صورت اور نوجوان لڑکی اور قیمتی سامان کو لے کر وہ ایک جنگل میں چلے گئے۔ کچھ ہندوؤں کا خیال تھا کہ لڑکی کو قتل کر دیا جائے اور کچھ کا خیال تھا:

...اسے بچالیا جائے، یہ حسن، یہ رعنائی، یہ تازگی، یہ جوانی کسی کے کام آ سکتی ہے۔☆ ۱۴۴

جب کہ لڑکی کا کہنا تھا:

''...مجھے ہندو کر لو...تم میں سے کوئی مجھ سے بیاہ کر لے۔ میری جان لینے سے فائدہ!'' ☆ ۱۴۵

لڑکی کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی، اور ایک ہندو نے لڑکی کے پیٹ میں چھری مار کر اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

مردہ لڑکی کے ہاتھ میں جو کتاب تھی اس کا عنوان تھا ''اشتراکیت عمل اور فلسفہ'' از جان سٹریچی۔ اس چیز کو بنیاد بنا کر کرشن چندر نے لڑکی کے بارے میں رائے دی ہے:

... وہ ذہین لڑکی ہوگی۔ اس کے دل میں اپنے ملک و قوم کی خدمت کے ارادے ہوں گے۔☆ ۱۴۶

مسلمان لڑکی کے بارے میں کرشن چندر نے جو رائے دی ہے اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے ترقی پسند تحریک کے نظریے کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے۔ گویا ان کے نزدیک اشتراکی گروہ ہی ملک کے خیر خواہ ہیں۔

اگر چہ کرشن نے ناول کے اختتام پر مستقبل کے بارے میں ایسا خواب دیکھا ہے:

... جب نہ کوئی ہندو ہوگا نہ مسلمان، بلکہ سب مزدور ہوں گے اور انسان ہوں گے۔☆ ۱۴۷

پورے افسانے کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے:

کرشن چندر نے انسان ہونے کا خواب تو دیکھا ہے لیکن خود ہندو بن کر سوچا ہے، اور حکومت اور نقاد کی جانب سے ان پر کیے جانے والی اعتراضات بے جا نہیں لگتے۔

سجاد ظہیر نے اپنی کتاب ''روشنائی'' میں حکومت کی جانب سے کیے جانے والے اعتراضات کو اس طرح بیان کیا ہے:

...ترقی پسند ادیب خود فرقہ پرستی کا شکار ہیں مثلاً کرشن چندر کے افسانوں کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ ان میں ہندوؤں کے ساتھ جانب داری برتی گئی ہے۔☆ ۱۴۸

افسانے کے ابتدا میں انھوں نے ''پشاور ایکسپریس'' کی زبانی ہندوؤں پر مسلمانوں کے مختلف مظالم کا ذکر کیا ہے۔ یقیناً ایسا ہوا تھا، لیکن ظلم اور زیادتی صرف مسلمانوں کی طرف سے نہیں ہوئی تھی، بلکہ ہندو ظلم کرنے میں مسلمانوں سے بھی آگے تھے۔

کرشن چندر نے ''پشاور ایکسپریس'' کے ذریعے مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کی زیادتیوں کو بہت رعایت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جس سے ان کا جانب دارانہ رویّہ ثابت ہو گیا ہے۔

حکومت کی جانب سے دوسرا اعتراض یہ تھا:

...کہ وہ اس مملکت کے ''وفادار'' نہیں، جہاں کے وہ تھے۔☆۱۴۹

افسانے میں ایک جگہ کرشن چندر نے لکھا ہے:

لاکھوں بار لعنت ہو ان رہنماؤں پر اور ان کی آئندہ سات پشتوں پر جنھوں نے اس خوب صورت پنجاب... کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔☆۱۵۰

کرشن کا یہی خیال پڑھنے سے حکومت کی طرف سے لگایا گیا دوسرا اعتراض بھی درست ثابت ہو جاتا ہے، اور ساتھ ہی کرشن چندر کی سوچ و فکر اور جانب داری بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔

کرشن نے رہنماؤں پر لاکھ بار لعنت بھیجتے ہوئے یہ نہیں سوچا کہ ملک کی غلط تقسیم کے ذمّے دار ہندوؤں کے سیاسی رہنما تھے، اور پنجاب میں تباہی مچانے والے اور سکھوں کو شہ دینے والے بھی ہندو رہنما ہی تھے جنھوں نے سکھوں کو ''خالصتان'' کا لالچ دے کر ان سے پنجاب خالی کروایا تھا۔

یہ حقیقت کرشن چندر سے چھپی ہوئی تو نہ تھی لیکن مذہبی تعصب کی وجہ سے انھیں حقائق سے نظریں چرانی پڑیں۔

ممتاز شیریں نے کرشن چندر کے افسانے ''پشاور ایکسپریس'' کے بارے میں یہ رائے دی ہے:

...ترازو بہت احتیاط سے پکڑنے کے باوجود ایک پلڑا ذرا جھک گیا ہے اور غلط پلڑا۔ کیوں کہ پاکستان کی سرحد پار کرنے کے بعد مظالم کی تفصیلیں پھیکی پڑ گئی ہیں۔☆۱۵۱

علی سردار جعفری نے کرشن چندر کے افسانہ ''پشاور ایکسپریس'' کے بارے میں رائے دی ہے:

...ترقّی پسند ادیبوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں سب سے زیادہ بلند درجہ کرشن چندر کی کہانیوں کو حاصل ہے جن میں میرے نزدیک سب سے اچھی کہانی ''پشاور ایکسپریس'' ہے۔☆۱۵۲

علی سردار جعفری نے یہ بیان غالبًا اپنے ترقّی پسند ساتھی کی حوصلہ افزائی کے لیے دیا ہے اور اس رائے کی دوسری وجہ حکومت کے بیان کی خلاف ورزی کرنا ہے۔

وجہ چاہے کچھ بھی ہو کرشن چندر کا افسانہ ''پشاور ایکسپریس'' ان کی متعصبانہ کو ظاہر کر دیتا ہے۔

مذہب اور قوم سے لگاؤ انسان کا فطری تقاضا ہے۔ مذہب کے معاملہ پر انسان احساس اور جذباتی ہوتا ہے۔ کرشن چندر جو مذہب سے زیادہ انسانیت اور انسان کے بلا تفریق ایک ہونے کا نعرہ لگاتے تھے، اور اپنے افسانوں کے ذریعے بھی

ترقی پسند نظریات کو فروغ دینے کی کوشش کرتے رہے، لیکن لاکھ کوشش کے باوجود وہ اپنے اندر چھپے ہوئے تعصب کو چھپا نہ سکے۔ جس سے ان کے انسان دوستی پر لکھے گئے افسانے محض نعرہ بازی اور لفاظی میں شمار کرنے کے قابل ہو گئے۔

لال باغ

اس افسانے میں کرشن چندر نے ان جرائم پیشہ افراد کا ذکر کیا ہے جنھوں نے ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران پیدا ہونے والے ناسازگار حالات اور افراتفری سے خوب فائدہ اُٹھایا۔ لوٹ مار، اسمگلنگ اور خواتین کی تجارت جیسے گھناؤنے کاروبار سے خوب فائدہ اٹھایا۔

ان ہی مجرموں میں سے ایک عادی مجرم کملاکر ہے جو بچپن ہی سے مجرمانہ زندگی گزار رہا ہے۔ جب ۱۹۴۷ء کے فسادات شروع ہوئے تو اس کے پاس جرائم کا پچاس سالہ تجربہ تھا اور لال باغ میں جرائم کی دنیا میں وہ ''دادا'' کے نام سے مشہور ہے۔ وہ غنڈوں کی ایک جماعت بنالیتا ہے۔ جب فسادات شروع ہوئے تو لال باغ کے مسلمانوں کو قتل کرنے میں کملاکر کے غنڈوں نے اہم کردار کیا ہے مسلمانوں کو قتل کرنے کے بدلے میں ان غنڈوں کو کملاکر سے ۵۰ روپے فی قتل ملتے۔

کملاکر نے جو پہلی لاش دیکھی اس کا حلیہ یوں تھا:

> ...نیم برہنہ کرتا لپٹا ہوا، آنتیں باہر نکلی ہوئیں۔ ہاتھ میں تیل کی شیشی شاید گھر سے ماں نے تیل بھیجا تھا۔ ☆۱۵۳

کملاکر نے لاش کو دیکھا اور شنکر کو شاباش اور ۵۰ روپے سے نوازا، اس نے مشورہ دیا:

> یہ تیل کی شیشی لے لو، کسی غریب ہندو کے کام آ جائے گی۔ ☆۱۵۴

دوسری لاش ایک غریب بوڑھے کی تھی جس کو بور کرنے مار کر ایک گڑھے میں پھینک دیا تھا۔

تیسری لاش شیدو کی تھی جو لال باغ کے محلّے میں تیس برس سے مونگ پھلی بیچ رہا تھا۔ وہ ملک میں ہونے والے ہندو مسلم فساد سے واقف تھا اس نے لال باغ میں بھی کئی مسلمانوں کو ہندوؤں کے ہاتھوں مرتے ہوئے دیکھا تھا۔

> ...بہت سے مسلمانوں نے اس سے کہا کہ وہ لال باغ کو چھوڑ کر چلا جائے، لیکن شیدو نے ہنس کر ٹال دیا۔ میں اپنے بھائی ہندوؤں میں ہوں۔ کوئی مجھے کیا کہے گا۔ ☆۱۵۵

کملاکر نے شیدو کو یقین دلایا تھا کہ وہ یا اس کے ساتھی اسے کچھ نہیں کہیں گے۔ شیدو کو بھی کملاکر اور اس کے ساتھیوں پر اعتماد تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ اسے کبھی بھی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔

شیدو کی لاش کو دیکھ کر کملاکر کو تھوڑی سی دیر کے لیے افسوس ہوا اور اس نے اپنے ساتھی سے اسے قتل کرنے کی وجہ پوچھی

تو اس نے کہا:

...کیا کرتا اپنے علاقے میں اب یہی باقی رہا تھا اور مجھے پچاس روپوں کی ضرورت تھی۔ ☆۱۵۶

چوتھی لاش ایک کشمیری میاں بیوی کی تھی جو لال باغ میں اپنے کسی رشتے دار کی تلاش میں آئے تھے۔ دھورت سنگ نے کملاکر کو اپنا کارنامہ اسی طرح سنایا:

یہ دو کشمیری مسلمان آئے تھے۔ میاں بیوی، اپنے کسی رشتے دار کو پوچھتے ہوئے۔ مجھے لڑکوں نے بتایا۔ میں نے کہا آؤ۔ تمھیں ان سے ملادوں بس میں انھیں ادھر لے گیا اور وہیں انھیں ختم کر دیا۔ ☆۱۵۷

کملاکر نے ہنس کر کہا، ''بڑے ٹھاٹ سے آئے تھے۔ اپنے کسی رشتے دار سے ملنے کے لیے معلوم نہیں تھا یہاں دادا کملاکر سے ملاقات ہوگی۔'' ☆۱۵۸

کرشن چندر اپنے اس افسانے میں چار مسلمانوں کے قتل کو بیان کر کے فسادات کے دوران ہندوؤں کے بے حس اور ظالمانہ رویّے کو بیان کرنا چاہ رہے ہیں جنھوں نے ۵۰ ؍روپوں کی خاطر مسلمانوں کو قتل کر دیا۔ صرف ان مسلمانوں کو ہی قتل نہیں کیا جو ہندوؤں کو ناپسند کرتے تھے، بلکہ انھوں نے شیدو کو بھی نہ بخشا جو انھیں اپنے دوستوں اور بھائیوں کی طرح سمجھتا تھا۔ ۵۰ روپے کی کشش کے سامنے شیدو کی محبت بے معنی ہو کر رہ گئی۔ قاتلوں نے انسانوں کو قتل کر کے اپنا پیٹ پالا۔ ایسے جارحانہ اور وحشت ناک فعل کو انسانیت کی موت کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا۔

قتل و غارت گری کی اس فضا کے ذمّے دار مسلمان اور ہندو سیاست دانوں کو ٹھہرایا ہے۔ اپنے افسانے میں ان پر ان الفاظ میں طنز کی ہے۔

یہ مردود سیاست دان ہندو اور مسلمان، یہ سانتی جاگیردار۔ یہ فریبی سرمایہ دار کس کے خون سے، اور کس کی بربادی سے اپنی حکومتوں کی تعمیر کر رہے ہیں۔ ☆۱۵۹

کرشن چندر کے اِن خیالات سے حکومت کی طرف سے ترقّی پسندوں پر ''ملک سے وفادار نہ ہونے'' کا الزام الزام نہیں، حقیقت لگتا ہے۔ کرشن چندر نے ہندو اور مسلمان رہنماؤں کو ۱۹۴۷ء کے فسادات کا ذمّے دار ٹھہرایا ہے اور اِس حقیقت کو فراموش کر دیا ہے کہ ملک میں فسادات کی اہم وجہ ہندوؤں اور انگریزوں کی آپس کی سازباز سے مقررہ تاریخ سے پہلے ملک کی تقسیم تھی۔

اندھے

کرشن چندر کے اس افسانے کا موضوع قتل و غارت گری ہے۔ افسانے میں قتل و غارت گری کے واقعات بیان کر کے کرشن چندر فسادات کے دوران ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے پائے جانے والے جذبہ انتقام کو بھی

بیان کرنا چاہ رہے ہیں جس کے تحت لاکھوں کی تعداد میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کو بے دردی سے مارا۔

کوچہ پیر جہازی میں بیش تر گھرانے مسلمانوں کے تھے۔ان مسلمان گھرانوں کا تعلق متوسط اور غریب طبقے سے تھا۔ ہندوؤں کے صرف دو گھر تھے۔ایک گھرانا لالہ باشی رام کھتری کا تھا جو محلّے کا سب سے امیر اور تہذیب یافتہ گھر تھا۔ محلّے کے سارے مسلمان ان کی دولت اور پُر آسائش زندگی سے مرعوب بھی تھے اور حسد بھی محسوس کرتے تھے۔دوسرا گھر نرائن برہمن کا تھا۔ تقسیمِ ہند سے پہلے بھی کوچہ جہازی کے ہندو اور مسلمان گھرانوں میں لڑائی جھگڑے ہوتے تھے،لیکن تقسیمِ ہند کے اعلان کے بعد جب سیاسی اور مذہبی بنیاد پر ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے تو کوچہ پیر جہازی کے ہندو اور مسلمان بھی اس جھگڑے سے نہ بچ سکے۔

فسادات کے ابتدائی دنوں میں کوچہ پیر جہازی کے ہندو اپنے علاقے میں ایک پر امن کمیٹی تشکیل دینے کا منصوبہ بنایا۔مسلمان اس کمیٹی کے خلاف تھے۔کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ جب دل میں ایک دوسرے کے لیے حسد اور کینہ ہو تو ظاہری طور پر صلح وصفائی کا ڈرامہ رچانا منافقت ہے۔

کچھ عرصہ تک امن کمیٹی قائم رہی،لیکن جب بہار میں مسلمانوں کے قتل عام کی خبر مسلمانوں تک پہنچی تو پیر جہازی کے مسلمانوں نے خود کو ہندوؤں سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار کر لیا۔اپنی عورتوں اور بچوں کو شاہ عالمی (ہندو اکثریت کا علاقہ) کے ہندوؤں کے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے بھاٹی گیٹ بھیج دیا۔

کوچہ پیر جہازی کے گردونواح میں فسادات کا آغاز ہندوؤں نے کیا۔کرشنا گلی،رام گلی،کرشن نگر،ست نگر،شاہ عالمی اور لاہور سے جہاں جہاں بھی ہندو اور مسلمان تھے۔وہاں ہندوؤں نے مسلمانوں کو مارنا شروع کر دیا۔انتقاماً مسلمانوں نے بھی خون کا بدلہ خون سے لیا۔

> ...اکبری دروازے سے بھاٹی گیٹ تک اور شاہ عالمی سے شاہی محلّے تک ہر جگہ نعرۂ تکبیر سنائی دینے لگا۔☆۱۶۰

جب ہر طرف انتقام کی آگ بھڑکی تو کوچہ پیر جہازی بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا۔کوچہ پیر جہازی میں مسلمانوں کے صرف دو گھرانے تھے لیکن مسلمانوں سے ہندوؤں کے گنتی کے دو گھر بھی نہ دیکھے گئے۔

مسلمانوں نے پہلے لالہ منشی رام کھتری کے گھر کو آگ لگائی۔

> مکان ایسے جلا جیسے سوکھی لکڑی چولھے میں چٹخ کر جلتی ہے۔لالہ بنشی رام کھتری نے اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو بچانے کی بڑی کوشش کی۔مگر بے چارا کامیاب نہ ہو سکا بس مجھے ایک پشپا کے مرنے کا افسوس ہے وہ مکان کے اندر جل کر مر گئی...لالہ بانشی رام کی بیوی کے سارے

کپڑے جل گئے تھے اور اس نے تیسری چھت سے چھلانگ لگا دی تھی۔☆۱۶۱

لالہ بانشی رام کے بعد رام نرائن کے گھر والوں کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا گیا جو بانشی رام کے گھر والوں کے ساتھ کیا گیا تھا کہ فرق صرف اتنا تھا کہ لالہ بانشی رام کے گھر کو بھی آگ لگائی گئی تھی جس سے ان کے گھر کا قیمتی سامان بھی جل گیا تھا اور مسلمان اسے لوٹنے سے محروم رہے تھے۔ اس لیے مسلمانوں نے رام نرائن کے گھر والوں کو چاقو سے قتل کیا۔

> پھجے نے اس کی (رام نرائن) پیٹھ میں چاقو مارا، اور وہ وہیں دھڑام سے فرش پر گر گیا تڑپنے لگا۔ اس کی ماں روتی پیٹتی باہر آئی۔ پھجے نے اسے بھی چاقو مارا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئی... اس کے بعد رام نرائن کی بیوی کی باری آئی... چار بچّوں کی ماں تھی اور بدصورت کوئی اسے مسلمان بنانے کے لیے تیار نہ تھا... ہم سب پنگوڑے کی طرف گئے بچہ سو رہا تھا رشید نے چھرا نکالا... میں نے سختی سے چھوڑو اسے۔ دراصل مجھے اپنا ننھا یعقوب نظر آ گیا تھا... بچّے کو چھوڑ کر ہم لوگ گھر کا ساز و سامان دیکھنے لگے ڈیڑھ دو ہزار کے زیور ملے اور آٹھ سو روپیہ نقد۔ ہم لوگوں نے آپس میں بانٹ لیا۔☆۱۶۲

ہندوؤں کے گھر اور خاندان کو تباہ و برباد کرنے کے بعد واحد متکلّم بھاٹی گیٹ چلا گیا وہاں جا کر اسے پتا چلا کہ ان کی غیر موجودگی میں کرشن نگر کی مہا سبھا ٹولی نے بھاٹی گیٹ کے مسلمانوں پر حملہ کر دیا تھا جس میں واحد متکلّم کی چچی، بیوی اور بچّے بھی مارے گئے مسلمانوں کے برخلاف ہندوؤں نے معصوم بچّے یعقوب کو بھی نہ چھوڑا جس کی محبت میں واحد متکلّم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ مسلمانوں کا انتقام لینے کے بعد اب وہ اپنے گھر والوں کا انتقام لینے کے لیے تیار رہو گا۔ واحد متکلّم کی ذہنی کیفیت کو کرشن نے اس طرح بیان کیا ہے:

> ... مجھے تیری قسم ہے عائشہ اگر تیرے خون کا بدلہ نہ لیا ہو تو میں اپنے باپ کی نہیں کسی سور کی اولاد ہوں۔☆۱۶۳

اس افسانے میں کرشن چندر نے فسادات کے دوران مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان پائی جانے والی نفرت، تعصب اور انتقام کی فضا کو بیان کیا ہے۔ انتقام کی آگ بجھانے کے لیے ہندو اور مسلمان دونوں اندھے ہو گئے تھے، اور انھیں انتقام کے سوا کچھ اور سوجھتا نہیں تھا۔

گورمکھ سنگھ کی وصیت

اگر چہ ہندو مسلم اختلافات تقسیمِ ہند سے بہت پہلے سے شروع ہو چکے تھے یہ اختلافات کبھی شدت اختیار کر جاتے کبھی ختم ہو جاتے۔ ہندو اور مسلمان ان حالات کے عادی ہو چکے تھے، لیکن ۱۹۴۶ء میں جو ہندو مسلم تنازعات شروع ہوئے وہ

روز بروز بڑھتے گئے اس وقت بھی بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ حالات بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے لیکن ایسا نہ ہوا، بلکہ ہندو مسلم فسادات نے اتنی شدّت اختیار کر لی کہ ان کو ختم کرنے کا حل تقسیمِ ہند کے سوا کچھ اور نہ رہا۔

منٹو کا افسانہ ''گورمکھ سنگھ کی وصیت'' اسی موضوع پر لکھا گیا ہے۔ اس افسانے میں ایک ایسے ہی شخص کا ذکر کیا گیا ہے جو ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دنوں میں حالات اچھے ہونے کا انتظار کرتا رہا یہاں تک کہ وہ اپنے بچّوں سمیت سکھوں کے ہتھے چڑھ گیا۔

ریٹائرڈ سب جج عبدالحیٰ امرت سر میں اپنی بیٹی صغریٰ، بیٹے بشارت اور نوکر اکبر کے ساتھ رہتا تھا۔ جب ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے تو ابتدا میں تو سب یہی سمجھے کہ کچھ عرصے بعد کسی نہ کسی متفقہ فیصلہ کے بعد حالات ٹھیک ہو جائیں گے، لیکن حالات ٹھیک ہونے کے بجائے تیزی سے بگڑنے لگے، مختلف جگہوں سے لوگوں کے قتل و غارت گری، لوٹ مار اور خواتین کے اغوا ہونے کی خبریں آنے لگیں تو مسلم اکثریت والے علاقوں سے ہندوؤں اور ہندو اکثریت والے علاقوں سے مسلمانوں نے گھر خالی کرنا شروع کر دیے۔

امرت سر کے جس محلّے میں عبدالحیٰ رہتا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ بھی خالی ہونے لگا۔ جج کی بیٹی صغریٰ بھی ان حالات سے بہت خوف زدہ تھی لیکن عبدالحیٰ نے اپنے بچّوں کو ڈرنے سے منع کر رکھا تھا اور اپنا محلّہ نہ چھوڑنے کا مصمم ارادہ کر رکھا تھا کیوں کہ ان حالات میں بھی عبدالحیٰ کو یقین تھا کہ ملک کے حالات کچھ ہی عرصے کے بعد معمول پر آ جائیں گے۔ اس لیے کچھ عرصے کے لیے محلّہ چھوڑنا بے کار ہے۔ عبدالحیٰ کی بہت باتیں درست ثابت ہو جایا کرتی تھیں کچھ اس وجہ سے اور کچھ باپ کی ناراضگی کے ڈر سے صغریٰ عبدالحیٰ سے محلّہ چھوڑنے کی ضد نہ کر سکی۔

عبدالحیٰ کی یہ بات غلط ثابت ہو گئی اور صرف امرت سر ہی نہیں، بلکہ پورے ملک کے حالات روز بہ روز خراب تر ہوتے گئے۔ جگہ جگہ آگ لگائی جانے لگی جس سے ہر طرف دھواں ہی دھواں نظر آنے لگا، لوگوں کو قتل کیا جانے لگا، خواتین کی حالت سب سے بدتر تھی ان کی عزت اور جان کچھ بھی محفوظ نہ تھا۔ غرض پورے ملک میں تباہی و بربادی کی ایسی آگ بھڑکی جیسے بجھانا کسی کے بس کی بات نہ رہی، لیکن عبدالحیٰ پر کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

> جب بجلی کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور ساتھ ہی نلوں میں پانی آنا بند ہو گیا تو اس نے میاں صاحب سے اپنی تشویش کا اظہار کیا... میاں صاحب نے اپنا فیصلہ نہ بدلہ اور کہا ''بے کار گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں حالات بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔'' ☆۱۶۴

ایسا نہیں تھا کہ عبدالحیٰ اپنی ضد یا ہٹ دھری کی وجہ سے اپنا شہر اور محلّہ نہیں چھوڑ رہا تھا، بلکہ امرت سر اور اپنے محلّے سے محبت نے اسے روک رکھا تھا۔ اس میں اتنی بڑی حقیقت کو تسلیم کرنے کا حوصلہ نہ تھا اور وہ اپنے اس دکھ کو اپنے بچّوں پر ظاہر نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ یہی دکھ اسے اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا۔ ایک دن فالج کے مرض کی شکل میں سب کے سامنے

ظاہر ہو گیا۔ جس سے عبدالحیٔ کی بے بسی اور صغریٰ اور بشارت کی پریشانیوں میں بھی اضافہ ہو گیا۔

میاں عبدالحیٔ کا سارا محلّہ خالی ہو چکا تھا، ان کے قریبی بازار میں ڈاکٹر گورانداتامل کے کلینک اور ڈسپنسر غلام مصطفیٰ کی ڈسپنسری پر بھی تالے پڑ گئے، اور اسی وجہ سے میاں عبدالحیٔ کا علاج بھی ممکن نہ رہا۔ جس سے صغریٰ اور بھی زیادہ دکھی ہو گئی اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ گھر سے باہر نکلنا خطرے سے باہر نہیں ہے اس نے بشارت کو باہر بھیجا اور کہا:

''کسی کو بھی بلا لاؤ۔ ابا جی کی حالت بہت خطرناک ہے۔'' ☆۱۶۵

ان حالات میں صغریٰ، بشارت اور میاں عبدالحیٔ کو ایک ہمدرد کی بھی ضرورت تھی جو ان کی دل جوئی کرے اور ان کا دکھ بانٹ سکے۔ یہی سوچ کر صغریٰ نے کہا تھا کہ کسی کو بھی بلا لاؤ۔

بشارت کو نہ کوئی دل جوئی کرنے والا ملا اور نہ ہی باپ کا علاج کرنے کے لیے کوئی ڈاکٹر یا حکیم یا کمپاؤنڈر ملا:

بشارت گیا، مگر فوراً ہی واپس آ گیا۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ چوک میں اس نے ایک لاش دیکھی، خون سے تر بتر — اور پاس ہی بہت سے آدمی ٹھاٹے باندھے ایک دکان لوٹ رہے تھے۔ صغریٰ نے اپنے خوف زدہ بھائی کو سینے کے ساتھ لگایا اور صبر و شکر کر کے بیٹھ گئی۔ ☆۱۶۶

میاں عبدالحیٔ کا مرض علاج نہ ہونے کے سبب بڑھتا جا رہا تھا۔ ان کے جسم کا داہنا حصّہ ضائع ہو چکا تھا اور ان کی قوتِ گویائی بھی متاثر ہو چکی تھی۔ اب وہ اشاروں ہی سے صغریٰ اور بشارت کو حوصلہ دیتے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

ان ہی تکلیف دہ حالات میں بہت سے روزے بھی گزر گئے اور میاں عبدالحیٔ کا خیال تھا کہ عید سے پہلے حالات بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ جیسے جیسے عید کے دن قریب آ رہے تھے صغریٰ کی اداسی میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سوچتے سوچتے جب صغریٰ کا دماغ ماؤف ہو گیا تو اس نے اپنے دس سالہ ملازم اکبر کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ جس کو دمے کا مرض تھا اور سارا دن اپنے کمرے میں پڑا کھانستا رہتا۔ صغریٰ کے مُنہ سے نمک حرام اور کام چور کا طعنہ اکبر سے برداشت نہ کیا گیا اور وہ گھر چھوڑ کر چلا گیا۔

اکبر کو ڈانٹنے کے بعد صغریٰ کو بہت ندامت ہوئی اور اب صغریٰ کو اکبر کا انتظار رہنے لگا۔ کیوں وہ پرانے ملازم سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔

اصل میں صغریٰ کو لاشعوری طور پر کسی ایسے ہمدرد کی ضرورت تھی جو انھیں حوصلہ دے سکے اور ان کا درد بانٹ سکے۔

سارے روزے گزر گئے۔ بشارت اور صغریٰ عید کا چاند دیکھ کر اپنے باپ کے پاس آئے اور اسے سلام کیا۔ انھوں نے اشارے سے جواب دیا... جو بازو ٹھیک تھا اٹھایا اور اس پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ صغریٰ کی آنکھوں سے ٹپ، ٹپ آنسو بہنے لگے تو میاں صاحب کی آنکھیں بھی نم ناک ہو گئیں۔ مگر انھوں نے تسلّی دینے کی خاطر بمشکل اپنی نیم مفلوج زبان سے یہ الفاظ نکالے، ''اللہ تبارک

تعالیٰ سب ٹھیک کر دے گا۔'' ☆۱۶۷

صغریٰ گورمکھ سنگھ کو پہنچانتی تھی۔ جب اس نے دروازے کی درز سے باہر دیکھا تو اسے گورمکھ سنگھ کی جگہ کوئی اور شخص دکھائی دیا جس کے ہاتھ میں سویوں کا تھیلا تھا۔صغریٰ کے پوچھنے پر اس نے بتایا:

''...میں سردار گورمکھ سنگھ کا بیٹا ہوں ___ سنتو کھ۔'' ☆۱۶۸

سنتوکھ سنگھ نے باہر سے میاں عبدالحیٔ کے بارے میں پوچھا۔صغریٰ سے میاں صاحب کی بیماری کا سن کر اس نے افسوس کا اظہار کیا، اور پھر گورمکھ سنگھ کے بارے میں بھی بتایا کہ وہ مر چکے ہیں اس کے ساتھ ہی سنتوکھ نے صغریٰ کو گورمکھ سنگھ کے وصیّت کے بارے میں بتایا جو اس نے مرنے سے پہلے سنتوکھ سنگھ کو کی تھی۔

...میں جج صاحب کی خدمت میں پورے دس برس سے ہر چھوٹی عید پر سویاں لے جاتا رہا ہوں ___ یہ کام میرے مرنے کے بعد اب تمھیں کرنا ہوگا۔ میں نے انھیں بچن دیا تھا جو میں پورا کر رہا ہوں...لے لیجیے سویاں۔☆۱۶۹

صغریٰ گورمکھ سنگھ کی وصیّت اور سنتوکھ سنگھ کے ایفاءِ عہد سے اتنا متاثر ہوئی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے دروازہ کھول کر سنتوکھ سنگھ سے سویوں کا تھیلا لے لیا۔

سنتوکھ نے ایک بار پھر میاں عبدالحیٔ کی بیماری پر افسوس کا اظہار کیا۔صغریٰ نے بھی گورمکھ سنگھ کی مغفرت کی دعا کی۔ سنتوکھ سنگھ میاں صاحب کو سلام بھیج کر واپسی کے لیے مڑا۔

صغریٰ سوچتی ہی رہ گئی کہ وہ اسے ٹھیرائے اور کہے جج صاحب کے لیے کسی ڈاکٹر کا انتظام کر دے۔☆۱۷۰

اگلے لمحے جو کچھ ہوا۔اس کی صغریٰ کو توقع نہ تھی۔ جب سنتوکھ سنگھ گورمکھ کی وصیّت کو پورا کر کے واپسی کے لیے مڑا تو چار نقاب پوش جلتی ہوئی مشعلیں اور تیل کے کنستر لے کر اس کا انتظار کر رہے تھے۔انھوں نے سنتوکھ سے پوچھا:

''...کیوں سردار جی،اپنا کام کر آئے؟''

سنتوکھ نے سر ہلا کر جواب دیا۔''ہاں کر آیا۔''

عبدالحیٔ سے پرانے تعلقات اور دوستی کا حق ادا کرنے کے بعد گورمکھ سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو ہندو ہونے کا حق ادا کرنے کی بھی فکر تھی،اور اس حق ادا کرنے میں بھی انھوں نے زیادہ دیر نہ لگائی۔

منٹو کے اس افسانے کا اختتام بھی قارئین کو چونکا دیتا ہے،اور اسے گورمکھ سنگھ دوستی اور دشمنی دونوں حالات میں اس کی فرض شناسی پر حیرت ہوتی ہے۔

۱۹۱۹ء کی ایک بات

سعادت حسن منٹو نے اس افسانے میں ۱۹۱۹ء میں جلیاں والہ باغ میں ہونے والے حادثے کی دردناک یادوں کو تازہ کیا ہے۔

الماس، شمشاد اور محمد طفیل اس افسانے کے خاص کردار ہیں۔ یہ تینوں کردار ایک طوائف کی اولاد ہیں۔ الماس اور شمشاد امرت سر کی مشہور طوائف ہیں جب کہ ان کا بھائی محمد طفیل ایک اوباش اور آوارہ قسم کا جوان ہے۔ طوائف کا بیٹا اور آوارہ ہونے کی وجہ سے محلّے کے لوگ اسے عرف عام میں تھیلا کنجر کہہ کر پکارتے، اور اس کی بہنوں کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے اسے گھر سے نکال کر ہمیشہ کے لیے اس سے اپنا تعلّق ختم کر لیا تھا، لیکن پھر بھی وہ اپنی کاہلی اور بے حسی کے ہاتھوں مجبور ہو کر مالی امداد کے لیے اکثر اپنی بہنوں سے کچھ نہ کچھ لیتا رہا۔

۱۹۱۹ء میں جلیاں والہ باغ میں حادثہ پیش ہوا تو محمد طفیل نے اس جلیاں والہ باغ کے جلسے میں جرنل ڈائر کی سازش سے مرنے والے ہندو اور مسلمانوں کا بہت گہرا اثر لیا اور ان کی موت اور جرنل ڈائر کے گھناونے مذاق کو اپنی توہین سمجھا، اور چند ہی لمحوں میں محمد طفیل کی سوچ اور فکر بالکل بدل گئی اس نے محلّے کے ساتھیوں اور دوستوں کو انگریزوں سے انتقام لینے کے لیے تیار کیا، لیکن صرف چند لوگوں نے چند قدم تک محمد طفیل کا ساتھ دیا، اور ان کی بددلی اور اپنی زندگی سے محبت نے انھیں پلٹ جانے پر مجبور کیا، لیکن اس کے برعکس محمد طفیل جو بدبھی تھا اور بدنام بھی۔ سارے شرفا اور عزت داروں کو پیچھے چھوڑ گیا، اور کئی ہندو اور مسلمانوں کے قتل اور ملک کی بے عزتی کا بدلہ لے کر شہادت جیسے اعلیٰ رتبے تک پہنچ گیا، اور اس کے سارے عیب اور داغ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے۔

اس افسانے میں منٹو نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ وطن اور مذہب سے محبت ایسا جذبہ ہے جو صرف معاشرے کے وطن پرستوں یا مذہبی لوگوں کے دلوں ہی میں نہیں پایا جاتا، بلکہ ملک قوم یا مذہب کی عزت کا سوال ہو تو عام انسانوں کی غیرت بھی اس طرح جوش مارتی ہے جیسے ملک کے فوجیوں یا مذہبی علما کی۔

حتیٰ کہ محمد طفیل جیسے لوگ بھی مذہب ملک اور قوم کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے سے بھی نہیں گھبراتے۔ طفیل کی اپنی شہادت کے بعد سب کے دل جیت لیے لوگوں نے اس سے جتنی نفرت کی تھی اور جتنا حقیر جانا تھا سمجھنے لگے اور اس کی بہنیں جنھوں نے اسے عاق کر دیا تھا اس کی شہادت پر رو رو کر بے ہوش ہو گئیں۔

افسانے میں جو دوسری حقیقت سامنے آئی ہے وہ طوائف کی فطرت کے بارے میں ہے۔ الماس اور شمشاد جو طفیل کی بہنیں پہلے اور طوائف بعد میں تھیں اور انھیں محمد طفیل کے مرنے کا دکھ بھی تھا، لیکن جب جرنل ڈائر نے محمد طفیل کے ہاتھوں اپنے مرے ہوئے ساتھیوں کا بدلہ لینے کا ارادہ کیا تو اور مسلمانوں کی ایک بار بے عزتی کرنے کے لیے الماس اور شمشاد کو اس وقت

بلایا ہے۔ جب محمد طفیل کو مرے ہوئے صرف دو دن تھے، اور یوں اتنے مختصر سے عرصے کے بعد وہ ان دونوں بہنوں سے ایک محفل میں مجرے سن کر اُنھوں نے صرف ان دونوں بہنوں ہی سے نہیں، بلکہ پوری ہندوستانی قوم اور مسلمانوں سے اپنے ساتھیوں کی موت کا بدلہ لے لیا۔

الماس اور شمشاد چاہتیں تو جانے سے انکار کرسکتی تھیں لیکن انھوں نے اپنے مذہب، ملک اور بھائی کسی کی بھی عزت کا پاس نہ رکھا اور ان سب کے مقابلے میں اپنے پیشے کو فوقیت دے کر اپنے بھائی کی شہادت پر بٹا لگا دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ حالات کیسے ہی ہوں بیش تر طوائفیں اپنے پیشے کی خاطر سب کچھ قربان کرسکتی ہیں۔

گڈریا

''گڈریا'' اشفاق احمد کا مشہور افسانہ ہے۔ جس میں انھوں نے تقسیمِ ہند سے پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپس کے دوستانہ تعلّقات کو دکھایا ہے، اور پھر آخر میں تقسیمِ ہند کے بعد کے حالات کو بیان کیا ہے۔

افسانے کا ناقابلِ فراموش کردار ''داؤجی'' ہے جو ایک ہندو منشی ہے جو افسانے کے واحد متکلّم کردار کا اُستاد ہے۔

اشفاق احمد نے افسانہ واحد متکلّم کردار کے ذریعے بیان کیا ہے۔

افسانے کا واحد متکلّم کردار امتحان میں فیل ہو جاتا ہے گھر والوں کی ناراضگی اور ڈانٹ پھٹکار کے بعد وہ گھر چھوڑنے کا فیصلہ کرتا ہے لیکن ایسا ہونے سے پہلے ہی داؤجی نے اس کے والد کی اجازت سے اسے پڑھانا شروع کر دیا۔

داؤجی اگرچہ ہندو تھے لیکن وہ واحد متکلّم کردار کے مثالی اُستاد ثابت ہوئے۔ انھوں نے واحد متکلّم کردار کو نہ صرف نصابی تعلیم دی، بلکہ اسے اسلامی تعلیمات سے بھی آگاہ کرتے۔

''...کون سا سپارہ پڑھ رہے ہو؟''

''چوتھا'' میں نے وثوق سے کہہ دیا۔

''کیا نام ہے تیسرے سپارے کا؟''

''جی پتا نہیں؟''...میری آواز پھر ڈوب گئی۔

''تلک الرسل'' ☆۱۷۱

ایک لمحہ بھی ایسا نہ ہوتا جس میں داؤجی واحد متکلّم کردار کو کچھ نہ سکھاتے۔ چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے وہ واحد متکلّم کردار کو پڑھاتے رہتے۔ سارا دن پڑھنے کے بعد جب واحد متکلّم کردار سوتا تو وہ اسے جگا کر پڑھانا شروع کر دیتے، لیکن واحد متکلّم اُستاد کی ایسی مہربانیوں کو اپنے لیے ایک مصیبت سمجھتا۔

داؤجی نے میری زندگی اجیرن کردی...سارادن اسکول کی بکواس میں گزرتا اور رات گرمیوں کی مختصر سی رات۔ان کے سوالات کا جواب دینے میں گزر جاتی...مونگ رسول اور مرالہ کی نہروں کی بابت پوچھ رہے ہیں۔ میں نے ٹھیک بتایا ہے اور پھر اسی سوال کو دہرا رہے ہیں۔ میں نے پھر ٹھیک بتادیا۔انھوں نے پھر اپنی نہروں کو آگے لاکھڑا کیا۔☆۱۷۲

اپنی سچی اور مخلصانہ کوشش اور محنت سے داؤجی اپنے نالائق شاگرد کو پڑھائی کی طرف راغب کرنے میں کام یاب ہوگئے جب امتحانوں کے دن قریب آئے تو داؤجی نے عام دنوں سے زیادہ واحد متکلّم کردار پر توجہ دی۔ واحد متکلّم کے امتحان دے کر آنے کے بعد داؤجی اس سے ایک ایک سوال کے بارے میں پوچھ گچھ کرتے۔

...کون سا سوال غلط ہوگیا؟ میں نے جھوم کر کہا،''چار دیواری والا''...تو نے میری بات نہ مانی۔ بیس نمبر ضائع کیے... پورے بیس نمبر اور داؤجی کا چہرہ دیکھ کر میری اسّی فی صدی کام یابی بیس فی صدی ناکامی کے نیچے یوں دب گئی گویا اس کا کوئی وجود نہ تھا۔☆۱۷۳

میٹرک پاس کرنے کے بعد واحد متکلّم نے شہر جا کر ایک کالج میں داخلہ لے لیا۔کالج جانے کے بعد داؤجی اور واحد متکلّم کا رابطہ کم ہوتے ہوتے ختم ہوگیا۔

اسی عرصے میں ہندو مسلم فسادات شروع ہوگئے۔واحد متکلّم کو اس کے گھر والوں نے اپنے قصبے میں بلالیا۔چوں کہ تقسیمِ ہند کے نتیجے میں وہ علاقہ مسلمانوں کے حصّے میں آیا تھا۔اس لیے ہندو اور سکھ یہ علاقہ چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔

فسادات اور لڑائیوں کی وجہ سے قصبے میں کرفیو لگ گیا لیکن جیسے ہی کرفیو ختم ہوا واحد متکلّم داؤجی کی خبر لینے آ گیا۔ داؤجی اور اس کے گھر والے بھی قصبہ چھوڑ کر جا چکے تھے۔جس کا واحد متکلّم اور اس کے گھر والوں کو بہت افسوس ہوا، لیکن تیسرے دن ایک جگہ تقریباً دو سو آدمیوں کی بھیڑ دیکھی واحد متکلّم نے بھی اس بھیڑ میں گھسنے کی کوشش کی، لیکن مہاجرین کے غصّے اور اشتعال کو دیکھ کر وہ رک گیا۔

اتنے میں اس بھیڑ سے کسی نے چلاّ کر کہا،''اوئے رانو جلدی آ... سای پنڈت۔ تیری سامی۔☆۱۷۴

رانو اور پنڈت کا نام سن کر واحد متکلّم چونک گیا، اور فوراً اس کا دھیان داؤجی کی طرف گیا۔کردار کی اس کیفیت کو افسانے میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

...میرے دل کو ایک دھکا سا لگا جیسے انھوں نے داؤجی کو پکڑ لیا ہو میں نے ملزم کو دیکھے بغیر اپنے قریبی لوگوں سے کہا۔''یہ بڑا اچھا آدمی ہے، بڑا نیک آدمی ہے۔اسے کچھ مت کہو... یہ تو...''

خون میں نہائی ہوئی چند آنکھوں نے میری طرف دیکھا اور نوجوان گنڈا اسی تول کر بولا، ''بتاؤں تجھے بھی! آ گیا بڑا حمایتی بن کر! تیرے ساتھ کچھ ہوا نہیں ناں!'' اور لوگوں نے گالیاں بک کر کہا، ''انصار ہوگا شاید۔'' ☆۱۷۵

اشفاق احمد نے اس افسانے میں تقسیمِ ہند سے پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپس کے دوستانہ تعلّقات کو داؤ جی اور واحد متکلّم کے کردار کے ذریعے بیان کیا ہے۔

داؤ جی اور واحد متکلّم کے درمیان پڑھائی کے معاملے میں اکثر لڑائی جھگڑا ہوتا لیکن مذہبی یا تہذیبی معاملات کبھی کسی ناراضی کا سبب نہ بنے۔

بظاہر لاپرواہ واحد متکلّم داؤ جی کا ایک لاپرواہ طالب علم تھا لیکن وہ اپنے اُستاد کی توہین و تذلیل برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ نتیجتاً جب وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی اپنی جان خطرے میں پڑ جاتی ہے، اور وہ اپنے مخلص اور بے غرض اُستاد کے احسانات چکانے میں ناکام ہو جاتا ہے۔

افسانے کے ذریعے اشفاق احمد نے لوگوں کی بعض ایسی مجبوریوں کو بیان کیا ہے جس سے وہ فسادات کے بعد دوچار ہوئے اور انھیں اپنے مرنے والوں یا لٹنے والوں کا بدلہ دشمن قوم کے بے گناہ افراد سے لینا پڑا، اور بعض لوگ ایسے بھی تھے جو انسانی ہمدردی یا صدیوں پرانے تعلّقات کے باعث ہندوؤں یا مسلمانوں کو تحفظ دینا چاہتے تھے لیکن معاشرے کے خوف سے وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔

اجنتا

خواجہ احمد عبّاس نے یہ افسانہ انسان دوستی کے موضوع پر لکھا ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے بمبئی میں ہونے والے ہندو مسلم فسادات کا ذکر کیا ہے، اور اس کے ساتھ ہی فسادات کی وجہ سے لوگوں کے رویّوں میں آنے والے منفی خیالات کو بھی بیان کیا ہے۔

نرمل اور احمد افسانے کے ہیرو ہیں جو لوگوں کے دلوں سے نفرت اور تعصّب کو نکالنا چاہتے ہیں۔ شہر کے تقریباً ہر فرد کے دل میں مخالف مذہب اور قوم کے لیے نفرت، شک اور تعصّب جیسے جذبات موجود ہیں۔ یہاں تک کہ عورتیں بھی جو مردوں کے مقابلے میں رحم دل اور درگزر کرنے والی ہوتی ہیں نفرت کی اس جنگ میں مردوں کے ساتھ ساتھ تھیں۔

...ایک بوڑھا... بوری مسلمان اپنے خون میں لت پت سڑک کے بیچوں بیچ پڑا آخری سانس لے رہا تھا، اور ساتھ کے مکان کی بالکنی پر اور اس کی نچلی منزل کی دہلیز پر مرہٹہ عورتوں کا ایک

گروہ کھڑا ہنس رہا تھا جیسے کوئی نہایت دل چسپ اور مزے دار تماشا ہو رہا ہو۔☆۱۷۶

ہندو خواتین کی طرح مسلمان خواتین بھی ہندوؤں کو مرتا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھیں۔

اری او گل بانو دیکھ تو سہی، ایک کافر ہماری گلی میں مارا گیا ہے۔"

...اور پھر تین چار جوان، ادھیڑ بوڑھی عورتوں کی خوشی سے بھری آوازیں۔

اس کی چٹیا تو دیکھ

...اچھا ہوا! یہ سب پوربیے دودھ میں برابر کا پانی ملاتے ہیں۔اب سزا ملی ہے۔

گرگام میں جو مسلمان مارے ہیں۔ ہمارے آدمی بھی ان میں سے ایک ایک کا بدلہ لیں گے۔☆۱۷۷

پورا بمبئی ''ہند بمبئی'' اور مسلم بمبئی میں تقسیم ہو گیا تھا۔نرمل اور احمد اپنے اپنے علاقے کے لوگوں کے دلوں سے نفرت اور تعصب نکالنا چاہتے تھے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انھوں نے ''شانتی دَل'' کے نام سے ایک فلاحی تنظیم قائم کی ۔جس کا دوسرا مقصد لوگوں سے چندہ جمع کر کے بلا امتیاز مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرنا تھا،لیکن وہ اپنے مقصد میں کام یاب نہ ہو سکے۔

جب چندہ جمع کرنے کا مرحلہ آیا تو مسلمانوں نے یہ کہہ کر چندہ دینے سے انکار کر دیا:

یہ''شانتی دَل'' کے پردے میں ہندو کیا کر رہے ہیں، ہم خوب جانتے ہیں...ہم نے بھی اپنی حفاظت کے لیے پٹھان رکھ لیے ہیں۔☆۱۷۸

اسی طرح ہندوؤں کو بھی مسلمانوں پر اعتماد نہ تھا اس لیے انھوں نے کہا:

''آپ کے نہتے والنٹیر ہماری حفاظت کیا خاک کر سکتے ہیں ہم سکھ دربان رکھ رہے ہیں۔''☆۱۷۹

بہت کوشش اور منت سماجت کے بعد کچھ ہندو اور مسلمان شانتی دل کے ممبر بن گئے،اور کچھ سرمایہ داروں نے احمد اور نرمل کو چندہ بھی دیا،لیکن جلد ہی ہندو ممبران اور چندہ دینے والے سرمایہ داروں نے ''شانتی دل'' کے لیے کام کرنے اور چندہ دینے کے لیے یہ شرط رکھ لی کہ'' شانتی دل'' میں صرف ہندو شامل ہوں اور وہ ہندوؤں کی مدد کریں۔ یہاں تک کہ ان ہندوؤں نے احمد کو بھی شانتی دل میں برداشت کرنے سے انکار کر دیا۔

گجراتی سیٹھ نے کہا،''ہم تو صاف بولیں گے۔اگر مسلمان رہے گا تو ہم چندہ نہیں دیں گے۔''

سیٹھ نے کہا،''ہم استعفیٰ دے کر ہندو مہاسبھا کے شور کھشن دَل میں شامل ہو جائیں گے۔''

مگر چالاک بوڑھے وکیل نے ...نرمل سے مخاطب کرتے ہوئے کہا،''...یہ ہندو علاقہ ہے، اگر یہاں پہرہ دیتے ہوئے اس بے چارے مسلمان سپاہی کو کچھ ہو گیا تو کون ذمّے دار ہو گا؟ آپ؟'' ☆۱۸۰

نرمل کو نہ چاہتے ہوئے بھی احمد کو شانتی دل سے برطرف کرنا پڑا۔ لیکن اس کے بعد وہ خود بھی شانتی دل میں نہ رہا۔ اسے ہندوؤں کے اس تعصبانہ رویے سے سخت تکلیف پہنچی، اور جب اسے یقین ہو گیا کہ ہر کوشش بے سود ثابت ہو گئی تو وہ اپنی دوست کے مشورے پر اجنتا چلا گیا لیکن وہاں جا کر بھی اسے مرتے ہوئے ہندوؤں اور مسلمانوں نے بہت بے چین رکھا اور ایک بار پھر وہ بمبئی آنے پر مجبور ہو گیا یہ جانتے ہوئے بھی وہ نفرت اور تعصب کی آگ کو بجھا نہ سکے گا۔

خواجہ احمد عباس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ۱۹۴۷ء کے مخصوص حالات نے انسانی عقل و فہم کو مسحور کر دیا تھا اور وہ تعصب کا ایسا شکار ہو گئے تھے کہ ان کے نزدیک انسانیت ایک بے معنی چیز بن کر رہ گئی۔ وہ صرف ہندو اور مسلمان تھے اور وہ بھی ایک دوسرے کے بدخواہ اور دشمن جانی جو ایک دوسرے کے جان، مال اور عزت و آبرو سے کھیلنا اپنے لیے کارِ ثواب سمجھتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں جو حالات و واقعات ہوئے وہ خواجہ احمد عباس کی موقف کا تائید کرتے ہیں۔

انسان کی لاش

انگریزوں نے برِصغیر میں اپنی حکومت قائم کرنے کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے متنفر کیا، اور ان کے درمیان جو مذہبی اختلافات تھے۔ انھیں ہوا دی۔ یہ اختلافات روز بروز بڑھتے چلے گئے تو ایک الگ ملک کی ضرورت پیش آئی اور ہندوستان کو تقسیم کر کے دو ملک ہندوستان اور پاکستان قیام میں آئے۔

اس حقیقت کو مہندر ناتھ نے استانی جی اور بملا کے کردار کے ذریعے بیان کیا ہے۔

تقسیمِ ہند کے بعد ہندوستان میں ہجرت کر کے آنے والے ہندوؤں کے کیمپ میں اسکول قائم کیا گیا۔ اس اسکول کی طالبات ہندو تھیں جب کہ استانی جی مسلمان تھیں ملک کی نئی تشکیل کے بعد اب استانی جی کو ہندوستان کے نئے جغرافیے کے بارے میں پڑھانا تھا۔

... یہ ہے ہندوستان! یہ ہے ہمارا دیس! یہ ہیں اس کے پہاڑ۔ یہ ہے مونٹ ایورسٹ... یہ ہے کشمیر...راوی کے اس پار مسلمان بستے ہیں، اور ادھر ہندو...اس کی حدیں بھول نہ جانا۔ ☆۱۸۱

تمام طالبات استانی جی جی کی بات پوری توجہ سے سنتیں اور وہ جو بھی سبق پڑھاتیں اسے فوراً یاد کر لیتی تھیں، لیکن بملا نے تو توجہ سے استانی جی کا سبق سنتی اور نہ ہی اسے کبھی سبق یاد ہوتا۔ جس کی وجہ سے اسے استانی جی سے بہت ڈانٹ پڑتی۔

ایک دن بملا نے استانی جی کو بتایا:

...میرے پتا جی کو کل گاؤں میں قتل کر دیا گیا۔ وہ چھپ کر ایک مسلمان کے گھر میں ٹھیرے ہوئے تھے، کہ لوگوں کو علم ہوگیا۔ انھوں نے اس مسلمان کو مار ڈالا اور میرے پتا جی کو بھی۔☆۱۸۲

بملا کی درد بھری داستان سن کر استانی جی کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا اور اس دل میں بملا کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوگئے۔ اب استانی جی کو بملا اپنی ایسی سہیلی لگی جس سے وہ اپنا ہر دکھ بیان کر سکے۔ استانی جی نے بھی بملا کو بتایا کہ:

میرا بھائی جالندھر میں تھا۔ ہندوؤں کے قبضے میں آ گیا اور بے چارا مارا گیا۔ ایک ہی بھائی تھا میرا۔ خاندان کی آخری نشانی تھا۔☆۱۸۳

ان حادثوں نے بملا اور استانی جی ہی کو نہیں، بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔

اس افسانے میں مہندر نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہندو مسلم فسادات کے ذمے دار ہندو یا مسلمان نہیں تھے، بلکہ ان دونوں کے درمیان نفرت کا بیج بونے والے انگریز تھے۔ اگرچہ ان فسادات کے نتیجے میں بیش تر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی طویل دیوار کھڑی ہوگئی تھی لیکن ان حالات میں بھی ایسے ہندو اور مسلمان موجود تھے جن کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے پائی جانے والی محبت کم نہ ہوئی تھی۔

جیسا کہ مہندر نے افسانے میں لکھا ہے:

... پہلے یہ دونوں بھائی بھائی تھے۔ بڑے آرام اور پیار سے رہتے تھے! اگر گھر میں لڑائی جھگڑا ہوتا تھا تو خود ہی نبٹ لیتے تھے۔ اب کے جھگڑا ہوا تو انھوں نے انگریزوں کو بلایا، اور انگریز نے دونوں کو اپنا اپنا حصہ دے دیا... ہندو مسلمان سے نفرت کرتا ہے ...اگر پاکستان جانا ہو تو پاسپورٹ لے کر جاؤ اور ہندوستان آنا ہو تو بھی پاسپورٹ لے کر آؤ۔☆۱۸۴

تانتیا

شوکت صدیقی نے اس افسانے میں غربت اور افلاس کو بیان کیا ہے اس سلسلے میں انھوں نے تانتیا کے کردار کے ذریعے یہ بتایا ہے کہ غربت انسان کو کس قدر بے حس اور خود غرض بنا دیتی ہے۔

تانتیا ایک غریب لڑکا تھا۔ اس کی زندگی ایک مسافر کی سی تھی۔ وہ کسی ایک جگہ مستقل نہیں رہتا تھا۔ ہوٹلوں میں آنے جانے والے لوگوں کے بچے کھچے کھانے سے وہ اپنا پیٹ بھر لیتا تھا۔ تانتیا کی زندگی اسی انداز سے گزر رہی تھی کہ ۱۹۴۷ء کے

فسادات ہو گئے اور وہ لوگوں کا بچا کھچا کھانا کھانے سے بھی محروم ہو گیا۔ فسادات کے دوران جب کرفیو لگا ہوا تھا۔ تانتیا ایک ہوٹل کے پیچھے بہت دیر تک بیٹھا رہا لیکن اسے کھانا نصیب نہ ہو، اور جب اس نے ایک کتے کو ہڈی چباتے ہوئے دیکھا تو اس کی بھوک اور بھی چمک گئی۔ تانتیا نے اپنا سارا غصہ کتے پر اتارا اور اس کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا۔ بھاگتے بھاگتے وہ ایک کوٹھی میں پہنچ گیا۔ جہاں ایک تنہا لڑکی کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ لڑکی کو تنہا دیکھ کر تانتیا پیٹ کی بھوک کو بھول گیا اور اس کی جنسی بھوک شدّت اختیار کر گئی وہ اپنی بھوک اس وقت تک مٹاتا رہا، جب تک لڑکی بے ہوش نہ ہو گئی تو اسے مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد بلوائی گھر کے اندر گھس آئے لیکن یہاں انھیں جب ایک مردہ لڑکی کے کچھ نہ ملا تو وہ لوٹ گئے اور جب بلوائیوں نے اس گھر کو آگ لگائی تو تانتیا گھر سے نکل کر بھاگا لیکن نمو (لڑکی) کی چیخیں سن کر وہ نمو کو گھر سے نکال لایا لیکن باہر گشت کرنے والے سپاہیوں کا خیال تھا کہ نمو پر ان کا زیادہ حق ہے۔ انھوں نے نمو کو تانتیا سے چھین لیا۔

اس موقع پر تانتیا جلنے اور کڑھنے کے سوا کچھ اور نہ کر سکا، اور اس نے اجنبی سمت چلنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ ایک جگہ بیٹھ گیا جہاں اسے ایک لاش اور ایک خوف زدہ آدمی نظر آیا تانتیا نے اسے اپنے پاس بلایا تو وہ آدمی اور بھی خوف زدہ ہو گیا اور اس نے تانتیا سے پوچھا:

''تم ہندو ہو یا مسلمان؟''

تانتیا جھنجھلا کر بولا ''میں کوئی بھی ہوں اب ہندو مسلمان کے بچے پہلے یہ بتا کوئی سگرٹ وگرٹ بھی ہے؟''

وہ آدمی کہنے لگا، ''نہیں میرے پاس سگرٹ نہیں ہے۔ نہ جانے کس طرح جان بچا کر بھاگا ہوں تمھیں سگرٹ کی پڑی ہے۔'' ☆۱۸۵

نمو کے جانے کے بعد تانتیا کی بھوک ایک بار پھر چمک گئی تھی اور جب اسے اجنبی آدمی سے سگرٹ بھی نہ ملی تو ہر طرف بکھری ہوئی لاشوں کو دیکھ کر تانتیا نے یہ نظریہ پیش کیا:

روز جو اتنے بہت سے آدمی بلوے میں مر رہے ہیں دیکھو کتنا گوشت بے کار جا رہا ہے۔ سرکار اس کو سکھا کر کیوں نہیں رکھ لیتی۔ پھر کال تو یوں بھی پڑ رہا ہے۔ کتنے ہی بھوکوں کا بھلا ہو جائے گا، اور تانتیا نے اس (اجنبی مسافر) کی پیٹ پر زور سے ہاتھ مارا۔ ابے تو تو بہت تگڑا ہے تو مرے گا تو بہت سا گوشت نکلے گا، اور ڈھیر چربی بھی نکلے گی۔ ☆۱۸۶

افسانے کے اس حصّے میں شوکت صدیقی نے تانتیا کی بے حسی اور خود غرضی دکھائی ہے جہاں اسے صرف اپنے پیٹ کی آگ بجھانے سے غرض ہے۔ اس کی یہ ضرورت کیسے پوری ہوتی ہے۔ اس سے اسے کوئی غرض نہیں۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی

اور بہت سے دوسرے بھوکوں کی بھوک ختم کرنے کے لیے انسانی گوشت کھانے کا سوچا۔

اس کے بعد تانتیا نے اجنبی مسافر کی جیب سے سارے پیسے نکال لیے تا کہ وہ اپنی ضروریات پوری کر سکے۔ اس کے اس عمل سے اجنبی مسافر بہت گڑگڑایا اور اس نے تانتیا کو بتایا:

''تمھارے دل میں ذرا رحم نہیں۔ میرا گھر جل رہا ہے سب کچھ لٹ گیا۔ بیوی کو بھی مار ڈالا بچوں کو بھی قتل کر دیا۔ میری جوان لڑکیوں کو بھگا لے گئے۔ اب میرے پاس رہ ہی کیا گیا ہے۔ عزت تو تھی وہ بھی برباد ہوگئی۔۔۔مگر تانتیا ہنستا رہا۔ ابے تو اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے لڑکیوں کو کوئی نہ کوئی تو لے ہی جاتا۔ کوئی اور نہ لے گیا وہ لے گئے اس میں کیا ہوا۔'' ☆۱۸۷

اجنبی مسافر کو اداس کر کے تانتیا ایک بار پھر ان جانے راستے پر چل پڑا جہاں کرفیو لگا ہوا تھا پولیس نے اسے روکنا چاہا لیکن وہ آگے ہی چلتا گیا مجبوراً پولیس کو فائرنگ کرنا پڑی۔ جس سے تانتیا مر گیا اور تانتیا نے اجنبی مسافر سے جو رقم لوٹی تھی وہ پولیس والوں نے اس سے لے لی۔

شوکت صدیقی کے بیش تر افسانوں کا موضوع معاشی مسائل ہوتا ہے۔ یہی ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔ جب انھوں نے فسادات کے موضوع پر لکھا تو بھی مہاجرین اور فسادات کے دوران مختلف حادثات کی وجہ سے پیدا ہونے والے معاشی مسائل کو اپنے افسانوں میں بیان کیا۔

اس افسانے میں تانتیا کا کردار اپنی معاشی ضروریات پوری کرنے کے لیے بار بار جارحانہ اور غیر اخلاقی رویہ اختیار کر رہا ہے، لیکن پھر بھی وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا، بلکہ اسے اس سے بڑی مچھلیاں نگل لیتی ہیں۔

تانتیا کے کردار کے ذریعے شوکت صدیقی نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ پیٹ واقعی بڑا ظالم ہوتا ہے وہی انسان کو برائی کی طرف دھکیلتا ہے اور انسان دوسرے کے جذبات و احساسات کو بھلا کر صرف اپنی غرض کو پوری کرنے کے لیے غلط راستوں کو اپنا لیتا ہے۔

سیاہ حاشیے

''سیاہ حاشیے'' سعادت حسن منٹو کے افسانچوں کا مجموعہ ہے۔ جس کے بیش تر افسانچوں کا موضوع قتل و غارت گری اور لوٹ مار ہے۔

افسانچوں میں اگر چہ ہندو مسلم فسادات بیان کیے ہیں اور انھوں نے ہندو اور مسلمانوں کے فرقہ وارانہ جھگڑوں کا بھی ذکر کیا ہے اور اس سلسلے میں جو افسانچے لکھے ہیں اس میں ایک کردار ظالم اور دوسرا مظلوم ہے لیکن بیش تر افسانوں میں منٹو نے یہ

ظاہرنہیں کیا کہ کون سا کردار ظالم اور کون سا کردار مظلوم ہے۔ان کا یہ رویہ ان کے غیر جانب دار ہونے کی دلیل ہے۔

''سیاہ حاشیے'' کے بارے میں محمد حسن عسکری نے یہ رائے دی ہے:

> فسادات کے متعلق جتنے بھی افسانے لکھے گئے ہیں ان میں منٹو کے یہ چھوٹے چھوٹے لطیفے سب سے زیادہ ہول ناک اور سب سے زیادہ رجائیت آمیز ہیں۔منٹو کی دہشت اور منٹو کی رجائیت سیاسی لوگوں یا انسانیت کے نیک دل خادموں کی دہشت یا رجائیت نہیں، بلکہ فن کار کی دہشت اور رجائیت۔اس کا تعلق بحث وتمحیص یا تفکر سے نہیں ہے، بلکہ ٹھوس تجربے سے، یہی منٹو کے ان افسانوں کا واحد امتیاز ہے۔☆۱۸۸

اسی طرح ڈاکٹر محمد صادق نے سیاہ حاشیے پر اس طرح تبصرہ کیا ہے:

> ...اس میں کوئی شک نہیں کہ منٹو ذہنی طور پر ان فسادات سے بہت متأثر ہوئے تھے اس لیے انھوں نے ان افسانوں میں حقائق کے اظہار میں بڑی سفا کی سے کام لیا ہے۔☆۱۸۹

افسانچوں کی ایک خوبی ان کا اختصار ہے۔

منٹو کا کمال یہی ہے کہ انھوں نے چند سطروں کے افسانچوں میں بہت بڑے المیے بیان کر دیے۔بعض افسانے خاص طور پر ''مزدوری''، ''پٹھانستان'' اور ''جائز استعمال'' بظاہر لطیفے لکھے ہیں لیکن ان لطیفوں میں بھی معاشرے کی تلخیوں کو بیان کیا گیا ہے۔سیاہ حاشیے پر انیس ناگی نے اِس طرح تبصرہ کیا ہے:

> فسادات کے موضوع پر منٹو کے ''سیاہ حاشیے'' زہر خند کی حیثیت رکھتی ہے۔منٹو نے aphorism کے ذریعے ۱۹۴۷ء کے واقعات مضحکہ خیز انداز میں بیان کیے ہیں۔غالباً اِس کتاب کا پس منظر ۴۸۔۱۹۴۷ء کا لاہور ہے۔اِس دور میں جس قسم کے متضاد مضحکہ خیز اور دکھ بھرے واقعات پیش آئے، ''سیاہ حاشیے'' اِن کا مجموعہ ہے۔☆۱۹۰

''مسوری'' اور ''اصلاح'' میں دو مردوں کی زندگی سے شدید محبت کو دکھایا گیا ہے لیکن طبی معائنہ کے بعد مخالف مذہب کے لوگوں نے انھیں موت کے حوالے کر دیا۔

''ہمیشہ کی چھٹی'' اور ''حیوانیت'' میں بھی انسان کی زندگی سے محبت کو دکھایا گیا ہے ان افسانچوں کے کردار موت سے بچنے کے لیے اور زندگی کی سخت ترین حالات میں بھی زندہ رہنے کی خواہش کرتے ہیں لیکن ناکام ہو جاتے ہیں۔

''استقلال'' میں ایک کٹر مسلمان کو اپنی زندگی سے زیادہ مذہب کی فکر ہے اور مذہب کا پاس رکھنے کے لیے وہ نقصان اُٹھانے کو تیار ہو جاتا ہے۔

جب کہ ''کھاد'' میں ایک سکھ اپنے کیس کٹنے کے غم میں خودکشی کر بیٹھا۔

''کھاد'' اور ''استقلال'' دونوں افسانچوں میں انسان کی اپنے مذہب سے فطری محبت کو بہت اچھے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

''حلال اور جھٹکا'' میں ایک سکھ نے اپنے دوست کا صرف اس لیے جھٹکا کیا کہ اس نے ایک مسلمان کو جھٹکا دینے کے بجائے ''حلال'' کر کے سکھ مت کے اصولوں کی خلاف ورزی کی۔

''گھاٹے کا سودا'' اور ''رعایت'' میں منٹو نے اپنے منفرد انداز میں خواتین کی بے حرمتی کے واقعات کو بیان کیا ہے۔ خاص طور پر ''رعایت'' میں افسانچے کا آخری جملہ:

''چلو اس کی مان لو۔ کپڑے اتار کر ہانک دو ایک طرف۔'' ☆۱۹۱

فسادات کے دوران خواتین کے ساتھ ہونے والی بے حرمتی اور تذلیل و توہین کا ثبوت ہے۔

فسادات کے دنوں میں جب قتل و غارت گری کی فضا میں ہر شخص اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا لیکن بعض لوگ ایسے جنھیں ان حالات میں بھی روپے پیسے کی ہوس تھی اور وہ اسی کے لیے کوشاں تھے۔ اسی حقیقت کو منٹو افسانچے ''خبردار'' میں بیان کیا ہے۔

''قسمت'' ان لوگوں کے بارے میں لکھا گیا افسانچہ ہے جنھوں نے حالات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے لوٹ مار کی ہر ممکن کوشش کی۔

منٹو کا افسانچہ ''جوتا'' سیاہ حاشیے میں لکھے گئے بہترین افسانچوں میں سے ایک ہے۔ جس میں وقت اور حالات کے آگے انسان کی بے بسی کو اچھوتے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

فسادات کی پر خطر اور پر آشوب فضا کو برداشت کرنا ہر انسان کے بس کی بات نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے اسی زندگی سے نجات کرنے کی آرزو کی۔

مذکورہ بالا افسانچے ''سیاہ حاشیے'' کے اہم افسانچوں میں سے ہیں جن میں فسادات کے دوران ہونے والے مختلف حادثات کو بیان کیا ہے۔ ان افسانچوں اور اس کے علاوہ دوسرے افسانچوں کا تجزیہ آئندہ صفحات میں کیا گیا ہے۔

ساعتِ شیریں

اس میں متعصب مسلمانوں کی خوشی کا ذکر کیا ہے جو انھیں گاندھی کی موت کی صورت میں حاصل ہوئی اور اس کا اظہار انھوں نے شیرینی بانٹ کر کیا۔

مزدوری

اس افسانچے میں منٹو نے فسادات کے دوران ہونے والی لوٹ مار کو مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ لوٹ مار کے لیے بھی سب نے اپنی پسند اور شوق کو ترجیح دی تھی، لیکن بدقسمتی سے ایک کشمیری پٹھان نے جب چاول کی بوری

اُٹھائی تو پولیس نے اس پر فائرنگ کر دی جس سے وہ زخمی ہو گیا، لیکن چاول کھانے کے شوق میں وہ زخمی حالت میں بھی بھاگتا رہا، اور بالآخر ایک جگہ گر پڑا۔ جب پولیس اسے تھانے لے گئی تو اس نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا:

''...حضرت، آپ مجھے کیوں پکڑتی ہے — میں تو غریب آدمی ہوں — چاول کی ایک بوری لیتی — گھر میں کھاتی — آپ ناحق مجھے گولی مارتی۔'' ☆۱۹۲

پھر بھی وہ پولیس کو قائل نہ کر سکا تو اس نے اس مسئلے کا حل نکالتے ہوئے کہا:

''اچھا حضرت تو بوری اپنے پاس رکھو۔ میں اپنی مزدوری مانگتی — چار آنے۔'' ☆۱۹۳

کشمیری کا یہ مشورہ فسادات جیسے المیہ افسانوں کو بھی مزاحیہ رنگ دے دیتا ہے۔ جسے مزاح سے زیادہ انسان کے اندر پوشیدہ حماقت کا اظہار کہنا چاہیے۔

تعاون

تقسیمِ ہند کے اعلان کے ساتھ عوام کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اب ہجرت کا عمل ناگزیر ہے۔ ہجرت کے لیے انھیں اپنا گھر بار، زمینیں اور جائیداد وغیرہ سب کو چھوڑنا تھا۔ اس لیے بہت سے لوگ ایسے بھی تھے۔ جنھوں نے ہجرت سے پہلے ہی اپنے گھر کا قیمتی سامان مقامی لوگوں میں تقسیم کر دیا۔

اس افسانچے میں بھی منٹو نے ایک ایسے کردار کا ذکر کیا ہے جس نے بلوائیوں کو خود بتایا کہ فلاں گھر ایک بہت امیر شخص کا ہے اور اس نے چالیس پچاس بلوائیوں کو اپنے گھر کا قیمتی سامان اُٹھانے میں بھرپور تعاون کیا۔

دفعتاً ایک...ایک آدمی باہر نکلا...اس نے بلوائیوں کو لیڈرانہ انداز میں مخاطب کیا۔ ''بھائیو! اس مکان میں بے اندازہ دولت ہے۔ بے شمار قیمتی سامان ہے۔ آ! ہم سب کر اس پر قابض ہو جائیں اور مالِ غنیمت بانٹ لیں۔ ☆۱۹۴

تقسیم

لوٹ مار کے دوران ایک آدمی کو ایک صندوق ملا، لیکن جب اس نے صندوق اُٹھانے کی کوشش کی تو وہ ناکام ہو گیا اور دوسرے شخص نے اس کی مدد کی آپس میں بحث کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ صندوق سے نکلنے والا خزانہ دو حصّوں میں تقسیم کریں گے لیکن صندوق سے خزانے کے بجائے ایک آدمی نکلا جس نے اپنے دو حصّے کرانے کے بجائے خود ان دو اشخاص کے چار حصّے کر دیے۔

اور دونوں کردار کی ساری محنت اور منصوبے ناکام ہو گئے اور لوٹ مار سے انھیں کوئی فائدہ ملنا تو دور کی بات وہ اپنی زندگی سے بھی محروم ہو گئے۔ بعض اوقات شکاری بھی اس طرح شکار ہوتے رہے۔

جائز استعمال

اس افسانچے میں بھی منٹو ایک پٹھان کی سادگی کو بیان کیا ہے جو تقریباً ایک گھنٹا کشتی کرنے کے بعد ایک تھرماس حاصل کر کے بہت خوش تھا۔ کیوں کہ اس نے تھرماس کو خاص مقصد کے لیے استعمال کرنے کا سوچ لیا تھا۔ اس کے نزدیک یہی اس کی کام یابی تھی۔

''...خوامِ اس میں نسوار ڈالے گا...گرمیوں میں گرم رہے گی اور سردیوں میں سرد!'' ☆۱۹۵

یہ جملہ اس افسانچے کو ایک لطیفہ بنا دیتا ہے اور بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔

بے خبری کا فائدہ

اس افسانچے کے ذریعے منٹو فسادات کے دنوں میں لوگوں کی وحشت کو دکھانا چاہ رہے ہیں۔ افسانچے کا کردار دو گولیوں سے دو انسانوں کو قتل کراتا ہے تیسری گولی ضائع ہو جاتی ہے چوتھی سے ایک عورت مر جاتی ہے۔ پانچویں اور چھٹی گولی ضائع ہو جاتی ہے اور پستول میں گولیاں ختم ہو جاتی ہیں لیکن اس کے دل کو پھر بھی سکون حاصل نہیں ہوتا، اور نہ ہی اس کی وحشت ختم ہوتی ہے نتیجتاً وہ پستول کا مُنہ ایک بچّے کی طرف کر دیتا ہے تا کہ بچّے کو موت سے خوف تو آئے۔''

مناسب کارروائی

فسادات کی وجہ سے جب مارنے والوں پر وحشت اور حیوانیت چھائی ہوئی تھی تو خوف کی وجہ سے لوگوں کی حالت ان جانوروں جیسی ہو گئی تھی جو شکاری کے خوف سے چھپنے کے لیے مارے مارے پھر رہے ہوتے ہیں۔

اس افسانچے میں بھی خوف زدہ میاں بیوی کا ذکر کیا گیا ہے جنھوں نے موت کے خوف سے اپنے گھر کے تہہ خانے میں پناہ لے لی۔ دو دن اور دو راتیں گزارنے کے بعد موت کا خوف تو کم ہو گیا لیکن اب ان کے لیے بھوک اور پیاس کو برداشت کرنا مشکل ہو گیا تو وہ دونوں تہہ خانے سے باہر آ گئے اور انھوں نے لوگوں سے درخواست کی:

''ہم دونوں اپنے آپ کو تمھارے حوالے کرتے ہیں۔ ہمیں مار ڈالو۔'' ☆۱۹۶

درخواست سننے والوں کا تعلق جین مت سے تھا۔ اس لیے وہ ان لوگوں کی یہ خواہش پوری نہیں کر سکتے تھے۔

''ہمارے دھرم میں تو جی ہتیا پاپ ہے۔'' ☆۱۹۷

اور اس کے بعد جینیوں نے انھیں دوسری جگہ منتقل کر دیا۔

سچ ہے فسادات کے دنوں میں زندگی اتنی سخت ہو گئی تھی کہ اس کے سامنے موت ایک پناہ لگتی تھی۔

کرامات

منٹو نے اس افسانچے میں انسان کی خود غرض اور مفاد پرستی کو دکھایا ہے۔ جہاں سے اسے فائدہ حاصل ہو اس کی محبت

اور ہمدردی کا رخ بھی اسی طرف مڑ جاتا ہے۔

جیسا کہ اس افسانچے میں ایک کردار نے پولیس کے ڈر سے اس نے شکر لوٹی ہوئی بوری کنویں میں پھینک دی اور جب دوسری بوری پھینکی تو وہ خود بھی کنویں میں گر گیا۔ اگلے دن جب لوگوں نے اس کنویں سے پانی پیا تو وہ میٹھا تھا۔ لوگوں نے اس کے احسان کی قدر کی۔

اسی رات اس آدمی کی قبر پر دیے جل رہے تھے۔☆۱۹۸

اصلاح

یہ افسانچہ انسان کی زندگی سے محبت کو دکھایا گیا ہے زندگی کے لیے انسان ہر چیز کو داو پر لگا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے بچاو کے لیے دوسرے مذہب کا سہارا لینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

افسانچے کے کردار کو موت قریب نظر آتی ہے تو وہ بھی خود کو ''دھرم چند'' بتا کر اپنے بچاو کی کوشش کرتا ہے، لیکن طبعی معائنے کے بعد اس کی اصلیت سامنے آ گئی، اور یوں وہ دھرم چند بن کر بھی موت سے نہ بچ سکا۔

جیلی

''جیلی'' میں ایک بچّے کی سادگی کو دکھایا گیا ہے۔

قتل کرنے کے بعد ہاتھ گاڑی میں برف بیچنے والے کو جب چھرے سے مارا گیا تو ایک گھنٹے تک اس کی لاش پر برف پگھل کر گرتی رہی جسے ایک بچّے نے ''جیلی'' سے تشبیہ دی۔

دعوت عمل

یہ افسانچہ ان لوگوں کی چالاکی اور عیاری کو ظاہر کرتا ہے جنھوں نے اپنے کاروبار کو چمکانے کے لیے دوسروں کا نقصان کیا، اور سارے محلّے کو آگ لگی لیکن عمارت سازی کی دکان سلامت رہی تا کہ جلے ہوئے مکانوں کی مرمت کے لیے ''عمارت سازی'' کا کاروبار چل سکے۔

پٹھانستان

اس افسانچے میں ایک پٹھان کردار کی سادگی اور بھولا پن کو دکھایا ہے جو قتل کرنے سے پہلے یہ جاننا چاہتا تھا کہ جسے وہ قتل کرنا چاہ رہا ہے وہ ہندو ہے یا مسلمان۔

''خو تمھارا رسول کون ہے؟''

''محمد خان۔''

''ٹھیک اے، جاوَ۔'' ☆۱۹۹

مسلمان پٹھان افسانچے''اصلاح'' کے ہندو قاتل کی طرح ذہین اور چالاک نہیں کہ وہ دوسرے کی صرف سنتا ہے تحقیق کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، اور اس پر یقین کر لیتا ہے۔

خبردار

مال و دولت کی ہوس ایسی چیز ہے جو عام طور پر مرتے دم تک ختم نہیں ہوتی۔ اس افسانچے کا کردار بھی موت کو تو گوارا کر سکتا ہے لیکن اپنی دولت کو چھوڑنا اس کی برداشت سے باہر ہے۔ اسی لیے وہ قاتل سے کہتا ہے:

''تم مجھے مار ڈالو لیکن خبردار جو میرے روپے پیسے کو ہاتھ لگایا۔'' ☆۲۰۰

ہمیشہ کی چھٹی

مجھے نہ مارو میں تعطیلوں میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔ ☆۲۰۱

افسانچے میں کردار کا یہ سادہ سا جملہ بھی انسان کی زندگی سے محبت کو ظاہر کرتا ہے۔

حلال اور جھٹکا

''حلال اور جھٹکا'' میں بھی معاشرے کے افراد پر طنز کی گئی ہے جو قتل کرنے میں تمام اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہیں۔ افسانہ کا قاتل ایک سکھ ہے جو اپنے قاتل ساتھی کو اس لیے جھٹکا دیتا ہے کہ اس نے ایک مسلمان کو جھٹکا دینے کے بجائے ''حلال'' کر کے سکھ مت کے اصول کی خلاف ورزی کی تھی۔

گھاٹے کا سودا

اس افسانچے میں بھی مذہبی تعصب دکھایا گیا۔ اگر چہ انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ افسانچے میں ظالم اور مظلوم میں سے کون مسلمان اور کون ہندو ہے۔ منٹو کا یہی انداز نہیں ایک غیر جانب دار افسانہ نگاروں کی صف میں شامل کرتا ہے۔

افسانچے میں دو دوست ایک لڑکی کا بیالیس روپے میں سودا کرتے ہیں رات گزارنے کے بعد انھیں پتا چلا کہ لڑکی کا تعلق بھی ان ہی کے مذہب سے ہے۔ تو انھیں اس کا بہت ملال ہوا کہ انھوں نے اپنی ہی لڑکی کو کیوں اذیّت دی۔

''اس نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے ہمارے مذہب کی لڑکی تھما دی۔ چلو واپس کر آئیں۔'' ☆۲۰۲

منٹو اس افسانچے میں یہی حقیقت بیان کرنا چاہ رہا ہے کہ فسادات کے دوران تعصب شدّت اختیار کر چکا تھا اور نفرت اور تعصب کی آگ بجھانے کے لیے انھوں نے مختلف طریقے اپنا رکھے تھے۔ انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے خواتین کو سب سے زیادہ استعمال کیا۔

حیوانیت

بیٹی کے گم جانے اور قیمتی اثاثوں کے کھو جانے کے بعد میاں بیوی اپنی زندگی کو کھونا نہیں چاہتے تھے، لہٰذا وہ اپنی چھوٹی

سی بچی کو لے کر ایک جگہ چھپ گئے بچی نے رونا شروع کیا تو باپ نے اس کے اوپر موٹی چادر ڈال دی تاکہ دشمن جب تک اس کی آواز نہ پہنچ پائے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک جگہ سے کسی بچھڑے کی آواز آئی تو گاے نے بے چین ہو کر دیوانہ وار بھاگنا شروع کر دیا، لیکن وہ اسے خاموش نہ کرا سکے۔ اور یوں جب انھیں دور سے روشن مشعلیں نظر آ ئیں تو انھیں اپنی موت بھی قریب نظر آنے لگی۔ بیوی نے اپنے شوہر سے کہا:

''تم کیوں اس حیوان کو اپنے ساتھ لے آئے تھے۔'' ☆۲۰۳

کھاد

موت کے ڈر سے ایک سکھ نے حلیہ بدلنے کے لیے اپنے کیس کاٹ لیے اور داڑھی بھی صاف کر لی، لیکن بعد میں وہ اپنے اس عمل پر بہت شرمندہ ہوا۔ دوستوں نے اسے سمجھایا:

''...واہگرو جی نے چاہا تو ایک ہی برس میں تم پھر ویسے کے ویسے ہو جاؤ گے۔'' ☆۲۰۴

سکھ سے یہ صدمہ برداشت نہ ہو سکا اور اس نے خودکشی کر لی۔

یہ افسانچہ سکھ کی اپنے مذہب سے محبت اور عقیدت کو ظاہر کرتا ہے۔ اپنے مذہب کے خلاف عمل کرنے پر اس خود کو سزا دی۔

استقلال

اس افسانچے میں کٹر مسلمان کا ذکر ہے جو کسی بھی قیمت پر اپنے مذہب کو چھوڑنے کو تیار نہیں۔

نگرانی میں

اس افسانچے میں کردار ''الف'' اپنے دوست ''ب'' کو اپنا ہم مذہب ظاہر کرنے کے لیے ملٹری کی نگرانی میں محفوظ مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ کردار ''ب'' ملٹری والوں سے آس پاس کے حالات کے بارے میں پوچھتا تو اسے خبر ملتی ہے کہ:

...فلاں محلّے میں ایک کتا مارا گیا...نہر میں تین کتوں کی لاشیں ملیں۔ ☆۲۰۵

شدید نفرت کی وجہ سے ملٹری والوں نے مرد اور عورتوں کے بجائے ''کتے'' اور کتیوں کا لفظ استعمال کیا۔ ''الف'' نے اپنے دوست ''ب'' کی خاطر ملٹری والوں سے پوچھا کہ ملٹری والے لوگوں کو تحفّظ کیوں نہیں دیتے۔

ملٹری والے اس بات سے بے خبر تھے کہ ان کے درمیان دوسرے مذہب کا بھی ایک شخص موجود ہے، لہٰذا ایک فوجی نے لاپروائی سے کہا:

''...کیوں نہیں سب کام اسی کی نگرانی میں ہوتا ہے۔'' ☆۲۰۶

فسادات کے دنوں میں عام انسانوں کے علاوہ ملٹری والے بھی تعصب کی وجہ سے بے گناہ لوگوں کی حفاظت کرنے

کے بجائے انھیں موت کے حوالے کر دیتے تھے۔

جوتا

مسلمانوں کے ایک متعصب ہجوم نے مشتعل ہو کر ''سر گنگا رام'' کے بت پر لاٹھیاں، پتھر اور جوتے برسانا شروع کر دیے ایک مسلمان نے جذباتی ہو کر بت کے منھ پر تار کول مل دیا۔ ان کا ایک اور ساتھی بت کو ہار پہنانے کے لیے جوتے جمع کر رہا تھا کہ پولیس نے فائرنگ شروع کر دی جس سے ہار پہنانے والا زخمی ہو گیا۔

چناں چہ اسے مرہم پٹی کے لیے سر گنگا رام ہسپتال بھیج دیا گیا۔☆۲۰۷

اس افسانچے میں کہانی کی بے بسی کو دکھایا ہے۔ متعصب اور مشتعل جوان جو بت کو ہار پہنانے والا تھا اسے یہ خبر نہ تھی کہ وہ زخمی ہونے کے بعد سر گنگا رام ہسپتال میں جائے گا۔

پیش بندی

فسادات کے دنوں میں ہر طرف لوٹ مار اور قتل غارت گری کا بازار گرم ہو چکا تھا پولیس کی کوشش کے باوجود حالات قابو میں نہیں آ رہے تھے۔

اگر ایک جگہ پولیس کو پہرے کے لیے کھڑا کیا گیا تو دوسری جگہ واردات ہو جاتی اور دور اندیش سپاہی نے انسپکٹر کو مشورہ دیا:

''...مجھے وہاں کھڑا کیجیے جہاں نئی واردات ہونے والی ہے۔'' ☆۲۰۸

منٹو کا یہ افسانچہ فسادات کے دنوں میں بگڑے حالات کی شدّت کو بیان کر رہا ہے۔

سوری

فسادات کے دوران قتل کرنے سے پہلے متعصب ہندو اور مسلمان مردوں کا مخصوص طبی معائنہ کرتے تا کہ ان کے اصل مذہب کا پتا چل سکے۔

اس افسانچے میں بھی اس معائنے کا ذکر کیا گیا ہے۔

...ازار بند کٹ گیا۔ چھری مارنے والے کے مُنہ سے دفعتاً کلمۂ تاسف نکلا، ''چ، چ، چ، چ

مشٹیک ہو گیا۔☆۲۰۹

افسانچے میں کردار کو اس بات کا افسوس ہے کہ اس نے اپنے ہی مذہب کے مرد کو مار دیا ہے۔

منٹو نے افسانچے میں بھی کرداروں کے مذہب کو ظاہر نہیں کیا جس سے ان کا غیر جانب دارانہ رویہ واضح ہو جاتا ہے۔

رعایت

تین سطروں کے اس مختصر افسانچے میں منٹو نے فسادات کے ایک بہت بڑے المیے کو بیان کر دیا ہے۔

افسانچے میں انھوں نے ایک بوڑھے شخص کا ذکر کیا ہے جو اپنی بیٹی کو اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتا نہیں دیکھ سکتا تو قاتل سے رعایت کی درخواست کرتا ہے:

''میری آنکھوں کے سامنے میری جوان بیٹی کو نہ مارو۔'' ☆۲۱۰

قاتل نے بوڑھے شخص کی درخواست کو تو قبول کر لیا لیکن قتل کرنے کے بجائے اس نے ظلم کا جو طریقہ اختیار کیا وہ موت سے بھی زیادہ گھناؤنا اور تکلیف دہ تھا۔

''چلو اسی کی مان لو۔ کپڑے اتار کر ہانک دو ایک طرف۔'' ☆۲۱۱

صفائی پسندی

یہ افسانچہ فسادات کے دنوں میں انسان کی سفاکی اور بربریت کو ظاہر کر رہا ہے جس میں ایک بے حس انسان کو دوسرے کو اپنے سامنے اس لیے قتل ہونے سے روکتا ہے تاکہ اس کے سامنے گندگی نہ پھیلے۔

صدقے اُس کے

تقسیمِ ہند کے بعد مسلمانوں اور ہندوؤں کو پاکستان یا ہندوستان جانا پڑا تو انھیں نہ صرف اپنے گھر بار اور قیمتی اثاثوں کو چھوڑنا پڑا، بلکہ نئے ملک میں جا کر انھیں معاشی اور سماجی لحاظ سے کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔

بعض لوگ ایسے بھی تھے جنھیں ہجرت کرنے یا نئے ملک میں جانے سے کوئی فرق نہ پڑا جو کچھ وہ چھوڑ کر آئے تھے۔ وہ سب کچھ انھیں پھر سے مل گیا، بلکہ بعض کو چھوڑے ہوئے سے زیادہ ملا۔

افسانے میں جس کردار کا ذکر ہے اسے بھی ہجرت کرنے سے کوئی فرق نہ پڑا۔

جیسا کہ افسانچے میں کردار نے خود اس بات کا اعتراف اس طرح کیا ہے:

''...سب کچھ لٹا پٹا کر یہاں آئے تھے، لیکن اللہ میاں نے چند دنوں ہی میں وارے نیارے کر دیے۔'' ☆۲۱۲

افسانچے کے کردار کو بھی نئے ملک میں آ کر ہر سہولت میسر آئی۔ روپے پیسے کی ریل پیل سے وہ صرف اپنی ضروریات ہی پوری نہیں کر سکتا، بلکہ عیش کا سامان بھی کر سکتا ہے۔

اشتراکیت

فسادات کے دوران لوٹ مار سے بہت سے لوگوں نے اپنی حیثیت کو بدل لیا تھا۔

افسانچے کا کردار اپنے گھر کا سامان ایک ٹرک پر لاد کر دوسرے شہر میں لے جا رہا تھا۔ کچھ لوگوں کو اس پر شبہ ہوا تو اس نے انھیں بتایا کہ یہ اس کا اپنا سامان ہے۔

لوٹ مار کی فضا میں کسی نے اس کی بات پر یقین نہ کیا اور یہی سمجھا کہ ٹرک پر لدا ہوا سامان اس شخص کا اپنا نہیں، بلکہ چوری شدہ مال ہے، لوگوں نے اس مال میں سے اپنے حصّہ لینا اپنا فرض سمجھا، اور ایک دوسرے کو مشورہ دیا۔

''...لوٹ لو، یہ امیر آدمی ہے۔ ٹرک لے کر چوریاں کرتا ہے۔'' ☆۲۱۳

اس سارے منصوبے کی وجہ اشتراکیت اور سچائی سے اعتبار اُٹھ جاتا ہے۔

اُلہنا

افسانچے ''اُلہنا'' کا کردار اس بات پر افسردہ ہے کہ وہ دکانوں کو جلانے میں ناکام ہوگیا ہے۔

''...ایسا رڈی پٹرول دیا کہ ایک دکان بھی نہ جلی۔'' ☆۲۱۴

یہ کردار ان لوگوں کی عکاسی کر رہا ہے جو فسادات کے دنوں میں دوسروں پر ظلم کرنے کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔ ان دنوں ہر ظالم انسان کا یہی مقصد تھا اور اسی کے لیے کوشاں تھے، اور ناکام ہونے کی صورت میں افسردہ ہو جاتے۔

آرام کی ضرورت

یہ افسانچہ ایک ایسے قاتل کے بارے میں ہے جس نے بے حساب لوگوں کا قتل کیا۔ یہاں تک کہ اسے آرام کی ضرورت پیش آئی۔

''مرا نہیں۔ دیکھو، ابھی جان باقی ہے۔''

''رہنے دو یار۔ میں تھک گیا ہوں۔'' ☆۲۱۵

قاتل نے یہ جملہ کسی کو بخشنے کے لیے نہیں، بلکہ اپنے آرام کے لیے کہا۔

یہاں ہم ان دو مکالموں کو جان بچانے والوں کے مکالمے بھی سمجھ سکتے ہیں۔ یہ دونوں زخمیوں کی تلاش میں ہیں تا کہ ان کی جان بچائی جا سکے۔ اس تناظر ایک مرتے اور سسکتے ہوئے انسان کو دیکھ کر اس کی جان بچانے کے مقابلے میں اپنی تھکن کا احساس بھی اتنی ہی ہول ناک بات ہے، جتنی کسی قاتل کا آرام کی ضرورت محسوس کرنا۔

قسمت

فسادات کے دوران ہونے والی لوٹ مار میں بھی چالاکی اور ہوشیاری کے علاوہ قسمت کا بھی دخل تھا۔

افسانچے کا کردار اپنی بدقسمتی سے صرف ایک ہی بکس چوری کر سکا۔

''... پر اس میں بھی سالا سور کا گوشت نکلا۔'' ☆۲۱۶

اور قسمت کی نامہربانی کی وجہ سے وہ لوٹ مار کے دنوں میں بھی کوئی بھاری فائدہ حاصل نہ کر سکا۔

منٹو نے اس افسانچے میں ان لوگوں پر طنز کی ہے جو دوسروں کے چھوڑے مال میں سے اپنا حصّہ لینا فرض سمجھتے تھے۔

جیسے اس مال کے یہی وارث ہیں۔

آنکھوں پر چربی

فسادات کے دنوں میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو اور مسلمانوں نے ہندوؤں کو اذیت دینے کے مختلف طریقے نکالے۔ اس افسانے میں منٹو نے ہندوؤں کے مندروں میں مسلمانوں کا آ کر گائے کا گوشت ذبح کرنے کا ذکر کیا ہے۔ جب کہ ہندوؤں کا مسلمانوں کی مسجد میں سوروں کے ذبح کا ذکر کیا ہے۔

ہندو اس بات پر افسردہ ہیں کہ:

''... وہاں دھڑا دھڑ گائے کا گوشت بک رہا ہے، لیکن یہاں سور کا مانس لینے کوئی نہیں آتا۔'' ☆۲۱۷

(۲) انسانی اقدار کی پامالی ـــ اغوا اور آبروریزی

یوں تو ۱۹۴۷ء کے فسادات میں معاشرے کے ہر فرد کو مختلف نقصانات کا سامنا کرنا پڑا یہ نقصات جانی و مالی اور روحانی ہر طرح کے تھے ان نقصانات نے کئی اور نقصانات اور نفسیاتی مسائل کو جنم دیا، لیکن یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کو ملنے والی آزادی کی سب سے بھاری قیمت خواتین نے اپنی عزت قربان کر کے ادا کی۔

ہمارا معاشرہ مردوں کا معاشرہ ہے۔ اس معاشرے کی عورت ہمیشہ سے مرد کے ظلم کا نشانہ بنتی رہی ہے۔ عورت کا تعلق چاہے کسی بھی طبقے سے ہو مرد نے ہمیشہ عورت پر اپنی حاکمیت جتائی ہے، اور اسے اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا ہے۔

جب ۱۹۴۷ء کے فسادات شروع ہوئے تو ان قیامت خیز حالات اور افراتفری کو بیش تر مردوں نے سنہرا موقع جانتے ہوئے محض اپنی تفریح اور جنسی تسکین کے لیے عورت کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا، انھیں اغوا کیا اور قحبہ خانوں کی زینت بنایا۔ اس کے علاوہ بیش تر عورتوں کی تجارت بھی کی گئی۔ بہت سے خواتین ایسی بھی تھیں جنھوں نے مردوں کی ہوس کا نشانہ بننے سے پہلے ہی خودکشی کر لی۔ جو خواتین اغوا کر لی گئی یا مردوں کی تفریح کا ذریعہ بنیں۔ وہ نہ صرف کئی نفسیاتی مسائل کا شکار ہوئیں، بلکہ ان کی سماجی حیثیت بھی خاک میں مل گئی یہاں تک کہ ان کے گھر والوں نے بھی انھیں قبول نہ کیا۔ اسی وجہ سے بہت سی خواتین نے ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ زندگی گزارنے کو ہی ترجیح دی۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جن مردوں نے خواتین کے ساتھ زیادتی کی وہ سب درندہ صفت انسان نہ تھے، بلکہ بعض مرد ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنی عورتوں کی بے حرمتی کا بدلہ لینے کے لیے تمام اخلاقی قدروں کو بالائے طاق رکھ کر دوسروں کی عورتوں کی بے حرمتی کرنا پڑی۔ ایسے مرد بھی کئی نفسیاتی مسائل کا شکار ہوئے اور ان کے اس فعل پر ان کا ضمیر ساری زندگی ملامت کرتا رہا۔

جن افسانہ نگاروں نے اس موضوع کو اپنے فن میں سمویا ان میں منٹو، بلونت سنگھ، راجندر سنگھ بیدی، مہندر ناتھ اور دیگر افسانہ نگار شامل ہیں۔ منٹو کا فن ہی اس رجحان سے عبارت ہے۔ اگلے اوراق میں ایسے افسانہ نگاروں کے فن کاروں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

بھاگ اِن بردہ فروشوں سے

راما نند ساگر کا افسانہ ''بھاگ ان بردہ فروشوں سے'' ۱۹۴۷ء کے فسادات میں اغوا ہونے والی خواتین کے بارے میں ہے۔ اس افسانے میں راما نند ساگر نے اغوا اور بازیافتہ ہونے والی خواتین کی نفسیاتی کیفیات کو جس انداز میں لکھا ہے وہ ان ہی کا کمال ہے۔

افسانے کی ہیروئن نرملا کا تعلق امرت سر کے ایک گاؤں سے ہے جو دریائے راوی کے کنارے ہے جب ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے تو بہت سے مسلمان کشتیوں میں سوار ہو کر اس گاؤں میں آئے اور ایک ایک گھر میں جا کر انھوں نے مردوں کو قتل کیا اور ان کی خواتین کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ قتل اور اغوا کرنے والے مسلمانوں کی نظر سب سے پہلے نرملا پر پڑی جو دریائے راوی کے بالکل کنارے لکڑیاں چننے میں مصروف تھی۔ نرملا نے ان مسلمانوں کو جب ہاتھ میں کلھاڑیاں لیے ہوئے اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا تو اپنے شوہر کو مدد کے لیے پکارا اور خود بھی بھاگنا شروع کر دیا، لیکن اس کے شوہر کو اپنی بیوی سے زیادہ اپنی اور اپنے بیٹے پریم کی زندگی عزیز تھی۔ اس نے نرملا کی جانب بڑھنے کے بجائے مخالف سمت میں چلنا شروع کر دیا۔ بلوائی نے بھی نرملا کو اغوا کرنا زیادہ ضروری سمجھا اور کچھ دیر بھاگنے کے بعد نرملا ان بلوائیوں کے قابو آ گئی۔ مسلمان بلوائی اغوا شدہ خواتین کے ساتھ تقریباً ایک ماہ تک ان کے گھروں میں رہے۔ حکومت کے اعلان کے بعد جب یہ گاؤں ہندوستان کے حصے میں آیا تو مسلمان بلوائی ہندو خواتین کو اپنے ساتھ کشتیوں میں سوار کر کے راوی کے دوسرے کنارے پاکستان لے گئے۔

راوی کے دوسرے کنارے جہاں سے پاکستان کی سرحد شروع ہوتی تھی مغویہ خواتین اکثر گھروں کی چھت پر کھڑی ہو کر اپنے پرانے گاؤں کو دیکھا کرتیں۔ انھی دنوں دریا کا پانی چڑھ گیا جس سے دریا کا پاٹ بھی چوڑا ہو گیا، اور راوی کے اس پار گاؤں اور زیادہ واضح نظر آنے لگا۔

ایک دن دریائے راوی کے دوسرے کنارے نرملا نے اپنے بیٹے کو دیکھا جو گرتے پڑتے راوی کی جانب بڑھ رہا تھا بیٹے کو موت کی جانب بڑھتا دیکھ کر نرملا بے چین ہو گئی۔

نرملا کی بے چینی کو راما نند ساگر نے نرملا کے الفاظ میں اس طرح بیان کی ہے:

> ...میں تڑپ اٹھتی، میں ایک بار وہاں جا کر ان سے اتنا کہہ آنا چاہتی تھی کہ جب تک میں لوٹ نہ آؤں پریم کو اس طرح ندی پر اکیلا نہ چھوڑ دیا کریں لیکن وہاں ایک بار اتنی سی دیر کے لیے جانا بھی ممکن نہ تھا۔ میں اور میری طرح ہر عورت ان وحشیوں کے درمیان جکڑی ہوئی تھی۔ ☆ ۲۱۸

بیٹے کی زندگی اور ممتا کی تڑپ نے نرملا کو بے بس کر دیا اور وہ پریم کی زندگی بچانے کے لیے چھت سے چھلانگ کے لیے مجبور ہو گئی۔ چھت سے چھلانگ کی وجہ سے اسے کئی جگہ چوٹیں آئیں، لیکن نرملا نے ان چوٹوں کی پروا نہ کی۔ اس کے

حواسوں پر صرف پریم چھایا ہوا تھا۔ اس نے دریا میں چھلانگ لگا دی اور تیرنا شروع کر دیا۔ اس کی نظریں پریم پر جمی ہوئی تھیں کچھ ہی دیر بعد نرملا نے دیکھا کہ پریم کو اس کے باپ نے اُٹھا لیا ہے۔ یہ دیکھتے ہی نرملا کی بے چینی میں کمی آئی، لیکن اگلے ہی لمحے اس نے دیکھا کہ مسلمان اسے پکڑنے کے لیے تیزی سے اس کی جانب آ رہے ہیں۔

> سب نگاہیں مجھ پر تھیں۔ میں نے تیرنا چھوڑ دیا۔ ایک دم غوطہ کھانے شروع کر دیے، اور پھر ایسی لمبی ڈبکی لگائی کہ انھیں یہ یقین ہو جائے کہ میں واقعی ڈوب گئی ہوں۔☆۲۱۹

آخر کار نرملا دریائے راوی کو عبور کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اپنے گاؤں کی آزاد فضا میں پہنچ کر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی ساری تھکن اتر گئی ہو۔ نرملا کا خیال تھا کہ اسے دیکھ کر اس کا شوہر اور بیٹا خوش ہوں گے اس کا شوہر اور سسر اس کی بہادری اور حوصلے پر فخر محسوس کریں گے۔ اس کی ماں اسے دیکھتے ہی خوشی سے رونے لگے گی۔ اس کے پڑوسی اور اس کے آس پاس کے گاؤں کے لوگ اس سے ملنے آئیں گے اور اسے زندہ سلامت لوٹ آنے پر مبارک دیں گے، اور وہ خود پھر سے اپنے شوہر اور بیٹے کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کرے گی۔

نرملا نے جو کچھ سوچا تھا ویسا کچھ نہ ہوا نرملا کے شوہر اور سسر نے اس سے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ اسے گھر میں بسانا تو بہت دور کی بات ہے۔ اسے گھر کے دروازے سے آگے نہ بڑھنے دیا۔

> پتا نہیں انھیں کیا ہو گیا تھا۔ انھوں نے اوّل تو جیسے مجھے پہچانا ہی نہیں، اور پھر انھوں نے نہایت ٹھنڈی آواز میں کہا کہ ''اب یہاں کیا کرنے آئی ہو۔'' ☆۲۲۰

نرملا کے شوہر کے علاوہ سسر نے بھی اس سے نفرت اور حقارت آمیز سلوک کیا۔ جس کا ذکر افسانے میں اس طرح کیا گیا ہے:

> میں نے آگے بڑھ کر ان چرن چھوئے، لیکن انھوں نے آشیرباد بھی نہیں دیا۔ اپنے بیٹے کی طرف ایک سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اور پھر میری طرف اور پھر ان کی زبان سے نکلا رام رام۔ جیسے میرے ناپاک لمس سے بچنے کے لیے وہ رام رام کی پناہ ڈھونڈ رہے ہوں۔☆۲۲۱

اس شان دار استقبال کے بعد نرملا کے شوہر اور سسر نے بے نیازی اور سرد مہری سے بھرپور خاموشی اختیار کر لی جس سے نرملا بے قصور اور معصوم ہونے کے باوجود خود کو ناپاک، بے شرم اور گناہ گار سمجھنے لگی یہاں تک کہ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا جسم کپڑوں سے بھی بے نیاز ہے۔ اس کی حالت نیم دیوانوں جیسی ہو گئی اور اس نے اپنے سسر کا پٹکا جس پر ہزاروں رام نام لکھے ہوئے تھے اپنے گرد لپیٹ لیا، لیکن اس کے باوجود اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اب بھی برہنہ ہے۔

> ''پاگل ہو گئی ہے بے چاری...'' سسر نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔'' ☆۲۲۲

سسر کی رائے کے بعد شوہر نے بھی اپنی بیوی کے لیے توہین آمیز رائے دینے سے گریز نہ کیا اور کہا:

''پاگل تو ہے...ورنہ اس طرح یہاں نہ چلی آتی۔'' ☆۲۲۳

اتنے سخت اور توہین آمیز الفاظ سن کر نرملا رونے اور سسکیاں بھرنے کے سوا کچھ نہ کر سکی۔ نرملا کے دکھ اور ندامت سے بھرپور آنسو بھی اپنے گھر والوں کی انسانیت کے احساس کو جگا نہ سکے۔

نرملا کے گھر والوں نے اپنے رویے سے اسے اس کی حیثیت کا احساس دلا دیا تھا۔ اب صرف یہ مرحلہ باقی کہ وہ صاف صاف الفاظ میں اسے واپس جانے کا کہتے، نرملا کے سسر نے اپنا یہ فرض بھی پورا کر دیا، اور خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے یہ دلیل بیان کی:

''بھگوان رام نے بھی اپنے کل کی لاج کے لیے سیتا گھر سے نہیں نکال دیا تھا، اور پھر ماتا سیتا تو ستی تھی۔'' ☆۲۲۴

نرملا کی زخمی روح پر اس جملے نے ایک اور وار کر دیا، اور نرملا کے دل سے رامائن لکھنے والے رشیوں کے لیے بددعائیں نکلیں۔

نرملا کے سسر نے اس بات پر اس کا شکر یہ ادا کیا کہ وہ رات کے اندھیرے میں آئی ہے اس لیے لوگ اسے دیکھ نہیں سکے ہوں گے کیوں کہ وہ لوگوں سے یہ کہہ چکے تھے کہ نرملا نے مسلمان کے ہتھے چڑھنے سے پہلے ہی دریا میں چھلانگ لگا دی تھی۔

اس کے ساتھ ہی نرملا کے سسر نے اسے اس بات کا حوصلہ بھی دیا کہ اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیوں کہ اس کی بے حرمتی کا بدلہ وہ مسلمان عورتوں سے لے چکے ہیں اور ان کے ساتھ وہی سلوک کیا ہے جو انھوں نے ہندو عورتوں سے کیا۔ نرملا کے سسر نے بڑے فخر سے یہ بھی بتایا کہ ہم نے دو مسلمان عورتوں کو اپنی قید میں رکھا ہوا ہے۔

ظالم سے بدلہ لینا تو بہادری اور قابلِ فخر بات ہو سکتی ہے لیکن کم زور اور بے بس پر ظلم کرنا بزدلی بھی ہے اور انسانیت کی توہین بھی۔ اس بات کو نرملا تو سمجھ سکتی تھی لیکن اس کا شوہر اور سسر اسے سمجھنے سے قاصر تھے۔

نرملا جو بہت سی اُمّیدیں لے کر اپنے گاؤں واپس آئی تھی وہ ساری اُمّیدیں خاک میں مل گئیں اسے ہندوستان اور پاکستان دونوں ملک ہی عورت کے لیے غیر محفوظ اور مردوں کے بنائے ہوئے جہنم لگے۔

راما نند ساگر نے نرملا کی اس کیفیت کو اس کے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے:

شریف عورت کے لیے اپنے ہندوستان میں بھی مجھے وہی کچھ دکھائی دیا جو ان کے پاکستان میں تھا یہ دونوں ملک ان مردوں کے تھے جنھوں نے شرافت کے نقلی پردے پھاڑ کر محض عورت کے ننگے جسم کے گرد اپنے اصلی رنگ میں ناچنا شروع کر دیا تھا۔ خود عورت کے لیے ان میں کوئی جگہ نہ تھی۔ زمینوں کی طرح ہمارے جسموں کا بٹوارا تو انھوں نے کر لیا تھا، لیکن ایک عورت، ایک

ماں کوشاید کوئی بھی اپنے حصّے میں لینا نہ چاہتا تھا۔☆۲۲۵

رامانند ساگر کا یہ افسانہ محض ایک افسانہ ہی نہیں، بلکہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران اغوا یا بازیافتہ ہونے والی ہر عورت کی کہانی ہے۔نرملا کا دکھ تقریباً ہر اُس عورت کا دکھ تھا جو دشمنوں کے قابو میں آ ئی۔وہ نہ اپنے معاشرے میں قابل عزت رہی نہ دوسرے معاشرے میں اگر اغوا کنندگان کے ساتھ رہتی تو ضمیر کے کچوکے کھاتی ہے اور اگر اپنے لوگوں میں واپس جاتی ہے تو طنز تفریض اور نفرت کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔ان عورتوں کی زندگی موت سے بدتر ہو جاتی ہے اور پوری زندگی ایک عذاب کی طرح گزارنا پڑتی ہے یہ فسادات کے دوران اغوا ہونے والی ہزار ہا عورتوں کی کہانی ہے جو اپنے دکھ درد کو اپنی زندگی بنائے رہیں اور موت کے ساتھ ہی اس سے نجات ہوئی۔

شریفن

’’شریفن‘‘ سعادت حسن منٹو کا ایک نفسیاتی افسانہ ہے جس میں انھوں نے ایک ایسے مرد کا ذکر کیا جو اپنی بیٹی کی بے حرمتی کا انتقام لینے کے بعد نفسیاتی مسائل کا شکار ہو جاتا ہے اور اسے دوسروں کی بیٹی کی بے حرمتی کا بھی اتنا ہی دکھ ہوتا ہے جتنا اپنی بیٹی کی بے حرمتی کا تھا۔

شریفن اور قاسم اس افسانے کے اہم کردار ہیں۔افسانہ کی ساری کہانی ان ہی کرداروں کی وجہ سے آگے بڑھتی ہے۔

’’شریفن‘‘ کا باپ قاسم جب زخمی حالت میں گھر پہنچتا ہے تو اس کی نظر اپنی بیوی کی لاش پر پڑتی ہے۔ جسے دیکھ کر قاسم بہت رنجیدہ ہو جاتا ہے اور اسی لمحے اسے اپنی بیٹی شریفن کا خیال آتا ہے اور وہ اس کے کمرے کی طرف بڑھتا ہے جہاں اسے شریفن کی برہنہ لاش نظر آتی ہے جسے دیکھ کر اسے اپنی ساری پرانی تکالیف بہت معمولی نظر آتی ہیں شریفن کی برہنہ لاش اس کا سب سے بڑا دکھ بن جاتی ہے اور اس کی غیرت، غم اور غصّے نے اسے انتقام لینے پر اُکسایا اور وہ نیم دیوانگی کی حالت میں گنڈاسا اُٹھا کر گھر سے نکلتا ہے، اور سارے راستے لوگوں کو مارتا ہوا اور وہ محض انتقاماً اس لڑکی کی بے حرمتی کرتا ہے لیکن ہندو لڑکی بملا کی بے حرمتی بھی اس کے دکھ کو کم نہیں کر سکتی، بلکہ قاسم پہلے سے زیادہ غمگین ہو جاتا ہے اور وہ بملا کی برہنہ لاش کو نہیں دیکھ سکتا اور اس پر ایک کمبل ڈال دیتا ہے۔اس کے بعد بملا کا باپ گھر داخل ہوتا ہے تو وہ بھی ’’بملا‘‘ کی حالت دیکھ کر مشتعل ہو جاتا ہے اور بملا کا انتقام لینے کے لیے گھر سے باہر نکل جاتا ہے۔

افسانے کے آغاز ہی میں منٹو نے اس نفسیاتی حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ انسان کو بگاڑنے اور سنوارنے میں ماحول اور حالات اہم کردار ادا کرتے ہیں جیسا کہ افسانے کے کردار قاسم کے ساتھ ہوا۔اس نے اپنی معصوم اور بے گناہ بیٹی شریفن کا انتقام ایک بے گناہ ہندو لڑکی، ’’بملا‘‘ سے لیا جس کا شریفن کی بے حرمتی سے کوئی تعلّق نہ تھا، لیکن شریفن کو دیکھ کر قاسم کو جس غم

اور غصّے کا احساس ہوا تھا۔اس ذلّت اور توہین کا بدلہ لینے کے لیے قاسم کے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔قاسم کے کرب کا اندازہ اس عبارت سے لگایا جا سکتا ہے:

> ایک گز کے فاصلے پر ایک جوان لڑکی کی لاش پڑی تھی... بالکل ننگی...ایک دم قاسم کا سارا وجود ہل گیا۔اس کی گہرائیوں سے ایک فلک شگاف چیخ اُٹھی،لیکن اس کے ہونٹ اس قدر بھنچے ہوئے تھے کہ باہر نہ نکل سکی۔اس کی آنکھیں خود بخود بند ہوگئی تھیں۔پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔مردہ سی آواز اس کے مُنہ سے نکلی۔''شریفن''اور اس نے آنکھ بند کیے دالان میں اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر کچھ کپڑے ــــ شریفن کی لاش پر گرا کر وہ یہ دیکھے بغیر ہی باہر نکل گیا کہ وہ اس سے کچھ دور گرے تھے۔☆۲۲۶

اسی دکھ،کرب اور بیٹی کی محبت نے قاسم کی غیرت کو للکارا اور اس بات پر اکسایا کہ وہ شریفن کی بے حرمتی کا بدلہ لے۔اس نفسیاتی جنگ کا انجام ''بملا'' کی بے حرمتی پر ہوا۔جب تک قاسم نے شریفن کا انتقام نہ لے لیا۔اس کے دل و دماغ پر شریفن کی لاش کا قبضہ رہا جو لمحہ لمحہ اس کے زخموں میں اضافہ کر رہی تھی۔

سارے راستے لوگوں کو قتل کرتے ہوئے اور گالیاں دیتا ہوا وہ آخر کار اس ہندو گھر میں بھی پہنچ گیا جہاں بدنصیب ''بملا'' رہتی تھی۔

> ...شعلہ بار نظروں سے اس نے لڑکی کی طرف دیکھا...پھر وہ عقاب کی طرح جھپٹا اور اس لڑکی کو دھکیل کر اندر دالان میں لے گیا...تقریباً آدھا گھنٹا قاسم اپنا انتقام لینے میں مصروف رہا۔لڑکی نے کوئی مزاحمت نہ کی۔اس لیے کہ وہ فرش پر گرتے ہی بے ہوش ہو چکی تھی۔☆۲۲۷

اگرچہ قاسم نے سب کچھ اپنے اندر لگی ہوئی انتقام کی آگ کو بجھانے کے لیے کیا تھا،لیکن انتقام لینے کے بعد بھی اسے چین نصیب نہ ہوا۔کیوں کہ وہ فطرتاً ایک نیک اور شریف انسان تھا۔اس لیے بملا کی برہنہ لاش دیکھ کر اسے اتنی ہی تکلیف ہوئی جتنی شریفن کو دیکھ کر ہوئی تھی،اور اس میں اتنی تاب نہ رہی کہ وہ ''بملا'' کی لاش کو دیکھ سکے اور اس نے بملا کی لاش کو اسی طرح ڈھک دیا جیسے شریفن کی لاش کو ڈھکا تھا۔

> تھوڑی دیر کے بعد ایک آدمی تلوار سے مسلح مکان کے اندر داخل ہوا۔اس نے دیکھا کہ دالان میں کوئی شخص آنکھیں بند کیے لرزتے ہاتھوں سے فرش پر پڑی چیز پر کمبل ڈال رہا ہے۔☆۲۲۸

جب اس مسلح شخص نے کمبل ہٹا کر دیکھا تو وہ اس کی بیٹی بملا کی لاش تھی۔جسے دیکھ کر اسے اسی کرب سے گزرنا پڑا جس سے قاسم گزر چکا تھا،اور اس کرب نے اسے بملا کا انتقام لینے پر مجبور کر دیا۔

بملا کی لاش کو دیکھ کر وہ کانپا، پھر ایک دم سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ تلوار اس کے ہاتھ سے گر پڑی اور وہ بملا، بملا کہتا لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے باہر نکل گیا۔☆۲۲۹

منٹو کے اس افسانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقسیم اور آزادی کے دوران ۱۹۴۷ء کے فسادات بے حرمتی یا قتل و غارت گری کے جو بھی واقعات ہوئے وہ صرف انسان کی کمزوریوں یا برائیوں کا نتیجہ نہ تھیں، بلکہ بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو دوسروں کی نظر میں تو ظالم اور کم ظرف تھے لیکن وہ بھی حالات کے ستائے ہوئے تھے اور جو بھی غلط فعل یا برائی کر رہے تھے اس سے پہلے وہ خود بھی کسی نہ کسی کے ظلم کا نشانہ بن چکے تھے۔

جو فسادات برپا ہوئے، قتل و غارت گری اور آبروریزی ہوئی وہ محض فطرت کے خراب لوگوں ہی نے انجام نہ کی، بلکہ زخم خوردگان نے انتقاماً بھی کی اور وقتی جنون نے مبتلا ہونے والوں نے آخر الذکر دونوں قسم کے لوگ ہمیشہ کے لیے نفسیاتی مریض بن کر رہ گئے۔

ڈارلنگ

جب ۱۹۴۷ء کے فسادات شروع ہوئے تو ہر طرف تباہی و بربادی کا بازار گرم ہو گیا اور لوگوں کو کئی نقصانات کا سامنا کرنا پڑا، لیکن ان حالات میں ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے ان قیامت خیز حالات کو سنہرا موقع جانتے ہوئے دوسروں کے چھوڑے ہوئے مال سے بھی فائدہ اُٹھایا، اور دوسروں کی بے بس اور کمزور عورتوں کو بھی اپنی تفریح کا ذریعہ بنایا۔

منٹو کے اس افسانے کا سب سے اہم کردار ''س'' کا تعلق بھی ان ہی لوگوں سے تھا جنھوں نے دوسرے کے چھوڑے ہوئے اثاثوں سے خوب فائدہ اٹھایا اسے کسی کے جینے یا مرنے سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ مالی طور پر مستحکم ہونے کے بعد اس کی بے حسی میں بھی اضافہ ہو گیا اور اسے اپنی تفریح اور وقت گزاری کے لیے کسی لڑکی کی ضرورت پیش آئی۔

اپنی تفریح کا سامان کرنے کے لیے وہ گھر سے باہر نکلا۔ تیز بارش میں اس نے سڑکوں پر گھومنا شروع کر دیا۔ آخر وہ ایک لڑکی کو قابو کر لینے میں کامیاب ہو گیا، اور اسے اپنے گھر میں لے آیا۔ ''س'' کے گھر سمیت پورے علاقے میں بجلی کے تار کٹ چکے تھے جس کی وجہ سے ہر جگہ اندھیرے نے قبضہ جما رکھا تھا۔ لڑکی نے گھر میں گھستے ہی چیخنا چلّانا اور مدد کے لیے لوگوں کو پکارنا شروع کر دیا۔ لڑکی کی مدد کے لیے باہر سے کوئی آ نہیں سکتا تھا کیوں کہ پورا محلّہ خالی ہو چکا تھا اور ''س'' کے گھر میں اس کے نوکر کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ ''س'' کی طرح اس کا نوکر بھی بے حس تھا اس لیے اس پر بھی لڑکی کی چیخوں یا آنسوؤں کا اثر ہونا ناممکن سی بات تھی۔

جب ''س'' نے دیکھا کہ زبردستی سے کام نہیں چلے گا تو اس نے لڑکی سے شاعرانہ گفتگو شروع کر دی اور ساتھ ہی خودگو

اس کا ہمدرد ظاہر کرتے ہوئے کہا:

''ڈارلنگ، میں تمھیں یہاں قتل کرنے کے لیے نہیں لایا...ڈرو نہیں... یہاں تم زیادہ محفوظ ہو... جانا چاہو تو چلی جاؤ، لیکن باہر لوگوں درندوں کی طرح تمھیں چیر پھاڑ دیں گے ... جب تک یہ فساد ہیں تم میرے ساتھ رہنا...تم پڑھی لکھی لڑکی ہو، میں نہیں چاہتا ...کہ تم گنواروں کے چنگل میں پھنس جاؤ۔'' ☆۲۳۰

لڑکی ''س'' کی چکنی چپڑی باتوں میں آ گئی۔ اسے اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ اگر وہ ''س'' سے بچ گئی تو باہر جا کر وہ کسی اور کے ہتھے چڑھ جائے گی۔ اس نے ''س'' کے پاس رہنے کو ترجیح دی اور خود کو اس کے حوالے کر دیا یہاں تک کہ ''س'' اپنے اصل مقصد میں کام یاب ہو گیا۔

کمرے میں اندھیرے کی وجہ سے ''س'' نے لڑکی کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ اس لیے جب وہ اپنے سارے شوق پورے کر چکا تھا تو اس کا دھیان لڑکی کی صورت دیکھنے کی طرف گیا۔

''س'' اپنے کمرے میں لالٹین لے آیا لیکن لڑکی نے کچھ شرمانے کی وجہ اور کچھ روشنی میں آنکھیں چندھیانے کی وجہ سے کمرے کے کونے کی طرف مُنہ کر لیا۔ ''س'' لالٹین لے کر لڑکی کے قریب گیا تو اس نے اپنے چہرے کے آگے ہاتھ رکھ لیے۔ ''س'' نے لڑکی کو بے وقوف بنانے کے لیے کہا:

''تم بھی عجیب لڑکی ہو۔ اپنے دولھے سے بھی پردہ...اگر ضد ہی کرنی ہے تو بھئی کر لو...ہمیں آپ کی ہر ادا قبول ہے۔'' ☆۲۳۱

اسی اثنا میں زوردار دھماکہ ہوا اور لڑکی ڈر کر ''س'' کے پاس آ گئی، اور ''س'' لڑکی کی شکل دیکھنے میں کام یاب ہو گیا، لیکن لڑکی کی شکل دیکھ کر اسے سخت مایوسی ہوئی اور اس پر جو گزری اسے اس طرح بیان کیا:

...بہت ہی بھیانک صورت، گال اندر دھنسے ہوئے جن پر گاڑھا میک اَپ تھا۔ کئی جگہوں پر سے اس کی تہہ بارش کی وجہ سے اتری ہوئی تھی اور نیچے سے اصلی جلد نکل آئی تھی جیسے کئی زخموں پر سے پھاہے اتر گئے ہیں...خضاب لگے خشک اور بے جان بال جن کی سفید جڑیں دانت دکھا رہی تھیں... میں دیر تک اس کو دیکھتا رہا...تھوڑی دیر کے بعد جب میں سنبھلا تو میں نے لالٹین ایک طرف رکھی اور اس سے کہا کہ ''تم جانا چاہو تو چلی جاؤ۔'' ☆۲۳۲

لڑکی کے جواب دینے سے پہلے ہی ''س'' نے اس کا بیگ اور رین کوٹ اُٹھا کر اسے دے دیا تو لڑکی سب کچھ سمجھ گئی اور دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔

لڑکی ''س'' کی ساری شاعرانہ باتوں اور جھوٹے عشق کو سچ سمجھ بیٹھی تھی، اس لیے ایک دم سے ''س'' کے بدلے ہوئے رویّے سے اسے بہت تکلیف پہنچی اور اسی رات جب وہ ''س'' کے گھر سے نکلی تھی اسے اپنے دھتکارے جانے اور بے عزت ہونے سے جو دکھ پہنچا تھا اسے برداشت نہ کر سکی اور اسی رات گاڑی چلاتے ہوئے اس کا حادثہ ہوا اور وہ مر گئی۔

اس طرح ایک آرٹ کالج کی پرنسپل جسے مردوں سے اتنی نفرت تھی کہ وہ صرف طالبات کو پڑھاتی تھی اور انھیں صرف عورت اور پھول کی تصویر بنانے کی اجازت دیتی تھی۔

مردوں سے نفرت رکھنے کے باوجود اس کے لاشعور میں کسی مرد کی محبت کی طلب موجود تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ''س'' نے اس سے شاعرانہ اور لچھے دار گفتگو کی تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی محبت کی تکمیل ہوگئی ہے، لیکن جن جھوٹے جذبات کو وہ محبت کی تکمیل سمجھ بیٹھی تھی وہ درحقیقت ''س'' کا رچایا ہوا ڈرامہ تھا جو اس عورت کی موت کا سبب بنا۔

منٹو کا یہ تلخ افسانہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران خواتین پر گزرنے والی قیامتوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ جو علاقے فسادات کی لپیٹ میں آ گئے تھے وہاں کی بیش تر لڑکیاں غیر محفوظ تھیں۔ یہ لڑکیاں سڑکوں اور گلیوں میں بے یار و مددگار ماری ماری پھر رہی تھیں۔ اگر وہ ایک جگہ سے بچ نکلتی تو دوسری جگہ پھنس جاتیں۔ ایسی لڑکیوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔

اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مردوں نے خواتین کی بے حرمتی کے لیے بھی اپنا معیار قائم کر لیا جس کے مطابق وہ کم عمر اور خوب صورت لڑکیوں کو دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں ترجیح دینے لگے۔

اس سے بڑھ کر معاشرتی اور اخلاقی زوال اور کیا ہو سکتا ہے؟

مرد سے تمام نفرتوں کے باوجود ''س'' کو ایک مرد کی تلاش تھی، اور یہ بالکل فطری بات تھی یہ مرد جب اسے ملا تو اس نے اس کو بخوبی گوارا کیا یہ اور بات ہے کہ اس کی بدشکل اس کے آڑے آئی۔

فسادات کے دوران جنسی تشدد نے جنس کے ہر پہلو کو واضح اور روشن کر دیا تھا یہ افسانہ اس کی اچھی مثال ہے۔

عزت کے لیے

۱۹۴۷ء کے فسادات میں خواتین کے ساتھ ہونے والی بے حرمتی کے موضوع پر منٹو نے کئی افسانے لکھے اس موضوع پر لکھا جانے والا ان کا ہر افسانہ ایک تلخ حقیقت ہے۔

منٹو کا افسانہ ''عزت کے لیے'' بھی خواتین کی بے حرمتی کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔

افسانے کے اہم کردار چونی لال، اس کی بہن روپا اور ہربنس ہیں۔

چونی لال ایک نیوز ایجنسی کا مالک تھا اس کو معاشرے کے اعلیٰ طبقے کے افراد سے تعلقات بڑھانے کا بے حد شوق

تھا۔ ان کی خوشی کے لیے وہ ہر جائز اور ناجائز کام کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ چونی لال نے اپنی ماں اور بہن روپا کے ساتھ رہنے کے بجائے الگ گھر میں رہنا شروع کر دیا تھا۔ جہاں اس کے دوستوں کو ہر وقت آنے اور ہر غیر اخلاقی کام کرنے کی مکمل آزادی تھی چونی لال کے دوست اس کے گھر میں شراب پیتے اور طوائفوں کو بلا کر مجرے سنتے چونی لال ان کے شوق پورا کرنے کے لیے ہر قسم کے انتظامات کرتا لیکن بذاتِ خود کسی برائی میں حصّہ نہ لیتا۔ اسے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ وہ بڑے بڑے امرا کے راز اور کمزوریاں جانتا ہے اور اگر وہ چاہے تو ان سب کی عزت کو خاک میں ملا دے۔

چونی لال امریکا سے انگریزی رسائل بھی منگواتا اور پھر اسے امیر لوگوں میں مفت بانٹتا تا کہ وہ لوگ اس سے متاثر ہو کر اس کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھائیں۔

چونی لال کے حلقے احباب میں ہربنس بھی شامل تھا جس نے اپنی جوانی کے ابتدائی ایام ہی میں چونی لال کے یہاں آنا شروع کر دیا تھا۔ چونی لال کو ہربنس کی دوستی پر بہت فخر تھا کیوں اس کی دوستی کے ذریعے وہ اور بہت سے امرا کے قریب ہو سکتا تھا۔ چونی لال نے پہلے اسے شراب پینی سکھائی اور پھر لڑکیوں کے ساتھ وقت گزارنے کا بھی بندوبست کر دیا۔

چونی لال اپنی زندگی میں مست تھا، اور اس کے گھر کی سرگرمیاں اپنے مخصوص انداز میں جاری تھیں کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات شروع ہو گئے۔

شدید فسادات کے دنوں میں ہربنس تقریباً ہر روز کسی نہ کسی مسلمان لڑکی کو چونی لال کے گھر لے آتا جہاں وہ ایک ہندو کی حیثیت سے مسلمان لڑکی کی بے حرمتی کر کے انتقام کی آگ بھی بجھاتا اور اسے جنسی تسکین بھی بغیر کسی دام کے حاصل ہو جاتی۔

فسادات کے دنوں ہی کی بات ہے کہ ایک دن ہربنس ایک لڑکی کو چونی لال کے گھر لے کر آیا اور اس کی آبروریزی کرتا رہا جب لڑکی کی حالت بہت خراب ہو گئی تو ہربنس کا رنگ خوف سے زرد ہو گیا وہ اسی پریشانی کی حالت میں چونی لال کے پاس آیا اور اسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

چونی لال کے گھر میں ایسے واقعات ہوتے رہتے تھے اس لیے ہربنس کی بات سن کر اسے کسی قسم کی پریشانی نہ ہوئی کسی بھی لڑکی کی حالت جب زیادہ خراب ہو جاتی تو اپنے دوست راما کی خدمات حاصل کرتا۔ لڑکی کے مر جانے کی صورت میں چونی لال نے لاش کو ٹھکانے لگانے کا بھی بندوبست کر رکھا تھا۔ شدید فسادات کی وجہ سے کئی علاقوں میں کرفیو لگ چکا تھا۔ اس لیے راما کو بلانا ممکن نہ تھا۔ راما کے علاوہ کسی اور ڈاکٹر سے یہ مسئلہ بیان کر کے ہربنس کو بدنام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ اس صورت میں چونی لال اور ہربنس کے ذاتی تعلّقات بھی خراب ہو سکتے تھے۔

مجھے کیا کرنا چاہیے؟ یہی سوچتے سوچتے چونی لال اس کمرے میں چلا گیا جہاں وہ لڑکی موت اور زندگی کی کش مکش میں مبتلا تھی۔

چونی لال نے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا...لڑکی نے کروٹ بدلی اور ایک چیخ اس

کے مُنہ سے نکلی، ''بھیا!'' ☆۲۳۳

بہن کو اتنی تکلیف دہ حالت میں دیکھ کر چونی لال کو دھچکا لگا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہربنس نے جس لڑکی کی بے حرمتی کی ہے وہ اس کی بہن روپا بھی ہو سکتی ہے۔ اب چونی لال یہ چاہتا تھا کہ ہربنس کو پتا نہ چلے کہ یہ لڑکی اس کی بہن ہے۔ چناں چہ اس نے اپنے مُنہ پر انگلی رکھ کر روپا کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

چونی لال ہربنس سے جو چھپانا چاہتا تھا وہ ہربنس سن چکا تھا اس لیے وہ پہلے سے بھی زیادہ خوف زدہ ہو چکا تھا کہ چونی لال بالکل خاموشی سے معاملہ سلجھانے میں غرق تھا۔ اب بھی اسے سب سے زیادہ فکر اسی بات کی تھی کہ ہربنس کی عزت پر آنچ نہ آئے، لیکن ہربنس کو چونی لال کی خاموشی میں اپنی موت نظر آئی اس لیے اس نے چونی لال کو اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا:

> ''... مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ... تمھاری بہن ہے... یہ ساری شرارت اس مسلمان کی ہے... اس مسلمان سب انسپکٹر کی... وہی طفیل جس کی ترقی تم نے رکوائی تھی... اس نے یہ لڑکی مجھے لا کر دی اور کہا مسلمان ہے... مجھے معلوم ہوتا تمھاری بہن ہے تو کیا میں اسے یہاں لے کر آتا... تم بولتے کیوں نہیں... تم مجھ سے بدلہ لینا چاہتے ہو... لیکن میں کہتا ہوں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔'' ☆۲۳۴

اس وضاحت سننے کے بعد چونی لال نے ہربنس سے کہا۔

''گھبرائیے نہیں... آپ کے پتاجی کی عزت کا سوال ہے۔'' ☆۲۳۵

چونی لال کا یہ حوصلہ اور تسلی بخش جملہ بھی ہربنس کو مطمئن نہ کر سکا۔ کیوں کہ اس کا جرم بھی معمولی نہ تھا اور وہ اس بات سے بھی واقف تھا کہ چونی لال بہت اثر ورسوخ رکھتا ہے اسے اس بات کا بھی وہم ہو گیا تھا کہ چونی لال اسے کسی بھی لمحے قتل کر سکتا ہے اس لیے ہربنس نے اس لمحے کا انتظار کیے بغیر چونی لال کو قتل کر دیا۔

قتل کرنے کے بعد بھی اس کی تسلی نہ ہوئی اور جب تین روز کے بعد کرفیو کی پابندی ختم ہوئی تو اخباروں میں شہ سرخیوں کے ساتھ یہ خبر آئی:

> موڈرن نیوز ایجنسی کے مالک چونی لال نے اپنی سگی بہن کے ساتھ مُنہ کالا کیا اور بعد میں گولی مار کر خودکشی کر لی۔ ☆۲۳۶

اور یوں چونی لال نے مر کر ہربنس کی عزت تو بچائی لیکن وہ اپنی بہن روپا کی عزت کو بچا نہ سکا۔ کیوں اسے اپنی اور اپنی بہن کی عزت سے زیادہ ہربنس کی عزت پیاری تھی جسے بچا کر وہ اپنے تعلقات قائم رکھنا چاہتا تھا۔

منٹو کے اس افسانے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران صرف تعصب رکھنے

والے لوگوں نے ہی مسلمان خواتین کی بے حرمتی نہیں کی، بلکہ وہ ہندو بھی جن کے ۱۹۴۷ء کے فسادات سے پہلے ہی ذاتی طور پر کسی مسلمان سے اختلاف تھے انھوں نے بھی ۱۹۴۷ء کے بگڑے ہوئے حالات سے فائدہ اُٹھا اور مسلمانوں سے اپنے پرانے نقصانات کا بدلہ لیا۔

افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ مردوں کی غلطیوں، خودغرضیوں اور بداعمالیوں کی سزا ان کی خواتین کو برداشت کرنا پڑیں۔ جیسا کہ روپا کو اپنے بھائی چونی لال، مسلمان انسپکٹر طفیل اور ہربنس کی غلطیوں اور گناہوں کا حساب چکانا پڑا۔ سچ ہے قدرت بھی تو اپنی چال چلتی رہتی ہے اور یہ چال کیسی خطرناک اور چونی لال کے لیے کیسی تکلیف دہ تھی۔

بسم اللہ

سعادت حسن منٹو کا یہ افسانہ بھی ۱۹۴۷ء کے دوران خواتین کے ساتھ ہونے والی مختلف زیادتیوں، اس کی سماجی حیثیت اور اس کے نفسیاتی اثرات کے بارے میں ہے۔

سعید، ظہیر اور بسم اللہ افسانے کے اہم کردار ہیں۔

افسانے کے کردار سعید کا تعلق فلمی صنعت سے ہے۔ وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آتا ہے یہاں فلم بنانے کے سلسلے میں اس کی ملاقات ظہیر سے ہوتی ہے جو پاکستان کا مقامی باشندہ تھا۔ دونوں فیصلہ کرتے ہیں کہ وہ مل کر فلم بنائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی ظہیر کا خیال تھا کہ وہ اپنی بیوی بسم اللہ کو فلم کی ہیروئین بنائے گا۔

یوں تو بسم اللہ عام سی شکل کی عورت تھی، لیکن اس کی آنکھوں میں ہر وقت رہنے والی اداسی نے سعید کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ سعید اس اداسی کی وجہ جاننا چاہتا تھا اس تجسس نے رفتہ رفتہ محبت کا رنگ اختیار کر لیا۔ بظاہر وہ ظہیر کے دوست کی حیثیت سے ہر روز ان کے گھر آتا، لیکن اصل حقیقت یہ تھی کہ وہ بسم اللہ سے ملنے جاتا جس سے ظہیر اور بسم اللہ دونوں بے خبر تھے۔ جب ظہیر اور سعید کی بے تکلفی بڑھی تو بسم اللہ ظہیر کی غیر موجودگی میں بھی اسے گھر آنے کی اجازت دے دیتی۔ سعید، ظہیر کے واپس آنے تک اس کے گھر بیٹھا رہتا۔ ظہیر اکثر گھر آتے ہی بسم اللہ کو لے کر کسی نہ کسی پارٹی میں چلا جاتا۔

سعید کو اکثر دل ہی دل میں اس بات پر ندامت محسوس ہوتی کہ وہ ظہیر اور اسکی بیوی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا رہا ہے، لیکن وہ خود کو بسم اللہ سے محبت کرنے سے روک نہ سکا۔

ایک دن وہ معمول کے مطابق ظہیر کے گھر گیا تو اس کے گھر کے چاروں طرف اسے پولیس نظر آئی لوگوں سے پوچھنے پر اسے پتا چلا:

بسم اللہ ظہیر کی بیوی نہیں تھی۔ وہ ایک ہندو لڑکی تھی جو فسادوں میں یہاں رہ گئی تھی۔ ظہیر اس

سے پیشہ کراتا تھا۔☆ ۲۴۷

اس دن سعید کو بسم اللہ کی آنکھوں میں رہنے والی اداسی کی اصل وجہ معلوم ہوگئی اور یہ بھی پتا چل گیا کہ ہر روز رات کے وقت ظہیر پارٹی کا بہانہ کر کے اسے پیشہ کرانے کے لیے لے کر جاتا تھا۔

اس افسانے میں منٹو یہ بات ثابت کرنا چاہ رہے ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران جو خواتین اپنے گھر والوں سے بچھڑ گئیں انھیں صرف گھر والوں سے جدائی کا غم ہی نہیں سہنا پڑا، بلکہ ان لڑکیوں کو اپنی باقی زندگی دوسروں کی مرضی کے مطابق گزارنی پڑی۔ شریف سے شریف لڑکیاں بھی قحبہ خانوں میں منتقل کر دی گئیں، اور انھیں طوائف جیسے ناپسندیدہ اور غیر اخلاقی پیشے کے اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا۔ ایسی بدنصیب لڑکیاں بےقصور ہوتے ہوئے بھی معاشرے کے سب سے قابل نفرت پیشے اختیار کرنے کی وجہ سے اپنی اور لوگوں کی نظروں میں گر گئیں، لیکن وہ سوائے دکھی اور اداس ہونے کے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھیں کسی بھی شریف لڑکی کے لیے اس سے بڑا کوئی اور دکھ نہیں ہو سکتا۔

پاکستان سے ہندوستان تک

جتنے بھی افسانہ نگاروں نے فسادات کے موضوع پر افسانے لکھے ان میں سے تقریباً ہر افسانہ نگار نے خواتین کی بے حرمتی اور اس کے نفسیاتی اثرات کو اپنے افسانے میں بیان کیا ہے۔

مہندر ناتھ نے بھی اس موضوع پر ایک افسانہ ''پاکستان سے ہندوستان تک'' لکھا جس میں انھوں نے ایک بازیافتہ عورت کو اپنے گھر والوں کی نفرت اور حقارت کا نشانہ بنتے دکھایا ہے۔

صفدر اور پشپا افسانے کے اہم کردار ہیں۔

تقسیمِ ہند سے قبل پشپا اور صفدر ایک ہی گاؤں میں رہتے تھے اور ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے تھے، لیکن پشپا کے گھر والوں اور گاؤں کے لوگوں نے اس کی شدید مخالفت کی، اور پشپا کی شادی سوہن لعل کے ساتھ کر دی گئی، اور وہ شادی کے بعد گوجر خان میں آ گئی۔

پشپا کی شادی کے کچھ ہی عرصے کے بعد ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے اور ایک دن تقسیمِ ہند کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ تقسیمِ ہند کے بعد گوجر خان پاکستان کے حصے میں آ گیا۔ پشپا کے گھر والوں کے ساتھ جو لوگ مخلص تھے انھوں نے پشپا کے گھر والوں کو مشورہ دیا کہ وہ ہندوستان چھوڑ دیں۔

پشپا کے شوہر سوہن لعل کے فیصلے کے مطابق یہ طے کیا گیا کہ وہ اپنی ماں اور بچوں کو لے کر دلی چلا جائے گا اور وہاں جا کر گھر کا بندوبست کر کے پشپا اور اپنے بچوں کو بلا لے گا۔ سوہن اپنی ماں اور بچوں کو لے کر دلی چلا گیا۔

۱۱راگست کی رات کو مسلمانوں نے پشپا کے گھر میں حملہ کر دیا۔ایک مسلمان حکیم نے پشپا کے سسر کی جان بچانے کی پوری کوشش کی لیکن وہ کام یاب نہ ہو سکا اور اس حملے میں پشپا کا سسر اور حکیم دونوں مارے گئے۔

...پھر پشپا کی باری آئی۔لوٹنے والوں نے اسے بھی مالِ غنیمت سمجھا..عورت کی حیثیت ہمارے معاشرے میں ایک تپائی کی سی ہے... یوں تو ہمارے گرنتھ صاحب میں، وید میں، قرآن مجید میں عورت کو بہت اونچا مقام دیا گیا ہے لیکن موقع ملنے پر ہم لوگ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔☆۲۳۸

مسلمان نوجوانوں نے پشپا کو ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا، اور اس کی تنہائی اور بے بسی کا فائدہ اٹھایا۔

ایک دن موقع پا کر پشپا بند کوٹھڑی سے فرار ہونے میں کام یاب ہوگئی۔کوٹھڑی سے فرار ہونے کے بعد پشپا کی ملاقات صفدر سے ہوگئی۔صفدر اسے اپنے گھر لے آیا۔

اور مسلمانوں کی طرح صفدر نے بھی بہت سے ہندوؤں کا قیمتی سامان لوٹنے کے بعد ایک گھر پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔اب وہ پشپا کے بارے میں صرف محبوبہ کی حیثیت سے نہیں، بلکہ دشمنوں کی عورت کی حیثیت سے سوچ رہا تھا۔

صفدر جانتا تھا کہ اگر چہ پشپا نے برقعہ پہن رکھا ہے وہ کلمہ بھی پڑھ سکتی ہے، گاے کا گوشت بھی کھا چکی ہے، لیکن اس کی روح اب بھی ہندو تھی۔اس نے جو اسلامی طور طریقے اپنائے وہ جبراً اور محض اپنی جان بچانے کے لیے اختیار کیے تھے۔وہ پشپا سے مسلمان لڑکیوں کی بے حرمتی کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔

اس سے پہلے کہ صفدر اس پر کوئی وحشیانہ حملہ کرتا اس کا ضمیر جاگ گیا اور اس کے ساتھ ہی پشپا اس کی پرانی محبت آڑے آ گئے، اور دوسرے ہی دن صفدر نے پشپا کو شرنارتھیوں کی ٹرین میں بٹھا دیا۔

پشپا کو چھوڑتے ہوئے صفدر کو بہت تکلیف ہوئی اگر چہ وہ بہت افسردہ تھا لیکن اس کا ضمیر مطمئن تھا۔

جب کہ پشپا جیسے جیسے پاکستان سے دور اور ہندوستان سے قریب ہوتی گئی اس کی خوشی اور اُمیدوں میں اضافہ ہوتا گیا۔

دہلی پہنچنے کے بعد ہندو والنٹیروں نے اس کا شاندار استقبال کیا اسے حوصلہ دیا اس کے گھر والوں اور خاوند کا نام پوچھا اور اسے مہاجر کیمپ میں پہنچا دیا۔

...آدمیوں کا کیمپ نہ تھا بالکل دیوانوں کا کیمپ تھا۔لوگ ہراساں تھے، پریشان تھے، غصّے سے آگ بگولہ ہو رہے تھے، مسلمانوں کو گالیاں دے رہے تھے۔سرکاری حکومت کو ملیا میٹ کرنا چاہتے تھے۔سرکاری حکومت ان کا اچھی طرح خیال نہ رکھتی تھی۔کسی کا خاوند مارا گیا تھا، تو کسی کا لڑکا...کسی کی جوان لڑکی پاکستان رہ گئی تھی تو کسی کا چھوٹا بچہ گھر رہ گیا تھا۔☆۲۳۹

دودن کے بعد پشپا اپنا گھر تلاش کرنے میں کام یاب ہوگئی۔ جب وہ گھر پہنچی تو اس کے گھر والوں نے اس کا شان دار استقبال کیا چند لمحوں کی محبت پا کر وہ اپنے سارے دکھ بھول گئی۔

اگلے ہی دن پشپا کی ساس اور شوہر کا رویّہ بالکل بدل گیا۔

> دن چڑھتے ہی اس کی ساس نے اپنا روپ دھارا۔ پشپا کو الگ برتن دیے گئے۔ ایک انگیٹھی دی گئی اور اس کا راشن الگ کر دیا گیا۔ آج سے اس کا کھانا الگ پکا کرے گا... وہ صرف اچھوت بن کر اس گھر میں رہ سکتی تھی... تیسرے دن اس کے خاوند نے اسے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اسے اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتا، اس کا ضمیر اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ پشپا کے ساتھ خاوند کا رشتہ قائم رکھ سکے۔ اب یہ رشتہ اس کے ضمیر اور تہذیب دونوں کے خلاف تھا۔'' ☆۲۴۰

ساس اور شوہر کے اس رویّے پر پشپا رونے دھونے کے سوا کچھ اور نہ کر سکی اب اس کے دل میں مسلمان غنڈوں کے علاوہ اپنے شوہر اور ساس کے لیے بھی نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

شدید مایوسی اور نا اُمیدی کے بعد اچانک اس کا ذہن بیدار ہو گیا اور اس میں زندہ رہنے اور یک نئی پشپا بننے کا عزم پیدا ہوا۔

> ...کیا اس سفر میں کسی نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ صفدر نے ساتھ دیا تھا، اور اس کے بچّوں نے... وہ زندہ رہے گی، وہ ان لوگوں کو ساتھ لے کر اس دنیا سے نکلے گی۔ وہ ایک نئی زندگی کا آغاز کرے گی۔ ☆۲۴۱

اس افسانے میں مہندر ناتھ نے بازیافتہ خواتین کی نفسیات کو بیان کی ہے، اور بتایا ہے کہ انھوں نے فسادات کے دوران مصائب سے نجات حاصل کرنے کے لیے طویل سفر طے کیا لیکن پھر بھی وہ ایک مصیبت سے نجات حاصل کرتیں تو دوسری مصیبت سے واسطہ پڑ جاتا۔

ان پر ظلم ڈھانے والے اپنے اور پرائے دونوں تھے۔ اگر دشمنوں نے ان کی بے حرمتی کی تو اپنوں نے بھی انھیں وہ عزت نہ دی جس کی وہ مستحق تھیں۔ غرض یہ کہ وہ اپنے اور پرائے دونوں کا کھلونا بن کر رہ گئیں۔

ان حالات میں بھی ایسی لوگ موجود تھے جنھوں نے ہندو بن کر سوچا اور نہ مسلمان بن کر سوچا، بلکہ صرف انسان بن کر سوچا اور انسان ہونے کا حق بھی ادا کیا۔ جیسا کہ اس افسانے میں صفدر اور مسلمان حکیم تھے انھوں نے بدلہ لینے کے بجائے معاف کرنے اور ایک انسان کی حیثیت سے دوسرے انسانوں کی حفاظت کی۔

پہلا پتھر

۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران ہندوؤں اور سکھوں نے صرف مسلمان خواتین کی بے حرمتی نہیں کی، بلکہ ہوس پرست ہندوؤں اور سکھوں نے اپنی عورتوں کی عزت و ناموس کا بھی خیال نہ رکھا۔ بالخصوص وہ خواتین جو پاکستان سے ہجرت کر کے آ ئیں تھیں۔انھیں ان کے اپنوں نے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔

بلونت سنگھ نے اپنا افسانہ ''پہلا پتھر'' اسی حقیقت کو اپنے ذہن میں رکھ کر لکھا ہے۔

اپنے اس طویل افسانے میں بلونت سنگھ نے مختلف کرداروں کے ذریعے مغربی پنجاب سے ہجرت کر کے آنے والے ایک گھرانے کی معاشرتی حیثیت کو بہت سچائی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

افسانے میں کئی کردار ہیں جن میں اہم کردار دیوداس کی تین بیٹیاں گھکی، نکی اور سانولی ہیں اس کے علاوہ باج سنگھ، بونگا اور لڈو، چمن داس اور کلدیپ افسانے کے کردار ہیں۔

دیوداس فسادات کے دوران اپنی تینوں بیٹیوں اور بیوی کے ساتھ پاکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آتا ہے اس کی بیوی راستے میں قتل کر دی جاتی ہے جب کہ اس کی تینوں بیٹیوں کی عزت اور زندگی ہجرت کے دوران تو محفوظ رہتی ہے لیکن جالندھر میں آ کر انھیں جس سکھ کی حویلی میں پناہ ملتی ہے وہاں حویلی کے مالک کے علاوہ کئی نوکر اور اس کے کارخانے کے مزدور بھی رہتے تھے۔ ان مزدوروں اور نوکروں نے گھکی، نکی اور سانولی کی زندگیوں اور عزتوں کے ساتھ کھیلنا اپنا حق سمجھا۔ انھوں نے مذہب یا قوم کسی کا بھی احترام نہ کیا، چمن داس نے گھکی کے ساتھ محبت کا ڈھونگ رچایا اور گھکی کی شادی ایک معمولی شخص کے ساتھ کر دی لیکن گھکی چمن کی محبت کو فراموش نہیں کر پائی اور سل کے مرض میں مبتلا ہو گئی۔ دوسری بیٹی نکی کی بے حرمتی کی گئی اور وہ اس صدمے کی تاب نہ لاسکی اور خودکشی کرنے پر مجبور ہو گئی تیسری بیٹی جو نابینا تھی اسے بھی کلدیپ سے محبت ہو جاتی ہے لیکن وہ کلدیپ کا طویل عرصے تک انتظار کرنے کے بعد اس سے شادی کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

سانولی جو گھکی اور نکی کا عبرت ناک انجام دیکھ چکی تھی، اور وہ باج سنگھ کی عادات واطوار سے بھی واقف تھی اس کے باوجود اسے باج سنگھ پر اعتماد تھا اور وہ اسے احتراماً باج چاچا کہتی تھی۔ ایک رات وہ باج سنگھ کے پاس آئی اور اس نے اسے سخت پریشانی کی حالت میں بتایا:

> ''لالہ بہت دکھی ہے وہ رات رات بھر روتا ہے... مجھے گلے لگا کر کہتا ہے کہ یہ میری رانی بٹیا ہے۔ اسے پاپ چھو کر بھی نہیں گزرا، لیکن اسے معلوم نہیں کہ میرا پاؤں بھی ... میں سوچتی ہوں اگر کلدیپ بابو نہ آئے تو...لالہ کو معلوم ہو جائے گا اور وہ مر جائے گا...یہ سوچتے سوچتے، مجھے رونا آ گیا۔ مجھے کچھ نہیں سوجھا تو جی کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے تمھارے پاس چلی آئی۔'' ☆۲۴۲

باج سنگھ غلط کاموں میں سب کا اُستاد ہے۔ گھکی اور نکی دونوں بہنوں سے اس نے محبت کے دھوکے سے جنسی تسکین حاصل کرنے کی کوشش کی۔ گھکی کے سلسلے میں تو اسے کسی حد تک کام یاب حاصل ہوئی تھی لیکن نکی کی خوش اخلاقی کو اس نے غلط رنگ دیا اور موقع پا کر اپنے سارے ارمان پورے کیے، لیکن ان تمام برائیوں کے باوجود جب باج سنگھ نے سانولی کو دلدل میں پھنستا دیکھا تو اس کا دل بری طرح پسیج گیا اور اس کا اظہار اس نے اس طرح کیا:

''... میں سوچتا ہوں کہ مسلمان گسسے میں آ کر جو بیا کوپھی (بے وقوفی) کر رہے وہی بیا کوپھی ہم چنگے بھلے اپنی بہنوں، بہوؤں کے ساتھ کر رہے ہیں بتاؤ مسلمان کو دوش دینے سے پہلے ہمیں کھد شرم مسوس نہیں ہونی چاہیے۔'' ☆۲۴۳

اس افسانے میں بلونت سنگھ نے فسادات کے بعد کے حالات اور مسائل کا ذکر کیا ہے خاص طور پر ان مہاجر خواتین کا ذکر کیا ہے جو اپنے ملک اور لوگوں کے درمیان آ کر بھی غیر محفوظ رہیں، اور یہاں بھی ان کی عزت سے کھیلا گیا۔ جیسا کہ افسانے کے کردار گھکی، نکی اور سانولی کو تحفظ نہ مل سکا، اور وہ ودھاوا سنگھ کے نوکروں اور مزدوروں کی فطرت جاننے کے باوجود اس کی حویلی میں رہنے پر مجبور تھیں۔ انھیں حالات سے سمجھوتا کرنا پڑا۔

دراصل ہجرت کرنے والے لوگ حالات کے ستائے ہوئے تھے اور غیروں کے ظلم برداشت کرتے کرتے تھک چکے تھے، اور انھیں اپنے ملک میں آ کر ہر انسان فرشتہ لگا اور وہ برے اور بھلے کی شناخت نہ کر پائے۔ مقامی لوگوں نے ان کی کم زوری اور بے بسی کا ناجائز فائدہ اٹھایا، اور انھیں اس قابل نہ سمجھا کہ معاشرے میں انھیں بھی باعزت مقام دیا جائے۔

لمحے

بلونت سنگھ نے اس افسانے میں ۱۹۴۷ء کے فسادات کے نفسیاتی اثرات کو ایک کردار کے ذریعے بیان کیا جو فسادات جیسے دردناک حالات میں صرف اس لیے بس میں سفر کرنے کے لیے بیٹھا تھا کہ وہ بس میں سفر والی خوب صورت خواتین کو دیکھے اور پھر ان سے باتیں کرنے کی کوشش کرے۔ وہ اپنے اس مقصد میں کام یاب ہو گیا، اور ایک خوب صورت عورت سے اس نے خوب باتیں کیں۔ باتوں کے دوران ہی جب فسادات کا ذکر شروع ہوا، اور اس لڑکے کو اپنے بارے میں بتانا پڑا:

''... میں نے پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کرنے کے بعد پشاور میں کاروبار شروع کیا تھا۔ آمدنی کی صورت نظر آنے لگی تو فساد شروع ہو گئے اور مجھے ادھر بھاگنا پڑا ... اب نئے سرے سے کام کرنے کا خیال ہے۔'' ☆۲۴۴

اپنے اس تعارف سے لڑکے کو خود بھی افسوس اور شرمندگی محسوس ہوئی اور اس سے خوب صورت عورت بھی اداس ہو گئی۔

اسی طرح دوسری بار وہ عورت اور لڑکا اس وقت افسردہ ہو جاتے ہیں۔ جب خوب صورت عورت اپنی منزل آنے پر بس سے اترتی ہے اور اس لڑکے کو پتا چل جاتا ہے کہ وہ عورت لنگڑا کر چلتی ہے یہ نقص پیدائشی نہ تھا، بلکہ فسادات کے دنوں میں کسی ہندو بلوائی نے اسے اس حال تک پہنچایا تھا۔ جیسا کہ اس عورت نے خود بتایا کہ:

> ''... جب فسادیوں نے ہمارے مکان پر حملہ کیا تو ایک سور نے لاٹھی گھما کر ماری تھی... بس کچھ نہ پوچھیے۔ مالی نقصان بہت ہوا۔ جانیں بچ گئیں۔ یہی غنیمت سمجھیے کہ کناٹ پیلس میں ہماری دکان لٹ گئی۔ مکان میں فسادی گھس آئے ...لیکن بیش تر اس کے کہ کوئی نقصان ہوتا پولیس آ گئی۔'' ☆۲۴۵

بس میں سفر کرنے والا لڑکا چوں کہ ہندو تھا اور خوب صورت عورت مسلمان تھی اس لیے ہندو لڑکا اس وقت ایک ہندو نمائندہ کی طرح تھا اور عورت مسلمان قوم کی نمائندگی کر رہی تھی اس لیے لڑکے کو شدید شرمندگی محسوس ہوئی اور اسے خوب صورت عورت سے گفتگو کرنے سے جو لطف حاصل ہوا تھا اس کی جگہ اب افسوس، شرمندگی اور احساس جرم نے لے لی وہ خود کو عورت کے معذور ہونے اور مالی نقصان ہونے کا ذمّے دار سمجھنے لگا، اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ عورت اس سے کہہ رہی ہو۔

> ''...مابدولت نے نہ صرف تمھیں، بلکہ تمھاری ساری قوم کو معاف کیا۔'' ☆۲۴۶

اس افسانے میں بلونت سنگ نے یہ ثابت کیا ہے کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں لوگوں کو مختلف حادثات کا سامنا کرنا پڑا۔ جس سے معاشرے کے صرف حسّاس لوگوں نے ہی شدت سے محسوس نہ کیا، بلکہ وہ لوگ بھی جو عام زندگی میں لاپروا اور لاابالی قسم کے تھے اس کی شخصیت پر بھی اس کے اثرات پڑے۔

تعمیر

بلونت سنگھ نے اس افسانے میں تقسیمِ ہند کے نتیجے میں ہجرت کرنے والی ایک لڑکی کی اذیّت ناک زندگی اور اس لڑکی کی ذہنی کیفیت اور کرب کو بیان کیا ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ خیر اور شر کا مادّہ ہر انسان میں ہوتا ہے لیکن حالات اسے کبھی شر اور کبھی خیر کے تابع کر دیتے ہیں۔

افسانے کا اہم کردار ایک ایسا شخص ہے جس کی بیوی اور بچّے فسادات کے دوران مر چکے ہیں۔ جب کہ افسانے کا دوسرا کردار ایک ایسی لڑکی ہے جس کا شوہر فسادات کے دوران مر چکا ہے، اور پاکستان میں آ کر وہ ایسے لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی جو اسے کال گرل بنا دیتے ہیں۔ دلال کے ذریعے افسانے کا مرد کردار اس لڑکی کا تیس روپے کے عوض ایک رات کے لیے سودا کرتا ہے، لیکن لڑکی رونا شروع کر دیتی ہے اس کے مسلسل رونے سے پہلے تو مرد کو اس پر بہت غصّہ آتا ہے بعد میں جب اس

لڑکی کی گذشتہ زندگی کے بارے میں پتا چلتا ہے تو اسے اس سے ہمدردی ہو جاتی ہے اور اسی رات یہ ہمدردی محبت کا رنگ اختیار کر گئی اور وہ اس لڑکی سے شادی کا فیصلہ کر لیتا ہے۔

لڑکی نے اگر چہ حالات سے مجبور ہو کر یہ پیشہ اختیار کیا تھا، لیکن اس کے باوجود اسے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہو رہی تھی وہ عجیب ذہنی کش مکش میں مبتلا ہو گئی تھی وہ کبھی ہندوؤں کو، کبھی مسلمانوں کو اور کبھی خود کو ہی اپنا مجرم قرار دیتی۔

"...اب میں بے حد تنگ آ گئی ہوں ہر روز جب میری بابت سودے بازی ہوتی ہے...تو میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ میں اس قدر گہرے کھڈ میں گر چکی ہوں یا گرادی گئی ہوں کہ اب میرا یہاں سے نکلنا ناممکن ہے۔ آپ پھر بھی شریف ہیں لیکن عورت کی حیثیت سے..." ☆۲۴۷

صرف لڑکی ہی کو نہیں، بلکہ مرد کو بھی غلط راستہ اختیار کرنے کا افسوس تھا لیکن وہ اسے اپنی مجبوری اور تنہائی دور کرنے کا واحد طریقہ کار سمجھ رہا تھا۔

"...میں تم سے زیادہ شریف نہیں ہوں، اگر ہوتا تو تمھیں اور تم ایسی لڑکیوں کو یہ پیشہ اختیار نہ کرنا پڑتا۔" ☆۲۴۸

افسانے کا ہیرو اپنی اور لڑکی دنوں کی مجبوریوں کو سمجھ رہا تھا۔ اس کے باوجود اپنے تیس روپے ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا، اور وہ یہ بھی جانتا کہ لڑکی آسانی سے رضامند نہیں ہوگی۔ اُس نے لڑکی کو سمجھاتے ہوئے کہا:

"...دیکھو بھئی! باد جود یہ کہ تم یہاں دھندے کے لیے آئی ہو یا لائی گئی ہو...اور میں حیوانی جذبے کے تحت آیا ہوں یا لایا گیا ہوں...تاہم ہمیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ...ہم شریف لوگ ہیں۔" ☆۲۴۹

لڑکی کو نہ چاہتے ہوئے بھی خود کو لڑکے کے حوالے کرنا پڑا، لیکن اس نے پیشہ ور لڑکیوں کی طرح ادائیں دکھانے کے بجائے ایک بار پھر رونا شروع کر دیا۔ ندامت کے یہ آنسو اس بات کے گواہ تھے کہ برے ماحول میں رہ کر بھی اس کی فطرت نہیں بدلی، اور وہ برائی کو برا ہی سمجھتی رہی۔ یہی وہ چیز جس سے لڑکا متاثر ہوا اور اس نے لڑکی سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس افسانے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ فسادات کے دوران لوگ مختلف مسائل کا شکار ہوئے جس سے ان کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب ہوئے جو لڑکیاں تنہا ہجرت کر کے آئیں اپنے وطن میں آ کر بھی تحفظ حاصل نہ کر سکیں یہاں کے لوگوں نے بھی انھیں اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا۔ خواتین کی طرح مرد بھی مختلف مسائل کا شکار ہوئے اور ایسے مرد بھی تھے جنھوں نے اپنے دکھوں اور پریشانیوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے غلط راستے کا انتخاب کیا۔

ہفتے کی شام

شوکت صدیقی کا یہ افسانہ فسادات کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔ اس افسانے میں شوکت صدیقی نے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنے والے مسلمان مہاجرین کی معاشی بدحالی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کو ذکر کیا ہے۔

واحد متکلم، عائشہ، انوار، نیاز، فدا احمد اور صفدر خان افسانے کے خاص کردار ہیں۔

ہندوستان سے پاکستان ہجرت کے دوران عائشہ کے والد اور بھائی مارے جاتے ہیں۔ عائشہ اپنی ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ پاکستان آ جاتی ہے۔ یہاں یہ لوگ مہاجروں کی جھگیوں میں رہائش اختیار کرتے ہیں۔ اب عائشہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی۔ اس لیے گھر کا خرچہ چلانے کے لیے اسے ہی بھاگ دوڑ کرنا پڑی۔ محلّے کے صرف لڑکے ہی نہیں، بلکہ شادی شدہ مرد بھی عائشہ سے دوستی کے خواہاں تھے، لیکن عائشہ کے سخت رویّے نے ان سب کے حوصلے پست کر دیے۔ انتقاماً سب نے عائشہ کو بدچلن اور آوارہ جیسے القاب سے نوازا۔ عائشہ واحد متکلم کردار کی بیوی کی سہیلی تھی۔ اس لیے وہ اکثر اس کے گھر میں آیا جایا کرتا۔ محلّے کے لوگوں نے واحد متکلم اور اس کی بیوی کو بھی عائشہ سے بدگمان کرنے کی کوشش کی۔ ان سب میں پیش پیش نیاز تھا۔ جس نے محلّے میں ''اصلاح المسلمین'' کے نام سے ایک انجمن قائم کر رکھی تھی اور وہ اکثر لوگوں کو اخلاقی درس دیتے اور معاشرتی برائیوں پر بھی بحث کرتے ''اصلاح المسلمین'' پہلے مہاجرین کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ادارہ تھا۔

> ...جس کے ذریعے نیاز صاحب نے محلّے بھر سے چندہ جمع کیا... عائشہ کو شعبہ خواتین کا سکریٹری چنا، ان دنوں ان کے گھر عائشہ کی آمد و رفت بہت زیادہ تھی۔ پھر نہ جانے کیوں وہ اس سے سخت ناراض ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی مہاجرین کی امداد کی تحریک بھی ختم ہو گئی اور اصلاحِ مہاجرین کے بجائے ان کے کوارٹر پر اصلاح المسلمین کا بورڈ نظر آنے لگا۔ ☆۲۵۰
>
> ...فدا احمد کا خیال تھا کہ عائشہ کا ذریعۂ معاش بلیک میلنگ ہے۔ اس سلسلے میں وہ شہر کے ایک سیاسی لیڈر کا نام بھی لیتا ہے... لیڈر اس پر کچھ اس طرح فریفتہ تھے کہ انھوں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے کتنے ہی عاشقانہ خطوط لکھ ڈالے۔ یہ خطوط اب تک عائشہ کے پاس موجود ہیں۔ اب وہ تو کسی اور لڑکی میں دل چسپی لے رہے ہیں لیکن یہ ان خطوط کی دھمکی دے کر ان سے کچھ نہ کچھ رقم اینٹھ لاتی ہے... صفدر خان... قسمیں کھا کر کہتا ہے کہ عائشہ الفنسٹن اسٹریٹ کی ایک دکان پر سیلز گرل ہے۔ ☆۲۵۱

صفدر خان کو عائشہ سے بہت ہمدردی ہے لیکن اس ہمدردی کے پیچھے بھی اس کی اپنی اغراض شامل ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے خیالات عائشہ تک ضرور پہنچتے ہوں گے اور وہ کبھی نہ کبھی عائشہ کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔

صفدر خان کے علاوہ انوار کو بھی عائشہ سے ہمدردی تھی وہ عائشہ کو اپنی بہنوں کی طرح سمجھتا ہے۔ عائشہ کے بارے میں اس کی رائے تھی:

...عائشہ بہت نیک اور محنتی لڑکی ہے، بے چاری لاوارث ہے۔ جن دنوں وہ یہاں آئی تھی۔ سارا خاندان فاقوں پر فاقے کر رہا تھا۔ آخر اس نے اپنے ایک دوست کے ذریعے کسی فرم میں ملازمت دلوادی۔ اس کا کام صرف اس قدر ہے کہ وہ گھر، گھر جا کر یہ تحقیقات کرتی ہے کہ لوگ کون سا ٹوتھ پیسٹ استعمال کرتے ہیں۔☆۲۵۲

محلّے کے ایک آرٹسٹ کا خیال تھا کہ عائشہ ایک پرفیکٹ ماڈل ہے اس کا کہنا تھا:

...یہ لڑکی ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی میں کام کرتی ہے وہاں اسے ماڈل بنا کر اشتہارات تیار کیے جاتے ہیں۔☆۲۵۳

بظاہر ہنس مکھ اور زندہ دل اور روشن خیال نظر آنے والا ایوب بات بات پر عائشہ کو بدچلن اور آوارہ کہتا۔

واحد متکلّم شش و پنج میں مبتلا ہو گیا وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ عائشہ صحیح ہے یا محلّے کے لوگ، آخر اس نے ایک دن عائشہ سے اس کے ذریعۂ معاش کا پوچھا تو اس نے بتایا:

''... پہلے ہم لوگ جب یہاں آئے تھے تو ہمارے ایک ماموں تھے۔ وہ کچھ نہ کچھ مدد کر دیا کرتے تھے پھر انھوں نے بھی ہاتھ کھینچ لیا...آخر جب بہت برے دن آ گئے تو امّاں نے یہ کیا کہ پاس پڑوس سے کچھ کپڑے لے آئیں۔ ہم سب بہنیں مل کر سی ڈالتی ہیں...اب میں نے یہ کیا ہے کہ کوٹھیوں اور بنگلوں میں جا کر خود سلائی کے آرڈر لے آتی ہوں... مشینیں خریدنے کے لیے کچھ پیسے ہو جائیں تو میں باقاعدہ درزی خانہ کھول لوں گی۔☆۲۵۴

عائشہ اس بات سے واقف تھی کہ محلّے کے لوگ اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے، لیکن اس کے باوجود وہ اپنی ذمّے داریاں پوری کرنے سے غافل نہ ہوئی اور اس کے معمولات میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

اچانک عائشہ نے گھر سے نکلنا بند کر دیا۔ اس بات پر بھی محلّے کے لوگوں کو تشویش ہوئی اور وہ اس سوچ میں پڑ گئے کہ عائشہ گھر سے باہر کیوں نہیں نکلتی۔ تقریباً بیس روز کے بعد عائشہ بہت کمزور حالت میں ایک بچّے کے ساتھ نظر آئی۔

عائشہ کو بچّے کے ساتھ دیکھ کر لوگ عائشہ سے پہلے سے بھی زیادہ بدگمان ہو گئے۔ واحد متکلّم جو عائشہ کے بارے میں اچھی رائے رکھتا تھا اسے بھی عائشہ بدچلن اور آوارہ لڑکی لگی۔

ایک رات عائشہ کا بھائی واحد متکلّم کو اپنے گھر بلانے کے لیے آیا۔ واحد متکلّم کو نہ چاہتے ہوئے بھی عائشہ کے گھر جانا

پڑا۔عائشہ نے واحد متکلّم کے ساتھ جا کر بچّے کو گرجا گھر کے جھولے میں ڈال دیا۔واحد متکلّم کو عائشہ نے بچّے کے بارے میں بتایا:

''...وہ میرا بچہ نہیں تھا میری ناک میں گوشت بڑھ گیا تھا۔اس کا آپریشن کرانے کے لیے اسپتال گئی تھی۔وہیں ایک عورت کے بچہ ہوا تھا۔وہ بہت بیمار تھی۔آخر بے چاری مر گئی۔'' ☆۲۵۵

بچّے کو گرجا گھر چھوڑنے کے بعد عائشہ بہت دیر تک روتی رہی۔اسے اس بات کا بے حد افسوس تھا کہ بدنامی اور لوگوں کی غلط سوچ کی وجہ سے اس بچّے کو گرجا گھر چھوڑنا پڑا۔جہاں وہ مسلمان بچہ عیسائی بن جائے گا۔

واحد متکلّم کو عائشہ کی باتوں میں سچائی نظر آئی اور اسے عائشہ بے قصور اور معصوم لگی۔

محلّے کے دوسرے لوگوں کی عائشہ سے بدگمانی اور نفرت کم نہ ہوئی اور سب نے مل کر ڈپٹی کمشنر کو ایک درخواست لکھی جس میں مطالبہ کیا گیا کہ:

''...عائشہ ایک آوارہ قسم کی عورت ہے۔جس کی موجودگی سے محلّے کے نوجوانوں کے اخلاق بگڑنے کا اندیشہ ہے یہ شریف لوگوں کی بستی ہے یہاں سے ایسی بدچلن اور بدکردار عورت کو فوراً نکالا جائے۔'' ☆۲۵۶

درخواست منظور ہونے سے پہلے ہی عائشہ ایک موٹر سے ٹکرا کر مر گئی۔مرتے وقت اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا جس میں اس کی ماں کے گھٹنوں کے درد کا ٹیکہ کچھ کپڑے اور سلائی کا سامان اور عائشہ کے چھوٹے بھائی کے جوتے تھے۔

عائشہ کی ماں اپنی بیٹی کی موت کو تسلیم نہ کر سکی، اور اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی۔عائشہ کے تھیلے سے نکلنے والے سامان کو دیکھ کر لوگوں کو اس کے ذریعۂ معاش اور پیشے کا اندازہ ہو گیا۔اس پر مختلف الزامات لگانے والے لوگ حیران اور شرمندہ ہوئے، اور عائشہ کی بے گناہی اور معصومیت ثابت ہو گئی۔

عائشہ کے کردار کے ذریعے شوکت صدیقی یہ حقیقت بیان کرنا چاہ رہے ہیں کہ تقسیمِ ہند کے نتیجے میں لوگوں کو صرف اپنے پیاروں کی جدائی اور ہجرت کے کرب کو ہی نہیں برداشت کرنا پڑا، بلکہ اپنے وطن میں آ کر بھی انھیں کئی مسائل کا شکار ہونا پڑا۔مقامی لوگوں نے انھیں وہ حیثیت نہ دی۔جس کے وہ مستحق بھی تھے اور متمنی بھی۔

غرض یہ کہ ان کی نفسیاتی، سماجی اور معاشی حیثیت بالکل تباہ ہو گئی۔

(۳) قربانی کا جذبہ

۱۹۴۷ء کے فسادات میں لوٹ مار اور قتل و غارت گری کی وجہ سے کئی نقصانات ہوئے اس کے نفسیاتی ردِ عمل سے امن پسند لوگوں میں بھی جذبہ انتقام ابھرا، اور اپنی عورتوں اور بچوں یا اپنے مالی نقصان کا بدلہ مخالف قوم کے بے گناہ لوگوں سے لیا۔ اس طرح ظالموں کے ظلم کی سزا مظلوم اور بے گناہ لوگوں کو بھگتنا پڑی۔

ان خود غرض اور ظالموں کے درمیان ایسے فرشتہ صفت انسان بھی موجود تھے جن کی اعلیٰ فطرت پر ماحول اور حالات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ انھوں نے خود کو دوسروں کی جگہ رکھ کر سوچا ان کی جان، مال اور عزت کی ایسے ہی حفاظت کی جیسے اپنی جان، مال اور عزت کی جاتی ہے۔ ایسے لوگوں نے دشمن بن کر نہیں، بلکہ ایک مسلمان بن کر سوچا جسے اس کا مذہب معاف کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

ایسے لوگوں کو معاشرے نے قدر کی نگاہ سے دیکھا اور ان کی عظمت اور انسان دوست ہونے کی خوبی کو تسلیم کیا۔

عام لوگوں کی طرح افسانہ نگاروں نے بھی انھیں معاشرے کے بہترین لوگوں میں شمار کیا اور جب فسادات کے موضوع پر افسانے لکھنا شروع کیے تو ان کی عظمت اور قربانیوں کو بھی یاد رکھا اور اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

اس سلسلے میں احمد ندیم قاسمی کا افسانہ ''پرمیشر سنگھ''، خواجہ احمد عباس کا افسانہ ''میری موت''، منٹو کا افسانہ ''موذیل''، ''ٹیٹوال کا کتا''، ''آخری سیلوٹ'' عصمت کا ''جڑیں'' اور کرشن چندر کا ''ایک طوائف کا خط'' بلونت سنگھ کا ''کالے کوس'' میں ہندو اور مسلم کردار ایک دوسرے کے لیے قربانی دی۔

ایک طوائف کا خط

کرشن چندر کا یہ افسانہ فسادات کے موضوع پر لکھے گئے تمام افسانوں سے موضوع کے لحاظ سے منفرد ہے۔ اس افسانے میں کرشن چندر نے ایک طوائف پر ۱۹۴۷ء کے فسادات اور اس کے نتیجے میں معاشرے میں آنے والی تبدیلیوں کے اثرات کو بیان کیا ہے۔

۱۹۴۷ء کے فسادات میں ایک ہندو لڑکی بیلا کے والدین مسلمان بلوائیوں کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں۔ ایک مسلمان دلال بیلا کو ایک طوائف کے پاس تین سو روپے میں بیچ جاتا ہے۔ افسانے کے دوسرے کردار بتول کے والدین بھی

فسادات میں مارے جاتے ہیں،اور اسے بھی ایک ہندو دلال اسی طوائف کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے۔جس سے اس نے بیلا کو سودا کیا تھا،لیکن یہ طوائف ان دونوں لڑکیوں کو اپنے مکروہ پیشے سے بچانا چاہتی تھی۔اگر چہ طوائف نے ان لڑکیوں کو اس پیشے سے میلوں دور رکھا تھا اس کے باوجود یہ دونوں لڑکیاں قحبہ خانوں کے ماحول اور وہاں آنے جانے والوں کو دیکھ کر خوف زدہ رہتیں۔ان لڑکیوں نے فسادات کے دوران خواتین کی بے حرمتی کے جو دردناک مناظر دیکھتے تھے اور اس کے بعد قحبہ خانے میں ہونے والے کاروبار نے ان کے ذہن اور سوچ وفکر کو ان کی عمر سے بہت آگے پہنچا دیا۔ان کے تمام خوف وخدشے دور کرنے کے لیے طوائف نے معاشرے میں اپنی حیثیت جانتے ہوئے بھی محمد علی جناح اور پنڈت جواہر لعل نہرو کو ایک خط لکھا جس میں اس نے بیلا کے تحفظ کی ذمّے داری قائدِ اعظم محمد علی جناح کے سونپی۔کیوں کہ بیلا کی بربادی کے ذمّے دار مسلمان تھے۔اسی طرح بتول کے تحفظ کی ذمّے داری نہرو کو سونپی کیوں کہ اسے برباد کرنے والے ہندو تھے۔

طوائف نے اپنے خط میں بیلا کی دردناک داستان کو اس طرح بیان کیا:

> 'بیلا نے اپنی آنکھوں سے اپنے باپ کو قتل ہوتے دیکھا۔پھر اس نے اپنی آنکھوں سے اپنی ماں کو قتل ہوتے ہوئے دیکھا... میں نے قرآن پڑھا ہے،اور میں جانتی ہوں کہ راول پنڈی میں بیلا کے ماں باپ کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ اسلام میں نہیں تھا۔وہ انسانیت نہ تھی۔وہ دشمنی بھی نہ تھی،وہ بدلہ بھی نہ تھا۔وہ ایک ایسی بربریت،بے رحمی،بزدلی اور شیطانیت تھی جو اندھیرے کے سینے سے پھوٹتی ہے،اور نور کی آخری کرن کو بھی داغ دار بنا دیتی ہے۔' ☆ ۲۵۷

طوائف نے بیلا کے بعد بتول کے بارے میں یہ تفصیل لکھی:

> '...ایک ہندو دلال اسے میرے پاس لایا تھا۔میں نے اسے پانچ سو روپے میں خرید لیا۔یہ ہندو دلال اسے لدھیانہ سے لایا تھا۔ایک جاٹ دلال سے۔اس سے پہلے وہ کہاں تھی میں نہیں جانتی۔ہاں لیڈی ڈاکٹر نے مجھ سے بہت کچھ کہا ہے اگر آپ اسے سنیں تو شاید پاگل ہو جائیں۔بتول بھی اب نیم پاگل ہو چکی ہے اس کے باپ کو جاٹوں نے بے دردی سے مارا... پھر اس کی شادی شدہ بیٹیوں سے زبردستی مُنہ کالا کیا...بتول کے بے بس بھینچے ہوئے ہونٹوں، اس کی بانہوں پر وحشی درندروں کے دانتوں کے نشان...تمھاری اجنتا کی موت ہے تمھارے ایلورا کا جنازہ ہے...آؤ تمھیں وہ خوب صورتی دکھاؤں جو کبھی بتول تھی کفن میں لپٹی ہوئی اس لاش کو دکھاؤں جو آج بتول ہے۔' ☆ ۲۵۸

طوائف کا بیلا اور بتول کی داستان سنانے کا مقصد قائدِ اعظم اور نہرو سے صرف ان دو لڑکیوں کی مدد کے لیے ہی

درخواست کرنا تھا، بلکہ وہ اپنے اس خط کے ذریعے ہندو اور مسلم قوم کی ان تمام لڑکیوں کی الم ناک داستان سنانا چاہ رہی تھی جو فسادات کے دوران ہندو یا مسلم مردوں کی ہوس کا شکار ہوئیں اور یہ بات بھی ثابت کرنا چاہتی تھیں کہ آزادی کی قیمت ادا کرنے میں ہندو اور مسلمان عورتوں نے کتنا اہم کردار ادا کیا۔

اس افسانے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران خواتین پر جو قیامتیں گزریں اسے جہاں معاشرے کے دوسرے لوگ دکھی ہوئے وہاں ایک طوائف نے بھی خواتین کے دکھوں کو محسوس کیا۔ طوائف کی دکھی انسانیت سے بلاتعصب محبت، ہمدردی اور جرأت مندانہ قدم نے کرشن کے اس افسانے کو منفرد اور اعلیٰ مقام تک پہنچا دیا۔

فسادات نے گھریلو اور شریف خاندان کی لڑکیوں کو کس طرح کوٹھوں کی زینت بنایا اور اس عمل میں کس کس کا گناہ شامل ہے یہ افسانہ اس کی واضح مثال ہے۔

سہائے

منٹو کے اس افسانے کا موضوع انسان دوستی ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے فسادات کے دنوں میں ہونے والے مختلف حادثات اور ان ہی لوگوں کے مختلف ردِعمل کو بیان کیا ہے۔

ممتاز، جگل اور سہائے افسانے کے اہم کردار ہیں۔ یوں تو جگل، ممتاز، برج موہن اور واحد متکلم چاروں دوست تھے، لیکن ممتاز اور جگل آپس میں بہت گہرے دوست تھے۔ جب ۱۹۴۷ء کے فساد ہوئے تو پاکستان میں کسی مسلمان نے جگل کے چچا کو مار دیا۔ جس سے جگل اور ممتاز کی دوستی میں دراڑ پڑ گئی، اور جیسے ہی اسے اپنے چچا کے قتل کی خبر ملی تو اس نے ممتاز کو اپنے منصوبے کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا:

> ''میں سوچ رہا ہوں اگر ہمارے محلّے میں فساد شروع ہو جائے تو میں کیا کروں گا؟''
>
> ممتاز نے اس سے پوچھا، ''کیا کرو گے؟''
>
> جگل نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا، ''میں سوچ رہا ہوں۔ بہت ممکن ہے میں تمھیں مار ڈالوں۔'' ☆۲۵۹

ممتاز کو جگل کا یہ خیال سن کر بہت دکھ ہوا اور اس نے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کر لیا، اگر چہ ہجرت کرنا اس کے لیے بہت تکلیف دہ تھا، لیکن اس نے اپنی اس دکھ کو دوستوں سے چھپانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن تمام کوششوں کے باوجود جب وہ آخری بار دوستوں کے ساتھ پانے لینے گیا تو وہ اپنے جذبات قابو میں نہ رکھ سکا۔ دوستوں کے ساتھ گزارے ہوئے بہت سے لمحے یاد کر کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ممتاز کی طرح جگل بھی اداس تھا لیکن اس کے باوجود جب روانگی سے چند گھنٹے قبل ممتاز نے جگل سے پوچھا کہ کیا تم مجھے واقعی مار ڈالتے۔

جگل جو اپنے کہے ہوئے جملے ''بہت ممکن ہے میں تمھیں مار ڈالوں'' کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا اور نہایت بھونڈے انداز میں ممتاز سے معافی بھی مانگ چکا تھا لیکن پھر بھی اسے اپنے فیصلے اور انتقام لینے کے منصوبے پر کسی قسم کی پشیمانی نہ تھی یہی وجہ ہے کہ: ''جگل نے اثبات میں سر ہلا دیا، لیکن مجھے افسوس نہیں ہے۔''

ممتاز نے جگل کی ذہنی کیفیت کو سمجھتے ہوئے ایک بار پھر اس کی بے حسی اور روکھے جواب پر تحمل اور اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا اور کوئی سخت اور نفرت آمیز جواب دینے کے بجائے اس سے صرف اتنا کہا:

> ''تم مجھے مار ڈالتے تو تمھیں زیادہ افسوس ہوتا اس صورت میں اگر تم نے غور کیا ہوتا کہ تم نے ممتاز کو ایک مسلمان کو، ایک دوست کو نہیں، بلکہ ایک انسان کو مارا ہے۔'' ☆۲۶۰

اس کے ساتھ ہی ممتاز جگل کو اس کی غلط سوچ کا احساس دلانے کے لیے اسے ''سہائے'' کے بارے میں بتایا جو طوائفوں کا دلال تھا لیکن وہ ان طوائفوں کو بالکل اپنی بیٹیوں کی طرح سمجھتا تھا۔ ان کے کھانے پینے کا خرچ خود اٹھاتا اور انھیں اپنے پیشے سے جو رقم حاصل ہوتی اسے ان کے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیتا۔ مسلمان طوائفوں کو ہر ہفتے کسی ہوٹل میں گوشت کھانے کے لیے بھیج دیتا۔

۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران ممتاز نے سہائے کو بھنڈی بازار میں زخمی حالت میں دیکھا لیکن اس نے جگل کی طرح تعصب کو اپنے قریب نہ آنے دیا جیسا کہ ممتاز نے سہائے کو خود بتایا:

> ''... مجھے یہ منظور نہیں تھا کہ میں مسلمان ہو کر، مسلمانوں کے علاقے میں ایک آدمی کو جس کے متعلق میں جانتا ہوں کہ ہندو ہے اس احساس کے ساتھ مرتے دیکھوں کہ اس کو مارنے والا مسلمان تھا... ایک طرف یہ خوف دامن گیر تھا ممکن ہے میں ہی پکڑ لیا جاؤں دوسری طرف یہ ڈر تھا کہ پکڑا نہ گیا تو پوچھ گچھ کے لیے دھر لیا جاؤں گا ایک بار یہ خیال آیا کہ اگر میں اسے اسپتال لے گیا تو کیا پتا ہے اپنا بدلہ لینے کی خاطر مجھے پھنسا دے۔ سوچا، مرنا تو ہے ہی کیوں نہ اسے ساتھ لے کر مروں۔'' ☆۲۶۱

ممتاز کی طرح سہائے کے دل میں بھی انسانیت سے پیار کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا جو مرتے دم تک اس کے دل میں باقی رہا۔ سہائے نے ہندو ہونے کے باوجود ایک مسلمان طوائف کے مال کی حفاظت بالکل اس طرح کی جس طرح اپنے مال کی کی جاتی ہے۔ مرنے سے پہلے شدید زخمی حالت میں اس نے ممتاز کو سلطانہ کے زیورات اور بارہ سو روپیہ دیتے ہوئے کہا:

''...یہ سلطانہ کا مال ہے۔ میں نے ایک دوست کے پاس رکھا ہوا تھا آج اسے بھیجنے والا تھا۔ کیوں کہ آپ جانتے ہیں کہ خطرہ بہت بڑھ گیا ہے۔ آپ اسے دے دیجیے گا اور کہیے گا فوراً چلی جائے...لیکن اپنا خیال رکھیے گا۔'' ☆۲۶۲

ممتاز جگل کو سہائے کا واقعہ سنانے کے بعد خود تو پاکستان چلا گیا لیکن جاتے جاتے اسے ایک نیا انسان بنا گیا جو سہائے اور ممتاز جیسا تھا۔ جگل کو اپنی گذشتہ سوچ کا شدت سے احساس ہوا اور اس نے نہایت شرمندگی سے کہا:

''کاش میں سہائے کی روح ہوتا۔'' ☆۲۶۳

منٹو نے اس افسانے میں فسادات کے دنوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مختلف سوچ، فکر اور رویّوں کو بیان کیا ہے اور انسان دوستی پر بہت زور دیتے ہوئے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے سب سے مضبوط اور بے غرض رشتہ انسانیت کا رشتہ ہوتا ہے اور جو لوگ اس رشتے کی قدر کرتے ہیں ان کے دلوں میں نفرت، تعصّب جیسے منفی جذبات کے بجائے محبت، ہمدردی اور خلوص جیسے اعلیٰ جذبات پروان چڑھتے ہیں جو معاشرے میں فسادات اور لڑائی جھگڑوں کو روکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی منٹو نے ان ہندوؤں اور مسلمانوں کو بے وقوف اور ظالم کہا ہے جنھوں نے فسادات کے دنوں میں مذہبی اختلافات کی وجہ سے ایک دوسرے کو قتل کیا اس بات کا اظہار منٹو نے اپنے افسانے میں اس طرح کیا ہے:

''یہ مت کہو، ایک لاکھ ہندو اور ایک لاکھ مسلمان مرے ہیں؛ یہ کہو، دو لاکھ انسان مرے ہیں اور یہ اتنی بڑی ٹریجڈی نہیں کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں۔ اصل ٹریجڈی یہ ہے کہ مارنے اور مرنے والے کسی کھاتے میں نہیں گئے۔ ایک لاکھ ہندو مار کر مسلمانوں نے یہ سمجھا ہوگا کہ ہندو مت مر گیا ہے...اسی طرح ایک لاکھ مسلمان مار کر ہندوؤں نے یہ سمجھا ہوگا کہ اسلام ختم ہوگیا۔ مگر حقیقت آپ کے سامنے ہے کہ اسلام پر ایک ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی۔ وہ لوگ بے وقوف ہیں جو سمجھتے ہیں کہ بندوقوں سے مذہب شکار کیے جا سکتے ہیں مذہب، دین، ایمان، دھرم، یقین، عقیدت یہ جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم میں نہیں، روح میں ہوتا ہے۔ چھرے چاقو اور گولی سے یہ کیسے فنا ہو سکتا ہے۔'' ☆۲۶۴

منٹو کے یہ جذباتی الفاظ ان کی ''انسان دوستی'' کو ظاہر کرتے ہیں۔

آخری سلیوٹ

قیامِ پاکستان کے بعد جب آزاد ریاستوں کے الحاق کا مسئلہ پیش ہوا تو اس موقع پر بھی ہندو مسلم فسادات برپا

ہوئے۔ان فسادات کی وجہ سے بھی لوگوں کو جانی اور مالی نقصانات اٹھانا پڑے۔

منٹو وہ واحد افسانہ نگار ہیں جنھوں نے کشمیر کے الحاق کے سلسلے میں ہونے والے تنازع کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

ان کا افسانہ ''آخری سلیوٹ'' ۱۹۴۸ء میں ہونے والے تنازع کشمیر کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔

افسانے کے اہم کردار مسلمانی فوج کے صوبے دار رب نواز اور ہندوستانی فوج کا صوبے دار رام سنگھ ہے۔یہ دونوں کردار ایک دوسرے کے دوست بھی ہیں اور دشمن بھی۔

تقسیمِ ہند کے بعد ہندوستانی فوج بھی پاکستانی اور ہندوستانی فوج میں تقسیم ہوگئی۔فوج کی اس تقسیم کے ایک سال بعد ہی ۱۹۴۸ء میں کشمیر کو حاصل کرنے لیے دونوں فوجوں میں جنگ چھڑ گئی، اور ہندوستانی فوج کی حیثیت سے ایک ساتھ رہنے والے فوجی اب ہندوستانی اور پاکستانی فوج کی حیثیت سے مقابلے کے لیے ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔

رب نواز اور رام سنگھ بچپن کے دوست تھے۔ان سے پہلے ان دونوں کے باپ دادا بھی ایک دوسرے کے گہرے دوست رہ چکے تھے۔جب رب نواز اور رام سنگھ بڑے ہوئے تو دونوں ایک ساتھ ہندوستانی فوج میں بھرتی ہوئے۔

صوبے دار رب نواز کے دل میں جذبہ انسانیت کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔اگر چہ وہ پاکستانی فوج کے صوبے دار کی حیثیت سے ریاست کشمیر کو ہندوستان سے آزاد کرانے کے لیے حملہ کرنے جارہا تھا،لیکن اس کے باوجود وہ ہندوستانی فوج اور ہندوستانی لوگوں کے بارے میں ایک دشمن بن کر نہیں، بلکہ وہ ان سب کے بارے میں پرانے دوست، پڑوسی اور ہم وطن کی حیثیت سے سوچ رہا تھا،اور یہ جذباتی وابستگیاں اسے جنگ کے لیے آمادہ کرنے میں رکاوٹیں بن رہی تھیں۔

...دل میں بڑا ولولہ، بڑا جوش تھا۔بھوک، پیاس سے بے پرواصرف ایک ہی لگن تھی۔دشمن کا صفایا کردینے کی۔مگر جب اس سے سامنا ہوا تو جانی پہچانی صورتیں نظر آتیں۔بعض دوست دکھائی نہیں دیتے، بڑے بغلی قسم کے دوست، جو پچھلی جنگوں میں اس کے دوش بدوش اتحادیوں کے دشمنوں سے لڑ رہے تھے، پر اب جان کے پیاسے بنے ہوئے تھے۔☆ ۲۶۵

ایسا نہیں تھا کہ رب نواز کو پاکستان سے محبت نہ تھی یا وہ کشمیر کے الحاق کو ضروری نہیں سمجھتا تھا، بلکہ اس کے ساتھ یہ مسئلہ تھا کہ اسے جس ملک پر حملہ کرنا تھا وہ ابھی اس کی یادوں کو اپنے دل سے نکال نہ پایا تھا۔اسے اب بھی ہندوستان سے اتنی ہی محبت تھی جتنی تقسیمِ ہند سے پہلے تھی۔پاکستان اگر چہ اس کا اپنا ملک تھا لیکن پھر بھی اسے یہاں اجنبیت محسوس ہوتی وہ ابھی یہاں کے لوگوں، یہاں کے ماحول اور یہاں کی فضا سے مانوس نہیں ہوا تھا۔

اسے بار بار اپنے کو سمجھانا اور یاد دلانا پڑتا کہ ہندوستانی لوگ اور ہندوستانی فوجی اس کے پرانے ساتھی اور دوست تو

تھے اوراب بھی اس کے دل میں ان کے لیے پیار موجود رہے لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت تھی کہ وہ اس کے دشمن ملک کے باشندوں کی حیثیت سے پاکستان کے دشمن تھے وہ اکثر یہ بھی سوچتا کہ آزاد ریاستوں میں سے صرف کشمیر ہی کے بارے میں کیوں فکر کی جارہی ہے حیدرآباد دکن، جوناگڑھ اور منادر کو مسلمانوں نے کیوں فراموش کردیا۔

وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ پاکستانی فوجی ہونے کے ناطے ہندوستان کا دشمن بن کر ان سے مقابلہ کرے یا ان پرانے ساتھیوں کی یادوں کا ماتم کرے آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچا:

> یہ باریک باریک باتیں فوجی کو بالکل نہیں سوچنی چاہیے۔ اس کی عقل موٹی ہونی چاہیے۔ کیوں کہ موٹی عقل والا ہی اچھا سپاہی ہوتا ہے، مگر فطرت سے مجبور کبھی کبھی وہ چور دماغ سے ان پر غور کرہی لیتا تھا۔☆۲۶۶

صوبے دار رب نواز اور ہندو فوجیوں کے درمیان مظفر آباد اور کرن کی سڑک کے لیے جھگڑا ہو رہا تھا۔ ہندو فوجی مسلمان فوجیوں کو مشتعل کرنے کے لیے ہوائی فائرنگ کے بجائے انھیں بڑی بڑی گالیاں دے رہے تھے۔ تو کبھی مسلمان فوجی بھی جواباً انھیں ایک آدھ گالی دے دیتے۔ تقریباً دو دن تک ہندو اور مسلمان فوجیوں کے درمیان گالیوں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ آخر کار مسلمان فوجیوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور انھوں نے ان گالیوں کا جواب گولیوں سے دینا شروع کردیا۔

مسلمان فوجیوں کا حملہ کامیاب رہا۔ دو ہندو فوجی مارے گئے، چار زخمی ہوئے اور تین بھاگ گئے۔ اب ہندو فوجیوں کے چھوڑے ہوئے پہاڑ پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا، کامیابی نے مسلمانوں کے حوصلے اور بلند کردیے اور وہ پہلے سے زیادہ چوکس ہوگئے۔ سخت سردی کی پروا کیے بغیر مقابلے کے لیے بالکل تیار کھڑے تھے۔ وقفے وقفے سے ہوائی فائرنگ بھی کر رہے تھے، اور دوربین سے دشمن کر حرکات وسکنات کا جائزہ بھی لے رہے تھے۔

اچانک دشمن کی طرف سے ایک آواز بلند ہوئی جسے صوبے دار رب نواز اور دوسرے فوجی سمجھ نہ سکے۔ رب نواز نے غصے میں آ کر انھیں گالی دی۔ دوسری طرف رام سنگھ تھا۔ جس نے رب نواز کی آواز پہچان کر اسے بڑے دکھی انداز میں مخاطب کیا۔ دشمن کی جانب سے اپنا نام سن کر رب نواز سوچ میں پڑ گیا کہ یہ آواز کس کی ہوسکتی ہے کیوں کہ ان دشمنوں میں ایسے بہت سے فوجی تھے جو اس کے عزیز ترین دوست رہ چکے تھے۔

> رب نواز نے دوربین لگا کر دیکھا... اسے کوئی نظر نہ آیا... اُس نے زور سے اُدھر آواز پھینکی۔
>
> ''''یہ کون تھا؟''... فوراً ہی اُدھر سے ایک آواز بلند ہوئی... میں ہوں رام سنگھ۔'' ☆۲۶۷

رام سنگھ کی آواز سن کر رب نواز خوشی سے اچھل پڑا اور دونوں ایک دوسرے سے ہنسی مذاق اور بے تکلفانہ گفتگو کرنے میں مشغول ہوگئے اور یہ بات بالکل بھول گئے کہ وہ بے شک اب بھی ایک دوسرے کے بہت گہرے دوست ہیں، لیکن اس

وقت وہ ایک دوسرے کے دشمن کی حیثیت سے لڑنا بھی اب ان کے فرائض میں شامل ہے۔

باتوں کے دوران ہی رام سنگھ نے رب نواز سے چائے کا سامان لینے کی بھی اجازت مانگ لی جو وہ دو دن پہلے مسلمانوں کے کیے جانے والے حملے کے دوران چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ رب نواز نے بہ خوشی انھیں سامان اٹھانے کی اجازت دے دی۔ اتنی جلدی اجازت حاصل کرنے پر رام سنگھ کو رب نواز پر شک ہوا کہ کہیں وہ اسے اعتماد میں لے کر مارنا تو نہیں چاہتا۔ اس بات کا اس نے اظہار بھی کیا۔

''...تو اُڑا دے گا کمھار کے کھوتے۔''

''رب نواز نے بھنا کر کہا۔'' بک نہیں اوئے سنتو کھ سر کے پھوے۔''

رام سنگھ ہنسا، ''قسم کھا نہیں مارے گا۔''

رب نواز نے پوچھا۔ ''کس کی قسم کھاؤں!''

رام سنگھ نے کہا، ''کسی کی بھی کھا لے!''

رب نواز ہنسا، ''اوئے جا...منگوا لے اپنا سامان۔'' ☆۲۶۸

رام سنگھ کے علاوہ رب نواز کے ساتھیوں کا بھی خیال تھا کہ رب نواز نے یہ چال محض رام سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو مارنے کے لیے چلی ہے، لیکن رب نواز نے رام سنگھ کو سخت سردی میں چائے پینے کی اجازت انسانیت کے تقاضے کو نبھانے کے لیے اور رام سنگھ اور اپنی کئی سال پرانی دوستی کا بھرم رکھنے کے لیے دی تھی، لہٰذا رب نواز نے اپنا وعدہ پورا کیا۔

ہندو فوجی جب چائے کا سامان لینے کے لیے آیا تو ایک مسلمان فوجی بندوق چلانے ہی والا تھا کہ رب نواز نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا، اور جب ہندو فوجی اپنا سامان لے کر چلا گیا تو رام سنگھ نے رب نواز کا شکریہ ادا کیا، اور اس کے بعد دونوں طرف سے کچھ دیر تک تفریحاً فائرنگ کی گئی، اور ساتھ ہی رب نواز اور رام سنگھ ایک دوسرے سے ہنسی مذاق بھی کرتے رہے۔ کچھ وقفے کے بعد رب نواز نے تفریحاً دوبارہ فائرنگ کی۔ فائرنگ کے ساتھ ہی فضا میں ایک چیخ بلند ہوئی۔

رب نواز نے فوراً دوربین لگائی اور دیکھا کہ ایک آدمی، نہیں، رام سنگھ پیٹ پکڑے پتھروں کی دیوار سے ذرا ہٹ کر دوہرا ہوا اور گر پڑا۔ ☆۲۶۹

رام سنگھ کو اس حال میں دیکھ کر رب نواز بہت حیران بھی ہوا اور دکھی بھی۔ اگلے ہی لمحے ہندو فوجیوں نے رام سنگھ کا بدلہ لینے کے لیے رب نواز پر گولی چلائی، لیکن رب نواز بچ گیا۔ اس کے ساتھ دونوں فوجوں میں گولیوں کا تبادلہ شروع ہو گیا۔ رب نواز نے مسلمان فوجیوں کو پہاڑ سے نیچے اترنے کو کہا۔ پھر بھی دو مسلمان فوجی مارے گئے۔ دونوں طرف ہلچل مچ گئی۔ ہندو فوجیوں نے بھی جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگنا شروع کر دیا۔

جیسے ہی گولیوں کی بارش تھمی رب نواز رام سنگھ کے پاس گیا۔ رام سنگھ نے کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار نہ کیا، بلکہ رب نواز کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایسی چمک آ گئی جو کسی عزیز دوست کو دیکھ کر آتی ہے اور اس نے اسے پیار سے وہی مخصوص گالی دی جو وہ اسے اکثر پیار سے دیا کرتا تھا۔

...رب نواز کو دیکھ کر اس کی آنکھیں تمتما اٹھیں۔ مسکرا کر اس نے کہا،''اوئے کمھار کے کھوتے، یہ تو نے کیا کیا؟'' ☆۲۷۰

اگر چہ رب نواز سے جو کچھ ہوا تھا انجانے میں ہوا تھا، لیکن پھر بھی رام سنگھ کو مسکراتا دیکھ کر رب نواز کا احساسِ ندامت شدت اختیار کر گیا، اور اسے رام سنگھ پر بے حد پیار آیا جس کا اظہار اس نے بھی وہی گالی دے کر کیا جو وہ اسے بہت پیار سے دیا کرتا تھا۔

''خنزیر کی دم''، تم سے کس نے باہر نکلنے کو کہا تھا؟'' ☆۲۷۱

رب نواز نے جب رام سنگھ کی پٹی کھولی تو اس کی تکلیف میں اضافہ ہو گیا۔ اب رب نوز کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ گولی رام سنگھ کے پیٹ میں نہیں، بلکہ اس کے پیٹ میں لگی ہے۔ رب نواز نے یہ جانتے ہوئے بھی رام سنگھ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ بے قصور ہے اس نے ایک بار پھر رام سنگھ کو یقین دلاتے ہوئے کہا:

رب نواز کا گلا رندھ گیا۔''قسم وحدہٗ لاشریک کی۔ میں نے ایسے ہی بندوق چلائی تھی ... مجھے معلوم نہیں تھا کہ تو کھوتے کا سنگھ باہر نکل رہا ہے... مجھے افسوس ہے۔'' ☆۲۷۲

رام سنگھ کا خون بہت زیادہ بہہ چکا تھا اس کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں تھی، لیکن پھر بھی رب نواز اسے تسلیاں دیتا رہا۔ اسے خوش کرنے کے لیے رب نواز نے یہ جھوٹ بھی بول دیا کہ اس کے فوجیوں نے چھ پاکستانی فوجی مارے ہیں۔ یہ بات سن کر رام سنگھ مطمئن ہوا، لیکن اس اطمینان کا تعلق اس کی ذات سے نہ تھا، بلکہ وہ اسے اپنے فوجیوں کی کامیابی سمجھ کر خوش ہو رہا تھا جو اسے موت کی جانب بڑھتا دیکھ کر بہت افسردہ ہو گئے تھے۔ رام سنگھ نے رب نواز کو بتایا:

''میں زخمی ہوا تو وہ بہت بددل ہو گئے تھے... میں نے کہا... کھیل جاؤ اپنی اور دشمن کی جان سے...'' ☆۲۷۳

اپنے فوجیوں کی کامیابی سے مطمئن ہو کر رام سنگھ پھر ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔ رب نواز اور رام سنگھ نے بچپن سے لے کر ہندوستانی فوج تک کے زمانے کی باتیں کیں جوان کی زندگی کے بہترین دن تھے۔ باتیں کرتے رام سنگھ اتنی زور سے ہنسا کہ اس جمے ہوئے خون کا ایک لوتھڑا باہر آ گیا۔ تو رب نواز نے اسے خاموش رہنے کی تلقین کی، لیکن رام سنگھ پھر بھی وقفے وقفے سے مختلف موضوعات پر باتیں کرتا رہا اسی حالت میں اس نے کشمیر کے بارے میں بھی پوچھا:

''یارا، سچو سچ بتا، کیا تم لوگوں کو واقعی کشمیر چاہیے؟''

''رب نواز نے پورے خلوص کے ساتھ کہا، ہاں رام سنگھا!''

رام سنگھ نے اپنا سر ہلایا ''نہیں یارا، میں نہیں مان سکتا... تمھیں ورغلایا گیا ہے۔''

رب نواز نے اس کو یقین دلانے کے انداز میں کہا، ''تمھیں ورغلایا گیا... قسم پنج تن پاک کی۔''

رام سنگھ نے رب نواز کا ہاتھ پکڑ لیا، ''قسم نہ کھا یارا... ٹھیک ہوگا۔'' ☆۲۷۴

دونوں کی دوستی اور محبت اپنی جگہ قائم تھی۔ جیسے بچپن میں ہوا کرتی تھی، لیکن کشمیر کے معاملے میں دونوں میں اختلاف تھا، لیکن رام سنگھ نے صرف دوست کی خاطر کشمیر کو زبانی کلامی رب نواز کے حوالے کر دیا اور نہ چاہتے ہوئے یہ بات مان لی کہ کشمیر پر مسلمانوں کا حق زیادہ ہے۔

جب رام سنگھ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا اور اس کی زندگی کے چند لمحے باقی تھے تو میجر اسلم بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ رام سنگھ کا پرانا دوست نہ تھا لیکن جب وہ ہندوستانی فوج میں اس وقت وہ بھی رجمنٹ نمبر ۹/ ۶ میں اس کے ساتھیوں میں سے تھا، اور وہ رام سنگھ کے ساتھیوں کو بہت اچھی طرح پہچان گیا تھا۔

رام سنگھ بھی نیم بے ہوشی اور نزع کی حالت میں ہونے کے باوجود میجر اسلم کو پہچان گیا، اور وہ تھوڑی دیر کے لیے بھول گیا کہ وہ اور میجر اسلم اب ایک فوج میں نہیں۔

رام سنگھ نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ لیٹے لیٹے اٹینشن ہو کر اس نے سلیوٹ کیا، لیکن پھر آنکھیں کھول کر اس نے ایک لحظے کے لیے غور سے میجر اسلم کی طرف دیکھا۔ اس کا سلیوٹ کرنے والا اکڑا ہوا ہاتھ ایک دم گر پڑا۔ جھنجھلا کر اس نے بڑبڑانا شروع کیا... ''کچھ نہیں اوئے رام سیاں... بھول ہی گیا... کہ یہ لڑائی... یہ لڑائی ؟'' ☆۲۷۵

اِس افسانے میں منٹو نے ثابت کر دیا ہے کہ جو لوگ اپنے دل میں خوفِ خدا اور جذبہ انسانیت رکھتے ہیں ان پر حالات اور ماحول کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ افسانے کے ہیرو رب نواز اور رام سنگھ بن کر نہیں، بلکہ دوست بن کر سوچا اور دوستی جیسے انمول جذبے کا احترام کیا۔ رب نواز چاہتا تو رام سنگھ اور اس کے اس فوجی کو جو چائے کا سامان لینے آیا تھا مار سکتا تھا، لیکن رب نواز نے ہندو فوجیوں کو تحفظ دیا۔ انھیں رب نواز پر جو اعتماد تھا اسے کبھی ٹھیس نہ پہنچائی اور ان اخلاقی قدروں کا پاس رکھا جب پر عمل کرنا ہی انسان ہونے کی دلیل ہے۔ رام سنگھ نے بھی رب نواز پر ہمیشہ اعتماد کیا و رمرتے دم تک اس کی دوستی کی قدر کی۔

رام کھلاون

سعادت حسن منٹو کے اس افسانے کا موضوع انسان دوستی ہے اس افسانے میں منٹو نے ایک دھوبی رام کھلاون کی

انسان دوستی کو ایک انوکھے انداز میں بیان کیا ہے۔

افسانے کے ہیرو رام کھلاون نے تعصب کی فضا میں بھی انسانیت کا دامن نہ چھوڑا، اور اپنے مالک کے پرانے احسانات اور مہربانیوں کو یاد رکھا۔

افسانے کے بیش تر حصے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ منٹو نے یہ افسانہ اپنے دھوبی رام کھلاون سے متاثر ہو کر لکھا ہے اور اس افسانے کے کئی واقعات کی زندگی میں بھی ہو چکے تھے، اور غالبًا افسانے میں ''میں'' سے مراد منٹو بذاتِ خود ہیں۔

رام کھلاون منٹو کا دس سال پرانا دھوبی تھا، اور منٹو کے دھوبی بننے سے پہلے وہ اس کے بھائیوں کا بھی دھوبی رہ چکا تھا۔ منٹو اور اس کی بیوی رام کھلاون سے اور رام کھلاون ان سے اور ان کے بھائیوں سے بہت خوش تھا۔ مالی طور پر غیر مستحکم ہونے کے باوجود منٹو اور اس کی بیوی اس کا خیال رکھتے۔ رام کھلاون نے بھی اپنے فرائض کی ادائیگی میں کبھی کوتاہی نہ برتی۔

جب ۱۹۴۷ء کے فسادات ہوئے تو ہندو اور مسلمانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے نفرت اور تعصب کا زہر بری طرح سرائیت کر گیا۔ وہ علاقے جہاں مسلمان رہتے تھے ہندوؤں کی جان کو خطرہ تھا اور جن علاقوں میں ہندوؤں کی اکثریت تھی وہاں مسلمان ہندوؤں سے خوف زدہ تھے۔

جب فسادات شدّت اختیار کر گئے تو منٹو کو اچانک ہندوستان چھوڑنا پڑا، اور وہ رام کھلاون سے بستی میں اپنے کپڑے لینے کے لیے گئے تو انھیں ہر طرف سے نشے میں دھت دھوبیوں نے واحد متکلم کو گھیر لیا، اور یہ پوچھنا شروع کر دیا کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان؟ تاکہ اس کی موت یا زندگی کا فیصلہ کیا جا سکے واحد متکلم نے اپنی جان بچانے کے لیے پہلے تو رام کھلاون کا حوالہ دیا کہ اس کے رام کھلاون سے گہرے مراسم ہیں لیکن اپنی بات مکمل کرنے سے پہلے ہی منٹو کی جرأت اور مذہب سے پیار نے اسے بولنے پر مجبور کر دیا۔

جب دھوبیوں کو پتے چلا کہ وہ مسلمان ہیں تو رام کھلاون سمیت سارے دھوبی منٹو کر مارنے کے لیے دوڑ پڑے لیکن سب کے متفقہ فیصلے کے بعد یہ طے ہوا کہ منٹو کو رام کھلاون مارے۔

جب رام کھلاون منٹو کو مارنے کے لیے ان کے قریب آیا تو اس کا رویّہ بالکل بدل گیا۔ نشے میں ہونے کے باوجود رام کھلاون منٹو کو پہچان گیا اور اس کے ساتھ ہی اسے منٹو اور اس کے بھائی کے کیے ہوئے احسانات یاد آ گئے، اور اس نے اپنے ساتھیوں کو منٹو اور اس کے بھائیوں کے کیے ہوئے احسانات گنوانا شروع کر دیا، اور انھیں منٹو کو مارنے سے منع کیا۔ یہاں تک کہ اس کے ساتھی منٹو کو چھوڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئے۔

اگلے دن رام کھلاون نہایت شرمندگی کے ساتھ منٹو کو اس کے کپڑے واپس کرنے آیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے منٹو کی جس تلخ حقیقت سے آگاہ کیا اس سے ۱۹۴۷ء کی نفرت اور تعصب آمیز فضا کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

''...ساب مجھے معاف کردو...دارو آج کل مفت ملتی ہے ـــ سیٹھ لوگ بانٹتا ہے کہ پی کر مسلمین کو مارو...مفت کی دارو کون چھوڑتا ہے ساب!'' ☆۲۷۶

اس کے ساتھ ہی رام کھلاون نے رونا اور منٹو اور اس کے بھائیوں کے احسانات کو دھرانا شروع کر دیا۔

''ساعید شالیم بالسٹر ہمارا بہت مہربان ہوتا ـــ ہم کو ایک پگڑی، ایک دھوتی، ایک کرتا دیا ہوتا... تمھارا بیگم ساب ہمارا جان بچایا ہوتا ـــ جلاب سے ہم مرتا ـــ وہ موٹر لے کر آتا۔ ڈاکڈر کے پاس لے جاتا۔ اتنا پیسا خرچ کرتا ـــ تم ملک جاتا۔ بیگم ساب سے مت بولنا رام کھلاون...'' ☆۲۷۷

رام کھلاون کے کردار کے ذریعے منٹو نے اس بات کو واضح کیا ہے ۱۹۴۷ء میں جب ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے دشمن بن چکے تھے اور انھوں نے صدیوں پرانے تعلّقات اور میل ملاپ کو فراموش کر کے ایک دوسرے کے صرف دشمن بن کر سوچا تھا۔ اس وقت بھی ایسے لوگ موجود تھے جنھوں نے انسانیت کا دامن نہ چھوڑا۔ یہی چنگاری انسانیت کی آخری اُمید تھی اور منٹو اس پر یقین رکھتا تھا۔

دوسری حقیقت یہ بیان کی ہے کہ فسادات کے دنوں میں دولت مند گھرانوں کے لوگ اپنے دشمنوں کو نقصان پہنچانے اور مارنے کے لیے غریب عوام کو استعمال کر رہے تھے، اور غریب لوگوں نے فسادات جیسے قیامت خیز وقت کو اپنے لیے پیسا کمانے کا بہترین موقع سمجھا اور امیروں نے معمولی معاوضہ یا صرف شراب لے کر مسلمانوں کو مارنے سے دریغ نہ کیا۔

جڑیں

عصمت چغتائی کا یہ افسانہ ان لوگوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ جنھوں نے جان کی پروا کیے بغیر آزاد ملک کے مقابلے میں صدیوں پرانے وطن میں رہنے کو ترجیح دی۔

افسانے کے آغاز میں عصمت نے امّاں اور ڈاکٹر روپ چند کے گھر والوں کے دوستانہ تعلّقات کو بیان کیا ہے۔ ان دونوں گھرانوں کے افراد ایک دوسرے کے دکھ اور سکھ میں شریک ہوتے۔ معمولی کاموں سے لے کر اہم فیصلے ایک دوسرے کے مشورے سے کیے جاتے۔

اگرچہ ان دو خاندانوں کے گھر کے افراد کے سیاسی نقطۂ نظر میں اختلافات تھے۔ سیاست پر اکثر بحث و مباحثہ بھی ہوتا، لیکن ان کی آپس کی دوستی میں کوئی فرق نہ آتا۔

...حالاں کہ دونوں خاندانوں میں مسلم لیگی، کانگریسی اور مہاسبھائی موجود تھے اور مذہبی اور سیاسی بحثیں بھی جم جم کر ہوتیں مگر ایسے ہی جیسے فٹ بال یا کرکٹ میچ ہوتے ہیں۔ ادھر ابا کانگریسی

تھے تو اُدھر ڈاکٹر صاحب اور بڑے بھائی لیگی تھے تو ادھر گیان چند مہا سبھائی اِدھر منجھلے بھائی کمیونسٹ تھے تو ادھر گلاب چند سوشلسٹ اور پھر اسی حساب سے مردوں کی بیویاں اور بچے بھی اسی پارٹی کے تھے۔ عام طور پر جب مچیٹا ہوتا، تو کانگریس کا پلّہ بھاری پڑتا۔ کمیونسٹ سوشلسٹ بھی گالیاں کھاتے مگر کانگریس ہی میں گھس پڑتے ...مہا سبھائی اور لیگی ...گو ایک دوسرے کے دشمن ہوتے، پھر بھی دونوں مل کر کانگریس پر حملہ کرتے۔☆۲۷۸

ملک میں ہندو مسلم فسادات کوئی نئی بات نہ تھی۔ تقسیمِ ہند سے پہلے ملک کے حالات کئی بار بگڑ کر ٹھیک ہوئے، لیکن تقسیمِ ہند کے اعلان کے بعد ہندو مسلم اتفاق کی کوئی اُمید نہ رہی جب کہ حالات پہلے سے زیادہ بگڑ گئے نفرت اور تعصب کی فضا ہندوستان میں تیزی سے پھیل گئی اور ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی جانوں کے دشمن ہو گئے۔

لمّاں اور روپ چند کے خاندان میں جھگڑا اس وقت ہوا جب ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو:

...چھبا میاں نے ...ایک دم اسکول کی دیوار پر ''پاکستان زندہ باد'' لکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ روپ چند جی کے بچوں نے اس کی مخالفت کی اور فوراً بگاڑ کر ''اکھنڈ ہندوستان'' لکھ دیا...اور ایک دوسرے کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی سعی فرمائی گئی۔ بات بڑھ گئی حتیٰ کہ پولیس بلائی گئی اور جو چند گنتی کے مسلمان بچے تھے، انھیں لاری میں بھر کر گھروں میں بھجوا دیا گیا۔☆۲۷۹

کچھ ہی دنوں میں دونوں گھرانوں کے افراد کی محبت میں دراڑ پڑ گئی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلّقات اور لمّاں اور روپ چند کے گھر والوں کے تعلّقات میں کوئی فرق نہ رہا۔ رہی سہی کسر اس وقت پوری ہوگئی جب روپ چند کے عزیز مسلمانوں سے پٹ کر ہندوستان آئے۔

...بڑی بہو کے میکے والے بہاول پور سے مال لٹا کر اور بہ مشکل جان بچا کر جب آئے تو خلیج کا دہانہ چوڑا ہو گیا۔ پھر راول پنڈی سے جب نرملا کے سسرال والے نیم مردہ حالت میں آئے تو تو اس خلیج میں اژدہے پھنکاریں مارنے لگے۔☆۲۸۰

بالآخر لمّاں کے گھر والوں نے ہندوستان سے ہجرت کرنے کا فیصلہ کر لیا، لیکن لمّاں اس فیصلے سے متفق نہ تھیں۔ صدیوں پرانے وطن کو پرایا وطن کہنا اور نئے اور اجنبی ملک کو اپنا ملک تسلیم کرنا ان کے بس سے باہر تھا۔ لمّاں کی اس نفسیاتی الجھن کو عصمت نے اس طرح بیان کیا ہے:

...اپنا وطن ہے کس چڑیا کا نام؟ لوگو!...جس مٹی میں جنم لیا...وہی اپنی نہ ہوا تو پھر کون جانے وہاں سے بھی کوئی نکال دے ایک دن تھا مغل اپنا وطن چھوڑ کر نیا وطن بسانے آئے تھے۔ آج پھر چلو

وطن بسانے۔وطن نہ ہوا پیر کی جوتی ہوگئی۔ذرا تنگ پڑی،اتار پھینکی،دوسری پہن لی۔☆۲۸۱

ہندوستان سے ہجرت نہ کرنے کے سلسلے میں امّاں نے جو بھی جواز بیان کیے وہ محض وطن نہ چھوڑنے کا بہانہ تھے اور صدیوں پرانے وطن سے شدید محبت کا ثبوت بھی۔اپنے گھر،محلّے اور شہر کے سامنے انہیں ہر جگہ معمولی لگ رہی تھی۔

''...میں سندھنوں میں مرنے جاؤں۔اللہ ماریاں بر کے پاجامے پھڑکاتی پھریں ہیں...''

''تو مجھلے بھائی کے پاس ڈھاکے چلی جایئے۔''

''اے وہ ڈھاکہ کاہے کو جائیں گی۔کہیں کی مونڈی کاٹے بنگالی تو چاول ہاتھوں سے لیسٹر لیسٹر کے کھادیں ہیں،'' مجھلے کی ساس ممانی بی نے طعنہ دیا۔

''تو راول پنڈی چلو فریدہ کے یہاں۔'' خالہ بولیں۔

''توبہ میری۔اللہ پاک پنجابیوں کے ہاتھوں کسی کی مٹی پلید نہ کرائے...'' ☆۲۸۲

جب سب گھر والے امّاں کو ہجرت کرنے کے لیے راضی نہ کر سکے تو انھیں مجبوراً امّاں کو تنہا چھوڑ کر جانا پڑا،لیکن وطن کو چھوڑنے کا سب کو ملال تھا اور ان کی خواہش تھی کہ کاش روپ چند یا اس کے گھر والے آ کر انھیں جانے سے روکیں۔

پر جب... پورا قافلہ پھاٹک سے نکل کر پولیس کی نگرانی میں لاریوں میں سوار ہونے لگا تو ان کے کلیجے کے ٹکڑے اُڑنے لگے بے چین نظروں سے انھوں نے خلیج کے اس پار دیکھا... روپ چند جی کا برآمدہ سنسان پڑا تھا۔دو ایک بار بچے باہر نکلے مگر ہاتھ پکڑ کر واپس گھسیٹ لیے گئے۔☆۲۸۳

روپ چند جی بھی ان کے جانے سے غمگین ہو گئے۔دکھ کے ساتھ ہی شرمندگی کے احساس نے انھیں بدلتے ہوئے حالات کا شدّت سے احساس دلایا۔

... جب لاریاں دھول اڑا کر قافلے کو لے سدھاریں تو ... بوجھل قدموں سے روپ چند جی چوروں کی طرح سامنے کے خالی ڈھنڈھار گھر کو تاکنے نکلے اور تھوڑی دیر تک غبار کے بگولے میں بچھڑی ہوئی صورتوں کو ڈھونڈتے رہے اور ان کی ناکام نگاہیں مجرمانہ انداز میں،اجڑے دیار میں بھٹکتی ہوئی واپس زمین میں دھنس گئیں۔☆۲۸۴

تمام کنبے کے جانے کے بعد امّاں اکیلی رہ گئیں تو انھیں مختلف خیالات نے گھیر لیا۔ایک طرف ماضی کی یادیں تھیں اور ان یادوں میں گھر سے رخصت ہونے والوں کی یادیں،تقسیمِ ہند سے پہلے روپ چند کے خاندان سے دوستانہ تعلّقات اور پر رونق محفلیں امّاں کو ان کی تنہائی اور بگڑے ہوئے حالات کا احساس دلا رہی تھیں۔

دوسری طرف آنے والے وقت کا خوف تھا۔یہ خوف صرف ان کی ذات تک ہی محدود نہ تھا،بلکہ وہ ہجرت کرنے

والے بیٹوں، بہوؤوں، پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کی آنے والی زندگی اور ہجرت کے دوران پُرخطر اور کٹھن راستوں سے سفر کرنے کے بارے میں تھا۔

...نہ جانے راستے میں تو سب نہ ختم ہو جائیں گے آج کل تو اِکّا دُکّا نہیں پوری پوری ریلیں کٹ رہی ہیں۔ پچاس برس خون سے سینچ کر کھیتی تیار کی اور آج وہ دیس نکالا لے کرنئی زمین کی تلاش میں افتاں وخیزاں چل پڑی تھی۔ کون جانے نئی زمین ان پودوں کوراس آئے نہ آئے...گھربار، نوکری، بیوپار، سب کچھ چھوڑ کر چل پڑے۔ نئے وطن میں چیل کوؤں نے کچھ چھوڑا بھی ہوگا، یا یہ مُنہ تکتے ہی لوٹ آئیں گے...اور جولوٹ کرآتے تو پھر سے جڑیں پکڑنے کا موقع بھی ملے گا یانہیں۔ کون جانے یہ بوڑھا ٹھونٹ بہار کے لوٹ آنے تک زندہ بھی رہے گا کہ نہیں۔☆۲۸۵

روپ چند کے گھر والوں کی لاتعلقی اور بے حسی نے بھی ان کے دکھوں میں مزید اضافہ کر دیا تھا لیکن وہ اب بھی اپنے فیصلے پر پشیمان نہ تھیں۔

لمّاں اس بات سے بے خبر تھیں کہ جس کرب سے وہ گزر رہی ہیں روپ چند اور ان کی بیگم بھی اس کرب سے محفوظ نہیں ہیں۔ اس بات کا اندازہ انھیں اس وقت ہوا جب رات کے وقت روپ چند کی بیوی لمّاں کے لیے کھانا لے کر آئی، اور روپ چند لمّاں کے گھر والوں کو اسٹیشن سے منا کر واپس لے آیا۔

اور یوں ان کا یہ جھگڑا بھی گذشتہ جھگڑوں کی طرح کرکٹ یا فٹ بال کے میچ کی طرح ثابت ہوا۔ جس میں دوفریق میچ کے ختم ہوتے ہی مل کر بیٹھ جاتے ہیں۔

اس افسانے میں عصمت چغتائی نے روپ چند اور لمّاں کے کردار کے ذریعے ان ہندو اور مسلمان گھرانوں کی آپس کی بے غرض محبت اور یگانگت کو بیان کیا ہے جنھوں نے فسادات کے دنوں میں بھی آپس کے دوستانہ تعلقات کو نبھانے کی ہر ممکن کوشش کی، اور اگر وہ تھوڑی دیر کے لیے تعصب کا شکار بھی ہوئے تو اس انھیں بعد میں پشیمانی ہوئی اور انھوں نے مذہب اور قومیت کے فرق کو ختم کر کے مل جل کر رہنے کو ترجیح دی۔ ان کی یہ سوچ اور عمل ان کی سوچ اور عمل ان کی سچی اور بے غرض محبت کو ظاہر کرتی ہے۔ اسی طرح لمّاں کا اپنے گھر والوں کی جدائی برداشت کرنا اور موت کی پرواکیے بغیر ہندوستان میں رہنا ان کی وطن پرستی، اپنے گھر، محلّے اور شہر سے انسیت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہی وہ انسانیت کی چنگاری تھی جو اس پُرآشوب دور میں کہیں کہیں نظر آجاتی تھی۔ اسی سے انسانیت زندہ رہی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو اسی طرف لوٹ کر آنا پڑا کہ انسانیت اصل چیز ہے اور یہی قائم رہنے والی ہے۔ درندگی اور حیوانیت ایک عارضی جنون تھا جو تقسیم کی تلخیوں کے باعث لوگوں کے سروں پر مسلّط ہو گیا تھا اور اس نے جادو جیسا اثر دکھایا تھا۔

پرمیشر سنگھ

احمد ندیم قاسمی کا افسانہ ''پرمیشر سنگھ'' اُردو کے نا قابلِ فراموش افسانوں میں سے ایک ہے۔فسادات کے موضوع پر لکھے جانے والے اس افسانے میں احمد ندیم قاسمی نے پرمیشر سنگھ کی قربانی اور انسان دوستی کو بیان کیا ہے:

> اس افسانے میں ایک عام سکھ گھرانے کی فضا،سکھوں کی عجیب عجیب حرکتیں، پرمیشر سنگھ کی بیوی اور بیٹی کی زخمی شخصیتیں،فسادات کے نتیجے کے طور پر ذہنوں پر خوف اور نا اُمیدی کے گہرے اور مہیب سائے ، پرمیشر سنگھ کی معصوم اور دلکش شخصیت اور اختر کے دل میں اپنی ماں کی چاہت کی ہوک اور اس سے جدائی کی ٹیسیں اور اپنے فطری ''روایتی اور مانوس تہذیبی رنگ سے ہم آہنگ رہنے کی نہ مٹنے والی خواہشات، حیرت انگیز بصیرت، ایجازِ بیاں اور گہری ہمدردی کے ساتھ واضح کی گئی ہے۔☆۲۸۶

اس افسانے کے اہم کردار پرمیشر سنگھ، اختر ،بنتو اور امر کور ہیں۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان سے پاکستان ہجرت کے دوران اختر اپنی ماں سے بچھڑ جاتا ہے، جب کہ افسانے کے ہیرو پرمیشر سنگھ کا بیٹا کرتار سنگھ بھی دوران ہجرت اپنے گھر والوں سے بچھڑ جاتا ہے،صدیوں پرانے ملک، گھربار،عزیز و رشتے داروں سے بچھڑنے کا غم اپنی جگہ لیکن اختر اور کرتار سنگھ سے بچھڑنے کا غم ایسا تھا جس نے دونوں بچوں کے گھر والوں کو بہت دکھی کر دیا تھا اور اس غم کے سامنے انھیں دوسرے غم معمولی نظر آتے تھے۔

ایک دن پرمیشر سنگھ اور اس کے ساتھی ڈاکا ڈالنے کی غرض سے گھر سے نکلے۔انھیں راستے میں ایک یارومددگار بچہ ملا۔ سکھوں نے اُسے گھیر لیا۔اُس نے طیش میں آ کر ''نعرۂ تکبیر'' مارنے کی دھمکی دی، اور فوراً ہی خود سہم گیا۔اختر کے اس معصومانہ ردِعمل پر سارے سکھ ہنس پڑے لیکن اگلے ہی لمحے ایک سکھ نے اسے مارنے کے لیے کرپان بھی نکال لی،لیکن پرمیشر سنگھ کو اختر اپنے بیٹے جیسا لگا اور اس نے اس سکھ کو اختر کو مارنے سے روک دیا پرمیشر کو اختر کی بہت سی عادتیں کرتار جیسی لگیں، اور اس کے چہرے کے خدوخال میں بھی اسے اپنے بیٹے کا چہرہ نظر آیا۔جس سے پرمیشر سنگھ کو اپنا بیٹا کرتار یاد آ گیا اور وہ بہت دکھی ہو گیا۔ آخر اس کے ساتھیوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اس لڑکے کو سکھ بنا کر کرتار کی کمی کو پورا کر سکتا ہے۔

پرمیشر سنگھ نے اختر کو گود میں اٹھا لیا اور تھپکیاں دینا شروع کر دیں،لیکن کسی اجنبی کی تھپکیاں ماں کی تھپکیوں کی جگہ کیسے لے سکتی ہیں۔اختر نے رونا شروع کر دیا اور اماں کے پاس جانے کی ضد کرنے لگا۔پرمیشر سنگھ نے اختر کو ماں کے پاس لے جانے کا بہانہ کیا تا کہ وہ رونا چھوڑ دے۔اس طرح پرمیشر اختر کو اپنے گھر لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔

پرمیشر اگر چہ اختر کو دھوکے سے گھر لے گیا تھا،لیکن اس دھوکے کے پیچھے اس کے دل میں محبت کے وہی جذبات تھے

جو وہ اپنے بیٹے کے لیے رکھتا تھا۔

تقسیمِ ہند سے قبل پرمیشر کرتار سنگھ سے خوش نہ تھا اس لیے بات بات پر اسے پیٹ دیا کرتا تھا جب کہ اپنی بیٹی سے خود بھی شدید محبت کرتا تھا، اور اگر اس کی بیوی امر کور کو کچھ کہتی تو اس پر سخت ناراض ہوتا۔

کرتار سنگھ کی جدائی کے بعد اس کا رویہ بالکل بدل گیا اب وہ اپنی بیٹی امر کور کو بہانے بہانے سے ڈانٹ دیا کرتا۔ اس بات کا پرمیشر کی بیوی اور بیٹی دونوں کو شکوہ تھا کہ کرتار کے اغوا ہو جانے میں ان دونوں کا کیا قصور تھا۔ جب کہ پرمیشر سنگھ کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنی بیٹی اور بیوی کو یہ طعنہ دینے سے بھی گریز نہ کیا:

''بیٹیاں، بیویاں اغوا ہوتے سنی تھیں یارو۔ یہ نہیں سنا تھا کہ پانچ برس کے بیٹے بھی اٹھ جاتے ہیں۔'' ☆۲۸۷

پرمیشر سنگھ کا اکثر بیوی اور بیٹی سے جھگڑا رہتا، لیکن جب انھیں کرتار سنگھ یاد آتا تو وہ سب مل کر خوب روتے اور ایک دوسرے کو حوصلہ بھی دیتے۔

اسی لیے پرمیشر سنگھ اختر کو پا کر بہت خوش تھا، لیکن جب وہ اسے گھر میں لے کر گیا تو اس کی بیوی اور بیٹی نے اختر سے نفرت اور بے گانگی کا اظہار کیا، اور پرمیشر سنگھ جو دل ہی دل میں خود کو اختر کا باپ، بنتو کو اختر کی ماں اور اختر کو کرتار سنگھ سمجھنے لگا تھا۔ اس کے یہ تصوراتی رشتے بنتو نے بری طرح توڑ دیے۔

''ڈاکا مارنے گیا تھا سورما اور اُٹھا لایا یہ ہاتھ بھر کا لونڈا۔ ارے کوئی لڑکی ہی اٹھا لاتا تو ہزار نہ سہی ایک دو سو میں بک جاتی۔ اس اجڑے گھر کا کھاٹ کھٹولا بن جاتا اور پھر پگلے دیکھتے نہیں، یہ لڑکا مسلا ہے۔'' ☆۲۸۸

جب پرمیشر سنگھ اختر کو گھر میں رکھنے کے لیے بضد رہا تو اس کی بیوی بنتو نے اختر کو جان سے مارنے کی دھمکی دی جواباً پرمیشر سنگھ بھی گنڈاسا لے کر بنتو پر حملہ آور ہونا چاہتا تھا کہ بنتو جان بچانے کے لیے گھر سے باہر بھاگ گئی، اور کچھ ہی دیر کے بعد گروگرنتھی سمیت پورے محلّے کے لوگ بنتو کے ہمدرد بن کر پرمیشر کے گھر آ گئے۔ اختر کا وجود ان سب کو سخت ناگوار گزرا، اور گروگرنتھی نے اختر کو گھر میں رکھنے کے لیے پرمیشر کو حکم دیا کہ وہ اسے سکھ بنائے۔

''کل سے یہ لڑکا خالصے کی سی پگڑی پہنے گا، کڑا پہنے گا، دھرم شالہ آئے گا اور اسے پرشاد کھلایا جائے گا۔ اس کے کیسوں کو قینچی نہیں چھوئے گی۔ چھوگئی تو کل ہی سے یہ گھر خالی کر دو۔'' ☆۲۸۹

پرمیشر کو نہ چاہتے ہوئے بھی گروگرنتھی سے یہ وعدہ کرنا پڑا کہ وہ اختر کی پرورش سکھ مذہب کے مطابق کرے گا، لیکن

اس نے کبھی بھی اختر کو سکھ مت کے عقائد پر چلنے کے لیے سختی نہ کی پرمیشر نے صرف اتنا کیا کہ اختر کا ظاہری حلیہ سکھوں جیسا بنا دیا۔ اختر بھی سکھ ماحول میں رہنے کے باوجود اپنے مذہب کو نہیں بھولا تھا اور اپنے سارے کام اسلامی طریقوں ہی سے کرتا۔ سکھ مت سے اسے سخت نفرت تھی اور اس بات پر وہ پرمیشر سے ناراض ہو کر گھر سے بھاگنے کی کوشش بھی کر چکا تھا، لیکن پرمیشر نے رو رو کر اختر کے آگے ہاتھ جوڑ کر یقین دلا دیا تھا کہ وہ اختر کا سچا دوست ہے اور وہ اسے اس کی ماں کے پاس ضرور پہنچائے گا اب اختر جب بھی سونے سے پہلے یا ڈرنے کی صورت میں سورۂ اخلاص پڑھتا تو نہ صرف خود پر دم کرتا، بلکہ پرمیشر سنگھ پر بھی دم کرتا اور پرمیشر بہ خوشی اسے ایسا کرنے کی اجازت دیتا۔

پھر بھی محلّے کے بچّوں اور اختر کے درمیان لڑائی ہوتی تو وہ ایک دوسرے کے مذہب کو بھی بیچ میں لے آتے اور اختر سکھ مت کا اور سکھ لڑکے مسلمانوں کا مذاق اڑاتے۔

ایک دن اختر اور سکھ لڑکوں کی کبڈی کھیلتے کھیلتے لڑائی ہو گئی تو سکھ لڑکوں نے اختر کو مسلمان ہونے کا طعنہ دیا۔

''کیا تمھارے رسول نے تمھیں یہی سمجھایا ہے؟'' لڑکے نے طنز سے پوچھا۔

اختر ایک لمحے کے لیے چکرا گیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''اور کیا تمھارے گرو نے تمھیں یہی سمجھایا ہے؟''

''مسلا'' لڑکے نے اسے گالی دی۔

''سکھڑا'' اختر نے اسے گالی دی۔'' ☆۲۹۰

اختر اور سکھ بچّوں کی لڑائی اصل میں مسلمانوں اور سکھوں کی لڑائی تھی جو کبڈی سے شروع ہو کر رسولؐ اور واہگرو پر ختم ہوئی۔ اس مذہبی اختلاف ہی کو بنیاد بنا کر ہمارے قومی رہنماؤں نے مسلمانوں کے الگ ملک پاکستان کے قیام کو ناگزیر قرار دیا تھا۔

پرمیشر چوں کہ قوم اور مذہب کے تعصب سے پاک تھا۔ اس لیے اس نے اختر اور سکھ بچّوں کا جھگڑا ختم کرا کے انسان دوست ہونے کا ثبوت پیش کر دیا۔

پرمیشر سنگھ کو تو اختر پہلی ہی نظر میں اچھا لگا تھا، لیکن جیسے جیسے اختر کے کیس بڑھتے گئے بنتو اور گاؤں کے دوسرے لوگوں کی اختر کے لیے محبت بھی بڑھتی گئی۔ بنتو اب اختر سے ایسے ہی پیار کرنے لگی تھی جیسے وہ کرتار سے کیا کرتی تھی۔

امر کور کو نہ تو اختر کے بڑھتے ہوئے کیس متأثر کر سکے، نہ اختر کا کنگھا، نہ پگڑی، نہ کڑا کیوں کہ وہ انسان بن کر نہیں، بلکہ سکھ لڑکی بن کر مسلمان لڑکے سے نفرت کر رہی تھی امر کور کی اختر سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ ایک دن پرمیشر سنگھ اور بنتو کی غیر موجودگی میں جب اختر نے تیز بخار کی حالت میں امر کور سے ملتجیانہ انداز میں پانی مانگا تو بھی امر کور کا دل موم نہ ہوا۔ اس نے یہ سوچ کر اختر کو پانی دینے سے صاف انکار کر دیا کہ کرتار سنگھ نے جب کسی مسلمان سے پانی مانگا ہو گا تو یقیناً اسے بھی کسی نے

پانی نے دیا ہوگا پیاسے کرتار پر نہ جانے کیا گزری ہوگی۔ انتقاماً امرکور نے بھی اختر کو پیاسا رکھا۔ امرکور کا یہ انتقام صرف اختر ہی سے نہیں، بلکہ اپنے باپ سے بھی تھا کیوں کہ امرکور کے اختر کو مارنے پر پرمیشر بھی اسے مارنے کے لیے دوڑا تھا اگر بنتو بیچ میں نہ آتی تو شاید امرکور زندہ نہ رہتی۔ پرمیشر امرکور کی جان تو نہ لے سکا لیکن اس کے یہ الفاظ اس سے زیادہ تکلیف دہ اور توہین آمیز تھے۔

''سنا تو یہی تھا کہ لڑکیاں اٹھ رہی ہیں۔ پر یہاں یہ مشٹنڈی ہمارے ساتھ لگی چلی آئی اور اُٹھ گیا تو پانچ سال کا لڑکا جسے ابھی اچھی طرح ناک تک پونچھنا نہیں آتا۔ عجیب اندھیر ہے یارو۔'' ☆۲۹۱

اس کے بعد امرکور نے اختر کو مارنا پیٹنا تو چھوڑ دیا لیکن اس کو اختر سے پہلے سے زیادہ نفرت ہوگئی اور اس نے اختر کو ستانے کے لیے دوسرے طریقے استعمال کرنا شروع کر دیتے۔

اختر کو پرمیشر سنگھ کے گھر والوں کے ساتھ رہتے ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ایک دن مغویہ عورتوں اور بچوں کی بازیابی کے سلسلے میں پاکستانی فوج پرمیشر سنگھ کے گاؤں میں آئی۔ پرمیشر سنگھ کو جب اس بات کی خبر ہوئی تو اس کا دھیان اختر کی طرف گیا، اور پرمیشر یہ بات سوچ کر رنجیدہ ہوگیا کہ اب اختر اس سے بچھڑ جائے گا۔

اگلے ہی لمحے اس کی سوچ میں خودغرضانہ تبدیلی آ گئی، اور اس نے سوچا کہ وہ اختر کو مسلمان فوج سے چھپا لے گا۔ اپنی سوچ کو پرمیشر نے عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنے گھر والوں، پڑوسیوں اور گرو گرنتھی کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔

مسلمان فوجی آئے اور انھوں نے اپنی تقریر میں پاکستان میں بسنے والے ان مسلمانوں کا ذکر کیا جن کی مائیں، بہنیں، بیویاں اور بیٹیاں اغوا ہو چکی تھیں یا بچھڑ چکی تھیں اور اپنے گھر والوں کو ایسے دکھ دے گئیں جن کا مداوا ممکن نہ تھا۔ ان فوجیوں نے مامتا پر خاص طور پر زور دیا اور لوگوں کو قائل کرنے کے لیے انسانیت کا درس کچھ اس طرح دیا:

''دنیا کا ہر مذہب انسان کو انسان بنانا سکھاتا ہے اور تم مذہب کا نام لے کر انسان کو انسان سے لڑا دیتے ہو۔ ان کی آبرو پر ناچتے ہو اور کہتے ہو کہ ہم سکھ ہیں، ہم مسلمان ہیں... ہم واہگرو جی کے چیلے ہیں، ہم رسولؐ کے غلام ہیں۔'' ☆۲۹۲

گرو گرنتھی اور گاؤں کے نمبردار نے مسلمان فوجیوں کو یقین دلایا کہ یہاں کوئی مسلمان بچہ یا عورت نہیں ہے۔ مسلمان فوجیوں نے بھی ان کی بات پر یقین کر لیا اور مطمئن ہو کر چلے گئے۔

پرمیشر سنگھ کا خیال تھا کہ اختر کو چھپا کر وہ اس پریشانی اور کرب سے بچ جائے گا۔ جس کرب سے وہ کرتار کی جدائی میں دوچار ہو چکا تھا، لیکن پرمیشر نے جو سوچا تھا اس کے برعکس ہوا اور فوجیوں کے جانے کے بعد وہ بہت اداس اور دکھی ہوگیا۔ اس دکھ کے پیچھے فوجیوں کی دردناک تقریر کا اثر بھی شامل تھا اور اختر کو مسلمان فوجیوں کے حوالے نہ کرنے کا افسوس بھی شامل تھا۔ ضمیر کی ملامت نے پرمیشر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

اسی وقت پرمیشر نے اپنی بیوی سے پوچھا کہ کیا اب بھی اسے کرتار سنگھ یاد آتا ہے؟

''لو اور سنو' بیوی بولی اور پھر ایک دم چھاجوں رودی... کرتار تو میرے کلیجے کا ناسور بن گیا پرمیشرے۔'' ☆۲۹۳

اسی شام پرمیشر اختر کو باہر گھمانے کے لیے لے گیا۔ جہاں دونوں نے خوب باتیں کیں۔ پرمیشر سنگھ جانتا تھا کہ اختر اس سے کافی مانوس ہو گیا ہے اور اسے پرموں کہنے لگا تھا، لیکن اپنی ماں کی کمی اسے اب بھی محسوس ہوتی ہے اور وہ اپنی ماں کے لیے اداس ہے پھر بھی پرمیشر نے اختر سے اس کی ماں کے پاس جانے کے لیے پوچھا۔

اختر ماں کے پاس جانے کے لیے کیسے انکار کر سکتا تھا۔ پرمیشر نے اختر سے وعدہ کیا کہ وہ اسے اس کی ماں کے پاس ضرور لے کر جائے گا۔ پرمیشر اختر سے یہ وعدہ پہلے بھی کئی بار کر چکا تھا، لیکن جب اس نے اختر کو اس کی ماں کے پاس بھیجنا چاہا تو اختر کی محبت آڑے گئی اختر کو اب پرمیشر کے وعدے پر اعتبار نہیں رہا تھا، اس نے پرمیشر سنگھ سے ناراض ہوتے ہوئے کہا:

''... پر تم جاتے نہیں، تم بہت برے ہو، تم سکھ ہو۔'' ☆۲۹۴

اختر کے شکوہ کرنے پر پرمیشر نے اسے یقین دلایا کہ وہ آج ہی اپنا وعدہ پورا کر دے گا۔

اختر اپنی ماں کے پاس جانے سے بہت خوش تھا، لیکن اس کے دل میں پرمیشر کے لیے بھی محبت موجود تھی اس لیے اختر نے پرمیشر سے وعدہ کیا کہ وہ ماں کے پاس جا کر اسے ضرور خط لکھے گا۔

اختر اور پرمیشر سنگھ آخر کار چلتے چلتے اس جگہ پہنچ گئے جہاں امرت سر کی سرحد ختم ہوتی تھی اور لاہور کی سرحد شروع ہوتی تھی۔ پرمیشر سنگھ نے نہ چاہتے ہوئے بھی پرمیشر کو اپنی گود سے اتارا اور اسے راستہ سمجھاتے ہوئے بتایا کہ اب وہ یہاں سے سیدھا چلا جائے۔ اختر نے پرمیشر کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا تو پرمیشر نے اسے یہ کہہ کر سمجھا دیا کہ تمھاری ماں نے خط میں لکھا ہے کہ صرف اختر یہاں آئے۔ اس کے ساتھ ہی اس سے خط لکھنے کو کہا اور اس بات کی بھی درخواست کی:

''...تمھیں کرتار نام کا کوئی لڑکا ملے نا، تو اسے ادھر بھیج دینا۔'' ☆۲۹۵

ڈر لگنے کی وجہ سے اختر نے ایک بار پھر پرمیشر کو ساتھ چلنے کے لیے کہا تو اس بار پرمیشر نے اختر کو سورۂ اخلاص پڑھنے کا مشورہ دیا۔

اختر نے پرمیشر سنگھ کے مشورے پر عمل کیا اور اس کے بعد سیدھے راستے پر چلنا شروع کر دیا۔ پرمیشر اختر کو اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک اس کا وجود ایک نقطے کی شکل اختیار نہیں کر گیا۔

اختر ابھی اپنے گاؤں تک نہیں پہنچا تھا کہ اسے دو مسلمان سپاہیوں نے سکھ سمجھ کر پکڑ لیا۔ انھوں نے اختر سے اس کا نام پوچھا تو اس کا نام مسلمانوں والا اور حلیہ سکھوں والا دیکھ کر وہ اس شش و پنج میں مبتلا ہو گئے کہ اختر سکھ ہے یا مسلمان۔

پھر ایک نے آگے بڑھ کر اس کی پگڑی جھٹکے سے اتار لی تو اختر کے کیس کھل کر اِدھر اُدھر بکھر گئے۔☆۲۹۶

ان مسلمان سپاہیوں کو اس وقت اس بات کا یقین ہو گیا کہ اختر سکھ ہے، جب اس نے اپنے کیس کھلنے پر رونا دھونا اور کنگھا مانگنا شروع کر دیا۔

ان سپاہیوں نے اختر کو تو کچھ نہیں کہا لیکن دور کھڑے ہوئے پرمیشر کی ران پر فائر کیا۔ جس سے پرمیشر شدید زخمی ہو گیا۔ گولی کی آواز سن کر اختر بھی بھاگا آیا۔

پرمیشر نے مرنے سے پہلے ان مسلمان سپاہیوں کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا کہ اختر ایک مسلمان بچہ ہے، اور اس بات کا شکوہ بھی کیا کہ انھوں نے ایک شخص کو کیوں مار دیا جس نے ان کے مذہب اور قوم کی حفاظت کی۔

''مجھے کیوں مارا تم نے، میں تو اختر کے کیس کاٹنا بھول گیا تھا۔ میں اختر کو اس کا دھرم واپس دینے آیا تھا۔ یارو۔'' ☆۲۹۷

اور یوں پرمیشر سنگھ نے اپنی خوشی اور زندگی کی قربانی دے کر انسان ہونے کا حق ادا کر دیا۔

پرمیشر سنگھ کو جب یقین ہو گیا کہ بنتو اور امر کور اختر کے ساتھ رہنے کے باوجود آج بھی کرتار سنگھ کے لیے اداس ہیں اور ہر لمحے اس کی منتظر ہیں اور اختر بھی بنتو سے مانوس ہونے اور پرمیشر کو پرموں کہنے کے باوجود اپنی ماں کے لیے بے چین اور اداس ہے تو پرمیشر نے بنتو، امر کور اور اختر کی خوشی کے لیے اپنی خوشی کو قربان کر دیا، اور کرتار کے بعد اختر کی جدائی کے دکھ کو بھی سینے سے لگایا، اور اختر کو بحفاظت اس کی ماں کے پاس لے جانے کا فیصلہ کیا۔ چوں کہ پرمیشر سنگھ کا اپنا بیٹا کرتار سنگھ ہجرت کے دوران اس سے بچھڑ گیا تھا۔ اس لیے اس کی کمی دور کرنے کے لیے اس نے ''اختر'' کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ اختر کی شکل و صورت اور عادت بھی کرتار سے ملتی جلتی تھیں۔ اس لیے بہت حد تک پرمیشر کے دل کا خلا پر تو ہو گیا تھا لیکن کرتار کا دکھ کبھی ختم نہ ہو سکا۔

یہی وجہ ہے کہ اس نے اولاد کے دکھ کو سمجھا اور اختر کو پاکستان کی سرحد تک پہنچا دیا۔ تاکہ کرتار کے بعد اس کے گھر والے جس کرب سے گزر رہے ہیں اختر کے ماں باپ اور بہن بھائی اس کرب سے بچ جائیں۔

پرمیشر کے اس اعلیٰ خیال نے اسے انسانیت کے بلند مقام پر پہنچا دیا۔

کالے کوس

بلونت سنگھ کے اس افسانے کا موضوع انسان دوستی ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے گاماں اور پھلوار سنگھ کی سچی اور بے لوث دوستی کو بیان کیا ہے۔

تقسیمِ ہند کے نتیجے میں ہونے والی جغرافیائی تبدیلی نے لوگوں کی سوچ اور فکر کو بدل کر رکھ دیا۔ صدیوں ساتھ رہنے والے لوگ ایک دم سے ایک دوسرے کے دشمن بن گئے سیدھے سادھے اور شریف لوگ بھی عادی مجرموں کی طرح ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ جان کے علاوہ دوسرے کے مال اور عزت کو نقصان پہنچانے کے لیے بھی ہندو اور مسلمان دونوں نے بھرپور کوشش کی۔

گاماں اور پھلوار جو عام زندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ بہت مخلص تھے۔ شدید فسادات کے دنوں میں بھی ان کی دوستی اور خلوص میں کوئی فرق نہ آیا۔ پھلوار سنگھ صرف گاماں ہی کا نہیں، بلکہ اس کی ماں، بیوی اور بہن کا بھی خیال رکھتا اور ان کی ایسی ہی عزت کرتا جیسے اپنے گھر کی عورتوں کی کرتا۔

جب حالات بہت زیادہ خراب ہو گئے تو گاماں ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنے کے لیے مجبور ہو گیا۔ پھلوار سنگھ نے اپنے مسلمان دوست گاماں سے وعدہ کیا کہ وہ اسے خود پاکستان کی سرحد تک چھوڑ کر آئے گا، اور ساتھ ہی یہ بھی تاکید کی تھی کہ وہ قافلے کے ساتھ نہ جائے کیوں کہ قافلے پر ہندوؤں اور سکھوں کے حملے کا زیادہ خطرہ تھا، لیکن ایک دن جب پھلوار سنگھ گاؤں سے باہر گیا ہوا تھا تو گاماں کو اس کے مالک مکان نے یہ کہہ کر گھر خالی کرنے کو کہا کہ اگر گھر خالی نہ کیا تو اسے اور گاماں کے گھر والوں کو دوسرے سکھ اور ہندو مار دیں گے۔ گاماں کو اچانک ہجرت کرنی پڑ گئی اور وہ پھلوار سنگھ کے بتائے ہوئے راستے پر اپنے گھر کی تین عورتوں سمیت چل پڑا۔

بھوک، تھکن اور موت کے خوف نے ان کے راستے کو طویل اور کٹھن کر دیا۔ ہر لمحے انھیں یہی خوف رہا کہ انھیں کوئی سکھ یا ہندو قتل کر دے گا۔

سب سے بری حالت خواتین کی تھی:

> وہ عفت مآب عورتیں اپنی آبرو کے لیے فکرمند ہو رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک مرتبہ آبرومندی کے ساتھ پاکستان کی سرزمین تک پہنچ جائیں۔ خواہ وہاں انھیں پہنچتے ہی موت آ جائے۔ انھیں اپنی جانیں ایسی پیاری نہیں تھیں۔ ☆۲۹۸

گاماں جب اپنے گھر والوں کے ساتھ پاکستان کی سرحد کے قریب پہنچ گئے تو اچانک پھلوار سنگھ ان کا پیچھا کرتا ہوا ان تک پہنچ گیا۔ اس نے سخت ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

> ''تمھارے پیروں کے نشانات دیکھ کر یہاں تک آن پہنچا ہوں... یہ درست تھا کہ کچھ خطرہ پیدا ہو چلا تھا، لیکن تمھیں باآسانی چھپایا جا سکتا تھا۔ اس دن سے تمھاری تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ یہی فکر تھی کہ کہیں فسادیوں کے ہتھے نہ چڑھ جائیں۔'' ☆۲۹۹

پھلوار سنگھ گاماں کی ماں، بیوی اور بہن کو زندہ سلامت دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ گاماں کی ماں بھی پھلوار سنگھ کو دیکھ بہت خوش ہوئی۔

> عمر رسیدہ ماں نے پھلوار کی طرف دیکھا (اور) پھر پس منظر میں کہنے لگی۔ میں پانچوں وقت نماز کے بعد اللہ سے اس شخص کے حق میں دعا مانگا کروں گی۔☆۳۰۰

پھلوار نے گاماں سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر کے دکھایا۔ وہ گاماں کے خاندان کو خود بحفاظت پاکستان کی سرحد تک چھوڑ کر آنا چاہتا تھا، لیکن گاماں کی اچانک ہجرت کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکا۔ جس کا اسے بے حد افسوس تھا۔ وہ ان کے لیے اتنا فکر مند اور بے چین تھا کہ وہ ان کے قدموں کے نشانات کو دیکھتا ہوا ان تک پہنچ گیا۔

پھلوار سنگھ کا یہ فعل اس کی عظمت اور سچی دوستی ہونے کی دلیل ہے اور اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ گاماں اور پھلوار سنگھ کی دوستی صرف ہنسی مذاق تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ فسادات جیسے خطرناک حالات میں بھی پھلوار نے اپنی جان کی پروا کیے بغیر گاماں کی ہر ممکن مدد کرنے کی کوشش کی۔

میری موت

خواجہ احمد عباس کا افسانہ ''میری موت'' فسادات کے موضوع پر لکھے گئے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے۔ شیخ برہان الدین، غلام رسول اور سردار جی افسانے کے اہم کردار ہیں۔ خاص طور پر سردار جی کے کردار نے افسانے کو جان ڈال دی ہے۔

افسانے کے کردار شیخ برہان الدین کو سکھوں سے بچپن ہی سے نفرت تھی اور یہ نفرت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ جب ۱۹۴۷ء میں ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے تو مشرقی پنجاب سکھوں نے مسلمانوں کو بہت بے دردی سے قتل کیا۔ جس سے شیخ برہان الدین سکھوں سے پہلے بھی زیادہ متنفر ہو گئے۔

جب ۱۹۴۷ء کے فسادات شروع ہوئے کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ شیخ برہان الدین کے پڑوس راول پنڈی سے ایک سکھ خاندان آ کر آباد ہوا۔ شیخ برہان کو اس سکھ سے نفرت کے ساتھ ساتھ خوف و خطرہ بھی ہوا اور اسے ہر دم یہی دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں وہ سکھ اسے یا اس کے گھر والوں کو مار نہ دے۔ سردار جی کے دوستانہ رویّے کے باوجود شیخ برہان الدین اس سے محتاط رہتا اور اس کے خلوص اور ہنسی مذاق کو اس نے سردار جی کی مکاری سمجھا۔ ایک دن اچانک سکھوں نے ایک جلوس کی شکل میں شیخ برہان کے گھر حملہ کیا سردار جی بھی محض دکھاوے کے لیے اس جلوس میں شامل ہو گئے اور شیخ کے گھر میں سب سے پہلے داخل ہو کر شیخ کو اپنے گھر میں چھپ جانے کے لیے بھیج دیا، اور دوسرے سکھوں کے ساتھ مل کر جو سامان لوٹا وہ بھی بعد میں شیخ کو لوٹا دیا۔ سردار

جی کو اس نیکی کی سزا کے طور پر اس کے ساتھی نے اسے قتل کر دیا۔ مرنے سے پہلے سردار جی نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ:

''مجھے کرجا اتارنا تھا بیٹا!''

''قرضہ؟''

''ہاں، راول پنڈی میں تمھارے جیسی سے ایک مسلمان نے اپنی جان دے کر میری اور میرے گھر والوں کی جان اور اجت بچائی تھی۔''

''کیا نام تھا اس کا سردار جی؟''

''گلام رسول۔'' ☆۳۰۱

سردار جی کی اس عظیم قربانی کا شیخ برہان الدین پر بہت گہرا اثر ہوا اور اسے یوں محسوس ہوا کہ گولی لگنے سے سردار جی تو مر ہی گئے ہیں لیکن ان کی اس قربانی سے وہ خود بھی مر گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے سکھوں کے بارے میں اپنی پرانی سوچ اور خیال کو یاد کر کے بڑی ندامت ہوئی اور اسے اپنا ہم خیال دوست غلام رسول یاد آ گیا، اور اسے ایسا لگا کہ وہ اب بھی اسے کہہ رہا ہے:

''میں نہ کہتا تھا کہ بارہ بجے ان سکھوں کی عقل غائب ہو جاتی ہے اور یہ کوئی نہ کوئی حماقت کر بیٹھتے ہیں۔ اب ان سردار جی ہی کو دیکھو نا ـــ ایک مسلمان کی خاطر اپنی جان دے دی۔'' ☆۳۰۲

خواجہ احمد عباس کے اس افسانے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر چہ بیش تر ہندوؤں اور مسلمانوں نے صدیوں پرانے تعلقات کو فراموش کر کے ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی، لیکن فسادات کی پُر آشوب فضا میں بھی ایسے عظیم لوگ موجود تھے جو تقسیمِ ہند اور فسادات اور لوٹ مار نے ان کے دلوں کو موم کر دیا، اور نفرت کی جگہ محبت نے لے لی۔ جیسا کہ افسانے کا غلام رسول جو سکھوں کو مسخروں کے سوا کچھ اور نہ سمجھتا تھا اور بات بات پر ان کا مذاق اڑایا کرتا تھا لیکن جب سردار جی اور اس کے گھر والوں کی خاطر اپنی جان بھی قربان کر دی۔

دوسری طرف سردار جی نے غلام رسول کے احسان کی قدر کی، اور شیخ برہان کی زندگی بچا کر اپنا قرض اتار دیا۔

اور یوں غلام رسول اور سردار جی نے اپنی زندگیوں کو قربان کر کے خود کو انسانیت کی معراج تک پہنچا دیا۔

ایک شہری پاکستانی

رام لعل نے اس افسانے میں فسادات کا شکار ہونے والے دو خاندانوں کی کہانی بیان کی ہے جن کے خاندان کے بیش تر افراد فسادات کے دوران مارے گئے اور جو زندہ رہے وہ ایسے حالات کا شکار ہوئے کہ زندہ رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے پھر سے ملنا تو دور کی بات ہے ان میں اتنی ہمت اور حوصلہ ہی نہ رہا کہ وہ ایک دوسرے کا سامنا کر سکتے۔

تقسیمِ ہند کے نتیجے میں سرسوتی اپنے شوہر بلدیو سے بچھڑ جاتی ہے اور اپنے والدین کے ساتھ پاکستان سے ہندوستان ہجرت کر کے چلی جاتی ہے ہندوستان میں سرسوتی اپنے گھر والوں کے ساتھ مہاجر کیمپ پہنچتی ہے جہاں اس کی ملاقات سندرداس سے ہوتی ہے۔ سندرداس ان لوگوں کی جان بچانے اور مکان وغیرہ حاصل کرنے کے سلسلے میں ہر ممکن مدد کرتا ہے سرسوتی کے ماں باپ اس سے بہت متاثر ہوتے ہیں، اور جب انھیں بلدیو کے سارے گھر والوں کے مرنے کی اطلاع ملتی ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ بلدیو کو بھی مسلمانوں نے مار دیا ہوگا۔ اس فرضی خیال کو وہ حقیقت سمجھ کر سرسوتی کی شادی سندرداس کے ساتھ کر دیتے ہیں۔

بلدیو بھی یہی سمجھتا تھا کہ سرسوتی اور اس کے گھر والے مارے جا چکے ہیں، لہٰذا اس نے پاکستان سے ہجرت کرنا بھی ضروری نہ سمجھا۔

ایک دن اچانک جب سندرداس اور سرسوتی کی شادی کو دس سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ بلدیو پاکستان سے ہندوستان آ گیا۔ یہ بات دونوں خاندانوں کے لیے حیرت اور دکھ کا سبب بنی خاص طور پر بلدیو اور سرسوتی کے لیے یہ حقیقت بہت تلخ اور کرب ناک تھی۔

> ...بلدیو کی آنکھیں اب صرف سرسوتی پر جمی تھیں...اگر چہ حسرت اور مایوسی کے گرد و غبار سے
> اس کی آنکھوں کی پہنائیاں بجھی ہوئی نہیں تھیں...سرسوتی کا چہرہ بھی کبھی شرم سے سرخ ہو اٹھتا۔
> کبھی راکھ کی طرح سرد ہو کر مرجھا جاتا۔ ☆۳۰۳

سرسوتی کی ماں اور باپ اس بات سے بہت حیران تھے وہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ اب انھیں کیا کرنا چاہیے بلدیو کے یوں اچانک آ جانے سے ان کے سارے زخم پھر سے تازہ ہو گئے تھے۔

اگر چہ سرسوتی کی ماں اس بات سے بہت خوش تھی کہ بلدیو زندہ ہے، لیکن اسے اس بات کا دکھ بھی کہ بلدیو انھیں اس وقت کیوں ملا جب اس کا سرسوتی سے تعلق نہیں رہا تھا، بلکہ وہ سندرداس کی بیوی بن چکی تھی۔

اب انھیں سرسوتی اور بلدیو کا ایک جگہ بیٹھنا اچھا نہ لگا، اور سرسوتی کی ماں نے اس بات پر سخت اعتراض کیا۔

> ...اس کی کمر پر زور سے دو ہتھڑ مار کر بولی، ''تو یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے۔ شرم نہیں آئی تجھے؟ چل
> اندر...ماں کی بات پر زخم خوردہ ہو کر جلدی جلدی بچوں کو گھسیٹتی کمرے کے اندر چلی گئی۔'' ☆۳۰۴

کچھ دیر کے بعد سرسوتی کے رشتے دار اور محلّے کے لوگ بھی ان کے گھر پہنچ گئے اور وہ سب بھی حیرت سے بلدیو کو دیکھنے لگے، لیکن مُنہ سے کچھ نہ بولے۔

> ''...پہچانتے کیوں نہیں ہو؟ بلدیو ہے! زندہ ہے۔ میری بیٹی کی ناک کاٹنے کے لیے سارے

جگ میں۔'' ☆۳۰۵

آخر میں سندر داس گھر پہنچا، سندر داس نے جب بلدیو کو دیکھا تو اسے بہت سی پرانی باتیں بھی یاد آ گئیں۔ بلدیو کو وہ شروع ہی سے اپنا رقیب سمجھتا تھا۔ اتنے سالوں کے بعد اسے اپنے مقابلے میں کھڑا دیکھ کر اسے غصہ بھی آیا اور بلدیو کے زندہ ہونے پر حیرت بھی ہوئی، لیکن وہ اپنے غصّے کو ضبط کر گیا، اور اس نے بلدیو کو مشورہ دیا کہ وہ چاہے تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے، لیکن بلدیو نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا ضروری نہ سمجھا اور کہا:

''سرسوتی میری بیوی ہے اور وہ میری محبت کو کبھی نہیں بھول سکتی اسے دوبارہ حاصل کرنے کے لیے آپ لوگ عدالت کا راستہ دکھا رہے ہیں مجھے عدالت کا راستہ معلوم ہے عدالت بھی انصاف کرے گی لیکن کب؟ کتنے سال بعد؟ کون جانے میں اب ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہتا ہوں اسی وقت اسی جگہ! مجھے اس کے انصاف پر پورا بھروسا ہے۔'' ☆۳۰۶

یہ کہتے ہوئے سندر داس نے کمرے میں بیٹھی ہوئی سرسوتی سے پوچھا:

''جواب دو سرسوتی! میں کسی اور سے نہیں پوچھتا! صرف تم سے پوچھتا ہوں۔'' ☆۳۰۷

یوں بلدیو کو سرسوتی کی عدالت سے انصاف مل گیا۔ سرسوتی کے آنسوؤں اور دل دوز چیخوں نے یہ ثابت کر دیا کہ اس کے دل میں اب بھی بلدیو کو محبت موجود ہے۔ حالات نے سرسوتی اور بلدیو کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا تھا۔ کہنے کو وہ اب سندر داس کی بیوی تھی، لیکن سندر داس کے ساتھ زندگی گزارنا ایک سمجھوتا تھا۔

یوں بلدیو نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی کو قربان کر کے خود کو انسانیت کی بلندی تک پہنچا دیا۔ کیوں کہ وہ اس حقیقت کو سمجھتا تھا کہ کسی کے ساتھ محبت سے رہنے اور محض سمجھوتا کرنے میں بہت فرق ہے۔ بلدیو کے لیے یہی کافی تھا کہ سرسوتی اب بھی اس سے محبت کرتی ہے لہٰذا اسے عدالت کا سہارا لینے کی ضرورت نہ رہی۔

رام لعل نے اس افسانے سے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ تقسیمِ ہند کے نتیجے میں قتل و غارت گری اور لوٹ مار کے واقعات کو تو سب نے دیکھ لیا لیکن فسادات کے دوران بہت سی خواتین اور مرد ایسے کرب سے گزرے جسے صرف وہی لوگ سمجھ سکے۔ جن پر یہ قیامتیں گزریں بعض لوگ ایک دوسرے سے بچھڑنے کے بعد مل تو گئے لیکن وہ ان کے ساتھ اپنا پرانا رشتہ قائم نہ رکھ سکے۔

(۴) نفسیاتی اثرات

۱۹۴۷ء کے فسادات اور ہجرت کے دوران قتل و غارت گری، لوٹ مار اور خواتین کی بے حرمتی کے ایسے دردناک واقعات پیش آئے۔ جس کے معاشرے نے ہر فرد پر گہرے نفسیاتی اثرات چھوڑے۔

جن لوگوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے عزیزوں کو قتل ہوتے دیکھا، خواتین کو اغوا یا بے آبرو ہوتے دیکھا۔ ان کی نظروں سے یہ تکلیف دہ مناظر کبھی اوجھل نہ ہو سکے۔

جو لوگ فسادات سے بچ گئے تھے۔ وہ نئے ملک میں آ کر یادوں کے حصار سے آزاد نہ ہو سکے۔ وطن اور بچھڑنے والوں کے غم میں وہ آزادی کی خوشی نہ منا سکے اور ایک طویل عرصہ گزرنے کے بعد بھی نئے ملک سے اجنبیت کا احساس نہ گیا۔

یوں تو ہر حادثہ کسی نہ کسی نفسیاتی مسئلے کا سبب بنا، لیکن خواتین کی بے حرمتی کے واقعات نے ان کی شخصیت اور سماجی حیثیت بہت بری طرح متاثر ہوئی۔

بے قصور ہوتے ہوئے بھی شرمندگی کے احساس نے انھیں سر اٹھا کر جینے کا حوصلہ نہ دیا۔

خواتین کے علاوہ بعض مرد بھی ایسے تھے۔ جنھوں نے مشتعل ہو کر گناہ تو کر لیے لیکن ضمیر کی عدالت میں وہ ہار گئے اور گناہ کے احساس نے انھیں پھر سے زندگی کی خوشیوں سے لطف اندوز نہ ہونے دیا۔

جب ہم فسادات کے موضوع پر لکھے جانے والے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس سلسلے میں سب سے پہلے سعادت حسن منٹو کا نام ذہن میں آتا ہے۔ ''کھول دو''، ''ڈارلنگ''، ''ٹھنڈا گوشت''، ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اور ''شریفن'' منٹو کے ایسے افسانے ہیں جس میں انھوں نے کرداروں کے ذریعے بہت سی نفسیاتی الجھنیں اور المیے بیان کیے ہیں۔

اسی طرح راجندر سنگھ بیدی نے ''لاجونتی'' میں اور حیات اللّٰہ انصاری نے ''شکر گزار آنکھیں'' میں نہ صرف خواتین، بلکہ مرد بھی نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہوئے ہیں۔

شکر گزار آنکھیں

حیات اللّٰہ انصاری کا یہ افسانہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے نفسیاتی اثرات کے حوالے سے لکھا گیا ہے اس افسانے کے

تین حصّے ہیں جنھیں اساطیری انداز میں لکھا گیا ہے پہلے حصّے کا عنوان ''شکر گزار آنکھیں''، دوسرے کا ''وہ'' اور تیسرے کا عنوان ''عکس'' ہے۔

افسانے کے پہلے حصّے میں حیات اللّٰہ انصاری نے ایک ایسے ہندو کا ذکر کیا ہے جس کا پورا خاندان اور گھر بار لٹ چکا ہے۔ اس ہندو کو رہ رہ کر اپنے ماں باپ اور بہن بھائی یاد آ رہے ہیں جنھیں مسلمانوں نے اس ہندو کے سامنے وحشیانہ طریقے سے مارا ہے۔ اس ہندو کی نفسیاتی کیفیت کو افسانے میں اس طرح بیان کیا ہے:

> گذشتہ منگل یعنی میرے نوجیون سے پہلے تمام ہول ناک مناظر سینکڑوں بار میرے دل میں آ کر گھوم جاتے تھے۔ جاتے وقت مجھے کھولتے کڑھاو میں جھونک دیتے تھے جس میں جلتے جلتے جھلسے جھلسے میں مجسم شعلہ بن جاتا تھا اور پھر ایٹم بم بن کر اسلامی دنیا پر گرتا تھا اسے بھسم کر ڈالتا تھا اور خود بھی بھسم ہو جاتا تھا۔☆۳۰۸

یہی ہندو یادوں کے حصار سے آزاد ہونے کے لیے ایک کیمپ خانے سے نکل کر بھاگنا شروع کر دیتا ہے بھاگتے بھاگتے وہ ایک ویرانے میں پہنچ جاتا ہے جہاں اس کی ملاقات ایک بدحال بڈھے سے ہوتی ہے جسے دیکھ کر ہندو کو اس سے نفرت محسوس ہوتی ہے اور اس پر شبہ ہوتا ہے کہ وہ شخص مسلمان ہے۔ حالاں کہ وہ شخص ہندو تھا، لیکن جب اس بڈھے کے کہنے کے باوجود ہندو کو یقین نہ آیا تو اسے ایک قصہ سنانا پڑا۔

اس بدحال بڈھے نے قصہ سننے والے کو بتایا کہ اس کا تعلق ان لوگوں سے ہے جنھوں نے ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران قتل و غارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا۔

حیات اللّٰہ انصاری کے افسانے کا دوسرا حصّہ ''وہ'' ہے جس میں قصہ بیان کرنے والے نے اعتراف کیا ہے کہ ہندوؤں نے فسادات کے دوران مسلمانوں کو ہر طرح کی اذیّت پہنچائی۔ اس کے علاوہ افسانے کے اس حصّے میں مسلمان مہاجرین کے کیمپوں کی حالت زار کو بھی بیان کیا ہے:

> قافلے کے ساز و سامان کی یہ حالت تھی کہ اگر کسی کے ایک پاؤں میں جوتی ہوتی ہے تو دوسرے میں ندارد۔ ایک جوان عورت کے کپڑے اس طرح تار تار تھے کہ ستر پوشی ناممکن تھی۔ ایک مرد کو کہیں سے شکستہ لہنگا مل گیا تھا جس کو اس نے جسم پر لپیٹ کر تہمد بنا لیا تھا، لیکن کسی کو ان باتوں کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہ تھی اور سکت بھی نہ تھی۔☆۳۰۹

فسادات کے دوران جن ہندوؤں نے مسلمانوں کو قتل کیا تھا، ان بلوائیوں میں قصہ بیان کرنے والا ہندو بھی شامل تھا۔ جس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر مختلف جگہوں میں لوگوں کو جانی، مالی اور روحانی نقصان پہنچایا تھا۔ ان ہی بلوائیوں

نے مل کر ایک ریل گاڑی پر بھی حملہ کیا تھا جس میں موجود لوگ پہلے سے موت اور زندگی کی کش مکش میں مبتلا تھے۔ بلوائیوں کو دیکھ کر کئی مسافر سیٹوں کے نیچے چھپ گئے لیکن پھر بھی ہندو بلوائیوں کے شر سے کوئی نہ بچ سکا۔ گاڑی سے چھلانگ لگانے کو بھی نیچے اترتے ہی ہندو درندوں نے انھیں پکڑ لیا۔

> ایک عورت بھاگنے کے لیے کھڑکی سے کودی۔ نیچے جو سورما کھڑے تھے انھوں نے فوراً اسے پکڑ لیا اور جس طرح کوئی کیلا چھیلتا ہے، اس طرح آناً فاناً سورماؤں کے تجربہ کار ہاتھوں نے اسے مادر زاد ننگا کر دیا اور پھر وہ مشتاق ٹائپسٹ کی طرح اپنی ہوس کی جلن ٹھنڈی کرنے لگے۔ ایک طرف برہنہ عورتیں اکٹھا کی جا رہی تھی تاکہ ان کا جلوس نکالا جائے پھر انھیں شرم ناک سے شرم ناک موت سے ہم آغوش کیا جائے۔☆۳۱۰

ریل گاڑی میں عجیب نفسا نفسی کا ماحول تھا۔ ہر ایک کو اپنی اپنی فکر تھی، لیکن اسی ریل گاڑی میں ایک ایسی نو بیاہتا دلہن بھی موجود تھی جو جذبۂ محبت اور حیا کے زیور سے مالا مال تھی اسے اپنے آپ سے زیادہ اپنے زخمی شوہر کی فکر تھی جب بلوائیوں نے ان کے گھر حملہ کیا تھا تو وہ سب گھر والوں کو خدا کے سپرد کر کے زخمی دولھا کو اپنے کندھوں پر لاد کر بھاگ آئی تھی، اور اب اپنے دوپٹے کے کونے کو پھاڑ کر اس کے زخموں کی پٹی کر رہی تھی۔ ان حالات میں وہ اس کی یہی طبی مدد کر سکتی تھی۔

بلوائیوں کی نظر جب اس دلہن پر پڑی تو وہ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے دلہن بھی ان کے شیطانی خیالات کو سمجھ گئی اور اسے اندازہ ہو گیا کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے، لہٰذا اس نے ان کے پاس جا کر التجا کی:

> ''مہاشے جی، میری ایک بنتی ہے۔''
>
> ''بنتی! ہونہہ! ہم تم کو چھوڑا ہے کی کتیا بنا کر چھوڑیں گے۔ آخر ہم اپنی ماؤں بہنوں کا انتقام کس سے لیں؟'' ☆۳۱۱

دلہن اپنے دولھا کے سامنے بے عزت ہونے سے پہلے مرجانا چاہتی ہے اس نے ہندو بلوائیوں کو خدا اور ایشور کا واسطہ دیا اور اپنی التجا سنائی۔ بلوائیوں کو آخر اس پر ترس آ گیا۔ انھوں نے اسے دولھا کے پاس لے جا کر خنجر سے قتل کر دیا۔

> اس کی بجھتی ہوئی آنکھ کی آخری بھڑک اس کی آنکھوں میں سیتا کا پریم بن کر آ گئی اور اس نے ان آنکھوں سے شوہر کو نظر بھر کر دیکھا... پھر گھوم کر اس نے قاتل کی طرف دیکھا۔
>
> جب اس نے قاتل کی طرف دیکھا تو اس کی پریم کی لیک سچی شکر گزار کی مہک میں تبدیل ہو چکی تھی... کتنی شکر گزار تھیں وہ آنکھیں! افوہ! وہ کہہ رہی تھیں۔
>
> ''مہا داتا تم نے مجھ بے یار و مددگار عورت پر جو احسان کیا ہے اس کے لیے میرا رداں رواں

شکرگزار ہے پر افسوس زبان سے شکریہ تک نہیں کہہ سکتی ہوں۔مگر یقین کرو اسی کی پیاری ہوکر مر رہی ہوں الوداع۔'' ☆۳۱۲

دلہن کی موت کے ساتھ ہی افسانے کا دوسرا حصّہ ختم ہو جاتا ہے۔

افسانے کا تیسرا حصّہ ''عکس'' میں حیات اللہ انصاری نے قصّہ بیان کرنے والے (ہندو بلوائی) پر قتل و غارت گری کے نفسیاتی اثرات کو بیان کیا ہے۔

دلہن کو قتل کرنے والا ہندو بلوائی ۱۹۴۷ء کے فسادات سے پہلے بھی کئی لوگوں کو قتل کر چکا تھا، لیکن اس کا اپنے آپ سے وعدہ تھا کہ وہ اپنے خنجر کو کبھی بھی کسی کم زور پر استعمال نہیں کرے گا۔

دلہن کو قتل کرنے کے بعد اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس نے اپنے خنجر کو ایک کم زور عورت پر استعمال کر کے اپنے آپ سے کیا ہوا وعدہ توڑ دیا ہے۔اس کے ضمیر نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور اسے ہر جگہ دلہن کی آنکھیں نظر آنے لگیں جو اس کا شکریہ ادا کر رہی تھیں لیکن ان آنکھوں میں شکریے کے پیغام کے ساتھ گہرا طنز بھی تھا جو اسے بار بار اس کے گناہوں کا احساس دلا رہی تھیں۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ضمیر کی ملامت بڑھتی گئی اور قاتل پر دلہن کی شکرگزار آنکھوں کا قبضہ ہو گیا۔ان آنکھوں میں تشکر کے جذبات کے علاوہ اب کئی اور جذبات اور تاثرات بھی تھے۔

وہ آنکھیں چکھنے میں مٹھائی کی ڈلیاں تھیں پر خار جیت میں رائفل کی گولیاں چھونے میں برف کی کنکریاں تھیں پر حلق میں اتارنے پر زہر میں بجھی ہوئی انیاں۔☆۳۱۳

قصّہ بیان کرنے والے ہندو بلوائی نے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لیے خود کو اذیّت دینا شروع کر دی اور جب بھی وہ بہت بے چین ہوتا تو اپنے جسم میں دو سوراخ کر لیتا اور پھر تصوّر میں ان شکرگزار آنکھوں کو ان میں جڑ دیتا۔جس سے اسے کچھ دیر کے لیے سکون نصیب ہو جاتا لیکن یہ سکون زیادہ دیر تک قائم نہ رہتا، بلکہ تھوڑی ہی دیر کے بعد گناہ کا احساس پھر شدّت اختیار کر جاتا اور وہ دوبارہ اپنے جسم میں سوراخ کر کے اس میں دلہن کی شکرگزار آنکھیں جڑ دیتا ہے، اور اپنے سکون میں اضافہ کرنے کے لیے قصّہ سنانے والا اپنے پرانے رستے ہوئے زخموں کو مسلنا شروع کر دیتا۔

وہ شخص ایک رستے ہوئے زخم کو چٹکی سے مسل مسل کر کہنے لگا ''یہ پیاری شکرگزار آنکھیں۔''
مسلنے سے زخم اس طرح بہنے لگا جیسے کسی سل کے مریض کا اگال دان الٹ ہو گیا ہو، مگر اس کی آنکھوں یں قابلِ رشک سکون آ گیا۔☆۳۱۴

حیات اللہ انصاری کے اس خوب صورت افسانے کا موضوع وہی ہے جو منٹو کے افسانے ''شریفن'' کا ہے اس میں حیات اللہ انصاری نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران بعض لوگوں نے انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنے کے

لیے جو جرائم کیے ان کے نفسیاتی اثرات اتنے گہرے اور شدید تھے کہ ان کی حالت ظلم سہنے والوں سے بھی بدتر اور عبرت ناک ہو گئی۔ اس بات کو حیات اللّٰہ انصاری نے افسانے کے آخر میں اس طرح بیان کیا ہے:

''بہادر مظلوم لاکھ خوش نصیب ہوتا ہے، بزدل ظالم سے۔''

کھول دو

سعادت حسن منٹو نے فسادات کے موضوع پر کئی افسانے لکھے، لیکن فسادات کے موضوع پر لکھا جانے والا ان کا افسانہ ''کھول دو'' کئی لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے۔ مثلاً ان کے اس افسانے کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی، منٹو کو یہ افسانہ لکھنے کی وجہ سے فحش افسانہ نگار قرار دیا گیا، احمد ندیم قاسمی نے جب ''نقوش'' میں یہ افسانہ شائع کیا تو ان کے رسالے پر بھی چھ ماہ کے لیے پابندی لگائی گئی۔ جیسا کہ احمد ندیم قاسمی نے اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے کہا:

> میں افسانہ پڑھ کر سناٹے میں آ گیا۔ اگر منٹو کے بجائے کوئی اور میرے پاس ہوتا تو میں بآوازِ بلند رونے لگتا۔ میں نے وہ افسانہ جیب میں ڈالا اور یہ سوچتا ہوا واپس آ گیا۔ اگر اس افسانے کو بھی عریاں افسانہ کہنے والے موجود ہیں تو پھر ہم سب افسانہ نگاروں کو افسانہ نگاری ترک کر کے کوئی اور مفید کام کرنا چاہیے — میں نے یہ افسانہ ''نقوش'' میں شائع کیا۔ پرچوں کو اسٹالوں پر آئے ہوئے چند دن ہی گزرے تھے کہ اس افسانے کی پاداش میں ''نقوش'' سیفٹی ایکٹ کے تحت چھ مہینے کے لیے بند کر دیا گیا۔ مگر یقین کیجیے کہ اُردو کے اس بے حد موٴثر اور بے حد مکمل افسانے کو شائع کرنے کی بے پناہ مسرت اپنے نئے رسالے کے چھ مہینے کے لیے بند ہو جانے کے دکھ پر بھاری تھی۔☆۳۱۵

ترقی پسند افسانہ نگار جنھوں نے منٹو کو فحش افسانہ نگار قرار دے کر ترقی پسندوں کے گروہ سے نکال دیا تھا، لیکن ان تمام مخالفتوں کے باوجود علی سردار جعفری ان کے اس افسانے کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے:

> تمھاری کہانی ''کھول دو'' کو میں اس دور کا شاہ کار مانتا ہوں۔☆۳۱۶

''کھول دو'' منٹو کا بہترین افسانہ ہے۔ اپنے اس مختصر اور منفرد افسانے میں منٹو نے فسادات کے دوران خواتین پر گزرنے والی قیامت کو افسانے کے کردار کے ذریعے بالکل واضح کر دیا ہے۔ اس مختصر سے افسانے میں منٹو نے وہ سارے تلخ حقائق بیان کر دیے جسے بیان کرنے کے لیے کئی صفحات درکار تھے۔

۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران سکینہ کی ماں کو ہندو بلوائی قتل کر دیتے ہیں۔ سکینہ کو ہندو بلوائی ہجرت کے دوران اغوا

کر لیتے ہیں جب کہ سکینہ کا باپ اس کے اغوا ہونے سے پہلے ہندو بلوائیوں کو دیکھ کر ہی بے ہوش ہو جاتا ہے۔ جب اسے ہوش آتا ہے تو وہ پاکستان میں مہاجرین کے کیمپ میں ہوتا اور اس کی حالت دیوانوں جیسی ہو چکی تھی جب اس کے حواس ذرا درست ہوتے ہیں تو اسے اپنی بیٹی سکینہ کا خیال آتا ہے۔ دماغ پر زور دینے سے اسے یاد آتا ہے کہ اس کی بیٹی ہجرت کے دوران اس سے بچھڑ گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اسے اپنی بیٹی کے بارے میں بہت سے پریشان کن خیالات آتے ہیں جو اس کی پریشانی میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ پریشانی کی میں وہ اپنی بیٹی کو اِدھر اُدھر ڈھونڈنا شروع کر دیتا ہے لیکن جب وہ سکینہ کو ڈھونڈنے میں ناکام ہو جاتا ہے تو مسلمان رضا کاروں کے پاس جا کر اپنا مسئلہ بیان کیا اور مدد طلب کی۔ اِن رضا کاروں نے سکینہ کے باپ سراج کو تسلی دی اور انھیں یقین دلایا کہ وہ بہت جلد سکینہ کو ڈھونڈ لائیں گے۔ سراج الدین نے اپنی بیٹی کا جو حلیہ بتایا تھا اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے رضا کار سکینہ کو دس دن کی کوشش کے بعد امرت سر سے تلاش کرنے میں کام یاب ہو گئے۔

آٹھ رضا کار نوجوانوں نے ہر طرح سکینہ کی دل جوئی کی۔ اسے کھانا کھلایا، دودھ پلایا اور لاری میں بٹھا دیا۔ ایک نے اپنا کوٹ اتار کر اسے دے دیا۔ ☆ ۳۱۷

خوب صورت تنہا اور بے بس سکینہ کو دیکھ کر ان رضا کاروں کی نیّت بدل گئی اور انھوں نے سکینہ کے ساتھ وہی سلوک کیا جو ہندو اور سکھ بلوائی مسلمان خواتین کے ساتھ کر رہے تھے۔ برائی کے نشے میں وہ اپنا فرض اور سراج الدین کے ساتھ کیا ہوا وعدہ بھول گئے۔ غرض یہ کہ جذبہ خیر کی جگہ جذبۂ شر نے لے لی۔

ان سب حالات سے بے خبر سکینہ باپ رضا کاروں کی کام یابی اور سکینہ کی بازیابی کے لیے دن رات دعائیں مانگنے میں غرق رہتا تھا۔

ایک روز سراج الدین نے کیمپ میں ان نوجوان رضا کاروں کو دیکھا...سراج الدین بھاگا بھاگا ان کے پاس گیا...اس نے پوچھا...''بیٹا، میری سکینہ کا پتا چلا؟''
سب نے ایک زبان ہو کر کہا ''چل جائے گا چل جائے گا'' اور لاری چل دی۔ ☆ ۳۱۸

یہ مسلمان رضا کار انسانیت اور شرافت کی تمام حدود پار کر چکے تھے۔ اب انھیں انسانیت کی خدمت سے زیادہ اپنی جنسی تسکین کی فکر تھی۔ دوسروں کی عزتِ نفس کی انھیں کوئی پروانہ تھی اور سکینہ جس کرب اور خوف سے دوچار تھی اسے سمجھنے کی انھوں نے ضرورت محسوس نہ کی اور جب مسلسل اذیّت سہنے کے بعد سکینہ بے ہوش ہو گئی تو ان وحشی رضا کاروں نے اسے مردہ جان کر ریلوے لائن کے پاس پھینک دیا۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے سراج الدین کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ ایک دن کیمپ کے لوگوں کو ریلوے لائن کے قریب ایک بے ہوش لڑکی ملی جسے وہ اُٹھا کر اسپتال لے جاتے ہیں۔ سراج الدین بھی ان کے ساتھ ہی اسپتال پہنچ جاتا ہے

اور تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کمرے میں داخل ہو جاتا ہے جہاں اس لڑکی کی لاش پڑی تھی۔

سراج الدین چھوٹے قدم اٹھاتا اس کی طرف بڑھا۔ کمرے میں دفعتاً روشنی ہوئی۔ سراج الدین نے لاش کے زرد چہرے پر چمکتا ہوا تل دیکھا اور چلایا۔ ''سکینہ!''

ڈاکٹر نے جس نے کمرے میں روشنی کی تھی سراج الدین سے پوچھا ''کیا ہے؟''

سراج الدین کے حلق سے صرف اس قدر نکل سکا۔ ''جی میں ...جی میں اس کا باپ ہوں!''

ڈاکٹر نے اسٹریچر پر پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھا۔ اس کی نبض ٹٹولی اور سراج الدین سے کہا۔

''کھڑکی کھول دو۔''

سکینہ کے مردہ جسم میں جنبش پیدا ہوئی۔ بے جان ہاتھوں سے اس نے ازار بند کھولا اور شلوار نیچے سرکا دی۔ بوڑھا سراج الدین خوشی سے چلّایا۔ ''زندہ ہے۔'' میری بیٹی زندہ ہے۔'' ڈاکٹر سر سے پیر تک پسینے میں غرق ہو گیا۔☆۳۱۹

یہ اس افسانے کا وہ حصہ ہے جس کی وجہ سے یہ افسانہ بدنام ہوا حالانکہ اس افسانے میں منٹو نے فحاشی نہیں، بلکہ ۱۹۴۷ء کے تلخ حقائق کو بیان کیا ہے، اور تلخ حقائق کے نتیجے میں سکینہ اور سراج الدین نے جو کیا اور قاری کو حیران بھی کر دیتا ہے اور دکھی بھی۔

بقول ممتاز شیریں:

...فن کار منٹو نے اس المیے کو ایک سطر میں نچوڑ دیا ہے۔☆۳۲۰

سکینہ کو دشمنوں سے بچانے والے خود اس کے دشمن بن گئے۔ مسلم رضا کاروں نے انسانیت، شرافت، قوم، مذہب کسی کا بھی پاس نہ رکھا، اور سکینہ کو مسلسل جنسی تشدد دینے کے بعد اس حالت تک پہنچا دیا کہ اس کا ذہن ''کھول دو'' کا صرف ایک معنی اخذ کر سکا۔

بقول ممتاز شیریں:

اس کی سہمی ہوئی حس کو ایک ہی بات کا احساس ہو سکتا ہے اس کے سہمے ہوئے بے جان ہاتھ، ایک ہی حرکت کے لیے اٹھ سکتے ہیں۔ اس نیم مردہ لڑکی سے ''کھول دو'' کے لفظ پر جو غیر شعوری حرکت سرزد ہوتی ہے۔ اس سے روح کی انتہائی دہشت زدگی کا اظہار ہوتا ہے۔☆۳۲۱

سکینہ کے اغوا ہو جانے کے بعد سراج الدین اس کی بازیابی کے سلسلے میں یقین اور غیر یقینی کی کیفیت سے دوچار ہو گیا تھا۔ اسی لیے وہ سکینہ کے ''کھول دو'' کے ردِعمل کی پروا نہیں کرتا۔ وہ اسی بات پر خوش ہو جاتا ہے کہ وہ زندہ ہے۔ اسے سکینہ کی

زندگی عزیز ہے؛ ورنہ عام حالات میں شاید ہی کوئی ایسا باپ ہوگا جو اپنی بیٹی کی ایسی حرکت پر خوش ہو، بلکہ ایسی صورت میں باپ کی غیرت اسے بیٹی کو مارنے کے بعد خود بھی مر جانے پر مجبور کر دیتی ہے۔

اپنے اس مختصر سے افسانے میں منٹو نے ایک باپ اور اس کی بیٹی پر فسادات کے نفسیاتی ردِ عمل کو بیان کیا ہے۔

اس افسانے میں منٹو کا ٹریٹ منٹ بڑا فن کارانہ ہے۔ پھر انسان کے اندر چھپے شیطان کو بھی اس نے پوری مہارت سے بے نقاب کیا ہے۔ فسادات کے دوران تمام ہی رضا کار فرشتے نہ تھے اور لوگوں پر قیامتیں ان کے ہاتھوں بھی ڈھائی گئیں۔ کھول دو کے الفاظ طلسمی الفاظ بنا دیے گئے ہیں کھل جا سم سم کی طرح اور یہی افسانے کا نقطۂ عروج بھی ہے اور اس کا حسن بھی۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ حکومت سمیت وہ تمام ناقدین جنھوں نے اس افسانے کو فحش قرار دیا ہے انھوں نے تصویر کا صرف ایک رخ دیکھا ہے کاش وہ یہ بھی سوچ لیتے کہ یہ افسانہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران خواتین کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو ذہن میں رکھ کر لکھا گیا ہے۔ ان ناقدین کا دھیان صرف سکینہ کے عمل پر گیا ہے، لیکن اس کرب اور اذیت کو تو انھوں نے سمجھنے کی کوشش نہ کی۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ

''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' منٹو کا فسادات کے موضوع پر لکھا جانے والا افسانہ ہے۔ منٹو یہ افسانہ لکھ کر یہ بات ثابت کر دی ہے کہ وہ جنس کے علاوہ دوسرے موضوعات پر بھی بہت اچھا لکھ سکتے ہیں۔

یوں تو منٹو کے بیش تر افسانے نفسیاتی ہوتے ہیں، لیکن یہ افسانہ اپنی مثال آپ ہے۔ منٹو نے اس افسانے میں تقسیمِ ہند پر پاگلوں کے مختلف خیالات اور کیفیات کو بیان کیا ہے۔ پاگلوں کا طبقہ ہمارے معاشرے کا وہ بدنصیب طبقہ ہے جسے عام طور پر لوگ پاگل کے علاوہ کچھ اور نہیں سمجھتے انھیں بری طرح نظر انداز کیا جاتا ہے، ان پر ہنسا جاتا ہے یا پھر بچے انھیں پتھروں سے مارنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کی آرا اور خیالات کو اہمیت دینا تو بہت دور کی بات ہے ان کے خیالات و احساسات کو کوئی سننا بھی گوارا نہیں کرتا۔ غرض یہ کہ پاگل لوگوں کی تفریح و تماشا کے سوا کچھ اور نہیں ہوتے۔

یہ افسانہ منٹو کی عظمت اور انسان دوستی کی بہترین مثال ہے۔ جس میں انھوں نے پاگلوں کی الجھنوں ان کی حرکات و سکنات اور لب و لہجے کو اتنے گہرے مشاہدے کے بعد پیش کیا ہے کہ افسانہ پڑھتے وقت یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم ان پاگلوں کے درمیان بیٹھے ہیں۔

اس افسانے کا مرکزی کردار بشن سنگھ ہے عرف عام میں اس کے ساتھی اسے ٹوبہ ٹیک سنگھ ہی کے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ سکھ ٹوبہ ٹیک سنگھ کا رہنا والا ہے۔ افسانے میں اس کے علاوہ اور بھی کئی پاگلوں کے کردار موجود ہیں جو قیامِ پاکستان کے

بارے میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔

تقسیمِ ہند کے تقریباً تین سال کے بعد ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ عام لوگوں کی آبادی کے تبادلے کے بعد اب پاگلوں کی آبادی کا بھی تبادلہ ہونا چاہیے۔ انھیں بھی ان کے اصل ملک میں بھیج دینا چاہیے جہاں ان کے عزیز و اقارب ہجرت کر کے جا چکے ہیں۔

یہ پاگل تقسیمِ ہند کے سیاسی پس منظر اور ہجرت کے دوران ہونے والے فسادات سے تو ناواقف تھے، لیکن یہ جانتے تھے کہ ہندوستان اب دو ممالک میں تقسیم ہو چکا ہے۔ پاکستان مسلمانوں کے لیے اور ہندوستان ہندوؤں کے لیے ہے۔

اس لیے جب پاگلوں کے تبادلے کی خبر ان تک پہنچی تو پاگل خانے میں عجیب ہلچل مچ گئی۔ سب اسی تذبذب میں مبتلا ہو گئے کہ وہ اس وقت ہندوستان میں ہیں یا پاکستان میں اور آئندہ دنوں میں وہ کہاں ہوں گے۔ سارے پاگل اپنی اپنی سمجھ اور اندازے سے مختلف نتائج اخذ کر رہے تھے۔

> چنیوٹ کے ایک موٹے مسلمان پاگل نے، جو مسلم لیگ کا سرگرم کارکن رہ چکا تھا اور دن میں پندرہ سولہ مرتبہ نہایا کرتا تھا، یک لخت یہ عادت ترک کر دی۔ اس کا نام محمد علی تھا، چناں چہ اس نے ایک دن اپنے جنگلے میں اعلان کر دیا کہ وہ قائدِ اعظم محمد علی جناح ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی ایک سکھ پاگل ماسٹر تارا سنگھ بن گیا قریب تھا کہ اس جنگلے میں خون خرابہ ہو جائے مگر دونوں کو خطرناک پاگل قرار دے کر علیحدہ علیحدہ بند کر دیا گیا۔ ☆ ۳۲۲

اس بات سے پاگل اچھی طرح واقف تھے کہ تبادلۂ آبادی کے بعد وہ جس ملک میں جائیں گے وہ ان کا اپنا ملک ہوگا، لیکن پھر بھی انھیں اپنے ملک میں جاتے ہوئے جھجھک محسوس ہو رہی تھی اور وہ یہ سوچ کر پریشان ہو رہے تھے کہ وہ نئے ملک اور نئے ماحول میں جہاں ہر چیز ان کے لیے غیر مانوس ہوگی کیسے رہیں گے۔

> ایک سکھ پاگل نے ایک دوسرے سکھ پاگل سے پوچھا، ”سردار جی ہمیں ہندوستان کیوں بھیجا جا رہا ہے — ہمیں تو وہاں کی بولی نہیں آتی۔“ دوسرا مسکرایا۔ ”مجھے تو ہندوستوڑوں کی بولی آتی ہے — ہندوستانی بڑے شیطانی آکڑ آکڑ پھرتے ہیں۔“ ☆ ۳۲۳

لاہور کے پاگل خانے میں ایک مسلمان پاگل، جو بارہ سال سے ”زمیندار“ اخبار پڑھ رہا تھا، ایک دن اس کے مسلمان دوست نے پوچھا:

> ”مولبی ساب، یہ پاکستان کیا ہوتا ہے؟“
>
> تو اُس نے بڑے غور و فکر کے بعد جواب دیا، ”ہندوستان میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں استرے

بنتے ہیں۔''

یہ جواب سن کر اس کا دوست مطمئن ہوگیا۔ ☆ ۳۲۴

پاگل ہونے کے باوجود انھیں اتنا ہوش تھا کہ ان کا تعلق کس مذہب سے ہے اس لیے انھیں اب کس ملک میں رہنا ہوگا اور بعض پاگل ایسے بھی تھے جو پاکستان بننے کی خوشی میں نعرے بھی لگا رہے تھے۔

ایک دن نہاتے نہاتے ایک مسلمان پاگل نے ''پاکستان زندہ باد'' کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ فرش پر پھسل کر گرا اور بے ہوش ہوگیا۔'' ☆ ۳۲۵

منٹو نے اپنے افسانے میں لاہور کے پاگل خانے کا ذکر کیا ہے۔ اس لیے یہاں سے ہجرت کر کے جانے والے ہندو اور سکھ تھے، لیکن ان پاگلوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ اس وقت ہندوستان میں ہیں یا پاکستان میں۔ ہجرت کرنے کا ان پاگلوں کو بھی اتنا ہی دکھ تھا جتنا ہوش مند اور عقل مندوں کو تھا۔ انھیں اپنے صدیوں پرانے ملک اور ساتھیوں کو چھوڑنا بہت دشوار لگ رہا تھا اور بہت سے پاگل تو یہیں (پاکستان میں) رہنا چاہتے تھے۔

اسی طرح مسلمان پاگلوں کو بھی اپنے ہندو اور سکھ ساتھیوں کو چھوڑنے کا دکھ تھا۔

ایک پاگل تو ہندوستان اور پاکستان اور ہندوستان، اور ہندوستان اور پاکستان کے چکر میں کچھ ایسا گرفتار ہوا کہ اور زیادہ پاگل ہوگیا... ایک دن درخت پر چڑھ گیا اور ٹہنے پر بیٹھ کر دو گھنٹے مسلسل تقریر کرتا رہا جو پاکستان اور ہندوستان کے نازک مسئلے پر تھی۔ سپاہیوں نے اسے نیچے اترنے کو کہا تو... اس نے کہا میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں، نہ پاکستان میں، میں اس درخت ہی پر رہوں گا... جب اس کا دورہ سرد پڑا تو وہ نیچے اترا اور اپنے ہندو سکھ دوستوں سے گلے مل مل کر رونے لگا۔ اس خیال میں اس کا دل بھر آیا تھا کہ وہ اُسے چھوڑ کر ہندوستان چلے جائیں گے۔ ☆ ۳۲۶

ایک ہندوستانی پاگل جس کا تعلق وکالت سے ہے اس کی محبوبہ جو اسے ٹھکرا چکی تھی لیکن پاگل کے دل میں اب بھی اس کی محبت باقی تھی۔ تقسیمِ ہند کے بعد وہ امرت سر چلی گئی تھی جس کا پاگل کو بہت دکھ تھا:

وہ ان تمام ہندو اور مسلم لیڈروں کو گالیاں دیتا تھا جنھوں نے مل ملا کر ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دیے تھے اس کی محبوبہ ہندوستانی بن گئی اور وہ پاکستانی۔ ☆ ۳۲۷

افسانے کے سب سے اہم کردار بشن سنگھ کا تعلق ٹوبہ ٹیک سنگھ کے ایک زمیں دار گھرانے سے ہے جسے پندرہ سال قبل اس کے رشتے دار پاگل خانے میں چھوڑ گئے تھے اور اس وقت سے بشن سنگھ کھڑا تھا، وہ نہ سوتا تھا، نہ بیٹھتا تھا اور نہ لیٹتا تھا کبھی

کبھار کھڑے کھڑے ہی دیوار سے ٹیک لگالیتا۔ جس سے اس کے پیر اور پنڈلیاں سوج گئی تھیں، لیکن پھر بھی وہ کھڑا رہتا تھا، اور ہر وقت ایک بے ربط سا جملہ دہراتا رہتا تھا: ''اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی دھیانا دی منگ دی دال آف دی لالٹین۔''

بشن سنگھ اگر چہ پاگل تھا لیکن پھر بھی بعض باتیں سمجھتا تھا، لیکن بعض باتوں کو وہ بالکل بھول چکا تھا۔ مثلاً اسے یہ معلوم تھا کہ اس کا تعلق ٹوبہ ٹیک سنگھ سے ہے، لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اسے پاگل خانے میں کب آیا تھا دن تاریخ اور مہینوں سے بھی وہ ناواقف تھا۔ اپنی بیٹی کو وہ نہیں پہچانتا تھا، لیکن ہر مہینے اس کے رشتے دار اس سے ملنے آتے تھے انھیں وہ پہچانتا تھا اور اس سے وہ یہ بھی اندازہ ہو جاتا تھا کہ ایک مہینا گزر چکا ہے۔

تقسیمِ ہند کے نتیجے میں جب ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان کے حصّے میں آ گیا تو بشن سنگھ کے رشتے داروں کو ہندوستان جانا پڑا۔ اب وہ بشن سنگھ کے پاس نہیں آ سکتے تھے۔ بشن سنگھ ان کے لیے بہت اداس ہوتا تھا اس کا بہت دل چاہتا تھا کہ وہ اس سے ملنے آئیں اور وہ نہادھو کر ان کے لیے تیار رہو۔

پاگل خانے میں ایک ایسا پاگل بھی موجود تھا جو خود کو خدا کہتا تھا۔ بشن سنگھ نے اس پاگل سے بھی یہ بات پوچھی کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے تو وہ خدا بھی بشن سنگھ کو تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔

> جب ایک دن بشن سنگھ نے پوچھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں؟ تو اس نے حسب عادت قہقہہ لگایا اور کہا، ''وہ پاکستان میں ہے نہ ہندوستان میں۔ اس لیے کہ ہم نے ابھی تک حکم نہیں لگایا۔'' ☆ ۳۲۸

بشن سنگھ نے اس فرضی خدا سے کئی مرتبہ منت سماجت بھی کی کہ وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کا فیصلہ جلد کر دیں، لیکن وہ ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ اسے ابھی اور بہت سے حکم جاری کرنے ہیں۔

جب بشن سنگھ نے دیکھا کہ منت سماجت کرنے کے باوجود خدا نے ٹوبہ ٹیک سنگھ کا فیصلہ نہیں کیا تو اسے طیش آ گیا اور اس نے غصّے سے اپنا مخصوص جملہ کہنا شروع کر دیا:

> ''اوپڑ دی، گڑ گڑ دی، اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف واہے گورو جی دا خالصہ اینڈ واہے گورو جی کی فتح ـــ جو بولے سو نہال، ست سری اکال۔''
>
> اس کا مطلب، شاید یہ تھا کہ تم مسلمانوں کے خدا ہو ـــ سکھوں کے خدا ہوتے تو ضرور میری سنتے۔ ☆ ۳۲۹

ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہوگا؟ ہندوستان میں یا پاکستان میں؟ یہ سوال بشن سنگھ کو ہر وقت الجھائے رکھتا۔ ایسے میں اسے اپنے وہ رشتے دار بہت یاد آئے جو تقسیمِ ہند سے قبل اس سے ہر مہینے ملنے آتے تھے۔

اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ لوگ آئیں جو اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے اور اس کے لیے
پھل، مٹھائیاں اور کپڑے لاتے تھے۔ وہ اگر ان سے پوچھتا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے تو وہ یقیناً
اسے بتادیتے کہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔☆۳۳۰

پاگلوں کے تبادلے سے کچھ دن پہلے فضل دین نام کا ایک شخص بشن سنگھ کے پاس آیا اور اسے بتایا کہ وہ اس کا اور اس کے رشتے داروں کا دوست ہے جو اب ٹوبہ ٹیک سنگھ سے ہندوستان جا چکے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ اس کے رشتے داروں کو سلام اور دعائیں بھیجتا ہے کیوں کہ وہ ان کی محبت اور خلوص کو فراموش نہ کر پاتا، اور انھیں ایسے ہی یاد کرتا ہے جیسے اپنے سگے رشتے داروں کو یاد کیا جاتا ہے۔

’’میں نے سنا ہے تم ہندوستان جا رہے ہو — بھائی بلبیر سنگھ اور بھائی ودھاوا سنگھ کو میرا سلام کہنا،
بہن امرت کور کو بھی... بھائی بلبیر سے کہنا فضل دین راضی خوشی ہے... اور جو میرے لائق
خدمت ہو، کہنا میں ہر وقت حاضر ہوں۔‘‘☆۳۳۱

بشن سنگھ نے فضل دین سے بھی ٹوبہ ٹیک سنگھ کے بارے میں پوچھا جس کے جواب میں فضل دین نے اسے بتایا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان کے حصے میں آیا ہے۔

اس کے بعد بشن سنگھ کو راضی کرنے کے لیے افسران اور سپاہیوں نے ہر ممکن کوشش کی یہاں تک کہ اسے بہلانے کے لیے یہ تک کہہ دیا گیا کہ کچھ عرصے کے بعد ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان سے ہندوستان منتقل کر دیا جائے گا، لیکن بشن سنگھ کسی بھی طرح راضی نہ ہوتو اس کو زبردستی دوسری طرف لے جانے کی کوشش کی گئی تو وہ ایک جگہ اس طرح جم کر کھڑا ہو گیا کہ اسے وہاں سے ہلانا کسی کے بس کی بات نہ رہی۔

افسران نے اسے بے ضرر ہونے کی وجہ سے پاکستان ہی میں رکھنے کا فیصلہ کر لیا، اور دوسرے پاگلوں کے تبادلے انتظامات میں مصروف ہو گئے۔

سورج نکلنے سے پہلے ساکت وصامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی۔ اِدھر
اُدھر سے کئی افسر دوڑے دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برس سے دن رات اپنی
ٹانگوں پر کھڑا رہا تھا۔ اوندھے مُنہ لیٹا ہے۔☆۳۳۲

یہ بشن سنگھ کے احساس کی شدّت تھی جس سے وہ اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا تھا اور یہ منٹو ہی کا کمال ہے جنھوں نے صرف فرزانوں ہی نہیں، بلکہ دیوانوں کے جذبات واحساسات کو بھی اہمیت دی کیوں کہ دیوانے بھی صدیوں پرانے وطن اور ساتھیوں کو چھوڑتے وقت اسی کرب سے گزرے تھے جس سے باقی لوگ گزرے تھے۔

بشن سنگھ کو یہ جان کر بہت دکھ ہوا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان کے حصّے میں آیا ہے اور اس نے غصّے میں بڑبڑانا شروع کر دیا:

''اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی پاکستان اینڈ ہندوستان آف دی دُر فٹے مُنہ۔'' ☆۳۳۳

جب ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں نے پاگلوں کے تبادلۂ آبادی کے تمام انتظامات مکمل کر لیے تو ایک مقرر کردہ دن پاگلوں کو ان کے محافظوں اور پولیس کے ساتھ ان کی سرحدوں کی طرف بھیجنا شروع کر دیا گیا۔

پاگلوں کو پاکستان سے ہندوستان جانے کے لیے آمادہ کرنا اور انھیں بسوں میں بٹھانا اور منزل پر پہنچنے کے بعد انھیں بسوں سے اتارنا سب سے کٹھن مرحلہ تھا تبادلۂ آبادی والے دن سارے پاگلوں نے مل کر خوب ہنگامہ کیا۔

پاگلوں کو لاریوں سے نکالنا اور ان کو دوسرے افسروں کے حوالے کرنا بڑا کٹھن کام تھا۔ بعض تو باہر نکلتے ہی نہیں تھے۔ جو نکلنے پر رضامند ہوتے تھے، ان کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا، کیوں کہ ادھر اُدھر بھاگ اٹھتے تھے۔ جو ننگے تھے، ان کو کپڑے پہنائے جاتے تو وہ پھاڑ کر اپنے تن سے جدا کر دیتے — کوئی گالیاں بک رہا ہے۔ کوئی گا رہا ہے۔ آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ رو رہے ہیں، بلک رہے ہیں۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ☆۳۳۴

جب رجسٹر میں پاگلوں کے نام درج کرنے کا مرحلہ آیا تو متعلقہ افسر نے بشن سنگھ کی باری پر اس کا نام دریافت کیا تو اس نے اپنا نام بتانے کے بجائے افسر سے کہا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟ افسر نے جب بشن سنگھ کو بتایا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے تو یہ بات اسے سخت ناگوار گزری۔

یہ سن کر بشن سنگھ اچھل کر ایک طرف ہٹا اور دوڑ کر اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ پاکستانی سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور دوسری طرف لے جانے لگے، مگر اس نے چلنے سے انکار کر دیا۔ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ یہاں ہے اور زور زور سے چلّانے لگا۔'' اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف ٹوبہ ٹیک سنگھ اینڈ پاکستان۔'' ☆۳۳۵

اگرچہ بشن سنگھ ایک عرصے سے پاگل خانے میں قید تھا اور ٹوبہ ٹیک سنگھ کو دیکھے ہوئے بھی اسے ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا، لیکن ٹوبہ ٹیک سنگھ کی محبت اس کے دل سے نکل نہ سکی، اور جب بشن سنگھ کو یقین ہو گیا کہ اس کا ملک اور اس کا شہر ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اس سے چھوٹ گیا ہے تو اس سے یہ صدمہ برداشت نہ ہو سکا، اور وہ پاکستان کی سرحد پار کرنے سے پہلے ہی دنیا سے چلا گیا۔

یہ منٹو کا کمال ہے جس نے فسادات کے دنوں میں جہاں عام انسان کی نفسیاتی الجھنوں کا تجزیہ کیا وہاں معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے اس طبقے کو بھی فراموش نہ کیا اور ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' جیسا یادگار افسانہ لکھ کر سب کو چونکا دیا۔

تیقّن

۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران ہندو مسلم خواتین کو کئی تکالیف اُٹھا پڑیں۔ ان تکالیف کی وجہ سے ان کی زندگی میں کئی تبدیلیاں آ ئیں جس سے ان کی سماجی حیثیت خاک میں مل گئی۔

منٹو کی یہ عظمت بھی ہے اور کمالِ فن بھی کہ انھوں نے مرد ہو کر بھی نہ صرف خواتین کے دکھوں کو سمجھا، بلکہ اسے نہایت جرأت اور سچائی کے ساتھ اپنے افسانوں میں بیان بھی کیا ہے۔

ان کا افسانہ ''تیقّن'' فسادات کے دوران اپنے گھر والوں سے بچھڑ جانے والی ایک لڑکی کے بارے میں ہے۔ اپنے اس مختصر سے افسانے میں منٹو نے ایک بہت بڑی اور تکلیف دہ حقیقت کو جس انداز میں بیان کی ہے وہ ان ہی کا کمال ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مرنے والے کا صبر تو آ جاتا ہے پر بچھڑے ہوئے کا صبر کبھی نہیں آتا۔ فسادات کے دوران اپنی بیٹی سے بچھڑی ہوئی ایک ماں کی اس کیفیت کو منٹو نے اپنے اس افسانے میں بیان کیا ہے۔

فسادات کے دوران مشرقی پنجاب کے علاقہ پٹیالہ سے ایک لڑکی اپنی ماں سے بچھڑ جاتی ہے۔ اس کی ماں اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے نیم پاگل ہو جاتی ہے۔ لوگ اس کی بے چینی اور کرب کو دیکھ کر اس سے یہ جھوٹ بولتے کہ اس کی بیٹی مر چکی ہے، لیکن وہ کسی کی بات کا یقین نہیں کرتی اور اس کی تلاش جاری رہی، اور صدمے، تھکن اور کمزوری سے اس کی حالت دن بہ دن خراب ہوتی گئی، لیکن وہ ممتا کے ہاتھوں مجبور تھی اور اسے یقین تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن اپنی بیٹی کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائے گی پٹیالہ، جالندھر اور سہارن پور میں وہ اس یقین سے گئی کہ اسے اپنی بچھڑی ہوئی بیٹی ضرور مل جائے گی۔

ایک دن کسی نے ترس کھا کر اس بوڑھی عورت سے کہا کہ تمھاری بیٹی واقعی مر گئی ہے لیکن اس نے اتنی جگہ مایوس ہو کر بھی اپنی بیٹی کی موت کو قبول نہ کیا اور کہا:

> میری بیٹی کو کوئی قتل نہیں کر سکتا... وہ بہت خوب صورت ہے — اتنی خوب صورت کہ اسے کوئی قتل نہیں کر سکتا — اسے طمانچہ تک نہیں مار سکتا۔'' ☆۲۳۶

یوں تو ہر ماں باپ کو اپنی اولاد خوب صورت ہی لگتی ہے، لیکن اس افسانے میں بڑھیا کا یہ جملہ کہ ''میری بیٹی اتنی خوب صورت ہے کہ کوئی اسے قتل نہیں کر سکتا'' فسادات کے دنوں کی اس تلخ حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے کہ فسادات کے دنوں میں سکھ اور ہندو مسلمان مردوں کو تو قتل کر دیتے تھے لیکن خواتین بالخصوص خوب صورت اور نوجوان لڑکیوں کے ساتھ ان کا رویّہ مختلف تھا۔ انھیں موت کے حوالے نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ ان کی زندگی موت سے بھی زیادہ گھناونی اور خوف ناک کر دی جاتی؛ یا پھر خوب صورت لڑکیوں کو اپنا ہم مذہب بنا کر ان سے شادی کر لی جاتی ہے۔

بیٹی کی تلاش میں جب تک بڑھیا امرت سر پہنچی تو وہ پاگل ہو چکی تھی اور رو رو کر اس کی آنکھوں کی بینائی بھی کم ہو گئی تھی،

لیکن وہ اپنی بچھڑی ہوئی بیٹی کو امرت سر میں ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگئی۔ صرف بڑھیا ہی نے اپنی بیٹی کو نہیں دیکھا، بلکہ اس سکھ نوجوان نے بھی اسے دیکھا جو اس کی بیٹی کے ساتھ تھا۔

سکھ نوجوان نے اس حسن و جمال کی دیوی سے اس پگلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:
''تمھاری ماں''
لڑکی نے ایک لحظے کے لیے پگلی (بڑھیا) کی طرف دیکھا اور گھونگھٹ چھوڑ دیا اور سکھ نوجوان کا بازو پکڑ کر بھنچے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''چلو۔'' اور وہ دونوں سڑک سے ادھر ذرا ہٹ کر تیزی سے آگے نکل گئے۔'' ☆ ۲۳۷

لڑکی چوں کہ اپنی ماں سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھی، اس لیے ماں کی دردناک آوازوں پر بھی نہ رکی۔ بیٹی کے بھاگ جانے سے اس کی صدموں میں اور بھی اضافہ ہو گیا اس کا خیال تھا کہ اس کی بیٹی بھی اس کے لیے اداس اور بے چین ہوگی، لیکن ایسا کچھ نہ ہوا، بلکہ وہ اپنی بیٹی کے سخت اور سرد رویے سے اور بھی زیادہ دکھی ہوگئی اور اسے لوگوں کی اس بات پر یقین کرنا پڑا کہ اس کی بیٹی مرگئی ہے اور بیٹی کی موت پر وہ خود بھی مرگئی۔

اس افسانے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں جن خواتین کو اغوا کیا گیا یا بچھڑ گئیں وہ نہ صرف خود مختلف مصائب کا شکار ہوئیں، بلکہ ان کے گھر والے بھی ساری زندگی ان کے لیے اداس رہے لیکن انھیں قبول نہ کر سکے۔ معاشرے کے خوف نے والدین اور ان کی مغویہ یا بچھڑی ہوئی بیٹیوں کو نفسیاتی مریض بنا دیا، اور ان کے پاس ایک دوسرے کی یادوں کے سوا کچھ نہ رہا۔

بچھڑنے والی لڑکیوں نے بھی اپنے اپنے حوصلے اور ہمت کے مطابق مختلف راستوں کا انتخاب کیا۔ اس افسانے میں اپنی ماں سے بچھڑنے والی لڑکی بھاگ بھری نے ایک سکھ نوجوان سے شادی کر لی۔ کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ جو بچھڑی ہوئی لڑکیاں اپنے گھر والوں کے پاس جاتی ہیں۔ ان سے کیسا سلوک کیا جاتا ہے اور کیا حیثیت دی جاتی ہے بھاگ بھری اس ذلت آمیز زندگی کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے سکھ کو قبول کرنے ہی میں عافیت سمجھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس نے غلط راستے کا انتخاب کیا ہے، لہٰذا وہ اپنی ماں سے نظریں نہ ملا سکی۔

اپنی ماں کی طرح بھاگ بھری بھی ناخوشگوار حالات اور غلط فیصلوں کی وجہ سے نفسیاتی مسائل کا شکار ہوگئی۔

یزید

سعادت حسن منٹو کا یہ افسانہ ۱۹۴۸ء میں ہونے والے تنازع کشمیر کے بارے میں ہے۔ یہ ایک نفسیاتی افسانہ ہے

جس میں انھوں نے پہلے ۱۹۴۷ء کے دوران ہونے والے حادثات کو بیان کی ہے اور پھر ۱۹۴۸ء میں کشمیر کے الحاق کے سلسلے میں ہونے والے ہندو مسلم اختلافات اور ہندوؤں کی زیادتیوں کو بیان کیا ہے۔

افسانے کے اہم کردار کریم اور جیناں ہیں۔

کریم داد اور جیناں دونوں کے گھر والے ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران مر چکے تھے۔

کریم داد کے والد رحیم داد کو ہندو بلوائیوں نے قتل کر دیا تھا۔اپنے والد کی موت پر کریم داد کو بہت دکھ پہنچا تھا،لیکن اس نے کمال کا حوصلہ دکھایا تھا،اور اس دکھ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا کریم داد کے برخلاف جیناں کو اپنے کی موت کا بہت دکھ تھا۔ بھائی کی موت اس کی زندگی کا سب سے بڑا دکھ بن گئی تھی۔اسے اس بات کا بے حد دکھ تھا کہ اس کا بھائی اس کی عزت بچاتے ہوئے مارا گیا۔

جینا اور کرم داس ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ کریم داد نے جینا سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔شروع میں تو گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے اس کی شادی کی بڑی مخالفت کی،لیکن وہ جلد ہی ہار مان گئے اور اس خوشی میں انھوں نے بڑی گرم جوشی سے شرکت کی۔

...وہ لوگ سوگ منا منا کر اتنے نحیف ہو گئے تھے کہ ایسے معاملوں میں سو فی صد کامیاب ہونے والی مخالفتوں پر بھی زیادہ دیر تک جمے نہ رہ سکے۔☆۳۳۸

کریم داد اور جیناں کی شادی کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ آزاد ریاست کشمیر کے الحاق کا جھگڑا کھڑا ہو گیا،اور ہر جگہ یہ خبر پھیل گئی:

ہندوستان والے دریا بند کرنے والے ہیں۔☆۳۳۹

گاؤں کے لوگوں اور چوہدری کے لیے یہ خبر بہت تکلیف دہ تھی۔اس خبر سے پورے گاؤں میں غم اور غصّے کی لہر دوڑ گئی،اور سب لوگوں نے گاندھی،نہرو اور تمام ہندوؤں کو دل بھر کر گالیاں دیں۔

کوئی پنڈت نہرو کو پیٹ بھر کر گالیاں دے رہا تھا۔کوئی بددعائیں مانگ رہا تھا۔کوئی بددعاؤں سے منکر تھا کہ دریاؤں کا رخ بدلا جا سکتا ہے۔☆۳۴۰

افسانے کے ہیرو کریم داد نے ان حالات میں بھی زندہ دلی اور حوصلے سے کام لیا،اور وہ لوگ جو نہرو اور گاندھی کو گالیاں دے رہے تھے ان کے غصّے کو بھی ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جس دن ہندوستان نے آزاد کشمیر میں بہنے والے دریاؤں کا رخ موڑ دیا۔اسی دن کریم داد کے گھر بیٹا پیدا ہوا،اور کریم داد نے اپنے بیٹے کا نام یزید رکھا۔

''...ضروری نہیں یہ بھی وہی یزید ہو...اُس نے دریا کا پانی بند کیا تھا...یہ کھولے گا۔'' ☆۳۴۱

منٹو اپنے افسانے کے ذریعے یہ حقیقت بیان کرنا چاہ رہے ہیں کہ فسادات کی دردناک اور افسردہ فضا میں بھی کریم داد جیسے لوگ بھی موجود تھے جنھوں نے ہر غم کا ہنس کر مقابلہ کیا، اور اسے اپنے اوپر مسلّط نہ ہونے دیا، بلکہ ہر مصیبت کا کوئی نہ کوئی مثبت پہلو نکالا۔

لاجونتی

فسادات کے موضوع پر راجندر سنگھ بیدی نے صرف ایک افسانہ ''لاجونتی'' لکھا۔ ''لاجونتی'' نہ صرف بیدی کا شاہ کار افسانہ ہے، بلکہ فسادات کے موضوع پر لکھے جانے والے تمام افسانوں میں اسے خاص اہمیت حاصل ہے۔

بیدی نے اپنے تمام افسانوں میں عورت کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور اس کی سماجی حیثیت کو بیان کیا ہے۔ مختلف رشتوں کے حوالے سے اس کی محبت، ایثار اور پاکیزگی جیسے اعلیٰ اوصاف کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ معاشرے میں اس کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور ناروا سلوک کے نفسیاتی اثرات کا بھی جائزہ لیا۔

مختصراً یہ کہ بیدی کے افسانوں کے نسوانی کردار خوب صورت بھی ہیں اور خوب سیرت بھی۔

''لاجونتی'' فسادات کے موضوع پر لکھا جانے والا نفسیاتی افسانہ ہے۔ اس افسانے میں ایک بازیافتہ عورت اور اس کے شوہر کی نفسیاتی کیفیات کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی معاشرے کے تنگ نظر اور مجبور لوگوں کا مغویہ عورتوں (خصوصاً لاجونتی) کے ساتھ ناروا سلوک، مذہبی پروہتوں کا مغویہ بازیافتہ عورتوں کے خلاف پروپیگنڈا وغیرہ ایسے اوصاف ہیں جنھوں نے اس افسانے کو انفرادی حیثیت دے دی ہے۔

لاجونتی، سندر لال، نارائن باوا، لال چند اور رسالو اس افسانے کے خاص کردار ہیں۔ افسانے ہیرو سندر لال ایک سخت مزاج ویہاتی شخص ہے جب کہ اس کی بیوی لاجونتی جو افسانے کی ہیروئن ہے اور مزاجاً ہنس مکھ اور نرم طبیعت ہے۔ اس لیے وہ سندر لال کی مار پیٹ اور ہر قسم کی تلخی سہ جاتی ہے۔ جس سے سندر لال کو بھی اپنی غلطیوں کا احساس نہ ہو سکا۔ لاجونتی نے سندر لال کو اس کی تمام خامیوں دل سے قبول کر لیا تھا، اور دونوں کی زندگی اچھی گزر رہی تھی کہ تقسیمِ ہند کا فیصلہ ہو گیا، اور ہندو مسلم فسادات جو پہلے سے شروع ہو چکے تھے۔ اس اعلان کے بعد شدت اختیار کر گئے اور لوگوں کو کئی نقصانات کا سامنا کرنا پڑا۔ لوٹ مار، قتل و غارت گری اور اچانک ہجرت کرنے کی وجہ سے ہر طرف ہلچل، بدامنی اور قیامت کا سماں پیدا ہو گیا۔ بہت سی عورتیں اغوا کر لی گئیں۔ اس کے بعد ان کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کیا گیا اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

اغوا ہونے والی عورتوں میں لاجونتی بھی شامل تھی۔ اغوا ہونے کے بعد نہ صرف لاجونتی کو کرب ناک کیفیات سے دوچار ہونا پڑا، بلکہ لاجونتی کی جدائی نے سندر لال کو بھی ایک نیا انسان بنا دیا جو حساس، رحم دل اور دوسروں کے کام آنے والا

تھا۔لاجونتی سے بچھڑنے کے بعد سندر لال کو اس کے ساتھ کی ہوئی زیادتیوں کا شدت سے احساس ہوا، اور اس نے اپنے آپ سے عہد کیا کہ اگر لاجونتی اسے دوبارہ مل گئی تو وہ اسے دل میں بسا لے گا۔

اس خیال کے ساتھ ہی اسے تمام مغویہ عورتوں سے ہمدردی محسوس ہوئی اور اس نے سوچا اس کے محلّے میں جہاں ''پھر بساؤ''، ''کاروبار میں بساؤ''، ''زمین پہ بساؤ'' نام کی کمیٹیاں لوگوں کی بہتری کے لیے کام کر رہی ہیں۔ وہاں ''دل میں بساؤ'' نام سے بھی جو کمیٹی تشکیل دی گئی ہے جس کا مقصد مغویہ اور بازیافتہ عورتوں کو معاشرے میں قبول کرنا اور انھیں عزت دینا تھا۔ وہ اس کمیٹی کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرے گا۔ ووٹوں کی اکثریت حاصل کرنے اور لوگوں کے متفقہ فیصلے کے بعد سندر لال کو ''دل میں بساؤ'' کمیٹی کا سیکریٹری مقرر کر دیا گیا۔ سندر لال نے اپنے فرائض نہایت خوش اسلوبی اور ایمان داری سے انجام دیے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے اس نے مندر کے قدامت پرست نرائن باوا کی مخالفت کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا جو کمیٹی کے مقاصد کے سخت خلاف تھی اور مغویہ اور بازیافتہ عورتوں کو قبول کرنے کے حق میں نہ تھا۔

> ...اور وہ یہی سوچتا: ایک بار صرف ایک بار لاجو مل جائے تو میں اسے سچ مچ ہی دل میں بسا لوں گا لوگوں کو بتا دوں گا ان بے چاری عورتوں کے اغوا ہو جانے میں ان کا کوئی قصور نہیں، وہ سماج جو ان معصوم اور بے قصور عورتوں کو قبول نہیں کرتا، انھیں اپنا نہیں لیتا ایک گلا سڑا سماج ہے اور اسے ختم کر دینا چاہیے۔ وہ ان عورتوں کو گھر میں آباد کرنے کی تلقین کیا کرتا اور انھیں ایسا مرتبہ دینے کی درخواست کیا کرتا جو گھر میں کسی بھی عورت، کسی بھی ماں، بیٹی، بہن یا بیوی کو دیا جاتا ہے اور کہتا انھیں اشارے اور کنائے سے بھی ایسی باتوں کی یاد نہیں دلانی چاہیے جو ان کے ساتھ ہوئیں کیوں کہ ان کے دل زخمی ہیں، وہ نازک ہیں، چھوئی موئی کی طرح۔ ہاتھ بھی لگاؤ گے تو مرجھا جائیں گے۔☆۳۴۲

ایک طرف ''دل میں بساؤ'' کمیٹی کے ممبران مغویہ اور بازیافتہ عورتوں کو قبول کرنے اور گھر میں باعزت طریقے سے بسانے کے لیے سرتوڑ کوششیں کر رہے تھے دوسری طرف نارائن باوا مغویہ اور بازیافتہ عورتوں سے لوگوں کو متنفر کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ اس طرح محلّہ ملاشکور کے کچھ لوگ سندر لال کے حمایتی بن گئے اور کچھ لوگوں کو نارائن باوا کے خیالات سے اتفاق تھا نارائن باوا کے ہر قسم کی تراکیب آزمانے کے بعد بھی جب سب کو قائل نہ کر سکے تو انھوں نے مذہب کا سہارا لیا اور اپنے خیالات سے ہم آہنگ کرنے کے لیے رام اور سیتا کی کتھا سنائی۔

اور لوگوں کو بتایا کہ جب رام چندر نے سیتا کو راون کے ساتھ اتنے دن گزارنے کے بعد دوبارہ اپنے گھر میں بسا لیا تھا تو ایک دھوبی کے کہنے پر اس نے سیتا کو گھر سے نکال دیا تھا۔ اس لیے کہ رام چندر معاشرے کے ہر فرد کی بات کو اہمیت دیتا تھا۔

مذہب کا سہارا بھی نارائن باوا کو ان کے مقصد میں کام یاب نہ کر سکا، اور سندر لال نے اپنے ان مضبوط دلائل کے ذریعے نارائن باوا کے مذہبی دلائل کو غیر تسلی بخش اور سطحی ثابت کر دیا۔

سندر لال نے کہا، ''میں ایک بات تو سمجھتا ہوں باوا کہ رام راج میں دھوبی کی آواز تو سنی جاتی ہے لیکن رام راج کے چاہنے والے سندر لال کی اواز نہیں سنتے... شری رام نیتا تھے ہمارے پر یہ کیا بات ہے باوا جی! انھوں نے دھوبی کی بات کو ستیہ سمجھ لیا، پر اتنی بڑی مہارانی کے ستیہ پر وہ وشواش نہ کر پائے... اس میں کیا قصور تھا سیتا کا؟ کیا وہ بھی ہماری بہت سی ماؤں بہنوں کی طرح ایک چھل اور ایک کپٹ کی شکار نہ تھی؟ اس میں سیتا کے ستیہ اور استھ کی بات ہے یا رکشن راون کے وحشی پن کی بات ہے؟ جس کے دس سر انسان کے ہیں لیکن ایک اور سب سے بڑا سر گدھ کا ہے۔'' ☆۳۴۳

ان دلائل کے بعد نارائن باوا کے پاس کوئی مناسب جواب نہ رہا اور اس کے ساتھی بھی سندر لال کی باتوں سے بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے ''سندر لال زندہ'' کے نعرے لگانا شروع کر دیے۔

سندر لال نے جو کچھ کہا کر کے دکھایا اور جب لاجونتی بازیاب ہو کر آئی تو سندر لال نے اسے سچے دل سے قبول کر لیا، لیکن اپنی خوشی میں اپنے فرائض اور دوسروں کے دکھ نہ بھولا اور ''دل میں بساؤ'' کمیٹی کے لیے اسی خلوص اور سچائی سے کام کرتا جیسے لاجونتی کی بازیابی سے پہلے کر رہا تھا۔

سندر لال نے اپنے رویّے اور باتوں سے لاجونتی کو یہ احساس نہ ہونے دیا کہ وہ ایک مغویہ عورت ہے۔ سندر لال ماضی میں لاجونتی پر جو ظلم کر چکا تھا اُس کی تلافی کے لیے سندر لال کے پاس یہی موقع تھا۔ اب اُس نے لاجونتی کو ''دیوی'' کہنا ہی نہیں، بلکہ دیوی کی طرح محترم اور لاجونتی کے پودے کی طرح نازک سمجھنا بھی شروع کر دیا۔ سندر لال اس حقیقت سے بہت اچھی طرح واقف تھا کہ لاجونتی کے اغوا ہونے میں اس کا کوئی قصور نہیں، بلکہ لاجونتی سمیت تمام مغویہ اور بازیافتہ عورتیں زندہ رہ کر جس بہادری اور حوصلے سے لوگوں کی نفرت اور حقارت کو برداشت کر رہی ہیں وہ مرنے سے زیادہ مشکل ہے۔

سندر لال کے حسن سلوک سے شروع میں تو لاجونتی بہت خوش ہوئی لیکن یہ خوشی زیادہ دن تک نہ رہ سکی، اور لاجونتی کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ سندر لال نے اسے ''دیوی'' بنا کر اس پر بڑا ظالم کیا ہے جس سے سندر لال اور لاجونتی کے درمیان فاصلے پیدا ہو گئے ہیں جو صرف اس صورت میں سمٹ سکتے ہیں اگر وہ دوبارہ ''لاجونتی'' بن جائے۔ لاجونتی کو سندر لال کی ہمدردی اور احترام سے زیادہ اس کی محبت کی ضرورت تھی۔ وہ نہ تو خود ''دیوی'' بن کر رہنا چاہتی تھی اور نہ ہی سندر لال کو اپنا پجاری بنانا چاہتی تھی، بلکہ وہ چاہتی تھی کہ وہ دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی گزاریں۔ سندر لال اس سے پہلے کی طرح لڑنے جھگڑنے

اور مارنے پیٹنے کے بعد اسے منائے۔

> وہ سندر لال کی وہی پرانی لاجونتی ہو جانا چاہتی تھی جو گاجر سے لڑ پڑتی تھی اور مولی سے مان جاتی تھی، لیکن اب لڑائی کا سوال ہی نہ تھا۔ سندر لال نے اسے محسوس کرا دیا جیسے وہ لاجونتی نہیں، بلکہ کانچ کی کوئی چیز ہے جو چھوتے ہی ٹوٹ جائے گی اور لاجو شیشے میں اپنا سراپا کی طرف دیکھتی اور آخر اس نتیجے پر پہنچتی کہ وہ اور سب کچھ تو ہو سکتی ہے لاجو نہیں ہو سکتی۔ ☆۳۴۴

اس افسانے میں بیدی نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ فسادات کے دوران کسی بھی قسم کی زیادتیوں کا شکار ہونے کے بعد جن لڑکیوں کو قبول کر لیا گیا وہ بھی اپنے پرانے ماحول میں واپس نہ آ سکیں۔ ان لڑکیوں کو بے قصور جاننے کے باوجود لوگوں نے ان کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کیا کہ وہ اپنی ہی نظروں میں گر گئیں۔ لوگوں کی ہمدردیاں بھی انھیں مصنوعی لگیں اور انھیں ان سیاہ دنوں کی یاد دلاتی رہیں جن کو وہ بھول جانا چاہتی تھیں۔

لاجونتی سے شدید محبت رکھنے کے باوجود سندر لال اس کے دل کی اصل تمنا کو نہ سمجھ سکا۔ ایسی ناسمجھی اور بے خبری ہی لاجونتی کو پرانے ماحول میں آنے میں سب سے بڑی رکاوٹ بنی۔

> سندر لال یہ بھی نہ سمجھ سکا کہ اس کے آنگن میں لاجونتی کا جو بوٹا دوبارہ آن لگا ہے۔ وہ اب گیتوں والی لاجونتی سے مزاجاً اور فطرتاً مختلف ہے کہ ہاتھ لگانے کے بجائے، ہاتھ نہ لگانے کے باعث: کملا رہا ہے، مرجھا رہا ہے ناسمجھی کے ہاتھوں اجڑ رہا ہے، یعنی:
>
> لاجو آئی بھی پر نہ آئی
>
> وہ بس گئی پر اجڑ گئی ☆۳۴۵

ایک بیوی اور عورت کے لیے اس سے بڑا سانحہ تقسیم اور کیا ہو سکتا ہے۔ تقسیم کے بعد یہ مسئلہ محض لاجونتی کا نہ تھا ایسی لاجونتیاں سیکڑوں نہیں ہزاروں تھیں جنھوں نے کچھ نہیں تو نفسیاتی مسائل ہی پیدا کر دیے تھے۔

نئی دھرتی، پرانے گیت

رام لعل نے اس افسانے میں تقسیمِ ہند کے بعد لوگوں کو پیش آنے والے معاشی مسائل اور اس کے نفسیاتی اثرات کو بیان کیا ہے۔

سائیں داس، ٹھاکر داس اور اس کے گھر والے افسانے کے اہم کردار ہیں۔

فسادات کی وجہ سے ٹھاکر داس اور سائیں داس پاکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے۔ اگرچہ دونوں خاندان

پاکستان میں مختلف جگہوں میں رہتے تھے لیکن ہندوستان میں آکر دونوں ایک دوسرے کے پڑوسی بن گئے۔

ٹھاکر داس کو تو ہندوستان میں آکر اس کی حیثیت سے زیادہ جائیداد مل گئی جب کہ سائیں داس کو رہنے کے لیے مکان حاصل کرنے اور دوسری بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لیے بہت تگ و دو کرنا پڑی۔

اب ٹھاکر داس کا شمار اپنے محلّے کے امیر گھرانوں میں ہوتا تھا۔ اس بات کا ٹھاکر داس اور سائیں داس دونوں کو احساس تھا۔ سائیں داس کو ٹھاکر داس کی اس ہمدردی اور محبت کی بہت ضرورت تھی جو ہندوستان میں آنے کے بعد ابتدائی دنوں میں دونوں گھرانوں میں پائی جاتی تھی لیکن وقت اور دولت نے دونوں گھرانوں کی دوستی میں دراڑ پیدا کردی۔

جیسا کہ سائیں داس اکثر کہا کرتا:

''روپیہ محبت کا دشمن ہوتا ہے...روپیہ پاکر تو آدمی قریبی سے قریبی رشتے تک کو بھول جاتا ہے۔
ایک ہی ماں باپ کے جائے ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔ ہمارا تو بس ایک ہی شہر کا
ناتا تھا۔'' ☆۳۴۶

جب ٹھاکر داس اور اس کی بیوی سائیں داس کو اپنے بیٹے کی شادی کی دعوت دی تو سائیں داس نے اس دعوت کو قبول نہ کیا اسے ٹھاکر داس کی ساری زیادتیاں یاد آ گئیں جو وہ اس کے ساتھ کر چکا تھا۔ اس نے اپنے گھر والوں کو سنبھالتے ہوئے کہا:

''...اسی مکان کا قصہ لے لو۔ ہماری الاٹمنٹ کینسل کرانے کی ٹھاکر داس نے کتنی کوشش کی نا! پر
کام یاب نہ ہو پایا۔ اس نے ہمارے ساتھ ایسا حاسدانہ رویّہ اختیار نہ کیا ہوتا تو آج ہم ایک
دوسرے سے کتنا قریب ہوتے۔'' ☆۳۴۷

بچّوں کی ضد پر سائیں داس کو نہ چاہتے ہوئے ان کی بات ماننا پڑی اور اس نے اپنے بچّوں کو ''رت جگے'' میں بھیج دیا۔

ٹھاکر داس کے گھر سے جب سائیں داس کو اپنی بیٹی کے گانے کی آواز آئی تو وہ یہ برداشت نہ کر سکا اور اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ فوراً جا کر ٹھاکر داس کے گھر سے سرلا کو لے آئے، لیکن سائیں داس کی بیوی ٹھاکر داس کے گھر میں جا کر خود بھی گیت گانے میں مصروف ہوگئی۔

ٹھاکر داس کے گھر سے جن گیتوں کی آواز آ رہی تھی وہ سائیں داس کی جوانی کے دور کے گیت تھے۔ ان گیتوں کو سن کر سائیں داس کو بہت سی پرانی باتیں یاد آ گئیں وہ اپنے جذبات کو قابو نہ کر سکا اور اپنی اور ٹھاکر داس کے گھر کی مشترکہ دیوار پر چڑھ گیا۔

سائیں داس کی یہ حرکت ٹھاکر داس سے چھپی نہ رہ سکی وہ اسے دیکھ کر مسکرا دیا اور اسے اپنے گھر آنے کو کہا۔

سائیں داس نے...اس کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے خلوص کو پرکھا۔ جسے اپنی آبائی علاقے کے

جذبات بھرے لوک گیت دل کی گہرائیوں میں سے نتھار کر اوپر لے آئے تھے۔☆۳۴۸

اور پھر چند ہی لمحے بعد وہ ٹھاکر داس کے گھر میں تھا۔

اس کے سامنے اس کے بچّے تھے، بیوی تھی، محلّے بھر کی عورتیں، لڑکیاں اور مرد تھے۔ وہ سب کی موجودگی سے اچانک بے نیاز ہو گیا۔ اپنی عمر کو بھول گیا۔ اپنے آپ کو پھر سے واپس لے گیا جوانی کے دور میں۔☆۳۴۹

اور یوں پرانے ہندوستانی گیتوں نے دو گھرانوں کے درمیان پیدا ہونے والی نفرت کو ختم کر کے انھیں پھر سے ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔

اس افسانے کے ذریعے رام لعل یہ حقیقت واضح کرنا چاہتے ہیں کہ تقسیمِ ہند کے بعد جب مسلمانوں اور ہندوؤں نے ہجرت کی تو نئے ملک میں جا کر انھیں معاشی طور پر مستحکم ہونے کے لیے کئی دشواریوں کا سامنا پڑا۔ جائیداد کی صحیح تقسیم نہ ہونے کی وجہ سے امیر غریب اور غریب امیر ہو گئے۔ لوگوں نے اپنی اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے خود غرضی سے کام لیا۔ جس سے بعض گھرانوں کے آپس کے تعلقات خراب ہو گئے، لیکن زندگی کی ساری خوشیوں کا دارومدار روپیہ پیسا اور جائیداد ہی نہیں، بلکہ آپس کا پیار و محبت اور خوشگوار تعلقات بھی اتنے ہی اہم ہوتے ہیں۔ جیسا کہ رام لعل ان تمام حقائق کو اس افسانے میں ٹھاکر داس اور سائیں داس کے کردار کے ذریعے بیان کیا ہے۔

ٹھاکر داس کے بیٹے کی شادی سائیں داس اور اس کے گھر والوں کے بغیر بھی ہو سکتی تھی لیکن خوشی کے موقع پر ٹھاکر داس کو پرانی صحبتیں یاد آئیں۔ تقسیمِ ہند کے بعد اس کے بہت سے دوست اور ساتھی اس سے بچھڑ گئے تھے، لیکن جو لوگ اب اس کے آس پاس تھے انھیں وہ کھونا نہیں چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے پرانی باتوں کو بھلا کر سائیں داس سے پھر سے تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی۔

اندھیرا اور اندھیرا

شوکت صدیقی نے اس طویل افسانے میں تقسیمِ ہند کے نتیجے میں پیدا ہونے والے معاشی مسائل کا ذکر کیا ہے۔

اسرار، رفیعہ، نفیسہ، انور اور ماں افسانے کے اہم کردار ہیں۔

اسرار اس افسانے کا اہم کردار ہے جو روزنامہ ''نقیب'' میں ایک صحافی کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ اسرار کا تعلق ایک متوسّط طبقے سے تھا اور اس کی آمدنی بھی زیادہ نہ تھی لیکن وہ رفیعہ کے شوہر، ماں جی کے بیٹے، نفیسہ اور انور کے بھائی کی حیثیت سے تمام فرائض بخوبی انجام دے رہا تھا۔

تقسیمِ ہند سے قبل روز نامہ ''نقیب'' مسلم لیگ کی حمایت میں تھا اور اس میں جو بھی اداریے لکھے جاتے تھے اس میں مسلم لیگ ہی کی حمایت کی جاتی تھی۔

جب تقسیمِ ہند کے بعد ملک میں ہندو مسلم فسادات ہوئے تو ہر طرف لوٹ مار، قتل و غارت گری اور خواتین کی بے حرمتی کے واقعات رونما ہوئے تو بعض لوگ ایسے دردناک واقعات اور حادثات دیکھ کر تقسیمِ ہند اور حکومت کے خلاف ہو گئے۔

اسرار نے جب ملک میں تباہی دیکھی تو وہ بھی تقسیمِ ہند کے خلاف ہو گیا ان ہی دنوں اسرار نے روز نامہ ''نقیب'' میں حکومت کے خلاف ایک اداریہ لکھا۔

حکومت نے اس کے خلاف سخت ایکشن لیا، اور اسرار کو تین ماہ کی تنخواہ دے کر ہمیشہ کے لیے معطل کر دیا۔ کچھ ہی عرصے کے بعد سارے پیسے ختم ہو گئے اور وہ محلّے کے بہت سارے لوگوں اور دکانداروں کے مقروض ہو گئے۔ ان تکلیف دہ حالات کی وجہ ان کے گھر کی فضا بھی خراب ہو گئی، اور سب گھر والے بات بات پر لڑنے جھگڑنے لگے۔

اسرار کی ماں نے اپنی بیٹی کی شادی کے لیے کچھ پیسے چھپا کر رکھے ہوئے تھے۔ ایک دن یہ پیسے اسرار کو مل گئے اسرار تمام حالات اور مصائب سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے یہ پیسے لے کر گھر سے بھاگ گیا۔ پاکستان جا کر وہ پہلے ایک مہاجر کیمپ میں گیا جہاں اسے کیمپ میں رہنے والا ہر مہاجر پریشان اور الجھا ہو نظر آیا۔

> ...کیمپوں میں ہر طرف مردوں، عورتوں اور بچّوں کی بھیڑ تھی، دن رات ان کی چیخ و پکار سے ہنگامہ برپا رہتا۔ پانی لینے پر جھگڑا ہوتا۔ عورتوں سے چھیڑ خانی پر چاقو نکل آتے۔ رات گئے اچانک کسی طرف سے شور اُٹھتا۔ عورتیں گھبرا کر اونچی آواز میں بولتیں۔ بچّے رونے لگتے۔ ہر وقت سراسیمہ ہو جاتا۔ تحقیقات کرنے پر پتا چلتا کہ کوئی مرا نہیں ہے، بلکہ کسی مہاجر کنبے کا سامان چوری ہو گیا ہے۔ چوری کرنے والا بھی مہاجر ہوتا۔ ☆۳۵۰

مہاجر کیمپ میں اسرار کے علاوہ اور بہت سے ایسے مہاجر تھے جو ہندوستان سے معاشی تنگی سے بے زار ہو کر اور معاشرے میں باعزت مقام حاصل کرنے کے لیے آئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پاکستان ان کا اپنا آزاد مسلم ملک ہے جہاں ان کی جان، مال اور عزت سب کچھ محفوظ رہے گا۔

اسرار کے گھر والوں نے بھی پاکستان سے بہت سی اُمیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ ان اُمیدوں کی آس پر وہ بھی ایک دن ہندوستان سے پاکستان آ گئے۔ پاکستان میں بیش تر مہاجرین مصیبت میں گھرے ہوئے تھے۔ زندگی کی آسائشیں میسّر آنا تو بہت دور کی بات ہے انھیں دو وقت کی روٹی اور سر چھپانے کے لیے چھت ملنا بھی محال ہو گیا تھا۔

غربت اور بدحالی میں اسرار پر ایسا وقت بھی کئی بار آیا جب اس نے چوری کرنے کے بارے میں سوچا لیکن اس کے

ضمیر نے اسے اس کی اجازت نہ دی۔

اسرار کے گھر والے جب ہندوستان سے پاکستان آئے تو انھیں بھوک اور غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر بھیک کے پیشے کو اختیار کرنا پڑا۔ ایک دن انور اور اس کی ماں کو بھیک مانگتے ہوئے اسرار مل گیا، اور پھر مل کر رہنے لگی۔ اسرار کو اپنی والدہ ہی کے ذریعے پتے چلا کہ اس کی بیوی اور بیٹا ہندوستان میں ہیں۔ اسرار نے انھیں اپنے پاس بلانے کی بہت کوشش کی لیکن وسائل اور روپے پیسے کی کمی کی وجہ سے اس کے لیے یہ ممکن نہ تھا۔ جب کہ کیمپوں کے حالات اتنے خراب ہو چکے تھے کہ بعض لوگوں نے غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کیمپوں کو قحبہ خانہ بنا لیا تھا۔

خوراک کی کمی، گھریلو مسائل اور پریشانیوں کی وجہ سے اسرار کی صحت روز بروز خراب ہوتی چلی گئی۔ وہ جب ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو اسے خدا یاد آیا۔ اب وہ نماز بھی پابندی سے پڑھنے لگا۔ شب کو وہ پوری رات تنہائی میں عبادت کرنے کی غرض سے کلفٹن کے ساحل پر چلا گیا۔

عبادت اور محنت کرنے کے باوجود اس کے معاشی مسائل حل نہ ہو سکے اور معاشی مسائل کے ساتھ ساتھ نفسیاتی مسائل میں بھی الجھتا گیا۔

❀❀❀

حوالہ جات:

☆۱ ''اُردو مختصر افسانہ فنی و تکنیکی مطالعہ (۱۹۴۷ء کے بعد)''، ڈاکٹر نگہت ریحانہ، بک وائز، لاہور، بارِ اوّل ۱۹۸۸ء، ص ۶۸

☆۲ ''اُردو مختصر افسانہ فنی و تکنیکی مطالعہ (۱۹۴۷ء کے بعد)''، محولہ بالا، ص ۷۸-۷۷

☆۳ ''تأثرات'' (''ادیبوں نے کہا'')، بلونت سنگھ، مشمولہ: ماہ نامہ ''بیسویں صدی''، دہلی، کرشن چندر نمبر، ص ۶۷
بحوالہ: ''کرشن چندر، شخصیت اور فن''، جگدیش چندر ودھاون، شرکت پرنٹنگ پریس، طبعِ اوّل ۱۹۹۳ء، ص ۴۴۰

☆۴ ''کرشن چندر، شخصیت اور فن''، محولہ بالا، ص ۴۴۳

☆۵ ''منٹو کی حقیقت نگاری''، عبارت بریلوی، مشمولہ: سہ ماہی ''نقوش'' لاہور، منٹو نمبر، ص ۲۶۷

☆۶ ''کچھ نئے اور پرانے افسانہ نگار''، ڈاکٹر اے بی اشرف، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۸۰

☆۷ ''کچھ نئے اور پرانے افسانہ نگار''، محولہ بالا، ص ۷۹

☆۸ ''اُردو افسانہ تحقیق و تنقید''، انوار احمد، بیکن بکس، ملتان، طبعِ اوّل ۱۹۸۸ء، ص ۲۳۹

☆۹ ''فسادات اور ادب''، عصمت چغتائی، مشمولہ: ماہ نامہ ''افکار'' کراچی، جوبلی نمبر، ص ۵۸۱

☆۱۰ ''یہاں سے وہاں تک''، عصمت چغتائی، چوہدری برادر، لاہور، طبعِ اوّل، سنہ ندارد، ص ۴۵-۴۶

☆۱۲ ''ہندو مسلم فسادات اور اُردو افسانہ''، شیخ محمد غیاث الدین، نگارشات، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۱۶۷

☆۱۳ ''رام لعل کی افسانہ نگاری''، ظہیر آفاق، شانِ ہند پبلیکیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء، ص ۲۱

☆۱۴ سہ ماہی ''نقوش'' لاہور، آپ بیتی نمبر، جلد دوم، جون ۱۹۶۴ء، ص ۱۰۵۱

☆۱۵ سہ ماہی ''نقوش'' لاہور، آپ بیتی نمبر، محولہ بالا، ص ۱۰۴۹، ص ۱۰۴۹

☆۱۶ ''خواجہ احمد عبّاس کے منتخب افسانے''، مرتبہ رام لعل، سیمانت پرکاشن، نئی دہلی، بارِ اوّل ۱۹۸۸ء، ص ۹

☆۱۷ ''اُردو ادب کی تحریکیں''، انور سدید، انجمنِ ترقی اُردو پاکستان، کراچی، ص ۵۱۱

☆۱۸ سہ ماہی ''ذہنِ جدید'' نئی دہلی، (فسادات کے افسانے: تجزیوں کے ساتھ)، جلد: ۴، شمارہ: ۱۴،
دسمبر ۱۹۹۳ء تا فروری ۱۹۹۴ء، ص ۱۴

☆۱۹ ''اُردو ادب کی تحریکیں''، محولہ بالا، ص ۵۱۰

☆۲۰ ''بات چیت''، ظہیر کاشمیری، مشمولہ: ''سویرا'' ۸-۷، بحوالہ: ''اُردو ادب کی تحریکیں''، محولہ بالا، ص ۵۱۰

☆۲۱ ''نیا منشور اور اُس کے بعد''، عابد حسن منٹو، مشمولہ: ''سویرا'' ۱۴-۱۳، بحوالہ: ''اُردو ادب کی تحریکیں''، محولہ بالا، ص ۵۱۰

☆۲۲ ’’روشنائی‘‘، سجاد ظہیر، مکتبۂ دانیال، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص۱۳-۴۱۲

☆۲۳ ’’روشنائی‘‘، محولۂ بالا، ص۴۱۳

☆۲۴ ’’روشنائی‘‘، محولۂ بالا، ص۴۱۵

☆۲۵ ’’روشنائی‘‘، محولۂ بالا، ص۴۱۴

☆۲۶ ’’روشنائی‘‘، محولۂ بالا، ص۴۱۵

☆۲۷ ’’بات چیت‘‘، محولۂ بالا، بحوالہ: ’’اُردو ادب کی تحریکیں‘‘، محولۂ بالا، ص۵۱۲

☆۲۸ ’’بات چیت‘‘، محولۂ بالا، بحوالہ: ’’اُردو ادب کی تحریکیں‘‘، محولۂ بالا، ص۵۱۱

☆۲۹ ’’ترقی پسند ادب‘‘، علی سردار جعفری، انجمنِ ترقی اُردو ہند، علی گڑھ، طبعِ دوم ۱۹۵۷ء، ص۲۰۳

☆۳۰ ’’اُردو ادب کی تحریکیں‘‘، محولۂ بالا، ص۵۱۱

☆۳۱ ’’ترقی پسند ادب‘‘، محولۂ بالا، ص۲۰۴

☆۳۲ ’’ترقی پسند ادب‘‘، محولۂ بالا، ص۲۰۵

☆۳۳ ’’روشنائی‘‘، محولۂ بالا، ص۴۰۳

☆۳۴ ’’روشنائی‘‘، محولۂ بالا، ص۳-۴۰۲

☆۳۵ ’’روشنائی‘‘، محولۂ بالا، ص۴۰۳

☆۳۶ ’’سویرا‘‘، شمارہ ۸-۷، ص۲۸، بحوالہ: ’’اُردو ادب کی تحریکیں‘‘، محولۂ بالا، ص۱۳-۵۱۲

☆۳۷ ’’سویرا‘‘، شمارہ ۸-۷، ص۲۴، بحوالہ: ’’اُردو ادب کی تحریکیں‘‘، محولۂ بالا، ص۵۱۳

☆۳۸ ’’اُردو ادب کی تحریکیں‘‘، محولۂ بالا، ص۵۱۴

☆۳۹ ’’اُردو ادب کی تحریکیں‘‘، محولۂ بالا، ص۵۱۵

☆۴۰ ’’ترقی پسند ادب (پچاس سالہ سفر)‘‘، مرتبہ: قمر رئیس، عاشور کاظمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، طبعِ دوم ۱۹۸۹ء، ص۳۲۳

☆۴۱ ’’ترقی پسند ادب (پچاس سالہ سفر)‘‘، محولۂ بالا، ص۳۲۳

☆۴۲ ’’ترقی پسند ادب (پچاس سالہ سفر)‘‘، محولۂ بالا، ص۳۲۳

☆۴۳ ’’ترقی پسند ادب (پچاس سالہ سفر)‘‘، محولۂ بالا، ص۳۲۴

☆۴۴ ’’نیا منشور اور اُس کے بعد‘‘، محولۂ بالا، بحوالہ: ’’اُردو ادب کی تحریکیں‘‘، محولۂ بالا، ص۱۷-۵۱۶

☆۴۵ ’’ترقی پسند ادب (پچاس سالہ سفر)‘‘، محولۂ بالا، ص۳۲۵

☆۴۶ ''حلقۂ اربابِ ذوق''،ڈاکٹر یونس جاوید،مجلسِ ترقئ ادب،لاہور،۱۹۸۴ء،ص۶۳

☆۴۷ ''اُردوادب کی تحریکیں''،محولۂ بالا،ص۵۵۶

☆۴۸ ''حلقۂ اربابِ ذوق''،محولۂ بالا،ص۵۵۷

☆۴۹ قیّوم نظر(انٹرویو)،مشمولہ:''ماہِ نو''،مئی۱۹۷۲ء،ص۱۹،بحوالہ:''اُردوادب کی تحریکیں''،محولۂ بالا،ص۵۵۷

☆۵۰ ''یادداشت''،ڈاکٹر محمد باقر،مشمولہ:''مخزن''،اگست۱۹۵۰ء،بحوالہ''اُردوادب کی تحریکیں''،محولۂ بالا،ص۵۵۸

☆۵۱ ''اُردوادب کی تحریکیں''،محولۂ بالا،ص۶۴-۵۶۳

☆۵۲ ''اُردوادب کی تحریکیں''،محولۂ بالا،ص۵۶۴

☆۵۳ ''ترقّی پسند ادب''،محولۂ بالا،ص۱۹۳

☆۵۴ ''اُردوادب کی تحریکیں''،محولۂ بالا،ص۵۶۵

☆۵۵ ''اُردوادب کی تحریکیں''،محولۂ بالا،ص۶۰۱

☆۵۶ ''اُردو مختصر افسانہ فنّی و تکنیکی مطالعہ(۱۹۴۷ء کے بعد)''،محولۂ بالا،ص۱۵۹

☆۵۷ ''عزیز احمد اور اُردو ادب''،جمیل جالبی،مشمولہ:ہفت روزہ''برگِ آوارہ''،حیدرآباد(دکن)،مئی۱۹۷۹ء،بحوالہ: ''اُردو مختصر افسانہ فنّی و تکنیکی مطالعہ(۱۹۴۷ء کے بعد)''،محولۂ بالا،ص۱۶۳

☆۵۸ ''حلقۂ اربابِ ذوق''،محولۂ بالا،ص۱۷۰

☆۵۹ ''حلقۂ اربابِ ذوق''،محولۂ بالا،ص۱۷۰

☆۶۰ کارروائی ادبی اجلاس،مخطوطہ،بتوسّط اعجاز حسین بٹالوی:۹رجولائی ۱۹۵۷ء،''حلقۂ اربابِ ذوق''،محولۂ بالا،ص۲۸۵

☆۶۱ ''اُردوادب کی تحریکیں''،محولۂ بالا،ص۵۷۶

☆۶۲ کارروائی ادبی اجلاس،محولۂ بالا،''حلقۂ اربابِ ذوق''،محولۂ بالا،ص۸۳-۸۲

☆۶۳ ''حلقۂ اربابِ ذوق''،محولۂ بالا،ص۸۳

☆۶۴ کارروائی ادبی اجلاس،محولۂ بالا،''حلقۂ اربابِ ذوق''،محولۂ بالا،ص۸۴

☆۶۵ کارروائی ادبی اجلاس،محولۂ بالا،''حلقۂ اربابِ ذوق''،محولۂ بالا،ص۸۴

☆۶۶ کارروائی ادبی اجلاس،محولۂ بالا،''حلقۂ اربابِ ذوق''،محولۂ بالا،ص۸۴

☆۶۷ کارروائی ادبی اجلاس،محولۂ بالا،''حلقۂ اربابِ ذوق''،محولۂ بالا،ص۸۵

☆۶۸ ''حلقۂ اربابِ ذوق''،محولۂ بالا،ص۸۵

☆۶۹ ''حلقۂ اربابِ ذوق''،محولۂ بالا،ص۸۵

☆۷۰ ''حلقۂ اربابِ ذوق''،محولۂ بالا،ص۸۵

☆۷۱ ''اُردوادب کی تحریکیں''،محولۂ بالا،ص۵۸۱

☆۷۲ ''نئی تحریریں''،شمارہ اوّل،بحوالہ:''اُردوادب کی تحریکیں''،محولۂ بالا،ص۵۸۲

☆۷۳ آئینِ حلقۂ اربابِ ذوق،''اُردوادب کی تحریکیں''،محولۂ بالا،ص۵۸۲

☆۷۴ ''اُردوادب کی تحریکیں''،محولۂ بالا،ص۵۸۴

☆۷۵ ''حلقۂ اربابِ ذوق''،محولۂ بالا،ص۱۱۹

☆۷۶ کارروائی ادبی اجلاس،محولۂ بالا،''حلقۂ اربابِ ذوق''،محولۂ بالا،ص۱۱۸

☆۷۷ کارروائی ادبی اجلاس،محولۂ بالا،''حلقۂ اربابِ ذوق''،محولۂ بالا،ص۱۱۹

☆۷۸ کارروائی ادبی اجلاس،محولۂ بالا،''حلقۂ اربابِ ذوق''،محولۂ بالا،ص۱۱۸

☆۷۹ ''ہندو مسلم فسادات اوراُردوافسانہ''،محولۂ بالا،ص۲۷۵

☆۸۰ ''اُردومختصر افسانہ فنّی وتکنیکی مطالعہ(۱۹۴۷ء کے بعد)''،محولۂ بالا،ص۱۱۸

☆۸۱ ''ہندو مسلم فسادات اوراُردوافسانہ''،محولۂ بالا،ص۳۲۴

☆۸۲ ''اختر شیرانی اورجدیداُردوادب''،ڈاکٹر یونس حسنی،انجمنِ ترقیٔ اُردو پاکستان،کراچی،طبعِ اوّل ۱۹۷۶ء،ص۱۴۴

☆۸۳ ''اصولِ انتقادِادبیات''،پروفیسر عابدعلی عابد،مجلسِ ترقیٔ ادب،لاہور،طبعِ دوم مئی ۱۹۶۶ء،ص۱۳۴

☆۸۴ ''اصولِ تنقید''،محمداحسان الحق،علمی کتاب خانہ،لاہور،سنہ ندارد،ص۱۸۶

☆۸۵ ''اُردوادب کی تحریکیں''،محولۂ بالا،ص۴۴۱

☆۸۶ ''اُردوادب کی تحریکیں''،محولۂ بالا،ص۴۳۹

☆۸۷ ''قمرزمانی بیگم''،مرتبہ:فرمان فتح پوری،اُردواکیڈمی سندھ،کراچی،بارِدوم ۱۹۷۹ء،ص۱۳-۱۲

☆۸۸ ''اُردوادب میں ترقّی پسند تحریک''،ڈاکٹر حنیف فوق،مشمولہ:''پاکستانی ادب''(پانچویں جلد:تنقید)
فیڈرل گورنمنٹ سرسیّد کالج،راولپنڈی،جنوری ۱۹۸۲ء،ص۳۶۴

☆۸۹ ''قمرزمانی بیگم''،محولۂ بالا،ص۱۳-۱۲

☆۹۰ ''اُردوادب کی تحریکیں''،محولۂ بالا،ص۴۷۹

☆۹۱ ''اُردوادب کی تحریکیں''،محولۂ بالا،ص۴۸۰

☆۹۲ ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، محولہ بالا، ص۱۳۹

☆۹۳ ''تنقیدی اشارے''، آلِ احمد سرور، بحوالہ: ''ترقی پسند تحریک اور اُردو افسانہ''، ڈاکٹر محمد صادق، نعمانی پریس، دہلی، ۱۹۸۱ء، ص۳۷۵

☆۹۴ ''داستان سے افسانے تک''، سیّد وقار عظیم، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۹۰ء، ص۱۸۱

☆۹۵ ''اُردو ادب کی تحریکیں''، محولہ بالا، ص۴۵۰

☆۹۶ ''خارستان''، سجّاد حیدر یلدرم، بحوالہ: ''ترقی پسند تحریک اور اُردو افسانہ''، محولہ بالا، ص۱۱۶

☆۹۷ ''اُردو ادب کی تحریکیں''، محولہ بالا، ص۴۵۵

☆۹۸ ''اُردو ادب کی تحریکیں''، محولہ بالا، ص۴۵۵

☆۹۹ ''جدید اُردو ادب اور نوجوانوں کے رجحانات''، علی سردار جعفری، مشمولہ: ''السیّدین'' (علی گڑھ کالج میگزین)، بحوالہ: ''ترقی پسند تحریک اور اُردو افسانہ''، محولہ بالا، ص۱۱۹

☆۱۰۰ ''جدید اُردو ادب اور نوجوانوں کے رجحانات''، محولہ بالا، بحوالہ: ''ترقی پسند تحریک اور اُردو افسانہ''، محولہ بالا، ص۱۱۶

☆۱۰۱ ''شہرِ نگاراں''، سبطِ حسن، مکتبۂ دانیال، کراچی، ص۴۰

☆۱۰۲ ''اُردو ادب میں رومانوی تحریک''، ڈاکٹر محمد حسن، کاروانِ ادب، ملتان، ۱۹۸۶ء، ص۶۰

☆۱۰۳ ''اُردو ادب کی تحریکیں''، محولہ بالا، ص۴۵۴

☆۱۰۴ ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، محولہ بالا، ص۱۳۸

☆۱۰۵ ''حجاب امتیاز علی کی دُنیا''، محمد خالد اختر، مشمولہ: ''تحریر''، میر پور خاص، علمی و ادبی کتابی سلسلہ: ۷، جنوری ۲۰۰۰ء، ص۴۱

☆۱۰۶ ''ہندو مسلم فسادات اور اُردو افسانہ''، محولہ بالا، ص۹۵

☆۱۰۷ ''ترقی پسند تحریک اور اُردو افسانہ''، محولہ بالا، ص۱۲۶

☆۱۰۸ ''ہندو مسلم فسادات اور اُردو افسانہ''، محولہ بالا، ص۹۵

☆۱۰۹ ''داستان سے افسانے تک''، محولہ بالا، ص۱۸۸

☆۱۱۰ ''ادبی تنقید''، ڈاکٹر محمد حسن، ص۱۱۴

☆۱۱۱ ''ترقی پسند تحریک اور اُردو افسانہ''، محولہ بالا، ص۱۱۷

☆۱۱۲ ''ہندو مسلم فسادات اور اُردو افسانہ''، محولہ بالا، ص۸۹

☆۱۱۳ ''ترقی پسند تحریک اور اُردو افسانہ''، محولہ بالا، ص۱۲۶

☆۱۱۴ ''فسادات کا اثر جذبات پر''، ڈاکٹر شائستہ اختر، مشمولہ: سہ ماہی ''نیا دور'' کراچی، فسادات نمبر، مارچ ۱۹۴۹ء، ص ۳۱

☆۱۱۵ ''ہم وحشی ہیں''، کرشن چندر، کتب پبلشرز، بمبئی، طبع دوم اپریل ۱۹۴۸ء، ص ۶۱-۶۱

☆۱۱۶ ''ہم وحشی ہیں''، محولہ بالا، ص ۶۲-۶۱

☆۱۱۷ ''ہم وحشی ہیں''، محولہ بالا، ص ۶۲

☆۱۱۸ ''ہم وحشی ہیں''، محولہ بالا، ص ۶۵

☆۱۱۹ ''ہم وحشی ہیں''، محولہ بالا، ص ۶۳

☆۱۲۰ ''ہم وحشی ہیں''، محولہ بالا، ص ۶۴-۶۳

☆۱۲۱ ''کرشن چندر، شخصیت اور فن''، محولہ بالا، ص ۴۶۶

☆۱۲۲ ''ہم وحشی ہیں''، محولہ بالا، ص ۸۴-۸۳

☆۱۲۳ ''ہم وحشی ہیں''، محولہ بالا، ص ۸۴

☆۱۲۴ ''ہم وحشی ہیں''، محولہ بالا، ص ۸۷-۸۶

☆۱۲۵ ''ہم وحشی ہیں''، محولہ بالا، ص ۹۱

☆۱۲۶ ''ہم وحشی ہیں''، محولہ بالا، ص ۹۲

☆۱۲۷ ''ہم وحشی ہیں''، محولہ بالا، ص ۹۳

☆۱۲۸ ''کرشن چندر، شخصیت اور فن''، محولہ بالا، ص ۴۷۶

☆۱۲۹ ''ہم وحشی ہیں''، محولہ بالا، ص ۹۵

☆۱۳۰ ''ہم وحشی ہیں''، محولہ بالا، ص ۹۹

☆۱۳۱ ''ہم وحشی ہیں''، محولہ بالا، ص ۱۰۱-۱۰۰

☆۱۳۲ ''ہم وحشی ہیں''، محولہ بالا، ص ۹۸

☆۱۳۳ ''ہم وحشی ہیں''، محولہ بالا، ص ۱۰۵

☆۱۳۴ ''ہم وحشی ہیں''، محولہ بالا، ص ۱۰۹

☆۱۳۵ ''ہم وحشی ہیں''، محولہ بالا، ص ۱۰۹

☆۱۳۶ ''ہم وحشی ہیں''، محولہ بالا، ص ۱۱۱

☆۱۳۷ ''ہم وحشی ہیں''، محولہ بالا، ص ۱۱۲-۱۱۱

☆۱۳۸ ''ہم وحشی ہیں''،محولہ بالا،ص۱۵-۱۱۴

☆۱۳۹ ''ہم وحشی ہیں''،محولہ بالا،ص۱۱۷

☆۱۴۰ ''ہم وحشی ہیں''،محولہ بالا،ص۱۱۷

☆۱۴۱ ''ہم وحشی ہیں''،محولہ بالا،ص۱۸-۱۱۷

☆۱۴۲ ''ہم وحشی ہیں''،محولہ بالا،ص۱۱۹

☆۱۴۳ ''کرشن چندر،شخصیت اور فن''،محولہ بالا،ص۴۸-۴۴۷

☆۱۴۴ ''ہم وحشی ہیں''،محولہ بالا،ص۱۲۱

☆۱۴۵ ''ہم وحشی ہیں''،محولہ بالا،ص۱۲۱

☆۱۴۶ ''ہم وحشی ہیں''،محولہ بالا،ص۱۲۱

☆۱۴۷ ''ہم وحشی ہیں''،محولہ بالا،ص۱۲۳

☆۱۴۸ ''روشنائی''،محولہ بالا،ص۱۳-۴۱۲

☆۱۴۹ ''روشنائی''،محولہ بالا،ص۱۳-۴۱۲

☆۱۵۰ ''ہم وحشی ہیں''،محولہ بالا،ص۴۸-۲۴۷

☆۱۵۱ ''معیار''،ممتاز شیریں،نیا ادارہ،لاہور،۱۹۶۳ء،ص۲۰۶

☆۱۵۲ ''ترقی پسند ادب''،محولہ بالا،ص۲۰۳

☆۱۵۳ ''ہم وحشی ہیں''،محولہ بالا،ص۳۳

☆۱۵۴ ''ہم وحشی ہیں''،محولہ بالا،ص۳۳

☆۱۵۵ ''ہم وحشی ہیں''،محولہ بالا،ص۳۵

☆۱۵۶ ''ہم وحشی ہیں''،محولہ بالا،ص۳۵

☆۱۵۷ ''ہم وحشی ہیں''،محولہ بالا،ص۳۷

☆۱۵۸ ''ہم وحشی ہیں''،محولہ بالا،ص۳۹

☆۱۵۹ ''ہم وحشی ہیں''،محولہ بالا،ص۳۹-۳۸

☆۱۶۰ ''ہم وحشی ہیں''،محولہ بالا،ص۴۱

☆۱۶۱ ''ہم وحشی ہیں''،محولہ بالا،ص۴۲

☆۱۶۲ ''ہم وحشی ہیں''،محولہٗ بالا،ص۲۳

☆۱۶۳ ''ہم وحشی ہیں''،محولہٗ بالا،ص۲۶

☆۱۶۴ ''یزید''،سعادت حسن منٹو،مکتبۂ شعروادب،لاہور،۱۹۹۱ء،ص۲۴

☆۱۶۵ ''یزید''،محولہٗ بالا،ص۲۵

☆۱۶۶ ''یزید''،محولہٗ بالا،ص۲۵

☆۱۶۷ ''یزید''،محولہٗ بالا،ص۲۹

☆۱۶۸ ''یزید''،محولہٗ بالا،ص۳۱

☆۱۶۹ ''یزید''،محولہٗ بالا،ص۳۲

☆۱۷۰ ''یزید''،محولہٗ بالا،ص۳۳

☆۱۷۱ ''گڈریا''،اشفاق احمد،مشمولہ:''ظلمتِ نیم روز''،ممتاز شیریں،مرتبہ: آصف فرخی،نفیس اکیڈمی،کراچی،۱۹۹۰ء،ص۳۷۵

☆۱۷۲ ''گڈریا''،مشمولہ:''ظلمتِ نیم روز''،محولہٗ بالا،ص۳۸۶

☆۱۷۳ ''گڈریا''،مشمولہ:''ظلمتِ نیم روز''،محولہٗ بالا،ص۴۱۱

☆۱۷۴ ''گڈریا''،مشمولہ:''ظلمتِ نیم روز''،محولہٗ بالا،ص۴۱۴

☆۱۷۵ ''گڈریا''،مشمولہ:''ظلمتِ نیم روز''،محولہٗ بالا،ص۴۱۴

☆۱۷۶ ''خواجہ احمد عبّاس کے شاہ کار افسانے''،مرتبہ: شفیق الرحمٰن،ادبی ستون،لاہور،۱۹۹۱ء،ص۳۰

☆۱۷۷ ''خواجہ احمد عبّاس کے شاہ کار افسانے''،محولہٗ بالا،ص۳۲

☆۱۷۸ ''خواجہ احمد عبّاس کے شاہ کار افسانے''،محولہٗ بالا،ص۴۱

☆۱۷۹ ''خواجہ احمد عبّاس کے شاہ کار افسانے''،محولہٗ بالا،ص۴۳

☆۱۸۰ ''خواجہ احمد عبّاس کے شاہ کار افسانے''،محولہٗ بالا،ص۴۳

☆۱۸۱ ''پاکستان سے ہندوستان تک''،مہندر ناتھ،مکتبۂ سلطانی،بمبئی،طبعِ اوّل مئی ۱۹۴۹ء،ص۱۷

☆۱۸۲ ''پاکستان سے ہندوستان تک''،محولہٗ بالا،ص۱۷

☆۱۸۳ ''پاکستان سے ہندوستان تک''،محولہٗ بالا،ص۶۷

☆۱۸۴ ''پاکستان سے ہندوستان تک''،محولہٗ بالا،ص۷۳

☆۱۸۵ ''تیسرا آدمی''،شوکت صدیقی،ص۸۵

☆۱۸۶ ''تیسرا آدمی''،محولہٗ بالا،ص ۸۶

☆۱۸۷ ''تیسرا آدمی''،محولہٗ بالا،ص ۸۷

☆۱۸۸ ''حاشیہ آرائی''،محمد حسن عسکری،مشمولہ:''سیاہ حاشیے''،سعادت حسن منٹو،مکتبہ شعروادب،لاہور،سنہ ندارد،ص ۱۶

☆۱۸۹ ''ترقی پسند تحریک اور اُردو افسانہ''،محولہٗ بالا،ص ۲۲۴

☆۱۹۰ ''سعادت حسن منٹو''،انیس ناگی،فیروز سنز،لاہور،۱۹۸۹ء،ص ۶۵

☆۱۹۱ ''سیاہ حاشیے''،محولہٗ بالا،ص ۵۵

☆۱۹۲ ''سیاہ حاشیے''،محولہٗ بالا،ص ۲۱

☆۱۹۳ ''سیاہ حاشیے''،محولہٗ بالا،ص ۲۱

☆۱۹۴ ''سیاہ حاشیے''،محولہٗ بالا،ص ۲۲

☆۱۹۵ ''سیاہ حاشیے''،محولہٗ بالا،ص ۲۳

☆۱۹۶ ''سیاہ حاشیے''،محولہٗ بالا،ص ۳۴

☆۱۹۷ ''سیاہ حاشیے''،محولہٗ بالا،ص ۳۴

☆۱۹۸ ''سیاہ حاشیے''،محولہٗ بالا،ص ۳۶

☆۱۹۹ ''سیاہ حاشیے''،محولہٗ بالا،ص ۴۱

☆۲۰۰ ''سیاہ حاشیے''،محولہٗ بالا،ص ۴۲

☆۲۰۱ ''سیاہ حاشیے''،محولہٗ بالا،ص ۴۳

☆۲۰۲ ''سیاہ حاشیے''،محولہٗ بالا،ص ۴۵

☆۲۰۳ ''سیاہ حاشیے''،محولہٗ بالا،ص ۴۷

☆۲۰۴ ''سیاہ حاشیے''،محولہٗ بالا،ص ۴۸

☆۲۰۵ ''سیاہ حاشیے''،محولہٗ بالا،ص ۵۱

☆۲۰۶ ''سیاہ حاشیے''،محولہٗ بالا،ص ۵۱

☆۲۰۷ ''سیاہ حاشیے''،محولہٗ بالا،ص ۵۲

☆۲۰۸ ''سیاہ حاشیے''،محولہٗ بالا،ص ۵۳

☆۲۰۹ ''سیاہ حاشیے''،محولہٗ بالا،ص ۵۴

☆۲۱۰ ''سیاہ حاشیے''،محولۂ بالا،ص۵۵

☆۲۱۱ ''سیاہ حاشیے''،محولۂ بالا،ص۵۵

☆۲۱۲ ''سیاہ حاشیے''،محولۂ بالا،ص۵۸

☆۲۱۳ ''سیاہ حاشیے''،محولۂ بالا،ص۵۹

☆۲۱۴ ''سیاہ حاشیے''،محولۂ بالا،ص۶۰

☆۲۱۵ ''سیاہ حاشیے''،محولۂ بالا،ص۶۱

☆۲۱۶ ''سیاہ حاشیے''،محولۂ بالا،ص۶۲

☆۲۱۷ ''سیاہ حاشیے''،محولۂ بالا،ص۶۳

☆۲۱۸ ''بھاگ اِن بردہ فروشوں سے''،رامانند ساگر،مشمولہ:سہ ماہی ''ذہنِ جدید''نئی دہلی،(فسادات کے افسانے: تجزیوں کے ساتھ)،جلد:۴،شمارہ:۱۴،ص۹۰-۸۹

☆۲۱۹ ''بھاگ اِن بردہ فروشوں سے''مشمولہ:سہ ماہی ''ذہنِ جدید''،جلد:۴،شمارہ:۱۴،محولۂ بالا،ص۹۰

☆۲۲۰ ''بھاگ اِن بردہ فروشوں سے''مشمولہ:سہ ماہی ''ذہنِ جدید''،جلد:۴،شمارہ:۱۴،محولۂ بالا،ص۹۲

☆۲۲۱ ''بھاگ اِن بردہ فروشوں سے''مشمولہ:سہ ماہی ''ذہنِ جدید''،جلد:۴،شمارہ:۱۴،محولۂ بالا،ص۹۳

☆۲۲۲ ''بھاگ اِن بردہ فروشوں سے''مشمولہ:سہ ماہی ''ذہنِ جدید''،جلد:۴،شمارہ:۱۴،محولۂ بالا،ص۹۳

☆۲۲۳ ''بھاگ اِن بردہ فروشوں سے''مشمولہ:سہ ماہی ''ذہنِ جدید''،جلد:۴،شمارہ:۱۴،محولۂ بالا،ص۹۳

☆۲۲۴ ''بھاگ اِن بردہ فروشوں سے''مشمولہ:سہ ماہی ''ذہنِ جدید''،جلد:۴،شمارہ:۱۴،محولۂ بالا،ص۹۳

☆۲۲۵ ''بھاگ اِن بردہ فروشوں سے''مشمولہ:سہ ماہی ''ذہنِ جدید''،جلد:۴،شمارہ:۱۴،محولۂ بالا،ص۹۴

☆۲۲۶ ''نمرود کی خدائی''،سعادت حسن منٹو،نیا ادارہ،لاہور،طبعِ اوّل،ص۱۱۰

☆۲۲۷ ''نمرود کی خدائی''،محولۂ بالا،ص۱۱۳

☆۲۲۸ ''نمرود کی خدائی''،محولۂ بالا،ص۱۱۴

☆۲۲۹ ''نمرود کی خدائی''،محولۂ بالا،ص۱۱۴

☆۲۳۰ ''نمرود کی خدائی''،محولۂ بالا،ص۶۱

☆۲۳۱ ''نمرود کی خدائی''،محولۂ بالا،ص۶۶

☆۲۳۲ ''نمرود کی خدائی''،محولۂ بالا،ص۶۷

☆۲۳۳ ''نمرود کی خدائی''، محولۂ بالا، ص۹۳

☆۲۳۴ ''نمرود کی خدائی''، محولۂ بالا، ص۹۵

☆۲۳۵ ''نمرود کی خدائی''، محولۂ بالا، ص۹۵

☆۲۳۶ ''نمرود کی خدائی''، محولۂ بالا، ص۹۶

☆۲۳۷ ''خالی بوتلیں، خالی ڈبّے''، سعادت حسن منٹو، مکتبۂ شعروادب، لاہور، سنہ ندارد، ص۴۷

☆۲۳۸ ''پاکستان سے ہندوستان تک''، محولۂ بالا، ص۱۸۴

☆۲۳۹ ''پاکستان سے ہندوستان تک''، محولۂ بالا، ص۱۹۹

☆۲۴۰ ''پاکستان سے ہندوستان تک''، محولۂ بالا، ص۲۰۲

☆۲۴۱ ''پاکستان سے ہندوستان تک''، محولۂ بالا، ص۲۰۶

☆۲۴۲ ''پہلا پتھر''، بلونت سنگھ، مکتبۂ جدید، لاہور، طبعِ اوّل دسمبر ۱۹۵۹ء، ص۴۰۳

☆۲۴۳ ''پہلا پتھر''، محولۂ بالا، ص۴۰۷

☆۲۴۴ ''پہلا پتھر''، محولۂ بالا، ص۱۴۹

☆۲۴۵ ''پہلا پتھر''، محولۂ بالا، ص۱۵۵اور ص۱۵۳

☆۲۴۶ ''پہلا پتھر''، محولۂ بالا، ص۱۵۶

☆۲۴۷ ''پہلا پتھر''، محولۂ بالا، ص۱۸۷

☆۲۴۸ ''پہلا پتھر''، محولۂ بالا، ص۱۸۸

☆۲۴۹ ''پہلا پتھر''، محولۂ بالا، ص۱۸۷

☆۲۵۰ ''راتوں کا شہر''، شوکت صدّیقی، رکتاب پبلیکیشنز، کراچی، طبعِ سوم مارچ ۱۹۸۹ء، ص۶۶

☆۲۵۱ ''راتوں کا شہر''، محولۂ بالا، ص۶۶-۶۵

☆۲۵۲ ''راتوں کا شہر''، محولۂ بالا، ص۶۶

☆۲۵۳ ''راتوں کا شہر''، محولۂ بالا، ص۶۶

☆۲۵۴ ''راتوں کا شہر''، محولۂ بالا، ص۶۶

☆۲۵۵ ''راتوں کا شہر''، محولۂ بالا، ص۷۵

☆۲۵۶ ''راتوں کا شہر''، محولۂ بالا، ص۷۶

☆۲۵۷ ’’ہم وحشی ہیں‘‘ ،محولۂ بالا ،ص ۴۷

☆۲۵۸ ’’ہم وحشی ہیں‘‘ ،محولۂ بالا ،ص۵۰-۴۹

☆۲۵۹ ’’خالی بوتلیں، خالی ڈبے‘‘ ،محولۂ بالا ،ص۲۴

☆۲۶۰ ’’خالی بوتلیں، خالی ڈبے‘‘ ،محولۂ بالا ،ص ۲۷

☆۲۶۱ ’’خالی بوتلیں، خالی ڈبے‘‘ ،محولۂ بالا ،ص۳۴-۳۳

☆۲۶۲ ’’خالی بوتلیں، خالی ڈبے‘‘ ،محولۂ بالا ،ص۳۴

☆۲۶۳ ’’خالی بوتلیں، خالی ڈبے‘‘ ،محولۂ بالا ،ص۳۴

☆۲۶۴ ’’خالی بوتلیں، خالی ڈبے‘‘ ،محولۂ بالا ،ص۲۴-۲۳

☆۲۶۵ ’’یزید‘‘ ،محولۂ بالا ،ص۳۴-۳۵

☆۲۶۶ ’’یزید‘‘ ،محولۂ بالا ،ص ۳۷

☆۲۶۷ ’’یزید‘‘ ،محولۂ بالا ،ص۴۳

☆۲۶۸ ’’یزید‘‘ ،محولۂ بالا ،ص۴۵-۴۴

☆۲۶۹ ’’یزید‘‘ ،محولۂ بالا ،ص۴۶

☆۲۷۰ ’’یزید‘‘ ،محولۂ بالا ،ص ۴۷

☆۲۷۱ ’’یزید‘‘ ،محولۂ بالا ،ص ۴۷

☆۲۷۲ ’’یزید‘‘ ،محولۂ بالا ،ص ۴۷

☆۲۷۳ ’’یزید‘‘ ،محولۂ بالا ،ص۴۹

☆۲۷۴ ’’یزید‘‘ ،محولۂ بالا ،ص۵۰

☆۲۷۵ ’’یزید‘‘ ،محولۂ بالا ،ص۵۱

☆۲۷۶ ’’خالی بوتلیں، خالی ڈبے‘‘ ،محولۂ بالا ،ص ۶۱

☆۲۷۷ ’’خالی بوتلیں، خالی ڈبے‘‘ ،محولۂ بالا ،ص ۶۱

☆۲۷۸ ’’جڑیں‘‘ ،عصمت چغتائی ،مشمولہ: ’’ظلمتِ نیم روز‘‘ ،محولۂ بالا ،ص ۴۴۷

☆۲۷۹ ’’جڑیں‘‘ ،عصمت چغتائی ،مشمولہ: ’’ظلمتِ نیم روز‘‘ ،محولۂ بالا ،ص ۴۴۶

☆۲۸۰ ’’جڑیں‘‘ ،عصمت چغتائی ،مشمولہ: ’’ظلمتِ نیم روز‘‘ ،محولۂ بالا ،ص ۴۵۰

☆۲۸۱ ''جڑیں''،عصمت چغتائی،مشمولہ:''ظلمتِ نیم روز''،محولۂ بالا،ص۴۵۲

☆۲۸۲ ''جڑیں''،عصمت چغتائی،مشمولہ:''ظلمتِ نیم روز''،محولۂ بالا،ص۴۵۱

☆۲۸۳ ''جڑیں''،عصمت چغتائی،مشمولہ:''ظلمتِ نیم روز''،محولۂ بالا،ص۵۳-۴۵۲

☆۲۸۴ ''جڑیں''،عصمت چغتائی،مشمولہ:''ظلمتِ نیم روز''،محولۂ بالا،ص۴۵۳

☆۲۸۵ ''جڑیں''،عصمت چغتائی،مشمولہ:''ظلمتِ نیم روز''،محولۂ بالا،ص۵۵-۴۵۴

☆۲۸۶ ''احمد ندیم قاسمی اور اُردو افسانہ''،اسلوب احمد انصاری،مشمولہ:ماہ نامہ''افکار''کراچی،احمد ندیم قاسمی نمبر، جنوری فروری۱۹۷۵ء،ص۳۱۸

☆۲۸۷ ''پرمیشر سنگھ''،احمد ندیم قاسمی،مشمولہ:سہ ماہی''ذہنِ جدید''،جلد:۴،شمارہ:۱۴،محولۂ بالا،ص۶۴

☆۲۸۸ ''پرمیشر سنگھ''،احمد ندیم قاسمی،مشمولہ:سہ ماہی''ذہنِ جدید''،جلد:۴،شمارہ:۱۴،محولۂ بالا،ص۶۵

☆۲۸۹ ''پرمیشر سنگھ''،احمد ندیم قاسمی،مشمولہ:سہ ماہی''ذہنِ جدید''،جلد:۴،شمارہ:۱۴،محولۂ بالا،ص۶۶

☆۲۹۰ ''پرمیشر سنگھ''،احمد ندیم قاسمی،مشمولہ:سہ ماہی''ذہنِ جدید''،جلد:۴،شمارہ:۱۴،محولۂ بالا،ص۷۰

☆۲۹۱ ''پرمیشر سنگھ''،احمد ندیم قاسمی،مشمولہ:سہ ماہی''ذہنِ جدید''،جلد:۴،شمارہ:۱۴،محولۂ بالا،ص۶۸-۶۷

☆۲۹۲ ''پرمیشر سنگھ''،احمد ندیم قاسمی،مشمولہ:سہ ماہی''ذہنِ جدید''،جلد:۴،شمارہ:۱۴،محولۂ بالا،ص۷۱

☆۲۹۳ ''پرمیشر سنگھ''،احمد ندیم قاسمی،مشمولہ:سہ ماہی''ذہنِ جدید''،جلد:۴،شمارہ:۱۴،محولۂ بالا،ص۷۱

☆۲۹۴ ''پرمیشر سنگھ''،احمد ندیم قاسمی،مشمولہ:سہ ماہی''ذہنِ جدید''،جلد:۴،شمارہ:۱۴،محولۂ بالا،ص۷۳

☆۲۹۵ ''پرمیشر سنگھ''،احمد ندیم قاسمی،مشمولہ:سہ ماہی''ذہنِ جدید''،جلد:۴،شمارہ:۱۴،محولۂ بالا،ص۷۴

☆۲۹۶ ''پرمیشر سنگھ''،احمد ندیم قاسمی،مشمولہ:سہ ماہی''ذہنِ جدید''،جلد:۴،شمارہ:۱۴،محولۂ بالا،ص۷۴

☆۲۹۷ ''پرمیشر سنگھ''،احمد ندیم قاسمی،مشمولہ:سہ ماہی''ذہنِ جدید''،جلد:۴،شمارہ:۱۴،محولۂ بالا،ص۷۴

☆۲۹۸ ''پہلا پتھر''،محولۂ بالا،ص۱۳۴

☆۲۹۹ ''پہلا پتھر''،محولۂ بالا،ص۱۴۱

☆۳۰۰ ''پہلا پتھر''،محولۂ بالا،ص۴۴-۱۴۳

☆۳۰۱ ''خواجہ احمد عبّاس کے شاہ کار افسانے''،محولۂ بالا،ص۹۹

☆۳۰۲ ''خواجہ احمد عبّاس کے شاہ کار افسانے''،محولۂ بالا،ص۱۰۰

☆۳۰۳ ''رام لعل کے منتخب افسانے''،رام لعل،سیمانت پرکاشن،نئی دہلی،۱۹۹۳ء،ص۶۹

☆۳۰۴ ''رام لعل کے منتخب افسانے''،محولہ بالا،ص ۷۰

☆۳۰۵ ''رام لعل کے منتخب افسانے''،محولہ بالا،ص ۷۱

☆۳۰۶ ''رام لعل کے منتخب افسانے''،محولہ بالا،ص ۷۳

☆۳۰۷ ''رام لعل کے منتخب افسانے''،محولہ بالا،ص ۷۳

☆۳۰۸ ''شکرگزار آنکھیں''،حیات اللہ انصاری،مشمولہ:سہ ماہی''ذہنِ جدید''،جلد:۴،شمارہ:۱۴،محولہ بالا،ص ۴۱

☆۳۰۹ ''شکرگزار آنکھیں''،حیات اللہ انصاری،مشمولہ:سہ ماہی''ذہنِ جدید''،جلد:۴،شمارہ:۱۴،محولہ بالا،ص ۴۳

☆۳۱۰ ''شکرگزار آنکھیں''،حیات اللہ انصاری،مشمولہ:سہ ماہی''ذہنِ جدید''،جلد:۴،شمارہ:۱۴،محولہ بالا،ص ۴۴

☆۳۱۱ ''شکرگزار آنکھیں''،حیات اللہ انصاری،مشمولہ:سہ ماہی''ذہنِ جدید''،جلد:۴،شمارہ:۱۴،محولہ بالا،ص ۴۴

☆۳۱۲ ''شکرگزار آنکھیں''،حیات اللہ انصاری،مشمولہ:سہ ماہی''ذہنِ جدید''،جلد:۴،شمارہ:۱۴،محولہ بالا،ص ۴۴-۴۳

☆۳۱۳ ''شکرگزار آنکھیں''،حیات اللہ انصاری،مشمولہ:سہ ماہی''ذہنِ جدید''،جلد:۴،شمارہ:۱۴،محولہ بالا،ص ۴۵

☆۳۱۴ ''شکرگزار آنکھیں''،حیات اللہ انصاری،مشمولہ:سہ ماہی''ذہنِ جدید''،جلد:۴،شمارہ:۱۴،محولہ بالا،ص ۴۶

☆۳۱۵ ہفت روزہ''پرچمِ ہند''دہلی،۳/مارچ ۱۹۶۸ء،بحوالہ:''منٹونامہ''،جگدیش چندر ودھاون،
ناشر:جگدیش چندر ودھاون،دہلی،۱۹۸۹ء،ص ۵۰۱-۵۰۰

☆۳۱۶ ''چغد''(دیباچہ)،سعادت حسن منٹو،مکتبۂ شعروادب،لاہور،سنہ ندارد،ص ۱۷۳

☆۳۱۷ ''نمرود کی خدائی''،محولہ بالا،ص ۱۰

☆۳۱۸ ''نمرود کی خدائی''،محولہ بالا،ص ۱۱

☆۳۱۹ ''نمرود کی خدائی''،محولہ بالا،ص ۱۲-۱۱

☆۳۲۰ ''معیار''،محولہ بالا،ص ۱۷۳

☆۳۲۱ ''منٹونوری نہ ناری''،ممتاز شیریں،مرتبہ:آصف فرخی،مکتبۂ اسلوب،کراچی،۱۹۸۵ء،ص ۱۲۵

☆۳۲۲ ''پھندنے''،سعادت حسن منٹو،مکتبۂ شعروادب،لاہور،دسمبر ۱۹۷۵ء،ص ۱۱-۱۰

☆۳۲۳ ''پھندنے''،محولہ بالا،ص ۸

☆۳۲۴ ''پھندنے''،محولہ بالا،ص ۸

☆۳۲۵ ''پھندنے''،محولہ بالا،ص ۹-۸

☆۳۲۶ ''پھندنے''،محولہ بالا،ص ۱۱-۹

☆۳۲۷ ''پھندنے''،محولہ بالا،ص ۱۱

☆۳۲۸ ''منٹو کے بہترین افسانے''،مرتبہ :اطہر پرویز،چودھری اکیڈمی،لاہور،سنہ ندارد،ص ۲۱۷

☆۳۲۹ ''پھندنے''،محولہ بالا،ص ۱۶

☆۳۳۰ ''پھندنے''،محولہ بالا،ص ۱۵

☆۳۳۱ ''پھندنے''،محولہ بالا،ص ۱۷

☆۳۳۲ ''پھندنے''،محولہ بالا،ص ۲۰

☆۳۳۳ ''پھندنے''،محولہ بالا،ص ۱۸

☆۳۳۴ ''پھندنے''،محولہ بالا،ص ۱۹-۱۸

☆۳۳۵ ''پھندنے''،محولہ بالا،ص ۲۰-۱۹

☆۳۳۶ ''برقعے''،سعادت حسن منٹو،ظفر برادرز،لاہور،۱۹۵۵ء،ص ۳۸

☆۳۳۷ ''برقعے''،محولہ بالا،ص ۴۰

☆۳۳۸ ''یزید''،محولہ بالا،ص ۸

☆۳۳۹ ''یزید''،محولہ بالا،ص ۱۲

☆۳۴۰ ''یزید''،محولہ بالا،ص ۱۳

☆۳۴۱ ''یزید''،محولہ بالا،ص ۲۱

☆۳۴۲ ''لاجونتی''،راجندر سنگھ بیدی،نیا ادارہ،لاہور،طبعِ دوم ۱۹۸۶ء،ص ۱۲۴

☆۳۴۳ ''لاجونتی''،محولہ بالا،ص ۳۰-۱۲۹

☆۳۴۴ ''لاجونتی''،محولہ بالا،ص ۴۲-۱۴۱

☆۳۴۵ ''بیدی نامہ''،شمس الحق عثمانی،مکتبۂ جامعہ،نئی دہلی،ص ۲۳۸

☆۳۴۶ ''رام لعل کے منتخب افسانے''،محولہ بالا،ص ۴۵

☆۳۴۷ ''رام لعل کے منتخب افسانے''،محولہ بالا،ص ۴۵

☆۳۴۸ ''رام لعل کے منتخب افسانے''،محولہ بالا،ص ۵۱

☆۳۴۹ ''رام لعل کے منتخب افسانے''،محولہ بالا،ص ۵۱

☆۳۵۰ ''اندھیرا اور اندھیرا''،شوکت صدیقی،رکتاب پبلشرز،کراچی،۱۹۸۷ء،ص ۱۷۱

❁❁❁

بابِ چہارم

اُردو ناول پر فسادات کے اثرات

باب چہارم

اُردو ناول پر فسادات کے اثرات

[پلاٹ، فضا اور کرداروں کا تجزیہ]

ادب صرف ایک لطیف ذریعۂ اظہار ہی نہیں، بلکہ تاریخ کا آئینہ دار بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم اُردو ادب کی کسی صنف کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ ہمارے لیے صرف تفریح کا سامان نہیں کرتی، بلکہ اس کے ذریعے ہمیں تاریخی، تہذیبی اور سماجی شعور بھی حاصل ہوتا ہے۔

تقسیمِ ہند، ہندو مسلم فسادات اور ہجرت ۱۹۴۷ء کے اہم واقعات ہیں۔ یہ واقعات بہت سے حادثات کا باعث بنے، جس سے معاشرے میں بہت سی تبدیلیاں آئیں۔

تقسیمِ ہند سے بہت سے سیاسی رہنما اور عام لوگ متفق نہ تھے اور بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو اتنے بڑے فیصلے ہی سے بے خبر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کی تقسیم کا اعلان ہوا تو ہر طرف ہلچل اور افراتفری مچ گئی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں جو نفرت چھپی ہوئی تھی وہ سامنے آ گئی، اور دونوں نے ایک دوسرے کو بے دردی سے قتل کرنے، گھروں کو آگ لگانے یا ایک دوسرے کی جائیدادوں پر قبضہ کرنے میں کوئی عار محسوس نہ کیا۔ جو لوگ قتل ہونے یا اغوا ہونے سے بچ گئے انھیں ہجرت کے دوران ہر لمحے قتل ہونے، لٹ جانے یا اغوا ہو جانے کا دھڑکا لگا رہا، خواتین کی حالت مردوں سے بھی بدتر تھی۔ موت سے زیادہ انھیں بے آبرو ہونے کا خطرہ تھا۔

غرض یہ کہ معاشرے کے تمام افراد چاہے ان کا تعلق کسی بھی طبقے سے ہو ۱۹۴۷ء کے حادثات سے بچ نہ سکے۔

اتنی بڑی قومی، سیاسی، سماجی اور جغرافیائی تبدیلی کو عوام کی طرح ہمارے ادیبوں نے محسوس کیا اور فسادات کے موضوع پر افسانہ نگاروں کے بعد ناول نگاروں نے خصوصی توجہ دی، اور بہت سے ایسے ناول تخلیق کیے جن میں فسادات، ہجرت خواتین کی بے حرمتی، عزیزوں اور رشتے داروں کے بچھڑ جانے کا ذکر کیا ہے۔ مختلف حادثوں کے نتیجے میں ہونے والی نفسیاتی الجھنوں

اور مہاجرین کی شخصیت کے بگڑ جانے اور نئے ملک کے نئے مسائل وغیرہ ایسے اہم مسائل ہیں جن سے ناول نگاروں نے اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ ناول میں فسادات کے موضوع کے ساتھ ہی اس کے پلاٹ، کردار اور فضا پر بھی اس کے اثرات پڑے۔

فسادات کے موضوع پر لکھے گئے ناولوں کے پلاٹ ۱۹۴۷ء کے اہم واقعات کو مدِ نظر رکھ کر مرتب کیے گئے ہیں۔ ناول کے آغاز یا کچھ واقعات گزرنے کے بعد ناول کا رخ فسادات، ہجرت یا مہاجرین کی نفسیاتی الجھنوں کی طرف مڑ جاتا ہے۔

ناول کی کہانی یا پلاٹ کو بنانے میں کردار سب سے اہم ہیں۔ فسادات کے موضوع پر لکھے گئے ناولوں کے کردار ہندو مسلم اختلافات کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ اختلافات کبھی قتل و غارت گری، کبھی اغوا، کبھی لوٹ مار اور کبھی ایک دوسرے کی خواتین کو بے آبرو کرنے کا باعث بنے۔ ناولوں کے کردار بھی انھی جھگڑوں میں مبتلا ہیں، اور ناول کی کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔

فسادات کے موضوع پر لکھے گئے ناولوں کی فضا بھی سوگوار ہے۔ ناول میں فسادات کے حوالے سے جس موضوع پر بھی لکھا گیا ہے اس کی فضا میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، بلکہ ہر کردار کسی نہ کسی حادثے کا شکار ہونے کی وجہ سے افسردہ ہے۔ جس کی وجہ سے ناول کی فضا گھٹی گھٹی اور افسردہ ہے۔

فسادات کے موضوع پر جن لوگوں نے ناول لکھے ان میں خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، کرشن چندر، رامانند ساگر، عصمت چغتائی وغیرہ شامل ہیں۔

''میرے بھی صنم خانے'' قرۃ العین حیدر کا پہلا ناول ہے جو ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ ناول کے تین حصے ہیں: پہلا حصہ ''چلی جائے موری نیا کنارے کنارے''، دوسرا حصہ ''دھنستے ہوئے ساحل'' اور تیسرا حصہ ''منزلِ لیلیٰ'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ اس ناول میں قرۃ العین نے اودھ کے نواب عرفان علی اور اس کے خاندان کے افراد کے، تقسیمِ ہند کے نتیجے میں آنے والے، خاندانی زوال کا ذکر کیا ہے۔ نواب عرفان علی کے علاوہ سیّد افتخار علی اور شمیم کے رسالے ''ملّتِ بیضا'' اور رخشندہ پی چوا اور ان کے ساتھیوں کے رسالے ''نیو ایرا'' کے ذریعے انھوں نے مسلم لیگ اور کانگریس کے اختلافات کو بیان کیا ہے۔

رامانند ساگر کا ناول ''اور انسان مر گیا'' ۱۹۴۸ء میں لکھا گیا، اس ناول کے چار حصے ہیں: پہلے حصے کا عنوان ''سرخ فوارے''، دوسرے کا ''رقصِ شرر''، تیسرے کا ''میں بچ گیا'' اور چوتھے حصے کا عنوان ''اور انسان مر گیا'' ہے۔

پہلے حصے میں رامانند ساگر نے فسادات کی دہشت اور خوف، دوسرے میں ہندو مسلم فسادات اور قتل و غارت گری، تیسرے میں اجاگر سنگھ کا اپنے گھر والوں کے دشمنوں کے مارنے سے پہلے قتل کر دینے اور آخر میں دشمن سے مقابلے نہ کر سکنے کے غم میں پاگل ہو جانے کا ذکر کیا ہے اور چوتھے حصے میں انسان کے حیوان بن جانے پر افسوس کیا ہے۔

''آگ کا دریا'' قرۃ العین حیدر کا مشہور ناول ہے جو ۱۹۵۹ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کا موضوع ماضی پرستی ہے۔ ناول کو انھوں نے چار مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ جس میں چمپا، کمال اور گوتم نیلمبر کے کردار کے ذریعے مختلف ادوار میں انسان

کے جذباتی اور تہذیبی معاملات میں ان کی کامیابیوں اور ناکامیوں کو بیان کیا ہے۔

تقسیمِ ہند کے حوالے سے قرۃ العین حیدر نے چمپا احمد، گوتم نیلمبر اور سیّد کمال کے کرداروں کے ذریعے ہندو مسلم اتحاد اور دو مشترکہ تہذیبوں کو بھی بیان کیا ہے جو تقسیم کے نتیجے میں قائم نہ رہ سکیں اور آخر میں گزرا ہوا وقت اور اس کی یادیں ان کرداروں کا قیمتی اثاثہ بن گئیں۔

کرشن چندر کا مختصر ناول ''غدار'' ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کے گیارہ ابواب ہیں۔ جس میں انھوں نے کہیں مسلمانوں اور کہیں ہندوؤں کو مظلوم دکھا کر یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نہ تو سارے ہندو ظالم تھے، اور نہ سارے مسلمان۔ ناول کے آخر میں انھوں نے ترقی پسند تحریک کا پروپیگنڈا کرنے کے لیے انسانیت کا درس دیا ہے اور اس دن کی اُمید کی ہے جب مختلف مذاہب اور اقوام کے لوگ صرف انسان بن کر سوچیں گے، اور تعصب اس دنیا سے ختم ہو جائے گا۔

فسادات کے سلسلے میں خدیجہ مستور کے ناول ''آنگن'' کو آدم جی ایوارڈ ملا۔ یہ ناول ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں خدیجہ مستور نے تقسیمِ ہند سے قبل ایک ہی خاندان کے مختلف افراد کے سیاسی نظریات میں جذبات کی شدّت اور باہمی اختلافات کو دکھایا گیا ہے۔ یہ افراد سیاسی معاملات میں اتنا مگن ہو گئے کہ انھیں اپنی گھریلو ذمّے داریوں کا احساس نہ تھا اور ان کے بچّے اپنے والدین کی محبت اور توجہ سے محرومیت کا شکار ہونے کی وجہ سے احساسِ کمتری کا شکار ہو گئے۔

عبداللہ حسین کا ناول ''اداس نسلیں'' بھی ۱۹۶۲ء میں لکھا گیا۔ ناول چار حصّوں پر مشتمل ہے پہلا حصّہ ''ہندوستان''، دوسرا ''برٹش انڈیا''، تیسرا ''بٹوارا'' اور چوتھا حصّہ ''اختتامیہ'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔

ان چار حصّوں میں عبداللہ حسین نے جنگِ عظیم اوّل، دوم، تحریکِ پاکستان، تقسیمِ ہند، ہجرت اور قیامِ پاکستان کے بعد کے حالات کو بیان کیا ہے۔

فسادات کے موضوع پر عصمت چغتائی نے بھی ایک ناول ''معصومہ'' لکھا جو ۱۹۶۲ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس ناول میں انھوں نے تقسیمِ ہند اور فسادات کے نتیجے میں معاشی مسائل کا شکار ہونے والے ایک خاندان کا ذکر کیا ہے۔ ''معصومہ'' ناول کا مرکزی کردار ہے جس نے غربت سے تنگ آ کر طوائف کا پیشہ اختیار کیا۔ معصومہ سے نیلوفر بننے تک معصومہ جن حالات سے گزری ان حالات نے ہمارے معاشرے کے بہت سے برائیوں اور صاحبِ حیثیت لوگوں کی اخلاقی کمزوریوں سے پردہ اُٹھایا ہے۔

بلونت سنگھ کا ناولٹ ''کالے کوس'' ۱۹۴۷ء کے فسادات سے متعلق لکھا گیا ہے۔ اس ناول میں بلونت سنگھ ایسے ہندو، سکھوں اور مسلمانوں کا ذکر کیا ہے جنھوں نے فسادات کے دنوں میں بھی ہندو، سکھ یا مسلم بن کر نہیں، بلکہ انسان بن کر سوچا اور ایک دوسرے کی جان، مال اور عزت کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔

مذکورہ بالا تمام ناولوں کو تفصیلی تجزیہ اگلے صفحات میں کیا گیا ہے۔

غدّار

''غدّار'' کرشن چندر کا مختصر ناول ہے جو فسادات کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔ فسادات کے حوالے سے انھوں نے ناول میں ہندو مسلم فسادات، قتل و غارت گری، لوٹ مار اور خواتین کی آبروریزی کے تکلیف دہ واقعات بیان کیے ہیں۔ یہ تمام حقائق ناول کے گیارہ ابواب میں بیان کیے گئے ہیں۔

اس ناول میں کرشن چندر نے غیر جانب داری سے کام لیا ہے وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو کہیں ظالم اور کہیں مظلوم دکھا کر یہ بات ثابت کرنا چاہ رہے ہیں کہ نہ ہندو ظالم تھے اور نہ مسلمان، بلکہ دونوں نے ایک دوسرے پر جو بھی ظلم کیا وہ ان کی تنگ نظری یا تعصب کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ وہ ایک نفسیاتی اور جذباتی ردِّعمل تھا۔

ناول میں بعض جگہ زندگی بچانے کے لیے یا پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے ایک ہی خاندان کے افراد کی خود غرضی اور بے حسی کو دکھایا گیا ہے۔

ناول اپنے موضوع، واقعات اور انجام ہر لحاظ سے منفرد ہے۔

کرشن چندر نے ناول میں مختصر واقعات کو منظر نگاری اور غیر ضروری تفصیلات سے بیان کیا ہے، لیکن ناول میں واقعات کی ترتیب اور سچائی کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ہم ناول کے پلاٹ کو اچھا کہہ سکتے ہیں۔

ناول چوں کہ فسادات کے موضوع پر ہے۔ اس لیے ناول کے بیش تر حصّے کی فضا سوگوار ہے کسی واقعے میں قتل و غارت گری، کہیں ہجرت کا کرب، کہیں کرداروں کی خود غرضی اور بے حسی اور بعض واقعات میں خواتین کے اغوا اور بے آبرو ہونے کے واقعات نے ناول کی فضا کو سوگوار اور اداس بنا دیا ہے۔

ناول میں ایک جگہ ایک بوڑھے کی بے بسی کی تصویر یوں کھینچی گئی ہے۔

> ...اس بڈھے کا مُنہ خوف سے کھلا تھا اور اوپر اٹھا ہوا ہاتھ ڈر اور التجا سے لرز رہا تھا۔ ☆۱
>
> ...وہ بھگدڑ مچی ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ ماں بیٹی کو بھول گئی اور بیٹی باپ کو اور باپ اپنی اولاد کو۔ جدھر جس کے سینگ سمائے... بھاگ کر چل دیا۔ ☆۲

بیج ناتھ ناول کا مرکزی کردار ہے ناول کی ساری کہانی اسی کردار کے ذریعے آگے بڑھتی ہے۔ باقی کرداروں کا اضافہ مختلف واقعات کے ذریعے ہوا ہے۔ ان کرداروں میں شاداں، میاں، پاروتی اور بلو وغیرہ شامل ہیں۔

ناول کا آغاز ۲/اگست ۱۹۴۷ء سے ہوا ہے۔ ناول کا کردار بیج ناتھ ''لالے گاؤں'' میں اپنے ننھیال آتا ہے۔ ملک کے حالات خراب ہونے کے باوجود ''لالے گاؤں'' کے حالات پرامن تھے۔ سکھ، ہندو اور مسلمان سبھی مل جل کر رہ رہے تھے۔ ''لالے گاؤں'' کے حالات پرامن ہونے کی وجہ سے آس پاس کے گاؤں کے لوگ بھی ''لالے گاؤں'' آگئے تھے، لیکن ایک

دن ''لالے گاؤں'' کے نمبردار کو چک تارہ کے نمبردار کی طرف سے دھمکی ملی:

پیر قلندر شاہ نے کہا کہ پندرہ اگست تک گاؤں میں جتنے ہندو جوان ہیں ان سب کو قتل کر دیا جائے۔ جتنی جوان عورتیں ہندوؤں کی یہاں اکٹھی ہو چکی ہیں...آس پاس کے علاقوں سے آ رہی ہے ان سب کو رکھ لیا جائے، البتہ بڈھے مردوں، عورتوں اور بچوں کو چھوڑ دیا جائے۔ ☆۳

شروع میں تو لالے گاؤں کے نمبردار اور گاؤں کے دوسرے مسلمانوں نے پیر قلندر شاہ کے خلاف احتجاج کیا اور ہندوؤں کو ہر طرح کا تحفظ دینے کا وعدہ کیا لیکن حالات اتنے بگڑے کے نمبردار سر بلند اپنا وعدہ نبھا نہ سکا۔

چک تارہ کے مسلمانوں نے لال گاؤں پر حملہ کر دیا۔ جس سے پورے گاؤں میں ہلچل مچ گئی۔

ان حالات میں بیج ناتھ کو شاداں نے اپنے بھائی کے ذریعے بحفاظت لاہور پہنچایا۔ لاہور جا کر بیج ناتھ کو پتے چلا کہ حالات خراب ہونے کی وجہ سے اس کے گھر والے لاہور میں بیج ناتھ کی ملاقات اپنے پرانے دوست ''میاں'' سے ہوئی جو اسے اپنے گھر لے گیا۔ میاں کے دوستوں کو اس بات پر سخت اعتراض ہوا کہ اس نے ایک ہندو کو اپنے گھر میں پناہ دے رکھی ہے۔ نتیجتاً وہ اس کے بچوں کو یرغمال بنا کر لے گئے اور انھیں چھوڑنے کی یہ شرط رکھی کہ وہ یا تو میاں کو قتل کر دے یا ان کے حوالے کر دے۔

ان حالات میں بھی میاں بیج ناتھ کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی کیفیت اور سوچ کو ناول میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''زندگی بھر کی دوستی پر خاک ڈال دوں؟ یہ انسانیت ہے؟'' ☆۴

ساتھیوں کے دباؤ، بیوی کی ناراضگی اور اولاد کی محبت کے سامنے میاں کو بیج ناتھ کی دوستی کو فراموش کرنا پڑا، اور وہ اسے لاہور اسٹیشن پر چھوڑ گیا، اور ایک مسلمان دوست کے مشورے پر وہ نارووال کے گاؤں میں چلا گیا۔

نارووال کے گاؤں ''سود کلاں'' میں بیج ناتھ کو اپنے گھر کے بچھڑے ہوئے تمام افراد مل گئے۔ بیج ناتھ نے انھیں ملک کے حالات سے آگاہ کیا اور ملک چھوڑنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کے گھر والوں کا خیال تھا کہ ملک کے حالات جلد ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔

''...اگر اس دھرتی پر پاکستان بنے گا تو ہم اسی دھرتی پر رہیں گے، اور اسی کا جس گائیں گے جیسا سات پشتوں سے کرتے چلے آئے ہیں۔'' ☆۵

اس گاؤں کے مسلمانوں نے بھی ان کے خیال کی تائید کی اور انھیں اس بات کا یقین دلایا کہ اگر سارے ملک کے حالات خراب ہو بھی گئے تو وہ اس گاؤں کے ہندوؤں پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔

کریما...مسکرا کر بولا ''بے فکر رہیے! جو فساد کرے گا ہم اس کی گردنیں مار دیں گے۔'' ☆۶

کچھ ہی دنوں کے بعد بیج ناتھ کے مزارعوں کریم خان اور اللہ داد نے بتایا:

''...اوپر سے حکم آیا ہے کہ لوٹ لو۔'' ☆ ۷

ان خطرناک حالات میں بھی بیج ناتھ کے دادا گاؤں چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک ایسا کرنا بزدلی تھا۔ نتیجتاً گھر کے آدھے افراد بیج ناتھ اور آدھے دادا کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔

...کچھ لوگ دادا کے حمایتی تھے، وہ کہتے تھے کہ یہ سب خون خرابہ، فساد چند دنوں کا ابال ہے، ٹھنڈا پڑ جائے گا...مگر میں اور میرا بڑا بھائی اور پتا جی جانے کے حق میں تھے۔'' ☆ ۸

اس واقعے کے اگلے ہی دن مسلمانوں نے بیج ناتھ کے گھر حملہ کر دیا۔ بیج ناتھ بھاگ کر کھیتوں میں چھپ گیا۔ تیسرے دن جب بھوک اور پیاس سے تنگ آ گیا تو جان کی پروا کیے بغیر کھیتوں سے نکل کر اپنے گھر چلا گیا۔ گھر کے تمام افراد غائب تھے۔ صرف دادا کی لاش موجود تھی۔

بیج ناتھ نے اپنے گھر والوں کی کمی شدّت سے محسوس کیا، اور ان کی ایک ایک چیز کو بہت محبت سے دیکھا، لیکن جلد ہی محبت پر بھوک غالب آ گئی، اور اس نے باورچی خانے میں جا کر باسی روٹیوں کو بہت شوق سے کھایا اور جو بچ گئیں اسے اپنے ساتھ لے گیا۔

اس موقع پر بیج ناتھ کی بے حسی قابلِ غور ہے:

''روٹی کھا کر میں نے پانی پیا۔ پھر آنگن سے گھر کی دہلیز تک آیا، دادا کی لاش پر سے چھلانگ لگا کر پہلے پہلے کھیتوں کے کنارے چلنے لگا۔'' ☆ ۹

فسادات کے دنوں میں بہت سے لوگ اس قسم کی بے حسی کا شکار ہوئے۔ اپنی زندگی کو بچانے اور پیٹ کی بھوک ختم کرنے کے لیے لوگ سب کچھ کرنے کو تیار تھے۔

بیج ناتھ کوٹلی سود کلاں سے راوی تک جانا چاہتا تھا۔ قافلے میں چوں کہ حملہ ہونے کا زیادہ خطرہ تھا۔ اس لیے اس نے تنہا سفر کرنا مناسب سمجھا۔

اس سفر کے دوران بیج ناتھ کو ایک بوڑھا سکھ ملا جسے اس کے بیٹے چھوڑ کر چلے گئے تھے اس نے بیج ناتھ کی منت سماجت کی کہ وہ اسے اُٹھا کر راوی کے کنارے تک لے جائے، لیکن اس نے اس ڈر سے بیج ناتھ کو بھاگنے میں دشواری ہوتی اس لیے بیج ناتھ ایسا مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

ناول میں ایک ایسی عورت کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ جس کے بچّوں کو اس کے شوہر نے قتل کر دیا تھا۔ اس نے اپنی بربادی کا قصہ سنایا:

''اس پر میرے گھر والے نے غصّے سے میری طرف دیکھا اور چھری نکال کر میرے تینوں بچّوں

کو ہلاک کر دیا۔ میں ڈر کے مارے بھاگی، اس نے زور سے چھری میری طرف پھینکی جو میری کمر میں جا لگی۔ قافلے والے چلے گئے۔ میں وہیں پڑے پڑے تڑپتی رہی، لیکن میری جان نہیں نکلی...ویرا تیرا بڑا بھلا ہوگا۔تو میری جان لے لے مجھے ختم کر دے۔'' ☆۱۰

بیج ناتھ اس عورت کی بددعائیں اور گالیاں سنتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

ناول میں قتل وغارت سے بے نیاز ایک بوڑھے کا بھی ذکر کیا ہے جو ہر طرف لاشوں کے ڈھیر کو دیکھ کر پریشان ہونے کے بجائے ان کی جیبوں سے پیسے نکالتا یا ان کے زیورات اور گھڑیاں وغیرہ اتار لیتا۔ کیوں کہ اس بوڑھے کا خیال تھا:

''...یہ لوگ تو مر ہی چکے ہیں۔ یہ روپے ان لوگوں کے کس کام کے؟ مسلمان آئیں گے اور ہماری دولت لے جائیں گے...یہ روپے...میری بیٹی کے جہیز کے کام آئیں گے۔'' ☆۱۱

راوی پار کرنے کے بعد بیج ناتھ ہندوستان کی سرحد میں پہنچ گیا۔ شرنارتھیوں کے کیمپ میں اسے اپنے خاندان کے بچھڑے ہوئے افراد مل گئے۔ اپنے گھر والوں سے اسے پتا چلا کہ اس کی بہن کو مسلمان اغوا کر کے لے گئے ہیں اور اس کے بیٹے کو بھی مسلمانوں نے قتل کر دیا ہے۔

فسادات اور ہجرت کے دوران اس قسم کے حادثے کئی لوگوں کے ساتھ پیش آئے۔ بیج ناتھ بھی اس قسم کے کئی حادثات دیکھ اور سن چکا تھا۔ اسے ان سے نفرت بھی محسوس ہوئی تھی، لیکن آج اس نے اپنی بہن اور بیٹے کا انتقام لینے کا ارادہ بھی کیا:

...اب تک مجھے اپنی روشن خیالی اور آزادروی پر بڑا ناز تھا، لیکن اپنے بچے کے قتل اور بہن کے اغوا کا قصہ سنتے ہی جیسے میرا خون ابل پڑا۔ میں وہیں بیٹھے بیٹھے مسلمانوں کو مغلظات سنانے لگا... میں خود ایک لمحے کے لیے حیران بھی ہوا۔ مگر پھر انتقام، غم اور غصّے کے جذبات کے ریلے میں میرے تمام اچھے خیالات خس وخاشاک کی طرح ہو گئے اور میں جوشِ انتقام میں دیوانہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ☆۱۲

انتقام کے ارادے سے جب بیج ناتھ گھر سے نکلا تو اسے ایک جگہ لوگوں کا ہجوم نظر آیا معلوم کرنے پر پتا چلا:

''...یہاں سیکس کا راشن ملتا ہے۔'' ☆۱۳

بہت سے ہندو ایک مسلمان لڑکی کی اجتماعی بے حرمتی کر رہے تھے، اور ان کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ اس وقت تک لڑکی کی بے حرمتی کریں گے جب تک وہ مر نہیں جاتی۔

بیج ناتھ بھی بے حرمتی کرنے والوں کی قطار میں کھڑا ہو گیا۔ اگرچہ بیج ناتھ اس وقت اپنے دل میں مسلمانوں کے لیے شدید نفرت اور انتقام کے جذبات رکھتا تھا، لیکن اس کے اندر کا انسان ابھی مرا نہیں تھا اس بات کا اندازہ اس اقتباس سے ہوتا ہے:

تھوڑی دیر تک کیو میں کھڑا رہا۔لوگ باری باری آگے بڑھتے گئے۔پھر بھی کیو بہت لمبا تھا...
کھڑے کھڑے میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔جیسے کوئی میرے دل کو مٹھی میں لے کر دھیرے
دھیرے مسل رہا ہو۔اس لڑکی کی چیخیں بڑی دردناک تھیں... میں نے اپنے جذبۂ انتقام کے
لیے اپنی بہن سروج کی معصوم صورت کا سہارا لینا چاہا مگر ہر بار سروج کی صورت پگھل جاتی تھی
اور پگھل کر اس مسلمان لڑکی کی صورت میں بدل جاتی تھی...میری روح کے ویرانوں میں جیسے
ازلی عورت کی پکار گونجنے لگی اور چیخ چیخ کر مدد مانگنے لگی۔☆۱۴

اور یوں بے بس اور مظلوم لڑکی کی چیخوں نے بیج ناتھ کے دل سے انتقام کی آگ بجھادی۔

ناول کے کردار بلو پہلوان نے ہر گھر کے ایک فرد کو مسلمانوں سے بدلہ لینے والے گروہ میں شامل کرنے کا منصوبہ بنایا۔جسے اس کے ہندو ساتھیوں نے بہت سراہا اور اس کام میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔بلو پہلوان نے بیج ناتھ کو اس گروہ میں شامل ہونے کے لیے کہا لیکن بیج ناتھ نے اس میں دل چسپی نہ لی تو بلو نے اسے بزدل سمجھا اور اس کے بارے میں رائے دی:

''ہاں! ہاں! تمھیں کیا؟...ایسے بزدل ہندوؤں نے تو پاکستان بنایا ہے۔ان کا باپ بھی
مر جائے تو کہیں گے ہمیں کیا؟'' ☆۱۵

بلو اور اس کے ساتھیوں کی خون خوار نظروں سے گھبرا کر بیج ناتھ ان کے گروہ میں شامل تو ہو گیا،لیکن قتل و غارت گری اور لوٹ مار اس کے بس کا کام نہ تھا۔اس موقع پر بیج ناتھ کے جذبات و احساسات کو ناول میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

...اس بڑھے کا مُنہ خوف سے کھلا تھا...اور جس نرمی اور شفقت اور التجا سے اس نے مجھ سے کہا!
''ناں! ناں! بیٹا۔ناں مجھے نہ مار!'' اس بڑھے سے بھی مجھے اپنا باپ یاد آ گیا،اور یکا یک میری
آنکھوں سے آنسو چھینے لگے...''او... باہمن،تُو کیا لڑے گا۔پرے ہٹ جا!غدّار!'' ☆۱۶

بیج ناتھ کو پیچھے ہٹا کر بلو پہلوان نے آگے بڑھ کر خنجر کے وار سے اس بوڑھے مسلمان کو مار دیا۔اس واقعے کے اگلے ہی دن بیج ناتھ نے اس بوڑھے کے بچّے کو پالنے کا ارادہ کیا اس مقصد کی تکمیل کے لیے اس نے جھوٹ کا سہارا لیا،اور پہرے دار کو یقین دلایا:

''یہ سانپ کا بچّہ ہے زندہ کیوں رہے!''
پہرے دار ذرا توقف سے مسکرایا اور بولا،''تم اسے لے جا سکتے ہو۔'' ☆۱۷

یہ جانتے ہوئے بھی کہ بہت سے ہندو اس بات پر اعتراض کریں گے کہ اس نے مسلمان بچّے کو پالا اور مسلمانوں کو اعتراض ہوگا کہ ایک مسلمان بچّے کو کوئی ہندو پال رہا ہے،لیکن بہت سے اندیشوں کے باوجود بیج ناتھ اپنے فیصلے پر قائم رہا۔

کرشن چندر نے اپنے خیالات کو بیج ناتھ کی سچ عمل اور انسان دوستی سے ظاہر کیا ہے جو ناول میں یوں پیش کیے گئے ہیں۔

> ...اس بچّے کو اپنے سینے سے لگائے اسے بھی زندہ رکھنا ہوگا...تاریکی کے گرتے ہوئے ملبے میں سے روشنی کی کرن کو ناخنوں سے کرید کرید کر نکالنا ہوگا اور اسے اپنے پر ہنسیں گے اور تھوکیں گے اور نفرت سے اپنا مُنہ پھیر لیں گے مگر مجھے اس زہر کو پی کر انسانیت کے وقار کی مشعل کو اپنے سینے میں فروزاں کیے اپنی منزل کی طرف بڑھنا ہوگا۔☆۱۸

ناول کا کردار بیج ناتھ نہ صرف ہندوستان اور پاکستان، بلکہ پوری دنیا میں امن وامان اور باہمی مساوات کا خواہش مند ہے وہ ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر پرامن اور خوش حال مستقبل کا خواب دیکھ رہا ہے۔ ناول کے آخری باب میں اسی خیال کو بار بار دہرایا گیا ہے۔

> اور پھر میرے دل میں اس زمانے کی یاد آئی جو ابھی آیا نہیں ہے، لیکن جو آنے والا ہے۔ جب ہندوستان ہوتے ہوئے بھی کوئی ہندوستان نہ ہوگا اور پاکستان ہوتے ہوئے بھی کوئی پاکستان نہ ہوگا۔ کوئی ایران نہ ہوگا اور کوئی افغانستان نہ ہوگا، اور کوئی امریکا نہ ہوگا اور کوئی روس نہ ہوگا، کوئی چین نہ ہوگا اور کوئی جاپان نہ ہوگا۔ جب یہ ساری دھرتی اس دنیا کے سارے انسانوں کے لیے ایک چھوٹا سا گاؤں بن جائے گی جس میں تمام انسان اپنی اپنی گلیوں میں رہتے ہوئے ایک دوسرے سے محبت اور الفت، ہمسائیگی اور آزادی اور برابری کا برتاو کرتے ہوئے امن چین سے رہیں گے۔☆۱۹

ڈاکٹر عبدالسّلام نے اس روشن خواب کو سراہتے ہوئے کہا:

> اس موقع پر بیج ناتھ جو تمنا کرتا ہے وہ خالص رومانی قسم کی ہے۔☆۲۰

کرشن چندر نے اس مختصر سے ناول میں فسادات کے دنوں کے بہت سے حقائق کو واضح کر دیا ہے اگرچہ بعض جگہ وہ متعصب نظر آتے ہیں لیکن جلد ہی وہ اس پر قابو پالیتے ہیں۔

مجموعی طور پر اس ناول میں فسادات کے دنوں میں انسانوں کے مختلف رویّوں کو پیش کرنا چاہ رہے ہیں، اور ان کے مختلف رویّوں اور واقعات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ نہ تو سارے مسلمان ظالم تھے اور نہ سارے ہندو۔ اس خیال کی تائید راز سنتو کھ سری نے اس طرح کی ہے:

> مصنّف کا زاویۂ نگاہ شروع سے آخر تک آفاقی (universal) ہے مصنف کے پیشِ نظر ساری انسانیت ہے۔ اس ناول کے ذریعے ساری انسانیت کو محبت اور اخوت اور خلوص اور تعاون،

بردباری اور وسیع الخیالی، مساوات اور آفاقی شہریت کا پیغام دیا گیا ہے۔☆۲۱

بلکہ بہت سے مسلمان ایسے تھے جنھوں نے اپنے ہندو ساتھیوں کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔

مسلمان کرداروں میں شاداں کا کردار مثبت رویّے کا حامل ہے۔ جس نے فسادات کے دنوں میں اپنے بھائی کی مدد سے اپنے ہندو عاشق بیج ناتھ کو بحفاظت اپنے گاؤں سے نکالا۔ شاداں کے علاوہ ''لالے گاؤں'' کے ہندوؤں اور سکھوں کو مسلمانوں نے اپنے حصّے میں آنے والے گاؤں میں بخوشی رکھنے کی کوشش کی، لیکن ان ہندوؤں اور سکھوں پر حملہ کرنے والا پیر قلندر شاہ اور اس کے ساتھی بھی مسلمان تھے۔

گاؤں ''سود کلاں'' کے ''کریما'' نے بھی اپنے گاؤں کے ہندوؤں اور سکھوں کو تحفظ دینے کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن انھیں ایسا کرنے سے روکنے والے بھی مسلمان تھے۔

اسی طرح ''میاں'' کا کردار بھی تعصب کے جذبے سے پاک ہے جس نے اپنے دوست ''بیج ناتھ کی برے وقت میں مدد کی۔

مسلمان کرداروں کے علاوہ بعض ہندو کردار بھی ایسے ہیں۔ جنھوں نے مسلمانوں کے ساتھ نیکی کا سلوک کیا۔ بیج ناتھ کا ایک لاوارث مسلمان بچّے کو پالنے کا عہد کرنا اور اپنی بہن سروج اور بیٹے کا انتقام لینے میں ناکام ہو جانا ان کی انسان دوستی کی اچھی مثال ہے۔

بلو پہلوان اور مسلمان لڑکی کی اجتماعی بے حرمتی کرنے والے ہندوان کے تعصب، مسلمانوں سے شدید نفرت اور جذبہ حیوانیت کو ظاہر کرتے ہیں۔

ان تمام خصوصیات کے علاوہ ناول میں جو چیز منفرد اور اعلیٰ ہے وہ اچھے اور پر امن دور کا خواب ہے۔ جب مذہب، قوم یا زبان کی وجہ سے پیدا ہونے والے جھگڑے اور اختلافات ختم ہو جائیں گے۔

میرے بھی صنم خانے

''میرے بھی صنم خانے'' قرۃ العین حیدر کا پہلا ناول ہے۔ اس ناول میں انھوں نے ۱۹۴۷ء کے فسادات کے نتیجے میں آنے والی الم ناک تبدیلیوں اور ہندو شرنارتھیوں کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔

ناول کے تین حصّے ہیں۔

پہلا حصّہ ''چلی جائے موری نیا کنارے کنارے'' میں انھوں نے ہندو مسلم مشترکہ کلچر کا بیان کیا ہے۔ یہ مشترکہ کلچر انھوں نے کنور عرفان کے بچّوں کے ہندو اور انگریز دوستوں کے ذریعے دکھایا ہے۔

ناول کا دوسرا حصّہ ''دھنستے ہوئے ساحل'' میں انھوں نے نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے سیاسی اختلافات کو بیان ہے، بلکہ مسلمانوں کے آپس کے مختلف سیاسی نکتہ نظر کی وجہ سے مختلف سیاسی پارٹیوں کے ساتھ وابستگی کو بھی بیان کیا ہے۔

ناول کا تیسرا حصّہ ''منزلِ لیلیٰ'' ہے۔ اس حصے میں ہندوستانی مسلمانوں کے زوال کا ذکر ہے اس سلسلے میں انھوں نے کنور عرفان کے خاندان کا تباہی کو بطور خاص بیان کیا ہے جن پر ۱۹۴۷ء کے فسادات کے گہرے اثرات ہوئے جوان کی زندگی میں الم ناک تبدیلیاں لائے۔

مسلمانوں کے علاوہ ہندو شرنارتھیوں پر بھی ہندو مسلم فسادات کے اثرات کو بیان کیا گیا ہے۔

اس ناول میں انھوں نے نواب کنور عرفان کی شاہانہ زندگی کو بیان کیا ہے جو تقسیمِ ہند کے نتیجے میں تباہ ہوگئی۔ تقسیم ہند سے نہ صرف اس کی زمینیں اور جائیداد ضبط کر لیں گئیں، بلکہ اس کا پورا خاندان بھی بکھر گیا۔ اس خاندان کی تباہی اس بات کی دلیل ہے کہ تقسیمِ ہند کے بعد ہندوؤں کا تعصب شدّت اختیار کر گیا اور انھوں نے قوم پرست مسلمانوں کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھا ان کی جائیدادیں ضبط کیں۔ انھیں خوف زدہ کیا یہاں تک انھیں قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔

قرۃ العین نے ناول کی فضا پر خاص توجہ دی ہے۔ ناول میں نواب کنور عرفان علی کے خاندان اور ''غفران منزل'' کا مختلف سیرگاہوں، کالجوں، کلبوں، سیاسی سرگرمیوں وغیرہ میں حصّہ لینے کا گہرے مشاہدے سے ذکر کیا ہے۔

''غفران منزل'' کے شاہانہ ماحول اور رکھ رکھاؤ کو انھوں نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ...اگلے روز ۲۱/ مارچ تھی اور غفران منزل میں جشنِ نو روز منایا جانے والا تھا۔ غفران منزل میں بڑے کنور صاحب مرحوم کے زمانے سے جشن نو روز ہر سال بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا اندر اور باہر دعوتیں ہوتی تھیں رنگ کھیلا جاتا تھا۔ ہوا میں گلاب جگمگاتے تھے غفران منزل کی ساری مہریاں سال بھر اس دن کی راہ دیکھتی تھیں کہ کب وہ پی چو اور پولو بھیا پر رنگ پھینک سکیں۔'' ☆۲۲

ہندو مسلم فسادات کے نتیجے میں پورے ہندوستان میں بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ ہر وقت پر رونق رہنے والے شہروں پر ویرانی چھا گئی اور لوگ بھی شدید خوف و ہراس کا شکار ہوگئے۔ اس بدلی ہوئی فضا کے بارے میں ناول نگار نے لکھا ہے:

> ... یہ مقامات جہاں اودھ کی دم توڑتی ہوئی پرانی زندگی کی ایک جھلک اب بھی نظر آجاتی تھی۔ یہاں کی فضا اب بالکل بدل گئی تھی۔ مسلمانوں کے چہروں پر خوف و ہراس طاری تھا۔ خود اپنے وطن میں وہ اپنی بے وقعتی شدّت سے محسوس کر رہے تھے۔ ☆۲۳

ناول کا پلاٹ نواب کنور عرفان علی کے خاندان پر مبنی ہے۔ اس خاندان کے ذریعے تقسیمِ ہند سے قبل ہندوؤں اور مسلمانوں کے دوستانہ تعلّقات اور کرواہاراج کے کنور عرفان علی سمیت دوسرے جاگیرداروں کو خوش حالی کو بیان کیا ہے جو ایک

عرصے تک ملک کی سیاست سے لاتعلق رہے، لیکن جب ہندو مسلم فسادات شدت اختیار کر گئے کنور عفان جیسے بااثر لوگ بھی ان فسادات کی زد سے بچ نہ سکے۔ اس ناول کے پلاٹ کے بارے میں احمد ندیم قاسمی کی رائے ہے:

''میرے بھی صنم خانے'' کا پلاٹ اودھ کے ایک بڑے زمیں دار گھرانے کے گرد گھومتا ہے، اس گھرانے کے معمر اور بزرگ افراد گردوپیش کی زبردست سیاسی و سماجی تبدیلیوں سے بے خبر ہیں، بلکہ بے خبر رہنا چاہتے ہیں...وہ آراستہ پیراستہ ایوانوں میں صوفوں پر بیٹھ کر آتشیں انقلابی مضامین لکھتے رہ جاتے ہیں ہوتے ہوتے تغیر پذیر حالات کے تقاضے انھیں بالکل غیر ارادی طور پر اس بحرِ ذخار میں دھکیل دیتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے ان کی زندگی کا، ان کے طبقے کا، ان کے ارادوں وولولوں کا اور ان کی بڑی ہی عزیز قدروں کا ایک بے پناہ المیہ شروع ہوتا ہے۔☆ ۲۴

جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی ہے ناول میں نہ صرف ہندو مسلم فسادات، بلکہ تقسیم ہند کے سلسلے میں مسلمانوں کے آپس کے اختلافات بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں مسلمانوں کے آپس کے اختلافات کو ناول نگار نے مسلم لیگ اور ترقی پسند تحریک (کانگریس) کے مختلف نظریات کو کنور عرفان کی اولاد اور ان کے دوستوں کے کرداروں اور مسلم لیگ کے رحمت اللّٰہ اور سیّد افتخار علی کے ساتھیوں کے ذریعے بیان کیا ہے جو اپنے نظریات صرف جلسے جلوسوں ہی میں نہیں، بلکہ اپنے رسالوں کے ذریعے دوسروں تک پہنچاتے تھے۔

...رحمت اللّٰہ خاں اب ''ملّتِ بیضا'' شائع کر رہا تھا، اور یقین تھا کہ یہ اخبار ''نیو ایرا'' کے مقابلے، میں موجودہ حالات اور ذہنیت کو دیکھتے ہوئے کہیں زیادہ کام یاب رہے گا... ہیڈ کوارٹرز کی طرف سے انھیں دیہاتوں اور قصبوں... میں جہاں اب تک قومی اور سیاسی شعور کی لہر بدقسمتی سے نہ پہنچی تھی... ان کی جماعت کی تحریک اپنی زبردست جذباتی اپیل کی وجہ سے ملک کے گوشے گوشے میں بے حد کام یابی اور تیز رفتاری کے ساتھ پھیل چکی تھی۔☆ ۲۵

قرۃ العین حیدر نے جہاں ہندوستان سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کی زیادتیوں کو بیان کیا ہے وہاں انھوں نے ہندو شرنارتھیوں کا بھی ذکر کیا ہے جو ہندوستان میں آکر دو طبقوں میں بٹ گئے۔ ایک طبقہ وہ تھا جو اپنے ملک میں آکر بھی بے یار و مددگار رہا اور دوسرا طبقہ وہ تھا جنھوں نے ہندوستان میں آکر مسلمانوں سے کروڑوں کی جائیدادیں کوڑیوں کے مول خرید لیں اور انھیں ڈرا دھمکا کر اور قتل کر کے ان کی جائیدادوں پر قبضہ کر لیا اور ساری دولت اپنی عیش و عشرت میں صرف کرنا شروع کر دی۔

یہ وہ لوگ تھے جنھیں ''شرنارتھی'' کہا جاتا تھا۔ ان کے بھی مختلف طبقے تھے، غریب شرنارتھی جو بالکل لٹ

کرصرف اپنی جانیں، اپنی پرانی یادیں اوراپنی بے پناہ نفرتوں کازادِراہ اپنے ساتھ لے کرآئے تھے انھیں شہر سے باہر مضافات کے کیمپوں میں رکھا گیا تھا... دولت مند شرنارتھی جو بڑے بڑے انگریزی ہوٹلوں یا کوٹھیوں میں یا اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ ہر وقت اسکیٹنگ کرتے، شرابیں پیتے اپنی بیویوں اورلڑکیوں کو بال روم میں ناچ سکھاتے۔☆۲۶

ناول کے کرداروں کے تعلق پڑھے لکھے، آزاد اوراعلیٰ طبقے سے ہے۔ اہم کرداروں میں نواب کنورعرفان علی، سلطنت آرا بیگم، پولو، پی چو، رخشندہ، کرن اور سیّد افتخار علی اور رحمت اللّٰہ خان وغیرہ شامل ہیں پولو، پی چو اور رخشندہ کے دوست کرن، گنی، ڈائمنڈ، سلیم اور شہلا وغیرہ ثانوی کردار ہیں یہ تمام کردار آپس میں گہرے دوست ہیں اور طالب علم ہیں۔ ''آگ کا دریا'' کے کرداروں کی طرح یہ کردار بھی آپس میں بلا تعصب اور دوستانہ زندگی گزارنے کے بعد ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔

ان کرداروں پر احمد ندیم قاسمی نے بڑے دلکش انداز میں تبصرہ کیا ہے:

> کردار بے شمار اور متنوع ہیں...شروع شروع میں ان کی دل چسپیاں ان کے مشاغل، ان کے نظریے بالکل یکساں معلوم ہونے لگتے ہیں، لیکن ہولے ہولے (مصنفہ کے بجائے) حالات و واقعات ان کی پارٹیوں اور قہقہوں اور لطیفوں کے نقابوں کے اُدھر عجیب مناظر پیش کرتے ہیں، وہاں سب کردار ایک دوسرے سے الگ کھڑے ہیں ان کی راہیں الگ ہیں، ان کی منزلیں الگ ہیں اور پھر اتنے الگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے کتنے قریب ہیں یہی قرب اور یہی اختلاف اس ناول کا پلاٹ ہے۔☆۲۷

کنورعرفان علی ''غفران منزل'' کا مالک ناول کے اہم کرداروں میں سے ایک ہے۔

> کنور اور ٹھاکر اور مہاراجا کے خطابات شاہانِ اودھ نے مسلمانوں کو اس وقت دیے تھے جب دو قوموں کے نظریے اور قوم کے وجوہ مفہوم کو سمجھنے کی سیاسی قابلیت کی کمی تھی۔☆۲۸

کنورعرفان اپنی پُرآسائش اور بے فکری کی زندگی میں مست تھے زمانے کی دھوپ اور چھاؤں سے انھیں کوئی دل چسپی نہ تھی۔ ان کی مصروفیات روایتی امرا کی طرح تھیں۔

> ...کنور صاحب سال کا زیادہ حصّہ اپنی ریاست کے قصبے، مانا ٹھیر میں گزارتے۔ جاڑوں میں لکھنؤ آجاتے، گرمیوں میں وائلڈ فلاور ہال نینی تال یا سوائے ہوٹل مسوری کو زینت بخشتے۔ ان کے مشغلے تعداد میں بہت کم تھے۔ سال میں چند مرتبہ قیصر باغ کی بارہ دری کے اعلیٰ پیمانے کے مشاعروں کی صدارت، برٹش انڈین ایسوسی ایشن کا سالانہ ڈنر، گورنمنٹ ہاؤس کے ایٹ ہوم

اور یونیورسٹی کے کورٹ میٹنگ جس کے وہ ممبر تھے کیوں کہ اودھ کے دوسرے تعلقہ داروں کی طرح نے بھی کیننگ کالج کی سربفلک اور شاہانہ عمارتوں کی تعمیر کے لیے گراں قدر عطیے دیے تھے، اور بینیٹ ہال کی...دیواروں پر صوبے کے سابق گورنر اور دوسرے مہاراجاؤں اور نوابوں کے ساتھ بڑے کنور صاحب مرحوم کی...تصویر بھی موجود تھی...شام کو انڈین سول سروس کے معمر انگریز افسروں کے ساتھ شطرنج کھیلنے...جاتے تھے...ان کی ذات سے نقصان کسی کو نہ تھا فائدہ ہزاروں کو تھا۔☆۲۹

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انھیں زندگی کے بہت سے تلخ حقائق کو برداشت کرنا پڑا اور بدلے ہوئے حالات سے سمجھوتا کرنا پڑا۔سب سے پہلے کنور صاحب کو انگریزوں سے شدید نفرت کے باوجود اپنے بیٹے پی چو کی انگریز فوج میں شمولیت کو برداشت کرنا پڑا۔

...تاریخ میں آج تک ان کے خاندان میں کسی نے بھی انگریز سرکار کی ملازمت نہیں کی تھی۔ان کے بزرگوں نے اودھ کی سلطنت کے دم توڑنے کے زمانے میں نواب کی طرف سے کمپنی بہادر سے ٹکر لی تھی جنرل ہیولاک کی توپوں کا سامنا کیا تھا...اور ان کا بیٹا اسی انگریزی سرکار کی غلامی کرے! یہ ناممکن تھا...کنور صاحب کو سخت صدمہ پہنچا۔☆۳۰

پی چو کی انگریز فوج میں شمولیت کے علاوہ کنور صاحب نے اپنے بچّوں کو ہر کا کی آزادی دے رکھی تھی۔رخشندہ، پولو اور پی چو اور ان کے ساتھیوں کے نکالے ہوئے رسالے ''نیوایرا'' کی انھوں نے ہمیشہ پذیرائی کی تھی۔

کنور صاحب اپنے بچّوں، دوستوں، جاننے والوں اور نوکروں کے ساتھ بہت گھل مل کر رہتے لیکن اپنی بیوی سلطنت آرا بیگم کے ساتھ ان کے تعلّقات عام طور پر کشیدہ رہتے۔

جب ملک میں ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے تو ہر طرف بدامنی، بدنظمی اور خوف و ہراس پھیل گیا۔ہر روز مختلف شہروں سے مسلمانوں کے شہید ہونے کی خبریں آتیں جو مسلمان صدیوں پرانے وطن سے محبت کی وجہ سے ہجرت نہ کرنا چاہتے تھے انھیں ڈرا دھمکا کر ہجرت کرنے پر مجبور کیا جاتا اور ان کی جائیداروں پر قبضہ کرلیا جاتا، لیکن ابتدا میں ان حالات کا کنور صاحب پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ اپنے حال میں مست رہے۔

جو بدامنی اور شرانگیزی پورے ملک کے گوشے گوشے میں پھیل چکی تھی اس کا کرواہار اج میں دور دور تک گزر نہ تھا۔☆۳۱

جب ملک میں ہندو مسلم فسادات شدّت اختیار کر گئے تو ملک کے بڑے بڑے امرا اور رؤسا بھی فسادات کی زد میں

آ گئے۔ انھیں بھی ان تکلیف دہ حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ جن کا عام شہری مقابلہ کر رہے تھے۔ ان دنوں کنور صاحب گرمیاں گزارنے نینی تال گئے ہوئے تھے اور اپنی پرانی مصروفیات کے مطابق وقت گزار رہے تھے۔ کہ ایک دن اقبال نرائن نے کنور صاحب کو منشی ددار کا پیغام دیا:

''...کنور صاحب سے کہو پاکستان کا ہے ناہیں چلے جات ہیں۔ ہم تو اب ایکو ڈبل لگان نہ دیبا۔
ہم اب آ جاد ہیں۔ ایکو مسلمان جمیند اری کی گلای نہ کریا۔ چاہے چودھری ہوں چاہے ٹھاکر۔
اپنے گھر کے ہوئی ہیں۔ ہمرے او پر اب کاہے کا رعب جماوت ہیں۔'' ☆۳۲

ان کشیدہ حالات میں کنور صاحب رخشندہ کو دوبارہ لکھنؤ بھیج دیا لیکن خود اپنے قبضے سے نکلنے کا حوصلہ نہ کر سکے کچھ عرصے کے بعد جب حالات مزید خراب ہو گئے تو رخشندہ اور پولو کو دوبارہ کنور صاحب کے پاس نینی تال جانا پڑا۔

ملک کے حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ اس صورتِ حال سے نبٹنے کے لیے تقسیمِ ہند کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ تھا۔ کنور صاحب کے لیے یہ حقیقت بہت تکلیف دہ تھی۔

کنور صاحب کے لیے یہ صدمہ جان لیوا ثابت ہوا۔

سلطنت آرا بیگم کرواہا راج کی کنور رانی ایک مغرور عورت تھیں۔ اپنی حیثیت اور مال و دولت پر انھیں بہت ناز تھا۔ اپنے شوہر اور بچّوں کے ساتھ بھی ان کی رسمی قسم کی گفتگو ہوئی۔ البتہ اپنے بیٹوں پی چو اور پولو کو رخشندہ سے زیادہ اہمیت دیتیں ردِ عمل کے طور پر کنور صاحب بیٹے سے زیادہ رخشندہ سے پیار کرتے۔ کنور صاحب سے ان کی ملاقات صرف دوپہر کے کھانے پر ہوتی۔ باقی معاملات نوکروں یا بچّوں کے ذریعے پیغامات دے کر طے کر لیے جاتے۔

کنور صاحب کی وفات کے بعد سلطنت آرا نے دکھی ہونے کے بجائے اپنی عدّت ختم ہوتے ہی سندیلہ کے چودھری شمیم سے نکاح کر لیا، اور ''غفران منزل'' پر حکومت نے قبضہ کر کے وہاں ہندو شرنارتھیوں کو آباد کر دیا۔

پولو کنور عرفان کا بیٹا تھا جو کم گو، سنجیدہ اور اپنے آپ میں مگن رہنے والا لڑکا تھا یہاں تک کہ جب ۱۹۴۷ء کے فسادات شروع ہوئے تو دوسرے مسلمانوں کی طرح ان کا خاندان پر بھی فسادات کے اثرات ہوئے، لیکن ان تمام حالات سے اسے کوئی دل چسپی نہ تھی۔

کنور صاحب کے انتقال اور تقسیمِ ہند کے بعد ''غفران منزل'' اور کنور صاحب کی بیش تر جائیداد پر ہندوؤں کا قبضہ ہو گیا۔ ان کنور صاحب کے بچّوں کی زندگی عام شہریوں جیسی ہو گئی یہاں تک کہ پولو جیسے شاہانہ مزاج شخص کی زندگی میں بھی تبدیلیاں آئیں اب اس کی طبیعت میں صبر و شکر اور قناعت آ گئی تھی، لیکن وہ اب شاہانہ زندگی کے خواب دیکھتا تھا اور ان خوابوں کی تعبیر کے لیے وہ سخت محنت کرنے اور اپنے سارے شوق ترک کرنے کے لیے تیار تھا۔

> غفران منزل کا کنور پولو آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ اس نے اپنی ساری رئیسانہ خو بو اور تن آسانی اور آرام پسندی کی عادتیں چھوڑ دی تھیں اس نے... بڑی اسکیمیں بنائی تھیں۔ وہ صوبے کی حکومت سے ٹریکٹر خرید کر خود سپر کرے گا۔ ترائی کے علاقے میں جتنے جنگل بیکار پڑے تھے... ان کی لکڑی سے وہ سیتاپور کے پلائی ووڈ کے کارخانے کی طرح کا ایک کارخانہ خود قائم کرے گا۔ اپنے سارے کتّے بیچ ڈالے گا۔ فلائنگ کلب اور ہوا میں وقت گزارنے کے بجائے وہ ایک نہایت محنتی اور ایمان دار کاشت کار بنے گا۔ جتنا حصّہ معاوضہ دینے کے بعد حکومت اسے سیر کے لیے دے گی، وہ اس پر قناعت اور صبر وشکر کے ساتھ گزر کر سکے گا۔ بارہ بنکی کے سابق ڈپٹی کمشنر اپنے ماموں میاں کی لڑکی سے شادی کر لے گا اور ٹریکٹر چلایا کرے گا۔☆۳۳

پی چو بھی کنور عرفان کا بیٹا تھا۔ پولو کے برخلاف ہنس مکھ اور سوشل تھا اس کے حلقۂ احباب میں ہندو انگریز اور مسلمان سبھی شامل تھے۔ فلاحی کام کرنا، ''نیوا یرا'' کے لیے مضامین لکھنا اور چندہ جمع، دوستوں کے ساتھ ہنسی مذاق اور ناچنا اس کے مشاغل میں شامل تھا۔

پی چو اپنے باپ کی وسیع جائیداد سے واقف تھا لیکن پی چو نے کنور صاحب کی مخالفت کے باوجود انگریز فوج میں شمولیت اختیار کی۔

> ...ان دنوں جنگ نئی نئی چھڑی تھی۔ پی چو نے چپکے سے ایر فورس میں درخواست بھیج دی۔ پھر الٰہ آباد جا کر انڈین پولیس کے مقابلے میں بیٹھ گیا اور اس میں کامیاب بھی ہو گیا۔ کنور صاحب کو سخت صدمہ ہوا لیکن... چہیتا بیٹا تھا، چپ ہو گئے۔☆۳۴

پی چو اپنے گروپ کی انگریز، غیر مسلم اور شادی شدہ لڑکی کرسٹابل سے شادی کا خواہش مند تھا اس کی شادی پر جب سب نے اعتراض کیا تو پی چو نے ناراض ہو کر گھر اور دوستوں کو چھوڑ کر ہوسٹل میں رہنا شروع کر دیا۔

اب پی چو کی ساری توجہ فوج کی طرف مرکوز ہو گئی وہ اپنے تعصّب سے پاک اور غیر جانب دارانہ نظریات کی وجہ سے فوج میں بہت مقبول تھا۔ یہاں تک کہ بعد بھی اس نے ہندو شرنارتھیوں کی دل و جان سے حفاظت کی، لیکن اس کے باوجود ہندو اسے شک کی نظروں سے دیکھتے۔ ہندو مسلم اختلافات کا شدّت سے احساس دلایا جاتا۔

> پی چو قوم پرست بیٹھے بیٹھے اپنے دوستوں کی باتیں سنتا۔ لاہور تمھارے لیے محفوظ ہے۔ دہلی ہمارے لیے محفوظ ہے۔ ہم ہندی ہیں تم پاکستانی ہو۔ ہماری قومی زبان شدھ ہندی ہے۔ تمھاری

قومی زبان خالص اُردو ہے۔ ہم چٹیا رکھتے ہیں۔ تم گائے کا گوشت کھاتے ہو تم نے اپنا ملک ہمیں سونپا ہے اور ہمیں ہمارے وطن سے نکالا ہے۔ ہم اب تمھارے یہاں آ کر تمھیں تمھارے ملک سے نکال رہے ہیں۔ انسانیت کی تاریخ میں کہیں اس سے زیادہ حماقت انگیز جنوں کبھی ہوا تھا۔☆ ۳۵

ہندوؤں نے پی چو کی شرنارتھیوں سے بے غرض ہمدردی اور پیار کسی کو بھی اہمیت نہ دی، بلکہ اس کے ہر مثبت رویئے کو شک کی نظر سے دیکھا اور اسے کبھی بھی اپنا فوجی محافظ یا ساتھی تسلیم نہ کیا۔

...رات رات بھر جاگ کر ہندوؤں کی حفاظت کے انتظامات میں لگا رہتا تھا۔ اسے انھوں نے بندوقوں کے کندوں اور سنگینوں کی نوک اور گولیوں کی بوچھار سے ختم کر دیا۔☆ ۳۶

رخشندہ ناول کا سب سے اہم کردار ہے ناول کی پلاٹ رخشندہ کے کردار کے ذریعے ہی آگے بڑھتی ہے ''غفران منزل'' میں وہ ایک عرصے تک بے فکری کی زندگی گزارتی رہے۔ تقسیمِ ہند کے ساتھ ہی رخشندہ کی ساری دل چسپیاں، شوخیاں، دسائل اور ہندو، انگریز اور مسلمان دوستوں کا ساتھ سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔

کنور عرفان نے رخشندہ کی تربیت اس انداز میں کی تھی کہ اسے عام دل چسپیوں سے لے کر کلبوں میں ڈانس تک کرنے کی آزادی حاصل تھی۔ اس کے باوجود ناول نگار کا خیال ہے کہ نواب کنور نے اپنی اولاد کی تربیت اس انداز میں کی تھی کہ ان کے خاندانی وقار پر کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔

کنور صاحب ایک حد تک بڑے وسیع النظر تھے ...انھوں نے اپنے تینوں بچوں کی ایسی تربیت کی تھی کہ ان میں خود اعتمادی، وسیع النظری اور عقیدے کی پختگی پیدا ہو سکے انھوں نے رخشندہ کو مکمل آزادی دے رکھی تھی کیوں وہ جانتے تھے کہ وہ اس کا غلط استعمال نہیں کرے گی اس نے میرس کالج سے ...میوزک کی ڈگری حاصل کی تھی اس نے المہوڑے کی کلچر سینٹر سے رقص سیکھا تھا وہ اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ ''دلکشا کلب'' جا کر انگریزی ناچ میں شامل ہوتی وہ پی چو کا یا اپنی سائیکل پر جب چاہتی اور جہاں چاہتی آ جا سکتی تھی۔☆ ۳۷

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کنور عرفان اور اس کے خاندان پر مغربی اور ہندی تہذیب پر گہرے اثرات تھے اور اس تہذیب کو اپنانا ان کے نزدیک وسیع النظری تھی۔

قرۃ العین نے ناول میں صرف ادب، موسیقی یا فنونِ لطیفہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ تہذیب کا ذکر نہیں کیا، بلکہ تہذیب وتمدن اور مذہبی معاملات میں ایک دوسرے کے مذہبی تہواروں یا محرم کے تعزیوں میں بلا امتیاز شرکت کو بھی بیان کیا ہے۔ جس میں مسلمان (شیعہ اور سنی دونوں) اور ہندو سب شامل ہوتے:

محرم آ گیا اور رخشندہ اس میں مصروف ہوگئی۔لکھنؤ کا محرم، جب گلی گلی امام باڑے سجتے ہیں اور شربت کی سبیلیں لگائی جاتی تھیں اور ہندو، مسلمان، شیعہ، سنی اکٹھے ہو کر حسینؓ مظلوم انسانیت کے سب سے بڑے ہیرو کی بارہ گاہ میں اپنی عقیدت کا اظہار کرتے...امام باڑوں میں چراغاں کیا جاتا تھا ہندو عورتوں کی ٹولیاں پوربی زبان میں کسے ہوئے نوحے اپنے طریقے سے گاتی ہوئی سڑکوں اور گلیوں سے گزرتی رہتی تھیں۔☆۳۸

قرۃ العین حیدر نے جہاں ہندی تہذیب پر مسلم تہذیب کے اثرات کو بیان کیا ہے وہاں مسلمانوں پر بھی ہندی تہذیب وتمدن اور ان کے مذہبی تہوار میں جوش وخروش سے شرکت کا بھی ذکر کیا ہے:

یہاں انھوں نے ہولی پر حویلی اور محلّے کے بچّوں کے ساتھ ہوا میں گلال اور عبیر اُڑایا تھا...رام لیلا پر راون کے جلنے اور سروپ نکھا کی ناک کٹنے پر بچپن میں اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ اکٹھی خوشیاں منائیں تھیں...دیوالی پر کھانڈ اور مٹی کے کھلونوں سے اپنے گھروندے سجا کر حویلی میں چراغاں کیا تھا...اقبال نرائن اور دوسرے کائستھ منشیوں سے اُردو اور فارسی پڑھی تھی یہاں کسی کو پتا نہیں تھا کہ کون ہندو ہے اور کون مسلمان۔☆۳۹

رخشندہ کے جہاں اور شوق تھے وہاں اسے صحافت سے بھی دل چسپی تھی۔اس شوق کی تکمیل کے لیے، رخشندہ، پی چو اور ان کے دوستوں کی، کرن اور کرسٹابل وغیرہ نے مل کر ایک رسالہ ''نیوایرا'' نکالا، جس میں وہ جاگیردارانہ نظام کے خلاف اور غریبوں کے حقوق پر مضامین لکھتے۔ جب تحرک پاکستان کا آغاز ہوا تو، انھوں نے اپنے رسالے کے ذریعے کانگریس کے نظریات کوفروغ دینے کی کوشش کی۔

جہاں ان کے رسالے ''نیوایرا'' کو ترقی پسندوں اور کانگریسیوں نے قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ وہاں اس رسالے اور ان کے نظریات کی مخالت کرنے والے بھی موجود تھے۔ان میں پیش پیش رحمت اللہ خاں، سیّد افتخار اور چودھری شمیم تھے۔انھوں نے ''نیوایرا'' کے مقابلے میں ایک نیا رسالہ 'ملتِ بیضا'' نکالا جس میں وہ مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کرنا چاہتے تھے۔

قرۃ العین چوں کہ خود ترقی پسند اور کانگریسی ہیں اس لیے انھوں نے ناول کی ترقی پسند کردار رخشندہ اور اس کے ساتھیوں کی حمایت کرتے ہوئے لکھا ہے:

...جس زہر کو وہ پھیلنے سے روکنا چاہتے تھے وہ بہت اچھی طرح پھیل چکا تھا۔ان کی کوشش کو غلط روشنی میں دیکھا جاتا تھا۔ان میں سے بعض کو غدّار اور قوم فروش کہہ کر گالیاں دی جاتی تھیں۔ ان سے پوچھا جاتا تھا کہ بھائی تمھیں ہیڈ کوارٹر سے کتنی تنخواہ جاتی ہے۔میاں، جتنے روپے تم

وہاں سے لیتے ہو اس سے دو گنے ہم سے لے لو لیکن خدارا قوم کو نہ بیچو۔☆۴۰

جیسے جیسے تحریکِ پاکستان زور پکڑتی گئی اور نیوایرا اور کانگریس کی مقبولیت میں بھی کمی ہوتی گئی اور ''نیوایرا'' کے لیے چندہ دینے والے بھی کم ہوتے گئے ان حالات میں بھی رخشندہ ''نیوایرا'' کی اشاعت کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی رہی، لیکن وسائل کی بے حد کمی کی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں کام یاب نہ ہو سکی۔

> اس نے تھک کر سوچا کہ وہ اپنے کرنٹ اکاؤنٹ میں سے روپیہ نکال کر اس وقت تو کام چلا لے گی۔ کرن واپس آ کر باقی باتیں خود نپٹا تا رہے گا۔ اس نے بنک کی کتاب دیکھی، لیکن اس کا جتنا روپیہ اس وقت بنک میں موجود تھا اس سے جو گنا بھی سارے ضروری حسابات کے لیے نہ کافی ہوتا۔ صاحب کے اچانک ہارٹ فیل ہو جانے کی وجہ سے کوئی وصیّت نہ چھوڑی تھی اور قانون کے لحاظ سے تعلّق داری کے حق وراثت میں اس کا کوئی حصّہ نہ تھا۔ اودھ کے تعلق داروں میں اس شرعی تیسرے حصّے سے محرومی کی تلافی شادی کے وقت کئی سیر سونے کی شکل میں کر دی جاتی تھی۔ اس کے لیے بھی یقیناً کنور رانی کے پاس اس وقت ڈھیروں سونا موجود ہو گا، لیکن کنور رانی اسے محض اخبار چھپنے کے لیے قطعی کچھ روپیہ نہ دیتیں جب کہ بلوے کی وجہ سے ریاست کو اتنا نقصان اُٹھانا پڑا تھا اور جب کہ اسمبلی زمیں دار کے خاتمے کا بل پاس کر چکی تھی۔☆۴۱

قرۃ العین حیدر نے اپنے بیش تر نسوانی کرداروں کی طرح رخشندہ کے کردار کو بھی باہمت اور مستقل مزاج دکھایا ہے جو پہلے سیّد افتخار، رحمت اللہ خاں اور چودھری شیمم کی مخالفت کے باوجود اپنے ساتھیوں کے ساتھ ''نیوایرا'' کی اشاعت کے لیے کوششیں کرتی رہی، اور بعد میں وسائل کی کمی کے باوجود ناممکن کو ممکن بنانے کی کوشش کرتی رہی۔ اپنے رسالے ''نیوایرا'' میں جاگیردارانہ نظام کے خلاف مضامین لکھنے والی رخشندہ یہ نہ جانتی تھی کہ وہ خود بھی اس کی لپیٹ میں آئے گی اور اس نظام کے خاتمے کے بعد مالی نقصان اُٹھائے گی اور اس کی حیثیت عام شہریوں جیسی ہو جائے گی۔

''غفران منزل'' والوں کی بے بسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ''ملتِ بیضا'' کے چودھری شیمم نے خط کے ذریعے شادی کا پیغام دیا:

> 'امبر پور کی نسبت ٹوٹنے کے بعد اور کنور صاحب کے انتقال کی بعد سے حالات کچھ اس طرح کے پیدا ہو گئے کہ کنور رانی کا اس خاکسار کو اپنی فرزندی میں لینا ناگزیر ہے آپ پر جتنا قرضہ چڑھا ہوا ہے، اس صورت میں یہ خاکسار ادا کرے گا۔ یہ کوئی احسان نہیں۔ اس نازک وقت پر محض آپ لوگوں کی خدمت منظور ہے۔ غور فرما لیجیے... شام کو باہر اتنی دیر نہ رہا کیجیے۔ اس کے علاوہ اگر پتلون

پہننے اور دلکشا جانے سے احتراز فرمایئے تو عین موجب مسرت اس ناچیز کے لیے ہوگا۔' ☆۴۲

کنور رانی اس موٹی آسامی کو ضائع کرنا نہ چاہتی تھی ان کی شدید خواہش تھی کہ رخشندہ کی شادی چودھری شمیم کے ساتھ ہو جائے۔ رخشندہ کے انکار کرنے پر کنور رانی کی لاتعلقی شدید نفرت میں بدل گئی۔

آخر بمبئی میں رخشندہ اپنے دوستوں کے ساتھ رہنے لگی اور ان کے ساتھ فلاحی کاموں میں مصروف ہو گئی۔ رخشندہ اور اس کے دوست بلاتعصب ہجرت کرنے والے مسلمانوں اور ہندو شرنارتھیوں کی کیمپوں میں جا کر ان کی خدمت کرتے، رخشندہ جب شرنارتھیوں کے کیمپ میں جاتی تو کرن اسے نصیحت کرتا:

> ''...تم مسلمان۔ اس لیے بندی لگا کر کورو کشیتر کیمپ تک ہمارے ساتھ چلنا۔ بچارے شرنارتھی مسلمانوں کے نام ہی اب اتنی نفرت کرتے ہیں کہ وہ تمھیں دیکھنا برداشت نہ کر سکیں گے۔ روشنی ڈارلنگ تم یہاں غرارے نہ پہننا۔ اوما اس سے کہتی ــــ اپنے ملک میں، اپنے وطن میں، شیر شاہ اور اکبر اور شاہ جہاں کی دلّی میں مسلمان ہونا جرم تھا۔ خطرہ تھا، شرم تھی۔ یہ سب ایک تماشے کی طرح، ایک دیوانے خواب کی طرح آنکھوں کے سامنے گزرتا جا رہا تھا۔ ☆۴۳

رفتہ رفتہ رخشندہ کے دوستوں کا ساتھ بھی چھوٹتا گیا۔ کرسٹابل یورپ اور ڈائمنڈ لاہور چلی گئی جب کہ کرن کو ہندوؤں نے مسلمانوں کا ساتھی ہونے کے جرم میں مار دیا۔

رخشندہ کا انجام بھی وہی ہوا جو عام طور پر قرۃ العین حیدر کے کرداروں کا ہوتا ہے۔ ہر وقت دوستوں کے مجمع میں دکھائی دینے والی رخشندہ آخر میں تنہائی کا شکار ہو گئی۔

رخشندہ کے کردار کے ذریعے قرۃ العین حیدر نے انسان کی تنہائی کے فلسفے کو بیان کیا ہے اس کے ساتھ وقت کا فلسفہ بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

> دو کرواہا راج کی رخشندہ آتش دان کے پاس ایک پرانے رنگ کے صوفے پر جس کے ٹوٹے ہوئے اسپرنگ نیچے کو دھنس گئے تھے، اپنے ہاتھوں پر چہرہ رکھے، بیٹھی رہی اور پلکیں جھپکاتی رہی۔ ☆۴۴

اب رخشندہ کے پاس صرف سنہرے ماضی کی یادیں تھیں۔ گھر، خاندان، دوست اور ''غفران منزل'' کو یاد کیا جا سکتا تھا۔ ان سب کا لوٹ کر آنا محض ایک خواب تھا۔

''سارا دن گزر گیا۔ کوئی نہیں آیا۔ کوئی نہیں ــــ سارا دن گزر گیا'' اس جملے سے رخشندہ کی تنہائی اور ناکامی ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ پر رونق ماضی کی یاد ہے جس میں بے فکری اور دوستوں کی محفلیں ہیں جو تقسیمِ ہند کے نتیجے میں قائم نہ رہ سکیں۔

ناول میں سیّد افتخار کا کردار بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ کردار مسلم لیگ کی نمائندگی کرتا ہے اور ناول کے شروع سے لے کر آخر تک ان کا کردار ناول کی کہانی کو آگے بڑھاتا ہے۔

سیّد افتخار کے مشورے پر ان کے ساتھ رحمت خان نے مسلم لیگ کی حمایت میں ایک رسالہ ''ملتِ بیضا'' نکالا جس میں انھوں نے مسلمانوں کے سیاسی شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کی اور اس میں نہ صرف ''مسلم لیگ'' کی نظریات کو ابھارنے، بلکہ ترقی پسندوں اور کانگریسوں کی مخالفت میں بھی مضامین لکھے جاتے۔

> ...رحمت اللّٰہ خاں اب ''ملتِ بیضا'' شائع کر رہا تھا اور یہ یقین تھا کہ یہ اخبار ''نیوایرا'' کے مقابلے میں موجودہ حالات ور ذہنیت کو دیکھتے ہوئے کہیں زیادہ کام یاب رہے گا...ان کی جماعت کی تحریک اپنی زبردست جذباتی اپیل کی وجہ سے ملک کے گوشے گوشے میں بے حد کام یابی اور تیز رفتاری کے ساتھ پھیل چکی تھی۔☆۴۵

مسلم لیگ کے نظریات تمام مسلمانوں کی آزادی اور خوش حالی کی ترجمانی کرتے تھے، اور جن حالات و واقعات سے گزرنے کے بعد ایک علیحدہ مسلم مملکت کے قیام کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ مسلم لیگ کا پھولنا پھلنا یقینی تھا، لیکن قرۃ العین حیدر چوں کہ کانگریسی تھیں اس لیے انھوں نے ''نیوایرا'' کے نظریات کو سراہا ہے جب کہ مسلم لیگ کے نظریات کو انھوں نے سیاسی پروپیگنڈا کہا ہے۔

> ...ہیڈکوارٹرز کی طرف سے انھیں دیہاتوں اور قصبوں اور ضلعوں کے چھوٹے چھوٹے دور افتاد اضلاع میں جہاں اب تک قومی اور سیاسی شعور کی لہر بدقسمتی سے نہ پہنچی تھی۔ اسٹڈی سرکل قائم کرنے اور پروپیگنڈے کی رفتار دوگنی کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔☆۴۶

ناول میں قرۃ العین نے سیّد افتخار، رحمت اللّٰہ خاں ور چودھری شمیم کے کنور عرفان علی اور پی چو کے ان دھمکی خطوط کا بھی ذکر کیا ہے جو انھوں نے ''نیوایرا'' کی پالیسی تبدیل کرنے کے لیے لکھے۔

پورا ناول پڑھنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قرۃ العین نے اپنی ذاتی پسند اور جانب داری سے کام لیتے ہوئے سارے غلط کام اور نازیبا باتیں مسلم لیگ کے حمایت کرنے والے کرداروں سے کروائے ہیں۔ ناول کے آخر میں جب تقسیمِ ہند کے بعد کے حالات کو بیان کیا گیا وہاں بھی سیّد افتخار، رحمت اللّٰہ اور چودھری شمیم کی جو گفتگو بیان کی گئی ہے اسے وہ یہ ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ شاید مسلم لیگی رہنما اپنے فیصلے پر پشیمان تھے۔

> سیّد افتخار اور ان کے ساتھی سخت چکرائے ہوئے تھے۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے:
>
> ارے میاں، جن قوم پرستوں کو پچھلے آٹھ سال تک گالیاں دیں۔ اب ان ہی کے دروازوں پر

پہنچنا پڑ رہا ہے کہ بھائی خدا کے لیے بتاؤ اب کیا کریں...عمرِ عزیز کے دس سال...اسی چکر میں گزارے اور اب اس کا صلہ کیا ملا...جنھیں تم قوم فروش کہتے تھے۔ یہی تو چلاتے تھے کہ میاں اقلیت کے صوبوں میں تمھارا کیا حشر ہوگا...اسکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اُردو اور فارسی کی کلاسوں میں ہندو طلبہ کا اوسط مسلمان کے لگ بھگ ہی رہتا تھا لیکن اتنی گالیاں سن لینے کے بعد...انتقام کا جذبہ اور خیال ان کے دل و دماغ میں اتنا رچ گیا ہے کہ وہ اُردو کا ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کرتے پڑھنا پڑھانا تو کجا۔ میاں لکیر پیٹتے جاؤ بیٹھے بیٹھے جس کلچر روایات اور زبان کے تحفظ کے لیے یہ ساری قیامت اٹھائی گئی تھی۔ ان علاقوں میں جنھیں حاصل کیا گیا ہے وہ کلچر اور زبان کہاں ہے۔ اس مرکز اور گہوارے اور اپنی تاریخ وتمدن کی ساری وراثت خود اپنے ہاتھوں سے ہم نے دوستوں کو سونپ دی۔ اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر! قوم کے جس وقار اور عزت کے لیے یہ سب کیا گیا تھا اس کے آدھے حصّے کا وقار خاک میں مل گیا۔ ☆۴۷

سیّد افتخار اور ان کے ساتھیوں کے علاوہ ہندوستان بہت جاگیردار اور اعلیٰ طبقے کے لوگوں کو تقسیمِ ہند کے بعد بھی ہندوستان چھوڑ کر پاکستان جانا نہیں چاہتے تھے، بلکہ ہندوستان میں رہ کر اپنی گذشتہ عظمت کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کے خیالات کو قرۃ العین نے ناول میں اس طرح بیان کیا ہے:

''...ہم یعنی سلطنت اودھ کے جائز اور صحیح وارث، چوں کہ انگریزی راج اب چلا گیا ہے، دوبارہ تخت نشیں ہوئے ہیں۔ انگریزی حکومت نے نوے سال قبل ہمارے نگڑ دادا خلد آشیانی جنت مکانی کو انتہائی بے کسی کے عالم میں تاج وتخت سے محروم کر دیا تھا اور سلطنت پر لٹیروں کی طرح قابض ہوئے تھے۔ آج بدیسی حکومت کے خاتمے کے بعد، ۱۵ اگست ۴۷ء کے بعد سے ہم، یعنی آخری تاجدار اودھ کے نگڑ پوتے پرنس چھبن صاحب قانونی طور پر سریر آرائے سلطنت ہوئے ہیں۔ ہمیں اُمّید ہے کہ ہماری پیاری رعایا ہمارے زیرِ سایہ امن و عافیت اور خوشی سے زندگی بسر کرے گی اودھ سو سال کی غلامی سے آزاد ہوا ہے۔'' ☆۴۸

اس ناول میں قرۃ العین نے نہ صرف ہندو مسلم فسادات کا ذکر کیا ہے، بلکہ ہندوستان کی تقسیم ہونے یا نہ ہونے کے سلسلے میں مسلمانوں کے آپس کے اختلافات کو بھی بیان کیا ہے۔

کنور عرفان، رخشندہ، پی چو، کرن، گنی اور رمل وغیرہ کانگریس کی اور سیّد افتخار، رحمت اللّٰہ خان اور چودھری نسیم مسلم لیگ کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ یہ دونوں سیاسی پارٹیاں اپنی تحریک کو فروغ دینے کے لیے جلسے جلوس نکالتیں اس کے علاوہ مسلم

نے مسلمانوں کے سیاسی شعور کو بیدار کرنے اور اپنے نظریات کو فروغ دینے کے لیے ایک رسالہ 'ملتِ بیضا' اور کانگریس نے ''نیوایرا'' کے نام سے ایک رسالہ نکالا۔ یہ دونوں سیاسی پارٹیاں اپنے نظریات کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور بدنام کرنے کی کوشش کرتیں جیسا کہ سیّد افتخار کی کنور عرفان اور ان کے بچّوں کے بارے میں یہ رائے تھی:

''کنور عرفان کی اولاد ایک سرے سے مسلمان ہی نہیں۔ ان کے لڑکے، شراب وہ پئیں۔ انگریزی ناچ وہ ناچیں۔ ہر وقت کا انگریزوں، کافروں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا۔ سور بھی یقیناً کھاتے ہوں گے، بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ان کی لڑکی شادی بھی کسی ہندو سے کرے گی۔'' ☆۴۹

قرۃ العین چوں کہ خود کانگریسی ہیں اس لیے انھوں نے کانگریسیوں کی منفی سرگرمیوں کی پردہ پوشی کی ہے جب کہ مسلم لیگ کو سیاسی اور اخلاقی لحاظ سے کم زور اور تنگ نظر قرار دیا ہے مسلمانوں کے آپس کے تفرقے پر تنقید کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد نسیم نے کہا ہے:

اگر مسلمانوں کی سیاسی صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے تو تاریخ کا ایک شرم ناک پہلو یہ بھی سامنے آئے گا کہ مسلمان خود مسلمان کی نگاہ میں مطعون وملعون تھے۔ سیاسی ناسمجھی کے باعث مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کا فقدان تھا۔ ملّی شیرازہ بندی ناپید ہو کر رہ گئی تھی... ناول ''میرے بھی صنم خانے'' میں مسلمانوں کے ملّی انتشار اور ذہنی کش مکش کی یہ کیفیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ☆۵۰

اگر چہ قرۃ العین تقسیمِ ہند کے خلاف تھیں اور انھوں نے ناول میں کئی جگہ تقسیمِ ہند کے نتیجے میں ہندو فرقوں اور مسلمانوں کے درمیان ہونے والے فسادات، قتل و غارت گری، لوٹ مار اور سب سے بڑھ کر خوش گوار یادوں پر ماتم کیا ہے:

... یہاں کسی کو پتا نہیں تھا کہ کون ہندو ہے، کون مسلمان ہے، کون شیعہ ہے کون سنی۔ اپنے دکھوں اور تکلیفوں کے باوجود زندگی بڑی مکمل پر مسرت اور قانع تھی پرانی روایات کی پابندی اور قدیم چلن کو نبھانا سب کا مقدّس فریضہ تھا لیکن قومی رہنماؤں اور ہمدردوں نے انکشاف کیا کہ ہماری جنتا میں سیاسی شعور کا فقدان ہے۔ ☆۵۱

اگر چہ قرۃ العین حیدر تقسیمِ ہند کے خلاف تھیں لیکن ہندوؤں کے مسلمانوں کے ساتھ ظلم اور زیادتیوں سے انھوں نے بھی انکار نہیں کیا۔ ناول میں تقسیمِ ہند کے بعد ہندوؤں کی ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ زیادتیوں اور ان کی جائیدادوں پر قابض ہونے کا ذکر کر کے یہ بات ثابت کی ہے کہ ہندوؤں نے تعصب کی بنیاد پر مسلمانوں کو جانی، مالی اور روحانی طور پر نقصان پہنچایا، اور جو ہندو ابھی تعصّب کا شکار نہ ہوئے تھے انھیں ان کے ساتھی ڈرا دھمکا کر یا جائیدادوں اور زمینوں پر قبضہ کرنے کا لالچ دے کر انھیں مسلمانوں کے خلاف اکساتے۔

ناول میں قرۃ العین حیدر نے کنور علی کے منشی اقبال نرائن کے کردار کے ذریعے یہ حقیقت واضح کی ہے:

''...چاچا اگر تم ان کچھ مسلمنٹوں کی دی ہوئی روٹی کھانے سے باز نہیں آؤ گے تو یاد رکھو تمھارے حق میں آگے چل کر اچھا نہیں ہوگا۔'' ☆۵۲

کنور عرفان علی کے انتقال کے بعد اقبال نرائن کے بھتیجوں نے اسے دھمکی دی:

''اپنی جگہ سے نہ ہٹنا...کرواہا راج تو بس اب اپنا سمجھو، کچھ گورنمنٹ چھین لے گی اور جو گورنمنٹ نہ چھینے گی وہ ہم اپنے ڈنڈے کے زور سے لے لیں گے۔ ان ملیچھوں کی بھگوان نے بہت دنوں تک رسی دراز رکھی تھی۔ اب سارا بھارت ورش ہمارا ہے۔'' ☆۵۳

مقامی ہندوؤں کے علاوہ ہندو شرنارتھیوں کی زیادتیوں کا بھی ذکر کیا ہے جو انھوں نے ہندوستان میں آکر ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ کیں جو ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ان مسلمانوں کی جائیدادیں کوڑیوں کے داموں خریدی گئیں۔ یا انھیں قتل کر کے ان کی جائیدادوں اور مال و دولت پر قبضہ کر کے اپنی حیثیت کو بدل لیا۔

مسلمانوں کو ریلوں کی کھڑکیوں سے باہر پھینکا جا رہا تھا...مسلمانوں کے کاروبار معطل ہو چکے تھے۔ انھیں...کتّے کی موت مارنے کے ارادے کیے جا رہے تھے...مسلمان خوف و ہراس سے سہمے جا رہے تھے۔ انھوں نے اپنے مکانوں اور کوٹھیوں پر سے اپنے ناموں کے بورڈ اتار دیے تھے۔ ریلوں میں سفر کرنے کے لیے ہندو نام تجویز کر لیے تھے۔ اپنے ہندو دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر ریل کے سفر میں حملہ آوروں کے سوالات کا جواب دینے کی ریہرسلیں کی جاتی تھیں... مسلمان زمیں داروں کو اپنی عاقبت نظر آ رہی تھی۔ کاروباری الگ ہاتھ پر ہاتھ دھرے روتے تھے۔ ملازمت پیشہ مسلمانوں کو بہانے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نوکروں سے برطرف کیا جا رہا تھا۔ ☆۵۴

تقسیمِ ہند کے نتیجے میں قرۃ العین حیدر نے ہندو شرنارتھیوں کے بسنے والے دو مختلف طبقوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ جنھوں نے اپنی چالاکی اور ہوشیاری سے جلد ہی ترقّی کی تمام منازل طے کر کے فرش سے عرش تک پہنچ گئے۔

دولت مند شرنارتھی جو بڑے بڑے انگریزی ہوٹلوں، کوٹھیوں میں یا اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ ہر وقت اسکیٹنگ کرتے، شرابیں اڑاتے، اپنی بیویوں اور لڑکیوں کو بال روم ناچ سکھاتے...انھوں نے آتے ہی ٹھیکے لینے شروع کر دیے تھے اور دوسری ڈومینین کو ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی جائیدادیں کوڑیوں کے مول خرید رہے تھے۔ ☆۵۵

ماضی پرستی پر قرۃ العین حیدر نے اپنے افسانوں اور ناولوں پر خصوصی توجہ دی ہے۔ اس ناول میں بھی ماضی پرستی کے

حوالے سے انھوں نے پرانے دوستوں اور ہندو مسلم مشترکہ کلچر کو شدّت سے یاد کیا ہے۔ ناول کے دوسرے باب ''ڈھلتے ہوئے ساحل'' اور تیسرے باب ''منزلِ لیلیٰ'' میں ہندو مسلم مشترکہ کلچر لکھنؤ کی پُرتصنع زندگی کو بار بار یاد کیا ہے۔

یادوں کی تکلیف دہ کیفیت سے ناول کا ہر کردار گزرا ہے۔ یہ یادیں دوستانہ ماحول کی آزادی اور بے فکری کی یاد مشترکہ کلچر جس کی بھی ہوں اس سے کوئی کردار بھی دامن نہ چھڑا سکا۔

قرۃ العین ذاتی طور پر ہندوستان کی مشترکہ ہندو مسلم گنگا جمنی تہذیب کی پروردہ اور ذہنی طور پر اس کی زائیدہ ہیں۔ ان کے خیال میں تقسیم کا ردِ عمل غیر فطری تھا۔ اس لیے وہ اس سلسلے میں ذہنی تحفظات کی حامل ہیں اور تقسیم کی وکیل جماعت مسلم لیگ سے دلی ہمدردی نہیں رکھتیں۔ وہ ایک مشترکہ متحدہ اور پرامن ہندوستان کی خواہاں تھیں، جو بہر حال برقرار نہ رہ سکا۔

اس صورتِ حال سے انھیں خود بھی ایک ذہنی دھچکا لگا یا جس کو وہ بمشکل برداشت کر سکیں۔ میرے بھی صنم خانے اسی ذہنی کیفیت کی تخلیق ہے اور جہاں جہاں وہ جانب دار ہوئی ہیں وہ ان کی مجبوری تھی۔

آگ کا دریا

''آگ کا دریا'' نہ صرف قرۃ العین حیدر کا کامیاب ناول ہے، بلکہ اس ناول کا شمار اُردو ادب کے اعلیٰ ترین ناولوں میں ہوتا ہے۔

قرۃ العین نے ناول میں ہندوستان کی ڈھائی ہزار سالہ تاریخ و تہذیب کے پس منظر میں ناول تخلیق کیا ہے اس عرصے میں ہندوستان میں مختلف اقوام آئیں جنھوں نے یہاں پر صرف مذہبی اور تہذیبی اثرات ہی نہیں چھوڑے، بلکہ یہاں پر حکومت بھی کی اور جب یہ اقوام ترقی اور کامیابی کی تمام منازل طے کر چکی تو حالات نے پلٹا کھایا اور ان کا زوال شروع ہو گیا، اور پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ انھیں ہندوستان چھوڑنا پڑا۔

قرۃ العین نے اس طویل تاریخ کو بیان کرنے کے لیے ناول کو چار حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے پہلا حصہ عہدِ قدیم، دوسرا عہدِ وسطیٰ، تیسرا عہدِ جدید اور چوتھے حصّے میں انھوں نے قیامِ پاکستان کے بعد کے حالات سے اعتنا کیا ہے۔

قرۃ العین کے اس ضخیم ناول میں جو ہزاروں سال کی مدّت میں پھیلا ہوا ہے چند باتیں قابلِ غور ہیں۔

• چمپک، چمپاوتی، چمپا بائی اور چمپا احمد اور اس طرح کمال، ابوالمنصور کمال، نواب کمن اور کمال رضا حفیف سے اسی تبدیلی کے ساتھ ہر دور میں براجمان رہتے ہیں اور اس طرح قرۃ العین کے ذہن میں ''انسان'' کی جو یکسانی تھی اور اس کے رویّوں اور اعمال میں جو آدمیت مضمر ہے اس کی وضاحت و ترجمانی بڑے فن کارانہ انداز میں ہو گئی ہے۔

ناول ''آگ کا دریا'' کے پلاٹ کے بارے میں ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے اپنے خیالات کا اس طرح اظہار کیا ہے:

اس ناول میں انھوں نے خاصے رجحانات سمیٹ لیے ہیں اور شعور کی رو داخلی خود کلامی، تلازمہ خیال اور اساطیر کے حوالوں سے تہذیب کے بننے بگڑنے اور نئی شکل میں متشکل ہونے کے ماجرے کو بڑی فنی خوبیوں سے پیش کیا ہے۔☆۵۶

قرۃ العین حیدر کا خیال تھا کہ عصری تبدیلیوں کے باوجود انسان کی آدمیت برقرار رہتی ہے اور اپنے اس دعوے کو انھوں نے فنی رچاو، مہارت اور ذہانت سے جس طرح ثابت کیا ہے وہ ان کے پائے کا فن کار ہی کر سکتا تھا۔ اس کو شاید ہندو مت آواگون کہتے ہیں۔ آواگون عقیدے کے لحاظ سے درست ہو یا غلط، ایک فن کار کے طور پر قرۃ العین کے بڑا کام آیا۔

... ناول ویدک عہد سے شروع ہو کر مغلیہ خاندان کے دورِ حکومت، مغلیہ سلطنت انگریزی مداخلت اور پھر ملک کی تقسیم اور اس کے بعد ہندوستان پاکستان میں پیدا شدہ مسائل کو پیش کرتا ہوا ختم ہوا ہے۔☆۵۷

اسی ناول کے بارے میں ڈاکٹر نیلم فرزانہ نے یہ رائے دی ہے:

''آگ کا دریا''... ایک ایسا ناول ہے جس کا دائرہ ہندوستان کی تاریخ سے لے کر عہدِ جدید، بلکہ تقسیمِ ہند کے بعد کے کئی سال پر محیط ہے گویا پورے ہندوستانی کلچر کی تبدیلیوں کی ایک رزمیہ داستان ہے۔☆۵۸

ناول میں برِصغیر کی تاریخ کے علاوہ مسلم فلسفہ کے مختلف موضوعات کو جس انداز میں بیان کیا ہے وہ ان کے تاریخی شعور اور فلسفہ پر ان کی گہری نظر کو ظاہر کرتا ہے ان خوبیوں نے ناول کی ادبی حیثیت پر مثبت اثرات ڈالے ہیں۔

ناول کا کینوس بہت وسیع ہے اس لیے ناول کے موضوع کے بارے میں ناقدین کی مختلف آرا ہیں، لیکن ناول کا بغور مطالعہ کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ''آگ کا دریا'' میں قرۃ العین نے پہلے ہندوستان میں مختلف اقوام کے اثرات سے بننے والے مشترکہ کلچر کو بیان کیا ہے اور پھر اس کلچر کے بکھرنے کا افسوس کا اظہار کیا ہے۔

پلاٹ، فضا، کردار اور موضوع ہر لحاظ سے یہ ناول تقسیمِ ہند کے موضوع پر لکھے گئے تمام ناولوں سے منفرد ہے۔ گو تقسیم کا معاملہ اس ناول کا محض ایک حصّہ ہے۔

''آگ کا دریا''... تمام سمتوں میں پھیلا ہوا ہے اس میں ماضی کی تاریخی اور حال کی داستان کے ساتھ ساتھ تو مستقبل کے خواب بھی ہیں انھوں نے اس دکھ کو تلاش کر لیا ہے جو ماضی میں ہمارے کرب کا باعث بنا تھا حال میں ہماری زندگیوں کو تلخ بنا دیا ہے اور اگر اس دکھ کو دور نہ کیا گیا تو مستقبل بھی اسی آگ کی نظر ہو جائے گا... یہ ایک ایسا ناول ہے جس میں جدیدیت بھی

ہے،شعور بھی ہے۔☆۵۹

اس ناول سے متاثر ہو کر ہمارے دوسرے ادیبوں نے ناول لکھے جن میں خدیجہ مستور کا ''آنگن' عبداللہ حسین کا ''اداس نسلیں'' اور شوکت صدیقی کا ''خدا کی بستی' جمیلہ ہاشمی کا ناول 'تلاشِ بہاراں'' قابلِ ذکر ہیں۔

قرۃ العین نے ناول کے چاروں حصوں میں اس کی فضا پر خاص توجہ دی ہے۔منظر چاہے قدیم ہندوستان ہو، مغلیہ عہد کا، انگریزوں کا یا عہدِ جدید میں یونیورسٹیوں اور کالج کا ذکر ہو یا تحریکِ پاکستان اور قیامِ پاکستان کے ابتدائی سالوں کا انھوں نے ہر دور کے ماحول اور فضا کو اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے۔

ڈاکٹر اسلم آزاد قرۃ العین کے ناول کی فضا پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے:

قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں مناظر کا احساس شدّت کے ساتھ ظاہر ہوا ہے...ان کی منظر نگاری بھی کوئی نہ کوئی تاریخی مقصدیت اور صداقت کی حامل ہے۔منظر نگاری برائے منظر نگاری نہیں ہوتی، بلکہ رومانی ہونے کے باوجود ان کے ناول کے مناظر میں مشاہداتی فکر انگیزی موجود ہے۔مشاہدات کی باریک بینی ان کے مناظر کو اور جاذب بناتی ہے۔وہ زندگی کے کھوکھلے پن کو شدّت کے ساتھ بیان کرنے کے لیے رومانیت کو ہلکی چاشنی کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ان کی تخلیقی بصیرت کی روشنی مناظر کو توانائی بخشتی ہے۔☆۶۰

ہر تہوار کے روز رگھو ماما کے آنگن میں ساری لڑکیاں جمع ہوتیں۔کڑھائی چڑھائی جاتی چٹائیوں پر بیٹھ کر چھپی ہوئی ساریوں میں لچکا ٹانکا جاتا۔ڈھولک پر....کیرتن اور قوالی ہوتی...اس خوش باش خاندان میں بیس پچیس ہندو لڑکیاں تھیں اتنی ہی مسلمان اور دو لڑکیاں عیسائی تھیں جن میں سے ایک... پادری صاحب کی بیٹی تھی اور فراک پر دوپٹا اوڑھ کر آتی۔☆۶۱

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ہند کے نتیجے میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا، لیکن اس سے قبل ہزاروں مسلمانوں اور ہندوؤں کو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے۔

ہندوستان سے پاکستان ہجرت کے دوران لاکھوں مسلمان شہید ہوئے۔آزادی کی منزل تک پہنچنے کے لیے جن قیمتی جانوں کا نقصان ہوا اسے قرۃ العین نے علامتی انداز اس طرح بیان کیا ہے:

اگست کی بارشیں اب کہ ایسی ٹوٹ کر برسیں کہ زمین آسمان اس میں ڈوب گئے...بارشوں کا پانی جو شفاف تھا...اس میں خون ملا تھا۔۔۔ خون کی برکھارت، خون کی کیچڑ، خون برسانے والے بادل۔☆۶۲

''آگ کا دریا'' کا پلاٹ وسیع اور جامع ہے ہندوستان کی ڈھائی ہزار سالہ تاریخ کو انھوں نے تسلسل اور ربط سے لکھا ہے، اور تمام تاریخی واقعات کو اس انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ ان میں کوئی جھول نظر نہیں آتا۔ تاریخ کو واضح کرنے کے لیے انھوں نے اسے مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے اور ایک ہی ناول میں انھوں نے ہندوستان کی تہذیبی و تاریخی ارتقا کی بہت سے منازل طے کر لی ہیں۔ بقولِ ڈاکٹر اسلم آزاد:

> اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرۃ العین حیدر کے ناولوں نے پلاٹ کے اعتبار سے بھی اُردو ناول نگاری کو جدید ترین فنی ہیئت سے آشنا کیا ہے۔☆ ۶۳

''آگ کا دریا'' میں ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت کی نشان دہی ان الفاظ میں کی گئی ہے:

> ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی حیثیت کا مسئلہ بہت ٹیڑھا بنتا جا رہا تھا۔ ہندو جو سَوا سَو سال سے انگریزی تعلیم سے روشناس ہو چکا تھا اپنے گنجلک مابعد الطبعیاتی ذہن اور خاص تجریدی فلسفے کے باوجود پریکٹیکل تھا۔ مسلمانوں کے عہد میں فارسی پڑھ کر حکومت کے نظم و نسق میں حصہ لیا۔ مسلمان حکم راں اور صوبے دار صرف فرمانوں پر دستخط کر دیتے تھے۔ دیہی ایڈمنسٹریشن ہندو چلاتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی آئی تب بھی ہندو نے فوراً حالات سے سمجھوتے کر لیا، اور مغلوں کا کائستھ منشی پل کی پل میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کلرک میں تبدیل ہو گیا۔☆ ۶۴

برِصغیر میں مسلمانوں کی سیاسی اور سماجی حالت دن بہ دن بگڑتی گئی اور ان مشکل حالات میں مسلمانوں نے علیحدہ مسلم مملکت کے قیام کا مطالبہ کیا۔ ان کا یہ مطالبہ پورا ہوا لیکن انھیں اپنے مقصد کے لیے مسلسل جدوجہد کرنی پڑی۔ اس حقیقت کو قرۃ العین حیدر ایک رومانی ناول نگار کی حیثیت سے بیان کیا ہے۔

ناول میں تاریخ کے ساتھ ساتھ فلسفے اور نفسیات پر بھی توجہ دی گئی ہے۔ ہر تاریخی واقعے کا وہ نفسیاتی تجزیہ بھی کرتی ہے اور اس کے بارے میں کوئی نہ کوئی فلسفیانہ نظریہ بھی پیش کرتی ہیں۔ ان خصوصیات نے ناول کی دل چسپی میں اضافہ کیا ہے اور قاری ناول پر غور و فکر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے:

> ...ہندوستان میں اَن گنت اسرار تھے۔ مذہب، فلسفہ، آرٹ، رمزیت، تصوّف، ادب، موسیقی، کیا کچھ یہاں نہیں تھا، ایک طرف یہ زبردست عظیم الشان ورثہ تھا، دوسری طرف انگریزی تمدّن تھا، صاحب لوگوں کا راج تھا، اسمبلی کے قانون تھے، گورنر کے دربار تھے۔☆ ۶۵

اس سلسلے میں ناول نگار نے فلسفے میں ''وقت'' اور نفسیات میں ''ماضی پرستی'' کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔

''وقت'' کا فلسفہ ناول میں شروع سے آخر تک ہر جگہ نمایاں طور پر نظر آیا ہے۔ انسان کی زندگی میں جو اتار چڑھاو اور

تبدیلیاں آتی ہیں وہ وقت ہی کے مرہون منت ہیں، اور اس کے آگے انسان مجبور و بے بس ہے۔

ناول کی کردار طلعت ایک جگہ وقت کے فیصلوں سے تنگ کر کہتی ہے:

وقت کی اس شعبدہ بازی نے مجھے بڑا حیران کر رکھا ہے... میں وقت کے ہاتھوں عاجز آ چکی ہوں۔☆۶۶

ناول میں ایک اور جگہ قرۃ العین نے وقت کے بارے میں یہ فلسفہ پیش کیا ہے:

وقت کو مختلف حصّوں میں قید کر لیا گیا ہے مگر وہ پل پل چھن چھن اس قید کو توڑتا ہوا چپ چاپ آگے نکلتا جاتا ہے۔☆۶۷

قرۃ العین نے ناول میں ہر کردار کا نفسیاتی تجزیہ بھی کیا ہے اور کرداروں کی زندگیوں میں آنے والی مختلف تبدیلیوں اور حادثات سے ان کی شخصیت پر جو اثرات پڑے ہیں اسے انھوں نے گہرے مشاہدے کے بعد بیان کیا ہے۔

تقسیمِ ہند کے حوالے سے انھوں نے ماضی پرستی اور انسان کی تنہائی کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ انھوں نے کمال کی ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد کی کیفیت کو اس طرح بیان کیا ہے:

...وہ چونک پڑا آنکھیں مل کر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ ہری شنکر غائب ہو چکا تھا یہ ۱۹۴۲ء نہیں تھا۔ وہ ۱۹۵۶ء کے دہرہ دون میں موجود تھا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں ملیں وہ تو اپنے مکان کے پھاٹک میں بیٹھا تھا۔☆۶۸

ناول کا کردار کمال ہندوستان سے پاکستان ہجرت کے دوران اپنے ساتھیوں سے جدا ہو جاتا ہے اگر چہ پاکستان میں اسے زندگی کی تمام مادّی سہولتیں میسّر تھیں لیکن روحانی طور پر خوش نہ ہونے کی وجہ سے مادّی خوشیوں کی بھی کوئی اہمیت نہ رہی تھی اس کیفیت کو ناول میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

'کیا کروں پارٹنر'— ٹرین میں بیٹھتے ہوئے اس نے دل میں کہا۔ 'میرا بڑا افسوس ناک خاتمہ ہوا۔'☆۶۹

قرۃ العین نے ناول کے اسلوب پر بھی بہت توجہ دی ہے۔ ناول کے چاروں ادوار کے مختلف واقعات کو انھوں نے اس کے ماحول کی زبان کے مطابق بیان کیا ہے۔

اگر چہ ناول کے ابتدائی حصّے میں ہندی الفاظ اور ان کے مذہب پر زیادہ توجہ دی گئی ہے اس لیے مجموعی طور پر ہم ناول کے ابتدائی حصّے کے اسلوب کو مشکل کہہ سکتے ہیں، لیکن اس خوبی سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں برِّصغیر کی تاریخ اور مذہب کو پیش کیا گیا ہے۔ بقولِ ڈاکٹر ممتاز احمد خان:

> اس میں کوئی شک نہیں کہ قرۃ العین حیدر نے اپنے اسلوب کو اس تکنیک کے ذریعے جو کمال عطا کیا ہے وہ انھیں کا حصّہ ہے اور ناول تصنیف کرنے والوں کے لیے ایک راستہ بھی کہ کس طرح ہیئت، مواد اور موضوع کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے ایک تکنیک کو اس طرح برتا جائے کہ محض ایک دو عہد نہیں، بلکہ کئی نسلیں اور کئی صدیاں منعکس ہو جائیں۔☆۷۰

ناول کے کردار بھی منفرد ہیں یہ کردار ہندوستان میں رہنے والی مختلف اقوام، مذاہب اور حکم رانوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مثلاً گوتم نیلمبر اور ہری شنکر ہندومت کی، ابوالمنصور کمال مسلمانوں کی اور سرل ایشلے انگریزوں کی نمائندگی کرتا ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ صرف نام اور چہرے بدل جاتے ہیں۔ انسان کبھی نہیں بدلتا اس کی خواہشات، جذبات و احساسات، خوشیاں اور غم اور سوچ و فکر میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں آتی۔ قرۃ العین حیدر نے ناموں کے فرق کو بھی ختم کر دیا ہے اور ہر دور میں مخصوص ناموں کو ہی دہرایا ہے۔

گوتم نیلمبر، کمال، چمپا، اور ہری شنکر کے کردار قدیم ہندوستان سے لے کر قیامِ پاکستان کے ابتدائی دس سالوں تک کے حالات کی نمائندگی کرتے ہیں، لیکن ہر دور میں ان کی زندگی کی مصروفیات اور مقاصد مختلف ہیں جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بدلتے گئے، لیکن عام انسان کی طرح ان کرداروں کے بعض جذبات و احساسات، سوچ و فکر میں کوئی قابلِ ذکر تبدیلی نہیں آئی۔

ان کرداروں کے علاوہ سرل نرملا، طلعت، احمد رضا کے کرداروں کا اضافہ جدید دور میں ہوا اور ناول میں سرل کے علاوہ باقی کرداروں کی حیثیت ثانوی ہے۔

پہلے دور کے گوتم نیلمبر کا کردار قدیم ہندوستانی تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے۔ قرۃ العین نے گوتم نیلمبر کے کردار کے ذریعے پاٹلی پترا، تکشلا، ہستناپور، کاشی، ایودھیا اور لکھنؤ کی تہذیب و تمدن کو پیش کیا ہے۔ ناول کا یہ اہم کردار ابتدائی دور میں فلسفہ کا طالب علم تھا اور ہندومت سے تعلق رکھتا تھا۔ فلسفی ہونے کی وجہ سے گوتم غور و فکر میں غرق رہتا اور مذہب، خوف، تنہائی، موت اور ہجرت وغیرہ اس کے غور و فکر کے خالص موضوع تھے۔

رفتہ رفتہ اس کے فلسفی ساتھیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ ان سب سے خوش اخلاقی سے پیش آتا اُستاد کی طرف سے ان طالب علموں کو حکم تھا:

> ...وہ ذات اور نسل کے غرور اور شہرت اور نیند کی تمنا سے دور رہے۔ شیخی اور خودنمائی کے جذبات پر قابو پائے دماغ کا سکون اور دل کا ضبط کرے۔☆۷۱

گوتم اپنے اُستاد کے تمام احکامات کی پیروی کرتا لیکن وہ دل کا سکون حاصل نہ کر سکا اور اکثر سوچتا:

> باسٹھ مختلف نظریے — اور زندگی ایک ہے — اور انسان تنہا ہے۔☆۷۲

دوسرے دور میں گوتم ایک اداکار، سنگتراش اور مصور ہے، اور اسے ناچنے میں بھی کمال حاصل ہے۔ اسی دور میں اس کی ملاقات چمپک سے ہوتی ہے جو برہم چاریہ ہے اور ناچنے میں وہ بھی ماہر ہے۔

گوتم ایک پرعزم نوجوان ہے وہ زندگی میں بڑی بڑی کامیابی حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہے ایک جگہ وہ چمپک سے کہتا ہے:

> تم سمجھتی ہو۔ میں بالکل نکما، تخیل پرست مسخرہ ہوں جیسے سب طالب علم ہوتے ہیں مگر چمپک رانی ایک روز تم سنو گی کہ شراوستی کا گوتم نیلمبر بہت بڑا چتر آچاریہ بن چکا ہے۔☆۷۳

اسی دور میں چندرگپت شراوستی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ اس جنگ میں مجبوراً گوتم کو بھی شامل ہونا پڑا، اور گوتم کو چمپا سے جدا ہونا پڑا۔

> شراوستی کے بازاروں میں حملہ آوروں سے وہ دن بھر لڑا تھا۔ رات گئے تک لڑتا رہا تھا اور پھر نیزہ لے کے ایک وار کی تاب نہ لاکر گر پڑا۔ جب اسے ہوش آیا...وہ زخموں سے چور ہے...تب اسے ایک اٹل حقیقت کا اندازہ ہوا۔ ہاتھ، انگلیاں جو حسن کی تخلیق کے لیے بنائی گئی ہیں خون میں نہلا دی جاتی ہیں کسی خاموش دیار میں بیٹھ کر وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔☆۷۴

جنگ ختم ہونے پر گوتم جب گھر لوٹ کر آیا تو اسے پتا چلا کہ جنگ کے دوران اس کے ماں باپ مارے جا چکے تھے۔ گوتم کو خیال آیا کہ غالباً چمپک بھی جنگ کے دوران مر چکی ہوگی۔

ان حالات میں ایک گوالن نے گوتم کا بھرپور ساتھ دیا لیکن زخموں کے ٹھیک ہوتے ہی گوتم اسے چھوڑ کر کاشی چلا گیا۔

اب گوتم کی انگلیاں کٹ چکی تھیں اس لیے وہ مصوری اور سنگ تراشی کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس لیے اس نے ڈراموں میں کام کرنا شروع کر دیا۔ اسی دوران گوتم کی ملاقات امبیکا سے ہوئی اور اس نے امبیکا کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا، اور اس طرح کئی برس گزر گئے جب وہ ۳۸ سال کا ہوا تو ایک دن پاٹلی پترا میں اسٹیج ڈرامہ کرتے ہوئے اسے چمپک نظر آئی۔ شدید دکھ اور تکلیف کی حالت میں اسے اس حقیقت کا انکشاف ہوا:

> ...اتفاقات، حادثات، وقت کے انوکھے کھیل بھی بہت بڑی حقیقت ہیں وہ سنبھل کر پھر اداکاری میں مصروف ہوگیا۔☆۷۵

آخر گوتم دل برداشتہ ہو کر سرجوندی کی طرف چلا گیا۔ پانی کی موجوں سے وہ کنارے کے بہت قریب پہنچ گیا۔ پانی کی لہریں بہت اونچی ہوتی گئیں۔ گوتم نے چٹان کا سہارا لینا چاہا، لیکن کٹی ہوئی انگلیوں کی وجہ سے اسے زیادہ دیر تک پکڑ نہ سکا،

اورلہروں ہی میں گم ہوگیا۔

چوتھے دور کا گوتم نیلمبر دت ایسٹ انڈیا کمپنی میں سرل کا کلرک ہے۔وہ کلکتے کا ایک پڑھا لکھا نوجوان ہے۔بی۔اے کرنا اس کی سب سے بڑی خواہش تھی اپنی خواہش کی تکمیل کے بعد وہ ایک کالج میں پروفیسر بن جاتا ہے،اور برہمو سماج کا رکن بن جاتا ہے۔

اس دور میں گوتم کو چمپا بائی سے عشق ہو جاتا ہے جو لکھنؤ کی مشہور طوائف تھی۔

کلکتہ میں وہ دن رات پڑھتا تھا پھر کتابوں پر سر رکھ کر سو جاتا۔آج پہلی مرتبہ رات کو ورڈز ورتھ اور شیلے اور کالی داس کے متعلّق سوچنے کی بجائے اس کے دماغ پر چمپا کے تصوّر نے تسلّط جمایا۔☆۷۶

بہت جلد چمپا بھی گوتم کی محبت میں گرفتار ہوگئی اور شادی کی پیش کش کی لیکن گوتم نے اسے اہمیت نہ دی،اور کلکتہ میں اپنے پرانے معمولات کی مطابق زندگی گزارنے لگا،اور ایک دن پڑھ لکھ کر پروفیسر بن گیا۔

جدید دور کا گوتم نیلمبر امیر طبقے کا نوجوان ہے جو یونیورسٹی سے ایم اے اور قانون کی ڈگریاں حاصل کر چکا ہے۔وہ ایک پرعزم نوجوان ہے اور جرنلزم،سیاست اور آرٹ ہر میدان میں نام کمانا چاہتا ہے۔

اس کے ساتھیوں میں کمال،ہری شنکر،چمپا،احمد رضا،نرملا،تہمینہ اور طلعت شامل ہیں وہ اپنے ساتھیوں اور پروفیسروں میں بہت مقبول ہے،اوران کے ساتھ فلسفے کے مختلف موضوعات مثلاً زندگی،انسان،موت،وقت،ماضی،ہجرت وغیرہ پر بحث کرنے میں مصروف رہتا۔

جب ملک میں تحریکِ پاکستان شروع ہوئی تو ان کی گفتگو میں تحریکِ پاکستان سے متعلّق بھی بحث ومباحثہ شروع ہو گیا۔گوتم اوراس کے ساتھ اس سیاسی مسئلے کے مطابق اپنے اپنے نظریات پیش کرتے ہیں۔

... ہر طرف مہا تما گاندھی اور نہرو اور قائدِ اعظم جناح اور کارل مارکس کا چرچا تھا۔☆۷۷

گوتم اوراس کے ساتھی کانگریس کے حامیوں میں سے تھے جب کہ چمپا مسلم لیگ میں شامل تھی چمپا کے ساتھی اس کے نظریات کی شدید مخالفت کرتے اور اکثر بحث کا انجام تلخ کلامی ہوتا لیکن گوتم یہ معاملہ بھی خوش اسلوبی سے ختم کروا دیتا،اور دوسروں کی غلطیوں کی بھی معافی مانگتا:

''چمپا باجی...کمال نے آپ سے کافی سخت باتیں کیں۔میں اس کی طرف سے آپ سے معافی مانگتا ہوں۔'' ☆۷۸

اگرچہ گوتم ہندومت سے تعلّق رکھتا تھا،لیکن مذہبی تعصّب سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔وہ پیار محبت اور امن سے

تمام معاملات طے کرنا چاہتا تھا:

''ہم امن چاہتے تھے، ہم امن چاہتے ہیں، ہم لڑنا نہیں چاہتے ہم ہرگز نہیں لڑیں گے۔'' ☆۷۹

طویل جدوجہد کے بعد تقسیمِ ہند کا اعلان ہوا۔ گوتم کو ملک کی تقسیم کا بے حد دکھ ہوا۔ گوتم کے خیال کے مطابق صرف ایک ملک ہی کی تقسیم نہیں ہوئی تھی، بلکہ ہندو مسلم کلچر کی تقسیم تھی۔

گوتم کہہ رہا تھا، ''پاکستان مسلمانوں کا اقتصادی مسئلہ حل کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔'' ☆۸۰

تقسیم کے بعد گوتم ہندوستانی سفارت خانے کے ساتھ ماسکو چلا گیا، اور پھر وہ یورپ کے بہت سے ممالک میں گیا، اور بہت ترقی اور شہرت حاصل کی ہندوستان کی فارن پالیسی، اس کے اقتصادی مسائل اور ملکی سیاست پر اس نے دو کتابیں لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں۔ یورپ میں بہت اچھا وقت گزارنے کے بعد آخر گوتم ہندوستان لوٹ آیا۔

گوتم ہندوستان لوٹ کر آیا تو اس کے پاس اعلیٰ عہدہ تھا، علم تھا اور ہر چیز کا تجربہ تھا، لیکن وہ رونقیں اور محفلیں نہ تھیں جو تقسیمِ ہند سے قبل تھیں۔ جس کی وجہ سے وہ ہر مادی خوشی کے باوجود دل کا سکون حاصل نہ کر سکا۔

کمال جو پاکستان سے ہندوستان آخری بار آیا تھا ہمت اور حوصلے کی کمی کی وجہ سے گوتم کی خواہش پر بھی اس سے ملنے نہ گیا، لیکن ہری شنکر اور گوتم اصل حقیقت سے ناواقف ہونے کی وجہ سے بے حد رنجیدہ ہو گیا۔

...سالا دتی ہوتا ہوا گیا۔ اگر مجھے تار دے دیتا تو میں اس سے آ کر وہیں مل لیتا۔ ☆۸۱

حالاں کہ گوتم کا یہ خیال محض غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔

ناول کا اہم کردار چمپا بھی ناول کے چاروں ادوار میں موجود ہے۔ ہر دور میں چمپا خوب صورت، ذہین اور باشعور ہے۔ چمپا کے کردار کے ذریعے قرۃ العین نے برِصغیر کی تاریخ اور معاشرت کے علاوہ ہر دور میں عورت کی محبت، ایثار اور معاشرے میں اس کی بے قدری کو بھی بیان کیا ہے۔

جیسا کہ بیگم افضل کاظمی نے ''چمپا'' کے کردار کے بارے میں رائے دی ہے:

> چمپا ہندوستانی عورت کی علامت ہے یہ عورت خواہ ہندو ہو یا مسلمان، شریف اور اعلیٰ خاندان سے متعلق ہو یا طوائف، ہر حال میں وہ پیاسی ہی رہتی ہے۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی خواہش کو جاننے کی کسی نے کوشش نہیں کی۔ خواہ وہ گھر کی چار دیواری میں مقید رہنے والی بے زبان، شرم و حیا کی پتلی ہو یا اعلیٰ تعلیم یافتہ یا آزاد ماحول کی پروردہ، نوشتہ، تقدیر یکساں ہی رہتی ہے۔ ☆۸۲

ابتدائی دور میں چمپا کا نام ''چمپک'' ہے۔ وہ رقاصہ ہے اور فلسفے سے بھی دل چسپی رکھتی ہے۔ اس دور میں گوتم اس کا

عاشق ہے۔وہ جنگل میں غور وفکر کے لیے آئی ہےاور گوتم سے فلسفے کے مختلف موضوعات پر بحث کرتی ہے۔گوتم اور چمپا کی محبت کا انجام جدائی پر ہوتا ہے۔

دوسرے دور کی چمپاوتی ایودھیا کے پنڈت کی بیٹی ہے۔ابوالمنصور کمال الدین جب ایک مورخ کی حیثیت سے ہندوستان آیا تو اسے تحقیق کے سلسلے میں چمپا کے والداور دوسرے پنڈتوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔اسی دوران اسے چمپا سے عشق ہوگیا۔کمال چمپا کو مسلمان کرنے کے بعد اس سے شادی کا خواہش مند تھا۔

''سنو چمپاوتی، مجھ سے بیاہ کرلو...میں کہتا ہوں مسلمان ہو جاؤ۔عاقبت سدھر جائے گی...''

''رام رام— کیسی باتیں کرتے ہو! میں کیوں ہونے لگی مسلمان، مجھے تو تمھارے مولویوں کی داڑھیوں سے ہی ڈر لگتا ہے۔جون پور کے قاضی بن کر تم بھی یہ لمبی سی داڑھی رکھ لوگے!''

''اب بھی وقت ہے چمپارانی۔دیکھنا،کسی دن کسی سر گھٹے پنڈے کے پلّے باندھ دی جاؤ گی جو عمر بھر ٹہل کروائے گا اور جب مرے گا تو اس کے پیچھے پیچھے چتا میں دھکیل دی جاؤ گی۔کبھی اپنے اس خوف ناک مستقبل پر غور کیا ہے؟''

''میں تو تمھارے ساتھ بھی مرنے کے لیے تیار رہوں،تم مر کے تو دیکھو!''

''سنو چمپا۔سچ مچ۔مجھ سے بیاہ کرلو۔''

''کاہے اپنی ذات بگاڑتے ہو۔تم سیّد زادے ٹھہرے۔''

''تم بھی برہمن ہو،اور ویسے تمھاری ذات اور اونچی ہو جائے گی۔سیّدانی کہلاؤ گی!''

''مگر ہم تو تم کو یوں ہی اپنا پتی مانتے ہیں۔''

وہ یہ سن کر چکرا گیا۔''وہ کیسے۔میرا تم سے بیاہ کہاں ہوا ہے...''

''اس سے کیا ہوتا ہے...ہم تو تم کو اپنا مالک خیال کرتے ہیں...ہم تو صرف ایک آدمی کو اپنا پتی سمجھیں گے اور وہ آدمی تم ہو۔ہمارا تمھارا تو جنم جنم کا ساتھ ہے۔''

''جنم جنم کا ساتھ،کیا خرافات ہے...پھر تم نے جادوگری کی باتیں شروع کیں۔''

''اِس میں جادو کیا ہے...کیا کوئی لڑکی کسی آدمی کو خود سے پسند نہیں کرسکتی۔ہم نے تمھیں چنا ہے اور ہم تمھارے آگے جھکتے ہیں۔''

''کیا کفر بکتی ہو۔میں نعوذ باللّٰہ کوئی خدا ہوں۔''

''ہو تو سہی۔دل ہی تو خدا کو جنم دیتا ہے...اچھا یہ بتاؤ تم ہم سے بڑی محبت کرتے ہو نا؟''

''کرتا کیوں نہیں ہوں۔''

''تو پھر اتنی گھبراہٹ کا ہے کی۔کبیر یہ گھر ہے پریم کا، خالہ کا گھر نا نہہ۔'' ☆۸۳

مندرجہ بالا طویل اقتباس صرف چمپا اور کمال کے تعلقات ہی کو ظاہر نہیں کرتا، بلکہ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ چمپا اور کمال ایک دوسرے سے شدید محبت کرنے کے باوجود مذہب کے معاملات میں قربانی دینے کے لیے تیار نہیں۔ دونوں اپنے مذہب کو بہتر اور دوسرے کے مذہب کو سخت اور کمتر اور غیر فطری سمجھ رہے ہیں۔

اس خیال کی تائید ڈاکٹر اسلم آزاد نے ان الفاظ میں کی ہے:

> یہ دو افراد کی گفتگو کا منظر بھی ہے، دو نظریہ حیات، دو نظامِ زندگی، دو کلچر، دو مذہب اور دو تہذیبی ماحول کی وضاحت بھی۔ چمپا شوخ ہے، بے باک، زندگی کی قوتوں سے بھرپور ہے۔ اپنے مذہب اور ہندوستانی تہذیب کی طاقت وَر نمائندہ ہے، کمال دردمند دل رکھتا ہے۔ جذبۂ محبت سے سرشار ہے۔ مذہبی تعلیمات اور اپنے تہذیبی ماحول کا مکمل ترجمان ہے۔ پرستش اس کے خیال میں صرف خدا کی ہو سکتی ہے... سجدے کی مستحق صرف اللّٰہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ☆۸۴

ناول نگار نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ دونوں کی جذباتی کیفیات اور ذہنی تصورات کی نشان دہی کی ہے۔

تیسرے دور کی ''چمپا بائی''، لکھنؤ کی مشہور طوائف ہے۔ یہاں چمپا کے کردار کے ذریعے لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت، اور خوش حالی اور لوگوں کی عیش پرستی کو دکھایا گیا ہے جب لکھنؤ کے معزز شہری بھی طوائفوں کے پاس جانا باعثِ فخر سمجھتے تھے ان کی اس سرگرمیوں کو معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔

یوں تو چمپا بائی کے اس گوتم، نواب کمن (کمال) اور سرل ایشلے سبھی جاتے، لیکن چمپا اور گوتم کے تعلقات عشق کی شکل اختیار کر گئے۔ مگر گوتم کا عشق چند دن کا کھیل تھا اس کے لیے عشق سے زیادہ اہم اس کی تعلیم تھی۔

> ''...چمپا...تمھاری زندگی اتنی رنگین ہے بہت جلد تم مجھے بھول جاؤ گی...میرا اور تمھارا کیا ساتھ ہے۔'' ☆۸۵

جب کہ چمپا کے لیے یہ عشق ساری زندگی کے لیے روگ بن گیا۔

جنگِ آزادی کے بعد لکھنؤ پر برا وقت آیا تو عام شہریوں کی طرح طوائفیں بھی اس سے متاثر ہوئیں اور چمپا بائی ایک امیر طوائف سے ایک غریب اور نشے کی عادی فقیرنی بن گئی۔

چمپا بائی کے کردار کے ذریعے قرۃ العین یہ بات ثابت کرنا چاہ رہی ہیں کہ عورت ہر حیثیت سے باوفا ہے۔ چمپا بائی ایک طوائف ہے، لیکن محبت کے معاملات میں اس کے جذبات و احساسات ایک عام لڑکی سے مختلف نہیں۔

جدید دور کی چمپا احمد کا تعلق پڑھے لکھے متوسط طبقے سے ہے وہ ایک کالج کی طالبہ ہے وہ خود تو مسلمان ہے لیکن اس کے ساتھیوں میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔ مذہبی اختلافات کے باوجود وہ گوتم، ہری شنکر، نرملا اور لاج سے بھی اسی محبت سے ملتی جیسے تہمینہ، طلعت اور کمال سے ملتی تھی۔

جب تحریکِ پاکستان اپنے زوروں پر پہنچی تو چمپا اور اس کے گھر والے مسلم لیگ میں شامل ہو گئے، اور وہ سب مل کر اکثر قیامِ پاکستان کے مطالبے پر تبادلۂ خیال کرتے۔

مسلم لیگی ہونے کی وجہ سے چمپا اپنے دوستوں میں ناپسند کی جانے لگی۔ اس کے دوست اس سے کترانے لگے برسوں پرانی دوستی اب رسمی تعلقات تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ یونیورسٹی اور کالجوں میں طلبہ و طالبات ملک کے سیاسی حالات پر بحث کرتے، اور ایک پارٹی دوسری پارٹی کو تنقید کا نشانہ بناتی تو چمپا سوچتی:

> ... یونیورسٹی علم کا گھر ہے۔ علم میں تعصب کس طرح داخل ہوتا ہے یہ اسے معلوم نہ تھا۔ تعصب اور نفرت اور تنگ نظری، شکوک اور ہٹ دھرمی ان بھوتوں سے وہ ابھی روشناس نہیں ہوئی تھی۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کے آس پاس کی دنیا میں بڑا زبردست شور مچ رہا ہے، اور یہ شور اس کے دل کی اندرونی خاموشی میں مخل ہوتا تو بڑی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔☆۸۶

لوگ تعلیمی اداروں کے علاوہ گھروں، محلّوں اور بازاروں ہر جگہ پاکستان بننے یا نہ بننے، ہندو مسلم اختلافات پر بحث کرتے نظر آتے۔

> ''پاکستان بنا تو مرادآباد کا علاقہ تو اس میں ضرور شامل ہوگا۔ کیا وجہ کہ مغربی اضلاع میں مسلمان زیادہ طاقت ور ہیں،'' چمپا کے والد نے اظہارِ خیال کیا۔
>
> ''اے واہ۔ مرادآباد پاکستان میں شامل ہو جائے اور ہم کاشی والے کہاں جائیں'' چمپا کی والدہ چہک کر کہتیں۔
>
> ''اجی تم پوربیوں کا کیا ہے۔ چلو تم کو بھی وہیں بلا لیں گے۔'' ☆۸۷

چمپا کے ساتھیوں نے جب اس کے ساتھ میل جول کم کر دیا تو اسے ماضی کی بھی ایسی باتیں یاد آئیں جس سے چمپا کو احساس ہوا کہ وہ ہمیشہ سے اپنے ساتھیوں کے لیے اجنبی تھی، اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جب خوشگوار تعلقات تھے اس وقت بھی وہ دل سے چمپا کو پسند نہ کرتے تھے۔

> ''جب میں بنارس میں پڑھتی تھی میں نے دو قومی نظریے پر کبھی غور نہ کیا۔ کاشی کی گلیاں اور شوالے اور گھاٹ میرے بھی اتنے ہی تھے جتنے میری دوست لیلیٰ بھارگوا کے۔ پھر یہ کیا ہوا جب

میں بڑی ہوئی تو مجھے پتا چلا کہ ان شوالوں پر میرا کوئی حق نہیں کیوں کہ میں ماتھے پر بندی نہیں
لگاتی اور ٹیلیویژن کی آرتی اتارنے کے بجائے میری اماں نماز پڑھتی ہیں، لہٰذا میری تہذیب
دوسری ہے... میں نے بسنت کالج میں ترنگے کے نیچے کھڑے ہوکر 'جن گن من' گایا ہے، لیکن
مجھے احساس ہوا کہ مجھے اس ترنگے کے سائے میں اجنبی سمجھا جاتا ہے۔'' ☆۸۸

جیسے جیسے قیامِ پاکستان کے دن قریب آتے گئے۔ چمپا کے ساتھیوں کے رویّے میں بھی تبدیلی آتی گئی، اور ایک دن کمال نے اپنے کانگریسی اور کمیونسٹ ساتھیوں سے کہا:

''چمپا مسلم لیگی ہوگئی ہے بڑی بھاری۔ آج لیگ کی طرف سے بیان چھپا ہے کہ ہندوؤں کا
سوشل بائیکاٹ کردیا جائے لہٰذا کل سے وہ ہماری محفلوں میں نہیں آئیں گی۔'' ☆۸۹

قیامِ پاکستان تمام مسلمانوں بالخصوص مسلم لیگیوں کے لیے بہت بڑی کامیابی تھی، لیکن اس کامیابی کے موقع پر بھی چمپا کے ساتھیوں نے اسے طعنوں سے نوازا۔

''چمپا باجی مبارک ہو۔ تمھارا پاکستان بن گیا۔'' اس کے لہجے میں جس قدر تلخی تھی نفرت اور شکستہ
دلی چھپی تھی۔ اس کا احساس کر کے چمپا لرز اٹھی۔ ☆۹۰

تقسیمِ ہند کے بعد چمپا وظیفہ لے کر برطانیہ چلی گئی اور وہاں اس نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی چمپا کے دوسرے ساتھی بھی وہاں موجود تھے، لیکن وہ اس میں گھل مل نہ سکی اور وہ اکثر سوچتی:

ملک تقسیم ہو چکا ہے۔ دو قومیں ہیں۔ میں مسلمان ہوں اس لیے قابلِ نفرت ہوں، یہ لوگ ہندو
ہیں اس لیے قابلِ گردن زدنی ہیں۔ ☆۹۱

تعلیم مکمل کرنے اور کئی جگہ ملازمتیں کرنے کے بعد چمپا اور اس کے ساتھی ہندوستان لوٹ آئے مسلم لیگی ہونے کی وجہ سے چمپا کی خواہش تھی کہ مسلمانوں کے لیے علیحدہ مسلم مملکت ہو اسی وقت وہ پرانے وطن سے مانوسیت اور محبت کے جذبات کو سمجھنے سے قاصر تھی لیکن تقسیمِ ہند کے بعد مسلم لیگی ہونے کے باوجود وہ ہندوستان کو چھوڑنے کا حوصلہ نہ رکھتی تھی۔

ناول کے آخر میں وہ ایک جگہ کمال سے کہتی ہے:

''...مسلمانوں کو یہاں سے نہیں جانا چاہیے تھا۔ یہ تمھارا اپنا وطن ہے۔ تم کیوں چلے گئے۔ کیا
میں تمھارے یہاں آجاؤں تو مجھے ایک سے ایک عمدہ عہدہ نہ مل جائے دیکھو میں پیرس اور لندن
سے کتنی ڈگریاں لائی ہوں۔'' ☆۹۲

قرۃ العین حیدر نے ہر دور کی چمپا کو بہادر اور باہمت پیش کیا ہے۔ جدید دور کی چمپا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ شروع سے لے

کرآخر تک وہ تنہا تمام مشکلات کا سامنا کرتی رہی پہلے مسلم لیگ کی حمایت کرنے کی وجہ سے اپنے ساتھیوں کی نفرت کو برداشت کرتی رہی، لیکن ہجرت کے کرب سے گزرنا اسے گوارانہیں وہ نہ صرف ہندوستان میں رہ کر ہندوؤں کے تعصّب کو برداشت کرلیتی ہے، بلکہ نئی اُمّید اور حوصلہ کے ساتھ آگے بڑھنے کا عزم کرتی ہے۔

> ''میں بالآخر بنارس واپس جارہی ہوں...اب میں نے دیکھا کہ کسی دوسرے کا سہارا ڈھونڈنا کس قدر زبردست حماقت تھی جانتے ہو میرے آبائی شہر کا کیا نام ہے؟ شوپوری...وہ بھی ایک نہ ایک روز واقعتاً مسرت کا شہر بنے گا...اس ملک کو دکھ کا گڑھ یا مسرت کا گھر بنانا میرے اپنے ہاتھ میں ہے۔ مجھے دوسروں سے کیا مطلب؟'' اس نے اپنے ہاتھ کھول کر غور سے دیکھا۔ رقاصہ کے ہاتھ، آرٹسٹ یا لیکھک کے ہاتھ؟ نہیں۔ یہ صرف ایک عام، اوسط درجے کی ذہین لڑکی کے ہاتھ ہیں جواَب کام کرنا چاہتی ہے۔☆۹۳

ناول کا اہم کردار کمال ہے جو ہر دور میں موجود ہے اور مختلف مقاصد میں کام یاب ہونے کے باوجود دل کا اطمینان حاصل کرنے سے محروم رہا۔

پہلے دور کا ابوالمنصور کمال بغداد کے سلطان حسین کے حکم پر ہندوستان بھیجا جاتا ہے تاکہ وہ ہندوستان کی مختلف زبانوں مثلاً سنسکرت، پراکرت اور ہندومت کی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کرے۔

ہندوستان میں آکر اس نے نہ صرف اہم کتابوں کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا، بلکہ ہندوستانی تہذیب وتمدن کا بھی مطالعہ کیا۔

دراصل پہلے دور کا کمال ہندوستان میں مسلمانوں کے آمد کو ظاہر کرتا ہے۔ جنھوں نے ہندوستان میں اپنے مذہب اور تہذیب کے گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس بات کا سب سے بڑا ثبوت بھگتی تحریک ہے۔

اس دور میں بھگتی تحریک اپنے عروج پر پہنچ کر دم توڑ گئی۔

> ...کاشی کے پنڈتوں اور مولویوں نے سلطان سکندر سے فریاد کی یہ بدعی جولاہا عوام کو گم راہ کررہا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کی لوگوں نے گنگا میں ڈبودیا مگر وہ ضدی جولاہا رگوناتھ کا نعرہ لگاتا پانی سے باہر نکل آیا...دلّی کا سلطان بڑا دین دار مسلمان تھا۔ اس نے میاں کبیر سے کہلوایا کہ وہ شر سے محفوظ رہنے کے لیے کاشی سے کہیں دور چلا جائے۔☆۹۴

کاشی، جون پور، ایودھیا اور اودھ میں ایک لمبا عرصہ گزارنے کے بعد کمال بنگال چلا گیا اور وہاں کھیتی باڑی کا پیشہ اختیار کرلیا اور ایک شودر ذات کی ہندو لڑکی سے شادی کرنے کے بعد ایک جھونپڑی میں اس کے ساتھ رہنے لگا۔ جب کمال نے

ایک عالمانہ زندگی گزارنے کے بعد ایک عام سے انسان کی طرح زندگی گزارنا شروع کی تو اسے احساس ہوا:

...روح اور دل کی ساری مسافت طے کرنے کے بعد اس نے اندازہ لگایا کہ زندگی میں اصل چیز سکون ہے۔ایسا سکون جس میں پر خطر طوفانوں اور آندھیوں کی گنجائش موجود نہ ہو...جون پور کی شہزادی ایک بہت دھندلا سا خواب تھا جو اسے یاد بھی نہیں رہا تھا۔ایودھیا کی برہمن زادی اس کی روح اور دل کے خانے میں موجود تھی جس کے دروازے مقفل کر کے اس کی کنجی اس نے خود ندی میں پھینک دی۔☆۹۵

اب کمال خود کو بنگال کا باشندہ سمجھنے لگا۔ جمال اور جلال کمال کے بیٹے اور سکینہ بیٹی تھی جمال ماہرِ تعمیر تھا اور اس نے بنگال کی عمارتوں اور مساجد کی تعمیر میں حصہ لیا تھا اور دلّی میں مغلوں کے لیے عمارتیں بنوائیں۔ جب ہندوستان میں مغلوں اور افغانوں کا جھگڑا ہوا تو اس میں کمال کا بیٹا جمال مارا گیا۔

شیر خان نے کمال کی جھونپڑی میں جا کر اسے بھی مار دیا۔مرنے سے پہلے کمال اس نتیجے پر پہنچا:

سہسرام کا شیر خان اور دلّی کا ہمایوں بادشاہ دونوں کلمہ گو ہیں لیکن ایک نے آ کر دوسرے کا قلع قمع کر دیا۔دارالسلام بھی دارالحرب بن سکتا ہے اگر اس میں شر کا وجود ہو۔☆۹۶

تیسرے دور کا کمال ''کمال ابوالمنشور'' ہے، جس کا تعلّق بنگال سے ہے اور وہ کشتیوں کا ملاّح ہے۔ اسی دور میں ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' قائم ہو چکی تھی، اور انگریز تاجر تیزی سے ہندوستان میں داخل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ جیسے جیسے ان کے قدم ہندوستان میں مضبوط ہوتے گئے ان کے روپے میں بھی تبدیلی آتی گئی اور وہ ہندوستانی عوام کو اپنا محکوم سمجھنے لگے۔ انھی مظلوم لوگوں میں کمال بھی شامل تھا۔

یہ بڑے ذلیل لوگ ہیں جب تک نظر نہ لگاؤ اس میں چستی نہیں آتی پیٹر نے کہا، سرل نے دور سے اپنی نقرئی موٹھ کی چھڑی بڑھا کر بوڑھے کی کمر میں چبھوئی، ابوالمنشور، اگر تم چاہتے ہو کہ اسی ہنٹر سے تمھاری کھال نہ ادھیڑ دوں ۔تو تم ذرا زیادہ طاقت سے پتوار چلاؤ، سمجھے۔☆۹۷

جدید دور کا کمال لکھنؤ کے نواب خاندان کا پڑھا لکھا اور باشعور نوجوان ہے۔طلعت اور تہمینہ اس کی بہنیں اور احمد رضا ان کا چچازاد بھائی ہے۔اس کے ساتھیوں میں ہرشنکر، نرملا اور گوتم شامل ہیں۔کمال کو فلسفہ، موسیقی اور سیاست سے گہری دل چسپی تھی۔کمال کے سارے ساتھیوں کو کمیونزم کے حامیوں میں سے تھے۔کمال تعلیمی مصروفیات کے علاوہ فلاحی کاموں میں اپنے دوستوں کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔

جب ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے تو ملک میں مختلف سیاسی پارٹیاں بھی قائم ہوئیں۔

کمال کانگریس سے وابستہ ہوگیا۔کانگریس کے خلاف وہ ایک لفظ بھی نہیں سن سکتا تھا۔سیاسی اختلافات کے سبب چمپا اور کمال کا اکثر جھگڑا ہو جاتا۔

> کمال فلیٹ اسٹریٹ میں پاکستان کے نظریے کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کے لیے لندن بھیجا جارہا تھا...معلوم ہوا کہ پاکستان کا مطالبہ منظور کرلیا گیا۔☆۹۸

قیامِ پاکستان کے بعد کمال اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے برطانیہ چلا گیا۔جہاں اس نے تعلیم کے میدان میں بہت ترقی کی اور برطانیہ کے علاوہ اسے اور بھی بہت سے ممالک میں جانے کا اتفاق ہوا۔کمال کے ساتھ طلعت بھی تھی اور بعد میں گوتم،ہری شنکر اور نرملا بھی اس کے ساتھ تھے رفتہ رفتہ ان کے ساتھیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔

اچھی تعلیم اور ملازمت کا تجربہ حاصل کرنے کے بعد کمال جب ہندوستان لوٹ کر آیا تو یہاں بہت سی تبدیلیاں آچکی تھیں۔۱۹۵۷ء کا ہندوستان اس ہندوستان سے بالکل مختلف تھا جسے کمال ۱۹۴۷ء میں چھوڑ کر گیا تھا۔

> آخر وہ اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر گر گیا،اور چپکے چپکے رونے لگا۔دنیا وہی تھی گلفشاں،لکھنؤ عزیز رشتے دار،سب کچھ وہی تھا۔کیا وہ صرف خود بدل گیا تھا۔کیا وہ اپنے باپ کی تنگ دستی دیکھ کر جذباتی طور پر مضطرب ہوگیا تھا؟وہ جس کی ساری عمر زمیں داری کے خلاف نعرے لگاتے گزری تھی۔زمیں داری کے خاتمے کی وجہ سے اتنا بڑا زوال آیا تھا کہ گلفشاں والوں کے یہاں دو وقتوں کی روٹی بڑی مشکل سے چلتی تھی۔☆۹۹

ہندوستان آ کر کمال نہ صرف روحانی طور پر ٹوٹ پھوٹ گیا،بلکہ مالی لحاظ سے بھی اسے کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اسے ملازمت کے سلسلے میں ہر طرف سے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

> چند روز بعد اس نے کمر کس کر ملازمت کی تلاش شروع کردی۔اس کے پاس اَن گنت ڈگریاں تھیں۔ٹرنٹی کالج کیمبرج،امپریل کالج آف سائنس،لندن،اور کئی سال اس نے انگلستان کی ایک مشہور لیبارٹری میں نوکری کی تھی وطن کی خدمت کے جذبے سے واپس آیا تھا۔یونیورسٹی میں جس جگہ کے لیے وہ کوشاں تھا۔وہ ایک معمولی ایم ایس سی کو دے دی گئی۔چوں کہ وہ ہندو تھا۔☆۱۰۰

سخت مایوس کن حالات میں بھی وہ سفارش کروانے کے حق میں نہ تھا۔بھیا صاحب کے خطوط کے ذریعے اسے اطلاع ملی تھی کہ پاکستان میں ملازمت ملنے کے قوی امکانات تھے۔وہ اپنے ہر خط میں اسے پاکستان آنے کی دعوت دیتا،لیکن وہ ہندوستان چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا۔کیوں کہ وہ ہندوستان کو ہی اپنا وطن سمجھتا تھا۔

نوبت یہ آئی کہ اب کمال نے ان کے خطوط کھولنے بھی چھوڑ دیے۔چند روز بعد اسے بارہ بنکی

> کے کالج میں لیکچرر شپ مل گئی مگر چوں کہ بھیّا صاحب پاکستانی تھے اور ''گلفشاں'' اور موروثی کی جائیداد میں ان کا حصّہ تھا، لہٰذا کسٹوڈین کا قضیہ شروع ہو گیا۔ نواب صاحب نے عدالت میں کسٹوڈین کے فیصلے کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔☆۱۰۱

اس کے ساتھ کمال اور اس کے گھر والوں نے دہلی جا کر ویزے کی درخواست بھی دی تھی اگر چہ کمال کی مزاج میں تلخی آ گئی تھی لیکن وہ ملک کے حالات بہتر ہونے کے انتظار میں تھا۔ ہتھیار ڈالنا اس کے سامنے نہایت بز دلانہ کام تھا۔ وطن کو چھوڑنے کے تصوّر ہی سے وہ شرمندہ ہو جاتا۔

> وہ متواتر اپنے آپ سے مکالمہ جاری رکھتا۔ تم بزدل ہو، کمینے، ڈرپوک، تمھاری وہ ساری نیشلسٹ ٹریننگ کہاں گئی۔ طلعت ٹھیک کہتی ہے گھاس کھودو ہل چلاؤ۔ لعنت ہو تم پر، موقع پرست، بے ایمان، ڈھلمل یقین کے۔ اب جامعۂ ملّیہ اور علی گڑھ یونیورسٹی دو جگہ کا اور آسرا رہ گیا تھا۔ مگر فی الحال وہاں بھی اس کے لائق کوئی جگہ نہ تھی اس نے بہر حال طے کر رکھا تھا کہ بھوکا مر جائے گا مگر ترکِ وطن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔☆۱۰۲

کمال کی اُمیدیں پوری نہ ہو سکیں اور حالات دن بہ دن بگڑتے ہی چلے گئے، اور اسے بھی ہجرت کے کرب سے گزرنا پڑا۔

> ایک روز عدالت نے فیصلہ سنا دیا۔ ''گلفشاں'' کمال کے بڑے ابا یعنی بڑے نواب صاحب کے نام رجسٹرڈ تھی عامر رضا خان ان کا اکلوتا وارث پاکستان میں تھا ''گلفشاں'' متروکہ جائیداد قرار دے دی گئی۔ دوسرے روز جب صبح آنکھ کھلی تو اس نے خود کو لکھنؤ میں رفیوجی پایا۔ تیسرے دن پولیس کے افسر کوٹھی میں تالے لگانے کے لیے آ گئے۔ چوتھے روز کمال رضا نے ویزا بنوایا۔ پانچویں روز ٹرین دلّی پہنچی۔ چھٹے روز ٹرین میں بارڈر کراس کیا۔ ساتویں روز کمال رضا کراچی میں تھا۔☆۱۰۳

کراچی پہنچ کر کمال کو ایک لیبارٹری میں بارہ سو روپے ماہوار پر ملازمت مل گئی اور وہ بھیّا صاحب کے ساتھ ان کی شاندار کوٹھی میں رہنے لگا۔ کمال کی کوٹھی کے لیے بھی بھیّا کی دلہن نے اپنے اثر ورسوخ سے پچاس ہزار روپے قرض دلوایا۔

ملازمت کے کام کے سلسلے میں دوبارہ ہندوستان جانا پڑا۔ صدیوں پرانے وطن جانے کے لیے ویزا بنانا ایک بہت تکلیف دہ کام تھا۔ اس موقع پر ناول نگار نے کمال کی نفسیاتی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے:

> ...سال بھر قبل یہ اس کا اپنا ملک تھا۔ اب اس میں وہ غیر ملکی کی حیثیت سے سفر کر رہا تھا۔ اسے لگا کہ لوگ اسے مشتبہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ تم پاکستانی ہو۔ تھانے چلو، تم پاکستانی ہو مسلمان۔ جاسوس۔ مسلمان۔ جاسوس۔ ٹرین کے پہیوں سے یہی آواز نکل رہی تھی۔ غدّار۔

جاسوس۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھ کھولی۔ ٹرین حسبِ معمول بڑی شان وشوکت سے چار باغ جنکشن میں داخل ہو رہی تھی۔ ☆۱۰۴

ہندوستان میں اپنے پرانے گھر ''گلفشاں'' بھی گیا جو اَب کسی سکھ کی ملکیت تھا۔ کمال نے سکھ کو تبادلے کے کاغذات دکھا کر اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت حاصل کی۔ جہاں سے اس نے اپنے گھر والوں کا سامان لینا تھا۔ گھر اور سامان کو دیکھ کر کمال کو ماضی کی بہت سی باتیں یاد آ گئیں۔ اسی مایوسی میں اس کے بزرگوں کی گروپ فوٹو تھی۔ جسے دیکھ کر کمال کو وطن کے چھوڑنے کے بارے میں سوچ کر شرمندگی کا احساس ہوا۔

...کمال اس تصویر کو دیکھتا رہا۔ ہم نے کس طرح ان کی نسل سے خود کو بہتر کیا؟ بے چارے بوڑھو— میں تمھارے آگے شرمندہ ہوں۔ میں تم کو اپنا مُنہ دکھانا نہیں چاہتا...خدا حافظ اس نے گروپ کو آہستہ سے پھر گودام کے فرش پر گرا دیا، اور تالا لگا کر باہر آ گیا۔ ☆۱۰۵

ہندوستان میں اپنے قیام کے دوران وہ چمپا سے بھی ملا اور دونوں ہندوستان، پاکستان کے حالات اس کے مسائل اور مستقبل پر غور وفکر کیا اور اپنے ماضی اور پرانے ساتھیوں کو بیٹھ کر یاد کرتے رہے۔ کمال نے ہری شنکر اور گوتم سے ملاقات کرنے کا وعدہ کرنے کے باوجود ان کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہ کر سکا۔ اس کیفیت کو قرۃ العین نے چمپا کے کردار کے ذریعے بیان کیا ہے:

''تم اب تک مضبوط نہیں ہوئے۔'' چمپا نے آہستہ سے کہا، ''تم ہری شنکر سے ملنا نہیں چاہتے کیوں کہ تم کو ڈر ہے کہ تم واقعی جا کر روتے ہوئے اس سے لپٹ جاؤ گے۔'' ☆۱۰۶

ہندوستان سے پاکستان لوٹتے وقت جدائی اور ہجرت کا کرب شدّت اختیار کر گیا۔ اس موقع پر بھی ناول نگار نے کمال کی دلی کیفیت کو بہت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے:

جب ٹرین نے بارڈر کراس کیا تو وہ اتنے دنوں سے اپنی ساری ہمّت صرف کر کے اپنے آنسو ضبط کر رہا تھا۔ کھمبے کے پاس ایک سردار جی کو کیسیں نکالے بندوق تانے کھڑے دیکھ کر بچّوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ☆۱۰۷

پاکستان پہنچ کر کمال کی نئی زندگی، نئی مصروفیات اور نئے معمولات تھے جنھیں پورا کرنا اب اس کی ذمّے داریوں میں شامل تھا۔

اس کی نئی زندگی اس کے سامنے تھی۔ اس نے ڈائری نکالی۔ کراچی واپس پہنچ کر اسے کتنے ضروری کام کرنے تھے۔ چچا فلاں سے کلیم کے متعلق سفارش کروانا تھی۔ کوٹھی کے لیے بلیک سے سیمنٹ اور لوہے کا انتظام کرنا تھا۔ مسٹر ایکس کو جم خانہ میں ایک پارٹی دینا تھی...میں کہاں

جاؤں..خراب انحطاط پذیر سوسائٹی میں مسلمان کا شریف رہنا کہاں تک ممکن ہے۔☆۱۰۸

جدید دور کے کمال کے کردار کے ذریعے قرۃ العین نے ہندو مسلم اختلافات، تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان کے بعد کے حالات کو بیان کیا ہے۔اس سلسلے میں انھوں نے سب سے زیادہ توجہ کرداروں کی نفسیاتی الجھنوں پر دی ہے۔

شدید نفسیاتی الجھنوں کے باوجود ناول کے آخر میں کمال ایک محبِ وطن کی طرح سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ایک جگہ وہ طلعت سے کہتا ہے:

''اس ملک نے مجھے اپنی حفاظت میں لے لیا ہے۔ مجھے پناہ دی ہے۔اس کو بنانا یا بگاڑنا اب میرے ہاتھ میں ہے۔ میں نے جو عمر بھر تخریب کے بجائے تعمیر کے خواب دیکھے ہیں۔کیا تمھارا خیال ہے یہاں کے ذہن پرستوں کے خلاف میں داخل ہو کر میں اپنے آپ کو کھو دوں گا؟'' ☆۱۰۹

کمال، گوتم نیلمبر اور چمپا کے علاوہ سرل بھی ناول کا اہم کردار ہے۔

سرل ایشلے مغربی کردار ہے۔ہندوستان میں اس کی آمد ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کی آمد کو ظاہر کرتی ہے۔

سرل کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔وہ شاعرانہ طبیعت کا مالک تھا۔کوئنز کالج کیمبرج سے بی۔اے کرنے کے بعد لندن میں مڈل ٹمپل میں داخلہ لیا۔اسی دوران اس کی ملاقات پیٹر جیکسن سے ہوئی جو ہندوستان میں تجارت کرتا تھا۔اس نے سرل کو ہندوستان کے بارے میں بتایا:

''نیٹو کس قدر بے وقوف ہوتے ہیں۔ان کے امرا کتنے دولت مند ہیں۔کلکتہ کس قدر دل چسپ شہر ہے...ہندوستان چلو تم سمجھدار آدمی معلوم ہوتے ہو۔اگر عقل سے کام لو تو چار روز میں وہاں سونے کے محل کھڑے کر لو گے۔'' ☆۱۱۰

پیٹر جیکسن کے مشورے پر سرل ہندوستان آ گیا۔اس دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی ترقی کے مراحل تیزی سے طے کر رہی تھی۔سرل کو ہندوستان میں اپنے قدم جمانے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔

کئی سال گزر گئے سرل اب کلکتہ کی اعلیٰ سوسائٹی میں رل مل چکا تھا اور اسی اسٹائل سے رہتا تھا جو اس سوسائٹی کی خاصیت تھی...وہی سرل جو کچھ عرصہ پہلے کیمبرج کی گلیوں میں ولیم بلیک کی کتابیں لیے مشقِ سخن کرتا پھرتا تھا، اور کسی پب میں جا کر چند پنس کے آلو کھاتا تھا...جو مڈل ٹمپل کے پھاٹک سے نکل کر دریا کے کنارے ڈون اور کرتے کی نظموں پر سر دھنتا سنسان سڑکوں پر ٹہلا کرتا اور رات کو کسی طالب علم کے یہاں جا کر سو رہتا تھا۔☆۱۱۱

ہندوستانی عوام اب ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کی محکوم بنتی جا رہی تھی۔ان کے کارخانے بند ہوتے جا رہے تھے اور اس کی

جگہ انگریز اپنے کاروبار کو پھیلا رہے تھے۔

سرل کی دولت اور شاہانہ زندگی سے متأثر ہوکر بہت سی لڑکیاں سرل سے شادی کرنا چاہتی تھیں، لیکن سرل نے شادی کرنے کے بجائے نیٹو عورت ''شہنیلا'' کو اپنی داشتہ بنالیا۔

اگر چہ سرل نے شہنیلا سے شادی نہیں کی تھی لیکن اس کے باوجود وہ خوشی سے سرل کے ساتھ زندگی گزار رہی تھی۔

...اس کی مانند اور بہت سی دیسی عورتیں اعلیٰ طبقے کے انگریزوں کے زنان خانوں میں براجتی تھیں ان کے بچّے پڑھنے کے لیے ولایت بھیجے جاتے اور جب تک ان بچّوں کے باپ زندہ رہتے تھے کم ازکم اس وقت تک ان کا خاندان آرام سے گزر کرتا تھا۔☆۱۱۲

قرۃالعین حیدر نے سرل کے کردار کے ذریعے ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان میں اپنے قدم جمانے اور راتوں رات امیر ہونے کا ذکر کیا ہے۔

''آگ کا دریا'' میں برِصغیر میں مسلمانوں کی آمد، ان کی حکومت، ان کا زوال، انگریزوں کی آمد، ہندو مسلم فسادات، تحریکِ پاکستان اور قیامِ پاکستان کے بعد کے ابتدائی مسائل کو بیان کیا ہے۔

ان تمام تفصیلات کے ذریعے وہ یہ بات ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر جو کلچر بنایا تھا وہ تقسیمِ ہند کے نتیجے میں منتشر ہوگیا۔

ہندو مسلم اشتراک کی ایک تصویر ناول میں یوں دکھائی گئی ہے:

''اگر محمدؐ اوتار جنم نہ لیتے۔'' کیرتن منڈلی نے گایا۔

''تو اللہ کی حکومت ترلوک میں قائم نہ ہوتی۔

نموِنمو ہے عبداللہ اور آمنہ۔

جے ہو مکہ نگری کی اور سارے اولیا کی اور بی بی فاطمہؓ کی جو سارے جگ کی ماتا ہیں۔

جے ہو اتر میں ہمالیہ کی جس کے قدموں میں ساری کائنات پھیلی ہے۔

جے ہو پورب سے نکلتے سوریہ کی۔

اب میں وندرابن کے سامنے جھکتا ہوں۔

بھگوان کرشن اور شری رادھے کو اور چاروں کھونٹ ندیوں اور ساگروں کو میرا پرنام۔

جے ہو مسلمانوں کے فرقوں کی۔

جے ہو دھرتی ماتا اور پوتر سنکھا ندی کی

نو پاڑا کی مسجد کو میرا پرنام

کیوں کہ وہ بڑا پیرا ایک بار ان خطّوں سے گزرا تھا۔

اب میں آگے بڑھ کر سیتا گھاٹ پہنچتا ہوں۔ آدرش استری سیتا دیوی اور ان کے مہاراج

رگھوناتھ کو میرا پرنام

جے ہو... جے ہو... جے ہو! ☆۱۱۳

اس مشترکہ کلچر پر اکبر کے دینِ الٰہی کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں اور ایسے کلچر کا کسی بھی معاشرے میں پنپنا ناممکن ہے۔ کیوں کہ جو بھی شخص اپنے عقیدے کا پکا ہوگا وہ اپنے مذہب میں کسی دوسرے مذہب کی تعلیمات کو ضم ہوتے نہیں دیکھ سکے گا، اور اگر کبھی ایسا ہو بھی جاتا تو معاشرے میں بار بار ''حضرت مجدد الف ثانی'' جیسے رہنما پیدا ہوتے۔

پاکستان مذہب کی بنیاد پر قائم کیا گیا۔ اس لیے قرۃ العین مذہب کو ہندو مسلم اتحاد، اور کلچر کے درمیان رکاوٹ سمجھتی تھیں۔ کمال کے کردار کے ذریعے انھوں نے اسلام پر گہری طنز کی ہے:

مسلمان سماجی طور پر پس ماندہ ہے اور مذہب اس کے لیے ایک بہت واضح تصوّر ہے، انتہائی شخصی اور ذاتی! ہندو کے یہاں مذہب ایک سماجی نظام ہے۔ ہزاروں لاکھوں دیوتا ہیں، وہ جن کو چاہے مانے جن کو چاہے رد کردے... پھر ان کی انٹیلیجنسیا نے سائنٹفک ہونا سب سے پہلے سیکھا۔ وہ مذہب کے بارے میں جذباتی نہیں... ظاہر ہے مسلمانوں کے مقابلے میں وہ کہیں زیادہ چالاک ہے۔ مسلمان بے چارہ خدا رسولؐ کا عاشق، بات بات پر ہجرت پر تیار۔ ترکی میں کسی کو چھینک آئی، آپ بھاگے چلے جارہے ہیں۔ افغانستان میں کسی کے پیر میں کانٹا چبھا، یہ بے کل ہوگئے۔ ہندی ہو کر بھی ہند کا نہ ہوا، مگر مصیبت یہ ہے کہ یہاں اجمیری پیا بھی ہیں، محبوبِ الٰہیؒ بھی، یہاں تاج محل پر بھی بھائی کو بہت ناز ہے کہ ہمارے بادشاہوں نے بنایا تھا مگر اس اسلامی بین الاقوامیت کے چکر نے اسے کہیں نہ رکھا... تعصب کے مسئلے کو... اسلام بھی نہ حل کرسکا۔ ☆۱۱۴

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرۃ العین حیدر اسلام کو ایک تنگ نظر مذہب قرار دیتی ہیں۔ اسلام کے مقابلے میں انھیں ہندو مت زیادہ وسیع اور روشن خیال مذہب لگتا ہے۔ انھوں نے ہندو مت کے مختلف دیوتاؤں کو تو ان کی آزاد خیالی ظاہر کیا ہے، لیکن انھوں نے ہندوؤں کی چار مختلف ذاتوں کے فرق اور اس کے مطابق معاشرے میں ان کی حیثیت کو بالکل فراموش کر دیا ہے، اور یوں ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوگیا ہے:

ان کی انٹیلیجنسیا نے سائنٹفک ہونا سب سے پہلے سیکھا وہ مذہب کے بارے میں جذباتی

نہیں۔☆۱۱۵

تعصّب کے مسئلے کو اسلام بھی حل نہ کرسکا ...شیعہ اور سنی ایک دوسرے سے کس قدر متنفر ہیں۔☆۱۱۶

اسلام کے خلاف کھوکھلے نعروں پر وہ خود بھی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکیں اور پنڈت کی بیٹی چمپا اور عرب کے ابوالمنصور کمال کے عہد اور جدید دور کی چمپا احمد کے خیالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندو اور مسلمان قوم کی تہذیب کے بعض پہلو تو ایک دوسرے سے مشترک تھے لیکن جب مذہب کا معاملہ آتا ہے تو دونوں میں اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔

مجموعی طور پر ناول میں خامیاں کم اور خوبیاں زیادہ ہیں۔

ناول کے جدید دور کا تعلّق ہمارے مقالے کے اصل موضوع سے ہے۔جس میں قرۃ العین حیدر نے کمال اور چمپا کے کرداروں کے ذریعے ۵۶-۱۹۴۷ء کے پاکستان اور ہندوستان کے معاشرے کی ناہمواریوں کو بیان کیا ہے۔

تقسیمِ ہند کے حوالے سے قرۃ العین نے سب سے پہلے ہجرت کے المیے کو بیان کیا ہے۔کرداروں کے ذریعے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہ مسلمان جو مسلم لیگ کے حامی تھے اور اپنے لیے علیحدہ مسلم مملکت کا مطالبہ کر رہے تھے جب قیامِ پاکستان کے بعد ہجرت کرنے کا وقت آیا تو صدیوں پرانے وطن سے محبت اور انسیت کے سامنے آزاد مسلم مملکت کی کوئی اہمیت نہ رہی۔جن لوگوں نے ہجرت کی وہ بھی ہندوستان کو ہی اپنا وطن سمجھتے رہے۔

سال میں ایک مرتبہ ویزا بنوا کر خاندان کے بچے کھچے افراد سے ملنے ہندوستان جاتے ہیں۔جس کو اب تک یہ گھر کہتے ہیں۔یعنی گھر دراصل سندیلہ اور مراد آباد ہے اور ملک پاکستان ہے۔☆۱۱۷

چمپا احمد جو مسلم لیگ کی حامیوں میں سے تھی جس کی وجہ سے اس نے اپنے تمام ساتھیوں کی مخالفت قبول کر لی تھی، لیکن ہندوستان چھوڑ کر پاکستان جانے کا حوصلہ نہ کر سکی۔ ہندوستان چھوڑنے کا مطلب صرف ایک ملک سے اُٹھ کر دوسرے ملک نہ جانا تھا، بلکہ صدیوں پرانے گھر، محلّہ، ساتھیوں، تہذیب، کلچر سب کو چھوڑنا تھا۔

اگرچہ کمال کو انتہائی مجبور حالات میں ہجرت کرنا پڑی تھی لیکن کمال اور اس کے خاندان کے لیے یہ بڑا کڑا وقت تھا۔

کمال نے اپنے باپ سے پوچھا، ’’کربلا ہجرت کیجیے گا یا پاکستان؟‘‘

’’یہیں رہوں گا۔‘‘ انھوں نے اطمینان سے جواب دیا، ’’کوئی ہم بھگوڑے ہیں؟‘‘

کمال ہکا بکا رہ گیا۔ ’’مگر بابا آپ تو بڑی دھوم دھام سے مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے۔‘‘

’’ہاں ہاں۔تو پھر پاکستان بن گیا ٹھیک ہوا۔ اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ ہم بھی بھاگ جائیں یہاں سے۔‘‘☆۱۱۸

تقسیمِ ہند کے بعد جن لوگوں نے پاکستان ہجرت نہ کی، ہندوؤں کو ان کا وجود سخت ناگوار گزرا اور انھوں نے اس کا اظہار بھی کیا۔ ناول میں اس حقیقت کو قرۃ العین نے اس طرح بیان کیا ہے:

''تقسیم کے بعد معلوم ہوا کہ اب ہندو کہتا ہے کہ جب تمھاری کلچر اور تمھارے نظریے علیحدہ ہیں تو جاؤ پاکستان۔ اب ہمارے سر پر کیوں سوار ہو۔ چناں چہ قوم مہاجرین بن کر پاکستانی آئی۔ یہاں انکشاف ہوا کہ ہندو سے تو چھٹکارا مل گیا مگر ایک اور مصیبت کا سامنا درپیش تھا۔ لاہور میں پنجابی تھا، ڈھاکے میں بنگالی، دونوں جگہ مہاجرین کو بڑا فرسٹریشن ہوا، لہٰذا ہر مہاجر نے ادبدا کر کراچی کا رخ کیا۔'' ☆۱۱۹

جن لوگوں نے ہجرت کی انھیں بھی آزادی کی خوشی نصیب نہ ہوسکی۔ ایک طرف یادیں تھیں اور دوسری طرف انھیں نئے ملک میں اجنبیت کا احساس ہوا اور ساتھ ہی اپنی کھوئی جائیداد کے حصول کے سلسلے میں بھی کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جائیداد کی وصولی اور آبادکاری کے سلسلے میں پاکستان میں بھی لوگوں نے اثر ورسوخ سے کام لیا اور معاشرے میں طبقاتی نظام نے فروغ پایا۔

ان طبقات کے بارے میں ناول نگار نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

ہر مہاجر نے ادبدا کر کراچی کا رخ کیا۔ اب کراچی گویا مہاجرین کا گڑھ ہے... اب یہاں جگہ جگہ ان کی کالونیاں قائم ہیں۔ یہاں آگرے والے رہتے ہیں، ادھر علی گڑھ والے، لکھنؤ والے، دلّی والے رہتے ہیں۔ یہ زیادہ تر ناظم آباد کا علاقہ ہے۔ لارنس روڈ، پیرالٰہی بخش کالونی، جہاں گیر روڈ، مارٹن روڈ کے سرکاری کوارٹروں میں ایک پوری دنیا آباد ہے۔ یہ خالص ٹھوس مسلمان، متوسّط طبقے، نچلے طبقے سے تعلّق رکھتے ہیں... دوسرا طبقہ اعلیٰ طبقہ کہلاتا ہے پچھلے تو سال میں بے حد مستحکم ہو چکا ہے اور محتاجِ تعارف نہیں۔ اس طبقے کی زندگی اس قدر الف لیلوی ہے کہ اب ''قصہ سوتے جاگتے'' کا اس کے مقابلے میں بالکل ہیچ ہے۔ یعنی کل جو صاحب گمنام قسم کے آدمی تھے آج وہ مرکزی وزیر ہیں یا کروڑ پتی یا بہت مشہور لیڈر۔ پورے ملک کی قسمت کا فیصلہ ان کے ہاتھوں میں ہے... اعلیٰ طبقہ جو بڑے بڑے تاجروں، لیڈروں، اعلیٰ حکام پر مشتمل ہے اس کی علیحدہ برادری ہے اتوار یہ لوگ سمندر کے کنارے گزارتے ہیں۔ چھٹیاں لے کر یورپ اور امریکا جاتے ہیں۔ ان کی اولاد بھی مغربی ممالک میں پڑھ رہی ہے۔ انھوں نے لاکھوں روپیہ سوئٹزرلینڈ کے بنکوں میں جمع کرلیا ہے بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ یہ

لوگ بات بات پر دوسروں کو غدار اور وطن فروش کے نام سے نوازتے ہیں اور حبِ وطن کا سارا ٹھیکا انھوں نے خود لے رکھا ہے۔ یہی سب لوگ خود انگلستان یا کینیڈا میں سکونت اختیار کرنے کے پروگرام بنا رہے ہیں۔☆۱۲۰

افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ملک میں بے ایمانی، رشوت ستانی، ذاتی اثر ورسوخ کی وجہ سے جو ناانصافیاں ہوتی ہیں اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس سے سب واقف ہیں لیکن اپنی جان، مال اور عزت کے تحفظ کی وجہ سے کوئی بھی ان کے خلاف آواز نہیں اُٹھا سکتا۔

لوگوں کو معلوم ہے کہ پنسلین اور دواؤں کی بلیک مارکیٹ ہوتی ہے...ناممکن سے ناممکن کام ذاتی اثر ورسوخ یا سفارش کے ذریعے چٹکی بجاتے میں پورا کر لیا جاتا ہے...شروع سے آخر...تک بے ایمانی کا دور دورہ ہے مگر اس کے لیے کوئی کچھ نہیں کرسکتا عوام جانتے ہیں ان کے لیڈر کتنے پانی میں ہیں، لیکن لیڈروں کو بھی چند گُر آتے ہیں جن کی وجہ سے ان کو قابو میں رکھا جا سکتا ہے۔'' ☆۱۲۱

قرۃ العین نے پاکستانی معاشرے کی صرف کم زوریوں کی نشان دہی نہیں کی، بلکہ انھوں نے پاکستان کی اعلیٰ اقدار، تعمیر و ترقی کا بھی ذکر کیا ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انھوں نے ناول میں جو کچھ بھی لکھا ہے وہ ان کے گہرے مشاہدے اور باشعور ہونے کی دلیل ہے۔

...مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ پاکستانی لڑکیاں بڑی تعداد میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں...یہ ایک بہت اچھا شگون ہے۔☆۱۲۲

اپنے ناول کے ذریعے قرۃ العین یہ ثابت کرنا چاہ رہی ہیں کہ ہر انسان کو اپنے مقاصد کے حصول اور منزل تک پہنچنے کے لیے جو جد و جہد کرنا پڑتی ہے اور جس طرح حالات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے وہ سب آگ کے دریا میں ڈوب کر جانا ہے۔

ناول کے نام میں قرۃ العین نے یہ استعارہ جگر مرادآبادی کے اس شعر سے لیا ہے:

یہ عشق نہیں آساں، بس اتنا سمجھ لیجے
اِک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

یہ عشق کس کا ہے خدا کا، انسان کا، حیات کا، ذات کا، کائنات کا؟ شاید سبھی کا ہو، جس کا بھی ہو، آسان نہیں، آگ سے بھرا ہوا ہے اور اس میں ڈوب کر ابھرنے سے ہی بیڑا پار لگ سکتا ہے۔☆۱۲۳

اس کے باوجود قرۃ العین نے ناول کا اختتام قنوطیت اور مایوسی پر نہیں کیا، بلکہ ہمت، حوصلے، زندہ دلی اور اُمید کے یقین کے ساتھ کیا ہے۔

اس نے دیکھا چاروں اور خلا ہے، اور اس میں وہ ہمیشہ کی طرح تنہا موجود ہے۔ دنیا کا ازلی اور ابدی انسان، تھکا ہوا شکست خوردہ، بشاش، پُر اُمّید۔☆۱۲۴

اس کے ساتھ ہی وہ زندہ دل اور پر اُمّید لوگوں کو مزید حوصلے کا پیغام بھی دے رہی ہیں:

جاگنے والوں کا جاگنا مبارک ہو

قانون کا پرچار مبارک ہو

سنگھ میں امن مبارک ہو

ان لوگوں کو ریاضت مبارک ہو

جنھیں شانتی میسّر آ گئی۔☆۱۲۵

رومانی ناول نگار کی حیثیت سے قرۃ العین نے تقسیمِ ہند کے نتیجے میں ہونے والے مختلف حادثات میں سب سے زیادہ اہمیت ''نفسیاتی مسائل'' کو دی ہے جو انھیں ہجرت اور یادوں کی وجہ سے پیش آئے۔

ناول کے کردار ان دردناک کیفیت سے بچنے کے لیے ہندوستان کو چھوڑنا نہیں چاہتے، لیکن وقت اور حالات سے مجبور ہو کر کمال کو ہجرت کے کرب سے گزرنا پڑا اور ہجرت کے بعد دولت اور اعلیٰ عہدے یا پُر آسائش زندگی کی کوئی اہمیت نہ رہی۔

کمال کے علاوہ چمپا بھی ہجرت کے کرب سے بچنے کے لیے ہندوستان میں ایک معمولی طرز کی زندگی گزارنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔

تقسیمِ ہند کے حوالے سے قرۃ العین نے جو دوسرا مسئلہ بیان کیا ہے وہ قیامِ پاکستان کے بعد معاشرتی حالات ہیں، جن کی ناہمواریوں کی وجہ سے ملک میں طبقاتی نظام قائم ہوا۔ طبقاتی تقسیم کی وجہ سے ادنیٰ اور اعلیٰ طبقے میں وہی فرق نظر آتا ہے جو ہندوستان میں کسی ظالم ہندو یا سکھ اور کسی پسے ہوئے مسلمان میں تھا۔

قرۃ العین حیدر کے اس خیال کی قارئین کے علاوہ دوسرے ناول نگاروں نے بھی پذیرائی کی اور شوکت صدیقی نے ''خدا کی بستی''، عبداللہ حسین نے ''اداس نسلیں''، خدیجہ مستور نے ''آنگن'' اور ''زمین'' اور قدرت اللہ شہاب نے ''یاخدا'' جیسے اعلیٰ ناول تخلیق کیے۔

قرۃ العین خود بھی ناسٹلجیا کا شکار ہیں۔ لکھنؤ، اس کی ثقافت اور اس کے گلی کوچوں سے ان کی وابستگی کی نوعیت، وہی ہے جو میر کی دلّی سے تھی۔ وہ ہندو مسلم گنگا جمنی تہذیب کی دل دادہ ہیں اور اس کی روح سے ان کی ہم آہنگی مسلم ہے۔ پھر ان کی بہت سی وابستگیاں انھیں ہندوستان سے علیحدہ ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتیں اس لیے تقسیم کے عمل کو انھوں نے کبھی دل سے تسلیم نہیں کیا۔ وہ خود پاکستان آ گئی تھیں مگر ہندوستان سے جدائی زیادہ دنوں گوارا نہ کر سکیں اور واپس ہندوستان چلی گئیں۔ ہو

سکتا ہے کہ اس کے لیے وہ پاکستان کے لوگوں کی ناقدری کی شکایت کریں مگر واقعہ یہ ہے کہ مشترکہ ہندوستان کی اصل روح کی پجاری ہیں اور اس مشترک اور تسلسل کے حامل کلچر سے رفاقت ان کی ذات کا حصّہ بن گئی ہے۔ جس سے وہ علیحدہ نہیں رہ سکتیں۔

ناول کے ابتدائی دو حصّوں میں جو تہذیبی شعور جھلکتا ہے وہ اسی متحدہ کلچر کی پرستش کا ودیعت کردہ ہے۔ اس لیے ناول کے تیسرے حصّے میں وہ گہرائی اور گیرائی نہ آسکی جو پہلے دو حصّوں میں ہے۔ تقسیم کے عمل کو انھوں نے کبھی ذہنی طور پر قبول نہیں کیا، لیکن کوئی بھی شخص ان کے نظریات سے اختلاف کر سکتا ہے مگر یہ نظریات رکھنے سے انھیں کوئی روک نہیں سکتا۔

اپنی فکری بنیاد اور فنی عظمت کی بنا پر ''آگ کا دریا'' بلاشبہ ایک عظیم ناول ہے جو اپنے طور پر تقسیم کے مسئلے کو بھی پیش کرتا ہے۔

اُداس نسلیں

''اُداس نسلیں'' عبداللہ حسین کا طویل اور مشہور ناول ہے۔ جس میں انھوں نے ۱۹۱۴ء سے ۱۹۴۷ء تک کے تاریخی اور سیاسی واقعات کو بیان کیا ہے۔

ناول چار حصّوں پر مشتمل ہے۔ ناول کا پہلا حصہ ''ہندوستان''، دوسرا ''برٹش انڈیا'' تیسرا ''بٹوارا'' اور چوتھا ''اختتامیہ'' کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ ان چار حصّوں میں ناول نگار نے جنگِ عظیم اوّل، جنگِ عظیم دوم، تحریکِ پاکستان، تقسیمِ ہند، ہجرت اور قیامِ پاکستان کے بعد کے حالات کو بیان کیا گیا ہے۔

طویل ناول ہونے کی وجہ سے ناول کا پلاٹ وسیع اور پھیلا ہوا ہے۔ کئی جگہ غیر ضروری طوالت کی وجہ سے ناول کی فنی اہمیت پر برے اثرات پڑے ہیں۔ خاص طور پر ناول کے پہلے دو حصّوں میں انھوں نے ایسے واقعات بھی بیان کر دیے ہیں۔ جن کا ناول کے اصول موضوع سے کوئی تعلّق نہ تھا۔

مثلاً جب عبداللہ حسین ''روشن پور'' کا ذکر کرتے ہیں تو دیہاتی ماحول کی ایک ایک بات تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ بھینس کی جگالی یا دوسرے جانوروں کی حرکات وسکنات کو اس انداز سے ذکر کرتے ہیں جیسے وہ ناول کے مرکزی کردار ہوں۔

> بھوری بھینس کا زخم کھلوا کر دیکھا اور اپنے سامنے جانوروں کے رکھوالے سے اس پر ہلدی اور سرسوں کے تیل کی پٹی کرائی۔☆۱۲۶
>
> بیلوں کے نتھنے پھڑپھڑائے، مونچھیں ہوا میں لہرائیں اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ دوڑ پڑے گا۔☆۱۲۷

اسی طرح ۱۹۱۹ء میں جلیاں والا باغ کے الم ناک حادثے کو ایک مچھیرے کے کردار کے ذریعے بیان کرنے میں

عبداللہ حسین بری طرح ناکام ہو گئے ہیں۔ مچھیرے نے اس انداز سے واقعے کو بیان کیا اصل واقعے کی جگہ دوسری تفصیلات نمایاں ہو گئیں ہیں۔

اگرچہ ناول کے پہلے اور دوسرے حصے کے مقابلے میں ناول کے تیسرے اور چوتھے حصے میں ہجرت اور قیامِ پاکستان کے بعد کے حالات کو متاثر کن انداز میں بیان کیا ہے، لیکن اس کے باوجود بعض واقعات یا جز ایسے بھی ہیں جو غیر ضروری ہیں۔

بقولِ ڈاکٹر عبدالسلام:

اس ناول میں بہت سے episodes ایسے ہیں جو پورے طور پر قصہ کا جز ونہیں بن پائے اور پیوند کی طرح اوپر سے چپکائے ہوئے نظر آتے ہیں۔☆ ۱۲۸

اسی خیال کو اسلم آزاد نے اس طرح بیان کیا ہے:

ناول نگار کے اپنے بیانات مکالموں سے زیادہ ہیں دراصل ان بیانات کی حیثیت پیوند کی سی ہے۔☆ ۱۲۹

ناول کے اسلوب کا جب جائزہ لیں تو جو چیز سب سے نمایاں ہے وہ مقامی زبانوں کے اثرات ہیں۔ مثلاً:

''...کلکتے میں بیائی پھاگن تک کرتے رہتے ہیں۔'' ☆ ۱۳۰

''کل بھاپے کے ساتھ جاٹ نگری جا رہی ہوں۔'' ☆ ۱۳۱

''تم نے ایک ستّا خراب کر دیا۔'' ☆ ۱۳۲

ناول میں جب شہر کے ماحول یا روشن محل کا ذکر کیا ہے تو شہری زندگی کے طور طریقے، رکھ رکھاو اور پر تکلف اور عالمانہ گفتگو کو بیان کیا ہے:

''...آپ خفا تو نہیں ہوئے، میں نے آپ سے مذاق کیا ہے۔'' ☆ ۱۳۳

''...یہ تعریف اس سلسلے میں تھی کہ آج سے بابا 'روشن آغا' کہلائیں گے۔'' ☆ ۱۳۴

''خالد نے محض کتابیں پڑھ پڑھ کر اپنے نظریات بنا لیے ہیں حالاں کہ یہ ایسا موضوع ہے جس کے لیے قوموں، بلکہ طبقوں کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔'' ☆ ۱۳۵

ناول کا ایک کم زور پہلو ناول نگار کا انسانی کرداروں کی حرکات و سکنات کو جانوروں سے تشبیہ دے کر بیان کیا گیا ہے:

ڈرے ہوئے کتے کی طرح دانت نکال کر وہ چیخا اور بھاگ اُٹھا۔☆ ۱۳۶

اس کا چہرہ میلے سنولائے ہوئے رنگ کا تھا جیسے گھوڑے کی لید کے اُپلوں کا ہوتا ہے۔☆ ۱۳۷

ناول میں کئی جگہ فحش گالیاں اور جنسی مناظر کی بھی تصویر کشی کی گئی جس کا ناول کے اصل موضوع سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔

اس خامی کوڈاکٹرعبدالسلام نے بھی محسوس کیا ہے اور اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

اس ناول کی ایک بات... کھٹکتی ہے وہ تذکرہ جنس کی تفصیلات بھی ہیں اور کھلی کھلی گالیاں بھی۔ ممکن ہے حقیقت نگاری کا تقاضا پورا کرنے کی خاطر مصنف نے یہ انداز اختیار کیا ہو مگر انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ اس طرح ادبیت کا خون ہوتا ہے۔☆۱۳۸

ایک اور جگہ ڈاکٹرعبدالسلام نے ناول پر اعتراض کیا ہے:

اس ناول میں جنس کا ذکر بہت زیادہ نہیں ہے مگر ان میں صرف چند مواقع ایسے ہیں جہاں ہمیں غیر ضروری بے باکی نظر آتی ہے اور جو بیانات ہیں انھیں عریاں کے بجائے بھونڈے کہنا زیادہ مناسب ہے۔☆۱۳۹

ایسے ہی بھونڈے پن کی نمایاں مثالیں وہ گالیاں ہیں جن کا ذکر قطعی غیر ضروری طور پر بار بار کیا گیا ہے۔☆۱۴۰

اس خیال کی تائید محمد اسلم نے بھی کی ہے:

...لیکن کہیں ایسی فحش گالیاں لکھ دی ہیں جن کی وجہ سے حسن واثر ماند پڑ گئے ہیں۔☆۱۴۱

ان تمام خامیوں کے علاوہ ناول کے پلاٹ کی کئی خوبیاں بھی ہیں۔ ناول میں ایسے واقعات بیان کیے گئے ہیں جس سے برِصغیر کے تاریخی اور سیاسی حالات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

جیسے جنگِ عظیم اوّل کے بارے میں بتایا گیا ہے:

۴راگست۱۹۱۴ءکو جنگ کا اعلان کیا گیا۔☆۱۴۲

۱۹۱۹ء میں جلیاں والا باغ کے المناک واقعہ کو اگرچہ نہایت احمقانہ طریقے سے بیان کیا گیا ہے لیکن ان کی اس خوبی سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے اس واقعے کی اہمیت کا خیال رکھا۔

ناول کے موضوع کو مدِنظر رکھتے ہوئے عبداللہ حسین نے تحریکِ پاکستان کے دوران پیش آنے والے اہم واقعات کو اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔

''انقلاب زندہ باد۔'' کئی ہزار لوگ چلائے۔ وہ مڑ کر کھڑا ہو گیا۔ مختلف قسم کے نعروں کا شور اس کے کانوں میں آ رہا تھا: ''انقلاب زندہ باد... اکھنڈ ہندوستان زندہ باد، حکومت برطانیہ مردہ باد۔ پاکستان زندہ باد۔''☆۱۴۳

سائمن کمیشن کے خلاف مظاہرین کے احتجاج کو بھی بخوبی بیان کیا گیا ہے۔

ہزاروں انسانی سروں کے اوپر جگہ جگہ چھوٹے بڑے سیاہ جھنڈے لہرا رہے تھے اور ہجوم میں بار بار تین انگریزی الفاظ کی پکار اُٹھ رہی تھی ...Simon, go back انھیں اس جذبے سے دہرائے جا رہے تھے جیسے ان کی سیکڑوں برس کی مشقت اور غربت کا انعام انھی تین لفظوں میں پنہاں تھا۔ مختلف سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے ان کے ساتھ مزید جتھے آ کر ملتے گئے، اور ریلوے اسٹیشن تک پہنچتے پہنچتے اس لمبے چوڑے جلوس میں کئی ہزار کا اضافہ ہوتا گیا تھا۔☆۱۴۴

تقسیمِ ہند کے اعلان کے ساتھ ہی ہندوستان اور پاکستان کے لوگوں نے ہجرت کرنا شروع کر دی۔ جیسا کہ انھوں نے ناول میں اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

دن میں ایک آدھ گاڑی ان کے بھائی بندوں کے ہندوستان سے وارد ہوتی اور تقریباً اتنے ہی لوگ ہندوستان جانے کے لیے یہاں سے گاڑیوں میں سوار ہوئے یا شمال کی طرف سے گاڑیوں میں بھر کر آتے اور واہگے کی سرحد کی طرف نکل جاتے۔☆۱۴۵

ناول کی فضا پر عبداللہ حسین نے سب سے زیادہ توجہ دی ہے۔ واقعہ چاہے دیہاتی زندگی کا ہو یا شہری زندگی کا، جنگِ عظیم کا ذکر ہو یا تحریکِ پاکستان، ہجرت یا پاکستان کے ابتدائی مسائل پر بحث ہو۔ انھوں نے ہر موقع کے ماحول اور فضا کو گہرے مشاہدے کے ساتھ بیان کیا ہے:

کھیتوں سے چلتا ہوا وہ اس جگہ پہنچا جہاں شیشم اور کیکر کے ذخیرے کے گرداگرد جگہ جگہ سے ٹوٹی کچی دیوار کھنچی ہوئی تھی۔ پگڈنڈی پر ایک جگہ مٹی کا ایک برتن ٹوٹا پڑا تھا اور لسی بہہ کر زمین میں جذب ہو چکی تھی۔ پاس ہی ایک چنگیر اور باجرے کی روٹیاں بکھری پڑی تھیں۔☆۱۴۶

شہری زندگی کے رکھ رکھاو کو انھوں نے اس طرح بیان کیا ہے:

...نیپکن ساری میزوں پر رکھے تھے اور سفید وردیوں والے بیرے آخری انتظامات میں مصروف تھے ...ایاز بیگ نے کونے میں ایک کرسی گھسیٹی اور کیمرا نکال کر رات کو تصویریں لینے کے لیے اسے تیار کرنے لگے۔☆۱۴۷

جنگِ عظیم اوّل و دوم کے دوران معاشرے میں جو تبدیلیاں آئیں اور میدانِ جنگ میں فوجیوں کو جن جن مسائل کا شکار ہونا یا جن سختیوں کو برداشت کرنا پڑا وہ سب حالات اس ناول میں موجود ہیں۔

ٹھاکر داس اور نعیم نے مشین گن کی نالی کے اوپر سے آہستہ آہستہ بڑھتی ہوئی دشمن کی صف کو دیکھا اور ان کی پشت پر خوف کی سرسراہٹ پیدا ہوئی۔☆۱۴۸

چندمنٹ کے بعد سامنے سے گولی چلنی بند ہوگئی اور وردیوں والے سپاہیوں کی ایک قطار گھاس میں سے نکل کران پر ٹوٹ پڑی۔اب دست بدست لڑائی شروع ہوئی۔☆۱۴۹

انگریزوں نے جنگِ عظیم سے پہلے روشن پور کے بیش تر جوانوں کوانگریز فوج میں بھرتی کرلیا تھاان کی غیر موجودگی میں روشن پور میں جوتبدیلیاں آئیں اسے عبداللہ حسین نے بیان کر کے ناول کے فن اور حقیقت نگاری کے عنصر پر مثبت اثرات ڈالے ہیں۔

...ان برسوں میں روشن پور کے بیسیوں نو جوان اجنبی سرزمینوں میں ہلاک ہو گئے تھے۔ جنگ کے میدانوں میں بکھرے ہوئے ان کے مضبوط،مضبوط جسم تیز دھوپ میں بخارات بن کر اڑ گئے، اور نئے سیلابوں،نئی آندھیوں اورطوفان نے ان کی ہڈیاں زمین میں دبا دیں۔ بیسوں عورتیں بیوہ ہوگئیں اورلڑکیاں محبت میں غریب ہوگئیں۔روشن پور کی زمینوں میں سیلاب آئے اور فصلیں تباہ ہوگئیں اور کسان قرضے اور بھوک کے نیچے جھک گئے۔جانور بیماری سے مر گئے یا بھوکے کسانوں نے کاٹ کرکھالیے۔☆۱۵۰

تحریکِ پاکستان سے جہاں ہندوستان کے سیاسی حالات میں تبدیلی آئی وہاں عام لوگ بھی یقین اور غیر یقینی کی صورتِ حال سے دو چار ہو گئے۔اس نفانفسی اور بے چینی کو ناول نگار نے بہت وضاحت اور سچائی کے ساتھ بیان کیا ہے:

...ملک کی دونوں بڑی پارٹیوں، کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈر دلی میں جمع تھے اور وائسرائے ماؤنٹ بیٹن سے ملنے میں مصروف تھے۔ ہرطرف عجیب افراتفری کا عالم تھا ملک کے مستقبل کے متعلق ہرکوئی اپنی سی پیش گوئی کررہا تھا،لیکن ہرکوئی اپنی اپنی جگہ مکمل بے یقینی اور بے اعتمادی کی حالت میں تھا۔روزانہ زندگی کا ہرکاروبار معطل ہو چکا تھا۔ملک کے بٹوارے کی خبریں گرم تھیں اورلوگ ایک جان گسل درمیانی وقفے سے گزر رہے تھے۔چالیس کروڑ ہندوستانیوں پر ابتری کا وہ دور تھا کہ پہلے کبھی نہیں تھا۔☆۱۵۱

تقسیمِ ہند کے فیصلے کے ساتھ ہی ہندو مسلم فسادات شدت اختیار کر گئے اور لوگ ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ فسادات اور ہجرت کے دوران لوگوں کو جانی و مالی نقصان اُٹھانا پڑا۔یہ تلخ حقیقت اس ناول کے آخری دو حصوں میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

اسی روز قافلے پر پہلی بار حملہ ہوا۔حملہ آور ہندو اور سکھ تھے جوکلھاڑیوں،بلموں،تلواروں اور رائفلوں سے مسلح تھے۔قافلے والے بہت سے مردہ اور زخمی چھوڑ کر آندھی کی طرح بھاگے۔☆۱۵۲

۱۴؍اگست ۱۹۴۷ء کو جہاں مسلمانوں کو آزادی کی خوشی حاصل ہوئی وہیں انھیں حادثات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ نئے ملک میں انھیں ہر طرح کی آزادی تو حاصل تھی لیکن اس منزل تک پہنچتے پہنچتے جسمانی اور روحانی طور پر زخمی ہو چکے تھے اور ان کی معاشی حیثیت بھی بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ ناول میں اس حقیقت کا اظہار اس طرح کیا گیا ہے:

> سارے پلیٹ فارم بے گھر لوگوں سے اٹے پڑے تھے جو اپنے پھٹے پرانے بستر بچھائے اندر اور باہر ہر جگہ لیٹے تھے۔ سو رہے تھے... جو ہمّت والے تھے، پیٹ بھرنے کے لیے مزدوری کرتے، بھیک مانگتے یا چوری کرتے، باقی کبھی کبھار اُٹھ کر ریلوے کے نل سے پانی پی لیتے اور سارا وقت پڑے رہتے۔☆۱۵۳

طویل ہونے کی وجہ سے ناول میں کرداروں کی بھی بھرمار ہے، لیکن ان میں روشن علی، نعیم، عذرا کے کردار نمایاں ہیں، پرویز، نجمی، علی اور عائشہ کے کردار ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

روشن آغا کے کردار سے ناول کی کہانی شروع ہوتی ہے۔ یہ کردار صرف چند صفحات تک ہی پھیلا ہے لیکن ناول کی کہانی میں انھیں خاص اہمیت حاصل ہے۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے دوران روشن علی نے ایک زخمی انگریز فوجی کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ جنگِ آزادی میں کامیاب ہونے کے بعد انگریزوں نے روشن علی کو انعام واکرام سے نوازا اس کی سماجی اور معاشی حیثیت کو بالکل بدل دیا۔

> ... جب غدر کا خاتمہ ہوا تو کرنل جانسن نے ...روشن علی خان کو دلّی دربار میں بلا بھیجا اور اپنے دستِ خاص سے خلعت عطا کی اور کہا کہ... جاؤ اور جا کر جتنی زمین جہاں سے چاہو گھیر لو... اس کے ایک فیاض انگریز حاکم نے.. نواب روشن علی خان کو ''آغا'' کا لقب عطا کیا۔☆۱۵۴

روشن آغا کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے غلام محی الدین کو ''روشن آغا'' کا لقب دے دیا گیا اپنے باپ کی طرح اسے بھی انگریزوں سے محبت اور عقیدت تھی، اور اس نے بھی ہر موقع پر انگریزوں کی حمایت کی۔ جنگِ عظیم اوّل کے موقع پر روشن آغا نے روشن پور کے لوگوں کو انگریز فوج میں شامل ہونے پر زور دیا۔

جنگ کے دوران روشن پور کے فوجیوں نے بڑے سچے جذبے سے مخالف فوج کا مقابلہ کیا۔ روشن آغا کے رعب و دبدبے اور انگریزوں سے گہرے مراسم کا اندازہ ان مکالموں سے کیا جا سکتا ہے:

> ''تمھیں پتا ہے ہم کیوں لڑ رہے ہیں؟ اچانک مہندر سنگھ نے پوچھا۔
>
> ''جرمنوں نے حملہ کیا ہے۔''
>
> ''کہاں روشن پور پر؟''

''یہاں۔''

''پر ہم یہاں کیوں ہیں، ہم کس لیے آئے؟''

''جرمن انگریزوں کے دشمن ہیں اور انگریز ہمارے مالک ہیں بس۔''

''ہمارے مالک روشن آغا ہیں۔ میں اتنا جانتا ہوں۔''

''انگریز روشن آغا کے مالک ہیں چناں چہ...'' ☆۱۵۵

روشن آغا اور ان کے گھر کے تمام افراد کے لیے تمام سیاسی لیڈر ایک سے تھے مسلم لیگ یا کانگریس کے سیاسی افکار سے انھیں کوئی دل چسپی نہ تھی ان کا شوق اعلیٰ عہدے داروں سے تعلقات بڑھانا اور انگریزوں کی خوشنودی کے لیے سرگرداں رہنا تھا۔

یہ لوگ ملک کی متوازی سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے آپ کو ''لبرل'' کہہ کر پکارتے تھے۔☆۱۵۶

تحریکِ پاکستان سے روشن آغا کو کوئی دل چسپی نہ تھی، لیکن ملک کی تقسیم کے بعد جب ہجرت کرنے کا وقت آیا تو انھیں اپنی جائیداد، صدیوں پرانے ملک اور اپنے گھر ''روشن محل'' کو چھوڑتے وقت اسی کرب سے گزرنا پڑا جس سے عام مسلمان شہری گزرتے تھے۔ ملک کے حالات سے باخبر ہونے کے باوجود روشن آغا آخری وقت تک اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ شاید اب بھی انگریز افسروں سے اثر و رسوخ کی بدولت ان کا خاندان اور روشن محل بچ جائے، لیکن حالات اس قدر بدل چکے تھے ان کے اثر و رسوخ اور مراسم کی بھی اب کوئی اہمیت نہ رہی۔ اس کے باوجود ''روشن آغا'' گھر والوں کے ہجرت کرنے کے باوجود روشن محل میں اپنے ملازم کے ساتھ رہے۔

شام تک روشن محل کے تمام نوکر غائب ہو گئے...صرف حسین وفاداری سے...بیٹھا رہا رات سے پہلے پہلے روشن محل کو آگ لگا دی گئی ... روشن آغا اور حسین پچھلے دروازوں سے جان بچا کر بھاگے۔☆۱۵۷

ہجرت کے بعد روشن آغا اور اس کے گھر والے لاہور کی کوٹھی میں منتقل ہو گئے۔

محمد بیگ، نیاز بیگ اور ایاز بیگ کے کرداروں کی اہمیت روشن آغا کے دوست اور نعیم کے خاندان کے افراد کی وجہ سے ہے۔

محمد بیگ روشن علی (روشن آغا) کے عزیز ترین دوست تھے۔ جب انھیں انگریزوں کی طرف سے جائیداد ملی تو روشن آغا نے محمد بیگ کو نیا گھر بنا کر دیا اور اپنی زمینوں میں سے پچاس مربع بھی دیے۔ محمد بیگ کے مرنے کے بعد اس کی جائیداد نیاز بیگ اور ایاز بیگ کو مل گئی، لیکن ایک جرم میں نیاز بیگ کو بارہ سال قید بامشقت کی سزا ہو گئی۔ سزا کے طور پر انگریز حکومت نے ان کی زمینوں کا بیش تر حصہ بھی ضبط کر لیا ان حالات سے دل برداشتہ ہو کر ایاز بیگ، نیاز بیگ کے بیٹے نعیم کو لے کر شہر چلا گیا۔

جہاں اس نے عمارتوں کی تعمیر کا کام شروع کر دیا اور نعیم کو اعلیٰ انگریزی اسکول میں تعلیم دلوائی۔

نعیم ناول کا مرکزی کردار ہے۔ نعیم چوں کہ ایک مجرم کا بیٹا تھا اس لیے سرکاری قانون کے مطابق وہ سرکاری ملازمت کرنے کا اہل نہ تھا، لہٰذا سینئر کیمبرج کے بعد وہ روشن پور چلا گیا۔ روشن پور میں نعیم نے کھیتی باڑی کا کام شروع کر دیا۔ کچھ ہی عرصے کے بعد جنگِ عظیم اوّل شروع ہوگئی، اور انگریز افسروں نے کسانوں کو جبراً برطانوی فوج میں شامل کیا۔ ان میں نعیم بھی شامل تھا۔ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے نعیم کو فوج میں لانس نائک کا عہدہ دیا گیا۔ جنگ کے دوران نعیم بہت بہادری سے لڑا جنگ کے دوران ہی نعیم کا بازو اور ہاتھ کٹ گیا۔ جنگ میں اعلیٰ کارکردگی دکھانے پر نعیم کو ایک مربع زمین اور کراس ملا۔ جنگ کا اختتام کامیابی پر ہوا اور اس کے بعد نعیم روشن پور آ گیا۔ گاؤں میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد وہ دہشت گردوں کے گروہ میں شامل ہو گیا، لیکن نعیم ایسے کردار کا مالک نہیں تھا کہ وہ دہشت گردی کر سکتا بہت جلد اس نے اس گروہ سے علیحدگی اختیار کر لی۔

اسی دوران نعیم نے شیلا نام کی لڑکی سے محبت کا ڈھونگ رچا کر اسے ہوس کا نشانہ بنا تا رہا، اور پھر ایک دن اسے چھوڑ کر روشن پور چلا گیا، لیکن اس گناہ کے احساس نے اسے ساری زندگی بے چین رکھا۔ جیسا کہ اس نے اس کا خود اعتراف کرتے ہوئے کہا:

> ... میں نے اسے تباہ کر دیا، محبت کے بغیر، اور اس کے بعد سے وہ میرے دل میں ہے۔ میں کسی بھی عورت سے محبت نہ کر سکا۔ اپنی بیوی سے بھی نہیں۔ اتنی مدت ہوئی میں کبھی دل میں امن لے کر... نہیں سو سکا۔ ☆۱۵۸

اپنے والد کے انتقال کے بعد نعیم دوبارہ شہر میں چلا گیا۔ جہاں اس کی شادی روشن آغا کی بیٹی عذرا سے ہوگئی۔ شادی کے بعد عذرا اور نعیم روشن پور آ گئے۔

تربیت اور ماحول میں فرق کی وجہ سے عذرا اور نعیم کے خیالات میں بھی فرق تھا۔ اسی لیے دونوں کی زندگی کی مقاصد بھی ایک دوسرے سے مختلف تھے۔

> پرنس آف ویلز کے ہندوستانی دورے کے سلسلے میں حکومت نے تمام سیاسی پارٹیوں کو دبانا شروع کیا... انڈین نیشنل کانگریس نے دورے کا بائیکاٹ کرنے کا ارادہ کیا تو اسے خلاف قانون جماعت قرار دیا گیا... اور وسیع پیمانے پر گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ ☆۱۵۹

کانگریس کا حامی ہونے کی وجہ سے نعیم بھی پرنس کے خلاف مظاہرہ کرنا چاہتا تھا، اور وہ گرفتار ہونے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو چکا تھا۔

جب پرنس آف ویلز دہلی میں آئے تو مسلمان اور ہندو مظاہرین نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔

...سرد کے مصنوعی درختوں...کی لکڑی پر برقی روشنی سے لکھے ہوئے یہ الفاظ بار بار ظاہر اور غائب ہورہے تھے: "Tell your mother, we are unhappy." ☆۱۶۰

ایک گروپ نے ان الفاظ میں مظاہرہ کیا:

...ان کے جسم ننگے اور سیاہ تھے اور سر منڈے تھے جن پر لکھا تھا: "Tell your mother, we are hungry." ☆۱۶۱

...اسی گلی میں چند گائیں باہر ہانک دی گئیں...ان کے گلوں میں بھی بورڈ لٹک رہے تھے۔ جن پر رقم تھا: "Tell your, mother, we are dry." ☆۱۶۲

عذرا نے ذمے داری لے لی تھی کہ وہ تحریری طور پر مظاہرہ کرنے میں نعیم کا ساتھ دی گی۔ وہ بورڈ جس پر پرنس کے خلاف احتجاجی نعرے تحریر تھے۔ عذرا نے اپنے پاس رکھ لیا، لیکن پرنس سے ذاتی دل چسپی اور نعیم کی گرفتار کے ڈر سے عذرا نے وہ بورڈ پرنس کے سامنے نہیں کیا۔

ان کو سامنے پا کر آخر نعیم نے قدم بڑھایا۔ ’’کاغذ نکالو‘‘ اس نے کہا۔

وہ شہزادے پر نظریں جمائے کھڑی رہی۔ ☆۱۶۳

اس طرح عذرا کی چالاکی سے نعیم گرفتار نہیں ہوسکا۔ ۱۹۲۴ء میں:

...نعیم کو جاٹ نگر میں جلسہ منعقد کرنے کے سلسلے میں دہلی سے ہدایات موصول ہوئیں۔ ☆۱۶۴

اس جلسے میں نعیم کے ساتھ اور بھی بہت سے لوگ شامل تھے۔ اس موقع پر نعیم نے سوراج کے لیے انگریزوں کے خلاف بڑی جذباتی اور نفرت آمیز تقریر کی۔ جس کی وجہ سے نعیم کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا، اور اس کی زمینیں اور کراس ضبط کر لی گئیں۔

جب آل انڈیا مسلم لیگ کے دونوں دھڑوں کا فیصلہ کیا گیا تو فرانس سے آغا خان سوم کو بھی اس سیاسی تقریب میں مدعو کیا گیا۔ اس موقع پر پر بھی عذرا آغا خان سوم کو دیکھنے کے لیے بے چین ہوگئی۔

...آغا خان کو بہت سال ہوئے میں نے بمبئی میں دیکھا تھا۔ اس قدر شان دار شخصیت ہے ان کی، اللہ۔ ☆۱۶۵

’’کراس تو چلا گیا...کتنا اچھا ہوتا اگر تم جیل نہ جاتے۔‘‘ ☆۱۶۶

نعیم کے لیے یہ احساس بہت تکلیف دہ تھا کہ عذرا اس کے جذبات و احساسات سے زیادہ اس کے کراس، فوجی لباس یا زمینوں کی قدر کرتی ہے۔

نعیم کی دلی کیفیت اور ردِ عمل کو عبداللّٰہ حسین نے اس مکالمے کے ذریعے بیان کیا ہے:

''ہندوستان میں بہت سے لوگوں کے پاس بہادری کے تمغے ہیں، تم ان کے پاس جاسکتی ہو۔'' ☆۱۶۷

اِس موقع پر عذرا نے روایتی جاگیرداروں کی طرح اپنے خاندان کے نعیم کے خاندان پر کیے جانے والے احسانات کو جتایا:

''میرے باپ کا گھر ہے؛ میرے باپ کی زمینیں ہیں جو تم کھاتے ہو۔'' ☆۱۶۸

غرض یہ کہ عذرا اور نعیم کی زندگی کا بیش تر حصّہ ایک دوسرے کو قائل کرنے میں گزر گیا، لیکن عمر کے آخری حصّے میں نعیم نے خود کو شہری زندگی کے طور طریقوں سے ڈھال لیا، اور عذرا اور اس کے خاندان کے احسانات کو تسلیم کر لیا۔

> نعیم وزارتِ تعلیم میں انڈین پارلیمنٹری سیکرٹری تھا... سب جانتے تھے کہ اس میں روشن آغا کے ذاتی اثر ورسوخ کا بڑا حصّہ تھا... آہستہ آہستہ وہ اس قابل ہو گیا کہ دن بھر کا کام وقتِ مقررہ کے اندر ختم کر لیتا۔ اس سے بہر حال اسے کوئی طمانیت حاصل نہ ہوئی... سب سے زیادہ احساسِ ناکامی اسے یہ تھا کہ باوجود ہزار کوشش کے اپنی شخصیت میں وہ بھاری بھرکم پن، قناعت، شائستگی، مکاری، خود غرضی اور بے غرضی کا ملا جلا انداز پیدا نہ کرسکا جو عموماً دوسرے درجے کے سرکاری اہل کاروں میں پایا جاتا ہے۔ نئی شخصیت کو اپنانے کی کوشش میں اس نے اپنی قدرتی شخصیت بھی کھودی تھی۔ ☆۱۶۹

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جب ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی تو ان کی مخالفت یا حمایت کرنے والوں کے الگ قوانین تھے۔ جب تک نعیم ایک عام شہری تھا اس وقت وہ مجرم کا بیٹا ہونے کی وجہ سے سرکاری ملازمت نہیں کر سکا۔ کانگریسی ہونے کی وجہ جیل گیا اور سزا کے طور پر اس کی زمینیں اور گھر اس ضبط کر لی گئیں، لیکن جب اس نے روشن آغا کے آگے سرخم کر دیا تو اس کا شمار بھی معاشرے کے اعلیٰ سرکاری افسران میں ہونے لگا۔

تقسیمِ ہند کے بعد جب ہندو مسلم فسادات شدّت اختیار کر گئے اور ہجرت ناگزیر ہو گئی تو نعیم بھی پیدل ہجرت کرنے والے قافلے کے ساتھ شامل ہو گیا، اس قافلے میں اسے اپنا بچھڑا ہوا بھائی علی اور اس کی بیوی عائشہ ملے۔ ان سب نے پاکستان جا کر نئی زندگی شروع کرنے کے خواب دیکھے تھے، لیکن منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی نعیم کو بلوائیوں نے قتل کر دیا۔ اس کا ذکر بہت ہی مبہم انداز میں کیا گیا ہے:

> ...آخری دفعہ انھیں ہجوم میں غائب ہوتی ہوئی نعیم کی پشت نظر آئی جس پر قمیض تار تار ہو کر لٹک رہی تھی۔

کچھ دیر بعد کہیں قریب سے چند فائروں کی آواز آئی۔☆۱۷۰

ابتدا میں ناول نگار نے نعیم کے کردار کے تمام پہلوؤں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، لیکن مندرجہ بالا سطور پڑھ کر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مصنّف نے فسادات کے دوران نعیم کے قتل ہونے کا واقعہ نامناسب اور مختصر طریقے سے بیان کیا ہے، اور نہ ہی اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ نعیم نے عذرا یا اس کے گھر والوں کے ساتھ ہجرت کیوں نہیں کی۔

عذرا ناول کی ہیروئن ہے اور روشن آغا کی بیٹی، پرویز کی بہن اور نعیم کی بیوی ہے۔ عذرا ایک جاگیردار خاندان کی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور جرأت مندلڑکی ہے۔ نعیم سے شادی، پرنس آف ویلز اور سائمن کا استقبال، نعیم کے ساتھ مل کر جلیاں والا باغ کے واقعہ کی تحقیق ہر کام اس نے اپنی پسند اور روشن آغا کی مخالفت کا سامنا کر کے بڑی جرأت مندی کے ساتھ انجام دیا۔

نعیم سے شادی کے بعد وہ ''روشن پور'' چلی گئی، لیکن خود کو دیہاتی ماحول میں ڈھال نہ سکی۔

...مگر کچھ عرصے کے بعد عذرا کثرت کے ساتھ طویل وقفوں کے لیے دلّی جا کر رہنے لگی، جہاں کی اونچی، چمکدار زندگی میں گاؤں کی غیر دلچسپ فضا کے مقابلے میں اس کے لیے زیادہ کشش تھی۔☆۱۷۱

جلیاں والا باغ کے الم ناک حادثے سے عذرا بے خبر نہ تھی، لیکن اس حادثے سے عذرا کے دل کو کوئی قابلِ ذکر تکلیف نہ پہنچی تھی۔ جلیاں والا باغ کی تحقیق سے واپسی پر عذرا اور نعیم نے ایک انگریز فوجی افسر کی گفتگو سنی جو یہ تھی۔

میں ہندوستانیوں کے اس مقدّس شہر کو جلا کر راکھ کر سکتا تھا، اور ان کا طرزِ عمل دیکھ کر میرے جی میں اس قانون شکن اور باغی ہجوم کی نیست و نابود کر دوں اور ان کے بچّوں اور ان کے گھروں کو آگ لگا دوں، لیکن محض انسانی رحم و کرم اور خدا ترسی کے جذبے نے مجھے روک لیا میں نے ایک لاقانون قوم کو زنجیروں میں جکڑ کر رکھ دیا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھ پر انکوائری بٹھا دی گئی... نعیم اور عذرا کو یہ جاننے میں دقت نہ ہوئی کہ وہ شخص جلیاں والا باغ کا فاتح بریگیڈیر جنرل ڈائر تھا۔ عذرا اس کی شان دار شخصیت اور جارحانہ انداز سے مرعوب ہوئی، لیکن نعیم کے ہاتھ اسے مار گرانے کے لیے کانپنے لگے۔☆۱۷۲

پرنس آف ویلز کو دیکھنے کے لیے عذرا نعیم کو پرنس کے خلاف احتجاج کرنے کے بہانے کلکتہ لے گئی لیکن عین موقع پر اس نے نعیم کو دھوکا دیا۔

نعیم نے بورڈ اس کے ہاتھ میں ٹھونس دیا جو اس نے ہاتھ لٹکائے لٹکائے پکڑ لیا اور شہزادے پر سے نظریں ہٹائے بغیر، سحر زدہ سی، کھڑی رہی۔ انھیں گزرتے ہوئے دیکھ کر نعیم نے... اس کا

باز و مروڑا... ''اوہ!''...عذرا کے مُنہ سے نکلا... بورڈ پاؤں میں گر پڑا۔☆۱۷۳

اور یوں عذرا کی اپنی خواہش تو پوری ہو گئی لیکن نعیم اپنے مقصد میں کام یاب نہ ہو سکا۔

سائمن کمیشن کی پورے ہندوستان میں مخالفت کی گئی۔

...ہفتوں پہلے سے سیاہ جھنڈیوں کے ساتھ ان کا استقبال کرنے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔☆۱۷۴

عذرا ان تمام حالات کی پروا کیے بغیر سائمن سے ملنے کے لیے بے چین تھی، اس نے لکھنؤ جانے کی ٹھان لی۔ عذرا کا لکھنؤ جانے کا دوسرا مقصد نعیم سے جیل میں ملاقات کرنا تھا۔

...اس ملاقات کو بہرحال اس وقت تک ملتوی رکھا جب تک سائمن کمیشن کا استقبال نہ کر لیا۔☆۱۷۵

سائمن سے ملنے کی خوشی میں عذرا یہ بات بالکل فراموش کر چکی تھی کہ وہ جس کے استقبال کے لیے جا رہی ہے اس کے ساتھیوں کی وجہ سے اس کا شوہر جیل گیا ہے۔

جب عذرا سائمن کے استقبال کے بعد نعیم سے ملنے جیل گئی تو اس نے اصل حقیقت کو یوں بدل کر بتایا:

''ہم نے سائمن کمیشن کا کالی جھنڈیوں سے جلوس نکالا...وہ چوروں کی طرح اسٹیشن پر سے ہی چلے گئے۔'' ☆۱۷۶

اس واقعے کے بعد عذرا کے اپنے گھر والوں کے ساتھ تعلّقات مزید خراب ہو گئے۔

روشن آغا نے عذرا اور نعیم دونوں کی سیاسی سرگرمیوں پر اعتراض کیا، حالاں کہ عذرا کسی سیاسی مقصد کے لیے نکلتے نہیں گئی تھی۔

نعیم نے پہلے ہی اپنی حب الوطنی سے ہماری عزت بڑھائی ہے۔ ہمارے خاندان میں پچھلے سو برس سے کسی نے ایسے کام نہ کیے تھے۔☆۱۷۷

آل انڈیا مسلم لیگ کے اتحاد کی تقریب کے موقع پر جب آغا خان سوم آئے تو عذرا اس سے ملنے کے لیے جس طرح بے تاب ہوئی اس کا ذکر گذشتہ صفحات میں ہو چکا ہے، اور نعیم کے درمیان کبھی معمولی اور کبھی بڑی بات پر اختلافات ہو جاتے۔ اگر چہ عذرا نعیم کی ہر طرح سے دل جوئی کرنے کی کوشش کرتی لیکن اس کی بعض خواہشات ایسی ہوتیں جو نعیم کو سخت ناگوار گزرتیں۔ مثلاً:

''کل نئے سال کی رات ہے...دو سال ہوئے راشد اس رات کو ہمارے ساتھ تھا۔'' ☆۱۷۸

''کل وحید کی پارٹی پر جائیں گے...گریکسن کنبہ بھی وہاں آئے گا۔ وہ سب رقص کے شیدائی ہیں

کونونٹ میں ہم سب نے رقص سیکھا تھا۔'' ☆۱۷۹

نعیم کے فالج زدہ ہونے کے بعد عذرا نے اپنی ساری توجّہ اس کی طرف مرکوز کر دی۔ نعیم نے بھی اس کی قدر کی اور خود کو اس کے رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کی تو عذرا کی بہت سے خواہشات دم توڑ چکی تھیں۔

تقسیمِ ہند کے بعد عذرا اپنے گھر والوں کے ساتھ ہجرت کر کے لاہور آ گئی۔ پاکستان میں آ کر روشن آغا کے انتقال اور نعیم سے بچھڑنے کے بعد عذرا اور اس کی ماں پرویز اور اس کی بیوی کے رحم و کرم پر زندگی گزارنے لگی۔

اس کی بیوی کا عذرا کی طرف جو پرانا برتری کا رویہ قائم تھا اس میں اب اس کے لیے حقارت بھی شامل ہو چکی تھی، کہ پہلے ہجرت اور موروثی جائیداد کی گم گردگی اور اس کے بعد اس کے خاوند کی گم شدگی اور روشن آغا کی موت سے اس گھر میں اس کی حیثیت صفر کے برابر رہ گئی تھی اور زندگی میں کوئی شے اس کے حق میں نہ رہی تھی... درجے میں اس کے بعد صرف ملازمین آتے تھے۔☆۱۸۰

ان تمام حالات کا عذرا نے بہادری سے مقابلہ کیا، عذرا کے لیے صرف اتنا ہی کافی تھا کہ اس نے اور نعیم نے ایک دوسرے کو خود کے لیے بدل لیا۔

کبھی کبھی نعیم کا خیال آتا تو اس کے دل میں بے اختیار درد پیدا ہوتا... اس وقت یکے بعد دیگرے چند سوچیں اس کے ذہن میں ابھرتیں... وہ بڑی یکسوئی کے ساتھ اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیتی... اور آخیر میں سوچتی... میں نے دل کی بے چینی پر فتح پائی ہے۔☆۱۸۱

ناول نگار نے عذرا کا انجام فلسفیانہ انداز میں کیا ہے۔ غالبًا انھوں نے یہ انجام ناول ''آگ کا دریا'' کی ''چمپا احمد'' سے متاثر ہو کر کیا ہے ''آگ کا دریا'' کے اختتام پر ایک جگہ چمپا احمد کمال سے کہتی ہے:

... جہاں تک ذاتی کامیابی کا سوال ہے میں تم سے کہیں زیادہ خوش قسمت ہوں۔ میں نے سراغ پالیا ہے۔☆۱۸۲

علی نعیم کا سوتیلا بھائی ہے، اور کھیتوں میں کام کرتا تھا لیکن نعیم کا خیال تھا کہ وہ زمینوں کی صحیح طرح دیکھ بھال نہیں کرتا اس لیے اسے ایک کارخانے میں ملازمت دلوادی۔ جہاں اسے سخت محنت و مشقت کرنا پڑی۔

روشن محل جا کر نعیم نے علی اور اس کی بیوی عائشہ کو بالکل بھلا دیا۔ ایک طویل عرصے کے بعد مہاجرین کے قافلے میں علی، عائشہ اور نعیم ایک دوسرے سے ملے۔

علی کے کردار کے مہاجرین کی بے چینی اور بے حسی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ عائشہ سے شادی کے لیے علی نے بہت جتن کیے تھے۔ علی جب کارخانے میں کام کر رہا تھا اس کے معاشی حالات اچھے نہ رہتی۔ اس دوران عائشہ بھی بیمار ہو گئی تو علی:

شام کو سبزیاں ابالتا... موٹی موٹی روٹیاں پکاتا اور پہلے عائشہ کو کھلاتا اور پھر خود کھاتا... ہر تین ماہ کے بعد جب اس کے پاس کچھ پیسے جمع ہو جاتے تو ڈاکٹر کو لے کر آتا جو اس کی بیوی کے لیے کئی قسم کی دوائیاں تجویز کر کے چلا جاتا۔ ان میں جتنی وہ خرید کر لاسکتا تھا لے کر آتا اور باقاعدگی سے عائشہ کو پلاتا... بیوی کے ساتھ اس کی وفاداری، بھوکے پیٹ کام کرنے کی ہمت اور دوسرے دنیاوی کاموں سے اس کی استغنا کو دیکھ کر اس کے ساتھی اسے ''علی سائیں'' یا محض ''سائیں'' کے نام سے پکارنے لگے تھے۔☆۱۸۳

ہجرت کے دوران بھی علی نے عائشہ کا ہر ممکن خیال رکھا، لیکن جب مہاجرین کی گاڑی آئی تو گاڑی میں جلد از جلد داخل ہونے کے چکر میں ہر طرف افراتفری پھیل گئی۔

اس موقع پر علی کی بے بسی اور بے حسی ملاحظہ کیجیے:

اسٹیشن پر اس نے عائشہ کو اٹھا کر چلنے کی سعی کی لیکن کمزوری اور بھیڑ کی وجہ سے گر گیا۔ پھر اٹھا اور بے دھیانی سے اکیلا چل پڑا، دروازے تک جا کر لوٹ آیا اور دوبارہ ادھ موئی عائشہ کو اٹھانا چاہا، پھر اسے زمین پر گھسیٹنے لگا، لیکن گھمسان کے رن میں ایک دفعہ پھر اس کا ہاتھ چھوٹ گیا اور وہ دھکے کھاتا ہوا اندر کی طرف بڑھنے لگا۔

جب گاڑی آہستہ آہستہ چلنی شروع ہوئی تو وہ لپک کر اس میں سوار ہوا۔☆۱۸۴

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کو اپنی زندگی کس قدر عزیز ہوتی ہے۔ علی عائشہ سے بے پناہ محبت کرنے کے باوجود اپنی زندگی کو بچانے کے لیے عائشہ کو اسٹیشن پر تنہا اور بے یار و مددگار چھوڑ کر گاڑی میں سوار ہو گیا۔ حالاں کہ گاڑی میں بھی اس کی زندگی محفوظ نہ تھی۔

علی جب لاہور اسٹیشن پر پہنچا تو وہاں مہاجرین کا ہجوم پہلے سے موجود تھا، اور اس میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جب کوئی گاڑی اسٹیشن پر آ کر رکتی تو علی اس میں جھانک کر ضرور دیکھتا۔

... ہر دفعہ ایسا ہوتا کہ گاڑی کے سامنے گزرتا ہوا علی ہجوم کے دھکے کھا کر گر پڑتا... وہ چیختا چلاتا اور گالیاں دیتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوتا اور اپنی بے کار کوشش کو جاری رکھتا... اس کے پاس اس کا بھی کوئی واضح تصور موجود نہ تھا کہ وہ کس کی تلاش میں تھا اور کس کا انتظار کر رہا تھا۔☆۱۸۵

لاہور اسٹیشن پر علی کو ماتو ملی جو علی کو انبالے اسٹیشن پر بھی مل چکی تھی اور اب کپڑے کے کارخانے میں کام کرتی تھی اور ہر روز اپنے بیٹے کی تلاش میں لاہور اسٹیشن آتی۔ وہ علی کو بھی اپنے ساتھ لے گئی۔

یہ بانو اصل میں شیلا تھی جو نعیم سمیت مختلف مردوں کی ہوس کا نشانہ بننے کے بعد لال دین کی بیوی بن گئی اور مسلمان ہو چکی تھی۔ بانو کی جھونپڑی میں اب علی اور دین محمد بھی رہنے لگی، اور بعد میں علی نے دونوں کی رضامندی سے بانو اور دین محمد کی شادی کروادی۔

عبداللہ حسین نے اس ناول میں دو مختلف طبقات کو دکھایا ہے۔ ایک طرف روشن آغا کا خاندان ہے جس میں عذرا، پرویز اور نجمی وغیرہ شامل ہیں۔

کلکٹر سے نواب آف روشن پور بننے میں ان کی محنت کا نہیں، بلکہ انگریزوں سے تعلّقات کا گہرا عمل دخل تھا۔ ملک کے حالات کیسے بھی ہوتے انھیں کوئی فرق نہیں پڑتا... معاشرے میں انھیں خاص مقام حاصل ہے، اور زندگی کی تمام سہولتیں انھیں میسّر تھیں۔

ہندو اور مسلمان جب انگریزوں کے خلاف متحد ہو کر مظاہرہ کرتے تو روشن آغا کو یہ بات سخت ناگوار گزرتی۔
تقسیمِ ہند کے اعلان کے ساتھ ہی ملک میں ہندو مسلم فسادات شدّت اختیار کر گئے اور لوگوں کو اچانک ہجرت کرنا پڑی جس سے ہر طرف افراتفری پھیل گئی۔

> چند روز بعد فسادات زور پکڑ گئے اور لوگ شہر چھوڑنے لگے۔ ریل گاڑیاں کم پڑ گئیں تو جان بچا کر بھاگنے والوں کے قافلوں کے قافلے پیدل چل پڑے... وہ جسے اب تک ملک کی آبادی نے مخصوص خیال آرائی سمجھ رکھا تھا حقیقت بنی ہوئی نظر آئی تو لوگ دفعتاً خالی الذہن ہو گئے۔ فسادات کی حیوانیت سر پر سوار ہوئی تو بالکل بوکھلا گئے اور گھر بار چھوڑ چھاڑ، منزل کا تعین کیے بغیر بھاگ اُٹھے۔☆۱۸۶

ان حالات میں بھی روشن آغا یا اس کے خاندان کے کسی فرد پر کوئی آنچ نہ آئی، اور جب ہجرت کرنے کا وقت آیا تو بھی انھیں کسی قسم کی تکلیف پیش نہ آئی۔

> پرویز دو گھنٹے سے متواتر بول بول کر اب خاموش ہو چکا تھا۔ صبح سے وہ روشن آغا کو سب کے ساتھ پاکستان جانے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس نے دلّی سے لاہور جانے والے ہوائی جہاز پر سب کی سیٹیں بک کرائی تھیں اور سامان، روشن آغا کو خبر کیے بغیر باندھا جا چکا تھا۔☆۱۸۷

لاہور میں انھیں کوئی تکلیف نہ تھی۔ ہندوستان میں ان کے لیے ''روشن محل'' تھا تو پاکستان میں ''راج منزل'' تھی۔ اتنا سا فرق بھی روشن آغا سے برداشت نہیں ہو رہا تھا، اور وہ چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح کوٹھی کا نام ''روشن محل'' ہو جائے۔

روشن آغا کے گھر کے دوسرے افراد کو بھی نئے ملک میں کوئی خاص دشواری پیش نہ آئی اور وہ نئے ماحول میں بہت جلد

ڈھل گئے۔

...نجمی نے ایک کونونٹ میں پڑھا شروع کر دیا تھا۔ مالی ضرورت سے کم اور اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی خاطر یا زیادہ، گو اس بات کا اس کے باپ کو روشن آغا کو علم نہ تھا۔ پرویز صوبائی حکومت میں اعلیٰ افسر تھا، اور ایک پرانی اوپل پر...سیکرٹریٹ جایا کرتا تھا۔☆۱۸۸

دوسری طرف ہندوستان کی عام عوام تھی جس میں محمد بیگ، نیاز بیگ، ایاز بیگ، نعیم علی اور عائشہ بھی شامل ہیں۔ یہ معاشرے کے مظلوم اور پسے ہوئے طبقے کے افراد تھے جو ۱۸۵۷ء کے بعد سے قیامِ پاکستان تک ہونے والے حادثات کا شکار ہوتے رہے۔ کبھی غدّاری کے جرم میں، کبھی جنگِ عظیم کے دوران، پھر تحریکِ پاکستان کے لیے اور آخر میں فسادات اور ہجرت کے دوران جانی، مالی اور روحانی نقصانات کا شکار ہوئے۔

جنگِ عظیم اوّل میں روشن پور کے جوان کو زبردستی فوج میں شامل کرتے وقت انگریز حکومت نے اس بات کا قطعی خیال نہ کیا کہ ان کے خاندان اور فصلوں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔

''اپنی فصلیں اب تم اس سے کاٹو گے اور میدانِ جنگ میں کاٹو گے'' یہ کہہ کر اس نے سنگین ہوا میں لہرائی... سنگین لگی ہوئی رائفلوں سے جوانوں کو ہانکا جانے لگا۔ بعض کسانوں کی پسلیوں میں رائفلوں کے دستے اور سنگین چبھو چبھو کر بیلوں سے علیحدہ کیا گیا۔☆۱۸۹

جنگِ عظیم سے پہلے انگریزوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں سے وعدہ کیا تھا کہ جنگ کے اختتام پر وہ انھیں انعام و اکرام سے نوازیں گے، لیکن جب وہ وعدہ پورا نہ کیا گیا تو ان کے خلاف مظاہرے کیے گئے جنھیں برداشت کرنا انگریزوں کے بس میں نہ تھا۔ چناں چہ انھوں نے رولٹ ایکٹ نافذ کر کے مظاہرے کرنے پر پابندی لگا دی، لیکن اس کے باوجود جب مظاہرے ہوتے رہے تو جنرل ڈائر نے ایک چال چلی اور انھیں جلیاں والا باغ میں جمع ہو کر اپنے مطالبات پیش کرنے کی تجویز دی۔ جب سب جمع ہو گئے تو ان پر فائرنگ کر دی گئی جس سے ہزاروں ہندو اور مسلمان مرے۔

انگریز ہندو مسلم اتحاد کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے تھے اس لیے وہ کسی نہ کسی بہانے انھیں لڑانے کی کوشش کرتے، اور ان کے باہمی اختلافات بالخصوص مذہبی معاملات کو بنیاد بنا کر وہ انھیں ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتے۔

گئوکشی کی بات تھی چوہدری...مدّت سے... پندرھویں کی پندرھویں گائے ذبح ہوتی آئی ہے۔ آج ہندو ضد پر آ گئے... یہ سب ان سؤروں کی شرارت ہے جو باہر سے آئے ہیں۔ بس جھگڑا بڑھ گیا۔ ماسٹر، جو بے چارا ادھر کا نہ ادھر کا، سمجھانے گیا اور سؤروں نے اسے ختم کر دیا۔☆۱۹۰

پرنس آف ویلز اور سائمن کمیشن کی آمد کے موقع پر جب ہندوستانی نے ان کے خلاف مظاہرہ کیا تو وسیع پیمانے پر

گرفتاریاں عمل میں آئیں۔

تحریکِ پاکستان کے بعد جب تقسیمِ ہند کا اعلان ہوا تو اس موقع پر بھی غریب اور متوسط طبقے کو ہی ہر قسم کے نقصانات کا سامنا کرنا پڑا ہجرت سے لے کر پاکستان پہنچنے تک انھیں خطرات کا سامنا کرنا پڑا۔ لاکھوں مسلمان شہید ہوئے اور جو زندہ رہے وہ خوف، دہشت اور صدمے سے بدحواس ہو چکے تھے۔ آزاد ملک میں پہنچنے کے بعد انھیں وہ خوشی نہ ملی۔ جس کے لیے انھوں نے کئی سال تک انتھک جدو جہد کی تھی۔

عبداللہ حسین نے ناول کے چاروں ابواب 'برٹش انڈیا'، 'ہندوستان'، 'بٹوارا' اور 'اختتامیہ' میں ہندوستان میں معاشرے کے مختلف طبقات پر ملک کے سیاسی حالات کے اثرات اور اس میں ان کی شمولیت یا گریز کو بیان کیا ہے۔ نعیم کے کردار کے ذریعے انھوں نے معاشرے کے ان لوگوں کی نمائندگی کی ہے جنھوں نے اپنی جان کی پروا کیے بغیر ملک کے تحفظ اور سلامتی کے لیے ہر ممکن کوششیں کیں۔ نعیم نے انگریزوں کے دور میں جنگِ عظیم میں بحیثیت برطانوی فوجی اور بعد میں کانگریسی بن کر ہر مصیبت کا سامنا کیا اور پھر جب تقسیمِ ہند کے بعد ہجرت کرنے کا وقت آیا تو بھی ہجرت کی صعوبتوں کو برداشت کرنا پڑا۔ ہجرت کے دوران بہت سے لوگ مارے گئے جن میں نعیم بھی شامل تھا اور جو لوگ آزاد ملک میں پہنچے ان کی زندگی میں بھی کوئی خوشگوار تبدیلی نہ آئی۔

جب کہ دوسری طرف روشن آغا کے خاندان کے افراد انگریزوں سے وفاداری کے صلے میں ہر دور میں سکھ اور چین نصیب ہوا۔

آزادی کے بعد بھی ملک سے وہ طبقاتی نظام ختم نہ ہو سکا جس کی وجہ سے ملک میں جو ناانصافیاں ہوئی تھیں وہ بھی ختم نہ ہو سکیں۔

غرض یہ کہ ملک تو بدل گیا لیکن نظام نہ بدلا۔ جیسا کہ عبداللہ حسین نے ناول کے شروع میں لکھا ہے:

> And (The people) shall look into the earth and behold trouble and darkness, dimness of anglisk; and they shall be driven to darkness. (ISAIH)

کوششیں کرنے اور زندگی کو داؤ پر لگانے والے کوئی اور تھے اور اس کا صلہ کسی اور کو ملا۔ یہ مظلوم اور پسے ہوئے لوگ جو منزل تک کبھی نہ پہنچ سکے وہی لوگ دراصل معاشرے کی ''اداس نسلیں'' ہیں۔ انھیں کے لیے محسن بھوپالی نے کہا تھا۔

نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھیے
منزل انھیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

معصومہ

عصمت چغتائی کا شمار ان ناول نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے نسوانی کرداروں کے ذریعے عورت کی نفسیات کو بیان کیا ہے۔

ناول ''معصومہ'' میں بھی انھوں نے فسادات اور تقسیمِ ہند سے متأثر ہونے والے ایک خاندان کے مسائل کو بیان کیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار معصومہ ہے جو اپنے گھر والوں کی خوشی کے لیے قربانی دیتی ہے، اور طوائف جیسے قابلِ ذکر نفرت پیشے کو اختیار کرلیتی ہے۔

ناول کا پلاٹ کم زور ہے۔ ناول میں انھوں نے دو موضوعات کو بیان کیا ہے۔ ایک طرف تو وہ تقسیم اور فسادات سے متأثرہ خاندان کی معاشرتی حیثیت اور معاشی مسائل کو واضح کرنا چاہ رہی ہے اور دوسری طرف انھوں نے فلمی دنیا کی غیر اخلاقی سرگرمیوں اور بے ہودہ ماحول کو مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔

ناول میں انھوں نے سب سے زیادہ توجہ جنس نگاری پر دی ہے۔ جس سے ناول کی اہمیت اور ادبی حیثیت پر برے اثرات پڑتے ہیں۔

جیسا کہ ڈاکٹر حسرت کاس گنجوی نے ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے:

> ''معصومہ'' میں عصمت پر جنس نگاری کا جذبہ زیادہ غالب ہے۔ بعض جگہ تو وہ جنسی حقیقت نگاری کا نام لے کر ہتھے سے اکھڑ گئی ہے۔☆۱۹۱

ناول میں فلمی دنیا کا ماحول نمایاں طور پر پیش کیا گیا ہے۔ فلمی دنیا کے کرداروں کے اندازِ گفتگو کو بھی انھوں نے جس طرح پیش کیا ہے وہ ان کے گہرے مشاہدے کی دلیل ہے، مثلاً ناول کے کرداروں نے بے باکی اور بے حیائی سے ہر بات کا برملا اظہار کیا ہے:

> ''اجی گولی مارو، اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو سوائے استانیاں بننے کے کسی مصرف کی نہیں ہوتیں۔'' ☆۱۹۲

> ''دعوتیں پارٹیاں سب اوپری باتیں ہیں، ذرا مرغی گلنے دو۔'' ☆۱۹۳

> ''یہی پیار ہے اور یہی بیوپار ہے۔'' ☆۱۹۴

> ''...مگر ابھی کتنا بلیک ہمیں بھی تو بھرنا ہے۔'' ☆۱۹۵

''معصومہ'' ناول کا مرکزی کردار ہے۔ اس کے بعد بیگم (معصومہ کی والدہ)، کرنل، احسان صاحب اور احمد بھائی وغیرہ ناول کے معاون کردار ہیں۔

جب ہندوستان میں فسادات شروع ہوئے تو معصومہ کے والد اپنے کاروبار کو محفوظ رکھنے کے لیے اپنے دونوں بڑے بیٹوں کو لے کر حیدرآباد دکن سے کراچی چلے گئے۔ان کا ارادہ تھا کہ کاروبار چل جانے کے بعد باقی گھر والوں کو بھی اپنے پاس بلالیں گے لیکن وہاں جب کاروبار چل گیا تو معصومہ کے والد نے کسی نوجوان لڑکی سے شادی کرلی والد کے علاوہ دونوں بیٹوں نے بھی شادیاں کرلیں اور اپنے گھر والوں کو فراموش کردیا۔

معصومہ کی والدہ نے کچھ عرصہ تک تو گھر کا قیمتی سامان اور زیورات بیچ کر اپنی ضرریات پوری کیں ،لیکن اس کے بعد کچھ عرصہ اپنے قریبی عزیز احسان صاحب کے ساتھ رہیں لیکن وہاں بھی احساب صاحب کی بیوی آڑے آگئیں اور احسان صاحب نے دوسری جگہ ان کے رہنے کا بندوبست کرت دیا۔ایک دن معصومہ کی والدہ کسی کام سے دوسرے شہر میں گئیں تو ان کی غیر موجودگی میں علی احمد بھائی معصومہ پر بہت مہربان ہوگئے۔

معصومہ کی والدہ کا خیال تھا کہ علی احمد معصومہ سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن علی احمد شادی کو بے وقوفی سمجھتے تھے۔ معصومہ کی والدہ کو جب اصل بات پتا چلی تو انھیں بہت دکھ ہوا اور انھوں نے احسان کی اتنی بے عزتی کی کہ اس نے کچھ عرصے کے لیے علی احمد کو سمجھا کر خاموش کروادیا۔

''...اونچے گھرانے کی لونڈیا ہے...کسی نے آج تک اس کا آنچل نہیں دیکھا۔اتنی تاولی نہیں چلے گی۔'' ☆۱۹۶

احسان نے بھی اپنی بات منوانے کے لیے بیگم (معصومہ کی والدہ) کو گھر کا خرچہ دینے میں کمی کردی۔خرچہ نہ دینے کی وجہ سے معصومہ کے چھوٹے بہن بھائیوں کے اسکول سے نام خارج کردیے گئے۔ جب بیگم سب کی مقروض ہوگئیں تو احسان نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ معصومہ کو فلم میں کام کروائیں۔

فلم اسٹوڈیو میں بیگم چلی تو گئیں وہاں اپنی خاندانی اکڑ اور حسب نسب کو دوسروں پر جتاتی رہیں رہی سہی کمی معصومہ کی جھجک اور شرم نے پوری کردی فلمی دنیا کے ماحول میں نہ ڈھلنے کی وجہ سے معصومہ کو فلم میں کام نہ مل سکا تو احسان نے ایک بار پھر بیگم سے احمد علی کی سفارش کی۔

معاشی مسائل اور شوہر اور بیٹوں کی بے وفائی نے بیگم کو بالکل نڈھال کردیا۔

اس دن بیگم کی خاندانی جھجک نے دم توڑ دیا۔انھوں نے حامی بھرلی۔فلیٹ بچی کے نام ہوگا۔ ایک ہزار کا بندھا خرچ ہے۔اس طرح انھوں نے اپنے شوہر سے بدلہ لے لیا۔اُدھر وہ کسی کی انیس برس کی کونپل کو کھول کر رہے تھے۔ اِدھر اُن کی اِسی عمر کی بیٹی کے دام لگ رہے تھے۔ بڑے میاں کو خبر ملے گی کہ صاحب زادی نے دھندا شروع کردیا تو مزہ آجائے گا۔☆۱۹۷

اور پھر ایک دن احمد بھائی کے دام وصول ہو گئے، اور وہ معصومہ نیلوفر بن گئی اور بیگم کی نوابی لوٹ آئی... سلیم میاں کا نام فوراً بڑے شان دار اسکول میں لکھوا دیا گیا.. صرف نواب نہ تھے۔ تو ناز برداریوں کو احسان صاحب کیا کم تھے۔ ☆۱۹۸

نیلوفر بننے کے بعد بھی معصومہ کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی وہ اسے ذرا ذرا سی بات پر مارنا پیٹنا شروع کر دیتی ایک بار اس نے احمد علی کے پیٹ میں اتنی زور سے لات ماری کہ اسے آپریشن کروانا پڑا۔

...ایک دم بھوت سوار ہو جاتا تو کتے کی طرح بھونکنے کا حکم دیتی... اپنا جوتا پھینک کر کہتی، چاروں ہاتھوں پیروں کے بل چل کر بھونکو، پھر مُنہ سے جوتا اٹھا کر لاؤ... بیٹھے بیٹھے سب کے سامنے کہہ دیتی، گدھے کی بولی بولو۔ ☆۱۹۹

احمد بھائی اس پر بھی خوش تھے۔ بیگم جب معصومہ کو ڈانٹتیں تو وہ کہتا:

عاسک ماسوک کا مُخول ہے تم کاہے کو بیچ میں آتا۔ ☆۲۰۰

احمد علی کی ہر ممکن کوشش کے باوجود معصومہ انھیں خاطر میں نہ لائی۔ ان ہی دنوں معصومہ کو اپنے پڑوسی منوہر سے عشق ہو گیا۔ منوہر اور معصومہ نے شادی کرنے کا بھی فیصلہ کر لیا۔ بیگم کو پتا چلا تو انھوں نے پریشان ہو کر کہا:

''شادی کر لوگی —— اور کھاؤ گی کیا؟ اس کے باوا کا سر؟'' ☆۲۰۱

گھنٹوں دونوں نے بحث کی بیگم نے رو رو کر اپنی بات منوانے کی کوشش کی اور آخر میں معصومہ ہی کو قربانی دینی پڑی۔ فلموں کی ناکامی اور گھوڑ دوڑ میں ہارنے کے بعد احمد علی بالکل دیوالیہ ہو گیا تو اسے معصومہ سے شادی کی سوجھی لیکن بیگم نے انکار کر دیا۔

اب احسان نے سیٹھ سورج مل اور معصومہ کو ایک دوسرے سے ملوا دیا۔ شکل وصورت، اور مالی لحاظ سے سورج مل احمد علی سے بہت بہتر تھا۔ وہ ایک بارعب شخصیت کا مالک تھا اس نے آہستہ آہستہ معصومہ سے تعلقات بڑھائے اس کی صحبت میں رہ کر معصومہ نے بھی بات چیت کرنے اور پہننے اوڑھنے میں سلیقہ اختیار کر لیا۔

سورج مل کے معصومہ کے علاوہ اور بھی کئی لڑکیوں سے تعلقات تھے۔ جن سے اس کی کئی اولادیں پیدا ہو چکی تھیں۔ سورج مل نے تمام لڑکیوں کے نام سے کاروبار شروع کر رکھے تھے ٹیکس سے بچنے کے لیے اس نے نیلوفر کے نام سے بھی اپنا بزنس شروع کیا۔

معصومہ اس بات پر ہی خوش تھی کہ سورج مل نے اسے رانیوں کی طرح رکھا ہے۔ وہ دعوتوں میں سیٹھ کے ساتھ جاتی۔ فلم سیٹ پر جاتی تو سب پر رعب جما کر بہت خوش ہوتی۔ معصومہ نے سورج مل کی بیٹی کو بھی جنم دیا۔ سورج مل نے بچی کے

سارے اخراجات استعمال کیے لیکن اسے کبھی بیٹی کا درجہ نہ دیا۔ سورج مل کا دل جب معصومہ سے بھر گیا تو اسے ایک رات پونا کے ہوٹل میں چھوڑ کر چلا گیا۔

سیٹھ کے اچانک جانے سے اسے بے حد صدمہ ہوا۔ اب اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی حیثیت مختلف سیٹھوں کی گیند کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ اس وقت معصومہ کی جو دلی کیفیت تھی اسے عصمت نے ناول میں معصومہ کے کردار کے ذریعے یوں بیان کیا ہے:

''...سب کچھ ہو سکتا ہے معصومہ نیلوفر بن سکتی ہے، امی جان نائیکہ بن سکتی ہیں۔ ابا جان سب کو بھول سکتے ہیں۔ بھائی مُنہ موڑ سکتے ہیں تو پھر سیٹھ کون سا اس کا سگا ہے۔'' ☆۲۰۲

سورج مل کے بعد ہوٹل کے مینیجر نے اسے اپنے دام میں پھنسا لیا۔ مینیجر کے ساتھ رہ کر اسے مارفیا کا انجکشن اور بے ہودہ فلمیں دیکھنے کی بھی لت پڑ گئی۔ مینیجر کے ساتھ کچھ ہی دن گزارے تھے کہ معصومہ کا ایک اور اُمّید وار بھی آ گیا جو پہلے ہی معصومہ کی ماں کو ایک مہینے کا خرچہ ایڈوانس میں دے کر آیا تھا۔ اسے مینجر نے بتایا کہ سیٹھ سورج مل نے اسے نواب صاحب کو بخش دیا ہے۔

معصومہ نے مینیجر سے شادی کی درخواست کی لیکن اس نے اپنی غربت اور مجبوریوں کا رونا رو کر معصومہ سے جان چھڑا لی۔

اب نیلوفر کا کام راجا کے ساتھ مختلف پارٹیوں میں جانا اور اس کے ساتھ سفر کرنا تھا۔ کیوں کہ راجا کو تنہا سفر کرنے سے کوفت تھی۔ راجا نیلوفر کے ذریعے لوگوں سے مراسم بڑھاتا اور پھر نیلوفر کے ذریعے ہی رشوت کا لین دین ہوتا اور کبھی کبھار اپنے مقصد میں کام یابی حاصل کرنے کے لیے نیلوفر کو بھی بطور رشوت پیش کرتا۔

راجا نے ایک پارٹی میں کرنل کو بطور مہمان خصوصی بلایا۔ معصومہ نے صرف پارٹی ہی میں کرنل کی خاطر مدارت نہیں کی، بلکہ کرنل کے ساتھ ایک گزارنے کے بعد اپنی قیمت وصول کی اور راجا کا مسئلہ بھی حل کروایا۔

اس زمین پر راجا نے ایک کارخانہ کھولا جہاں گاڑیوں کے اسپئیر پارٹ تالے، اسٹو اور ٹفن بنتے تھے۔ راجا کی فیکٹری کے گرد و نواح میں بھی بعض لوگ گھروں میں اسٹو اور تالے وغیرہ بنا کر سستے داموں بیچتے تھے اس لیے عام طور پر لوگ کاٹیج انڈسٹری ہی سے اپنی ضرورت کی چیزیں خریدتے تھے۔ یہ بات راجا کو سخت ناگوار گزرتی ایک دن راجا نے منصوبہ بنا کر اپنے کارخانے میں آگ لگوا دی اور اس کا سارا الزام انڈسٹری کاٹیج کے مزدوروں پر لگا کر انھیں گرفتار کروا دیا اور بعض کو مروا دیا۔ اس کام میں بھی راجا نے معصومہ کے ذریعے کرنل کی مدد حاصل کی۔

غرض یہ کہ معصومہ ایک کے بعد دوسرے دام میں پھنس جاتی ذرا سا بھی احتجاج کرنے پر معززین شہر اسے اس کی اوقات یاد دلا دیتے۔ ان حالات میں اسے معصومہ سے نیلوفر بننے کا شدّت سے احساس ہوتا۔ تب وہ دعا مانگتی:

''...اللہ کرے ممی مر جائیں۔ پھر بچّوں کی فیس کے تقاضے ختم ہو جائیں گے زبیدہ کی شادی کے لیے روپیہ کی ضرورت نہ رہے گی۔ آخر وہ ان کے بچّے کیوں پال رہی ہے وہ بھی ان کی لڑکی ہے...پھر وہ اسے خصم سمجھ کر تقاضے کیوں کرتی ہے۔'' ☆۲۰۳

زبیدہ کی شادی اس نے بہت دھوم دھام سے کی۔ زبیدہ اور اس کے شوہر کی علاوہ ان کے گھر والوں کو بھی نہایت قیمتی تحائف سے نوازا گیا، لیکن قیمتی تحائف بھی معصومہ کی اصلیت کو نہ چھپا سکے۔

سلیم کو لوگ رنڈی کا بھائی کہہ کر چڑاتے ہیں تو وہ خاموش، سر جھکا کر آنسو بہاتا ہے، تب نیلوفر کا کلیجہ کٹنے لگتا ہے اور وہ اسے موٹر سائیکل دلا کر دل بہلا دیتی ہے۔ زبیدہ کا میاں اسے بہن کی بدکاریوں کے طعنے دیتا ہے...تب نیلوفر سچے موتیوں کی لڑیوں سے اس کے آنسو پونچھتی ہے... عید پر روٹھے ہوئے بہنوئی کو منانے کے لیے اسے نئی موٹر لے کر دی، تب وہ سلام کرنے دو گھڑی کے لیے آیا۔ ☆۲۰۴

معصومہ کا انجام پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ عصمت چغتائی نے ترقی پسند تحریک کے نظریات کو پیشِ نظر رکھ کر ناول لکھا ہے عصمت نے معصومہ کی تمام بدکاریوں کا ذمّے دار معاشرے کو ٹھہرایا ہے۔

جب معصومہ نیلوفر بنی تو دنیا والے کہاں تھے؟ کس نے سر پر ہاتھ دھرا؟ یہاں تو بس اپنی ڈفلی اور اپنا راگ! اپنی بلا سے کوئی جیے یا مرے۔ ☆۲۰۵

حالاں کہ ''معصومہ'' کو نیلوفر بنانے کی ذمّے داری معصومہ کے والدین ہیں۔

یقیناً معاشرے میں احمد علی بھائی، احسان، سورج مل، منیجر، راجا اور کرنل جیسے بدکردار لوگ موجود ہیں۔ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ایسے لوگ اپنے ہر برے مقصد میں کام یاب بھی ہو جاتے۔ بدکاریوں کے ساتھ وہ کبھی کبھی نیکیوں کی نمائش بھی کر دیتے ہیں۔

سورج مل تو دیش سیوک ہیں۔ آئے دن یتیم خانوں اور دودھوا آشرموں کا ادگھاٹن کرتے رہتے ہیں۔ جہاں ان کے گلوں میں لمبے لمبے ہار پڑتے ہیں...کیوں کہ بدکار نہیں...احمد علی بھائی قومی اداروں میں انسانیت اور شرافت پر لیکچر جھاڑتے ہیں۔ لڑکیوں کے اسکول میں انعامات تقسیم کرتے وقت وہ بڑے چاو سے پیاری پیاری بچیوں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔ شاید یہ معلوم کرنے کے لیے ان میں سے کون اس قابل ہیں جنھیں نیلوفر بنایا جائے اس لیے بدکار نہیں... راجا صاحب ملک کو انڈسٹریلائز کر رہے ہیں۔ ان کا کارخانہ بڑے زور شور سے ترقی کر رہا

ہے۔ وہ چناو میں کھڑے ہو رہے ہیں۔ اسمبلی میں بیٹھ کر جنتا کی بھلائی کے لیے بڑے بڑے
کام کریں گے... دیواروں پر چپکے... پوسٹروں میں ان کی قومی خدمات کی لمبی چوڑی فہرست
موجود ہے۔ مگر کہیں ان گم نام مستریوں کا ذکر نہیں جو لاپتا ہو گئے، جن کے بال بچے سڑکوں پر
رُل گئے ہیں نہ معصومہ کے چندن ہار کا کہیں حوالہ دیا ہے کیوں کہ راجا بدکار نہیں! ☆۲۰۶

معاشرے کے بے خبر اور غریب لوگ ایسے بدکاروں کے اصل چہرے دیکھنے سے قاصر ہوتے ہیں اور ان کے دکھاوے کی نیکیوں کو ان کا خلوص اور ہمدردی سمجھ کر انھیں اپنا محسن تسلیم کر لیتے ہیں۔

جو لوگ ان کے تمام اوصاف سے واقف ہونے کے باوجود ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور انھیں مرعوب کرنے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ وہ بھی ان کے تمام گناہوں اور بدکاریوں میں برابر کے شریک ہوتے ہیں ناول کا کردار ''معصومہ'' بھی معاشرے کے ان لوگوں کی ترجمانی کرتا ہے جو سب کچھ جانتے ہوئے بھی گم راہی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ اس حقیقت کو عصمت نے بھی ناول میں بیان کیا ہے:

بدی کتنی جلدی اور آسانی سے انسان میں رچ جاتی ہیں نیکی کی تلقین کے لیے بڑے بڑے اوتار،
پیغمبر سر پٹک کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ ☆۲۰۷

معصومہ کی والدہ اگر چاہتیں تو شریفانہ پیشہ اختیار کر کے بھی زندگی گزار سکتی تھیں۔ پُر آسائش زندگی گزارنے کے بجائے سادگی سے بھی زندگی گزاری جا سکتی تھی۔ اس خیال کو عصمت نے ناول میں بیان کرتے ہوئے کہا:

اگر بیگم درمیانے طبقے کی کم زوریوں میں جکڑی ہوتیں تو بیٹی کا سودا کرنے کے بجائے سلائی
کر کے پیٹ پالتیں۔ لڑکی کو کسی اسکول میں چھوٹی موٹی نوکری مل جاتی، روکھی سوکھی میں گزر
کرتیں تو زیور ہی کئی سال ساتھ دے جاتا مگر تنگی ترشی کی نہ تو انھیں عادت تھی نہ ہی کسی اور کو
کرتے دیکھا۔ ☆۲۰۸

ڈاکٹر سہیل بخاری نے معاشرے کی اس تلخ حقیقت کو جھٹلاتے ہوئے کہا ہے:

کوئی شخص جوان بیٹیوں کے ہوتے ہوئے بیوی بچوں کو یوں بھلا کر نہیں بیٹھ سکتا جیسے نیلوفر کا
باپ پاکستان پہنچ کر اس کی ماں، بہنوں کو بھول گیا اور نہ جوان بیٹے ہی اپنی ماں بہنوں کو یوں
بھلا سکتے ہیں۔ پھر بیگم جیسی خاندانی اور عمر رسیدہ عورت بھی سات اولادوں کے بعد منجھی ہوئی
نائیکہ نہیں بن سکتی۔ مصنفہ نے بیگم اور نائیکہ کے درمیانی فاصلے کو طے کرنے کی ناکام کوشش کی
ہے۔ ☆۲۰۹

ڈاکٹر سہیل بخاری کی اِس سادگی اور بے خبری پر بڑی حیرت ہوتی ہے۔ درحقیقت معاشرے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں۔ اگر ڈاکٹر سہیل بخاری کا خیال درست ہوتا تو طوائف جیسا پیشہ کب کا دم توڑ چکا ہوتا۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ معاشرے میں غریبوں کی کمی نہیں یہ انسان کی اپنی فطرت یا رجحان ہوتا ہے کہ وہ اپنی عزت اور شرافت کو بچائے یا فراموش کر کے راتوں رات امیر ہونے کا خواب پورا کرے۔

معصومہ کی ماں کا کردار بھی ان لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے جو دولت کی خاطر اپنی عزت اور تن من دھن سے سب کچھ قربان کر دیتے ہیں۔ معصومہ کی ماں فسادات اور شوہر کے بے وفائی کے بعد معاشی مسائل کا شکار ہوئی، لیکن یہ معاشی مسائل صرف بیٹی کو طوائف بنا کر حل نہیں کیے جاسکتے تھے، بلکہ کوئی شریفانہ پیشہ اختیار کر کے بھی وہ اپنی زندگی کی ضروریات پوری کر سکتی تھیں۔

ناول کے ذریعے یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ معصومہ اور اس کے خاندان کے دوسرے افراد کو پہلے فسادات اور پھر اپنے باپ اور بھائیوں کی زیادتیوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن یہ نقصان معصومہ کو پورا کرنا پڑا۔ ان حالات نے معصومہ کی زندگی کو بری طرح متاثر کیا۔

ایک وہ دور تھا جب معصومہ کی والدہ کہتیں:

''معصومہ بی بی دوپٹا سنبھال کر اوڑھو، قرآن سامنے رکھا ہے۔'' ☆ ۲۱۰

اور اس کے گھر والے سوچتے:

...اگلے جمعے قرآن شریف ختم ہو جائے گا، پھر نشرہ ہوگا۔ ☆۲۱۱

اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب معصومہ کی والدہ نے اپنی اور اپنے بچوں کی خوشیوں اور آسائشوں کے لیے معصومہ کی عزت اور زندگی کو داو پر لگا دیا۔

> ...وہ آج اتنے دنوں سے غائب تھی مگر شاید انھیں فکر نہ تھی۔ جیسے وہ عورت ہی نہیں اس کی عصمت ہی نہیں ایک آبرو باختہ عورت کا ماں کو کیا ڈر؟ یہ بھی تو ڈر نہیں کہ کوئی اس کا گلا ہی گھونٹ دے گا، کوئی کاٹ کر ندی میں بہا دے گا۔ اب وہ ان کی ناک نہیں چورا ہے کی ناک تھی، جو جڑ سے کٹ چکی تھی۔ ☆ ۲۱۲

اس ناول میں عصمت نے معصومہ کی والدہ کی خود غرضی کے علاوہ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے سرکاری افسروں اور سیاست دانوں اور صنعت کاروں کی اخلاقی کم زوریوں کا بھی نقشہ کھینچا ہے، احمد بھائی، کرنل، سورج مل، راجا اور مینجر صاحب کی زندگیوں کے معمولات میں خواتین کو اپنی تفریح، ہوس اور رشوت کے طور پر استعمال کرنا بھی شامل ہے۔ ان بدنصیب خواتین میں معصومہ بھی شامل تھی۔

جسے ناول کے کردار اپنی ہوس اور مفاد کے لیے استعمال کرنے کے بعد چھوڑتے گئے، لیکن تمام اخلاقی کمزریوں کے باوجود ان کی نیک نامی پر کوئی آنچ نہ آئی اور وہ دنیا کی نظر میں معزز بنے رہے۔ جب کہ معصومہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بدنام ہوتی گئی اور آخر میں وہ ایسی دلدل میں پھنس گئی جہاں سے نکلنا ممکن نہ رہا، اور اگر ایسا ہو بھی جاتا تو وہ معاشرے کی نظر میں طوائف کی حیثیت ہی سے پہچانی جاتی۔

عصمت چغتائی نے ناول کے کردار احمد، راجا، کرنل وغیرہ کے ذریعے ان سرکاری افسران اور صاحب حیثیت لوگوں کی نشان دہی کی ہے۔ جنھوں نے تقسیم ہند کے بعد مشکلات میں گھرے ہوئے لوگوں کا سہارا بننے کے بجائے ان کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھایا، لیکن ان کی اصلیت کو وہی جان سکے جن کا ان سے واسطہ پڑا، لیکن ناول میں فلمی دنیا اور ان کے کرداروں کی سرگرمیوں کو اتنی تفصیل سے بیان کیا ہے کہ تقسیم سے متعلق موضوع ثانوی حیثیت اختیار کر گیا ہے اور بعض جگہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ فسادات کے موضوع پر لکھنے میں ناکام ہو گئی ہیں۔ ناول میں بیک وقت دو موضوعات شروع کرنے کے بجائے وہ دو مختلف ناول لکھ لیتیں تو زیادہ بہتر نتائج سامنے آتے۔ اس موجودہ صورت میں فسادات، اس کی ہولناکیاں اور اس کے نتائج اتنے اہم نہیں رہے جتنا فلم دنیا کا ماحول۔ عصمت چوں کہ فلمی دنیا سے وابستہ رہیں اور اس کا عملی تجربہ رکھتی تھیں اس لیے وہ اس کی پیش کش میں کام یاب رہیں رہے تقسیم کے مسائل وہ اس ناول میں تشنہ ہی رہے۔

کالےکوس

۱۹۴۷ء کے فسادات میں دوملکوں کی تقسیم نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے نفرت اور تعصب کے جذبات کو ہوا دی۔ جس سے وہ ایک دوسرے سے نہ صرف دور ہو گئے، بلکہ ایک دوسرے کی جان، مال اور عزت کے دشمن ہو گئے اور دونوں نے ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

نفرت اور تعصب کی اس فضا میں ایسے فرشتہ صفت لوگ بھی موجود تھے جنھوں نے ان حالات میں بھی انسان ہونے کا حق ادا کیا۔ ایسی اعلیٰ صفات کے مالک ہندو اور سکھ بھی تھے اور مسلمان بھی۔

اسی حقیقت کو مدِ نظر رکھ کر بلونت سنگھ نے ''کالے کوس'' کے نام سے یہ ناولٹ لکھا۔

اس ناولٹ میں انھوں نے پنجاب کا ماحول پیش کیا ہے اور اسی ماحول کی مناسبت سے مختلف کرداروں کا انتخاب کیا ہے۔

ان کرداروں کا لب ولہجہ بھی ان کے ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔ ان کرداروں کا لب ولہجہ بھی ان کے ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔

پشورا سنگھ، میاں ولی محمد، درسا سنگھ، گوبندی، صورت سنگھ، مہندر کور، سراج اور کریمو ناولٹ کے اہم کردار ہیں۔

ناولٹ میں پٹیالہ کے گاؤں ''چار گاؤں'' کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس گاؤں میں ہندو سکھ اور مسلمان سبھی بہت مل جل کر

رہتے تھے۔آپس کی دوستی اور پیار کا سلسلہ کئی نسلوں سے چلا آیا تھا۔جیسا کہ ناولٹ میں بلونت سنگھ نے ان کی آپس میں مل کر بیٹھنے کی محفلوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> چارگاؤں میں بیٹھک بازی کے لیے دو مقام تھے۔ایک تھا نمبردار میاں دل محمد کا دارا، اور دوسرا پشوراسنگھ کی بیٹھک۔مسلمان راہ گیروں کے لیے دارے بنواتے تھے جہاں لسّی اور حقے سے وہ تازہ دم ہوجاتے تھے۔ ہندو اور سکھ دھرم شالائیں بنواتے تھے، پھلاں میں پشوراسنگھ کی بیٹھک مشہور تھی اور چک ماگھ میں میاں دل محمد دارا، پشوراسنگھ اونچے رتبے اور حیثیت کا مالک تھا۔ وہ اردگرد کے دیہات کا ذیل دار تھا۔میاں دل محمد چک ماگھ کا نمبردار تھا۔☆۲۱۳

اس بیٹھک میں بیٹھ کر ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے زندگی کے مختلف مسائل پر تبادلہ خیال بھی کرتے۔اسی بیٹھک میں پشوراسنگھ کا بیٹا صورت سنگھ لوگوں کو اخبار پڑھ کرسناتا۔ایک دن اس نے تقسیمِ ہند کے بارے میں لوگوں کو یہ خبر پڑھ کر سنائی:

> ''آج کل پاکستان بننے یا نہ بننے کا مسئلہ سب سے زیادہ اہمیت حاصل کر چکا ہے۔مسلم لیگ کا کہنا ہے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ان دونوں میں وطن کے سوا اور کوئی بات سانجھی نہیں۔اس لیے یہ دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔کانگریس کہتی ہے کہ یہ ساری شرارت انگریزوں کی ہے۔ وہ ہندوستان کو آزاد کرنے سے پہلے اس کا بٹوارا کردینا چاہتے ہیں۔اس طرح یہ عظیم ملک دو حصّوں میں بٹ جائے گا۔ جہاں تک ہندو اور مسلمان کا تعلّق ہے، وہ ایک ہی ماں یعنی بھارت ماتا کے بیٹے ہیں۔'' ☆۲۱۴

اگرچہ چارگاؤں کی ساری سرگرمیاں جاری تھیں، لیکن جب بھی ہندو مسلم فسادات کی خبریں ان تک پہنچتیں تو سارے گاؤں میں ہل چل مچ جاتی۔ بالخصوص جب پنجاب کے مختلف علاقوں سے ہندو مسلم فسادات کی مسلسل خبریں آتی رہیں تو چارگاؤں کے ہندوؤں اور سکھوں کو بھی اپنے گاؤں کے مسلمانوں کی دوستی اور خلوص پر شک ہونے لگا اور وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے:

> ''...ہمیں چوکنا رہنا چاہیے، یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلم لیگ نے خفیہ طور پر لڑائی کی تیاریاں کررکھی ہیں۔گاؤں گاؤں کے مسلمانوں کو لڑائی پر آمادہ کیا جارہا ہے...چارگاؤں کا ہر مسلمان دل سے اصلی مسلم لیگی ہے ایک دن ایسا آنے والا ہے جب یہی معصوم شکلیں، بندوقیں، بلّم اور چھرے لے کر ہم پر پل پڑیں گے۔'' ☆۲۱۵

چارگاؤں کے مسلمانوں نے بھی جب ہندوؤں اور سکھوں کے بدلے ہوئے رویّے کو دیکھا تو انھیں بھی اس بات کا احساس ہو گیا ملک کے دوسرے حصّوں کی طرح چارگاؤں کے ہندو اور مسلمان اب ایک نہیں رہے۔

فسادات ہی کے دنوں میں جب ہر طرف سے ہندو مسلم فسادات کی خبریں آ رہی تھیں، گیتا سنگھ اور اس کے ساتھی شیخو پورہ میں گئے۔ تقسیمِ ہند کے بعد شیخو پورہ پاکستان کے حصّے میں آنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔

مسلمانوں کو شک ہو کہ شاید ہندو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی نیّت سے شیخو پورہ آئے ہیں۔ مسلمانوں نے اسے اس کے ساتھیوں کو مار پیٹ کر جیل بھیج دیا جہاں اُنھیں کچھ دیر رکھنے کے بعد چھوڑ دیا گیا۔

پٹیالہ آنے کے بعد گیتا سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے بتایا کہ مسلمان اب سکھوں کو یہاں نہیں رہنے دیں گے۔ انھوں نے اپنے اوپر ہونے والی فائرنگ اور پڑنے والی مار کے بارے میں بھی بتایا۔

گیتا سنگھ اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں سن کر گاؤں کے ہندو اور سکھ چارگاؤں کے مسلمانوں کے خلاف متحد ہو گئے اور اُنھوں نے چارگاؤں کے مسلمانوں سے گیتا سنگھ اور اس کے ساتھیوں کا بدلہ لینے کا فیصلہ کیا۔

مسلمانوں کو بھی ان کے ارادوں کا علم ہو گیا۔ میاں دل محمد نے گاؤں کے تمام مسلمان مردوں کو جمع کیا اور گیتا سنگھ اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کی معافی مانگنے کے لیے گیتا سنگھ امر سکھوں کے سربراہ پشورا سنگھ کے پاس گیا اور امن اور پیار محبت کی بات کی کہ صدیوں سے قائم بھائی چارہ بنا رہنا چاہیے، اور یوں بڑے بزرگوں کے سمجھانے اور صدیوں پرانی محبت نے انھیں ایک دوسرے کا دشمن بننے سے بچا لیا۔

جب چارگاؤں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کا آپس میں سمجھوتا ہو گیا تو باہر والے مسلمانوں کے حملے کا خطرہ رہ گیا۔ یہ مسئلہ بھی چارگاؤں کے ہندو، سکھوں اور مسلمانوں نے مل کر طے کر لیا۔ اس موقع پر درسا سنگھ نے سب سے اہم کردار ادا کیا۔ درسا سنگھ نے چارگاؤں کو باہر کے لوگوں سے بچانے کے لیے اکال گڑھ میں رہنے والے اپنے ایک دوست سے جنگ کے لیے ہتھیار مانگ لیے اور ان ہتھیاروں کو استعمال کرنے کے اپنے دوست کے ساتھیوں کو بھی اپنے ساتھ گاؤں میں لے آیا۔

ناول میں جو چیز خوب صورتی پیدا کرتی ہے وہ درسا سنگھ کا کردار ہے جو شروع میں ایک اکھڑ اور لاپروا شخص تھا لیکن فسادات کے دنوں میں جب ہر طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو رہا تھا۔ اُن حالات میں درسا سنگھ جیسے شخص کا ایک دم سے نرم ہو جانا اس کے ضمیر کے جاگ جانے اور انسانیت کی عظمت کی دلیل ہے۔

جیسا کہ ناول میں ایک جگہ وہ صورت سنگھ سے کہتا ہے:

> ’’کیا ہمارا پنجاب بربادی سے بچ جائے گا؟ تم میرے مُنہ سے یہ باتیں سن کر شاید حیران ہو رہے ہو گے لیکن... میں بھی اپنی دھرتی سے پیار کرتا ہوں، بے شک میں برا آدمی ہوں۔‘‘ ☆۲۱۶

چارگاؤں کے ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے تمام اندیشے اس وقت درست ثابت ہو گئے جب شہر سے موہن سنگھ نے آ کر انھیں بتایا کہ ملک کے حالات روز بروز بگڑتے جا رہے ہیں، ملک کی تقسیم ہو چکی ہے، چارگاؤں پاکستان کے حصے میں آیا ہے اور اب چارگاؤں کے ہندوؤں اور سکھوں کو مسلمانوں کے ساتھ پرامن طریقے سے رہنے کے باوجود ہر صورت ہجرت میں کرنا ہوگی۔

''سرکار کا حکم ہے کہ سب ہندوؤں اور سکھوں کو چارگاؤں سے نکل جانا چاہیے، میں آپ سب کو یہاں سے لے جانے کے لیے آیا ہوں۔ آپ کو رفیوجی کیمپ میں پہنچا دیا جائے گا۔'' ☆ ۲۱۷

اگرچہ چارگاؤں کے ہندو اور سکھ کسی بھی صورت ہجرت کرنا نہ چاہتے تھے اور نہ ہی مسلمان اُنھیں خود سے جدا کر سکتے تھے، لیکن جب ملک کے مختلف حصّوں میں فوجی بھیجے گئے تاکہ وہ لوگوں کو بحفاظت ہجرت کرا سکیں تو انھیں جذبات کو فراموش کر کے مصلحتوں کا شکار ہونا پڑا:

دوسرے دن سورج طلوع ہونے سے پہلے چارگاؤں کے باہر بڑا ہی دردناک منظر دیکھنے میں آیا، ہندو، سکھ مرد، عورتیں، بچے بوڑھے خانہ بدوشوں کی طرح اپنے آبائی مکان سے نکلے اور کھیتوں میں جمع ہو گئے۔ مسلمان مردوں کی آنکھوں میں آنسو تھے اور مسلمان عورتیں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ گوبندی کی سہیلیاں اس کے ساتھ آئیں، ان کی آنکھیں اُمڈی آتی تھیں... انھوں نے سوچا بھی نہ تھا کہ کبھی انھیں بھی ایک دوسرے سے جدا ہونا پڑے گا۔ ☆ ۲۱۸

اس دردناک کیفیت سے صرف خواتین ہی دوچار نہیں تھیں، بلکہ مرد بھی افسردہ اور پریشان تھے:

درسا سنگھ، صورت سنگھ، پشورا سنگھ، کھیم چند، ہیڈ ماسٹر، سورج سنگھ اور ماسٹر چانن لعل اب بھی میاں دل محمد، اللّٰہ دتہ، بگو ساہنسی، بیلی شاہ وغیرہ کے پاس کھڑے تھے۔ انھیں ایک دوسرے سے رخصت ہونا دشوار ہو رہا تھا۔ وہ آپس میں بغل گیر ہوئے کیوں کہ قافلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں انسانیت کی گرم جوشی اور خلوص تھا۔ مگر اب انھیں جدا ہونے سے کون بچا سکتا تھا۔ جب وہ ایک دوسرے سے دور ہٹ گئے تو بڑے بوڑھوں کی سسکیاں بھی نہ رک سکیں۔ ☆ ۲۱۹

آخر نو میل کا فیصلہ پیدل طے کر کے قافلہ مہاجر کیمپ پہنچ گیا۔ مہاجر کیمپ کی حالت اور فضا بہت تکلیف دہ تھی۔ چارگاؤں کے مہاجر جب کیمپ میں پہنچے تو وہاں اُنھیں کھلے میدان میں رات گذارنی پڑی تو ایسے میں انھیں اپنا گھر بار اور بھی شدّت سے یاد آیا، لیکن اب انھیں سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ اُن کی عزت پر کوئی آنچ نہ آئے اور وہ صحیح سلامت ہندوستان پہنچ جائیں۔ گومندی سمیت چارگاؤں کے تمام مہاجرین کو درسا سنگھ کا بڑا سہارا تھا۔

مہاجر کیمپ میں رہتے ہوئے ابھی انھیں پانچ روز ہی گزرے تھے کہ ایک دن اچانک درسا سنگھ کو اپنا بہت ہی قریبی دوست ملا جس نے اُسے اپنی مغویہ بیوی کے بارے میں بتایا:

لگتا ہے کہ صبح کے مدہم اُجالے میں کسی مسلملیٹے نے اسے دبوچ لیا ہوگا۔ دوسرے دن ہمیں کیمپ آنا پڑا۔ اسی دن سے میں اسے تلاش کر رہا ہوں۔☆ ۲۲۰

کابل سنگھ اور درسا سنگھ کے متفقہ فیصلے کے بعد یہ طے ہوا کہ دونوں ٹرکوں کے ذریعے لاہور تک جائیں گے اور کابل سنگھ کی بیوی کو تلاش کر کے ٹرکوں ہی کے ذریعے وہ امرت سر چلے جائیں گے۔ درسا سنگھ نے اپنے گھر والوں کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ درسا سنگھ چاہتا تھا کہ پشورا سنگھ کے گھر والے بھی اُس کے ساتھ جائیں لیکن ٹرکوں کے ساتھ ملٹری نہ ہونے کی وجہ سے پشورا سنگھ اور اس کے گھر والوں نے درسا سنگھ کے ساتھ جانا مناسب نہ سمجھا۔

ٹرکوں کے ڈرائیور مسلمان تھے جو درسا اور کابل سنگھ کے جگری دوست تھے۔ ان مسلمانوں نے اپنے دوستوں کو صحیح سلامت سرحد پار کرانے کا بیڑا اُٹھایا تھا... ڈرائیور کہتے تھے،"یارو! مزے میں بیٹھے گاتے رہو۔ جہاں کہیں مجمع نظر آئے گا ہم تمھیں خبردار کر دیں گے۔" ☆۲۲۱

واہگہ پار کرنے سے پہلے ہندو مہاجرین کی لاریوں کی ایک جگہ تلاشی بھی لی گئی جب انھیں پتا چلا کہ وہ مسلمانوں ہی کے ساتھی ہیں تو اُنھوں نے انھیں چھوڑ دیا۔

اور یوں مسلمان کے تعاون سے وہ بحفاظت امرت سر پہنچ گئے۔

بلونت سنگھ نے ناول کے جس حصے میں ہجرت کرنے والے مہاجرین کی بے بسی اور اذیّت ناک حالت کو بیان کیا ہے وہ مہاجرین کی ریل گاڑی میں پیش آنے والے مختلف واقعات ہیں۔

درسا سنگھ کے جانے کے بعد مہاجر کیمپ کے تمام مہاجرین کو چودہ دن تک ریل گاڑی کا انتظار کرنا پڑا اور جب ریل گاڑی آئی تو لوگ دیوانوں کی طرح گاڑی کی طرف بھاگے۔

جب ڈبے میں اتنی بھیڑ ہوگئی کہ دروازوں اور کھڑکیوں کے راستے بند ہو گئے تو کچھ لوگ گاڑی کے باہر لٹک گئے اور کچھ تپتی ہوئی چھتوں پر چڑھ گئے اور اپنا سامان اپنے ساتھ رکھ لیا۔ پگڑیاں اُتار اُتار کر بیوی بچّوں اور اپنے آپ کو اس طرح باندھ لیا کہ چلتی گاڑی کے ہچکولوں سے کوئی نیچے نہ گر جائے۔☆ ۲۲۲

پشورا سنگھ اور اس کے ساتھی ایک ہی ڈبے میں تھے، لیکن بہت زیادہ رش کی وجہ سے انھیں ایک دوسرے کا ہوش نہیں رہا۔ شدید گرمی کی وجہ سے لوگوں میں لڑائی جھگڑے بھی ہوئے لیکن جلد ہی بڑے بوڑھوں کے سمجھانے سے وہ خاموش ہو گئے۔

کافی دیر انتظار کرنے کے بعد گاڑی تھوڑی دیر چل کر رک گئی۔ پشورا سنگھ کا بیٹا صورت سنگھ جو ریل گاڑی میں بیٹھے ہوئے تمام مسافروں میں سے زیادہ پڑھا لکھا اور باشعور تھا اس نے بہت جلد ایک انگریز افسر کے ذریعے اس حقیقت سے آگاہی حاصل کر لی کہ جگہ جگہ مسلمان انھیں موت کے حوالے کرنے کے لیے کھڑے ہیں اس لیے گاڑی بھی سُست رفتاری سے چلنے کے بعد بار بار مختلف جگہوں پر رکے گی۔

ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر جب گاڑی کی رفتار سُست ہوئی تو گاڑی کے کارکن بھی سمجھ گئے کہ آگے کوئی خطرہ ہے، چناں چہ اس سے بیش تر کہ گاڑی میں بیٹھے مسافر کسی مصیبت میں گرفتار ہوتے گاڑی کی رفتار تیز کر دی گئی، لیکن پھر بھی گاڑی سے باہر اور چھتوں سے لٹکے ہوئے مسافر خود کو دشمنوں سے بچا نہ سکے۔ اس دردناک منظر کو بلونت سنگھ نے اپنے ناولٹ میں اس طرح بیان کیا ہے:

> باہر لٹکتے ہوئے کچھ مسافروں کی ٹانگیں پکڑ کر انھیں نیچے گھسیٹ لیا گیا۔ کچھ لٹکتے ہوئے مسافروں نے کھڑکیوں اور دروازوں سے اندر گھسنے کی کوشش کی، لیکن اندر والوں نے گولیوں کے ڈر سے کھڑکیوں کے تختے اوپر چڑھا لیے۔ اس افراتفری میں چھت پر بیٹھے ہوئے کچھ بچے اور عورتیں لڑھکیں اور دھادھم نیچے گر گئیں۔ چلتی ہوئی گاڑی کی کھٹا کھٹ میں چیخوں اور مدد کے لیے آہ و پکار کا شور گھل مل گیا۔☆ ۲۲۳

نہات سُست رفتاری سے ریل گاڑی لاہور اسٹیشن پر پہنچ گئی جہاں وہ صبح سے شام تک کھڑی رہنے کے بعد دوبارہ پیچھے کی طرف جا کر ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رُک گئی۔ اسٹیشن ماسٹر نے اس کی وجہ یہ بتائی:

> ''مشرقی پنجاب سے رفیوجیوں کی پوری گاڑی خون سے لتھڑی ہوئی لاہور پہنچی ہے جس سے لاہور اور اس کے نواحات میں حالات اور بھی خراب ہو گئے ہیں...ہمیں آرڈر تو یہ ملا تھا کہ آپ سب کو پھر سے کیمپ پہنچا دیا جائے، لیکن پتا چلا ہے کہ لاہور اور شیخو پورہ کے اسٹیشن پر بھی فسادیوں کا بے پناہ ہجوم موجود ہے۔ اب ہم تو نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔'' ☆ ۲۲۴

لاہور اسٹیشن پر اب ہندوؤں اور سکھوں کو نہ صرف انتظار کی زحمت اُٹھانا پڑی، بلکہ اب بھوک، پیاس اور موت کے خوف سے ان کا بہت برا حال تھا۔ آخر پیاس سے تنگ آ کر دو نوجوان سکھ جب اسٹیشن پر پانی پینے کے لیے اُترے تو گولیوں کی بوچھار سے وہ ہلاک ہو گئے اور اس کے بعد فسادیوں کا پورا ریلا ریل گاڑی میں آ گیا۔ فسادیوں کے اس ریلے میں کریمو اور اس کے ساتھی بھی شامل تھے۔ کریمو کا تعلق چار گاؤں سے تھا اور شروع ہی سے کریمو اور اس کے ساتھیوں کے پشورا سنگھ اور درسا سنگھ کے گھر والوں سے اختلافات تھے۔ کریمو کو جو چیز سب سے زیادہ ناگوار لگتی تھی وہ درسا سنگھ اور گوبندی کے درمیان پائی

جانے والی محبت تھی۔

اس وقت کریمو اور اُس کے ساتھیوں کی شدید خواہش تھی کہ وہ درسا سنگھ اور گوبندی کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ نقصان پہنچائے۔ کریمو اور اس کے ساتھیوں نے پشورا سنگھ سے درسا سنگھ کے بارے میں بہت پوچھ گچھ کی اور بہت مشکل سے انھیں یقین آیا کہ درسا سنگھ پہلے ہی ٹرک کے ذریعے روانہ ہو چکا ہے۔ انھوں نے گوبندی کو اغوا کرنا اپنا فرض سمجھا۔

انھوں نے پشورے سنگھ سے کہا کہ وہ اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے کیوں کہ:

''...تیری لونڈیا پٹاخا ہے...اور مجھے پسند ہے۔'' ☆ ۲۲۵

اور پھر اگلے ہی لمحے اُنھوں نے گوبندی کی کلائی کو پکڑ لیا۔

اس پر پشورا آگے بڑھا تو تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا بازو لٹکنے لگا، اور وہ تیورا گیا...

گوبندی آندھی میں اُڑتے ہوئے تنکے کی طرح بے بس کھنچتی چلی گئی۔ اس کی چیخ و پکار سارے شوروغل سے اوپر اُٹھ گئی۔ اس کے آنسو سوکھ گئے۔ وہ ہاتھ پھیلا کر چلائی، ''پتا جی.... ویر جی...مجھے بچالو!'' ☆ ۲۲۶

بہن کو بچانے کے لیے صورت سنگھ آگے بڑھا لیکن کریمو نے اُسے بھی زخمی کر دیا جس سے وہ بے ہوش ہو گیا۔

اور کریمو اور اس کے ساتھی گوبندی کو اغوا کر کے لے گئے۔

درسا سنگھ جب امرت سر پہنچا تو اس نے وہاں جا کر بہت کوشش سے پشورا سنگھ اور اس کے گھر والوں کو تلاش کیا۔ اُنھیں سے درسا سنگھ کو پتا چلا کہ گوبندی اغوا ہو چکی ہے۔ پشورا سنگھ اور اس کے گھر والوں کو گوبندی کے اغوا ہونے کے دکھ کے مقابلے میں صدیوں پرانے وطن اور ساتھیوں سے بچھڑنے کا غم بہت معمولی لگا۔ گوبندی کی ماں نے تو یہاں تک سوچنا شروع کر دیا تھا:

'کاش ہماری جانیں چلی جاتیں لیکن ہماری لاڈلی کی آبرو بچ جاتی اب تو ہماری زندگی موت سے بھی بدتر ہے۔' ☆ ۲۲۷

گوبندی کے اغوا ہونے کے بارے میں جان کر دوسا سنگھ کو بے حد دکھ پہنچا، لیکن وہ صرف افسوس کرنے والوں میں سے نہ تھا، بلکہ وہ ایک باعمل انسان تھا۔ اُس نے اسی دن سے گوبندی کی تلاش شروع کر دی۔

اُن دنوں چار گاؤں میں کسی بھی ہندو کا جانا خطرے سے باہر نہ تھا، لیکن درسا سنگھ اپنی جان کی پروا کیے بغیر بے خطر آتشِ نمرود میں کود گیا۔ اُس کا کہنا تھا:

''میں خود گوبندی کو تلاش کروں گا۔ وہ زندہ بچ گئی ہوگی تو اسے واپس لا کر اپنی بیوی بناؤں گا اور

اگر مرگئی ہوگی تو اس کے قاتل کو ٹھکانے لگا دوں گا چاہے اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔'' ☆۲۲۸

جب درسا سنگھ چار گاؤں میں داخل ہوا تو کریمو اور اس کے ساتھیوں نے اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کی لیکن چار گاؤں میں درسا سنگھ کے مسلمان دوستوں کی محبت میں کوئی کمی نہ آئی تھی اُنھوں نے درسا سنگھ کو کریمو کے جال سے آسانی سے نکال لیا اور گاؤں کے چوہدری دل محمد کے پاس لے گئے۔ دل محمد نے درسا سنگھ کا والہانہ استقبال کیا اور اسے بتایا کہ گوبندی کو کریمو اور اس کے ساتھی اغوا کر کے چار گاؤں میں لے آئے تھے لیکن جیسے ہی اُسے اس بات کی خبر پہنچی تو اُس نے گوبندی کو اپنی حفاظت میں لے لیا تھا۔

...گوبندی کی آبرو پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ یہ بات معجزہ سے کم نہیں، لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے، اگر وہ کریمو کے قبضے میں رہ جاتی تو اس کی عزت نہ بچ پاتی...گوبندی گاڑی میں ہی بے ہوش ہوگئی تھی۔ کریمو اسے اسی حالت میں یہاں لے آیا۔ ہمیں پتا چلا تو ہم نے اسے اپنی حفاظت میں لے لیا۔ اس طرح رسولِ پاکؐ کے فضل سے ایک معصوم لڑکی کی آبرو بچ گئی۔☆۲۲۹

دل محمد کی باتیں سن کر درسا سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دل محمد جانتا تھا کہ درسا سنگھ اور گوبندی کے درمیان صرف مذہب اور قومیت کا رشتہ نہیں، بلکہ ان دونوں کے درمیان محبت کا بھی رشتہ ہے اور گوبندی درسا سنگھ کی ہونے والی بیوی ہے۔ اس لیے دل محمد نے گوبندی کو درسا سنگھ کے حوالے کر دیا اور دوسرے ہی دن انھیں مہاجر کیمپ پہنچا دیا جہاں ایک ہندو میجر نے انھیں امرت سر جانے والے ٹرک میں بٹھا دیا۔

اس طرح ایک مسلمان کی مہربانی سے نہ صرف یہ کہ ایک ہندو لڑکی کی عزت اور زندگی ہی نہیں بچ گئی، بلکہ اُسے بحفاظت اُس کے ورثا تک پہنچانے کا بندوبست بھی ہوگیا۔

پشورا سنگھ، درسا سنگھ اور دل محمد کے درمیان جو دوستی اور پیار تھا اُس میں کوئی فرق نہ آیا اور دل محمد نے دوستی اور انسانیت کے رشتوں کا بھرم قائم رکھا۔

گوبندی اور درسا سنگھ نے امرت سر واپس پہنچ کر اپنے گھر والوں کو پھر سے زندہ کر دیا۔ پشورا سنگھ اور اس کے گھر والوں کے دل سے دل محمد اور درسا سنگھ کے لیے بہت سی دعائیں نکلیں۔

پشورے نے درسے کو شکر گزار آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا، ''بیٹا! تم نے میری سب سے قیمتی شے واپس لا دی ہے۔'' ☆۲۳۰

درسا سنگھ جانتا تھا کہ وہ اکیلا ہوتا تو شاید سب کچھ اتنی آسانی سے نہ ہوسکتا اس لیے اس نے میاں دل محمد کی مہربانیوں اور محبتوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا:

''اس میں میری کوئی بہادری نہیں ہے۔ چار گاؤں کے دوستوں اور میاں دل محمد کی مہربانی سے آج آپ گوبندی کا مُنہ دیکھ رہے ہیں۔'' ☆۲۳۱

گوبندی کو امرت سر پہنچانے کے بعد (درسا سنگھ بہت خوش اور مطمئن تھا، لیکن اپنی خوشی میں مست ہوکر درسا سنگھ کے اپنے عزیز دوست سراج کا خیال دل سے نہ نکال سکا۔ اب اُس کا اگلا مشن پٹیالہ جاکر راج اور اس کے گھر والوں کو تلاش کرنا تھا۔

اس کے اچانک واپس جانے کا ارادہ جان کر سب گھر والے پریشان ہوگئے۔

''گوبندی! سراج کی بھی تمھاری طرح ایک بہن ہے بھولی بھالی دیوی سی۔ کیا تم نہیں چاہتیں کہ وہاں جاکر انھیں بچالوں؟ پہلے ہی کافی دیر ہوچکی ہے۔'' ☆۲۳۲

درسا سنگھ ارادہ جان کر اسے کوئی بھی جانے سے روک نہ سکا۔

سراج اپنے ہندو دوستوں کی مدد اور کچھ اپنی دہشت کی وجہ سے بالکل صحیح سلامت رہا۔ انھیں زندہ دیکھ کر درسا سنگھ کو بہت خوشی ہوئی لیکن تقسیمِ ہند کے بعد پٹیالہ میں کسی بھی مسلمان کا رہنا خطرناک تھا۔ درسا سنگھ انھیں جلد سے جلد ہندوستان کی سرحد پار کروانا چاہتا تھا۔ درسا سنگھ نے سراج اور اس کے گھر والوں کو نصیحت کی:

''آپ سب عورتوں کے کپڑے بدل جانے چاہییں۔ تاکہ آپ مسلمان نظر نہ آئیں۔ جب میں ساتھ ہوں گا تو لوگ کیسے سمجھ سکیں گے آپ میرے ہی خاندان کے نہیں ہیں، اس علاقے میں میرے گھر والوں کو کوئی نہیں پہچانتا۔ رہی سراج کی بات۔ تو میں سب سے کہوں گا وہ ہندو ہے، اس طرح کھلم کھلا سفر ٹھیک رہے گا۔ چھپ چھپ کر جانے میں تو خواہ مخواہ لوگوں کو شک ہونے لگے گا۔'' ☆۲۳۳

درسا سنگھ سراج اور اس کے ساتھیوں کو پٹیالہ سے امرت سر لے آیا اور انھیں اپنے ایک دوست کے گھر ٹھہرا دیا۔ ریلوے اسٹیشنوں اور ریل گاڑیوں میں قتل و غارت گری کی خبریں سن کر درسا سنگھ نہیں چاہتا تھا کہ وہ ریل گاڑی کے ذریعے سفر کریں، بلکہ وہ چاہتا تھا کہ مسلمان فوجیوں کی حفاظت میں سراج اور اس کے گھر والے ہندوستان کی سرحد پار کریں۔ یہ سارا کام کرنے کے لیے اُسے کچھ وقت درکار تھا۔ وہ انھیں اپنے ایک دوست کے گھر میں چھپا گیا۔

درسا سنگھ کے جانے کے بعد درسا سنگھ کے دوست اور سراج کے گھر والوں نے خود کو غیر محفوظ سمجھا۔ درسا سنگھ کے دوست کو یہ خوف تھا کہ کہیں ہندوؤں اور سکھوں کو اس بات کا پتا نہ چل جائے کہ سراج اور اس کا خاندان مسلمان ہیں۔ سراج بھی

اس کے خوف اور پریشانی کو سمجھ گیا اور دوسرے ہی روز رات کے وقت سراج میزبان کو کچھ بتائے بغیر خاموشی سے اپنے گھر والوں کو لے کر وہاں سے چلا گیا۔

وہ لوگ اندازے سے مغرب کی جانب چل پڑے۔ راستے میں انھیں کئی بار موت اپنے بہت قریب نظر آئی، لیکن اللہ کی رحمت سے وہ ہمیشہ بچ گئے۔ اب اُن کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ منزل کا صحیح تعیّن نہیں کر پا رہے تھے۔ دو دن اور دو راتیں چلنے کے بعد وہ بری طرح تھک گئے تھے۔ بھوک، پیاس، مایوسی اور خوف اُن سب پر بری طرح مسلّط ہو چکے تھے۔

سراج اُس وقت ماں بیوی اور بیٹی، تینوں کا محافظ تھا۔ اس لیے وہ اپنے خوف کو ان تینوں پر ظاہر نہیں کرنا چاہ رہا تھا، لیکن اندر سے اُس کا برا حال تھا:

> بوڑھی ماں کی... آنکھوں سے تکان اور اذیّت کا احساس ہو رہا تھا۔ زندگی بھر اس نے ایسے حالات نہیں دیکھے تھے نہ سنے تھے۔ بیوی بھوک، لگا تار پریشانی اور عزت وآبرو کے خوف سے بدحواس ہو گئی تھی... ریشماں کو غالباً خطرے کا پوری طرح احساس نہیں تھا اس لیے اس کی حالت اتنی غیر نہ تھی۔☆۲۳۴

> رہ رہ کر ان کے دل میں یہی خیال آتا تھا۔ جس پاکستان کا اتنا شور تھا وہ ان سے دُور دُور کیوں بھاگ رہا تھا۔☆۲۳۵

اسی اثنا میں سراج کو کچھ فاصلے پر اسے کوئی سکھ نظر آیا جس کے ہاتھ میں چھری تھی۔ سراج ہمت کر کے آگے بڑھا دوسری جانب سے لمبا تڑنگا سکھ بھی آگے بڑھا۔ تب دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ درسا سنگھ سراج کے اچانک چلے آنے پر اس سے سخت ناراض تھا پھر بھی وہ ان کا تعاقب کرتا ہوا ان تک پہنچ گیا تھا۔ وہ سراج اور اس کے گھر والوں کو زندہ سلامت دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ایک دوسرے کی خیر خیریت پوچھنے کے بعد درسا سنگھ نے سراج کو اپنے ایک ساتھی سے ملوایا اور کہا۔

> ''سراج یہ میری امانت ہے۔ تمھارے دوست کی امانت۔ اس کا اب اس دنیا میں کوئی نہیں رہا۔ میری خواہش ہے کہ اب تم اسے قبول کرو اور مجھ سے وعدہ کرو کہ ساری عمر اسے اپنے ساتھ رکھو گے۔''☆۲۳۶

سراج نے درسا سنگھ کے ساتھی کو نہ صرف دل سے قبول کر لیا، بلکہ اُسی وقت اُس نے یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ وہ ریشماں کی شادی سلطان سے کر دے گا۔

اس کے بعد درسا سنگھ نے سراج کو بتایا کہ وہ صرف دو فرلانگ کا فاصلے طے کر کے پاکستان پہنچ جائے گا اور پھر وہ سب دو فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے اپنے آزاد ملک پاکستان میں پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ سب کچھ بھول گئے فسادات، ہجرت،

راستے کا تکلیف دہ سفر اور سب سے بڑھ کر صدیوں ساتھ رہنے والوں کی جدائی۔ یہاں تک کہ وہ درسا سنگھ کو بھی بھول گئے اور پھر اچانک سراج کو احساس ہوا کہ کا عزیز ترین دوست اس سے جدا ہو گیا ہے جو کچھ ہی فاصلے پر ہندوستان کی سرحد پر کھڑا اسے الوادعی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''رخصت ہونے کے لیے سراج آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا اپنے دوست کی طرف بڑھا۔ اس کے پاؤں من من بھاری ہو رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ درسا وہاں کیوں رک گیا تھا... درسے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا ہوئی جسے پوچھ رہا ہو:

'سراج! کیا تم مجھ سے ملنے کے لیے پاکستان سے یہاں آئے ہو۔' ☆ ۲۲۷

اور پھر انھیں نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مخالف سمتوں میں اپنے اپنے آزاد اور خود مختار ملک کی طرف روانہ ہونا پڑا۔

بلونت سنگھ کا ناول لکھنے کا اصل مقصد تقسیمِ ہند کے بعد لوگوں کے رویّوں میں آنے والی تبدیلیوں کو بیان کرنا ہے، اور ساتھ ہی ان کرداروں کے ذریعے اس حقیقت کو بھی بیان کرنا ہے کہ تقسیمِ ہند کے فسادات کے نتیجے میں بھی بعض لوگ ایسے تھے جنھوں نے فسادات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تعصب کو قبول نہ کیا، بلکہ انسان دوستی کے جذبے کے تحت ایک دوسرے کے محافظ بنے رہے؛ مثلاً شیخو پورہ میں گیتا سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو زخمی کر کے پولیس کے حوالے کرنے والے مسلمان تھے، لیکن ان کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں پر شرمندہ ہونے اور معافی مانگنے والے چارگاؤں کے دل محمد اور اس کے ساتھی بھی مسلمان تھے۔

ہندو مہاجرین کی ریل گاڑی پر حملہ کرنے والے اور گوبندی کو اغوا کرنے والے کریمو اور اس کے ساتھی مسلمان تھے، لیکن گوبندی کو جس شخص نے کریمو سے بچایا اور تحفظ بھی دیا وہ بھی مسلمان تھا۔

اسی طرح درسا سنگھ کا کردار بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ہندو مسلم فسادات نے اس کی شخصیت پر بہت گہرے اثرات ڈالے۔ اکھڑ اور جھگڑالو درسا ایک دم سے انسان دوست، ہمدرد اور رحم دل بن گیا۔ گوبندی کو حقیر سمجھنے والا درسا اس کے اغوا ہونے پر سب سے زیادہ افسردہ ہوا یہاں تک کہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر وہ چارگاؤں میں گوبندی کو لینے کے لیے گیا۔

درسا سنگھ کو جب اپنے دوست سراج کا خیال آیا کہ وہ پٹیالہ میں ہے جہاں مسلمان ہندوؤں اور سکھوں کی بربریت کا شکار ہو رہے ہیں تو وہ سراج اور اس کے گھر والوں کے لیے بھی پریشان ہوا۔ سراج کی بیوی اور بیٹی کی عزت بچانے کی اُسے اتنی ہی فکر تھی جتنی کہ اُسے گوبندی کی تھی۔

درسا سنگھ نے سراج اور اس کے گھر والوں کا حلیہ بدل کر انھیں بحفاظت امرت سر پہنچایا، درسا سنگھ چاہتا تھا کہ وہ ریل گاڑی کے بجائے پیدل یا ٹرک کے ذریعے سفر کریں کیوں کہ ریل گاڑی میں ہندو دہشت گردوں کے حملے کا زیادہ خطرہ تھا لیکن جب سراج درسا کو کچھ بتائے بغیر چلا گیا تو درسا نے اس کا تعاقب کیا تا کہ اسے پتا چل جائے کہ وہ صحیح سمت اور صحیح جگہ پہنچ سکے ہیں یا نہیں۔

درسا سنگھ کا یہ رویّہ اس کی سراج سے سچی دوستی اور انسانیت سے پیار کا ثبوت ہے اور کوئی بھی شخص اگر محبت اور سچائی کی قدر کرتا ہو وہ انسانیت کی قدر بھی ضرور کرے گا چاہے حالات اور زمانہ اس کا ساتھ دے یا نہ دے، وہ انسان ہونے کا حق ضرور ادا کرے گا۔

اور انسان مر گیا

رامانند ساگر کا ناول ''اور انسان مر گیا'' تقسیمِ ہند کے نتیجے میں پیدا ہونے والی معاشرتی تبدیلیوں کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے ہندوستان اور پاکستان ہجرت کرنے والے مہاجرین کے ساتھ پیش آنے مختلف حادثات اور مسائل کو بیان کیا ہے۔

ناول کو انھوں نے چار حصّوں میں تقسیم کیا ہے، پہلا حصّہ ''سرخ فوارے'' دوسرا حصّہ ''رقصِ شرر'' تیسرا حصّہ ''میں بچ گیا'' اور چوتھا حصّہ ''اور انسان مر گیا'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔

پہلے حصّے ''سرخ فوارے'' میں فسادات کی وجہ سے لوگوں کی دہشت، خوف اور بدحواسی کو بیان کیا ہے۔ دوسرے حصّے میں ''رقصِ شرر'' میں ہندو مسلم فسادات کی شدّت نفرت اور تعصب کی بنیاد پر قتل و غارت گری، لوٹ مار اور اغوا کے واقعات بیان کیے گئے ہیں تیسرا حصّہ ''میں بچ گیا ہے'' میں بچ گیا ایک سکھ کا جملہ ہے جس نے مسلمانوں کے خوف سے اپنی بیوی اور بچّوں کو قتل کر دیا تھا، اور پھر دیوانگی کے عالم میں وہ ہر وقت یہی جملہ دہراتا رہتا۔ ناول کے اس حصّے میں فسادات کے نفسیاتی اثرات دکھائی دیے گئے ہیں چوتھا حصّہ ''اور انسان مر گیا'' میں انسانوں کے حیوان بننے کا ذکر کیا ہے۔

ناول کے پلاٹ میں کئی کمزوریاں ہیں۔ ناول کے چاروں حصّے میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں ان میں تسلسل اور توازن کی کمی ہے۔ دوسری کمزوری یہ ہے کہ ناول میں واقعات کی بھرمار ہے بہت سے واقعات ایسے ہیں جو ایک پیراگراف یا ایک صفحے پر مشتمل ہیں اس وجہ سے ناول میں وہ دلچسپی اور تجسس پیدا نہیں ہو سکا جو ناول کو کامیاب بنانے کے لیے بہت اہم ہے۔

اس ناول کے بارے میں اسلم آزاد نے یہ رائے دی ہے:

> ''سرخ فوارے''، ''رقصِ شرر''، ''میں بچ گیا'' اور ''انسان مر گیا''، یہ چاروں حصّے ایک ہی وقت میں مختلف جہتوں میں پھیلے نظر آتے ہیں مگر ان حصّوں میں کوئی گہرا ربط نہیں ہے۔ جذباتی بیانات اور جذباتی تفصیلات ناول کو اثر انگیز بنا دیا ہے، لیکن فنی سطح پر کوئی ندرت اور فکری سطح پر گہرائی نہیں ملتی۔ ☆ ۲۳۸

ناول کی فضا ابتدا ہی سے سوگوار ہے۔ یہ سوگواری کبھی کسی کے گھر جلنے کی وجہ سے، کبھی کسی بچّے کے قتل سے کبھی کسی

عورت کی بے حرمتی کی وجہ سے، کبھی خاندان کے افراد کے بچھڑ جانے کی وجہ سے اور کبھی صدیوں پرانے وطن سے ہجرت کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔

افراد کے علاوہ مہاجر کیمپوں اور متاثرہ علاقوں کی فضا کا نقشہ بھی انھوں نے ایسا کھینچا ہے جس سے ناول میں اداس فضا نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ رامانند ساگر نے ناول میں لاہور کے بارے میں لکھا ہے:

> لاہور جو کبھی حسن کا مسکن تھا آج زخمیوں کی ایک بستی ہے، بلکہ خود لاہور مجھے ایک بڑا زخم دکھائی دیتا ہے۔ وہ زخم جس کا علاج کرنے والا کوئی نہ رہا۔ ☆۲۳۹

ناول کے پہلے حصے کا عنوان ''سرخ فوارے'' ہے۔ اس حصے میں اہم کردار آنند ہے جو پورے ناول میں موجود رہتا ہے اس کے علاوہ سیٹھ کشن لال، اوشا اور دوسرے چھوٹے چھوٹے کردار بھی موجود ہیں۔

ناول کے اس حصے میں رامانند ساگر نے ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی تعصب اور بدحواسی کو دکھایا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک واقعہ بیان کیا ہے جس میں انھوں نے ایک سانڈ کے زخمی ہونے کا ذکر کیا ہے:

> ایک سانڈ جب زخمی ہو کر بھاگا ہے تو کئی لوگ اس سے بچنے کے لیے بے تحاشہ بھاگ کھڑے ہوئے انھیں دیکھ کر ان سے آگے والے اور پھر اسی طرح بازار کے دوسرے سرے تک سب لوگ ایک دوسرے کو دیکھ کر بھاگنا شروع ہو گئے تھے...ایک ڈر جوان کی روحوں میں سما گیا تھا وہی انھیں بھگا رہا تھا۔ ☆۲۴۰

اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فسادات کے دنوں میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے خوف زدہ رہتے کہیں بھی شور ہوتا یا مجمع لگتا تو سب کو یہی شک ہوتا کہ کسی ہندو یا سکھ نے مسلمانوں پر حملہ کیا ہے اس سانڈ کے بھاگنے کے ساتھ بھی یہی معاملہ مسلمانوں نے ہندوؤں یا سکھوں کو نقصان پہنچایا ہے ناول کے اس حصے میں جو چیز سب سے نمایاں طور پر پیش کی گئی ہے وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا آپس میں تعصب ہے اور اس کا ذمّے دار وہ معاشرے کے اعلیٰ طبقے اور افسران کو ٹھہراتے ہیں۔

> ہندو ساہوکار اور مسلمان ساہوکار دونوں اپنے اپنے فرقوں کے معصوم نوجوانوں کو قومی نعروں کے جوش سے بھڑکا کر فسادات کی آگ میں شہید کرا رہے تھے۔ تاکہ ان کے اپنے مکان اور جائیداد سلامت رہ سکیں، اور دوسروں کے مکان اور جائیدادیں خاک کر دی جائیں۔ نظم و نسق کے حالات اپنے بگڑ چکے تھے کہ خود پولیس کے مسلمان اور ہندو افسر بھی اندرونی طور پر اپنے اپنے فرقوں کی مدد کر رہے تھے۔ ☆۲۴۱

اس خیال کو رامانند ساگر نے لاہور کے ایک سیٹھ کشوری لال کے کردار کے ذریعے بیان کیا ہے سیٹھ کشوری لال پیار

محبت کے جذبات سے عاری ایک مفاد پرست آدمی ہے۔ جب تقسیمِ ہند کے بعد لاہور پاکستان کے حصے میں آیا تو اس نے مسلمانوں کے محلّے سے بحفاظت نکلنے کے لیے محلّے کے تمام ہندو نوجوانوں کے ساتھ دوستانہ رویّہ اختیار کرلیا۔ ان نوجوانوں میں محلّے کے مفلس اور انسان دوست شاعر آنند کو بھی شامل کرلیا گیا۔ جس سے کبھی کشوری لال اس کی غربت اور اپنی بیٹی اوشا کا عاشق ہونے کی وجہ سے سخت نفرت کرتا تھا لیکن جب اسے اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنے کا وقت آیا تو اس کے خیالات میں بھی تبدیلی آ گئی اور وہ سوچتا:

> اگر اوشا چھپ چھپ کر اس سے مل بھی لے تو کیا ہرج ہے، آخر انسان کو ترقی پسند ہونا چاہیے۔ ☆۲۴۲

اور اس طرح آنند جو مذہب اور قوم کی تفریق کے بغیر ہر انسان سے محبت کرتا تھا۔ اسے مجبوراً اوشا کے لیے ہندو بن کر سوچنا پڑا، اور ہندو قوم کے فرد کی حیثیت سے اسے اپنی باری پر ہندوؤں کی حفاظت کے لیے رات بھر جاگ کر پہرا دینا پڑتا۔

ناول کے اسی حصے میں ہندو مسلم تعصب کو واضح کرنے کے لیے ایک ہندو اور مسلمان لڑکے کی دوستی کا ذکر کیا ہے۔ فسادات کے دنوں میں ہندو لڑکا مسلمانوں کے علاقے سے جان بچا کر اپنے مسلمان دوست کے گھر پناہ لینے گیا، لیکن دوستی، محبت اور لحاظ کا دور ختم ہو چکا تھا اور مسلمان لڑکے نے اپنے قتل ہونے والے بھائیوں کا بدلہ اپنے ہندو دوست سے لینے کا ارادہ کرتے ہوئے کہا:

> ''مارنے والے تمھارے مذہبی بھائی تھی۔ جس طرح اپنے مقتول بھائیوں کے خون کا بدلہ لینا مجھ پر فرض ہے۔ اسی طرح اپنے قاتل بھائیوں کے عمل کا خمیازہ تمھیں بھگتنا پڑے گا۔'' ☆۲۴۳

اس موقع پر ہندو لڑکے نے چالاکی سے کام لیا اور اپنے مسلمان دوست سے کہا کہ وہ اس کی آخری خواہش پوری کرے۔ مسلمان لڑکا پرانی دوستی کا پاس رکھتے ہوئے اس کے لیے مٹر پلاؤ لینے گیا لیکن جب وہ واپس آیا تو ہندو لڑکے نے اسے قتل کر دیا۔

فسادات کے دنوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعصّب کی انتہا ظاہر کرنے کے لیے ناول میں ایک اور واقعہ بیان کیا گیا ہے جس میں ایک ہندو ایک مسلمان کو بھاری رقم دے کر مسلمانوں کے علاقے سے بحفاظت نکالنے کے لیے کہا تھا جب وہ ہندوؤں کے علاقے میں پہنچے تو متعصب ہندو لڑکوں کی ایک ٹولی نے اصل صورتِ حال جانے بغیر ہی تانگے والے پر خنجر سے وار کر دیا لیکن جب وہ فوراً نہیں مرا تو ہندوؤں نے تانگے کو آگ لگا دی۔ اچانک انھیں احساس ہوا کہ مسلمان آدمی کے ساتھ گھوڑا بھی جل جائے گا۔ جس کا تعلّق کسی قوم یا مذہب سے نہیں ہے۔ اس لیے انھوں نے گھوڑے کو فوراً کھول دیا۔

رحم دلوں نے اسے ٹھنڈا پانی پلایا۔ اس کی جلد ایک دو جگہ سے جل گئی تھی چناں چہ ایک لڑکی بھاگ کر

مرہم لینے گئی اور چند عورتیں اپنے آنچل کی ہوا سے اس کی زخموں کی مکھیاں اُڑا رہی تھیں۔☆۲۴۴

ناول کا ہیرو آنند متعصب ہندوؤں کے درمیان گرا ہوا تھا، لیکن اس کے باوجود آنند کو اپنی فطرت کے مطابق ہر ظالم سے نفرت اور ہر مظلوم سے ہمدردی تھی۔

جب ہندوؤں نے شمس الدین کو آگ لگائی تو آنند نے بہت کوشش کی کہ اس کے ساتھی اس کے ساتھ مل کر آگ بجھائیں لیکن کوئی بھی اس کام کے لیے تیار نہ ہوا تو آنند شمس الدین کے جلتے ہوئے مکان میں چلا گیا۔

آنند کی وجہ سے عورتوں اور بوڑھوں میں ایک ہاہا کار مچ گیا تھا اور نوجوان مجبور ہو کر پانی کی بالٹیاں لیے ادھر سے اُدھر بھاگنے لگے تھے لیکن آگ ان کے قابو سے باہر ہو چکی تھی۔☆۲۴۵

آنند کے پہنچنے سے پہلے شمس الدین کے گھر کافی حد تک جل چکا تھا لیکن اس کے جانے کا اتنا اثر ہوا کہ اس کے ساتھیوں نے آنند کی خاطر مکان پر پانی کی بالٹیاں ڈال کر آگ بجھا دی اور یوں آنند نے اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر شمس الدین اور اس کے گھر والوں کی جان بچالی۔

ناول کے دوسرے حصّے کا عنوان ''رقصِ شرر'' ہے۔

اس حصّے میں بھی رامانند ساگر نے لاہور میں ہونے والے ہندو مسلم فسادات کا ذکر کیا ہے ہندوستان میں جب زخمیوں یا مردہ مہاجریں سے بھری ہوئی ٹرینیں آتیں تو ہندو اور سکھ ان کا بدلہ لینے ہندوستان سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں سے لیتے۔اسی طرح جب پاکستان میں مسلمان شہیدوں سے بھری ہوئی ٹرین آئی یا کسی اور ذریعے سے مسلمانوں پر کیے جانے والے ظلم کی خبریں پاکستان پہنچتیں تو مسلمان اپنے ساتھیوں کے لیے جذباتی ہو جاتے اور جو بھی ہندو یا سکھ سامنے نظر آتا اس سے اپنے ساتھیوں کا بدلہ لیتے۔

ایک ڈبے کی دیوار پر کسی نے خون کے ساتھ لکھ دیا...''راول پنڈی کا جواب، اور اس ڈبے پر چھائی ہوئی موت کی خاموشی زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ''ان کورو کو ــــ جنھوں کھالی کا جواَب بہار میں اور بہار کا جواب راول پنڈی میں دیتے ہیں۔☆۲۴۶

ہندو، سکھ یا مسلمان جب بھی اپنے نقصان کا بدلہ لینے کا ارادہ کرتے تو خواتین ہی سب سے پہلے ان کے ظلم اور ہوس کا نشانہ بنتیں۔اس حقیقت سے خواتین بھی اچھی طرح آگاہ ہو چکی تھیں۔

آدھی کے قریب خواتین نے خودکشی کر لی تھی اور جو باقی تھیں وہ کچھ اس طرح سہم گئی تھیں کہ انھیں اپنے مردوں پر بھی اعتبار نہ رہا تھا۔جو مرد اپنے گاؤں کی ہر لڑکی کو بیٹی سمجھا کرتے تھے... اور جن بزرگوں نے ان کی ماؤں اور دادیوں کی عزت کی ہمیشہ حفاظت کی تھی ان ہی مردوں نے

آج ان کے ساتھ وہ کچھ کیا تھا کہ اب وہ ہر مرد سے دہشت کھانے لگی تھیں۔☆ ۲۴۷

سکھ، ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے بدلہ لینے کے نشے میں اتنا غرق ہو جاتے کہ انھیں آس پاس کا ہوش نہ رہتا یہاں تک کہ وہ اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کو بھی بھول جاتے جو ان کی مدد کے منتظر ہوتے۔

ناول میں ایک جگہ ایک زخمی مسلمان مہاجر پلیٹ فارم پر کسی رضا کار کی مدد کا منتظار تھا جو اسے اسپتال لے جاتا، لیکن رضا کار نے اسے یہ کہہ کر ڈانٹ دیا:

''...تو یہ ہم کس کی مدد کر رہے ہیں۔ اپنے باپ کی؟ اس وقت سو کے قریب ہندو اس اسٹیشن پر قتل کیے جا چکے ہیں اور آپ کا مزاج ہی کہیں نہیں ٹھہرتا۔'' ☆ ۲۴۸

ناول کے اس حصّے میں بھی کشوری لال کی بے حسی دکھائی گئی ہے۔ جسے شدید فسادات کے دنوں میں اپنی بیوی اور بیٹی کی عزت اور زندگی سے زیادہ اپنی زندگی اور اپنی دولت بچانے کی فکر تھی۔

جب مسلمانوں نے کشوری لال کے گھر پر حملہ کیا تو اس نے صرف روپے پیسے اور سونا چاندی ہی کو اپنی قیمتی سرمایہ سمجھا، اور اسی سرمائے کے سہارے وہ ایک محفوظ مقام پر پہنچ گیا۔

آنند نے جب اس سے اوشا اور اس کی بیوی کے بارے میں پوچھا تو اس نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا:

''اس وقت اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ میں ان کو ڈھونڈتا پھرتا۔ ہزار جلدی کرنے پر بھی نوٹوں کی چند گڈیاں رہ گئیں۔ آخر روپیہ کیسے چھوڑا جا سکتا ہے،...جیب ٹھوس ہو تو بیوی کی کیا کمی ہے۔'' ☆ ۲۴۹

ناول کے اسی حصّے میں ایک مولانا کے کردار کا بھی اضافہ ہوا ہے جس نے آنند کو مسلمان حملہ آوروں سے بچایا اسے اوشا سمیت تین مغویہ لڑکیوں سے ملوانے کے بعد بحفاظت ریلیف کیمپ تک پہنچایا۔

آنند ریلیف کیمپ میں ان تینوں لڑکیوں کی حفاظت خود کرنا چاہتا تھا۔ آنند اس بات سے بہت خوش تھا کہ اوشا کیمپ میں اس کے ساتھ ہو گی لیکن آنند کا یہ ارمان پورا نہ ہو سکا، اور ریلیف کیمپ میں اوشا کا باپ پہلے سے موجود تھا۔

سیٹھ نے جب بے حد جذباتی انداز میں اپنی لڑکی کو گلے سے لگایا تو یہ جھوٹا ناٹک دیکھنے کی تاب نہ لا کر آنند خاموشی سے آگے نکل گیا۔☆ ۲۵۰

کیمپ میں بیٹھ کر کشوری لال خود کو شفیق اور ذمّے دار باپ ظاہر کرنے کے لیے اوشا کے ساتھ سائے کی طرح رہتا۔ جس سے اوشا اور آنند کی آپس میں بات نہ ہو پاتی۔ سارے حالات جانتے ہوئے بھی اوشا کے دل میں یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کے اغوا کرنے کی وجہ سے آنند اس سے دور ہو گیا۔

جب کیمپ سے قافلے کے جانے کا وقت آیا تو آنند نے قافلے والوں کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا کیوں کہ آنند

لاہور میں رہ کر بلا تعصب مصیبت زدہ لوگوں کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ اوشا نے اصل وجہ جاننے کی کوشش نہ کی اس کا شک یقین میں بدل گیا اور اس نے آنند سے کہا:

''کیا تم مجھ سے اس لیے نفرت کرنے لگ گئے ہو کہ مجھے مسلمان اٹھا لے گئے تھے۔'' ☆۲۵۱

اوشا نے آنند کو صفائی کا موقع نہ دیا اور زہر کھا کر مر گئی۔

اوشا کر کردار اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس کردار کے ذریعے ان مغویہ خواتین کی نفسیاتی الجھنوں کی ترجمانی ہوتی ہے جنھوں نے لوگوں کے تحقیر آمیز رویئے اور دل دکھانے والے سوالوں سے خوف زدہ ہو کر خودکشی کی۔

اوشا کی موت کے بعد ناول کا تیسرا حصہ ''میں بچ گیا'' شروع ہوتا ہے جس میں آنند اوشا کی موت کے بعد افسردہ ہے۔ اس کی دلی کیفیت کو اس ناول میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''اس کا دکھ ان رئیسوں سے کہیں زیادہ تھا۔ اس نے زندگی کی تمام رونقیں کھو دی تھیں۔'' ☆۲۵۲

ناول کے اس حصے میں ''کشن چند'' کے کردار کا اضافہ ہوا ہے جس کی بہن کو مسلمان اغوا کر کے لے گئے تھے۔ اس کا شوہر اس کی حفاظت کرتے ہوئے پہلے ہی مارا جا چکا تھا۔ اغوا کرنے والوں نے اس کی بہن کی گود سے یہ کہہ کر اس کا بچہ چھین لیا تھا:

''...اس سرٹیفکیٹ کو ساتھ کہاں لیے جا رہی ہو۔ اس کے ساتھ تو تمھاری قیمت آدھی ہو جائے گی۔'' ☆۲۵۳

کشن چند نے یہ بچہ آنند کے حوالے کر دیا تھا۔ اب یہ بچہ ہی آنند کا دوست اور دکھ درد کا ساتھی تھا۔

ناول کے تیسرے حصے میں نرملا کے کردار کا بھی اضافہ ہوتا ہے۔ نرملا ایک مظلوم لیکن باہمّت لڑکی ہے۔ فسادات میں مسلمان اسے اغوا کر کے پاکستان لے جاتے ہیں۔ اپنی بہادری سے وہ مسلمانوں کی قید سے نکل جاتی ہے اور دریائے راوی پار کر کے دوبارہ ہندوستان کر سرحد میں داخل ہو جاتی ہے، لیکن اس کے گھر والوں نے اسے دروازے ہی سے یہ کہہ کر واپس بھیج دیا تھا کہ انھوں نے اپنے خاندان اور محلّے میں یہ مشہور کر دیا ہے کہ ان کی بہو غیرت مند تھی اس لیے اس نے کنویں میں چھلانگ لگا کر اپنی عزت بچانے کے لیے اپنی جان قربان کر دی تھی۔ نرملا کے سسر نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا:

''ہم نے ان سے پورا پورا بدلہ لے لیا ہے۔ جتنی عورتیں ہمارے گاؤں کی وہ اٹھا کر لے گئے ہیں۔ ان سے کہیں زیادہ ہم ان کی عورتیں گاؤں میں لے آئے ہیں... اپنے ہاں بھی دو ہیں۔'' ☆۲۵۴

نرملا نے مجبوراً اور مایوس ہو کر دوبارہ دریائے راوی پار کیا اور پاکستان میں آ گئی۔ جہاں آنند کو وہ بے ہوشی کی حالت میں ملی۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ آنند کی کئی دنوں کی کوشش کے بعد اس کے حواس درست ہوئے تو اس نے اپنی پوری کہانی آنند کو سنائی۔ کہانی سنانے کے بعد وہ جس نتیجے پر پہنچی اسے رامانند ساگر نے بہترین الفاظ میں یوں بیان کیا ہے:

''شریف عورت کے لیے ہندوستان میں بھی مجھے وہی کچھ دکھائی دیا جو اُن کے پاکستان میں تھا۔ یہ دونوں ملک ان مردوں کے تھے جنھوں نے شرافت کے نقلی پردے پھاڑ کر اپنے اصلی رنگ میں عورت کے ننگے جسم کے گرد ناچنا شروع کر دیا تھا...اس عیاشی کے لیے دونوں ایک دوسرے سے مل گئے تھے، اور میں ان دونوں کی پہنچ سے کہیں دور چلی جانا چاہتی تھی۔'' ☆۲۵۵

یہ ساری باتیں سن کر آنند کو نرملا سے ہمدردی محسوس ہوئی اور اس کے ساتھ ہی اسے اوشا یاد آ گئی۔ اسے نرملا اوشا ہی کا کوئی روپ لگی۔ اس نے کشن چند کا بھانجا نرملا کے حوالے کر دیا تا کہ اسے اپنے بیٹے کی کمی محسوس نہ ہو۔
نرملا بھی اس بچے کو فوراً اپنا بیٹا تسلیم کر لیا اور اس میں مگن ہو کر وہ کسی حد تک اپنا دکھ بھول گئی۔ ناول کے اس حصّے میں اجاگر سنگھ کا کردار یہ ظاہر کرتا ہے۔ فسادات کے دوران مسلمانوں نے بھی سکھوں پر ہر طرح کے ظلم کیے۔
اجاگر سنگھ راول پنڈی کا رہنے والا تھا۔ جب اس کے آس پاس دیہاتوں میں سرحد کے مسلمانوں نے حملہ کیا تو اجاگر سنگھ کے گاؤں کے لوگوں نے بھی خود کو مرنے کے لیے تیار کر لیا۔

گاؤں والوں نے مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی عورتوں کی عزت یقینی طور پر بچانے کے لیے اپنے اپنے گھروں کی عورتوں کو خود اپنے ہی ہاتھوں قتل کر دیا جائے۔ تا کہ ایک فی صد بھی کھٹکا باقی نہ رہے۔☆۲۵۶

اجاگر سنگھ جب اپنی بیوی اور بچّوں کو مارنے کی نیّت سے گھر داخل ہوا تو اس کی بیوی خود کو مرنے کے لیے آمادہ کر چکی تھی۔

اندر جا کر عورت نے چپ چاپ ایک لکڑی کے صندوق پر سر رکھ دیا؛ آنکھیں بند کیں، اور کہا،
''واہگرو۔'' اس لفظ کے ساتھ اس کا سر تن سے جدا ہو گیا۔☆۲۵۷

اس ناول میں رامانند ساگر نے جو ایک نیا نکتہ بھی پیش کیا ہے وہ ایک بچے پر فسادات کے نفسیاتی اثرات کو بیان کرنا ہے۔ اس بچے کا ننھا ذہن ہندو مسلم فسادات کی وجوہات سے تو ناواقف ہے لیکن آس پاس کے ماحول نے اسے یہ احساس دلا دیا تھا کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے دشمن ہو چکے ہیں اور ان کی خوشی ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے میں ہے۔ وہ خود بھی مرنے کے لیے تیار تھا۔ جب اجاگر سنگھ اپنے گھر والوں کو مارنے کی نیّت سے گیا تو اس بچے نے جو اجاگر سنگھ کا بیٹا تھا اپنی روتی ہوئی ماں کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا:

''ماں تو کیوں فکر کرتی ہے۔ آنے تو دے کسی مسلمان کو، میں یہ برچھا تیار کر رہا ہوں، بس اسی سے ایک ایک کا خون کر دوں گا۔'' ☆۲۵۸

بیٹے نے اپنی ماں کو قتل ہوتے دیکھ لیا تھا اس لیے جب اجاگر سنگھ نے اسے لیٹنے کے لیے کہا تو وہ اپنے باپ کا مقصد

سمجھ گیا اور اس نے کہا:

''ماں تو کہتی تھی ہمیں مسلمان مار ڈالیں گے؛ پھر تم کیوں مارتے ہو؟ کیا تم مسلمان ہو گئے ہو۔'' ☆۲۵۹

اجاگر سنگھ نے بیٹے کے قتل کے بعد بیٹی کو بھی قتل کر دیا اور پھر مسلمان حملہ آوروں کے گروہ کا مقابلہ کرنے کے لیے گاؤں کے ہندوؤں کے ساتھ مل گیا۔

مسلمان حملہ آور جب گاؤں میں داخل ہوئے تو تمام سکھ مقابلے کے لیے ان کے سامنے آ گئے لیکن اس سے پہلے کہ مقابلہ شروع ہوتا۔ فوجیوں کا ایک دستہ ان کے گاؤں میں آ گیا اور ان سکھوں کو راول پنڈی کے کیمپ میں لے گیا۔

اجاگر سنگھ بھی اپنے ہاتھوں ہی اپنے گھر کو اجاڑنے اور دشمنوں سے مقابلہ نہ کرنے کے دکھ میں پاگل ہو گیا اس نے کرپان پھینک دی۔ البتہ اپنے بیٹے کے بنائے ہوئے برچھے کو اپنے پاس ہمیشہ کے لیے رکھ لیا، اور ہر وقت ''میں بچ گیا'' کے نعرے لگاتا رہتا۔

اس دیوانگی کی حالت میں اس نے قافلے کے ساتھ پاکستان سے ہندوستان ہجرت کی۔

ناول کے چوتھے حصے ''اور انسان مر گیا'' میں ہندوؤں کا طویل قافلہ ہجرت کی منازل طے کرتا ہوا ہندوستان کی سرحد میں پہنچ جاتا ہے۔ شرنارتھیوں کے کیمپ کی تصویر ملاحظہ فرمائیے:

> وہاں مختلف قسم اور مختلف علاقوں کے لوگ آ کر جمع ہو گئے تھے۔ ان میں اکثر تو اُن دور افتادہ دیہات کے تھے جہاں مکمل قتلِ عام ہوا تھا، اور کوئی ایک آدھ کسی طرح بچ بچا کر بھاگ آیا تھا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو قافلوں سے بچھڑ گئے تھے، تھک کر بیٹھ گئے تھے، بیمار ہو گئے تھے، اور قافلے والے انھیں چھوڑ کر اس طرح آ گے چلے گئے تھے۔ یہ سب بھٹکے ہوئے، بچھڑے ہوئے لوگ، جن میں سے ہر ایک اکیلا تھا، یہاں آ کر جمع ہو گئے تھے۔ ان میں کوئی بھی کسی کا کچھ نہ تھا۔ ☆۲۶۰

اس قافلے میں آنند، نرملا، بے سہارا بچہ، اجاگر سنگھ، کشن چندر بھی شامل ہیں۔ اس حصے کی ابتدا میں راما نند ساگر نے انسانیت کا درس دینے کی کوشش کی ہے ان کے بعض خیالات متاثر کن بھی ہیں جن میں انھوں نے جن ہندوؤں اور مسلمانوں پر طنز کی ہے جو انسانی تہذیب اور انسان اور حیوان کے فرق کو بھول چکے تھے۔

> ...انسانیت، ننگی ہو گئی تھی۔ مذہب کا پول کھل گیا تھا اور انسان اپنے اصلی رنگ میں نمودار ہو گیا تھا۔ اس نے ہزاروں، لاکھوں برسوں کی روایات کے زور پر بنے ہوئے تمام رشتے توڑ دیے

تھے۔☆۲۶۱

ہجرت کرنے والے قافلے کا ہر فرد کسی نہ کسی تکلیف میں مبتلا تھا۔ سب کو اپنے آپ کے علاوہ کسی سے دل چسپی نہ رہی تھی۔ بھوک، پیاس، تھکن اور ہجرت کے غم سب کو بری طرح نڈھال کر دیا تھا۔ کشن چندر کا بھانجا بھی بھوک سے مر چکا تھا۔ اب نرملا اور آنند اس کی لاش کی حفاظت بھی ایسے ہی کر رہے تھے جیسے کسی زندہ انسان کی جاتی ہے۔ جیسے جیسے قافلے میں بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی قافلے کی بدنظمی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ نرملا اور آنند کو ڈر تھا کہ کسی بھی لمحے بچہ ان کے ہاتھ سے گر کر کچل جائے گا۔ دونوں نے متفقہ فیصلے کے بعد اسے ایک درخت کے نیچے رکھ دیا اسے دیکھ کر بہت سے کتے اس کی طرف دوڑے لیکن اس سے پہلے لاش کو کوئی نقصان پہنچتا آنند نے دوبارہ اس بچے کو اٹھالیا۔

جب قافلہ ہندوستان سے چند میل دور رہ گیا تو قافلے والوں کو خبر پہنچی کہ جواہر لال نہرو ان کی حفاظت کے لیے ملٹری اور ہوائی جہاز سے ان کے لیے روٹیاں بھیجیں گے، لیکن آنند کو ان باتوں پر یقین نہ آیا اور اس نے کہا:

> ’’...آخر جواہر لال نہرو ہمارے کیا ہوتے ہیں تم نے دیکھا نہیں یہاں جو اپنے قریبی رشتے دار ہیں وہ ایک دوسرے کو سڑک پر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں... ہاں البتہ ایک بات ہو سکتی ہے اسے کوئی غرض ہوگی۔ شاید اسے ان سب لوگوں سے ووٹ لینے ہوں گے۔‘‘ ☆۲۶۲

اور جب ہوائی جہاز سے روٹیاں پھینکیں گئیں تو قافلے میں ایسی ہلچل مچ گئی جیسے روٹیاں نہیں بم پھینکے جا رہے ہوں۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے اور روندتے ہوئے روٹی چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔

> ایک عجیب دل ہلا دینے والا سماں تھا۔ جنھیں کچھ ٹکڑے مل گئے تھے وہ خوشی کے مارے رو رہے تھے... روٹیاں پیروں تلے کچلی گئیں... آدمی اور بچے بھی ان کے ساتھ اس طرح کچلے گئے تھے۔ ایک طرف ان کی چربی اور دوسری طرف خون میں کچلی ہوئی روٹیوں کے آٹے میں تمیز کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔☆۲۶۳

اسی دھکم پیل میں نرملا کے ہاتھوں سے بچہ بھی گر گیا جو اسے دوبارہ نہ مل سکا۔ اس طرح وہ بچہ جس کی لاش کو آنند کتوں اور گدھوں سے بچالایا تھا اسے انسانوں سے نہ بچا سکا۔

جیسے جیسے قافلہ آگے بڑھتا جا رہا تھا ان کی منزل قریب آتی جا رہی تھی، منزل پر پہنچنے کی خوشی اور اچھے مستقبل کی اُمید نے انھیں اتنا طویل سفر طے کرنے میں سہارا دے دیا تھا۔

نرملا آنند کے ساتھ نئی زندگی شروع کرنے کے خواب دیکھ رہی تھی، اور پھر وہ وقت بھی آ گیا جب نرملا نے سلیمانکی کا پل پار کر کے ہندوستان کی سرحد پر اپنا پہلا قدم رکھا۔ اس لمحے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے:

... آدم خوروں، راکھشسوں کی بستی سے نکل کر وہ دیوتاؤں کی دھرتی پر قدم رکھ رہی ہو۔☆۲۶۴

ہندوستان کی سرحد پر پہنچنے تک آنند نیم پاگل ہو چکا تھا۔نرملا تمام حادثات کے باوجود زندگی کی متمنی تھی۔آنند زندگی سے اتنا ہی متنفر ہو چکا تھا، اور اسے ایسے بہت سے مواقع یاد کر کے افسوس ہو رہا تھا جب اس نے زندہ رہنے کے لیے خطرات کا مقابلہ کیا تھا۔

آنند نرملا کے ساتھ پل پار کر چکا تھا کہ پیچھے سے مولانا نے آواز دی اور ایک لاوارث ہندو بچہ اس کے حوالے کر دیا تو آنند نے نہایت غصّے سے مولانا کو مخاطب کر کے کہا:

''تم اتنے ظالم کیوں ہو گئے ہو؟ تم تو چاہتے ہو کہ یہ بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مرے اور پھر جب اس کی ماں ملے تو اس کی چھاتیاں کٹ چکی ہوں۔'' ☆۲۶۵

اگلے ہی لمحے آنند نے مولانا کی گردن دبا دی، دونوں طرف کی فوجوں نے فائرنگ کی لیکن انسان (مولانا) مر چکا تھا۔

راما نند ساگر کے اس ناول میں ہندو مسلم فسادات کی وجہ سے پیش آنے والے مختلف حادثات کو بیان کیا گیا ہے۔فنی کمزوریوں کے باوجود بعض واقعات نے ناول میں جان ڈال دی ہے۔مولانا، آنند، اوشا، نرملا اور اجاگر سنگھ جن حادثات کا شکار ہوئے اس سے کس نتیجے میں ان کا جانی، مالی اور روحانی نقصان ہی نہیں ہوا، بلکہ ان حادثات سے ان کی شخصیت بھی متاثر ہوئی۔

تمام واقعات میں انھوں نے خود کو غیر جانب دار ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اور انسانیت کا درس دے کر خود کو سوشلسٹ ظاہر کرنا چاہ رہے ہیں۔ایک جگہ انھوں نے ناول کے مرکزی کردار آنند کے ذریعے اپنا خیال پیش کیا ہے:

اس فساد میں نہ ہندو کا کچھ بگڑا۔نہ مسلمان کا نقصان ہوا۔دونوں نے اِدھر کا نقصان اُدھر سے پورا کر لیا۔صرف نقصان ہوا تو انسان کا، اور لٹ گئی تو انسانیت۔☆۲۶۶

انھوں نے ناول میں بعض جگہ ہندوؤں کو اور بعض جگہ مسلمانوں کو وحشی ثابت کرنا چاہا ہے اور اس طرح حساب برابر رکھنے کی کوشش کی ہے، پھر بھی وہ اپنے دل میں مسلمانوں کی خلاف چھپی ہوئی نفرت اور تعصب کو چھپانے میں ناکام ہو گئے ہیں۔

فسادات کے دنوں میں مولانا نے تین ہندو لڑکیوں کو محفوظ جگہ چھپا کر رکھا تھا اور بعد میں انھیں آنند کے حوالے کر کے کیمپ تک پہنچایا تھا، اور انھیں یقین دلایا تھا کہ خدا ان کی حفاظت کرے گا۔اس موقع پر انھوں نے خدا پر طنز کرتے ہوئے لکھا ہے:

''آپ اپنی عظمت خواہ مخواہ خدا کے سر تھوپ رہے ہیں اگر آپ کا خدا ہی ان کی حفاظت کرتا ہے تو دیکھیے آسمان پر چھایا ہوا دھواں اور اُدھر زمین پر بہنے والا خون بھی دیکھیے۔خدا شاید یہی کچھ کر سکتا ہے۔مگر جو آپ نے کیا ہے۔ایسا عظیم کام وہ نہیں کر سکتا۔یہ ایک انسان ہی کر سکتا تھا۔'' ☆۲۶۷

آخر میں جب مولانا اسلام کو ایک آئیڈیل مذہب ثابت کرنے میں کام یاب ہو گئے۔ تو انھوں نے اسلام کے ساتھ ہندومت کو بھی عظیم مذہب قرار دیا۔

''وہ مہادیو کے سر سے نکلنے والی گنگا کی طرح پوتر اور نا قابلِ تسخیر ہے۔'' ☆ ۲۶۸

ناول میں ایک جگہ لٹے پٹے مسلمان مہاجرین کی ٹرین کا ذکر کیا ہے جس کے صرف پندرہ مسلمان زندہ سلامت بچے ہیں ان مہاجرین کو غیر مہذب اور ندیدہ ظاہر کرنے کے لیے ایک غیر حقیقی بیان دیا ہے:

ان پندرہ افراد نے بے حد بھوک اور پیاس کے سبب فرش پر جمے ہوئے اپنے بھائیوں، بیویوں اور بچّوں کے خون کو چاٹا تھا۔ اپنے بدن میں دانتوں سے کاٹ کر خون چکھا تھا اور انتہا یہ ہے کہ کئی روز سے پیاسے رہنے کے بعد آخر انھوں نے ایک دوسرے کے مُنہ میں پیشاب کیا تا کہ حلق تو تر کر سکیں۔ ☆ ۲۶۹

مغربی پنجاب سے جانے والی ہندوؤں اور سکھوں کی ٹرین کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے:

مغربی پنجاب سے آئی ہوئی ایک رفیوجی ٹرین کو منٹگمری اور رائے ونڈ سے ہو کر لاہور پہنچنے میں پانچ دن لگے تھے۔ اس میں دس ہزار سکھ تھے۔ ان پر کئی مرتبہ حملے کیے گئے اور محافظ دستوں نے بڑی بہادری سے انھیں بچایا، لیکن پیاس سے انھیں کوئی نہ بچا سکا۔ راہ میں پاکستان کے کسی بھی اسٹیشن پر تین دن تک انھیں پانی کا ایک گھونٹ نہ دیا گیا جس سے چار سو ننھے بچے بلک بلک کر مر گئے۔ ☆ ۲۷۰

ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ رامانند ساگر ہندوؤں اور مسلمانوں کو انسان کی حیثیت سے نہیں، بلکہ دو مختلف قوموں کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔ اپنے دل میں چھپی ہوئی نفرت کو انھوں نے نہایت غیر شائستہ اور سطحی انداز میں بیان کیا ہے۔ کوئی بھی مسلمان یا مہذب انسان اتنا بے صبرہ یا ندیدہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی پیاس بجھانے کے لیے اپنے ساتھیوں کا خون یا پیشاب پیے۔ البتہ اگر یہ بات ہندوؤں کے بارے میں کہی جاتی تو اس بات پر بغیر کسی شک وشبہ کے یقین کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ جس قوم کے مذہب میں گائے کا پیشاب پینے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ وہاں کسی انسان کا پیشاب پینا ناممکن نہیں۔

اسی طرح نرملا کے کردار کے ذریعے بھی رامانند ساگر کے متعصبانہ خیالات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ناول میں جب نرملا کے گھر والے اسے گھر سے نکال دیتے ہیں۔ وہ مجبوراً دوبارہ پاکستان آ جاتی ہے۔ ناول نگار نے اس کے کرب کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''شریف عورت کے لیے ہندوستان میں بھی مجھے وہی کچھ دکھائی دیا جو اُن کے پاکستان میں

تھا۔'' ☆۲۷۱

ناول کے آخر میں انھوں نے اپنے متعصبانہ جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر نرملا کی دلی کیفیت کے ذریعے ظاہر کر دیا ہے:

''آدم خور راکھشسوں کی بستی سے نکل کر وہ دیوتاؤں کی دھرتی پر قدم رکھ رہی ہو۔'' ☆۲۷۲

پورا ناول پڑھنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رامانند ساگر ناول کے ذریعے مسلمانوں کو ہی ظالم اور جابر ثابت کرنا چاہ رہے ہیں۔ ان کے نزدیک ہندو بے قصور اور مظلوم اور سارے فسادات کے ذمّے دار مسلمان ہیں۔

اس لحاظ سے خواجہ احمد عبّاس کا یہ بیان بھی غلط ثابت ہو جاتا ہے جو انھوں نے ناول کے دیباچے میں لکھا ہے:

> رامانند ساگر کسی پارٹی کا ممبر نہیں ہے۔ اگر کمیونسٹ ہوتا تو سامراج اور سرمایہ داری پر لعنت بھیج کر چپ بیٹھا رہتا یا موضوعِ سخن بدل کر تلنگانہ کے بہادر چھاپہ ماروں کا ذکر شروع کر دیتا۔ سوشلسٹ ہوتا تو کمیونسٹوں کی پاکستان پروری کو گالیاں دے کر ڈسٹرکٹ بورڈ کے الکشنوں میں مصروف ہو جاتا۔ کانگریسی ہوتا تو مسلم لیگ والوں کی صلواتیں سنا کر شراب بندی کا پرچار شروع کر دیتا... وہ کسی پارٹی کا ممبر نہیں۔ صرف انسان پارٹی سے تعلّق رکھتا ہے۔ وہ انسانیت کے علم بردار فن کاروں کی اس بلند مرتبت صف کا ایک رکن ہے۔☆۲۷۳

اس پیراگرف میں خواجہ احمد عبّاس نے جانب داری سے کام لیا ہے۔ یہ محض ان کا خیال ہے کہ رامانند ساگر انسان دوست ہیں۔

اگر چہ ناول کے شروع میں رامانند ساگر نے جو واقعات بیان کیے ہیں ان میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہو گئے ہیں، لیکن جیسے جیسے ناول کی کہانی آگے بڑھتی ہے اس میں انھوں نے ایسے واقعات بیان کر دیے ہیں جن سے ان کے دل میں مسلمانوں سے نفرت کا جذبہ ظاہر ہو گیا ہے۔

ان واقعات سے ناول کی ادبی حیثیت بری طرح متأثر ہوئی ہے۔ اگر چہ ناول میں انھوں نے بعض جگہ اپنے آپ کو غیر جانب دار اور انسان دوست ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے لیکن جب پورے ناول کا جائزہ لیا جائے تو نفرت، تعصب اور جانب داری جگہ جگہ نمایاں ہوتی ہے، اور فلسفہ انسانیت محض لفاظی بن کر رہ جاتا ہے، اور یہ ناول ایک ادبی تخلیق سے زیادہ ایک سیاسی پروپیگنڈا لگتا ہے۔

یہ ناول پڑھ کر ذہن میں یہ خیال بھی آتا ہے کہ جب ایک ادبی فن کار کے دل میں متعصّبانہ خیالات پرورش پا سکتے ہیں تو عام ہندوؤں کے ذہن میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کے کیا کیا جذبات ہوں گے، اور ان منفی جذبات کی تکمیل کے لیے وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے کیا کیا ہتھکنڈے آزماتے ہوں گے۔

انھوں نے اسلام اور ہندومت کو بھی عظیم مذاہب قرار دیا ہے مگر یہ بھی محض نعرے بازی اور کھلا تجربہ ہے اس کا مسئلہ یہ تھا کہ اگر دونوں اپنے مذہب پر عمل کر رہے ہوتے تو ایسے درندے کیوں کر ہو جاتے کیوں کہ کوئی مذہب اس درندگی کی تعلیم نہیں دیتا۔

دراصل اس عہد میں غیر جانب دار ہونا اور محض انسان ہونا بوجوہ ایک فیشن بن گیا تھا۔ رامانند ساگر اس فیشن کا شکار ہوئے ہیں۔

یہ الگ بات ہے کہ وہ انسان ہونے کے باوجود اپنا ہندو ہونا چھپا نہ سکے۔

آنگن

''آنگن'' خدیجہ مستور کا آدم جی ایوارڈ یافتہ ناول ہے۔ اس ناول میں تقسیمِ ہند سے قبل برِصغیر میں پیش آنے والی سیاسی کش مکش کے علاوہ جنگِ عظیم دوم اور قیامِ پاکستان اور اس کے بعد کے حالات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

''آنگن'' مضبوط و مستحکم ماجرے اور کردار نگاری کے فنّی توازن کے حوالے سے ایک یادگار ناول ہے۔ ☆۲۷۴

اس ناول کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے ''ماضی'' میں ناول کی ہیروئن عالیہ اپنے ماضی میں کھوئی ہوئی ہے۔ اسے اپنی بہن تہمینہ اور والد کی کمی شدّت سے محسوس ہوتی ہے۔

دوسرے حصے ''حال'' میں ناول کے تمام کردار ایک ہی گھر میں رہتے ہیں اور وہ آپس میں رشتے دار یا بہن بھائی ہیں لیکن ان کے سیاسی نظریات ایک دوسرے سے مختلف ہیں یہ کردار اپنے اپنے نظریات کو درست ثابت کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔

آنگن کا پلاٹ مربوط اور جامع ہے ناول کے تمام واقعات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، اور ان واقعات میں سچائی اور حقیقت نمایاں ہے ناول نگار نے بڑے سیدھے سادے انداز میں تقسیمِ ہند سے قبل اور بعد کے واقعات کو بیان کیا ہے ان واقعات کے ذریعے کانگریس اور مسلم لیگ کے سیاسی نظریات واضح ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔

ان تمام خوبیوں کے باوصف پلاٹ میں ایک خامی یہ ہے کہ ناول میں تقسیمِ ہند سے پہلے واقعات کو تفصیل سے ۲۴۷/ صفحات پر پھیلا کر بیان کیا ہے، لیکن تقسیم کے نتیجے میں ہونے والے فسادات اور ہجرت سے معاشرے میں ہونے والی ہر سطح کی تبدیلیوں کو اتنی تیزی سی بیان کیا گیا ہے کہ کسی ایک نکتے پر توجہ مرکوز ہونے ہی نہیں پاتی۔ اس خامی کی وجہ سے پلاٹ میں توازن برقرار نہیں رہا۔

''آنگن'' کو مصنفہ نے اس انداز سے اختتام کو پہنچایا ہے کہ چاہیں تو اسے آگے بھی بڑھا سکتے ہیں۔☆۲۷۵

اس کا سبب شاید یہ ہو کہ اس وقت تک مہاجرین کی آبادکاری کا عمل تیزی سے مگر بے ربط طور پر جاری تھا اور حالات اس تیزی سے بدل رہے تھے کہ ان میں مستقبل کا چہرہ واضح طور پر دکھائی دیتا تھا۔ اس بے یقینی نے آنگن میں تقسیم کے بعد کے حالات پر سرسری نظر دوڑاتے جانے کی کیفیت پیدا کی۔

ناول کی فضا ابتدا ہی سے گھٹی گھٹی اور افسردہ ہے۔ اس میں یوپی کے ایک ایسے جاگیردار گھرانے کا ذکر کیا گیا ہے جو اپنی شان وشوکت تو کھو چکا ہے۔ پھر بھی ان کی زندگی اور گفتگو کرنے کے انداز میں ماضی کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ ناول نگار نے مختلف واقعات کی فضا اور ماحول کو بھی پس منظر کے طور پر بیان کیا ہے۔ گھر میں پیش آنے والے مختلف واقعات سے گھر کے افراد کے رویّوں میں آنے والی تبدیلیوں کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

ناول کے اہم کردار امّاں، ابا، عالیہ، تہمینہ اور صفدر ہیں۔ یہ تمام افراد ایک ہی گھر میں رہتے ہیں جب کہ صفدر ابا کا بھانجا ہے اور ان کے ساتھ رہتا ہے۔

دادی امّاں، بڑے چچا، بڑی چچی، جمیل، شکیل بھی ایک ہی خاندان کے افراد ہیں چھمی بڑے چچا کی بھتیجی ہے چھمی کی والدہ کے انتقال کے بعد بڑے چچا اسے اپنے گھر لے آئے۔ کریمن بوا ان کی بہت پرانی ملازمہ ہے جب کہ اسرار میاں دادا ابا کی داشتہ کی اولاد ہونے کی وجہ سے گھر کے سب سے زیادہ ناپسندیدہ فرد ہیں۔

تمام کردار آپس میں بہن بھائی اور رشتے دار ہیں۔

ناول کے پہلے حصے کا عنوان ''ماضی'' ہے۔ اس حصے میں عالیہ اپنے ماضی کو یاد کر رہی ہے اس حوالے سے اپنے والد اور بہن تہمینہ کی کمی شدّت سے محسوس ہوتی ہے اور ماضی کے مختلف واقعات ایک فلم کی طرح اس کے سامنے آرہے ہیں۔

ماضی کے حوالے سے اس کا سب سے بڑا دکھ امّاں اور ابا کے ناخوشگوار تعلّقات اور ان کا اپنی بیٹیوں کو اپنی محبت اور توجہ سے محروم رکھنا ہے۔

امّاں اور ابا کا سارا وقت انگریز کی حمایت یا مخالفت کرنے میں گزرتا۔ ابا کو اپنی سیاسی سرگرمیاں عزیز تھیں جب کہ امّاں کی ہر ممکن کوشش ہوتی کہ وہ صفدر کو کسی نہ کسی طرح ذلیل کرتی رہیں اور اس کی ایسی برائیاں کریں جس سے عالیہ اور تہمینہ بھی صفدر سے متنفر ہو جائیں، لیکن ایسا ہو نہ سکا اور تہمینہ صفدر سے شدید محبت کرنے لگی، اور جب امّاں نے تہمینہ اور صفدر کی شادی کی مخالفت کی تو تہمینہ امّاں کا حکم نہ ٹال سکی لیکن ان کا حکم مان بھی نہ سکی اور زہر کھا کر مرگئی، اور عالیہ کا بھی بیش تر وقت صفدر کے ساتھ ہنسی مذاق کرنے اور کھیلنے کودنے میں گزرنے لگا۔

امّاں اور ابا دونوں اپنی اصل ذمّے داریوں سے بالکل غافل تھے۔

عالیہ کی اپنے والدین کے بارے میں سوچ کو خدیجہ مستور نے اس طرح بیان کیا ہے:

> امّاں اپنے دکھوں میں مگن رہتیں اور ابّا اپنی دنیا میں مگن۔ دفتر سے آنے کے بعد وہ گھنٹا آدھا گھنٹا گھر میں گزارتے۔ امّاں کسی نہ کسی بات پر لڑتیں اور ابّا باہر کی راہ لیتے۔☆۲۷۶

امّاں اور ابّا کے درمیان ایک نیا جھگڑا اس وقت ہوا جب امّاں نے عالیہ کو صفدر بھائی کے ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھا اور عالیہ کو اسکول داخل کرانے کا فیصلہ کیا۔ ابّا انگریزوں سے نفرت کی وجہ سے انگریزی اسکول سے بھی نفرت کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے تہمینہ کو میٹرک کے بعد کسی کالج میں داخل نہیں کرایا اور اب وہ عالیہ کو بھی انگریزی اسکول میں داخل کرانے کے حق میں نہیں تھے۔ ابّا کا کہنا تھا:

> یہاں بس ایک ہی مشن ہائی اسکول ہے اور وہاں صرف انگریزی پڑھائی جاتی ہے یا پھر اپنے مذہب کی تبلیغ کی جاتی ہے۔ انگریزوں کے ان اسکولوں کے سخت خلاف ہوں یہ ہماری غلامی سے ہر طرح کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔☆۲۷۷

امّاں کو جب بھی موقع ملتا وہ اپنے شوہر کو انگریزوں کی غلامی کرنے کا طعنہ دیتیں ان کا خیال تھا کہ جب وہ انگریزوں کی نوکری کر سکتے ہیں تو اپنی بیٹی کو انگریزی اسکول میں تعلیم کیوں نہیں دلوا سکتے۔ وہ اکثر کہتیں:

> ''تم کو تو اللّٰہ واسطے کا بیر ہے، انگریزوں سے، جس تھالی میں کھاؤ اسی میں چھید کرو۔'' ☆۲۷۸

اصل میں مظہر چچا نہیں چاہتے تھے کہ وہ انگریزوں کے ساتھ نوکری کریں جب کہ امّاں کی دلی خواہش تھی کہ وہ انگریزوں کی خوشامد کریں تاکہ انھیں ترقّی مل سکے۔ اس لیے امّاں نے اپنے شوہر کی ساری رقم اپنے بھائی کے پاس رکھوا دی۔ ابّا کو نہ چاہتے ہوئے بھی انگریزوں کی ملازمت کرنی پڑی۔

ایک دن مظہر چچا کو اطلاع ملی کہ ان کے دفتر میں ایک انگیز افسر معائنے کے لیے آرہے ہیں۔ ابّا کو مجبوراً اپنے گھر میں انگریز افسر کے رہنے اور کھانے پینے کا انتظام کرنا پڑا۔ اس موقع پر بھی امّاں نے ابّا کا دل کھول کر مذاق اڑایا۔

دفتر میں انگریز افسر نے معائنے کے دوران ابّا کو ڈیم فول کہہ دیا۔ جس سے دونوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا، اور وہ انگریز افسر کے ساتھ کھانے کے لیے نہ آسکے۔ دفتر کے چپراسی نے گھر آکر بتایا:

> ''بابو جی کو پولیس پکڑ کر لے گئی۔ معائنے کے دوران افسر سے جھگڑا ہو گیا اور اپنی بابو جی نے رول سے اس کا سر پھاڑ دیا۔'' ☆۲۷۹

ابّا کے جیل جانے کے بعد ناول کا پہلا حصّہ ''ماضی'' ختم ہو جاتا ہے۔

ابّا کے جیل جانے کے بعد عالیہ اور امّاں اپنا گھر چھوڑ کر بڑے چچا کے پاس آجاتی ہیں۔

بڑے چچا کے گھر ہی سے ناول کا دوسرا حصہ ''حال'' شروع ہوتا ہے۔

بڑے چچا کے گھر میں بھی سیاسی موضوعات پر دن رات بحث ہوتی ہے۔اس بحث میں عام طور پر چھمی، جمیل، شکیل، کریمن بوا اور کبھی کبھی بڑی چچی بھی اس بحث میں حصہ لیتیں۔

بڑے چچا کانگریس کے نظریے سے متفق ہونے کی وجہ تقسیمِ ہند کے سخت خلاف تھے ان کا بیش تر وقت اور پیسا کانگریس کو فروغ دینے میں گزر جاتا۔سیاسی مصروفیات میں الجھ کر بڑے چچا اپنے گھر، بیوی اور بچوں سب کو بھول چکے تھے۔گھر کے مسائل اور ذمے داریاں کیا تھیں۔اس سے انھیں کوئی دل چسپی نہ رہی۔ بڑی چچی نے ایک روایتی اور مشرقی بیوی کی طرح حالات سے سمجھوتا کرلیا۔ جب کہ شکیل اور جمیل اپنے والد سے بہت دور ہوتے گئے اور ان کے دل میں اپنے والد کے لیے محبت یا عقیدت کا جذبہ بالکل ختم ہوگیا۔

> ...گھر میں مثالی خوش حالی تھی مگر جب وہ بڑی سرگرمی سے سیاست میں حصہ لینے لگے تو...ان کی آمدنی چندوں اور سیاسی ورکروں پر خرچ ہو جاتی۔ بڑے چچا کئی بار جیل جا چکے تھے، انھیں قیدِ تنہائی اور بیڑیاں پہننے کی سزا بھی مل چکی تھی۔ان کے پیروں میں موٹے موٹے سیاہ گھٹے پڑے ہوئے تھے...وہ ان گٹوں کو بڑے پیار اور فخر سے دیکھا کرتے۔ وہ اس قدر کٹر کانگریسی تھے کہ خالص مسلمانوں کی کسی بھی جماعت کو برداشت نہ کر سکتے تھے...کانگریس کے سوا ہر جماعت کے لوگ ان کی نظر میں ملک کے غدار تھے۔☆۲۸۰

بڑے چچا کی بیٹی کی شادی کا جب وقت آیا تو انھوں نے اس وقت بھی ایسے ہی شخص کو اہمیت دی جس کا تعلق کانگریس سے تھا۔

> ...انھیں اپنے سیاسی کارکن سے زیادہ بہتر آدمی نظر نہ آیا۔مگر چند ہی دنوں بعد بڑے چچا کو اس بہتر آدمی سے نفرت ہوگئی کیوں کہ وہ سیاست سے الگ ہوکر اپنے چند بیگے زمین اور بیوی بچوں میں کھو گیا تھا۔☆۲۸۱

بڑے چچا کی لا پروائی اور غفلت کی وجہ سے ان کے بیٹے جمیل اور شکیل صحیح طرح تعلیم حاصل نہ کر سکے خاص طور پر شکیل کا زیادہ وقت محلّے کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ گزرنے لگا شکیل اپنے گھر کے معاشی مسائل اور ناخوشگوار ماحول سے واقف تھا اور اس لیے وہ اپنی کم زوریوں پر پردہ ڈالنے کے لیے ہمیشہ کہتا:

> ''کہاں گھومتا ہوں، پڑھتا ہوں اپنے دوستوں کے ساتھ، میرے پاس تو پوری کتابیں بھی نہیں۔'' ☆۲۸۲

شکیل کی طرح جمیل بھی اپنے والد کی توجہ اور محبت سے محروم رہا پرائمری تک تو انھوں نے ایک مفت کے پرائمری اسکول میں تعلیم حاصل کر لی تھی، لیکن بی اے کرنے تک اسے کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بڑے چچا کو اس سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔

چھمی کا کردار ناول کا سب سے دل چسپ کردار ہے۔ چھمی بے باک، بدلحاظ اور نڈر لڑکی ہے۔ اگر چہ اس کا بات کرنے کا انداز جاہلانہ ہے لیکن پھر بھی اس کی باتوں میں صداقت ہے بے باک اور بدلحاظ ہونے کی وجہ سے وہ گھر والوں کی محبت سے محروم رہی۔ چھمی کو بھی کسی کی محبت یا نفرت یا پسند یا ناپسند سے کوئی غرض نہ تھی وہ ہر کام اپنی مرضی سے کرتی۔ حالات سے سمجھوتا کرنا اس کی فطرت میں شامل نہ تھا، بلکہ وہ ''جیسی کرنی ویسی بھرنی'' کو ذہن میں رکھ کر ہر فیصلہ کرتی۔

گھر کے تمام افراد کی طرح وہ بھی بڑے چچا کی سیاسی سرگرمیوں سے خوش نہ تھی۔ وہ بڑے چچا سے انتقاماً مسلم لیگ کی حامی بن گئی اور اپنی حد تک مسلم لیگ کے لیے جو کچھ کر سکتی تھی اس نے کیا۔ چھمی کے والد اسے جو بھی پیسے بھیجتے وہ مسلم کے لیے خرچ کر دیتی اور کہتی۔

> ''روپے پیسے کی کیا بات ہے میں تو اپنی جان تک نچھاور کر دوں مسلم لیگ پر، پھر ہمارے کافر چچا کو پتا چلے۔'' ☆۲۸۳

سب کے منع کرنے کے باوجود چھمی بظاہر کانگریس میں لیکن حقیقتاً بڑے چچا کے خلاف خوب بولتی خاص طور پر جب بیٹھک میں بڑے چچا کانگریسیوں کی محفل جما کر بیٹھتے تو چھمی بڑے چچا سے پورا پورا مقابلہ کرتی اور محلّے کے بچّوں کو جمع کر کے ان سے یہ نعرے لگواتی:

> ''کاشی میں تلسی تو بوئی بکریاں سب چر گئیں۔
> گاندھی جی، ماتم کرو ہندو کی نانی مر گئیں۔''
> ''مسلم لیگ زندہ باد، بن کے رہے گا پاکستان، دُھتیا راج نہیں چلے گا، چٹیا راج نہیں ہوگا۔'' ☆۲۸۴

کانگریس کے خلاف نعرے لگانے پر ایک دن بڑے چچا نے چھمی کی پٹائی بھی کی، لیکن چھمی پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ البتہ گھر کی فضا پہلے سے بھی زیادہ اداس ہوگئی۔ اس کے باوجود کسی نے بڑے چچا کے خلاف کوئی احتجاج نہ کیا۔ سوائے جمیل کے، شاید اسے چھمی کا احسان یاد آ گیا تھا:

> ''خوب، خوب !...واہ کیا عظیم آدمی ہیں ہمارے ابا بھی، یہ گھر ان کی عظمت کا مثالی نمونہ ہے برسوں سے غلامی کر رہے ہیں اور مجھے نوکری نہ دلا سکے۔ حالاں کہ اب کانگریس کی وزارت بھی

بن گئی ہے۔'' ☆ ۲۸۵

جب چھمی کی سیاسی سرگرمیاں ختم نہ ہوئیں تو بڑے چچا، بڑی چچی اور امّاں کے مشترکہ فیصلے سے ایک معمولی سے آدمی سے چھمی کی شادی کردی گئی۔ چھمی نے باغی اور بدلحاظ ہونے کے باوجود سب کچھ بہت آسانی سے قبول کرلیا۔ کیوں کہ اسے اندازہ ہوگیا کہ جمیل بھیا کو اس سے اس وقت تک محبت تھی جب تک وہ بی اے کررہے تھے اور وہ اپنے سارے پیسے انھیں کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے دیتی تھی۔

ناول میں بڑی چچی کا کردار سب سے زیادہ قابلِ رحم ہے وہ ایک وفا شعار بیوی کی طرح شوہر کی شان کے خلاف کچھ بولنا نہیں چاہتی تھیں۔ انھیں گھریلو پریشانیوں کا بھی تنہا مقابلہ کرنا پڑتا۔ سب کے لیے اور جمیل کے لیے بھی انھیں ہی جلنا کڑھنا پڑتا، چھمی، دادی امّاں، عالیہ، امّاں سب کے لیے وہی سوچ سوچ کر اپنی جان ہلکان کرتیں۔

''بڑی چچی اس گھر میں عبرت کی لاش معلوم ہوتیں۔ ان کی آنکھوں میں جیسے صدیوں کا دکھ سمایا ہوا تھا۔ اتنی بہت سی جانوں کی فکر صرف ان ہی کے کاندھوں پر سوار رہتی۔'' ☆ ۲۸۶

کانگریس کا سرگرم رکن ہونے کی وجہ سے بڑے چچا جب جیل جاتے تو بھی:

بڑی چچی اپنے میاں کے جیل جانے کی تفصیلیں سنا سنا کر گرفتار کرنے والوں کے ہاتھ ٹوٹنے کی دعائیں کرتیں۔ ☆ ۲۸۷

جمیل بھیا کو جب گھر کے حالات سدھرنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو اس نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا یہ فیصلہ گھر کے تمام افراد کے لیے بہت تکلیف دہ تھا ابا اور بڑے چچا کے انجام کے بعد بڑی چچی جمیل کے انجام سے بھی خوف زدہ تھیں۔ انھوں نے جمیل کو زہر کھا کر مرنے کی دھمکی دی لیکن پھر بھی وہ اسے روک نہ سکیں۔

عالیہ کی امّاں اگرچہ خود بھی تہمینہ کی موت اور پھر شوہر کی سات سال قید کے صدمے سے دوچار تھیں لیکن پھر بھی وہ دوسروں کو شرمندہ کرنے اور دل دُکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتیں:

''ارے بھابھی کیوں اپنی جان جلاتی ہیں، بیٹا بھی باپ کے نقشِ قدم پر چلے گا۔ بس اب اس سے ہاتھ دھولیں۔'' ☆ ۲۸۸

مسلم لیگ کے جلسے میں شرکت کے کچھ ہی دنوں کے بعد جمیل بھائی واپس آگئے اور انھیں ایک معمولی سی ملازمت بھی مل گئی۔

بڑے چچا کے گھر کے حالات روز بروز خراب ہوتے چلے گئے۔ چھوٹی چھوٹی خواہشات پوری کرنے کے لیے بھی انھیں کئی بار سوچنا پڑتا اور آخر میں ان کی خواہشات حسرت بن جاتیں۔ عید کے موقع پر گھر کے کسی فرد نے نئے کپڑے نہیں

بنائے۔ کھانے کے لیے کبھی منوں کے حساب سے سویاں پکائی جاتی تھیں لیکن اب صرف دو سیر سویاں پکائی گئیں۔ اس موقع پر سب کو اپنا ماضی بہت یاد آیا۔ شکیل نے اس موقع پر دل برداشتہ ہو کر کہا:

''مجھے اس گھر سے ملا ہی کیا ہے؟ کپڑے بھی دوست ہی دیں گے۔'' ☆۲۸۹

شکیل نے اپنے گھر خوش حالی کے دن بہت کم دیکھے تھے، اور کچھ اپنی بے راہ رویوں کی وجہ سے وہ گھر والوں میں سے کسی کی بھی محبت اور توجہ حاصل نہ کر سکا۔ اسے اپنے گھر والوں سے کوئی دل چسپی نہ رہی اور ایک دن اچانک وہ گھر سے بھاگ گیا۔ بڑے چچا کو تو اس بات کا ہوش ہی نہیں تھا کہ گھر میں کون ہے اور کون نہیں۔ بڑی چچی کو ہی ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنا پڑتا۔ جمیل نے بھی جان چھڑانے کے لیے بڑی چچی سے کہہ دیا کہ شکیل بمبئی میں چلا گیا ہے، اور وہاں بہت خوش ہے۔

اس موقع پر بڑی چچی نے پہلی بار صبر وضبط کے سارے بندھن توڑ کر بڑے چچا کو ان کی غلطیوں کا احساس دلاتے ہوئے کہا:

''تم نے اس کے لیے کیا کیا ہے، تم کو تو یہ بھی یاد نہ تھا کہ شکیل بھی تمھاری اولاد ہے۔'' ☆۲۹۰

شکیل کے گھر سے بھاگنے کے کچھ ہی دنوں کے بعد جمیل بھیا کی نوکری ختم ہو گئی۔

انھی دنوں جنگِ عظیم دوم بھی شروع ہو چکی تھی جس کی وجہ سے انگریز ہندوؤں اور سکھوں اور مسلمانوں کو زمین اور جائیداد کا لالچ دے کر اپنی فوج میں شامل کر لیا۔ بے روزگار ہونے کی وجہ سے جمیل بھی فوج میں شامل ہو گیا۔ جہاں اسے اپنی تحریروں کے ذریعے فوجیوں کو ہٹلر کے خلاف ابھارنا تھا۔

جمیل کے فوج میں جانے سے بڑی چچی پریشان ہو گئیں کیوں کہ وہ فوج میں جمیل کے اصل کام سے ناواقف تھیں۔ کریمن بوا نے بھی ہمیشہ کی طرح اس موقع پر ماضی کو یاد کیا اور ٹھنڈی آہیں بھریں:

''زمانے کی بات ہے، آج مالک مرحوم کی اولادیں نوکریوں کی تلاش میں کہاں کہاں جا رہی ہیں کبھی وہ زمانہ بھی تھا کہ دولت اپنے قدموں چل کر آتی تھی اور کوئی اسے اٹھا کر رکھنے والا نہیں تھا۔'' ☆۲۹۱

جمیل کے فوج میں جانے کے بعد گھر کے حالات کسی حد تک بہتر ہو گئے، لیکن بڑے چچا جمیل کے فوج میں بھرتی ہونے سے سخت ناراض ہوئے۔ اس ناپسندیدگی کی وجہ جمیل کی زندگی جانے کا خوف نہ تھا، بلکہ انھیں اس بات کا افسوس تھا کہ وہ جس قوم سے نجات حاصل کرنا چاہ رہے ہیں ان کا بیٹا فوج میں شامل ہو کر ان کی کامیابیوں کے لیے کوشش کر رہا ہے۔

انھوں نے بڑی صفائی سے انکار کر دیا تھا کہ وہ جمیل بھیا کی کمائی کا ایک پیسا بھی اپنے اوپر خرچ نہ ہونے دیں گے۔ ☆۲۹۲

ایک دن اچانک جیل سے عالیہ کے ابا کے مرنے کی خبر آئی۔ بڑے چچا عالیہ اور امّاں کے دکھ میں برابر کے شریک تھے لیکن وہ عالیہ کے ابا کے لیے صرف ایک بھائی کی حیثیت ہی سے دکھی نہیں ہو رہے تھے، بلکہ ایک کانگریسی کی حیثیت سے یہ خیال بھی پریشان کر رہا تھا کہ ان کا بھائی انگریزوں سے دکھی ہو کر مرا۔

''میرے بھائی کو انھوں نے مار ڈالا، اس نے تو انگریز حکمراں کو مار کر ثواب بھی نہیں کمایا تھا اور انھوں نے اتنی بڑی سزا دی۔'' ☆ ۲۹۳

ابا کے مرنے کے بعد عالیہ اور امّاں کو اپنے گھر لوٹ جانے اور پھر سے مل جل کر زندگی گزارنے کی جو آس تھی وہ ٹوٹ گئی۔ اس حادثے کے بعد امّاں پہلے سے زیادہ خود غرض اور مادّہ پرست ہو گئیں تھیں۔ اچھی تعلیم کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہ رہی وہ عالیہ کے بی ٹی کرنے کے لیے علی گڑھ جانے کے بھی خلاف ہو گئیں۔ انھیں اب صرف فکر تھی کہ جو ماضی وہ گزار چکی ہیں وہ عالیہ کا مستقبل ہو۔

''میں کہتی ہوں کہ اب تم علی گڑھ جانے کا خیال چھوڑ ہی دو۔ خدا جمیل کو خیریت سے واپس لے آئے، میں تمھارے ماموں سے روپے لے کر اسے دے دوں گی، تمھارے چچا کی دکانیں کچھ دن بعد چل نکلیں گی۔ وہ بہت اچھا لڑکا ہے ... اگر میں نے کہا تو جنگ سے آنے کے بعد تمھارے ماموں اسے ضرور کوئی بڑا عہدہ بھی دلا دیں گے۔ رہے تمھارے بڑے چچا اور اسرار تو میں انھیں جلد ہی اس گھر سے چلتا کروں گی، بنا بنایا گھر ہے ... سب تمھارے نام لکھوا لوں گی، شکیل تو سمجھو مر ہی گیا۔'' ☆ ۲۹۴

اگرچہ امّاں جانتی تھیں کہ عالیہ ان کے مقصد کو کبھی بھی پورا نہیں ہونے دے گی۔ پھر بھی اپنے منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے صرف بڑے چچا اور ان کے گھر والوں کے لیے ہی بے حس نہیں ہوئیں تھیں، بلکہ انھیں پوری دنیا میں کسی کے مرنے یا جینے سے کوئی غرض نہ رہی تھی۔

''اپنی حکومت جیت جائے تو کریمن بوا سب کچھ کھانے کو ملے گا۔ سب ہار گئے ہیں، ایک جاپان ملک ہی تو رہ گیا ہے۔ اللہ جانے یہ کس پتھر کے بنے ہیں۔'' ☆ ۲۹۵

آخر ایک دن امّاں کی یہ خواہش پوری ہو گئی جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر انگریز فوج نے زبردست بمباری کی جس سے دونوں شہر اور اس کے شہری تباہ و برباد ہو گئے۔ جاپان بھی انگریزوں کے قبضے میں آ گیا اور جنگِ عظیم دوم اپنے اختتام کو پہنچی جمیل بھائی واپس آ گئے اور امّاں نے سکھ کا سانس لیا۔

جنگ سے واپس آنے کے بعد جمیل بھیّا ایک بار پھر بے روزگار ہو گئے۔ انھوں نے نوکری تلاش بھی نہیں، بلکہ وہ سارا

دن مسلم لیگ کے دفتر میں کام کرتے اور اس کے بدلے میں انھیں جو معاوضہ ملتا وہ بڑی چچی کو دے دیتے۔

طویل اور انتھک جدوجہد کے بعد تحریکِ پاکستان رنگ لائی اور ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ ہو گیا۔

آزادی کے فیصلے سے برِصغیر کی ساری قوم متفق نہ تھی کانگریس اور مسلم لیگ کے لیے ملک کا تقسیم ہونا یا نہ ہونا بہت اہمیت رکھتا تھا۔

ملک کی آزادی کی خبر سن کر ''آنگن'' کے کردار بھی ذہنی کش مکش میں مبتلا ہو گئے اور بڑے چچا کے گھر کا آنگن ایک سیاسی اکھاڑہ بن گیا، خاص طور پر بڑے چچا اور جمیل بھیا کے درمیان بالکل ایسے کشیدگی پیدا ہو گئی جیسے ملک کا آزاد ہونا ہندوستان کا سیاسی مسئلہ نہیں، بلکہ ان کا کوئی ذاتی جھگڑا ہے۔

ناول کے کردار ''عالیہ'' کے ذریعے خدیجہ مستور نے ان کرداروں پر طنز کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ...آزادی کے فیصلے کے ساتھ باپ بیٹے ایک دوست کی صورت سے بیزار ہو گئے تھے۔ پاکستان بنے گا یا نہیں بنے گا— اور اس کش مکش کے عالم میں اسے چھمی بری طرح یاد آنے لگی تھی۔ اگر آج وہ بھی اس گھر میں ہوتی تو کیا ہوتا۔ آزادی سے پہلے سب اپنا اپنا سر پھوڑ کر خدا کو پیارے ہو چکے تھے۔☆۲۹۶

بڑی چچی، جمیل بھیا، اماں اور عالیہ آزادی کے تصور ہی سے خوش نظر آ رہے تھے۔ بڑی چچی یہ سوچ کر خوش ہو رہی تھیں کہ آزادی کے بعد بڑے چچا کو سیاسی سرگرمیوں سے بھی نجات مل جائے گی اور وہ اپنے گھر اور کاروبار پر توجہ دیں سکیں گے۔ جس گھر سے خوش حالی آئے گی۔

ایک دن ملک تقسیم ہو گیا۔ تقسیم کے اعلان کے ساتھ ہی ملک میں ہندو مسلم فسادات شدت اختیار کر گئے بالخصوص مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگائی گئی، انھیں قتل کیا گیا، خواتین کی بے حرمتی کی گئی اور آخر میں ان کے گھروں اور دوسری جائیدادوں پر قبضہ کر لیا گیا۔ ملک میں فساد برپا دیکھ کر بڑے چچا کی حالت دیوانوں جیسی ہو گئی۔

> یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ ہندو مسلمان ایک دم ایک دوسرے کے ایسے جانی دشمن کیسے ہو گئے؟ یہ انھیں کس نے سکھایا ہے؟ ان کے دل سے کس نے محبت چھین لی۔☆۲۹۷

اس موقع پر بھی کریمن بوا کو ماضی یاد آیا۔ وہ ماضی جب ہندو، سکھ اور مسلمان ہندوستانی قوم بن کر سوچتے تھے مذہب اور قوم کا فرق کبھی ان کی محبت میں آڑے نہیں آیا تھا۔ وہ سوچتی رہتیں:

> زمانے زمانے کی بات ہے، وہ بھی زمانہ تھا جب ہندو اپنے گاؤں میں مسلمانوں پر آنچ آتے دیکھتے تو سر دھڑ کی بازی لگا دیتے اور مسلمان ہندو کی عزت بچانے کے لیے اپنے جان نچھاور کر

دیتا... پر اب کیا رہ گیا دونوں کے ہاتھوں میں خنجر آ گیا ہے۔☆ ۲۹۸

قیامِ پاکستان کے بعد بھی بڑی چچا ہندوستان ہی کو اپنی ملک سمجھتے رہے۔ یہ صرف ان کی انا کا مسئلہ ہی نہ تھا، بلکہ انھیں اس بات کا بھی یقین تھا کہ بہت جلد ملک کے حالات ٹھیک ہو جائیں گے اور ہندو، مسلمان اور سکھ پھر سے مل جل کر رہنے لگیں گے۔ اس لیے انھوں نے اپنے گھر والوں کو پاکستان ہجرت کرنے سے منع کر دیا، لیکن بڑے چچا اور گھر کے تمام افراد کے منع کرنے کے باوجود امّاں نے پاکستان جانے کا فیصلہ نہ بدلہ، عالیہ کو مجبوراً اپنی ماں کا حکم ماننا پڑا۔

امّاں اور عالیہ کے جانے کا سب کو بہت ملال ہوا جمیل بھیّا اور بڑے چچا میں تو اتنی بھی ہمّت نہ رہی کہ وہ انھیں الوداع کہہ سکتے۔ چچا اس دن صبح صبح ہی گھر سے نکل گئے اور جمیل بھیّا اپنے بستر میں پڑے روتے رہے، لیکن امّاں جذبوں کی قدر کرنے والوں میں سے نہ تھی انھوں نے بڑے چچا اور جمیل بھیّا کے جذبات کی اس شدّت کو ان کی بداخلاقی کہا اور سب کی محبت کر پروا کیے بغیر اپنے سفر پر روانہ ہو گئیں۔

امّاں عالیہ اور اپنے بھائی کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان میں آ گئیں۔ لاہور میں وہ کچھ دن ماموں کے ساتھ رہیں لیکن جلد ہی ماموں نے انھیں الگ کوٹھی کا بندوبست کر دیا۔

امّاں اور ماموں بھی ان لوگوں میں شامل ہو گئے جنھوں نے ہجرت کے بعد دوسروں کی جائیداد پر قبضہ کر کے اپنی حیثیت کو بدل لیا۔

زندگی کی ساری آسائشیں حاصل کر کے امّاں پہلے سے زیادہ مغرور اور خود پسند ہو گئیں۔ وہ بہت جلد بڑے چچا کے گھر کے آنگن اور آنگن میں بیٹھنے والوں کو بھول گئیں۔

امّاں کے برعکس عالیہ پاکستان میں تو آ گئی لیکن وہ بڑے چچا، بڑی چچی، جمیل کریمن بوا، اسرار میاں اور چھمی کسی کو بھی بھول نہ سکی۔ ان سب کی یادیں اسے ہر وقت اداس رکھتیں۔ چناں چہ اس نے خود کو مصروف رکھنے کے لیے دن کے وقت ایک اسکول میں اور شام کا وقت گزارنے کے لیے والٹن کیمپ میں ملازمت کر لی۔

ایک دن اس نے اخبار میں بڑے چچا کے بارے میں پڑھا:

> مشہور مسلمان کانگریسی لیڈر کو کسی شخص نے مار دیا، نہرو کا اظہارِ افسوس، مرحوم کے خاندان کے لیے تین ہزار روپیہ کا عطیہ، ہندو مسلم منافرت کی شدید مذمّت۔☆ ۲۹۹

جمیل بھیّا نے بے روزگار ہونے کے باوجود اور بڑی چچی نے گھر کے مالی حالات خراب ہونے کے باوجود تین ہزار روپیہ واپس کر دیا۔ جب گھر میں فاقے ہونے لگے تو بڑے چچا کے کانگریسی ساتھیوں نے جمیل بھیّا کو اسسٹنٹ جیلر کی نوکری دلا دی۔

اگر چہ چھمی کی شادی جمیل بھیّا کے ساتھ نہیں ہو سکتی تھی لیکن وہ اپنے دل سے جمیل بھیّا کی محبت نہ نکال سکی۔ جب چھمی کے سسرال والوں نے پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا تو چھمی نے جمیل بھیّا سے دور ہونے کے دکھ سے اپنے سسرال والوں سے لڑ جھگڑ کر ہجرت کرنے سے صاف انکار کر دیا، اور اس جھگڑے کا اختتام چھمی کی طلاق پر ہوا۔
طلاق کے بعد چھمی پھر سے بڑے چچا کے گھر آ گئی اور اس طرح اس کا جمیل بھیّا سے قریب رہنے کا مقصد پورا ہو گیا۔ جمیل بھیّا کو بھی عالیہ کو پانے کی کوئی اُمید نہ رہی تھی اور چھمی کے گذشتہ احسانوں کا بدلہ چکانے کا یہ موقع بہترین لگا اور اس نے چھمی سے شادی کر لی۔

پاکستان میں ایک دن اچانک عالیہ کو شکیل ملا جو اب جیب کتروں کے گروہ میں شامل ہو چکا تھا۔ عالیہ نے امّاں کی شدید مخالفت کے باوجود اسے اپنے گھر رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا وہ اسے پڑھا لکھا کر اچھا انسان بنانا چاہتی تھی، لیکن اس کے لیے اچھی تعلیم یا رشتوں کی کوئی اہمیت نہ رہی۔

> ابا کا مر جانا ہی ٹھیک ہوا، انھوں نے کسی کے لیے کچھ نہ کیا، اب میں گھر جا کر کیا کروں، وہ جمیل بھیّا مجھے طعنے دے دے کر زندگی حرام کر دیں گے، میرے لیے تو اب بھی اس گھر میں کچھ نہ ہوگا۔ یہاں کما کھالوں گا۔☆۳۰۰

شکیل نے عالیہ کے خلوص کی قدر نہ کی اور اگلے دن جب عالیہ تیار ہونے کے لیے اپنے کمرے میں گئی تو:

> ...اسے الماری کا تالا کھولنے کی ضرورت نہ پڑی۔ ٹوٹا ہوا تالا چھوتے ہی کھل گیا پرس کھلا پڑا تھا اور اس کے جمع جتھے سے پچاس روپے غائب تھے۔☆۳۰۱

اور شکیل عالیہ اور امّاں کے اٹھنے سے پہلے ہی جا چکا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عالیہ نے بھی سب کو بھول جانے ہی میں عافیت سمجھی۔ چھمی اور جمیل کی شادی کے بعد اسے لاشعوری طور پر جمیل کے کھونے کا دکھ ہوا۔ اب وہ جانتی تھی کہ جمیل اور چھمی کے لیے اس کی کوئی اہمیت نہ رہی، بڑی چچی گھر میں خوش حالی آنے کے بعد اپنی دنیا میں مگن ہو گئیں تھیں، بڑے چچا کے مرنے کے بعد کریمن بوا اسرار میاں کو گھر سے نکال کر بہت خوش تھیں۔ امّاں پاکستان میں آ کر اپنی مالی حیثیت بدلنے پر بہت خوش تھیں خوب صورت گھر، پُر آسائش زندگی اور نوکروں کی ہر وقت موجودگی نے امّاں کے سارے دکھ دور کر دیے تھے۔ طویل سوچ بچار کے بعد عالیہ اس نتیجے پر پہنچی:

> ...اب یہ خط و کتابت کا سلسلہ بھی ختم ہو جانا چاہیے۔ کیا فائدہ کہ مسلسل اذیّت سہتی رہے۔ یادیں سب سے زیادہ ظالم ہوتی ہیں۔☆۳۰۲

عالیہ ناول کا مرکزی کردار ہے۔ وہ محبت اور امن کی خواہاں ہے۔ دوسروں کو تکلیف میں دیکھ کر وہ رنجیدہ ہو جاتی ہے۔

وہ ظلم کرنے والوں کے خلاف احتجاج کرنا چاہتی ہے، لیکن خود اعتمادی اور جرأت کی کمی کی وجہ سے وہ ایسا کر نہیں پاتی۔ بچپن میں ابّا اور صفدر کے ساتھ امّاں کا تحقیر آمیز رویہ دیکھ کر وہ امّاں کو روکنا چاہتی ہے لیکن اسے خوف رہتا ہے کہ اس کے احتجاج کرنے سے کہیں گھر میں کوئی اور فساد کھڑا نہ ہو جائے۔ اسی طرح بڑے چچا کے گھر میں جب اسرار میاں کو وہ سب کے ہاتھوں ذلیل ہوتا دیکھتی تو وہ سوائے افسوس کرنے کے کچھ اور نہیں کر سکتی۔ اس کے دل میں یہ حسرت ہی رہی کہ وہ اسرار میاں کو بھی اپنا چچا کہے اور اس کی اس طرح عزت کرے جس طرح وہ بڑے چچا کی کرتی ہے، لیکن یہاں بھی پورے گھر کی مخالفت کا ڈر اس کی خواہش کی تکمیل میں رکاوٹ بن گیا۔

جمیل بھیّا سے محبت کرنے کے باوجود وہ اس پر اعتبار نہ کر سکی، اور نہ ہی اس پر اپنی محبت کو ظاہر ہونے دیا۔ جمیل بھیّا کی مسلم لیگ میں شمولیت کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ وہ ایک نہ ایک دن بڑے چچا اور ابّا کی طرح جیل میں جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ کسی دن جیل سے اس کی لاش آئے اور وہ بھی امّاں کی طرح بیوہ ہو جائے گی۔

جمیل بھیّا کی سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ ان کی محبت کے بدلتے مراکز، سب ایسے پہلو ہیں جس نے عالیہ کی شخصیت کو توڑ پھوڑ دیا اور وہ ایک الجھی اور سہمی ہوئی لڑکی بن گئی۔ خود کو مصروف رکھنے کے باوجود عالیہ کی زندگی کا خلا پورا نہ ہوا۔ امّاں کے پاس ہونے کے باوجود خود کو تنہا محسوس کرتی، کیوں کہ امّاں کے خیالات اس سے بہت مختلف تھے وہ امّاں سے کم کم بولنے کی کوشش کرتی۔

وہ محبت کرنا اور کروانا چاہتی تھی اس کے لیے وہ دولت کا سہارا نہیں لینا چاہتی تھی جب اسے والٹن کیمپ کے ڈاکٹر نے شادی کے لیے رضامند کرنے کے لیے:

> ...زمین مکان سب اس کے نام لکھنے کے لیے کہا تھا ساری زندگی اس کے قدموں میں گزارنے کا وعدہ کیا تھا۔☆۳۰۳

تو بھی وہ اس کی بات نہ مان سکی۔ اس کے لیے مال و دولت کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے اور نہ وہ اس کے بدلے کو اپنا سکتی تھی۔

پاکستان میں آ کر عالیہ کی ایک دن اچانک صفدر سے ملاقات ہوئی جو ابّا کی زندگی ہی میں ان کے گھر سے چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد تہمینہ اور ابّا کی موت واقع ہوئی لیکن صفدر لوٹ کر نہ آیا۔ ماضی کے حوالے سے عالیہ اور صفدر نے تہمینہ کو بہت یاد کیا پھر اچانک صفدر کو عالیہ میں تہمینہ کی شبیہ نظر آئی اور دونوں نے چند ہی لمحوں میں شادی کا فیصلہ کر لیا۔ امّاں نے رکاوٹ بننے کی کوشش کی تو عالیہ نے ان کی پروا نہ کی، لیکن صفدر نے امّاں کو راضی کرنے کے لیے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا:

> ''...میں نے اپنی زندگی کی ڈگر کو بدل دیا، دنیا فنا ہوتی ہے تو ہو جائے مجھے کوئی مطلب نہیں، میں

اب صرف دولت کماؤں گا، عیش کروں گا، میں اب کار، کوٹھی کے خواب پورے کروں گا۔ میں اب جیل نہیں جا سکتا۔'' ☆۳۰۴

وہ صفدر کی بات بھی نہ مان سکی۔ کیوں کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ صفدر عالیہ کی وجہ سے دکھی لوگوں کی مدد کرنا یا ان کے لیے پریشان ہونا چھوڑ دے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہ تھی جو اپنی خوشی کے لیے دوسروں کا نقصان کر دیتے ہیں۔ اسے ایسا محسوس ہوا:

...وہ بہت دور سے ریتیلے میدانوں میں چل کر آ رہی ہے تھکن سے نڈھال جنم جنم کی پیاسی، ارے کوئی تو اس کے حلق میں ایک قطرہ پانی کا ٹپکا دے۔☆ ۳۰۵

خدیجہ مستور نے اس ناول میں ملک کی سیاست میں حصّہ لینے والوں کی گھریلوں زندگی میں پیش آنے والی منفی تبدیلیوں، بیوی، بچوں، یا ماں باپ اور بہن بھائیوں سے ان دوری کو بیان کیا ہے، اور وہ اپنے باپ، بھائی یا شوہر کی محبت اور شفقت سے محروم رہ جانے کی وجہ سے عدم تحفظ کا شکار ہو جاتے ہیں۔

جیسا کہ ناول میں امّاں اور ابّا کے سیاسی جھگڑوں کی وجہ سے عالیہ کی شخصیت بکھر گئی۔ شکیل بڑے چچا کی وجہ سے جیب کترا بن گیا اور پھر ایک دن گھر سے بھی غائب ہو گیا، جمیل بھیّا کو جب اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے چھمی سے پیسے لینے پڑے تو اس نے محض چھمی کی خوشی کے لیے اس سے محبت کا ڈھونگ رچایا۔

اور یوں جمیل اور شکیل دونوں بھائی اپنے والد کی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے اور اخلاقی پستیوں کا شکار ہو گئے۔

آنگن کے کرداروں کا وجود سیاسی وابستگی سے ریزہ ریزہ ہو کر رہ گیا ہے۔ ایک طرف یہ پرخطر خارجی حالات ہیں جنھوں نے انھیں مسائل کی بھٹی میں جھونک دیا ہے۔ دوسری جانب ان کا داخلی انتشار و کرب ہے جس نے انھیں یاسیت اور محرومی کے احساس سے دوچار کر رکھا ہے۔☆۳۰۶

اس ناول پر ڈاکٹر شمع افروز زیدی نے اس طرح تبصرہ کیا ہے:

اس ناول میں انھوں نے زوال آمادہ تہذیب، انحطاط پذیر معاشرہ اور بیسویں صدی کے مشترکہ ہندوستان کے اقتصادی نظام اور تہذیبی بساط پر ہندوستانی مسلمانوں کے متوسّط طبقے کی اہمیت کی ترجمانی کی ہے یا بازیافت کی ہے۔ اس طرح خدیجہ مستور کا ''آنگن'' ہندوستان و پاکستان کے ہر آنگن کی علامت بن گیا ہے۔☆ ۳۰۷

آنگن دراصل تقسیم سے قبل مسلم ہند کے ذہنی اور فکری تضادات کا عکاس ہے۔ تو دوسری طرف تقسیم کے نتیجے میں تقسیم ہو جانے والے خاندانوں اور ان کی ذہنی ناآسودگیوں اور محرومیوں کا آئینہ دار ہے۔ یہ صرف بڑے چچا کے گھر کا قصّہ نہیں ہر گھر

کی داستان ہے تقسیم کے نتیجے میں:

ایسے ویسے کیسے کیسے ہو گئے!

کیسے کیسے ایسے ویسے ہو گئے!

جمیل اور شکیل کو ایسی ہی صورتِ حال سے واسطہ رہا۔ عالیہ بھی تقسیم کی ماری ہے اور چھمی کو بالآخر جو خوش بختی میسّر آئی وہ بھی تقسیم کے نتیجے میں تھی۔

تقسیم نے خاندان ہی کے حصے بخرے نہیں کر دیے اخلاقی اقدار کو بھی توڑ دیا۔ خاندانی وجاہت اور نسب وانساب قصے کہانیوں کی باتیں ہو کر رہ گئیں اور زندگی کی تعمیر و تشکیل اب تقسیم کے ملبے سے کی جانے لگی۔

اس صورتِ حال کو خدیجہ نے بڑے فن کارانہ رچاؤ اور مہارت سے پیش کیا ہے۔ ان کا انداز بیش کشی برا معروضی ہے اور ناول میں کہیں بھی اس نے ناول نگار کو دخیل نہیں ہونے دیا۔ جو کچھ واقع ہوا، ناول کے کرداروں کے ذریعے ہوا ہے اور خدیجہ کا حل غیر جانب داری سے صورتِ حال کو اسی طرح پیش کیا ہے جیسی وہ نظر آ رہی تھی۔

انھوں نے نہ ناصحانہ انداز اختیار کیا، نہ ترقّی پسندوں کی طرح اپنا فلسفہ مسلّط کرنے کی کوشش کی۔ وہ تماش بین رہی ہیں اور تماشا ان کے آگے ہوتا رہا ہے۔

❁ ❁ ❁

حوالہ جات:

☆۱　''غدار''، کرشن چندر، نیا ادارہ، لاہور، بارِ دوم ۱۹۷۹ء، ص۱۳۴

☆۲　''غدار''، محولۂ بالا، ص۱۸

☆۳　''غدار''، محولۂ بالا، ص۱۴

☆۴　''غدار''، محولۂ بالا، ص۳۴

☆۵　''غدار''، محولۂ بالا، ص۴۸

☆۶　''غدار''، محولۂ بالا، ص۴۹

☆۷　''غدار''، محولۂ بالا، ص۵۱

☆۸　''غدار''، محولۂ بالا، ص۵۲

☆۹　''غدار''، محولۂ بالا، ص۵۶

☆۱۰　''غدار''، محولۂ بالا، ص۷۹

☆۱۱　''غدار''، محولۂ بالا، ص۶۹

☆۱۲　''غدار''، محولۂ بالا، ص۱۰۵

☆۱۳　''غدار''، محولۂ بالا، ص۱۰۷

☆۱۴　''غدار''، محولۂ بالا، ص۱۰۶-۷

☆۱۵　''غدار''، محولۂ بالا، ص۱۳۲

☆۱۶　''غدار''، محولۂ بالا، ص۱۳۴-۳۵

☆۱۷　''غدار''، محولۂ بالا، ص۱۴۵

☆۱۸　''غدار''، محولۂ بالا، ص۱۴۸

☆۱۹　''غدار''، محولۂ بالا، ص۱۴۶-۴۷

☆۲۰　''اُردو ناول بیسویں صدی میں''، ڈاکٹر عبدالسلام، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، اکتوبر ۱۹۷۳ء، ص۳۲۰

☆۲۱　''غدار، ایک تنقیدی جائزہ''، سنتو کھ سری، مشمولہ: ماہ نامہ ''شاعر'' بمبئی، کرشن چندر نمبر، ۱۹۶۷ء، ص۳۵۳

☆۲۲　''میرے بھی صنم خانے''، قرۃ العین حیدر، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص۱۲۲

☆۲۳ ''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۲۴۹

☆۲۴ ''میرے بھی صنم خانے''،احمد ندیم قاسمی،مشمولہ:''قرۃ العین حیدر،ایک مطالعہ''،مرتبہ:ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۱۹۹۲ء،ص۱۰۷

☆۲۵ ''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۴۶

☆۲۶ ''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۲۴۶

☆۲۷ ''میرے بھی صنم خانے''،احمد ندیم قاسمی،مشمولہ:''قرۃ العین حیدر،ایک مطالعہ''،محولہ بالا،ص۱۰۷

☆۲۸ ''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۲۵۰

☆۲۹ ''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۳۶

☆۳۰ ''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۳۷

☆۳۱ ''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۱۲۱

☆۳۲ ''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۲۴۶

☆۳۳ ''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۲۷۲

☆۳۴ ''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۳۷

☆۳۵ ''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۳۰۰

☆۳۶ ''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۳۰۱

☆۳۷ ''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۳۸-۳۷

☆۳۸ ''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۴۱-۲۴۰

☆۳۹ ''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۲۵۲

☆۴۰ ''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۲۰

☆۴۱ ''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۲۶۵

☆۴۲ ''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۲۶۶

☆۴۳ ''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۹۵-۲۹۴

☆۴۴ ''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۳۱۲

☆۴۵ ''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۴۶

☆۴۶　''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۴۶

☆۴۷　''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۴۷-۲۷۲

☆۴۸　''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۲۷۳

☆۴۹　''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۲۵۲

☆۵۰　''اُردوناول پر تقسیمِ ہند کے المیے کے اثرات''،ڈاکٹرمحمدنسیم،اُجالا آفسیٹ،پٹنہ،۲۰۰۲ء،ص۹۲

☆۵۱　''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۲۵۲

☆۵۲　''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۲۵۸

☆۵۳　''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۲۵۸

☆۵۴　''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۲۷۱

☆۵۵　''میرے بھی صنم خانے''،محولہ بالا،ص۴۷-۲۴۶

☆۵۶　''اُردو میں معیاری ناول کا مسئلہ''،ڈاکٹرممتازاحمدخاں،مشمولہ: ماہ نامہ''قومی زبان'' کراچی،جولائی ۱۹۹۵ء،ص۳۴

☆۵۷　''اردوناول اور تقسیمِ ہند''،عقیل احمد،موڈرن پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی،طبعِ اوّل ۱۹۸۷ء،ص۴۶

☆۵۸　''اُردوادب کی اہم خواتین ناول نگار''،نیلم فرزانہ،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،۱۹۹۲ء،ص۱۳۰

☆۵۹　''اُردوناول کے پچیس سال''،بیگم افضل کاظمی،مشمولہ:ماہ نامہ''افکار'' کراچی،جوبلی نمبر،ص۱۵۷

☆۶۰　''اُردوناول آزادی کے بعد''،ڈاکٹراسلم آزاد،سیمانت پرکاشن،نئی دہلی،۱۹۹۰ء،ص۱۴۷

☆۶۱　''آگ کادریا''،قرۃالعین حیدر،مکتبۂ اُردوادب،لاہور،سنہ ندارد،ص۳۳۷

☆۶۲　''آگ کادریا''،محولہ بالا،ص۴۶۶

☆۶۳　''اُردوناول آزادی کے بعد''،محولہ بالا،ص۱۵۵

☆۶۴　''آگ کادریا''،محولہ بالا،ص۳۷۵

☆۶۵　''آگ کادریا''،محولہ بالا،ص۳۷۹

☆۶۶　''آگ کادریا''،محولہ بالا،ص۶۵۲

☆۶۷　''آگ کادریا''،محولہ بالا،ص۲۴۵

☆۶۸　''آگ کادریا''،محولہ بالا،ص۷۵۷

☆۶۹　''آگ کادریا''،محولہ بالا،ص۷۵۵

☆۷۰ ''آزادی کے بعد اُردو ناول''، ڈاکٹر ممتاز احمد خان، انجمنِ ترقیٔ اُردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص۹۰

☆۷۱ ''آگ کا دریا''، محولہٗ بالا، ص۳۵

☆۷۲ ''آگ کا دریا''، محولہٗ بالا، ص۱۵

☆۷۳ ''آگ کا دریا''، محولہٗ بالا، ص۸۸

☆۷۴ ''آگ کا دریا''، محولہٗ بالا، ص۱۱۸

☆۷۵ ''آگ کا دریا''، محولہٗ بالا، ص۲۸-۱۲۷

☆۷۶ ''آگ کا دریا''، محولہٗ بالا، ص۲۵۲

☆۷۷ ''آگ کا دریا''، محولہٗ بالا، ص۳۹۴

☆۷۸ ''آگ کا دریا''، محولہٗ بالا، ص۴۲۷

☆۷۹ ''آگ کا دریا''، محولہٗ بالا، ص۴۴۴

☆۸۰ ''آگ کا دریا''، محولہٗ بالا، ص۴۵۵

☆۸۱ ''آگ کا دریا''، محولہٗ بالا، ص۸۱۷

☆۸۲ ''اُردو ناول کے پچیس سال''، بیگم افضل کاظمی، مشمولہ: ماہ نامہ ''افکار'' کراچی، جوبلی نمبر، ص۱۵۷

☆۸۳ ''آگ کا دریا''، محولہٗ بالا، ص۶۹-۱۶۸

☆۸۴ ''اُردو ناول آزادی کے بعد''، محولہٗ بالا، ص۱۴۷

☆۸۵ ''آگ کا دریا''، محولہٗ بالا، ص۲۵۸

☆۸۶ ''آگ کا دریا''، محولہٗ بالا، ص۳۴۱

☆۸۷ ''آگ کا دریا''، محولہٗ بالا، ص۴۰-۳۳۹

☆۸۸ ''آگ کا دریا''، محولہٗ بالا، ص۴۱۶

☆۸۹ ''آگ کا دریا''، محولہٗ بالا، ص۴۲۶

☆۹۰ ''آگ کا دریا''، محولہٗ بالا، ص۴۵۷

☆۹۱ ''آگ کا دریا''، محولہٗ بالا، ص۴۹۳

☆۹۲ ''آگ کا دریا''، محولہٗ بالا، ص۵۱۲

☆۹۳ ''آگ کا دریا''، محولہٗ بالا، ص۵۲-۵۱۷

☆۹۴ ''آ گ کا دریا''،محولۂ بالا،ص۱۹۲

☆۹۵ ''آ گ کا دریا''،محولۂ بالا،ص۱۹۷

☆۹۶ ''آ گ کا دریا''،محولۂ بالا،ص۲۰۱

☆۹۷ ''آ گ کا دریا''،محولۂ بالا،ص۲۰۲

☆۹۸ ''آ گ کا دریا''،محولۂ بالا،ص۴۵۵

☆۹۹ ''آ گ کا دریا''،محولۂ بالا،ص۶۷۹

☆۱۰۰ ''آ گ کا دریا''،محولۂ بالا،ص۶۸۰

☆۱۰۱ ''آ گ کا دریا''،محولۂ بالا،ص۶۸۱

☆۱۰۲ ''آ گ کا دریا''،محولۂ بالا،ص۶۸۴

☆۱۰۳ ''آ گ کا دریا''،محولۂ بالا،ص۷۴۲

☆۱۰۴ ''آ گ کا دریا''،محولۂ بالا،ص۷۴۲

☆۱۰۵ ''آ گ کا دریا''،محولۂ بالا،ص۷۶۳

☆۱۰۶ ''آ گ کا دریا''،محولۂ بالا،ص۷۵۱

☆۱۰۷ ''آ گ کا دریا''،محولۂ بالا،ص۷۷۶

☆۱۰۸ ''آ گ کا دریا''،محولۂ بالا،ص۷۷۶

☆۱۰۹ ''آ گ کا دریا''،محولۂ بالا،ص۷۰۱

☆۱۱۰ ''آ گ کا دریا''،محولۂ بالا،ص۴-۲۰۳

☆۱۱۱ ''آ گ کا دریا''،محولۂ بالا،ص۲۱۵

☆۱۱۲ ''آ گ کا دریا''،محولۂ بالا،ص۱۹-۲۱۸

☆۱۱۳ ''آ گ کا دریا''،محولۂ بالا،ص۹۵-۱۹۴

☆۱۱۴ ''آ گ کا دریا''،محولۂ بالا،ص۲۳-۴۲۲

☆۱۱۵ ''آ گ کا دریا''،محولۂ بالا،ص۱۹۴

☆۱۱۶ ''آ گ کا دریا''،محولۂ بالا،ص۱۹۵

☆۱۱۷ ''آ گ کا دریا''،محولۂ بالا،ص۶۸۷

☆۱۱۸ ''آ گ کا دریا''، محولہٴ بالا، ص۶۷۹

☆۱۱۹ ''آ گ کا دریا''، محولہٴ بالا، ص۶۸۲

☆۱۲۰ ''آ گ کا دریا''، محولہٴ بالا، ص۶۸۷

☆۱۲۱ ''آ گ کا دریا''، محولہٴ بالا، ص۶۸۸

☆۱۲۲ ''آ گ کا دریا''، محولہٴ بالا، ص۶۹۲

☆۱۲۳ ''قرۃ العین حیدر کا فن''، عبدالمغنی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص۷۵

☆۱۲۴ ''آ گ کا دریا''، محولہٴ بالا، ص۷۸۴

☆۱۲۵ ''آ گ کا دریا''، محولہٴ بالا، ص۷۸۴

☆۱۲۶ ''اُداس نسلیں''، عبداللہ حسین، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص۲۳۲

☆۱۲۷ ''اُداس نسلیں''، محولہٴ بالا، ص۷۵

☆۱۲۸ ''اُداس نسلیں، ایک جائزہ''، ڈاکٹر عبدالسلام، مشمولہ: سہ ماہی ''سیپ'' کراچی، دسمبر ۱۹۸۳ء، ص۹۵

☆۱۲۹ ''اُردو ناول آزادی کے بعد''، محولہٴ بالا، ص۲۴۱

☆۱۳۰ ''اُداس نسلیں''، محولہٴ بالا، ص۵۷

☆۱۳۱ ''اُداس نسلیں''، محولہٴ بالا، ص۵۰

☆۱۳۲ ''اُداس نسلیں''، محولہٴ بالا، ص۴۹

☆۱۳۳ ''اُداس نسلیں''، محولہٴ بالا، ص۲۴

☆۱۳۴ ''اُداس نسلیں''، محولہٴ بالا، ص۲۵

☆۱۳۵ ''اُداس نسلیں''، محولہٴ بالا، ص۴۱۳

☆۱۳۶ ''اُداس نسلیں''، محولہٴ بالا، ص۴۱۳

☆۱۳۷ ''اُداس نسلیں''، محولہٴ بالا، ص۱۶۰

☆۱۳۸ ''تقسیم کے بعد اُردو ناول''، ڈاکٹر عبدالسلام، مشمولہ: ''اُردو نثر کا فنی ارتقا''، مرتبہ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص۸۶

☆۱۳۹ ''اُداس نسلیں، ایک جائزہ''، محولہٴ بالا، ص۱۱۴

☆۱۴۰ ''اُداس نسلیں، ایک جائزہ''، محولہٴ بالا، ص۱۱۴

☆۱۴۱ ''اُردو ناول آزادی کے بعد''بحولۂ بالا،ص ۲۴۱

☆۱۴۲ ''اُداس نسلیں،ایک جائزہ''بحولۂ بالا،ص ۸۵

☆۱۴۳ ''اُداس نسلیں،ایک جائزہ''بحولۂ بالا،ص ۴۹۴

☆۱۴۴ ''اُداس نسلیں،ایک جائزہ''بحولۂ بالا،۲۹۴

☆۱۴۵ ''اُداس نسلیں،ایک جائزہ''بحولۂ بالا،۵۲۹

☆۱۴۶ ''اُداس نسلیں،ایک جائزہ''بحولۂ بالا،۲۱۷

☆۱۴۷ ''اُداس نسلیں،ایک جائزہ''بحولۂ بالا،۱۲

☆۱۴۸ ''اُداس نسلیں،ایک جائزہ''بحولۂ بالا،۱۱۷

☆۱۴۹ ''اُداس نسلیں،ایک جائزہ''بحولۂ بالا،۱۳۲

☆۱۵۰ ''اُداس نسلیں،ایک جائزہ''بحولۂ بالا،۱۴۷

☆۱۵۱ ''اُداس نسلیں،ایک جائزہ''بحولۂ بالا،۴۹۲

☆۱۵۲ ''اُداس نسلیں،ایک جائزہ''بحولۂ بالا،۵۰۵

☆۱۵۳ ''اُداس نسلیں،ایک جائزہ''بحولۂ بالا،۵۲۹

☆۱۵۴ ''اُداس نسلیں،ایک جائزہ''بحولۂ بالا،۵

☆۱۵۵ ''اُداس نسلیں،ایک جائزہ''بحولۂ بالا،۱۲۷

☆۱۵۶ ''اُداس نسلیں،ایک جائزہ''بحولۂ بالا،۲۸۹

☆۱۵۷ ''اُداس نسلیں،ایک جائزہ''بحولۂ بالا،۴۹۶

☆۱۵۸ ''اُداس نسلیں،ایک جائزہ''بحولۂ بالا،۴۹۰

☆۱۵۹ ''اُداس نسلیں،ایک جائزہ''بحولۂ بالا،۲۶۰

☆۱۶۰ ''اُداس نسلیں،ایک جائزہ''بحولۂ بالا،۶۶-۲۶۵

☆۱۶۱ ''اُداس نسلیں،ایک جائزہ''بحولۂ بالا،۲۶۶

☆۱۶۲ ''اُداس نسلیں،ایک جائزہ''بحولۂ بالا،۶۷-۲۶۶

☆۱۶۳ ''اُداس نسلیں،ایک جائزہ''بحولۂ بالا،۲۶۶

☆۱۶۴ ''اُداس نسلیں،ایک جائزہ''بحولۂ بالا،۲۶۷

☆۱۶۵ ''اُداس نسلیں، ایک جائزہ''، محولۂ بالا، ۳۱۸
☆۱۶۶ ''اُداس نسلیں، ایک جائزہ''، محولۂ بالا، ۳۱۹
☆۱۶۷ ''اُداس نسلیں، ایک جائزہ''، محولۂ بالا، ۳۱۹
☆۱۶۸ ''اُداس نسلیں، ایک جائزہ''، محولۂ بالا، ۳۲۰
☆۱۶۹ ''اُداس نسلیں، ایک جائزہ''، محولۂ بالا، ۴۴۹
☆۱۷۰ ''اُداس نسلیں، ایک جائزہ''، محولۂ بالا، ۲۶-۵۲۵
☆۱۷۱ ''اُداس نسلیں، ایک جائزہ''، محولۂ بالا، ۲۳۱
☆۱۷۲ ''اُداس نسلیں، ایک جائزہ''، محولۂ بالا، ۲۵۳
☆۱۷۳ ''اُداس نسلیں، ایک جائزہ''، محولۂ بالا، ۲۶۶
☆۱۷۴ ''اُداس نسلیں، ایک جائزہ''، محولۂ بالا، ۲۹۳
☆۱۷۵ ''اُداس نسلیں، ایک جائزہ''، محولۂ بالا، ۲۹۴
☆۱۷۶ ''اُداس نسلیں، ایک جائزہ''، محولۂ بالا، ۲۹۳
☆۱۷۷ ''اُداس نسلیں، ایک جائزہ''، محولۂ بالا، ۳۰۳
☆۱۷۸ ''اُداس نسلیں، ایک جائزہ''، محولۂ بالا، ۳۰۴
☆۱۷۹ ''اُداس نسلیں، ایک جائزہ''، محولۂ بالا، ۳۱۸
☆۱۸۰ ''اُداس نسلیں، ایک جائزہ''، محولۂ بالا، ۵۵۴
☆۱۸۱ ''اُداس نسلیں، ایک جائزہ''، محولۂ بالا، ۵۵۵
☆۱۸۲ ''اُداس نسلیں، ایک جائزہ''، محولۂ بالا، ۵۳-۷
☆۱۸۳ ''اُداس نسلیں، ایک جائزہ''، محولۂ بالا، ۳۵-۴۳۴
☆۱۸۴ ''اُداس نسلیں، ایک جائزہ''، محولۂ بالا، ۵۲۶
☆۱۸۵ ''اُداس نسلیں، ایک جائزہ''، محولۂ بالا، ۴۹۵
☆۱۸۶ ''اُداس نسلیں، ایک جائزہ''، محولۂ بالا، ۴۹۵
☆۱۸۷ ''اُداس نسلیں، ایک جائزہ''، محولۂ بالا، ۴۹۵
☆۱۸۸ ''اُداس نسلیں، ایک جائزہ''، محولۂ بالا، ۵۴۰

☆۱۸۹ ''اُداس نسلیں، ایک جائزہ''، محولہ بالا، ۷-۸

☆۱۹۰ ''اُداس نسلیں، ایک جائزہ''، محولہ بالا، ۲۱۷

☆۱۹۱ ''عصمت چغتائی شخصیت اور فن''، ایم سلطانہ بخش، ورڈ وژن پبلشرز، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء، ص ۵۱۱

☆۱۹۲ ''کلّیاتِ عصمت چغتائی''، تحقیق و ترتیب: آصف نواز: مکتبۂ شعر و ادب، لاہور، سنہ ندارد، ص ۶۴۵

☆۱۹۳ ''کلّیاتِ عصمت چغتائی''، محولہ بالا، ص ۶۴۸

☆۱۹۴ ''کلّیاتِ عصمت چغتائی''، محولہ بالا، ص ۶۲۲

☆۱۹۵ ''کلّیاتِ عصمت چغتائی''، محولہ بالا، ص ۲۲۶

☆۱۹۶ ''کلّیاتِ عصمت چغتائی''، محولہ بالا، ص ۶۵-۵۶۴

☆۱۹۷ ''کلّیاتِ عصمت چغتائی''، محولہ بالا، ص ۵۶۸

☆۱۹۸ ''کلّیاتِ عصمت چغتائی''، محولہ بالا، ص ۸۲-۲۸۱

☆۱۹۹ ''کلّیاتِ عصمت چغتائی''، محولہ بالا، ص ۵۸۲

☆۲۰۰ ''کلّیاتِ عصمت چغتائی''، محولہ بالا، ص ۵۸۳

☆۲۰۱ ''کلّیاتِ عصمت چغتائی''، محولہ بالا، ص ۶۰۹

☆۲۰۲ ''کلّیاتِ عصمت چغتائی''، محولہ بالا، ص ۶۳۲

☆۲۰۳ ''کلّیاتِ عصمت چغتائی''، محولہ بالا، ص ۶۳۳

☆۲۰۴ ''کلّیاتِ عصمت چغتائی''، محولہ بالا، ص ۶۸۱

☆۲۰۵ ''کلّیاتِ عصمت چغتائی''، محولہ بالا، ص ۶۷۰

☆۲۰۶ ''کلّیاتِ عصمت چغتائی''، محولہ بالا، ص ۶۸۱

☆۲۰۷ ''کلّیاتِ عصمت چغتائی''، محولہ بالا، ص ۶۰۸

☆۲۰۸ ''کلّیاتِ عصمت چغتائی''، محولہ بالا، ص ۶۰۸

☆۲۰۹ ''اُردو ناول کی تنقید و تاریخ''، سہیل بخاری، مکتبۂ میری لائبریری، بارِ اوّل ۱۹۶۶ء، ص ۶۲۱

☆۲۱۰ ''کلّیاتِ عصمت چغتائی''، محولہ بالا، ص ۶۴۶

☆۲۱۱ ''کلّیاتِ عصمت چغتائی''، محولہ بالا، ص ۶۴۷

☆۲۱۲ ''کلّیاتِ عصمت چغتائی''، محولہ بالا، ص ۶۳۷

☆۲۱۳　''کالے کوس''، بلونت سنگھ، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص۳۳

☆۲۱۴　''کالے کوس''، محولۂ بالا، ص۹۵

☆۲۱۵　''کالے کوس''، محولۂ بالا، ص۹۵

☆۲۱۶　''کالے کوس''، محولۂ بالا، ص۱۳۱

☆۲۱۷　''کالے کوس''، محولۂ بالا، ص۱۶۴

☆۲۱۸　''کالے کوس''، محولۂ بالا، ص۱۶۵

☆۲۱۹　''کالے کوس''، محولۂ بالا، ص۶۶-۱۶۵

☆۲۲۰　''کالے کوس''، محولۂ بالا، ص۱۶۹

☆۲۲۱　''کالے کوس''، محولۂ بالا، ص۱۹۱

☆۲۲۲　''کالے کوس''، محولۂ بالا، ص۱۹۱

☆۲۲۳　''کالے کوس''، محولۂ بالا، ص۱۸۱

☆۲۲۴　''کالے کوس''، محولۂ بالا، ص۱۸۱

☆۲۲۵　''کالے کوس''، محولۂ بالا، ص۱۹۰

☆۲۲۶　''کالے کوس''، محولۂ بالا، ص۱۹۰

☆۲۲۷　''کالے کوس''، محولۂ بالا، ص۲۰۲

☆۲۲۸　''کالے کوس''، محولۂ بالا، ص۲۰۵

☆۲۲۹　''کالے کوس''، محولۂ بالا، ص۲۱۶

☆۲۳۰　''کالے کوس''، محولۂ بالا، ص۲۲۱

☆۲۳۱　''کالے کوس''، محولۂ بالا، ص۲۲۱

☆۲۳۲　''کالے کوس''، محولۂ بالا، ص۲۲۲

☆۲۳۳　''کالے کوس''، محولۂ بالا، ص۲۲۵

☆۲۳۴　''کالے کوس''، محولۂ بالا، ص۲۲۴

☆۲۳۵　''کالے کوس''، محولۂ بالا، ص۲۳۲

☆۲۳۶　''کالے کوس''، محولۂ بالا، ص۲۳۵

☆۲۳۷ ''کالے کوس''،محولہ بالا،ص ۳۸-۲۳۷

☆۲۳۸ ''اُردو ناول آزادی کے بعد''،محولہ بالا،ص ۱۰۷

☆۲۳۹ ''اور انسان مر گیا''،رامانند ساگر،مکتبہ شعر و ادب،لاہور،سنہ ندارد،ص ۲۱۸

☆۲۴۰ ''اور انسان مر گیا''،محولہ بالا،ص ۲۴

☆۲۴۱ ''اور انسان مر گیا''،محولہ بالا،ص ۱۶

☆۲۴۲ ''اور انسان مر گیا''،محولہ بالا،ص ۱۷

☆۲۴۳ ''اور انسان مر گیا''،محولہ بالا،ص ۲۵

☆۲۴۴ ''اور انسان مر گیا''،محولہ بالا،ص ۳۵

☆۲۴۵ ''اور انسان مر گیا''،محولہ بالا،ص ۳۸

☆۲۴۶ ''اور انسان مر گیا''،محولہ بالا،ص ۴۴

☆۲۴۷ ''اور انسان مر گیا''،محولہ بالا،ص ۴۱

☆۲۴۸ ''اور انسان مر گیا''،محولہ بالا،ص ۴۵

☆۲۴۹ ''اور انسان مر گیا''،محولہ بالا،ص ۵۲

☆۲۵۰ ''اور انسان مر گیا''،محولہ بالا،ص ۶۶

☆۲۵۱ ''اور انسان مر گیا''،محولہ بالا،ص ۶۹

☆۲۵۲ ''اور انسان مر گیا''،محولہ بالا،ص ۷۶-۷۵

☆۲۵۳ ''اور انسان مر گیا''،محولہ بالا،ص ۹۰

☆۲۵۴ ''اور انسان مر گیا''،محولہ بالا،ص ۱۰۱

☆۲۵۵ ''اور انسان مر گیا''،محولہ بالا،ص ۱۰۱

☆۲۵۶ ''اور انسان مر گیا''،محولہ بالا،ص ۱۱۵

☆۲۵۷ ''اور انسان مر گیا''،محولہ بالا،ص ۱۱۷

☆۲۵۸ ''اور انسان مر گیا''،محولہ بالا،ص ۱۱۶

☆۲۵۹ ''اور انسان مر گیا''،محولہ بالا،ص ۱۱۷

☆۲۶۰ ''اور انسان مر گیا''،محولہ بالا،ص ۱۸-۲۱۷

☆۲۶۱ ''اور انسان مر گیا''،محولۂ بالا،ص۱۴۹

☆۲۶۲ ''اور انسان مر گیا''،محولۂ بالا،ص۱۵۳

☆۲۶۳ ''اور انسان مر گیا''،محولۂ بالا،ص۱۶۶

☆۲۶۴ ''اور انسان مر گیا''،محولۂ بالا،ص۱۷۱

☆۲۶۵ ''اور انسان مر گیا''،محولۂ بالا،ص۱۷۳

☆۲۶۶ ''اور انسان مر گیا''،محولۂ بالا،ص۱۷۱

☆۲۶۷ ''اور انسان مر گیا''،محولۂ بالا،ص۶۵

☆۲۶۸ ''اور انسان مر گیا''،محولۂ بالا،ص۶۵

☆۲۶۹ ''اور انسان مر گیا''،محولۂ بالا،ص۱۲۷

☆۲۷۰ ''اور انسان مر گیا''،محولۂ بالا،ص۱۲۷

☆۲۷۱ ''اور انسان مر گیا''،محولۂ بالا،ص۱۰۱

☆۲۷۲ ''اور انسان مر گیا''،محولۂ بالا،ص۱۷۱

☆۲۷۳ ''اور انسان مر گیا''،خواجہ احمد عبّاس،مشمولہ:''اور انسان مر گیا''،محولۂ بالا،ص۶

☆۲۷۴ ''آنگن'' کا ایک کردار اسرار میاں''،ڈاکٹر ممتاز احمد خاں،مشمولہ:ماہ نامہ''قومی زبان''کراچی،جنوری ۱۹۹۸ء،ص۳۹

☆۲۷۵ ''اُردو ناول میں طنز و مزاح''،شمع افروز زیدی،پروگریسو بکس،لاہور،۱۹۸۸ء،ص۳۱۱

☆۲۷۶ ''آنگن''،خدیجہ مستور،سنگِ میل پبلیکیشنز،لاہور،سنہ ندارد،ص۱۴

☆۲۷۷ ''آنگن''،محولۂ بالا،ص۲۲

☆۲۷۸ ''آنگن''،محولۂ بالا،ص۲۳

☆۲۷۹ ''آنگن''،محولۂ بالا،ص۶۹

☆۲۸۰ ''آنگن''،محولۂ بالا،ص۸۴

☆۲۸۱ ''آنگن''،محولۂ بالا،ص۸۴

☆۲۸۲ ''آنگن''،محولۂ بالا،ص۸۲

☆۲۸۳ ''آنگن''،محولۂ بالا،ص۹۲

☆۲۸۴ ''آنگن''،محولۂ بالا،ص۹۴

☆۲۸۵ ''آنگن''،محولہٗ بالا،ص۹۶

☆۲۸۶ ''آنگن''،محولہٗ بالا،ص۸۵

☆۲۸۷ ''آنگن''،محولہٗ بالا،ص۱۴۶

☆۲۸۸ ''آنگن''،محولہٗ بالا،ص۱۵۴

☆۲۸۹ ''آنگن''،محولہٗ بالا،ص۱۲۲

☆۲۹۰ ''آنگن''،محولہٗ بالا،ص۱۸۳

☆۲۹۱ ''آنگن''،محولہٗ بالا،ص۲۰۲

☆۲۹۲ ''آنگن''،محولہٗ بالا،ص۲۱۷

☆۲۹۳ ''آنگن''،محولہٗ بالا،ص۲۲۶

☆۲۹۴ ''آنگن''،محولہٗ بالا،ص۲۲۰

☆۲۹۵ ''آنگن''،محولہٗ بالا،ص۲۳۸

☆۲۹۶ ''آنگن''،محولہٗ بالا،ص۲۶۳

☆۲۹۷ ''آنگن''،محولہٗ بالا،ص۲۷۵

☆۲۹۸ ''آنگن''،محولہٗ بالا،ص۲۷۵

☆۲۹۹ ''آنگن''،محولہٗ بالا،ص۲۹۳

☆۳۰۰ ''آنگن''،محولہٗ بالا،ص۳۰۴

☆۳۰۱ ''آنگن''،محولہٗ بالا،ص۳۰۶

☆۳۰۲ ''آنگن''،محولہٗ بالا،ص۳۰۱

☆۳۰۳ ''آنگن''،محولہٗ بالا،ص۳۱۲

☆۳۰۴ ''آنگن''،محولہٗ بالا،ص۳۱۷

☆۳۰۵ ''آنگن''،محولہٗ بالا،ص۳۱۸

☆۳۰۶ ''آزادی کے بعد اُردو ناول''،محولہٗ بالا،ص۱۲۶

☆۳۰۷ ''اُردو ناول میں طنز و مزاح''،محولہٗ بالا،ص۱۰-۳۰۹

❁ ❁ ❁

بابِ پنجم

تقسیم اور فسادات کے بعد فکشن کی فضا

باب پنجم

تقسیم اور فسادات کے بعد فکشن کی فضا

الف: افسانے کی فضا

تقسیمِ ہند اور فسادات کے دوران قتل و غارت گری، لوٹ مار اور خواتین کی بے حرمتی کے جو واقعات پیش آئے اسے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ تقسیم، فسادات اور ہجرت کے بعد بھی مسائل ختم نہ ہوئے لوگوں کو نئے ملک اور نئے لوگوں سے اجنبیت کا احساس ہوا۔ ان حالات میں یادیں ان کا سہارا بنیں۔ آزاد ملک میں آنے کے بعد بیشتر لوگوں صبح و شام اپنے بچھڑے ہوؤں کو تلاش کرنے اور انھیں یاد کرنے میں گزارتے۔

ہمارے افسانہ نگاروں نے مہاجرین کی ان نفسیاتی الجھنوں کو شدّت سے محسوس کیا اور ان پر افسانے لکھے۔ اس سلسلے میں قدرت اللہ شہاب کا طویل افسانہ ''یا خدا'' ایک مثالی افسانہ ہے۔ جس میں انھوں نے دلشاد اور زبیدہ کے کردار کے ذریعے ان المیوں کو بیان کیا ہے جو انھیں پاکستان آ کر پیش آئے۔

تقسیم اور فسادات کے بعد کی صورتِ حال کو مدنظر رکھتے ہوئے قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین نے سب سے زیادہ افسانے تخلیق کیے۔ قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے تقریباً تمام افسانوں کا موضوع ماضی پرستی ہے۔ ماضی پرستی کے حوالے سے تقریباً تمام افسانوں میں دوستوں تعلیمی اداروں، پرانے اُستادوں یا محلّے والوں کے ساتھ گزرے ہوئے دنوں کی یاد کو بیان کیا گیا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا ایک موضوع ماضی پرستی بھی ہے لیکن ان کا افسانے لکھنے کا انداز اسی انداز کے دیگر لکھنے والوں سے بہتر اور متاثر کن ہے۔ ان کے افسانوں میں واقعات سے زیادہ کرداروں کی کیفیات اور مکالموں پر توجہ دی گئی۔

تقسیم کے بعد انھوں نے جو بھی افسانے لکھے ان میں قتل و غارت گری، لوٹ مار یا خواتین کے بے آبرو کے بجائے مہاجرین کی نفسیاتی الجھنوں مثلاً نئے ملک میں اجنبیت کے احساس، ماضی کی یاد اور تقسیم کے بعد لوگوں کی معاشرتی اور معاشی حیثیت میں آنے والے فرق کو بہت فن کاری سے پیش کیا ہے۔

ان کے افسانوں کے مجموعے ''یاد کی اِک دھنک جلے''، ''پت جھڑ کی آواز'' اور ''شیشے کے گھر'' کے بیش تر افسانے تقسیمِ ہند کے بعد مہاجرین کی جذباتی کیفیات سے متعلق ہیں۔ خاص طور پر ''حسب نسب''، ''جلاوطن'' اور ''پت جھڑ کی آواز'' اپنے موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے بہترین افسانوں میں سے ہیں۔

انتظار حسین نے مہاجرین کی نفسیاتی الجھنوں اور نئے ملک میں آبادکاری کے سلسلے میں پیش آنے والے مسائل کو اپنے افسانوی مجموعے ''شہرِ افسوس'' اور ''گلی کوچے'' میں بیان کیا ہے ان افسانوی مجموعوں میں ''اُستاد''، ''قیوما کی دکان''، ''ایک بن لکھی رزمیہ'' وغیرہ کو شہرت حاصل ہوئی۔

موجودہ دور کے افسانہ نگاروں میں سید محمد اشرف کا افسانہ ''ڈار سے بچھڑے'' میں انسان کی مجبوریوں کو بیان کیا گیا ہے۔ افسانے کے کردار واحد متکلم، نواب، غلام علی اور وزیر الدین کی بیویاں اپنے آبائی وطن جانے کے لیے بے چین ہیں لیکن معاشی مسائل اور شوہر کی اجازت کے بغیر ان کے لیے یہ شوق پورا کرنا ممکن نہیں اس طرح نواب اپنی کاروباری مصروفیات کی وجہ سے اور واحد متکلم سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے ہندوستان نہیں جا سکتا۔

مسعود اشعر کا افسانہ ''اپنا گھر'' موجودہ حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے عوام کو ایک دوسرے کے بارے میں جو غلط فہمیاں اور بدگمانیاں ہیں مسعود اشعر نے احمد کے کردار کے ذریعے بیان کیا ہے۔

پت جھڑ کی آواز

قرۃ العین حیدر کا یہ افسانہ ان کے مشہور افسانوں میں سے ایک ہے۔ اس افسانے کا موضوع ماضی پرستی ہے۔ افسانے کو قرۃ العین نے تنویر فاطمہ کی آپ بیتی کی شکل میں لکھا ہے۔ تنویر فاطمہ، خوش وقت سنگھ، فاروق اور وقار حسین افسانے کے اہم کردار ہیں۔

افسانے کی کردار تنویر فاطمہ کا تعلق میرٹھ کے ایک مذہبی اور زمیں دار گھرانے سے تھا، لیکن تنویر فاطمہ جب اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے سلسلے میں پہلے علی گڑھ اور پھر دلّی گئی تو اسے ہوسٹل میں رہنا پڑا۔ یونیورسٹی اور ہوسٹل کی آزاد فضا کا اس نے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اسی دوران تنویر فاطمہ کی دوستی میجر خوش وقت سنگھ سے ہوگئی۔ خوش وقت سنگھ کے ساتھ وہ سیر و تفریح کے لیے دوسرے شہروں میں بھی جانے لگی، اور تعلیم سے اس کی دل چسپی کم ہوتی چلی گئی۔ تنویر فاطمہ کی ان حرکتوں کی وجہ سے یونیورسٹی کی

لڑکیاں اسے سخت ناپسند کرتی تھیں۔ اگر چہ خوش وقت سنگھ اور تنویر فاطمہ دوستی میں بہت آگے جا چکے تھے لیکن خوش وقت سنگھ کی ایک عیسائی لڑکی سے بھی منگنی ہو چکی تھی۔ تنویر فاطمہ کو جب اس حقیقت کا علم ہوا تو اسے عیسائی لڑکی سے ایسی ہی نفرت ہوئی جیسے عام طور پر رقیبوں سے کی جاتی ہے۔ اس کے باوجود جب خوش وقت سنگھ نے تنویر فاطمہ سے شادی کرنا چاہی تو تنویر فاطمہ نے انکار کر دیا۔ انکار کرنے پر خوش وقت نے تنویر سے کہا:

''میں نے کیا ہندو مسلم شادیوں کا حشر نہیں دیکھا تھا۔ کئیوں نے ترقی پسندی یا جذبہ عشق کے جوش میں آ کر ہندوؤں سے بیاہ رچائے اور سال بھر کے اندر جوتیوں میں دال بٹی۔ بچوں کا جو حشر خراب ہوا وہ الگ۔ نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے۔'' ☆۱

تنویر فاطمہ کے انکار کے بعد خوش وقت سنگھ نے عیسائی لڑکی سے شادی کر لی۔ شادی کے کچھ عرصہ کے بعد خوش وقت پھر سے تنویر فاطمہ سے ملنا جلنا شروع کر دیا ملاقاتوں کا یہ سلسلہ تقریباً ایک سال تک جاری رہا۔ اس کے بعد خوش وقت سنگھ اپنے دوست فاروق سے تنویر فاطمہ کا تعارف کروا دیا۔ فاروق کا شمار ہندوستان کے بڑے تاجروں میں ہوتا تھا۔ بہت جلد فاروق اور تنویر فاطمہ ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ اس کے بعد خوش وقت سنگھ اور تنویر فاطمہ کا رابطہ نہ رہا۔

اب تنویر فاطمہ فاروق کی منگیتر کی حیثیت سے ہر جگہ آنے جانے لگی۔ فاروق شادی شدہ بال بچوں والا چالیس سالہ مرد تھا، لیکن تنویر فاطمہ کو اس بات پر کوئی اعتراض نہ تھا۔

ان ہی دنوں تقسیمِ ہند کا اعلان ہو گیا۔ ملک کے حالات بہت زیادہ خراب ہو گئے خاص طور پر لڑکیوں کے لیے یہ وقت بہت سخت اور تکلیف دہ تھا۔ ہر لڑکی کی عزت خطرے میں تھی۔ تنویر فاطمہ کے والد نے اسے پاکستان بھیج دیا۔ فاروق بھی یہی چاہتا تھا کہ تنویر فاطمہ پاکستان چلی جائے فاروق نے فاطمہ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ پاکستان جا کر اس سے شادی کرے گا۔ تنویر فاطمہ پاکستان جانے کے بعد فاروق دلّی سے ہر تین ماہ بعد لاہور میں اس سے ملنے جاتا اور اسے اس کی ضرورت کے مطابق پیسے بھی دیتا رہا، لیکن نئے ملک میں تنویر فاطمہ کو اجنبیت کا احساس بہت شدّت سے ہوا۔ ہجرت کے کرب اور پرانی یادوں نے اسے بہت بے چین رکھا۔ تنویر فاطمہ کی اس کیفیت کو قرۃ العین نے اس طرح بیان کیا ہے:

''میں زندگی کی اس یک بیک تبدیلی سے اتنی ہکا بکا تھی کہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا سے کیا ہو گیا کہاں غیر منقسم ہندوستان کی وہ بھرپور دلچسپ رنگا رنگ دنیا، کہاں ۱۹۴۸ء کے لاہور کا وہ تنگ و تاریک مکان! غریب الوطنی، اللہ اکبر! میں نے کیسے کیسے دل ہلانے والے زمانے دیکھے ہیں۔'' ☆۲

ان دنوں پاکستان میں لیکچرروں کی بہت ضرورت تھی۔ تنویر فاطمہ نے ایم ایس سی کی ڈگری ہونے کے باوجود شدید

اُکتاہٹ اور بیزاری کی وجہ سے کہیں بھی ملازمت نہ کرسکی۔لیکن اب اُس نے ایک کالج میں پڑھانا شروع کردیا۔

آہستہ آہستہ فاروق نے بھی لاہور میں آنا کم کردیا اور نہ ہی کبھی تنویر فاطمہ سے شادی کا ذکر چھیڑا تنویر فاطمہ کو بھی اب فاروق میں نہ دلچسپی اور نہ اُمّید۔

ایک مرتبہ جب فاروق لاہور میں آیا تو اس نے تنویر فاطمہ کو اپنے دوست وقار سے ملاقات کرائی جو ایک ڈانسنگ اسکول چلا رہا تھا۔تنویر فاطمہ کی وقار اور اس کی بیوی سے اچھی دوستی ہوگئی۔پھر ایک دن وقار نے اپنی بیوی کو طلاق دے کر تنویر فاطمہ سے شادی کرلی۔

وقار سے شادی کرنے کے بعد اس کی زندگی میں بظاہر کسی قسم کی تکلیف نہ تھی۔وہ ایک گھریلو بیوی کی طرح زندگی گزار رہی تھی، اور اسے ہر قسم کی مادّی آسائش بھی میسّر تھی، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے ماضی سے نہ نکل سکی۔نہ ہی خوش وقت سنگھ کی یادوں کو فراموش کرسکی۔بقولِ تنویر فاطمہ:

''اب میں دن بھر گھر کے کاموں میں مصروف رہتی ہوں۔میرا حسن و جمال ماضی کی داستانوں میں شامل ہو چکا ہے مجھے شور شغب پارٹیاں ہنگامے مطلق پسند نہیں۔وقار حسین اور تنویر فاطمہ کی شادی محض ایک سمجھوتا ہے۔

شادی کر لینے کے بعد لڑکی کے سر کے اوپر ایک چھت سی پڑ جاتی ہے۔☆۳

خوش وقت سنگھ جو اس کی پہلی محبت تھا۔اس سے شدید محبت رکھنے کے باوجود وہ اس سے شادی نہیں کرسکتی تھی۔ کیوں کہ شدید محبت کے باوجود دونوں کے درمیان مذہبی تفریق بھی تھی۔تنویر فاطمہ خوش وقت سنگھ کو بھول جانا چاہتی تھی لیکن اس لاشعور میں وہ بری طرح چھایا ہوا تھا۔

> اب خوش وقت کو یاد کرنے کا کیا فائدہ؟ وقت گزر چکا۔جانے اب تک وہ بریگیڈیر میجر جنرل بن چکا ہوگا۔سام کی سرحد پر چینیوں کے خلاف مورچہ لگائے بیٹھا ہویا...شاید وہ کب کا کشمیر کے محاذ پر مارا جاچکا ہو۔☆۴

اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہندو سکھ اور مسلمان ایک دوسرے سے محبت تو کرسکتے تھے لیکن آپس میں کسی سی مضبوط اور قانونی رشتہ نہیں جوڑ سکتے تھے۔

اس افسانے کے یوں تو کئی پہلو ہیں لیکن جو چیز نمایاں طور پر نظر آ رہی ہے وہ تنویر فاطمہ کا ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد زندگی میں پیدا ہونے والا خلا ہے۔دتی اور علی گڑھ جہاں اس نے اپنی تعلیم مکمل کی اور زندگی کے بہترین دن گزارے ساتھ پڑھنے والی لڑکیوں کی جدائی ان کی یادوں اس کی زندگی اور شخصیت پر گہرے اثرات ڈالے اور زندگی کی تمام دلچسپیاں اس کے لیے بے معنی ہوکر رہ گئیں۔

افسانے کا سارا تانا بانا خود قرۃ العین کی ذات اور شخصیت کی آئینہ داری کرتا ہے۔ ہندو مسلم کلچر کا معاشقانہ ملاپ اس میں ناکامی، پاکستان آنا اور یہاں کے ماحول کا راس نہ آنا اور شادی کے بعد بھی ماضی کی یادوں کے باعث آسودگی حاصل نہ ہونا یہ سارے عناصر قرۃ العین کے پسندیدہ موضوعات ہیں اور ان کی ذات کی ماضی پرستی اور ناسٹلجیا ظاہر کرتے ہیں۔

جلاوطن

قرۃ العین حیدر کا یہ افسانہ ان کی ماضی پرستی کا عکاس ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے تقسیمِ ہند سے پہلے ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کی تصویر کشی ہے اس سلسلے میں انھوں نے کھیم دتی، کشوری، پروفیسر آفتاب، کنول کماری، اصغر عباس، رما کانت کی باہمی دوستی کو بیان کیا ہے جو تقسیمِ ہند کے بعد نفرت میں بدل گئی اور محبت اور گرم جوشی کی جگہ سرد مہری اور اجنبیت نے لے لی۔

خورشید زہرہ عابدی نے اس افسانے کے بارے میں یہ رائے دی ہے:

> اس افسانے میں جلاوطنی اور ہجرتوں کا احوال ہے انسانی رشتوں کے ٹوٹ جانے کا غم ہے جدید عہد کی زندگی کے اس اختراق اور انتشار کا اظہار ہے جہاں زندگی، موت، شخصیت اور وجود سب اپنے اپنے تضادات سے متصادم ہیں ان کرداروں کی داستان ہے جو کبھی اپنی دنیا میں اپنی تہذیب اور تاریخ کا محور تھے۔ ہجرت سے پیدا ہونے والا زندگی کا خلاف جو ذاتی، شخصی اور بڑا شدید ہے اور اس نسل کا ترجمان بھی جسے ایک تہذیب، ایک ثقافت اور ایک آشنا ملک سے کٹ جانے کا ملال ہے۔☆۵

کھیم اور کشوری بچپن کی سہیلیاں تھیں۔ کشوری کا بھائی اصغر عباس اور کھیم کا بھائی رما کانت بھی آپس میں ایک دوسرے کے دوست تھے۔

کشوری اور کھیم دونوں کے خاندانوں سے آفتاب رائے کے دوستانہ مراسم تھے۔ آفتاب رائے جب بھی لکھنؤ سے جون پور آتے ان دونوں کے گھر والوں سے ملنے ضرور جاتے۔ آفتاب رائے کے مشورے پر ہی کشوری اور کھیم نے دونوں میٹرک کے بعد لکھنؤ پڑھنے کے لیے گئی تھیں۔

کھیم اور کشوری نے لکھنؤ جا کر ایک دوسرے سے رابطہ رکھنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن ان ہی دنوں ملک کے سیاسی حالات بگڑ گئے۔ ہندو اور مسلمان لیڈروں کے علاوہ عام لوگ بھی خود کو ایک دوسرے سے مذہبی اور تہذیبی لحاظ سے مختلف محسوس کرنے لگے۔ بہت سے ہندو اور مسلم گھرانوں کی طرح کشوری اور کھیم کے گھر والوں کے درمیان بھی فاصلے پیدا ہو گئے۔

کشوری جو کانگریس کی حمایتی تھی اب اس نے مسلم اسٹوڈینٹس فیڈریشن میں اور کھیم دتی نے ہندو مہاسبھا میں شمولیت

اختیار کر لی۔ یوم پاکستان کے موقع پر کھیم اور اس کے ساتھیوں نے کشوری سمیت مسلم لیگ کے طلبہ پر اینٹیں پھینکیں۔

طالب علموں کی دنیا اچھی خاصی سیاسی اکھاڑہ بن گئی تھی گھر پر واپس جاؤ تو وہی سیاست کل کی تشویش۔ مستقبل کی فکر ملک کی تقسیم ہوگی، نہیں ہوگی، ہوگی۔☆۶

کھیم اور کشوری ایک یونیورسٹی میں پڑھتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے ملنے سے کترانے لگیں، اور لکھنؤ میں آنے کے چار سال بھی کشوری اور کھیم کا آمنا سامنا ہوا تو کھیم کشوری کو ہیلو کے سوا کچھ اور نہ کہہ سکی۔ طالب علموں کے علاوہ ہندو پروفیسر بھی مسلمان طالب علموں کو ناپسند کرنے لگے۔

مسلمان طالب علموں کو اچھے نمبر نہ ملتے۔ ہندوؤں کو یوں ہی پاس کر دیا جاتا۔ جس ہوٹل میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس پر سبز پرچم لہرانے لگا تھا۔ اس کے جواب میں عین مغرب کے وقت ہندو اکثریت والے ہوٹلوں میں لاؤڈ اسپیکر نصب کر کے گراموفون بجایا جاتا۔☆۷

آخر کار ملک تقسیم ہو گیا۔ کئی مسلمانوں نے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی۔ کشوری اپنے والد کے ساتھ ہندوستان ہی میں رہی۔ جب کہ اس کا بھائی جو انڈین فوج میں تھا ہجرت کر کے پاکستانی فوج میں چلا گیا۔ پاکستان سے انھیں نہ تو خط لکھ سکتا تھا اور نہ ہی روپے پیسے بھیج سکتا تھا۔ کشوری کے گھر کے مالی حالات بہت خراب ہو گئے۔ گھر کا خرچہ چلانے کے لیے پہلے تو کشوری کے زیورات بیچے گئے پھر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ گھر کے برتن اور استعمال کی چیزیں بھی بیچی جانے لگیں۔

کشوری کے علاوہ بھی بہت سے مسلمان گھرانے ایسے تھے جہاں لوگ اپنے کے سامان کو بیچ کر گھر کا گزارا کر رہے تھے۔ ان حالات میں کشوری نے ملازمت کرنے کی کوشش کی تو مسلمان ہونے کی وجہ سے اسے ہر جگہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

جب کشوری کو ہندوستان میں نوکری ملنے کی کوئی اُمید نہ رہی تو وہ وظیفہ لے کر انگلستان چلی گئی اسے نہ چاہتے ہوئے اپنے بوڑھے باپ کو بالکل تنہا چھوڑنا پڑا جو سخت ترین حالات میں بھی خود کو اور کشوری کو ہندوستان سے دور نہیں کرنا چاہتا تھا، لیکن وقت نے اسے سب کچھ دکھا دیا، اور کشوری کے جانے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔

انگلستان میں ایک دن کشوری نے کھیم کو اس کے شوہر کے ساتھ دیکھا تو اس کے بچپن کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ اس نے سارے مذہبی اور سیاسی اختلافات اور ذاتی تلخیوں کو بھلا کر اسے نمستے کہا لیکن کھیم کا دل محبت اور انسیت کی جذبات سے بالکل بے نیاز تھا۔ اس نے اسے بہت رد کھے اور طنزیہ انداز میں کہا:

''تم تو پاکستانی ہو، تمھیں نمستے نہ کہنا چاہیے تھا۔''☆۸

کشوری کا دل پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا۔ کھیم کے اس رویے سے اسے ایک اور دھچکا لگا، اور اسے ماضی وہ سنہرا دور لگا جس میں ہندو اور مسلمان تمام اختلافات کے باوجود مل کر رہتے تھے۔ ان کی مشترکہ ہندوستانی تہذیب تھی۔ جسے بننے میں صدیاں

لگیں تھیں، لیکن جب کشوری کا اور اس کے ساتھیوں کا دور شروع ہوا تو یہ تہذیب ایسی بکھری کہ اس کے دوبارہ ملنے کی کوئی اُمید باقی نہ رہی۔

ماضی کی قدر و قیمت اور اچھے دنوں کا یہ احساس قرۃ العین حیدر کے اپنے ناسٹلجیا کی دین ہے وہ خود ماضی کے سہانے خوابوں میں رہنے کی عادی ہیں اور اپنے قاری کو بھی ماضی کے انھیں خواب ناک لمحوں میں لے جانا چاہتی ہیں۔

حسب نسب

''حسب نسب'' قرۃ العین حیدر کے مشہور افسانوں میں سے ایک ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے چھمی بیگم کے کردار کے ذریعے انسان کی زندگی میں آنے والے مختلف نشیب و فراز کو بیان کیا ہے۔

شاہ جہاں پور کی چھمی بیگم کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ اس کے گھر دو حصے تھے۔ زنانہ حصہ میں املی کا درخت تھا اس لیے اسے ''املی والا گھر'' اور مردانے میں چنبیلی کی جھاڑیاں تھیں۔ اس لیے اسے ''چنبیلی والا گھر'' کہا جاتا۔ املی والے گھر میں چھمی بیگم، اس کی والدہ اور تائی اور چنبیلی والے گھر میں چھمی کے والد، تایا اور اجو رہتے تھے۔

چھمی کی منگنی بچپن ہی میں اپنے تایا کے بیٹے ''اجو'' سے ہو چکی تھی جب چھمی بیگم سولہ سال کی ہوئی تو پہلے اس کی والدہ اور پھر والد کا انتقال ہو گیا، اور کچھ ہی عرصے کے بعد اس کے تایا کا بھی انتقال ہو گیا۔

باپ کے انتقال کے بعد اجو لکھنؤ چلا گیا اور پھر وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ اجو کی والدہ نے اسے کئی بار شادی کے لیے بلایا لیکن وہ ہر بار مختلف بہانے کر کے اسے ٹالتا رہا۔ اسی انتظار میں اجو کی والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب اجو کو مکمل آزادی حاصل ہو گئی، اور ایک دن اس نے ایک طوائف سے شادی کر لی اسے شاہ جہاں پور لے آیا۔

چھمی جو والدین اور تایا کی موت کے بعد اجو کے بدلے ہوئے رویے سے دکھی ہو گئی تھی۔ اجو کی شادی کے بعد اس کی ساری اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔

اجو اور اس کی بیوی کلو بیگم نے چھمی سے دوستی کرنی چاہی لیکن انھیں ہر بار مایوسی کا سامنا کرنا پڑا، خوددار چھمی نے جسے ایک عرصے سے اجو ہر ماہ دو سو روپے بھیجتا تھا۔ اب اس سے پیسے لینے بھی چھوڑ دیے۔ کیوں کہ اس کا خیال تھا:

> جمعہ خان مرحوم کی بیٹی اور شبو خان مرحوم کی بھتیجی چکلے سے آیا ہوا ایک پیسا بھی اپنے اوپر حرام سمجھتی ہے۔☆۹

اس کے بعد چھمی نے پہلے گھر کا قیمتی سامان اور پھر گھریلو سامان بیچ کر گھر کا گزارہ کیا۔ سامان ختم ہونے کے بعد چھمی نے محلے والیوں کے کپڑے سی کر اور گھر میں چھوٹا سا مکتب کھول کر بچیوں کو پڑھانا شروع کر دیا اور یوں اس کی گزر اوقات کا

بند و بست ہو گیا اور چنبیلی والے مکان سے جہاں اب اجو اور کلو بیگم رہتے تھے۔ چھمی کا تعلق بالکل ختم ہو گیا۔

چھمی بیگم نے دھمو خاں کو حکم دے رکھا تھا کہ چنبیلی والے مکان سے کوئی چڑیا کا بچہ بھی اس طرف آئے تو اس کی ٹانگیں توڑ دو۔☆۱۰

اسی عرصے میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے، اور مسلمانوں کو ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنا پڑی۔

آدھا شاہ جہاں پور سمجھو خالی ہو گیا۔ ان کے مکتب کی ساری لڑکیاں اپنے ماں باپ کے ساتھ پاکستان چلی گئیں۔ چھمی بیگم کے ہاں روٹیوں کے لالے پڑ گئے۔☆۱۱

فسادات کے دوران اجو بھائی دہلی میں مارے گئے۔ اجو بھائی کے چالیسویں کے بعد کلو بیگم گھر چھوڑ کر چلی گئیں اور کچھ دنوں کے بعد کلو بیگم کی لڑکی آئی اور چنبیلی والے گھر کا سارا سامان لے کر چلی گئی۔

چنبیلی والے مکان پر کسٹوڈین کا تالا پڑ گیا۔ کیوں کہ چھمی بیگم عدالت میں یہ کسی طرح ثابت نہ کر پائیں کہ اجو بھائی پاکستان نہیں گئے بلوے میں مارے گئے ہیں۔☆۱۲

چنبیلی والے گھر میں ایک سکھ شرنارتھی ڈاکٹر اپنے گھر والوں کے ساتھ آ کر بس گیا۔ چھمی ملن خان اور دھمو خان کے مرنے اور سلامت بوا کے فالج گرنے کے بعد ''املی والے گھر'' میں بالکل تنہا رہ گئی اب وہ چنبیلی والے گھر کی سردارنیوں سے کبھی کبھی اپنے دکھ سکھ کی باتیں کر لیتی۔ چنبیلی والے گھر کی سردارنی کے ایک دن چھمی نے دہلی میں ایک مسلمان افسر صبیح الدین کے بچوں کو چالیس روپے ماہوار کی تنخواہ پر بارہ سال تک قرآن اور اُردو پڑھانا شروع کر دیا۔ صبیح الدین ریٹائر ہو کر مرزاپور چلے گئے۔ مرزاپور جانے سے پہلے بیگم صبیح الدین نے چھمی کو راشد علی کے گھر ملازمت کا بندوبست کر دادیا۔ بیگم راشد علی اور اس کے بچے بھی بیگم صبیح الدین کے گھر والوں کی طرح چھمی سے بہت عزت اور محبت سے پیش آتے۔ چھمی نے پانچ برس بیگم راشد کے گھر گزار دیے۔ اس کے بعد راشد علی کا واشنگٹن سفارت خانے میں تبادلہ ہو گیا، اور چھمی کی ملازمت کا بندوبست بمبئی میں رضیہ بانو کے گھر ہو گیا۔ رضیہ نے بھی چھمی کو بہت عزت دی یہاں بھی چھمی کا کام نماز اور قرآن پڑھ کر رضیہ بانو کے لیے دعا کرنا تھا، اور بے خبر سادہ چھمی کو اس بات کی خبر ہی نہ تھی کہ اب وہ ایک طوائف کے گھر ہے۔

چھمی بیگم نے اپنی کوٹھڑی میں جا کر ایک بار پھر جائے نماز نکالی...اور اس پروردگار کا شکریہ ادا کیا جس (کذا) نے ان کے باپ دادا کی لاج، ان کے حسب نسب کی عزت رکھ لی اور ایک بار پھر ایک شریف گھرانے کی حق حلال کی کمائی میں ان کا حصہ بھی لگا دیا۔☆۱۳

حسب نسب کی چھمی ان مظلوم مسلمانوں کی ترجمان ہے۔ جن کی فسادات کے نتیجے میں معاشی اور سماجی حیثیت بالکل بدل گئی۔ دھمو خان اور ملن کے مرنے کے بعد وہ دہلی والے گھر میں تنہا رہ گئی۔ ''اجو'' کے قتل ہوتے کے بعد ''چنبیلی والے گھر''

ہندوستانی حکومت کے قبضے میں چلا گیا۔ سلائی سیکھنے والی لڑکیوں اور مکتب کے بچّوں کے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد اس کی گزراوقات کا صحیح بندوبست نہ رہا اور ہر وقت پردہ میں رہنے والی چھمی کو زنانے سے نکل کر پہلے دہلی میں صبیح الدین پھر راشد علی اور آخر میں ایک طوائف کے گھر پناہ لینا پڑی۔ (اعلیٰ حسب نسب اور نازک مزاج چھمی کی زندگی میں جیسے جیسے حادثات پیش آتے گئے اس کی حیثیت بھی بدلتی گئی اور حیثیت بدلنے کے ساتھ اس کے مزاج میں صبر و تحمل آتا گیا۔)

اُستاد

انتظار حسین کے اس افسانے کا موضوع بھی ان کے بیش تر افسانوں کی طرح ماضی پرستی ہے۔ اس افسانے میں بھی انتظار حسین نے ماضی کی یادوں کا ماتم کیا ہے۔

افسانے کا بنیادی کردار ''اُستاد'' ہے جو ایک مثالی اُستاد ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں اس کی عزت کرتے تھے۔ ''قیّوما کی دکان'' کی طرح اُستاد کی حویلی میں بھی ہر وقت محفل جمی رہتی۔ اُستاد اگرچہ مسلمان تھا لیکن اس کے باوجود ہندو بھی اس سے پیار کرتے اور ہر کام اُستاد کے مشورے سے کرتے۔ اُستاد کی حویلی میں لوگ ہر موضوع پر تبادلۂ خیال کرتے، لیکن جب ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے اُستاد کی حویلی بھی پہلے جیسی نہ رہی۔ اُستاد کا سارا محلّہ خالی ہو گیا۔ مسلمان ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے اور ہندوؤں نے بھی مذہبی تعصب کی وجہ سے اُستاد کی حویلی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔

> چاروں طرف خون خرابہ ہوتا رہا۔ آگیں لگتی رہتیں مگر بڑی حویلی کی طرف سے کسی نے آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا۔ خیر یہ فساد تو ختم ہو گیا، لیکن قیامتیں تو اس کے بعد بھی آئیں اور ایسی آئیں کہ بڑی حویلی کی بنیادیں ہل گئیں۔ ہاں نہ ہلے تو اُستاد اپنی جگہ سے نہ ہلے... زمانہ دیکھتے دیکھتے بدلنے لگا۔ محلّے خالی ہونے لگے۔ بھری بستیاں اجڑنے لگیں۔ لوگ ایمان بچانے کے بہانے جانیں بچا بچا کر گئے۔ اُستاد نے اسی چبوترے پر بیٹھ کر بلائیں بھی ہوتے دیکھیں اور میلے بھی ڈھلتے دیکھے۔ مگر ان کی وضع داری میں فرق نہ آیا۔ ان کی نگاہیں سڑک پر تو نہیں ہوتی تھیں۔ بس خلا میں جمی رہتی تھیں... ان کی خاموشی اب اور بڑھ گئی تھی۔ یہ خاموشی اور بڑھی اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔ ☆۱۴

افسانے کے کردار اُستاد کا نہ تو جانی نقصان ہوا اور نہ ہی مالی۔ وہ اس حویلی میں تھا جہاں وہ تقسیم ہند سے قبل رہتا تھا، لیکن اب اس کے پاس رونق بخشنے والے اور محبت کرنے والے نہ رہے۔ یہی اُستاد کا دکھ تھا جس نے اس کی شخصیت پر گہرے اثرات ڈالے۔ ہر وقت ہنسی مذاق اور شور و ہنگامہ کرنے والے اُستاد کو چپ لگ گئی، اور اس روحانی صدمے نے اس کی جان لے لی۔

اس افسانے میں انتظار حسین نے اس حقیقت کو بیان کیا ہے۔انسان صرف روپے پیسے اور جائیداد کا خواہش مند نہیں ہوتا، بلکہ اسے پیار محبت کی بھی اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ صرف پیٹ کی بھوک ہی نہیں مٹانا چاہتا، بلکہ اپنے اردگرد اپنے دوستوں اور پیار کرنے والے ساتھیوں کو بھی دیکھنا چاہتا ہے،اور تقسیمِ ہند کا ایک بڑا نقصان ساتھیوں اور محبتوں سے بچھڑ جانا بھی ہے۔

قیّو ما کی دکان

انتظار حسین نے یہ افسانہ ماضی کی یادوں میں گم ہو کر لکھا ہے۔ ماضی کو یاد کرتے ہوئے وہ قیّو ما کی دکان پر آ کر رک گئے ہیں،اور پھر قیّو ما کی دکان کی ایک ایک بات کو وہ اپنے اس افسانے میں بیان کر رہے ہیں۔

واحد متکلّم ،قیّو ما، کمر جی، الطاف اور بدھن وغیرہ اس افسانے کے اہم کردار ہیں جو ہر وقت قیّو ما کی دکان پر دیر تک بیٹھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

قیّو ما کی دکان واحد متکلّم کے قصبے کی ایسی دکان ہے جو دن رات کھلی رہتی ہے اور محلّے کے لوگوں کے علاوہ آس پاس کے محلّے کے لوگ اور دکاندار صرف دودھ دہی یا مٹھائی وغیرہ ہی لینے نہ آتے، بلکہ یہاں اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے ملنا ان کا اوّلین مقصد ہوتا۔ کمر جی، الطاف اور بدھن اس دکان کو رونق بخشنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

تقسیمِ ہند سے قبل جب ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے ہو تو جہاں ملک کے مختلف حصّوں میں قتل وغارت گری، لوٹ مار اور خواتین کی بے حرمتی جیسے دردناک اور وحشیانہ واقعات رونما ہوئے تو حکومت کو بہت سے علاقوں میں کرفیو لگانا پڑا۔ جس علاقے میں قیّو ما کی دکان تھی وہاں بھی کرفیو لگا دیا گیا تو مجبوراً قیّو ما کو بھی اپنی دکان بند کرنا پڑی۔ یہ پہلا موقع تھا جب قیّو ما نے اپنی دکان کو بند رکھا۔

> کرفیو ختم ہونے کے بعد اگرچہ قیّو ما نے اپنی دکان کھولی لیکن اس کے بعد وہاں پہلی سی رونق کبھی نہ آ سکی۔
>
> بدھن نے حقہ بھی بھر کے رکھ دیا تھا اور وہ اونچے نیچے پایوں والی بینچ بھی حسبِ معمول بچھا دی تھی پھر بھی ٹکنے کا کوئی نام نہ لیتا تھا۔لوگ جلدی جلدی سودا سنبھالتے اور پیسے پھینکتے اور گلیوں میں سٹک جاتے اور پھر کنواڑوں کے دہاڑ دہاڑ بند کرنے کی آوازیں آتیں۔☆۱۵

تقسیمِ ہند کے بعد ملک کے حالات اور بھی خراب ہو گئے تو واحد متکلّم ،قیّو ما، بدھن اور الطاف سب کو ہجرت کر کے پاکستان آنا پڑا۔ اگرچہ پاکستان میں بھی آ کر قیّو ما نے دکان کھولی لیکن قیّو ما کی دکان کو رونق بخشنے والے ایک ملک میں ہونے کے باوجود ایک جگہ جمع نہ ہو سکے اور نہ ہی کبھی قیّو ما کی دکان میں وہ محفلیں اور رونقیں لوٹ کر آ سکیں جو ہندوستان میں تھیں۔

انتظار حسین کے لیے یہ بہت بڑا دکھ ہے اپنے اس دکھ کو انھوں نے واحد متکلّم کے ذریعے اس طرح بیان کیا ہے:

''پھر میں پاکستان چلا آیا۔ یہاں آ کر نہ جانے مجھے کیا ہو گیا ہے ایک بوریت سی ذہن پر طاری رہتی ہے۔ مجھے گھن لگ گیا ہے، میں گھٹتا چلا جا رہا ہوں۔ ایک دن انارکلی بازار میں نمبردار سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ بے چارے بہت روتے تھے... یہ انارکلی بھی خوب ہے بچھڑے ہوئے پناہ گزین یہاں ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔'' ☆۱۶

انتظار حسین کا یہ افسانہ ماضی کی یادوں کے بارے میں ہے اس پورے افسانے میں انتظار حسین نے قیّو ما کی دُکان اور اس مے محفل جمانے والے لوگوں کی مختلف باتوں کو بیان کر کے ماضی کی یادوں کو تازہ کیا ہے۔

اس افسانے کا بنیادی موضوع... ایک فرد ہی نہیں ہے، بلکہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہے۔ وہ ایک دکاندار ہی نہیں تھا...، بلکہ مجلسی زندگی کا محور تھا، جس کے گرد بے شمار لوگ خوش گپیاں کرتے تھے اچھا وقت گزارتے تھے۔ ☆۱۷

ہر اِک مکاں کو ہے مکیں سے شرف اسؔد
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

دراصل ایک جگہ سے جب لوگ ہجرت کر جائیں تو اس مقام کی رونقیں بھی انھیں کے ساتھ ہجرت کر جاتی ہیں اور ان رونقوں کی صرف یادیں رہ جاتی ہیں قیّو ما داحد متکلّم اور ان کے اہلِ محلّہ کے مقام بدل جانے کے بعد اگر چہ وہ پھر ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں مگر وہ بات پھر کبھی پیدا نہ ہو سکی۔ قیّو ما کی دکان کی محفل آرائی اب محض تصورات میں رہ گئی ویسی محفل آرائی پھر وجود میں نہ آسکی۔

اپنا گھر

مسعود اشعر کے اس افسانے میں بکھرے ہوئے ایک مسلمان خاندان کے مسائل کو بیان کیا گیا ہے تقسیمِ ہند کے نتیجے میں احمد پاکستان میں آ گیا جب کہ اس کے خاندان کے دوسرے افراد نے ہندوستان ہی میں رہنے کو ترجیح دی۔

افسانے کا مرکزی کردار احمد پچاس سال کے بعد ہندوستان میں اپنے رشتے داروں سے ملنے گیا تو جانے پہلے اس کے دل میں بہت سے اندیشوں نے گھر کر لیا۔

پچاس برس بعد وہاں جا کر اسے کیسا لگے گا؟ اسے خوشی ہو گی یا صدمہ وہاں سب کچھ ویسا تو نہیں ہو گا جیسا وہ چھوڑ کر آیا تھا تو پھر کیسا ہو گا؟ بدل گئی ہوں گی سب چیزیں؟... سڑکیں اور گلیاں تو وہی ہوں گی پھر اپنے عزیز رشتے دار تو ہوں گے نہ۔ اس عرصے میں دو تین موتیں ہی تو ہوئیں

ہیں...، بلکہ اب تو رشتے داروں کی تعداد اور بھی بڑھ گئی ہے۔ بچّے اور پھر بچّوں کے بچّے چالیس پچاس برس میں کتنی نسلیں بڑھ جاتی ہیں۔☆۱۸

ہندوستان پہنچ کر احمد کو احساس ہوا کہ واقعی ہر چیز بدل چکی تھی۔ اس کے گھر، محلّہ، شہر غرض ہر جگہ کا نقشہ بدل چکا تھا۔ عمارتوں، دکانوں اور انسانوں کے ہجوم کی وجہ سے اسے ایسے لگا جیسے اسٹیشن، سڑکیں اور شہر چھوٹے ہو گئے ہیں۔ افسانہ نگار نے احمد کی دلی کیفیت کو اس کی زبانی یوں بیان کیا ہے:

''میں نے اسٹیشن سے باہر قدم رکھتے ہی جو پہلا بورڈ دیکھا تھا اس پر دیوناگری رسم الخط میں لکھا تھا، انجمنِ اہلِ سنت والجماعت۔ میرے لیے یہ پہلا صدمہ تھا۔''☆۱۹

جگہوں کے علاوہ خوراک، لباس اور لوگوں کے رویّے میں بھی تبدیلی آ چکی تھی۔ کھانے کے لیے بھی پہلے سے مختلف چیزیں آ گئیں تھیں جس پر احمد کو حیرت ہوئی۔

''اد ہو نسیم، تم نے یہ کیا کر دیا؟'' احمد نے کھانا دیکھ کر زور سے کہا۔ ''تمھیں بھی یہ مرغ مسلّم اور کوفتے کباب ہی پکانا رہ گئے تھے۔ میں تو یہاں کڑوے تیل میں پکائی ہوئی آلو میتھی کی بھجیا، کھٹی ہری مرچیں، ہینگ کا بگھار لگے کالے ارد، لچ لچ اور ارد کی دال کی کھچڑی کھانے آیا تھا۔''☆۲۰

اصل میں احمد ماضی کی ہر چیز سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا جو چیزیں اس نے بچپن میں کھائی تھیں وہ پھر سے ان کا ذائقہ چکھنا چاہتا تھا۔

''ہم یہاں کیک پیسٹریاں نہیں کھایا کرتے تھے۔ ہم تو شاہ آباد کی صابونیاں، گجیاں، چاول کے نکتیوں والے لڈو اور قلاقند اور اشفاق بھائی کے اِندرسے کھایا کرتے تھے۔''☆۲۱

احمد نے اپنے گھر کی ایک ایک چیز کو غور سے دیکھا پھر اس کا ماضی سے موازنہ کیا:

''سامنے دالان میں دائیں طرف نماز کا تخت اسی طرح بچھا تھا۔ تخت پر تو شک اور ...سفید چادر بھی اسی طرح تھی۔ تخت پر ایک طرف جانماز اور دوسری طرف گاؤتکیہ رکھا تھا۔ جانماز کا ایک کونہ مڑا ہوا تھا۔ بائیں طرف دو تین چارپائیاں پڑی تھیں۔ یہ سب چیزیں ویسی ہی تھیں جیسی وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ مگر چارپائیوں کے ساتھ رکھی چار کرسیاں نئی تھیں۔ تو گویا گھر کے اندر بھی کرسیاں آ گئیں؟ پہلے تو سب پلنگوں پر ہی بیٹھتے تھے یا مونڈھوں پر کرسیاں تو صرف بیٹھک میں ہوتی تھیں۔''☆۲۲

''صحنچی، جس میں پہلے صرف ایک بڑا سا نعمت خانہ اور دو پیڑھیاں پڑی رہتی تھیں اب باقاعدہ کھانے کا کمرا، یا ڈائننگ روم بن گیا تھا۔'' ☆۲۳

کھانے پینے اور رسمی باتوں کے گلے شکوؤں کا دور شروع ہو گیا۔ احمد کے ہندوستانی رشتے داروں کو سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس سے شکوہ تھا کہ وہ اتنا عرصہ ان سے لاتعلق کیوں رہا۔ احمد کے تینوں چچا اور والد اور تینوں بھائی ہندوستان ہی میں رہتے تھے۔ ایک بار احمد کے والد اس سے ملنے کے لیے پاکستان آئے تو وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ چچا میاں کو شکایت تھی کہ احمد نے بروقت انھیں اس خبر کی اطلاع نہ دی۔

احمد نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

''ان دنوں ۱۹۶۵ء کی جنگ چھڑی ہوئی تھی خط وطآ جا ہی نہیں رہے تھے۔'' ☆۲۴

والد کے انتقال کے ذکر ہی سے احمد کو اپنی چچی کے انتقال کا خیال آ گیا جس کے بارے میں چچا میاں احمد کو مطلع نہ کر سکے تھے۔ چچا نے اپنی مجبوری بتائی:

''اس وقت بھی دونوں ملکوں میں جنگ ہو رہی تھی، سرحدیں بند تھیں۔''

''...وہ اکہتر کی جنگ تھی۔'' احمد نے جلدی سے کہا... اس کی ہنسی نکل گئی۔ ''ہم ساری باتیں جنگوں اور جھگڑوں کے حساب سے ہی یاد رکھتے ہیں۔'' ☆۲۵

احمد کو رشتے داروں سے رابطہ رکھنے کے لیے صرف ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگ ہی رکاوٹ نہ بنی، بلکہ اصل مسئلہ اس وقت پیش آیا جب اس نے خفیہ ذرائع سے سری نگر کے رشتے داروں سے رابطہ رکھنے کے لیے اپنے ایک دوست کی مدد کی۔

احمد نے اپنے چچا کو اپنے دوست کے بارے میں بتایا کہ اس کے دوست کے ماں باپ، بہن بھائی اور رشتے دار سب سری نگر میں رہتے تھے۔

ان دنوں سری نگر سے پاکستان تو خط آ سکتا تھا مگر وہاں سے سری نگر کوئی خط نہیں جا سکتا تھا۔ اس وقت تک لاہور میں ہندوستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر کا دفتر تھا۔ ان صاحب نے سری نگر خط بھیجنے کا یہ طریقہ نکالا تھا کہ وہ ہندوستانی ڈپٹی ہائی کمشنر کے دفتر سے ڈاک کے ہندوستانی ٹکٹ لے آتے تھے۔ ☆۲۶

ڈاک کے ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے بھی انھیں الگ سے محنت کرنی پڑی۔

''انھوں نے وہاں کے کلرکوں سے دوستی کر لی تھی وہ انھیں ٹکٹ دے دیتے تھے۔ وہ خط لکھ کر لفافے میں بند کرتے، ہندوستانی ٹکٹ لگاتے اور کسی ایسے شخص کو دے دیتے جو ہندوستانی میں

خط لکھتا رہتا تھا۔ وہ شخص ان کے لفافے کو اپنے لفافے میں رکھتا اور ہندوستان کے کسی بھی شہر میں اپنے عزیز کو بھیج دیتا۔ لکھ دیتا کہ یہ دوسرا لفافہ لیٹر بکس میں ڈال دینا... اس مرتبہ انھوں نے مجھ سے کہا تو میں نے بھی ان کا لفافہ اپنے لفافے میں رکھ دیا۔ مجھے کیا خبر تھی، یہ مصیبت آ جائے گی۔'' ☆۲۷

اس خط میں جو لکھا تھا انھوں نے اسے غلط رنگ دے کر بہت بڑا مسئلہ بنا دیا۔

''...بچّوں کے پھنسیاں نکل آئی ہیں۔ بیوی کے سر میں درد رہتا ہے۔ وہ کہتے تھے یہ پھوڑے پھنسیاں اور سر کا درد کوڈ ورڈز ہیں۔ خفیہ اشارے ہیں۔'' ☆۲۸

خط پکڑے جانے کے بعد احمد کو ہندوستان کا ویزا حاصل کرنے میں کئی دشواریاں ہوئیں اس کے خلاف ایک فائل تیار کی گئی اور جب بھی احمد نے ویزے کے لیے درخواست دی اسے مسترد کر دیا گیا۔

ادھر ہندوستان میں چچا میاں کے خاندان کو بھی طرح طرح کے سوالات کر کے پریشان کیا گیا۔ تفتیش کا یہ سلسلہ چھ ماہ تک جاری رہا۔

احمد نے ڈپٹی کمشنر کو ساری بات سچ سچ بتا دی لیکن وہ اپنے اعتماد کو بحال نہ کر سکا، اور نہ ہی اسے ویزا مل سکا۔ ان کا کہنا تھا:

''دلوں میں میل آ جائے تو پھر بدگمانیاں پیدا ہو ہی جاتی ہیں اور تم بھی اپنی بدگمانیوں کی بھینٹ چڑھ گئے ہو۔'' ☆۲۹

کئی بار مایوس ہونے کے بعد احمد نے ویزے کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا لیکن ان کی اچانک حکومت کی طرف سے اسے ہندوستان میں تین روزہ کانفرنس کے لیے ویزا مل گیا۔ تین دن کی مدّت میں اس کے لیے سب رشتے داروں سے ملنا ممکن نہ تھا اور نہ ہی اسے ہر شہر کا ویزا ملا تھا۔

''...میں تھانولے کیسے جا سکتا ہوں؟ میرے پاس تو وہاں کی ویزا ہی نہیں ہے... تھانولے جانے کو اس کا کتنا دل چاہتا تھا۔ اس کی وہ گلیاں، وہ باغ اور وہ کھیت دیکھنے کو اس کا دل تڑپتا تھا جہاں اس کا بچپن اور لڑکپن گزرا تھا۔'' ☆۳۰

تین دنوں میں احمد نہ تو اپنے سارے رشتے داروں سے مل سکا نہ ساری جگہیں دیکھ سکا اور نہ ہی سب سے دل بھر کی باتیں کر سکا البتّہ تین ہی دنوں میں اسے اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ ہندوستان کے لوگوں کے دلوں میں پاکستان اور پاکستانیوں کے لیے جو بدگمانیاں تھیں وہ پچاس سال گزرنے کے بعد بھی ختم نہ ہو سکیں تھیں۔ اسے ہر ایک نے یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ تقسیمِ ہند کے ذمّے دار پاکستانی مسلمان ہیں۔ اس لحاظ سے ہندو مسلم فسادات کے ذمّے دار بھی مسلمان ہی ہیں،

اور طویل جدوجہد اور فسادات کے بعد جو ملک وجود میں وہ ایک کم زور ملک ہے۔

احمد کے ایک رشتے دار کا کہنا تھا:

''آپ کے ملک کی وجہ شہرت تو سیاسی لیڈروں کی لوٹ مار اور کرپشن ہے۔'' ☆۳۱

احمد نے بھی اپنے دل کا غبار نکالنے کے لیے کہہ دیا:

''تم لوگ بھی ہم سے پیچھے نہیں ہو۔'' ابھی پچھلے دنوں آپ کے ایک بڑے اخبار کی رپورٹر ہمارے ہاں آئی تھی۔ کرپشن کی بات چلی تو میں نے تمھارے بہار کا ذکر کر دیا۔ معلوم ہے اس نے کیا کہا؟ اس نے کہا، ہمارے یہاں تو کہا جاتا ہے کہ اگر پاکستان کو تباہ کرنا ہے تو اُسے بہار دے دو۔'' ☆۳۲

مولوی عبدالسّلام خان جو کانگریسی تھے ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو آزادی کے نتیجے میں کئی نقصانات کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنے گھر بار، جاگیر اور وطن کے علاوہ انھیں بہت سی تاریخی یادگاریں چھوڑیں۔ وہ اس حقیقت کو بھی ماننے سے انکار کر رہے تھے کہ تقسیمِ ہند نہ ہونے کی صورت میں ہندو اور سکھ اکثریت کی وجہ سے مسلمانوں پر حاوی ہو جاتے۔

ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد کے بارے میں ان کا نظریہ یہ تھا:

''آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔'' وہ بولے جا رہے تھے۔ ''ہم یہاں بہت ہیں تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا۔'' ☆۳۳

مولوی عبدالسّلام نے بحث کو طول دینے کے لیے آزاد ریاستوں کے مسئلے کو بھی چھیڑا:

''...نواب صاحب نے آزادی کے اعلان کے ساتھ ہی ریاست کو انڈین یونین میں شامل کرنے کا اعلان کر دیا تھا...اس اعلان کے ساتھ جلسے جلوس شروع ہو گئے تھے۔ مطالبہ یہ تھا کہ یہ مسلمان ریاست ہے۔ اس لیے اسے پاکستان میں شامل ہونا چاہیے۔'' ☆۳۴

ایک طرف مولوی عبدالسّلام کے اور دوسری طرف احمد کے دوست ماسٹر ممتاز کے نظریات تھے ماسٹر ممتاز جو کسی زمانے میں کمیونسٹ رہ چکا تھا، لیکن تقسیمِ ہند کے بعد اسے احساس ہوا کہ اس کی انسان دوستی پر شبہ کیا جانے لگا ہے۔

آزادی کے فوراً بعد جب احمد اور ممتاز ہندو شرنارتھیوں کے لیے کتابوں کا انتظام کرتے گئے تو اس دکان دار نے فوراً سوال کیا:

''تم کون جات ہو؟''

یہ سوال احمد کے لیے بالکل نیا تھا اور پریشان کرنے والا بھی۔ جس شہر میں وہ پیدا ہوا تھا...وہاں

کبھی کسی نے کسی سے ایسا سوال نہیں کیا تھا... ماسٹر ممتاز نے فوراً معاملے کو سنبھال لیا تھا۔'' گپتا ہیں یہ!'' ☆۳۵

بعد میں ماسٹر ممتاز نے احمد کو حالات کی نزاکت سنبھالتے ہوئے کہا:

''...اگر دکان کو معلوم ہو جاتا کہ ہم مسلمان ہیں تو وہ کہتا۔ تمھیں شرنارتھیوں سے کیا ہمدردی ہے۔ یاد نہیں، ہم ایک کانگریسی لیڈر کے پاس پیسے مانگنے گئے تھے تو اس نے کیا کہا تھا اس نے کہا تھا؟ اس نے کہا تھا۔ شرنارتھیوں کو بھیک مانگنا کیوں سکھا رہے ہو۔'' ☆۳۶

ممتاز نے اپنے بارے میں بتایا:

''تمھارے جانے کے بعد میرے ساتھ بہت برا ہوا... پہلے میرا تبادلہ ٹھری گڑھوال کر دیا گیا پھر پہلی بھیت بھیج دیا۔ ریٹائر ہوا تو اب تک پنشن کا جھگڑا چل رہا ہے ہر وقت سی آئی ڈی والے میرا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔'' ☆۳۷

ہندوستان کے سیاسی حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد ممتاز نے یہ اعتراف کر لیا تھا کہ جو مسلمان ہندوستان میں قیام پذیر ہیں، وہ مظلوم اور محکوم ہیں۔

''ہندو مسلمان میں فرق تو اب بھی نہیں کرتا، مگر حالات نے مسلمانوں کو آج کا سب سے مظلوم طبقہ بنا دیا ہے... اس شہر کے قریب قریب ہر گھر میں عورتیں اور بچے بیڑیاں بنا رہے ہیں کارچوبی کر رہے ہیں یا چکن بنا رہے ہیں اور مرد سائیکل رکشہ چلا رہے ہیں۔ پڑھنے کے لیے ان کے پاس وقت ہے نہ پیسا۔'' ☆۳۸

عبدالسلام اور ماسٹر ممتاز کے برخلاف چچا میاں کے خیال میں اعتدال تھا۔ انھوں نے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ ان کے بچے ہندوؤں کے ساتھ کاروبار بھی کر رہے تھے۔ اس بات پر احمد کو حیرت ہوئی۔

''عقیل ہندوؤں کے ساتھ بھی کاروبار کرتا ہے؟'' اب احمد کے اندر کا پاکستانی مسلمان جاگ اٹھا تھا۔

''کاروبار میں ہندو مسلمان نہیں ہوتا۔''

اور ہندو مسلم جھگڑے؟ احمد کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''وہ بھی چلتے رہتے ہیں۔ یہ کاروبار ہے، وہ سیاست ہے، جب کاروبار اور سیاست اکٹھے ہو جاتے ہیں تو ایسا بھی ہو جاتا ہے۔'' ☆۳۹

احمد کے یہ خیالات صرف ایک کردار کے خیال نہیں، بلکہ بہت سے پاکستانیوں کے خیالات ہیں جس کی وجہ ان کے لاشعور میں چھپا ہوا خوف اور عدم اعتماد ہے جیسا کہ افسانے میں بھی ایک جگہ اس خیال کو مسعود اشعر نے ایک کردار کے ذریعے بیان کیا ہے:

''...ایک بار کھٹ پٹ ہو جائے تو پھر غلط فہمیاں بڑھتی ہی رہتی ہیں۔ ہر جگہ دال میں کالا نظر آتا ہے۔'' ☆۴۰

۱۹۴۷ء کے فسادات میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کے ساتھ جو سلوک کیا اس سے ایک دوسرے کے خلاف جو نفرت اور بدگمانیاں پیدا ہوئیں۔ وہ پچاس سال گزرنے کے بعد بھی ختم نہ ہو سکیں آج بھی دونوں ملکوں کے لوگ نہ صرف ایک دوسرے کے خلوص پر شک کرتے ہیں، بلکہ انھیں اپنے ملک کے سامنے دوسرا ملک کم زور اور ترقی اور خوش حالی کے لحاظ سے اپنے ملک سے بہت پیچھے نظر آتا ہے۔

افسانے کا کردار احمد اگرچہ ہندوستان میں ایک سرکاری کانفرنس میں شرکت کے لیے گیا تھا لیکن اپنے پرانے وطن کو دیکھنے اور پرانے دوستوں اور رشتے داروں سے ملنے کے لیے وہ بے تاب تھا۔ اس کی سوچ، خیالات اور گفتگو میں ماضی چھپا ہوا تھا۔

ہندوستان میں آ کر اسے احساس ہوا کہ یہ ہندوستان اس ہندوستان سے مختلف ہے جسے وہ چھوڑ کر گیا تھا، اور جسے دیکھنے کے لیے وہ عرصہ دراز سے کوشش کر رہا تھا۔

ڈار سے بچھڑے

اس افسانے میں محمد اشرف نے پاکستان میں رہنے والے ان مہاجرین کا ذکر کیا جو ایک لمبا عرصہ گزارنے کے بعد بھی اپنے پرانے وطن کو فراموش نہیں کر پائے۔ پرانے وطن اور وہاں کے لوگوں سے ملنے کے لیے وہ آج بھی بے چین ہیں لیکن معاشی مجبوریاں اور ملازمتیں یا کاروبار ان کے لیے رکاوٹ بن جاتے ہیں۔

واحد متکلم، نواب غلام علی اور اس کی بیوی اور وزیر الدین اور اس کی بیوی افسانے کے کردار ہیں۔

افسانے کا مرکزی کردار ۱۸ سال کی عمر میں ہندوستان (یوپی) سے پاکستان ہجرت کر کے آ گیا تھا اور پاکستان میں اسے سرکاری نوکری بھی مل گئی تھی لیکن پرانے وطن اور بچپن کی یادیں اسے ہمیشہ ستاتی رہیں۔ ہندوستان جانا اس کے لیے ناممکن نہ تھا لیکن اس کی نوکری ایسی تھی کہ اسے حکومت سے اجازت ملنا مشکل تھا۔ اس کا اظہار واحد متکلم نے اس طرح بیان کیا ہے:

سرکاری افسر اتنی آسانی سے نہیں جا پاتے اور سرکار پوچھتی ہے کس سے ملنے جا رہے ہو۔ ☆۴۱

یہی کیفیت غلام علی کی بیوی کی تھی وہ بھی یوپی کی رہنے والی تھی اور اس کی شدید خواہش تھی کہ کم از کم ایک ہی بار وہ

ہندوستان کو دوبارہ دیکھ کر آئے ،لیکن اس کا شوہر چوں کہ تقسیمِ ہند سے پہلے ہی پاکستان رہتا تھا اور اسے ہجرت کے کرب سے گزرنا نہیں پڑا تھا۔اس لیے اس کے لیے وطن کی یاد یا اسے دیکھنے کی تڑپ ایک بے معنی جذبات تھے۔یہی وجہ ہے کہ جب بھی اس بیوی نے ہندوستان جانے کی بات کی وہ اسے کسی نہ کسی بہانے سے ٹالتا رہا۔غلام علی کی بیوی نے اس مسئلے کو حل کرنے کی آخری صورت یہ نکالی کہ وہ اپنے شوہر کے افسر (واحد متکلم) سے مدد حاصل کرے،لیکن غلام علی نے واحد متکلم کو اپنی بیوی سے ملوانے سے پہلے اسے سمجھایا:

''...وہ آپ سے کہے تو ذرا سختی سے منع کر دیجیے گا کہ اس کا پرمٹ نہیں بن سکتا۔'' ☆۴۲

واحد متکلم کے حیران ہونے پر اس نے وضاحت پیش کی:

''پاسپورٹ کی بات نہیں صاحب، آدمی کی زندگی میں ایک ہی جھنجٹ تھوڑی ہوتا ہے اسے تو بے کار کا شوق ہے بھارت جانے کا۔اس کا شوق پورا کرنے میں میرے چار پانسو اٹھ جائیں گے۔'' ☆۴۳

غلام علی وزیر الدین کی بیوی بھی ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئی تھی۔وطن شہر، رشتے داروں اور عزیزوں کی یادوں نے اسے بھی ہندوستان جانے کے لیے مجبور کر دیا۔

اس نے چوری چھپے پرمٹ بنوالیا اور پھر کانوں کا زیور بیچ کر وزیر الدین سے اجازت مانگی۔ وزیر الدین کو معلوم ہوا تو اسے اچنبھا ہوا اور غصہ بھی آیا۔اس نے اوپری دل سے اجازت دے دی اور رات کو اس کے بکسے سے پرمٹ نکال کر جلا دیا صبح اٹھی تو پرمٹ غائب۔اس نے فیل مچایا، اور وزیر الدین سے کہا کہ یہ اسی کا کام ہے۔وزیر الدین نے پہلے تو بہانے ملائے، اور پھر...ڈنڈا لے کر جٹ پڑا کہ حرام زادی تین چار مہینے تک کیا تیری ماں مجھے روٹی پکا کر کھلائے گی۔ ☆۴۴

غلام علی نے واحد متکلم کو وزیر الدین کا یہ کارنامہ اپنی زیادتیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے سنایا تھا لیکن غلام علی نے جس انداز میں وزیر الدین کی وکالت کی تھی واحد متکلم کو غلام کی سوچ بے حسی اور خودغرضی پر حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔اس وقت واحد متکلم کی ذہنی کیفیت کو افسانہ نگار نے اس طرح بیان کیا ہے:

'غلام علی — تم بہت کمینے اور بہت بھولے ہو۔تم اور تمھارا دوست نہیں جانتے کہ اس جگہ سے بچھڑ کر انسان کی کیا حالت ہو جاتی ہے۔جہاں اس نے پیدا ہو کر ماں.... اور باپ کی شفیق انگلیوں کے لمس کو اپنے سر پر محسوس کیا ہو... جہاں اس کا بچپن لڑکپن سے گلے ملا ہو۔تمھیں اس

کا علم نہیں غلام علی کہ انسان ان لمحوں کو کتنا عزیز رکھتا ہے جن لمحوں میں اس کا بھولا ذہن، معصوم، سر پھرے اور خود سر جذبوں کو خون پلا کر پالتا ہے۔' ☆ ۴۵

جب واحد متکلّم کی غلام علی کی بیوی سے ملاقات ہوئی تو اسے ایک طرف غلام علی کی التجائیں یاد آئیں اور دوسری طرف اس کی بیوی کی آخری اُمّید اور اصرار تھا۔ عجیب کش مکش اور بدحواسی میں مبتلا ہو گیا، لیکن غلام علی کے خیالات سے شدید اختلافات کے باوجود اسے اسی کا پاس رکھنا پڑا اور اس نے غلام علی کی بیوی سے کہا:

''تمھارا پاسپورٹ نہیں بن پائے گا — تم گھر نہیں جا سکو گی بھتو۔'' ☆ ۴۶

واحد متکلّم کا جواب سن کر غلام علی بیوی بے انتہا دکھی ہوگئی، لیکن پھر بھی اپنی بات کو درست ثابت کرنے اور منوانے کے لیے کوئی نہ کوئی دلیل پیش کرتی رہی۔ جس اس کی وطن کو دیکھنے کی تڑپ اور بے چارگی ثابت ہوگئی۔ افسانہ نگار نے اس عورت کی کیفیت کو اس طرح بیان کیا ہے:

''...کیوں بھیّا...آپ بھی نہیں بنوا سکتے۔ آپ تو سب سے بڑے دروغہ ہیں۔''

''ہاں۔ دیکھ لو سب سے بڑا دروغہ خود اپنا پرمٹ نہیں بنوا سکتا تو تمھارے لیے کیسے بنوائے پائے گا۔''

''لیکن وزیرالدین بھائی کی گھر والی نے تو اپنا پرمٹ بنوالیا تھا'' وہ بولی جیسے مایوسی کے عالم میں یہی ایک حوالہ اس کا سہارا رہ گیا ہو۔'' ☆ ۴۷

اس کی ساری تدبیریں اور منصوبے ناکام ہو گئے اور جب اس کی آخری اُمّید بھی ختم ہوئی تو اس نے اپنی بے بسی پر رو دھو کر صبر کر لیا۔

افسانے کا کردار نواب بھی ہجرت کا مارا ہوا ہے اس کا دکھ واحد متکلّم، غلام اور وزیرالدین کی بیوی سے مختلف نہ تھا۔ کئی سالوں کے بعد اچانک واحد متکلّم اور نواب کی ملاقات شکار کھیلنے کے دوران ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو فوراً پہچان گئے، اور دونوں نے ماضی کو شدّت سے یاد کیا۔

''میں نے اس ایک لمحے میں تیس برس کا سفر طے کر لیا...اور میرے حافظے نے بڑی سبک دستی سے بچپن کی امنگوں، لڑکپن کی جستجو اور شروع جوانی کے ولولوں کے بے حد خوش نُما رنگ بھر دیے۔ میں نے یوپی کے گنگا جمنا کے دو آبے کو بالکل واضح چمکتا... ہوا دیکھا۔ وہاں کی مسجدیں...وہاں کے سارے محلّے ساری گلیاں دیکھ ڈالیں۔ قصبے کے سارے گھر دیکھ ڈالے، پھر اپنا مکتب دیکھا پھر اسکول دیکھا سارے بزرگ اور تمام ماسٹر شفیق چہرے لیے میرے سامنے کھڑے تھے۔'' ☆ ۴۸

واحد متکلّم کی طرح نواب کو بھی بہت سی باتیں یاد آ گئیں اور اس نے بچپن، لڑکپن اور جوانی کے بہت سے یادگار واقعات کو دہرایا اور بچھڑے ہوئے دوستوں کو یاد کیا۔نواب پرانے وطن اور ساتھیوں سے ملنے کے لیے بے تاب تھا اور ایک بار پھر ان سب کے درمیان جانا چاہتا تھا لیکن اس نے اپنی مجبوری یہ بتائی:

> ''میں کراچی سے ایک دن باہر رہوں تو دو ہزار کا نقصان ہو جاتا ہے۔ ہندوستان جاؤں تو کم از کم چالیس پچاس ہزار کی چوٹ پڑے گی۔'' ☆۴۹

افسانے میں واحد متکلّم ،نواب، وزیرالدین اور غلام علی کی بیوی، سب اپنے آبائی وطن شہر محلّے ،گلیوں، دوستوں اور رشتے داروں کو دیکھنے کے لیے بے چین ہیں لیکن ہر ایک کی اپنی اپنی مجبوریاں ہیں۔

واحد متکلّم سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے حکومت کی پوچھ گچھ سے ڈر رہا ہے نواب کے پاس وقت اور پیسا دونوں ہیں لیکن پیسا خرچ کرنے کا حوصلہ کہاں سے لائے۔ بقول فیض احمد فیض:

> تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے

غلام علی کو اپنی بیوی کا بھارت جانا برا نہیں لگتا لیکن وہ چار پانچ سو روپے خرچ ہونے سے ڈرتا ہے اور مجبوراً بیوی کو شوہر کے جھوٹ کو سچ سمجھ کر حالات سے سمجھوتا کرنا پڑا۔

وزیرالدین کی بیوی کا تجربہ سب سے زیادہ تلخ ہے۔اپنے پرانے وطن کو دیکھنے کے شوق میں اس نے اپنے زیور بیچ کر پرمٹ بنوالیا،لیکن اسے شوہر کی اجازت نہ مل سکی کیوں کہ اس کا شوہر تین چار مہینے تک کہیں اور کھا نہیں کھا سکتا تھا۔

ان کرداروں کی مجبوریوں کو واحد متکلّم نے افسانے میں اس طرح بیان کیا ہے:

> ''...ہم لوگ بہت بے اختیار... لاچار... مجبور ...اور بے بس ہیں میں اگر ایک بار ہندوستان جانے کے لیے اس ملازمت سے استعفیٰ دے دوں تو گھر والوں کی زندگی کی گاڑی کیسے آگے بڑھے گی، اور نواب تم اگر فیکٹری چھوڑ کر بیس دن کو بھی پاکستان چھوڑ دو چالیس پچاس ہزار کا نقصان کون بھرے گا۔'' ☆۵۰

تقسیمِ ہند کے بعد مسلمانوں نے اپنی زندگی کے تحفظ اور مذہبی آزادی اور سماجی انصاف حاصل کرنے کے لیے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی۔انھیں زندگی کا تحفظ تو حاصل ہو گیا، اور کسی حد تک سماجی انصاف تو مل گیا،لیکن وہ ماضی کی یادوں سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکے۔

آج بھی انھیں یادیں اپنے آبائی وطن کو پھر سے دیکھنے اور بچھڑے ہوئے ساتھیوں سے ملنے کے لیے اکساتی ہیں لیکن کہیں معاشی مجبوریاں اور کہیں قانونی تقاضے انھیں اس کی اجازت نہیں دیتے۔

بدن کا طواف

امراؤ طارق کا افسانہ ''بدن کا طواف'' تقسیمِ ہند کے کچھ عرصے کے بعد ہندوستان سے پاکستان آنے والی ایک تنہا اور بے بس لڑکی کے بارے میں ہے۔

تقسیمِ ہند کے نتیجے میں افسانے کے مرکزی کردار منیرہ کے گاؤں کے بیشتر لوگ ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے، لیکن منیرہ اور اس کے والد نے ہندوستان ہی میں رہنے کو ترجیح دی۔ کچھ عرصے بعد منیرہ کی والد کا انتقال ہو گیا اور منیرہ تنہا رہ گئی پھر ایک عرصے کے بعد اس کی خالہ ہندوستان آئیں اور منیرہ کو اپنے ساتھ لے گئیں۔ وطن چھوڑتے وقت منیرہ کو بہت دکھ ہوا۔ اس کیفیت کو افسانے میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> خالو جان کے ساتھ پاکستان روانہ ہوئی تو ایسا لگا کہ اپنے پیچھے یادوں، چاہتوں اور پیار کے خزانے چھوڑ چلی ہو جب بیل گاڑی سست رفتاری کے باوجود گاؤں لمحے بھر میں درختوں کے جھنڈ کے پیچھے چھپ گیا تو اس کے اندر جیسے کوئی چیز چھن سے ٹوٹ گئی ہو۔☆۵۱

منیرہ پاکستان میں بہت سی اُمیدیں اور ارمان لے کر گئی تھی اسے یقین تھا کہ کچھ بہت اس کی شادی اپنے منگیتر اور خالہ زاد سلیم کے ساتھ ہو جائے گی، لیکن حالات اس کے خیالات سے بالکل مختلف نکلے۔ سلیم کے رویّے میں بہت سی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ وہ مذہب، گھر اور اخلاقی اقدار سے بے نیاز ہو چکا تھا، بقول مہناز ضمیر:

> جمہوریت کے نام لیواؤں نے اپنا راگ اس قدر الاپا کہ بیشتر نوجوانوں کو مذہب سے بے گانہ کر دیا، نام نہاد ترقی پسندی نے ان کے اذہان کو اس درجے متاثر کیا کہ نیک و بد کی تمیز جاتی رہی۔☆۵۲

پاکستان آ کر منیرہ نے ایک نرسنگ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ سلیم اسے باقاعدگی سے اسکول چھوڑنے اور لینے جاتا۔ بہت جلد سلیم نے منیرہ کو اعتماد میں لے لیا۔ اور شادی کا لالچ دے کر اس کی بے حرمتی کرتا رہا۔ اور جب اپنا دل بھر گیا تو ایک ہزار کے عوض اس کا کسی اور سے سودا کر دیا۔ مجبوراً منیرہ کو گھر چھوڑنا پڑا۔

اس کے بعد منیرہ کو مردوں سے سخت نفرت ہو گئی لیکن ایک دن ڈاکٹر اختر نے منیرہ کے دل سے مردوں سے بدگمانیاں نکال دیں اور یوں منیرہ ایک بار پھر دھوکے میں آ گئی۔ اس بار بھی منیرہ کی خوش فہمیاں زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکیں۔ ڈاکٹر اختر کا یہ جملہ اسے خوابوں کی دنیا سے باہر لے آتا ہے:

> ''منیرہ میں ری کنڈیشنڈ کار رکھ سکتا ہوں اور کچھ نہیں۔'' ☆۵۳

امراؤ طارق اس افسانے کے ذریعے یہ بات ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تنہا اور بے بس عورت اپنوں میں ہو یا غیروں میں مردوں

کے لیے وہ ایک کھلونا ہی ہوتی ہے۔ جیسا کہ افسانہ کی کردار ''منیرہ'' کے ساتھ اپنوں نے وہی سلوک کیا جو فسادات اور ہجرت کے دوران ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمان عورتوں کے ساتھ کیا۔

دراڑوں میں سانپ

امراؤ طارق کے افسانے ''دراڑوں میں سانپ'' میں قیامِ پاکستان کے بعد لسانی اور علاقائی بنیاد پر فرقے وارانہ پابندیوں کا ذکر کیا ہے۔

تعلیمی اداروں اور ملازمت کے حصول کے لیے فارم پر کرتے وقت بھی یہ لکھا جاتا ہے کہ اس کی مادری زبان کیا ہے، اور اس کے والدین کا تعلق کہاں سے ہے۔

ہجرت کے اکتیس سال بعد بھی افسانے کے مرکزی کردار کا بیٹا سوال کرتا ہے:

''پاپا! آپ کی جائے پیدائش کہاں کی ہے؟'' تو اس کے والد کو بہت تکلیف پہنچتی ہے۔

''بیٹے تم اتنے سرکش ظالم اور بے حس ہو کہ تمھیں میری اذیت کا کوئی احساس نہیں۔''

''پاپا مگر مجھے تو یہ فارم پر کرنا ہے جس میں میری اور میرے باپ کی جائے پیدائش پوچھی گئی ہے۔'' ☆۵۴

اس افسانے کے ذریعے امراؤ طارق نے ان لوگوں پر طنز کی ہے جو معاشرے کو علاقوں کی بنیاد پر فرقوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

❀ ❀ ❀

ب: ناول اور ناولٹ کی فضا

اُردو ناول اُردو ادب کی وہ صنف ہے جس میں نہ صرف ۱۹۴۷ء کے فسادات اور ہجرت کے تلخ تجربات کو بیان کیا ہے، بلکہ فسادات اور ہجرت کے بعد مہاجرین کو نئے ملک میں آ کر آبادکاری، ملازمت اور نئے ملک کے ماحول کا عادی ہونے میں بھی کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ناول نگاروں نے ان مسائل کو بھی شدت سے محسوس کیا اور ان مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔

اس سلسلے میں شوکت صدیقی اپنا شاہ کار ناول ''خدا کی بستی'' لکھ کر بہت شہرت کمائی۔ ہمارے موجودہ معاشرہ ہو یا قیامِ پاکستان کے ابتدائی دنوں کی بات ہو۔ اس ناول میں شوکت صدیقی نے معاشرے کے ایک ایک مسئلے کو بیان کیا ہے۔

تقسیم کے بعد مہاجرین جب لٹ پٹ کر پاکستان آئے تو مقامی لوگوں نے ان کو حقیر سمجھا۔ آبادکاری اور ملازمت کے سلسلے میں انھیں تلخ تجربات سے گزرنا پڑا۔ گلی، محلّے اور دفاتر ہر جگہ انھیں نئے نئے تجربات سے واسطہ پڑا جس نے ان کی زندگی پر بہت گہرے اثرات ڈالے۔ ''خدا کی بستی'' کے کردار ان ہی مسائل میں اُلجھے ہوئے ہیں۔

تقسیمِ ہند کے بعد کی صورتِ حال پر خدیجہ مستور نے بھی ''زمین'' کے نام ایک ناول لکھا جس میں مہاجرین کے غلط کلیم داخل کروانے والے نودولتیے طبقے کی تشکیل کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ مہاجرین کے آپس تعلّقات کو بیان کیا ہے۔ ناجی اور کاظم کے کردار نودولتیے طبقے اور غریب مہاجرین کی نمائندگی کرتے ہیں۔

پاکستان کے ابتدائی مسائل پر قرۃ العین حیدر کا ناولٹ ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' بھی اپنے موضوع اور انداز بیان کے لحاظ سے ایک منفرد ناولٹ ہے۔ اس ناولٹ میں بھی انھوں نے قیامِ پاکستان کے بعد معاشرے کے اعلیٰ طبقے میں شامل ہونے کے لیے مہاجرین کی کش مکش کو بیان کیا ہے۔

ہاؤسنگ سوسائٹی

قرۃ العین حیدر نے اس ناولٹ میں تقسیمِ ہند کے بعد ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنے والے مہاجرین کی بدلتی ہوئی معاشی اور سماجی حیثیت اور نودولتیے طبقے کی اخلاقی پستیوں کو بیان کیا ہے۔

ناولٹ کا پلاٹ مربوط ہے اور مختلف واقعات میں تسلسل ہے۔ ناولٹ میں امیر طبقے کا پاکستان میں آ کر در در کی ٹھوکریں کھانے اور غریب طبقے کا جھوٹ، فریب اور رشوت خوری کا راستہ اختیار کر کے راتوں رات امیر ہونے کا ذکر ایک منفرد اور دل چسپ انداز میں کیا گیا ہے۔ بقولِ نیلم فرزانہ:

> ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' کا موضوع تقسیمِ ہند سے پیدا ہونے والی اقتصادی اور سماجی صورتِ حال ہے جس میں تہذیب و اقدار کی شکست و ریخت جاگیردار طبقے کا زوال، نئے سرمایہ دار طبقے کا عروج اور پھر سب سے بڑھ کر استحصال جو اس سرمایہ دار طبقے نے ضمیر فروشی اور بے حسی کے ساتھ شروع کیا، سب ہی کچھ اس ناولٹ میں سمٹ آئے ہیں۔☆ ۵۵

ناولٹ کے کردار شروع سے لے کر آخر تک کبھی معاشی کش مکش میں کبھی معاشرتی اور کبھی نفسیاتی کش مکش کا شکار نظر آتے ہیں۔

تقسیمِ ہند کے پس منظر میں لکھے گئے اس ناولٹ میں انھوں نے مہاجرین کی بے چینی اور آنے والے وقت سے خوف کو بہت اچھے انداز میں بیان کیا ہے:

> روزانہ کھوکھرا پار عبور کر کے راجستھان، دلّی اور یوپی کا ایک نیا پریشان حال قافلہ ان محلّوں میں چھاونی چھاتا۔ کیسی کیسی مصیبتیں اُٹھا کر لوگ ہندوستان سے نکلے تھے اور یہاں ان کو کیسی کیسی مصیبتیں اٹھانا تھیں...ہر شخص نئی سرزمین پر زندہ رہنے کے لیے از سرِ نو زندگی شروع کرنے کے لیے بری طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔☆ ۵۶

جشید علی، سلمان مرزا، سلمیٰ مرزا عرف بٹیا اور ثریا حسین ناولٹ کے اہم کردار ہیں۔

ناولٹ کا کردار سیّد جمشید علی تقسیمِ ہند سے قبل معمولی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کا تعلق ایسے گھر سے تھا جہاں عام طور پر وسائل کی کمی کی وجہ سے خواب حسرت بن جاتے۔ جمشید کے والد سیّد مظہر علی کو ایل ایل بی کرنے کے بعد ملازمت نہ ملی۔ کئی سال تک بے روزگار رہنے کے بعد انھوں نے درویشانہ زندگی اختیار کر لی۔ جمشید کی شدید خواہش تھی کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرے لیکن والد کے بے روزگار ہونے کی وجہ سے اسے کم عمری ہی میں گھر کا سرپرست بن کر تمام ذمّے داریاں پوری کرنی پڑیں، اور گنج محمد سے کارن پور چلا گیا۔

> اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ کان پور جا کر جی توڑ کر محنت کرے گا۔ فرسٹ ڈویژن لائے گا۔ مقابلے کے امتحان پاس کرے گا، اور ایک دن اس کے نام کے آگے لکھا جائے گا ایس جے علی آئی سی ایس پی اور پھر جب میں محمد گنج جاؤں گا تو کسان کہیں گے جنٹ صاحب دورے پر آئے ہیں۔☆ ۵۷

اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے اس نے تعلیم کے ساتھ ساتھ ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیا تا کہ گھر کا خرچ بھی چلتا رہے۔ اپنی محنت سے اس نے ایم اے کر لیا۔

اس دوران جنگِ عظیم دوم شروع ہوگئی اور ملٹری اسٹور کے محکمے میں حوالدار کی نوکری مل گئی اس نوکری کا اس نے بھرپور فائدہ اٹھایا وہ اکثر کینٹین سے کھانے پینے کا سامان لے آتا اور مناسب تنخواہ سے ان کے گھر کے حالات پہلے سے بہتر ہو گئے، لیکن جنگ کے خاتمے کے بعد یہ محکمہ بھی ختم ہوگیا۔ جب ملک کی تقسیم ہوئی تو وہ کراچی چلا گیا۔

کراچی پہنچ کر حالات نے پلٹا کھایا اور کچھ ہی عرصے کے بعد جمشید نے اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کر امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار شروع کر دیا۔

> وہ ہندو تاجروں کے انخلا کا زمانہ تھا۔ اس لیے اسے اپنا کاروبار جمانے میں بہت آسانی ہوئی۔ جنوری ۱۹۴۸ء کے بلوے کے بعد ایک دو منزلہ کوٹھی عامل کالونی نمبر۲، میں خالی ہوئی تو اس نے اپنے نام الاٹ کروالی... ڈیڑھ سال کے اندر اندر کراچی کی نئی دنیا میں اس کے قدم مضبوطی سے جم گئے۔☆۵۸

ایک سال بعد اس نے اپنے گھر والوں کو بھی پاکستان سے بلا لیا۔ پاکستان آ کر جمشید کے بہن بھائیوں نے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخلہ لے لیا۔ جب زندگی کی ساری آسائشیں اور خوشیاں ملیں تو جمشید کی والدہ کی صحت بھی ٹھیک ہوگئی اور رفتہ رفتہ ان کے مزاج میں بھی نرمی آ گئی۔ انھی دنوں جمشید کو اپنی بیٹی فرحت النسا شدت سے یاد آ گئی اور اسے فرحت کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں پر شرمندگی ہوئی تو ایک دن وہ اپنے ہندوستان میں اپنے گاؤں محمد گنج گیا۔ ہندوستان جا کر اس نے پاکستان کے بارے میں ایسی باتیں کیں کہ سب کو پاکستان کی ترقی اور خوش حالی پر رشک آیا۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے تصور ہی سے ان کے ذہن میں مخصوص سوال آئے، شراب کے بارے میں انھوں نے پوچھا:

> ''ارے ام الخبائث تو ممنوع ہوگی۔ ماشاءاللہ سے اسلامی ملک ہے۔''
>
> ''بھیا تنک تم ہی بتاؤ، تمھارے ہاں قومی پہناوا کیا ہے۔''
>
> ''پاکستان میں تو مستورات پردے میں رہتی ہوں گی۔'' ☆۵۹

کراچی میں آ کر فرحت النسا ''فیری'' بن گئی اور بہت اعلیٰ اور مہنگے اسکول میں اس کا داخلہ ہوگیا اور اس کی تربیت کے لیے اینگلو انڈین گورنس مقرر کر دی گئی۔

فرحت النسا کے بعد جمشید کے والد سیّد اختر علی نے بھی درویشانہ زندگی کو خیر باد کہا اور وہ بھی پاکستان چلے آئے، اور بقول ان کے:

> ''ہمیں بشارت ہوئی تھی کہ پاکستان چلے جائیں۔'' ☆۶۰

پاکستان آ کر سیّد اختر علی جمشید کے ساتھ کاروبار سنبھال لیا اور اب سیّد اختر علی بھی جمشید علی کے رنگ میں رنگنے لگا، اور دھوکے بازی، جھوٹ اور مکاری کے سہارے ترقی کی منازل طے کرنا شروع کر دیں۔

سیّد اختر علی نے پاکستان میں آ کر اپنے خاندان کی فرضی جائیداد کے بارے میں بہت سی من گھڑت کہانیاں سنائیں:

''... میں نے تو اپنی کا پور کی کوٹھی کا کلیم داخل کر دیا ہے فی الحال منظور ہونے پر بھی اس کا چالیس فی صدی ہی ملے گا مگر صبر وشکر کر کے وہی قبول کر لیں گے ... یہاں تو ہر طرف لوٹ مچی ہوئی ہے آبادکاری کے محکمے میں ذرا بھی انصاف نہیں۔ یہ ملک تو بالکل اندھیری نگری بنا ہوا ہے۔ ☆۶۱

ناولٹ کا دوسرا اہم کردار سلیمان مرزا کا ہے۔ سلمان کا تعلق اعلیٰ طبقے سے تھا اس کے والد کلکٹر تھے سلمان کا تعلق کمیونسٹ پارٹی سے تھا اپنی مصروفیات کی وجہ سے وہ الہٰ آباد میں رہتا۔ سلمان کی بہن سلمٰی مرزا مسوری کے کانونٹ میں پڑھی تھی۔ ان کے گھر کے تمام افراد خدا ترس اور نیک تھے۔

بوٹا بیگم کی بیٹی کو بھورے خان کے چنگل سے نکالنے میں سلمان کے گھر والوں نے ان کی بھرپور مدد کی تھی، اور بوٹا بیگم اور اس کی بیٹی عرف بسنتی بیگم کو اپنے گھر میں رکھ لیا تھا، اور ثریا بیگم کی تعلیم کے اور دوسرے اخراجات پورے کرنے کی ذمّے داری لے لی تھی ثریا کو مصوری کا بہت شوق تھا۔ مصوری میں اسے ہمیشہ اوّل انعام ملتا۔ قابلیت کی وجہ سے ثریا کو لکھنؤ آرٹ اسکول میں داخلہ مل گیا جہاں تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسے الہٰ آباد میں نوکری مل گئی۔

''سات سال سے ہم اس محل میں رہ رہے ہیں۔ مجھے مفت کے ٹکڑے توڑتے ہوئے شرم آتی ہے۔ مجھے سو روپے ماہوار نوکری مل گئی ہے۔ شام کے وقت میں ٹیوشن بھی کروں گی اور شہر میں مکان لے کر رہوں گی۔'' ☆۶۲

الہٰ آباد میں آنند موہن گھوش نے ثریا کی بہت حوصلہ افزائی کی اور ثریا کو بہترین مصورہ کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ ثریا سات سال تک سلمان کے گھر رہی تھی لیکن اس وقت وہ سلمان سے پردہ کرتی تھی۔ کچھ ہی ملاقاتوں کے بعد دونوں کی دوستی ہوگئی اور ثریا نے بھی سلمان کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔

ان ہی دنوں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے اور سلمان کے مسوری والے گھر کو ہندوؤں نے آگ لگا دی۔ سلمان کے گھر والے پاکستان چلے گئے۔ پاکستان جا کر حالات نے پلٹا کھایا اور وہ کیا سے کیا ہو گئے۔ بابا چلنے پھرنے کے قابل نہ رہے۔ صرف زیور بیچ کر گھر کا خرچہ پورا نہیں کیا جا سکتا تھا سلمٰی مرزا کو ایک اسکول میں ملازمت کرنی پڑی۔

کچھ عرصے کے بعد سلمان بھی پاکستان آ گیا۔ کچھ دن کی کوشش کے بعد اسے پتا چل گیا کہ اس کے والدین لاڑکانہ میں ہیں، اور بہت سخت زندگی گزار رہے ہیں۔

پروشل سروس والوں کی پنشن کے کاغذات ابھی سرکاری دفتروں میں اٹکے پڑے تھے۔
قصرِ سلمان متروکہ جائیداد قرار دے دیا گیا۔ الہٰ آباد بنک نے اطلاع دی ہے کہ اکاؤنٹس انھوں
نے منجمد کر لیے ہیں تاوقتیکہ موو ایبل پراپرٹی کے سلسلے میں کوئی معاہدہ نہیں ہو جاتا۔ ☆۶۳

لاڑکانہ سے سلمان کے گھر والے کراچی آ گئے، اور پیر الٰہی بخش کالونی کے دو کمروں والے کوارٹر میں رہنا شروع کر دیا۔ ان کوارٹروں کے آس پاس کچرے کے ڈھیر اور کیچڑ تھا ان کا یہ گھر ہندوستان والے گھر کے سامنے اور بھی معمولی نظر آتا۔ سلمان اور سلمیٰ مرزا کے لیے بہت کڑا وقت تھا۔ سلمیٰ کو ہر لحہ یہی وہم رہتا کہ شاید لوگ ان کی غربت کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ سلمان کی سرگرمیاں جب جاری رہی تو اسے غیر معینہ مدّت کے لیے کراچی کے باہر نظر بند کر دیا گیا بی اے کرنے کے بعد سلمیٰ مرزا نے پھر سے اسکول میں ملازمت کرنا شروع کر دی۔ اسکول کی تنخواہ سے جب گزارہ کرنا مشکل ہوا تو مجبوراً اسے ایک بڑی فرم میں مینیجنگ ڈائریکٹر جمشید علی کی پرسنل سیکرٹری کی نوکری کرنا پڑی۔

جمشید علی نے اسے اپنی پرسنل سیکرٹری بنانے سے پہلے اس کی بھولی بھالی اور معصوم صورت کو دیکھ کر سوچا تھا:

'...میں اس لونڈیا کو groom کروں گا۔ contact woman ثابت ہوگی ایک سے ایک بڑا
گھاگ اس کی بھولی بھالی صورت پر ریشہ خطمی ہو کر سارے کاروباری راز اگل دے گا —
لاکھوں کے معاملات منٹوں میں طے ہو جائیں گے۔' ☆۶۴

سلمیٰ مرزا اس تنخواہ سے اپنی والدہ کی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ سلمان کے لیے پھل اور کتابیں وغیرہ خریدنا چاہتی تھی۔ پہلی بار پارٹی پر جانے کے لیے تیار ہوتے وقت سلمیٰ مرزا دل ہی دل میں بہت شرمندہ ہوئی لیکن سات سو روپے تنخواہ کا سوچ کر وہ اپنا فیصلہ بدل نہ سکی۔

''انھیں بوس کے غیر ملکی دوستوں کو انٹرٹین کرنا تھا۔ وہ اس پارٹی کی ہوسٹس تھیں اور انھیں لامحالہ
بوس کی مسٹریس بھی سمجھا جائے گا— ہم مرکیوں نہیں جاتے۔'' ☆۶۵

پہلی ہی پارٹی میں سلمیٰ نے دوسروں کے دل میں اپنے لیے جگہ بنالی۔ بقولِ جمشید علی:

''...لوگ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ اگر اس ملک میں اتنی چارمنگ اور پرفیکٹ سیکریٹریز ہوتی ہیں
تو ہم سارا کاروبار یہاں منتقل کرنے کو تیار ہیں۔'' ☆۶۶

ناولٹ کی کردار ثریا بیگم عرف بسنتی بیگم بھی ایک دن ہندوستان سے پاکستان تک پہنچ گئیں اور پاکستان آ کر انھوں نے اپنی محنت اور لگن سے اپنے آپ کو منوایا اور وہ ایک کالج میں آرٹ کی لیکچرر بن گئی۔ اسٹاف کے مشورے پر اس نے قسطوں پر سوسائٹی میں چار سو گز زمین خرید لی، اور مکان بنانے کے لیے بینک سے قرضہ لے لیا، اور چھ مہینے ہی میں اس نے خوب صورت

گھر بنالیا اور آہستہ آہستہ اس میں سامان لاکر رکھ دیا۔

بوٹا بیگم محمد گنج میں ڈولی میں بیٹھ کر باہر نکلتی تھیں۔ قصر سلمان میں بھی ان کا پردہ قائم رہا۔ الٰہ آباد میں وہ ثریا کے چند دوستوں کے سامنے آنے لگیں۔ ڈھاکے میں انھوں نے ساڑھی پہننی شروع کر دی لیکن پردہ ترک نہ کیا، لیکن کراچی میں آ کر ان کا پردہ ختم ہو گیا اب وہ ہر جگہ آزادی سے جاتیں۔

> اب وہ بیگم حسین کہلاتی اور ساڑھی پہنے بڑی متانت کے ساتھ آنچل سے سر ڈھکے... سائیکل رکشا پر بیٹھی بوہری بازار جاتی نظر آتی۔ ☆۶۷

ثریا اور بوٹا بیگم کی یہ زندگی گذشتہ زندگی سے بہت مختلف تھی۔ عزت اور دولت اب ثریا کا مقدر بن چکی تھی۔ فنی حلقوں میں اس کا تعارف بڑے شاہانہ انداز میں کروایا جاتا اور ثریا بہت سی پارٹیوں کی رونق ہوتی۔

> کراچی کے فنی حلقوں کے لیے میں ثریا حسین محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ مس حسین نے جو اتر پردیش (بھارت) کے ایک تعلقہ دار کی صاحب زادی ہیں، مسوری کانونٹ میں تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد شانتی نکیتن اور... ☆۶۸

انھی دنوں جمشید کی بہن عالیہ سیّد اپنی چند امریکن دوستوں کے ساتھ ثریا سے تصاویر خریدنے آئی۔ امریکن لڑکیوں کو ثریا کی بنائی ہوئی تصاویر بہت پسند آئیں۔ عالیہ کے ذریعے ثریا جمشید علی سے متعارف ہوئی۔ جمشید نے ایڈورٹائزنگ کمپنی میں نو سو روپے ماہوار پر نوکری دلوادی۔ تنخواہ بڑھی تو ثریا کا معیارِ زندگی بھی بلند ہوتا گیا۔ ایجنسی میں کام کرنے کے ایک سال بعد ہی اسے اسکالرشپ مل گیا اور پیرس چلی گئی اور اس طرح ثریا نے ترقی کی ایک اور منزل طے کر لی۔ اب ثریا کو سلمان کا خیال بھی کبھی کبھار ہی آتا۔

جمشید علی اپنے اپنے گھر ''ہاؤس وارمنگ'' بننے کی خوشی میں شہر کے تمام اہم لوگوں کی دعوت کی۔ اس دعوت میں ثریا حسین اور سلمیٰ مرزا نے بھی شرکت کی۔ دعوت میں کھانے پینے کے علاوہ شراب اور ناچ گانے کا بھی بندوبست کیا گیا تھا۔ اس پارٹی میں جمشید اور ثریا نے بھی شراب پی کر رقص کیا۔ سلمیٰ کے لیے یہ بات حیران کن اور تکلیف دہ تھی۔ سلمیٰ جو کئی سالوں کے ثریا سے ملی تھی۔ سلمیٰ کے مزاج میں اتنی بڑی تبدیلی کی اسے ہرگز توقع نہ تھی۔

> ''ثریا باجی!'' اس نے دل میں کہا۔ ''بھیا آپ کے نام کی مالا جپتے جپتے برسوں کی قید کاٹنے چلے گئے۔ جب وہ قیدِ تنہائی کی لمبی مدت کے بعد باہر نکلیں گے ان کے بال سفید ہو چکے ہوں گے، لیکن... نااُمید نہ ہوں گے کبھی ہار نہ مانیں گے۔ جب کہ آپ نے... اتنی آسانی سے ہار مان لی۔ آپ جنھوں نے بھیا کو روشنی دی تھی۔ دل دیا تھا، ہمّت دی تھی۔'' ☆۶۹

سلمیٰ مرزا نے اپنے اور جمشید کے درمیان جو فاصلہ رکھا تھا جمشید اسے بھی ختم کرنا چاہتا تھا لیکن سلمیٰ نے اسے اس کی اجازت نہ دی۔

> سلمیٰ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی اور جمشید کو پوری طاقت سے پیچھے دھکیلتے ہوئے اس نے یک لخت شدید کراہت کے ساتھ کہا، ''کیپ اوے یو ڈرٹی ڈوگ۔'' ☆۷۰

سلمیٰ اور جمشید کا جھگڑا دیکھ کر ثریا کا نشہ بھی اترنا شروع ہو گیا اور اس نے نہ صرف سلمیٰ کی وکالت کی، بلکہ جمشید کے بہت سے راز بھی فاش کیے۔

> ''جمشید ڈارلنگ! میں کسی تعلقہ دار کی بیٹی نہیں ہوں۔ میں نے کسی مسوری کانونٹ میں تعلیم نہیں پائی ہے۔ میں نے کسی شانتی نکیتن کی شکل نہیں دیکھی میں سیّد زوار حسین مرحوم سوز خواں و کاشت کار، موضع محمد گنج ضلع سلطان پور کی لڑکی ہوں۔ تم کان پور کے کسی مشہور ایڈوکیٹ کے بیٹے نہیں ہو۔ تم سیّد مظہر علی، کاشت کار موضع محمد گنج ضلع سلطان پور کے بھتیجے ہو اور تم نے کسی کرنل براؤن اسکول ڈیرہ دون سے تعلیم حاصل نہیں کی تم اور میں ...اپنے پبلک ایکسپرٹ کے تخلیق کردہ کردار ہیں۔'' ☆۷۱

دوسروں پر اپنی اصلیت ظاہر ہونے پر جمشید کو دھچکا لگا، اور اس نے اگلے ہی لمحے ثریا اور سلمیٰ دونوں سے معافی مانگ لی۔ دونوں نے اسے معاف کر دیا۔

کچھ ہی دیر کے بعد ثریا اور جمشید نے اپنے دور کے پرانے گیتوں پر نہ صرف تبصرہ کیا، بلکہ مل کر گایا بھی۔ چار جھپڑ مارنے کے بعد اسی شخص کے ساتھ مل کر گانا اور اس کے ساتھ کام کرتے رہنا بہت سطحی قسم کی فلمی کہانی والا انداز ہے۔ عام طور پر حقیقی زندگی اور افسانوں میں بھی اس قسم کی لڑائیوں کے بعد کردار ایک دوسرے کی شکل بھی دیکھنا گوارا نہیں کرتے لیکن اس ناولٹ کا انجام بالکل مختلف ہے۔

سلمیٰ مرزا جو مذکورہ بالا جھگڑے اور مار پیٹ کے بعد بھی اگلے ہی روز کی دعوت میں بڑی سعادت مندی سے جمشید کے ساتھ مل کر مہمانوں کا استقبال کرنے اور اپنی ملازمت جاری رکھنے کے لیے تیار تھی۔ غالباً اس کے پیچھے سلمیٰ اور ثریا دونوں کی معاشی مجبوریاں تھیں۔ سلمان کے جیل جانے اور والد کے انتقال کے بعد گھر کو سنبھالنا سلمیٰ کی ذمّے داری تھی۔ اس طرح ثریا بھی اپنے گھر کی واحد کفیل تھی۔

جب جمشید پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ سلمیٰ مرزا، سلمان کی بہن اور ڈاکٹر قمر الدین احمد کی بیٹی ہے تو اس نے خود کو اس قابل نہیں سمجھا کہ سلمیٰ اس کے دفتر میں مزید نوکری کرے، لہٰذا اس نے تحریری معافی نامے کے ذریعے اپنی غلطیوں کا اعتراف کر

لیا اور سلمٰی کو نوکری چھوڑنے کا مشورہ دیا:

'چھوٹی بٹیا— پرسوں رات انتہائی نشے اور نیم دیوانگی کے عالم میں میں نے جس طرح آپ سے گستاخی کی۔ اس کے لیے صدقِ دل سے معافی کا خواست گار ہوں... پرسوں رات میں ایک اہم فیصلہ کر چکا تھا... کہ میں اس ملازمت کے لیے جو آپ کے وقار اور شرافت کے سراسر منافی ہے اور آپ کی شخصیت کی توہین ہے آپ کو مزید زحمت نہیں دے سکتا... چھوٹی بٹیا— میں در پردہ ہر ممکن طریقے سے آپ کی مدد اور اعانت کرتا رہوں گا اور آپ کو کسی بھی دفتر میں ایک معقول ملازمت دلوا دوں گا۔

والدہ صاحب محترمہ کو میرا آداب کہیے گا... یقین کیجیے میں آپ کا مخلص اور بے لوث دوست رہوں گا' ☆۲۷

جمشید کا یہ خط اس کے گناہوں کا اعتراف نامہ ہے۔

قرۃ العین حیدر کا یہ ناولٹ قیامِ پاکستان کے ابتدائی دنوں کے بارے میں ہے جب ملک میں نو دولتیوں کا ایک نیا طبقہ سامنے آیا۔ لوگوں نے غلط کلیم داخل کروا کے اپنے صدیوں پرانے ارمان پورے کیے۔

''اے چنن خان۔ میں نے کہا، اکیلے اکیلے مکان الاٹ کرا لیا، یاروں کو ہوا بھی نہ لگنے دی۔ میاں اگر تم نے اڑائی ہیں تو ہم نے بھون بھون کر کھائی ہیں۔'' ☆۲۷

نو دولتیوں کا نمائندہ کردار جمشید علی ہے جو اخلاقی اور تہذیبی اقدار کو فراموش کر چکا ہے۔ اب ان لوگوں کی زندگی کا مقصد صرف پیسا کمانا تھا۔ جائز اور ناجائز، سچ اور جھوٹ ان کے لیے خواب و خیال کی باتیں تھیں، اور جب ملک کا نظام جمشید جیسے لوگوں کے ہاتھ میں آیا تو انھوں نے ملک اور قوم کی تعمیر سے زیادہ اپنے روشن مستقبل کی تعمیر میں لگ گئے۔

نو دولتیے طبقے کی ایک اور مثال ثریا بھی ہے جس نے پُرآسائش اور اعلیٰ اسٹیٹس کے لیے جمشید جیسے مکروہ شخص کی حاکمیت کو قبول کر لیا، اور سلمان جیسے مخلص شخص کو فراموش کر دیا۔ ایسے نو دولتیے کو جس کی زندگی کی کایا قیامِ پاکستان کے بعد پلٹ گئی۔ انھیں اپنا ماضی کبھی بھول کر بھی یاد نہ آیا۔

دوسری طرف وہ طبقہ ہے جس میں سلمٰی مرزا جیسے بے بس لوگ موجود ہیں۔ جنھوں نے ماضی میں ایک باوقار اور پُرآسائش زندگی گزاری تھی لیکن تقسیمِ ہند کے ساتھ ہی ان کی بدنصیبی کے دن شروع ہو گئے۔ ہندوستان میں ان کے گھر کو ہندوؤں نے آگ لگائی پاکستان میں آ کر انھیں مسلمانوں کی زیادتیوں کو سہنا پڑا، اور سب سے بڑی بدنصیبی یہ تھی کہ انھیں جمشید جیسے شخص کی پرسنل سیکرٹری بننا پڑا۔

یا خدا

قدرت اللہ شہاب نے تقسیمِ ہند کے نتیجے میں پاکستان ہجرت کی اور عوام کی طرح انھیں بھی صدیوں پرانے وطن، ماحول، ساتھیوں اور عزیزوں سے بچھڑنا پڑا۔ فسادات کے الم ناک واقعات نے انھیں اپنے افسانے کا موضوع بنانے پر مجبور کیا انھوں نے اس بات کا اقرار کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ستمبر ۱۹۴۷ء میں کراچی پہنچا تو چاروں طرف لٹے پٹے، کٹے پھٹے مہاجرین کا ایک سیلابِ عظیم پاکستان میں امڈ چلا آ رہا تھا۔ انھی میں کہیں میرا نہایت قریبی عزیز اپنی بیوی اور بچّوں سمیت بھی شامل تھا۔ اس کی تلاش میں ایک ایک کر کے میں نے تقریباً تمام مہاجر کیمپوں کا بڑی تفصیلی جائزہ لیا... اپنی اس تلاش کے دوران ظلم، بربریت اور مصائب کی چادر میں لپٹے لاکھوں مہاجرین میری نظروں کے سامنے سے گزرے ان میں ہزاروں کی تعداد میں بچّے بھی تھے اور جوان اور بوڑھی عورتیں بھی۔ درجنوں نے تڑپ تڑپ کر اور رو رو کر بین کرتے ہوئے مجھے اپنی بپتا بھری جیون کہانیاں سنائیں۔ اس کرب ناک مجموعی مشاہدے نے اندر ہی اندر سلگ سلگ کر آخر ایک روز دلشاد کا روپ دھار لیا۔ ایک شام میں قلم لے کر بیٹھا اور فجر تک ایک ہی نشست میں ''یا خدا'' کی کہانی مکمل کر ڈالی۔ ☆۴۷

قدرت اللہ شاب کا یہ ناولٹ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔ اس ناولٹ میں انھوں نے نہ صرف فسادات اور ہجرت کے دوران ہونے والے مختلف حادثات کو بیان کیا ہے، بلکہ نئے ملک میں مہاجرین کو پیش آنے والے مسائل کا بھی ذکر کیا ہے۔

''یا خدا'' کے پلاٹ میں تسلسل اور توازن ہے۔ قدرت اللہ شہاب اس افسانے کو تین حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلا حصہ ''ربّ المشرقین''، دوسرا حصہ ''ربّ المغربین'' اور تیسرا حصہ ''ربّ العالمین'' ہے۔ ان تینوں حصّوں میں انھوں نے تقسیم کے نتیجے میں پیدا ہونے والی معاشی اور معاشرتی تبدیلیوں کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ خاص طور پر تقسیم سے قبل ہندوستان میں، ہجرت کے دوران اور اس کے بعد مہاجر کیمپوں میں اور آخر میں اپنے آزاد ملک مین خواتین پر گزرنے والی مختلف قیامتوں کو انھوں نے بہت سچائی، جرأت اور بعض جگہ طنز کے ساتھ بیان کیا ہے۔

ناولٹ کی فضا اپنے موضوع کے مطابق شروع ہی سے سوگوار ہے۔ ناولٹ کے شروع میں انبالہ کے ایک گاؤں کے ماحول کو بیان کیا گیا ہے۔ جہاں سکھ آباد ہیں جو تقسیمِ ہند کے بعد تعصب کا شکار ہو چکے ہیں۔ ناولٹ کے اسی حصے میں مسلم مہاجرین کی ریل گاڑی کی بھی منظر نگاری کی گئی ہے۔ جہاں خواتین کی پریشان، بے بس اور کرب میں مبتلا دکھایا گیا ہے۔ یہ

خواتین تلخ تجربات سے گزرنے کے باوجود مستقبل سے پُر اُمید ہیں۔

> لدھیانہ پھلور، جالندھر...امرت سر... ہر منزل ہر عورتوں کی زندگی کے بعد کھلتے گئے۔ان کی خاک میں سوئے ہوئے خواب بیدار ہونے لگے...جیسے کسی بھیانک خواب کو بھلانے کی کوشش کر رہی ہوں۔☆۷۵

ناولٹ کے دوسرے حصّے میں مہاجر کیمپوں میں انتظامیہ کی غیر ذمے داری اور بے حسی کو بیان کیا گیا ہے۔ دلشاد اور عائشہ کے کردار کی دلی کیفیات اس حصّے میں سب سے نمایاں ہیں۔

ناولٹ کے تیسرے حصّے میں مقامی لوگوں کا مہاجرین کے ساتھ ناروا سلوک دکھایا گیا ہے۔ ان کی گفتگو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے آپس کے تعلّقات کس قدر ناخوشگوار تھے۔

ناولٹ کے پہلے حصّے میں دلشاد، ملاعلی بخش، رحیم خان، امریک سنگھ اور اس کے ساتھیوں کے کرداروں کے ذریعے ہندو اور مسلمانوں کے آپس کے تعلّقات کا اندازہ ہوتا ہے۔ بالخصوص دلشاد کا کردار صرف ناولٹ کی ہیروئین بلکہ فسادات کا شکار ہونے والی خواتین کا ترجمان بھی ہے۔

ناولٹ کے اس حصّے میں دلشاد پر گزرنے والی قیامتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مصائب کا مقابلہ کرتے کرتے جب دلشاد تھک گئی تو اس نے خود کو حالات کے حوالے کر دیا، اور اپنے باپ ملاعلی بخش کی شہادت کے بعد ہر مصیبت کو برداشت کیا۔

> لوگ باریاں باندھ باندھ کر وہاں آتے تھے اور جب وہ بہادر خالصے محراب کے نیچے بیٹھ کر شراب کا ادھیا کھولتے اور دلشاد کی بوٹیوں کو چوڑ چوڑ کر کھانے کی کوشش کرتے تو گویا انھیں یہ فخر ہوتا کہ وہ گن گن کر ساڑھے تیرہ سو برس کی اذانوں اور نمازوں کا بدلہ چکا رہے ہیں۔☆۷۶

جب ان کا دل دلشاد سے بھر گیا تو امریک سنگھ اسے تھانے دار لبھو رام کے پاس لے گیا جہاں مسلمان عورتوں بھی برآمدگی کا کام ہوتا تھا لیکن تھانے دار نے بھی اسے مہاجر کیمپ میں بھیجنے سے پہلے اپنے سارے شوق پورے کیے، اور چند دنوں کے کام کو تین مہینے میں مکمل کیا اور پھر ایک دن اسے پاکستان جانے والی ریل گاڑی میں بٹھا دیا، پاکستان کی سرحد پر پہنچنے سے پہلے وہ ایک بچی کو بھی جنم دے چکی تھی۔

ناولٹ کا دوسرا حصّہ ''ربّ المغربین'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ اس حصّے میں دلشاد مہاجرین کی ریل گاڑی سے پاکستان کی سرحد پر پہنچ جاتی ہے۔

وہ پاکستان میں جو اُمّیدیں لے کر آئی تھی وہ پوری نہ ہو سکیں، بلکہ یہاں بھی اسے لاہور اسٹیشن سے لے کر مہاجر کیمپ تک کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ پاکستان میں بھی اسے لوگوں کی بھوکی اور گرہنہ نظروں، توہین آمیز رویّے، عدم تحفظ اور مقامی

لوگوں کی بے حسی کا سامنا کرنا پڑا۔

ہندوستان سے آنے والے مسلمان مہاجرین کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا اور مقامی لوگ مہاجرین کی دردناک داستانیں سن سن کر بے زار ہو گئے۔

مہاجر خانوں میں بھی وسائل اتنے نہ تھے جتنی مہاجرین کی تعداد تھی۔ اس صورتِ حال کو بھی قدرت اللہ شہاب نے ناولٹ کے اس حصّے میں گہرے مشاہدے کے بعد پیش کیا ہے۔

> اُس کے تخیل میں تو مغرب کی ساری کائنات اُس کی منزل تھی۔ وہ تو ایک ایسی وسیع برادری میں شامل ہونے والی تھی جس میں اُسے سارے اپنے ہی نظر آتے تھے، لیکن یہاں کی اینٹ اینٹ اُس سے پوچھتی تھی، تم کون ہو؟ تمھاری جیب میں پیسے ہیں؟ تمھارے جسم میں تازگی ہے؟ ☆۷۷

ناولٹ کے اس حصّے میں انھوں نے ان نام نہاد مولویوں پر بھی گہری طنز کی ہے جو اسلام کا پرچار تو بہت کرتے ہیں، لیکن وہ خود صرف داڑھی رکھنے اور تسبیح کرنے کی حد تک اسلامی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں۔

ناولٹ کے مولوی کردار اسٹیشن پر دلشاد کی بے بسی کا تماشا تو دیکھ سکتے تھے لیکن ایک انگریز عورت کو دلشاد کی مدد کرتے ہوئے نہ دیکھ سکے۔

> ان دونوں بزرگوں کو یہ محسوس ہوا کہ اس فرنگن نے ان کی داڑھیوں کو پکڑ کر زور سے جھٹک دیا ہے۔ ☆۷۸

اور جب وہ اپنی توہین نہ برداشت کر سکے تو انھوں نے اپنے دل کی تسلی کے لیے اقبال کا یہ شعر پڑھا:

اے طائرِ لاہوتی، اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

ان مولویوں نے اس بات کو اپنی ہی نہیں، بلکہ پوری قوم اور معاشرے کی توہین سمجھا کہ ایک انگریز عورت مسلمان عورت کی مدد کرے۔ انھوں نے دلشاد کو مہاجر خانے جانے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا:

> ''آزاد قوم کی بیٹیاں بھیک کے ٹکڑوں پر نہیں پلتیں ہاں... تمھیں خود شرم آنی چاہیے۔'' ☆۷۹

ناولٹ کے اس حصّے میں قدرت اللہ شہاب نے مہاجر کیمپوں کی تکلیف دہ اور عبرت ناک فضا کا بھی ذکر کیا ہے مہاجر کیمپوں میں مہاجرین کو جن جن مسائل کا سامنا کرنا پڑا تھا ان سب کو انھوں نے گہرے مشاہدے کے بعد بیان کیا ہے۔

مہاجر کیمپ میں دلشاد کے علاوہ زبیدہ، محمود اور دادا کے کردار کا اضافہ کیا گیا ہے یہ کردار دلشاد کے ہمدرد بن جاتے

ہیں۔ جب دلشاد مہاجر کیمپ میں جاتی ہے تو وہ اس سے محبت اور اپنائیت سے ملتے ہیں۔

اسی مہاجر کیمپ کے اسٹور کیپر کی بے حسی کو بھی دکھایا گیا ہے:

...اس نے نہایت خشمگیں انداز سے دلشاد کو گھورا۔

"دفتر بند ہے جی اس وقت؛ صبح کے آٹھ بجے آنا... میں کہتا ہوں چلی جاؤ سیدھی طرح۔ میں بھی آخر انسان ہوں، مشین نہیں ہوں، ہاں، صبح آٹھ بجے آنا۔" ☆۸۰

مہاجر کیمپ ہی میں آنے والی ایک ماں کی مامتا اور اس کے بچے سے محبت کے انوکھے اور تکلیف دہ انداز کا بھی شہاب نے نہ صرف قریب سے مشاہدہ کیا ہے، بلکہ اسے شدت سے محسوس کیا ہے۔

یہ بے بس اور مجبور ماں اپنی چار سالہ بچی کو شدید سردی اور بارش سے بچانے کے لیے اسٹور بابو سے کمبل لینے کے لیے گئی تھی، لیکن اسٹو بابو کو دوسروں کی پریشانیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے صرف سونے یا اقبال کا شکوہ پڑھنے سے دلچسپی تھی۔

اور آخر میں ماں کی ساری کوششوں کے باوجود اپنی بچی کی جان نہ بچا سکی، اور یوں غیروں سے بچ کر آنے والی عورت اپنوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گئی۔

اس کی ماں گھبرا گئی... اس نے کھڑے ہو کر گرد و پیش کا جائزہ لیا... اس نے چوروں کی طرح دزدیدہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور ہولے ہولے جھجکتے ہوئے، شرماتے ہوئے اس نے کپڑے کھول دیے ٹھٹھری ہوئی بیمار بچی کو ان میں لپیٹ لیا... اندھیرے میں ایک بجلی سی لہرائی اور اس جوان عورت کا برہنہ جسم کائنات کے ذرے ذرے کو للکارنے لگا کہ دیکھو دیکھو یہ لاجواب ساعت بیت نہ جائے۔ تم نے ارض و سما کے بہت سے راز دیکھے ہوں گے لیکن تم اس عورت کے برہنہ جسم کو نہ بھول سکو گے... جب صبحِ صادق کو پو پھٹی تو مہاجر خانے کے میدان میں ایک مرمریں مجسمہ چاندی کی طرح جھلملایا۔ یہ اس جوان عورت کا برہنہ جسم تھا جس نے اپنے کپڑوں میں اپنی مرتی ہوئی بچی کو لپیٹ لیا تھا۔ ☆۸۱

اسی سرد رات میں ناولٹ کے کردار دادا بھی شدید سردی اور بارش کی رات میں گرم کمبل نہ ہونے کی وجہ سے موت کا شکار ہو گئے۔

اور یوں اسٹور بابو کی بے حسی اور غفلت کی وجہ سے مہاجر کیمپ میں رہنے والے بہت سے لوگ موت کا شکار ہو گئے۔ اور پھر صورتِ حال یہ ہوئی کہ اگلی ہی صبح مہاجر کیمپ لاشوں سے بھر گیا، اور اسٹور بابو نے بہت سے قتل کرنے کے بعد

جفا سے توبہ کر لی۔

> مہاجر خانے کے کچھ مہتر کمبلوں کا پلندا اٹھا کر لائے۔ایک کمبل انھوں نے دادا پر ڈال دیا۔دوسرا عورت کے ننگے بدن پر، تیسرا اس کی بچی پر، چوتھا— اور اس طرح وہ میدان میں بکھری ہوئی لاشوں پر نرم نرم گرم گرم کمبلوں کے کفن ڈالتے گئے جو لوگ زندہ تھے وہ حسرت بھری نگاہوں سے اپنے مردہ ساتھیوں کی طرف دیکھتے تھے اور رشک کرتے تھے اگر موت کے تصوّر میں ایک اَن دیکھی، اَن سمجھی حقیقت کا خوف نہ ہوتا تو وہ سب برضا و رغبت وہیں مر جاتے تا کہ مہاجر خانے کے مہتر اُن پر اونی کمبل ڈالتے جائیں۔☆۸۲

مہاجرین کے ساتھ صرف اسٹور بابو ہی نے بے حسی اور نفرت کا سلوک نہیں کیا، بلکہ ایک اہم کردار مصطفیٰ سیمابی کا بھی ہے۔مصطفیٰ سیمابی کا کردار ان لوگوں کی نمائندگی کر رہا ہے جنھوں نے ۱۹۴۷ء کے فسادات میں تھکے ہارے اور لٹے ہوئے مہاجرین اور بالخصوص مہاجر خواتین کو اپنی تفریح کے لیے استعمال کیا۔ہندو اور سکھوں کی ہوس ناکیوں سے بچ کر آنے والی خواتین پاکستان میں آ کر یہ سمجھ بیٹھی تھیں کہ یہاں کا ہر مرد فرشتہ ہے اور فرشتوں سے مقدّس اور پاک کون ہو سکتا ہے۔اسی خیال کو ذہن میں رکھتے ہوئے وہ انسانی روپ دھارنے والے شیطان پر بھروسا کر بیٹھیں۔

مصطفیٰ سیمابی مہاجر کیمپ جاتا وہاں مہاجرین سے ہمدردی اور محبت کا اظہار کرتا اور ان کے مسائل پوچھتا ان کی مالی امداد کرتا اور اس کے بدلے ان کی خواتین کو اپنی ملکیت بنا لیتا۔یہی رویہ اس نے دلشاد کے ساتھ اختیار کیا۔دلشاد نے پاکستان آ کر رحیم کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔جب مصطفیٰ سیمابی کو دلشاد نے اپنی پریشانی بتائی تو وہ دلشاد کو رحیم خان سے ملانے کے بہانے اپنے گھر لے گیا، اور اپنا اصلی روپ بھی دکھا دیا۔

> وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھی۔اس کی روح اپنے رحیم خان کے استقبال کے لیے سراپا انتظار بنی ہوئی تھی لیکن اس کے جسم کو ابھی تک، کتے نچوڑ رہے تھے — مصطفیٰ خان سیمابی ڈریسنگ گاؤن پہنے اس کے سامنے بھوکے گِدھ کی طرح منڈلا رہا تھا۔میز سے اسکاچ کی بوتل جگمگا رہی تھی وہ اپنی بانہیں پھیلا پھیلا کر کہتا تھا کہ ”تم بڑی مظلوم ہو... میں کچھ روز کے لیے تمھیں ملکہ بنا کر رکھوں گا تمھارا رحیم خان معلوم نہیں کہاں کھو گیا۔شاید کسی ویرانے میں مرا پڑا ہو، لیکن تم اس فرضی ہستی کی یاد میں اپنی جوانی نہ گنواؤ...اب تم اپنے آزاد وطن میں آ گئی ہو اب تمھیں کسی بات کا ڈر نہیں۔“☆۸۳

بعض اوقات غربت انسان کو گم راہ کر دیتی ہے۔انسان جب حالات کا مقابلہ کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو اچھے اور

برے کی تمیز کرنا چھوڑ دیتا ہے، اور اسے صرف اپنی ضرورتوں کی تکمیل سے غرض رہ جاتی ہے۔
دلشاد کو بھی عزت کے بدلے دولت کا سودا مہنگا نہ لگا اور اس نے خود کو مصطفیٰ سیمابی کے حوالے کر دیا۔

دو چار دن میں جب مصطفیٰ سیمابی نے اپنے حج کے ارکان پورے کر لیے تو دلشاد پھر سے
مہاجر خانے آ گئی۔☆۸۴

دلشاد کے بعد زبیدہ بھی اپنے مرحوم دادا سے ملنے کے بہانے کہیں اور اپنی عزت کا سودا کر آئی، اور واپس آ کر اپنے ننھے بھائی محمود کے شوق پورے کرتی اور وہ دوسروں کو خوشی سے بتایا:

''...دادا میاں نے شیشے کا یہ لٹو بھیجا ہے، یہ ربڑ کی گیند، یہ رنگ دار مٹھائی آج وہ پھر موٹر میں بیٹھ
کر دادا کے پاس گئی ہے...اب وہ دادا میاں سے پیسے لائے گی نئے نئے بوٹ لائے گی۔
تلے دار ٹوپی لائے گی۔'' ☆۸۵

غرض یہ کہ کئی خواتین جن مصائب سے بچ کر اپنے ملک پہنچی تھیں انھیں یہاں آ کر ان مصائب کو گلے لگانا پڑا خیر کو چھوڑ کر شر کا انتخاب کرنا اور سیدھی سادی اور گھریلو لڑکیوں کو طوائفوں کی طرز زندگی کو اپنانا پڑا۔

یہاں دلشاد کے لیے ہر روز ایک نیا رحیم خان پیدا ہو جاتا تھا—زبیدہ کے لیے ہر روز ایک نیا
دادا جنم لیتا تھا۔بیٹیوں کے لیے نئے نئے باپ تھے—بہنوں کے لیے نئے نئے بھائی—جسم
کا رشتہ جسم سے ملتا تھا۔خون کا رشتہ خون سے۔☆۸۶

یہ چیز کسی بھی عزت دار اور شریف لڑکی کے لیے ہی باعث دکھ نہ ہوگی، بلکہ دیکھنے والے بھی اس درد کو محسوس کریں گے۔
ناولٹ کے تیسرے حصے کا عنوان ''رب العالمین'' ہے۔ناولٹ کے اس حصے میں دلشاد لاہور سے کراچی آ جاتی ہے۔
کراچی میں ایک نیا ماحول ہے۔یہاں پر بھی کراچی کے مقامی لوگوں کا مہاجرین کے ساتھ کیا جانے والا ناروا سلوک بیان کیا گیا ہے۔

لاہور میں جب مہاجرین کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی تو نئے آنے والے مہاجرین لاہور سے کراچی آنے لگے۔یہ لٹے پٹے مہاجرین پاکستان کی سرزمین پر بہت سی اُمیدیں لے کر آئے تھے، لیکن یہاں ان کی اُمیدیں پوری نہ ہو سکیں۔وہ مہاجرین جو ہندوستان میں بھرے ہوئے گھر اور جائیداد چھوڑ کر آئے تھے۔یہاں آ کر ان کی حیثیت بالکل بدل گئی۔انھیں نہ تو رہنے کے لیے ڈھنگ کی جگہ نصیب ہوئی اور نہ ہی کوئی خاص ذریعۂ معاش ملا مقامی لوگوں نے انھیں اپنے لیے بوجھ سمجھا۔انھیں مالی طور پر مستحکم ہونے میں کئی سال لگے۔اپنی تعلیم اور حیثیت کے مطابق انھیں ملازمتیں نہ ملتیں اور نہ ہی ان کے پاس اتنا روپیہ پیسا تھا کہ کوئی کاروبار شروع کیا جا سکتا۔معمولی معمولی سے کاموں کے لیے لوگوں کے توہین آمیز رویے کو برداشت کرنا پڑتا۔

صدر کے چوک میں ایک ایرانی ہوٹل والا، ایک چھابڑی والے پر گرج رہا تھا، ''تم یہ گندے کیلے یہاں نہیں رکھ سکتے۔ میرے ہوٹل میں مکھیاں آتی ہیں۔''

چھابڑی والے نے گڑگڑا کر خوشامد کی، ''داروغہ جی، میں اجمیر شریف سے آیا ہوں۔ میرا گھر بار لٹ گیا ہے۔ میری اندھی بہن میرے ساتھ ہے۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں آئندہ یہاں چھابڑی نہیں لگاؤں گا۔'' ☆۸۷

کانسٹیبل کو اس وقت سارے قانون یاد آ گئے اس لیے اس نے چھابڑی والے کی ایک نہ سنی البتہ اسے اس بات کا افسوس ضرور رہا کہ وہ اس کی اندھی بہن کو ساتھ لے کر کیوں نہیں آیا۔

اسی طرح بعض مہاجرین بھی اپنے غم اور غصے کا سارا لاوا مقامی لوگوں پر پھینکتے تھے ناولٹ نگار نے اس حقیقت کو ایک بس کنڈیکٹر اور ہجرت کر کے آنے والے مسافر کے درمیان ہونے والے جھگڑے کو بیان کر کے واضح کیا ہے۔

ایک پنجابی مسافر نے جب بس کنڈیکٹر کو کھوٹی دونی دی تو کھوٹی دونی سے شروع ہونے والا جھگڑا ایک دوسرے کو گالیاں دینے پر ختم ہوا:

ایک پنجابی مسافر نے جب بس کنڈیکٹر کو کھوٹی دونی دی تو ان کے درمیان جھگڑا ہو گیا اور اس نے سندھیوں کے بارے میں یہ رائے قائم کی: ''سالے سندھی، مفت پاکستان مل گیا سالوں کو۔'' ☆۸۸

اسی طرح بعض سندھیوں کی پنجابیوں کے بارے میں رائے تھی:

''سالے پنجابی پٹ پٹا کر یہاں آئے تو سالوں کا دماغ ہی نہیں ملتا، سر پر ہی چڑھے آتے ہیں... جیسے ان کی ماں کے خصم کا گھر ہے۔'' ☆۸۹

مقامی لوگوں میں ایسے بے حس لوگ بھی شامل تھے جنھوں نے خواتین کی تجارت کی اور ان تکالیف کو اپنے کاروبار کو چمکانے کا سنہرا موقع سمجھا۔ اغوا شدہ یا اپنے گھر والوں سے بچھڑنے والی لڑکیوں کے ان کی شکل وصورت اور عمر کے حساب سے مختلف دام مقرر کیے۔

''سچ پوچھو تو دوست سیزن بڑا کرارا ہے،'' چیلا رام کے گالوں کی کچوریاں خوشی سے پھول رہی تھیں۔'' ایک سیزن میں سولہ چھوکریاں! رام قسم میں نے تو ایسا دھندا ساری عمر نہیں کیا تھا۔'' ☆۹۰

ایک دوسرا شخص جو زیادہ تعداد میں لڑکیوں کی تجارت نہ کر سکا تھا وہ اس کا افسوس اس طرح کر رہا تھا:

''تم سالے قسمت کے دھنی ہو۔'' خوشی محمد منمنایا۔ ''چھوکری پر چھوکری اتارتے تھے۔ یہاں مشکل سے صرف تین ہاتھ آئیں۔'' ☆۹۱

جب تنازع کشمیر شروع ہوا تو وہاں کی صورتِ حال پنجاب کی صورتِ حال سے مختلف نہ تھی۔ کشمیر میں بھی مسلمانوں کے گھروں کو جلایا گیا۔ مردوں، عورتوں اور بچّوں کو قتل کیا گیا۔ خواتین کی بے حرمتی کی گئی۔ انھیں اغوا کیا گیا اور پھر ان کی تجارت کر کے وسیع سرمایہ کمایا گیا۔

اس موقع پر بھی چیلا رام اور خوشی محمد کو نہ تو کسی کے مرنے کا دکھ ہوا، نہ کسی کے لٹنے کا، نہ کسی کی بے حرمتی کا اور نہ ہی کسی کے اغوا ہونے کا دکھ ہوا، بلکہ انھوں نے روایتی کاروباریوں کی طرح صرف اپنے نفع اور نقصان کے بارے میں سوچا، اور اپنے کاروبار کو چمکانے کے لیے ان حالات کو سنہرا موقع جانا۔

چیلا رام دلال کے مُنہ سے رال ٹپکنے لگی... پھر وہ سر سے سر جوڑ کر بیٹھ گئے، اور کشمیر کے سیزن کی اُمّید افزا عنایتوں میں کھو گئے۔ ☆۹۲

چیلا رام اور خوشی محمد دلال کے علاوہ ناولٹ کے کردار سیٹھ قائم علی اور سیٹھ دائم علی کا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے مہاجر خواتین کی بے بسی اور مجبوریوں کا جشن منایا، اور ان خواتین کو ذہنی اور جسمانی اذیّت دے کر اپنی جنسی تسکین حاصل کی۔ اپنی تسکین کے لیے انھوں نے مختلف جگہوں پر عشرت کدے بنا رکھے تھے۔

ایک دن سیٹھ قائم علی اور دائم علی کو منوڑہ میں ایک ملّاح نے انھیں ایک کشمیری لڑکی سے ملایا۔ اس کی آنکھیں کسی ڈوگر نے ضائع کر دیں تھیں، لیکن اس کے باوجود اس میں ابھی کشش باقی تھی ملّاح نے اس لڑکی کا تعارف کراتے ہوئے کہا:

''... کشمیر سے آئی ہے سیٹھ، اندھی ہے، بولو، کس طرف چلوں، پیرس یا وینس۔'' ☆۹۳

پیرس، وینس، نیپلز اور روم خواتین کی بے حرمتی کرنے کے لیے مخصوص جگہیں تھیں جو کسی بھی گم راہ اور بھٹکے ہوئے انسان کے لیے کسی دلکش وادی سے کم نہ تھیں۔ انھوں نے اس مناسبت سے ان جگہوں کے نام خوب صورت شہروں کے نام پر رکھے۔

ملّاح جب دونوں سیٹھوں کو تصوّراتی پیرس لے گیا تو اس نے کہا:

''... لو سیٹھ، میں تو مچھلیاں پکڑنے چلا... تم مزے سے کشمیر کی بہاریں لوٹو۔'' ☆۹۴

اور یوں کشمیر سے آنے والی یہ نابینا لڑکی ہمیشہ کے لیے پیرس کی زینت بن گئی۔ گھریلو، خوش گوار، اور باوقار زندگی کا دور اپنے اختتام کو پہنچا اور ہجرت کے بعد باعزت زندگی گزارنا اس کے لیے محض ایک خواب بن کر رہ گیا۔

اس ناولٹ میں قدرت اللّٰہ شہاب نے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین کے مختلف مسائل کو بیان کیا ہے۔

اس سلسلے میں انھوں نے سب سے زیادہ زور ہجرت کے بعد خواتین کی معاشرتی حیثیت پر دیا ہے۔
مشرقی پنجاب سے آنے والی دلشاد اور زبیدہ کشمیر سے آنے والی نابینا لڑکی کے کردار ہجرت کرنے والی کئی لڑکیوں کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان یا مغربی پاکستان، مسلمان ہندو یا سکھ ان کے لیے سب مرد برابر تھے۔ کہیں انھیں مسلمان ہونے کی اور کہیں انھیں بے بس اور تنہا ہونے کی سزا ملی۔
جب انھوں نے ہر طرف جھوٹ، دھوکے اور فریب کے سہارے لوگوں کو ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے دیکھا تو دلشاد اور زبیدہ نے بھی سچائی، ایمان داری اور شرم وحیا کی تمام حدود توڑ دیں اور دھوکا، جھوٹ، فریب جیسی برائیاں ان کی عادت بن گئیں۔

''یا خدا'' کے نسوانی کرداروں پر ممتاز شیریں نے اس طرح تبصرہ کیا ہے:

> قدرت اللہ شہاب نے اس طویل مختصر افسانے میں ایک مظلوم، اغوا شدہ لڑکی کی بپتا سنائی ہے۔ اس کہانی کا المیہ یہ ہے کہ مشرقی پنجاب میں ظلم سہہ سہہ کر جب دلشاد اپنے روحانی وطن ''مغرب'' میں پناہ لینے آتی ہے تو اپنے بھی اس سے بیگانوں کا سا سلوک کرتے ہیں۔ اپنوں اور بیگانوں سے اس نے وہ صدمے اٹھائے ہیں، اس کی عصمت یوں لٹی ہے کہ اب اس کا ضمیر مر چکا ہے۔ اس کی روح مسخ ہو چکی ہے اور وہ جسم فروشی کو ذریعۂ معاش بنا لیتی ہے۔☆۹۵

کراچی آنے کے بعد زبیدہ نے وہی بڑے اور پکوڑیاں بیچنا شروع کر دیں۔ ان کے پاس جب گاہک دہی بڑے یا پکوڑے لینے آتے تو وہ انھیں اپنی نظروں اور مسکراہٹوں سے اپنی جانب مائل کر لیتیں اور دہی بڑے اور پکوڑیاں بیچتے بیچتے وہ اپنی عزتوں کے بھی سودے کر لیتیں۔ قدرت اللہ شہاب نے ان پر طنز کرتے ہوئے کہا:

> دہی اور بیسن کی اس ملاوٹ پر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ملّت کا مستقبل پروان چڑھ رہا ہے۔ جب دلشاد کی بچی... پکوڑیوں پر پل کر جوان ہوگی۔ جب زبیدہ کا محمود دہی بڑوں کی چاٹ پر سیانا ہوگا، تو اسلام کی برادری میں دو گراں قدر رکنوں کا اضافہ ہو جائے گا۔ ایک مضبوط بھائی، ایک خوب صورت بہن — یہی تو وہ اینٹ اور گارا ہے، جس سے بہادر قومیں تعمیر ہوتی ہیں۔☆۹۶

خواتین کی سماجی حیثیت کے علاوہ انھوں نے مقامی لوگوں کے مہاجرین کے ساتھ ناروا سلوک کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔

مقامی لوگوں میں مہاجر کیمپ کے بے حس اسٹور بابو کا کردار ایسا ہے جو پہلے مہاجرین کی بے بسی اور مجبوری کا تماشا

دیکھتا، مہاجرین کو کھانا دینا ہوتا یا سردی سے بچنے کے لیے انھیں لحاف یا کمبل، وہ اُن کے گڑگڑانے یا سردی سے مرجانے کا انتظار کرتا۔

اس طرح مصطفیٰ سیمابی اور دوسرے سرمایہ دار جب مہاجر کیمپوں میں جاتے تو ان سے محبت اور ہمدردی کا اظہار کرتے ان کے لیے تحفے تحائف لے کر جاتے۔ خاص طور پر وہ خواتین پر زیادہ مہربان ہوتے لیکن ان کی اس مہربانی کے پیچھے نہ تو خوفِ خدا ہوتا اور نہ ہی ان کا یہ عمل انسانی ہمدردی کے تحت ہوتا، بلکہ ان کا اصل مقصد اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے خواتین کو اپنے جال میں پھنسانا اور انھیں اپنی ہوس کا نشانہ بنانا ہوتا۔

اس طرح چیلا رام اور خوشی محمد دلال بھی اس ظالم اور سفاک لوگوں میں سے تھے جنھوں نے ہجرت کر کے آنے والی لڑکیوں کی مدد کرنے کے بجائے انھیں اپنے کاروبار کے لیے استعمال کیا۔ منوڑا میں کشتی چلانے والا ملاّح اور سیٹھ قائم علی اور دائم علی کا شمار بھی ان مقامی لوگوں میں ہوتا ہے جن کا وجود مہاجرین کے لیے بہت تکلیف دہ ثابت ہوا۔ ان کے دلوں میں نہ تو خوفِ خدا تھا اور نہ ہی یہ لوگ مظلوموں کی آہ سے ڈرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تنازعِ کشمیر ہوا تو ان لوگوں نے خوشی کا اظہار کیا تاکہ وہ وینس، پیرس، روم وغیرہ کے نام سے بنائی جانے والی کمین گاہوں میں ہجرت کر کے آنے والی کشمیری لڑکیوں کو بھی شامل کرسکیں۔

زمین

''زمین'' خدیجہ مستور کا دوسرا اور آخری ناول ہے۔ ان کے اس ناول میں ۱۹۴۷ء میں ہونے والے فسادات کے معاشرے اور افراد پر ہونے والے اثرات کو بیان کیا گیا ہے ناول میں پاکستان کے مہاجر کیمپ میں لٹے پٹے اور غم زدہ لوگوں کی داستانوں کو مختلف کرداروں کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔

اس ناول کا آغاز ایک مہاجر کیمپ سے ہوتا ہے۔ ناول میں کیمپ کے مہاجرین کے مختلف واقعات کو تسلسل اور توازن سے بیان کیا گیا ہے۔ مہاجرین کی الجھنیں اور پریشانیاں ہی ناول کا موضوع ہے۔ ناول کے ابتدائی حصّے میں مہاجر کیمپ میں پیش آنے والے واقعات کا مختصر ذکر ہے اور پھر دو مہاجر لڑکیوں ساجدہ اور تاجی کی کہانی شروع ہوتی ہے۔

ناول کی فضا ابتدا ہی سے سوگوار ہے۔ کیمپ کا ہر مہاجر روحانی اور جسمانی طور پر زخمی ہے۔ ہر ایک کے پاس ایک دردبھری کہانی ہے۔ آزاد ملک میں آنے کے بعد بھی انھیں وہ خوشی نہیں مل سکی جس کی اُمید میں وہ ہجرت کی صعوبتوں کو برداشت کر کے آئے تھے۔ اپنے ملک میں آ کر بھی انھیں اپنی عزت اور زندگی خطرے میں نظر آئی انھیں دوسرے کی سچائی اور خلوص پر بھی شک ہونے لگا اور وہ بے یقینی اور غیر یقینی کی اذیّت ناک کیفیت سے دوچار ہو گئے۔

ان کے چہروں پر گھروں کی چھت کے سائے کی محرومیت برس رہی تھی لڑکیاں اب تک دہشت زدہ سی تھیں...بس صرف بچّے تھے جنھیں دنیا کی کوئی فکر نہ ستا رہی تھی ۔☆ ۹۷

زمین کے اہم کردار ساجدہ، ناظم، تاجی، کاظم، سلیمہ، مالک، بڑی امّاں اور خالہ بی ہیں ۔ ان کرداروں کے علاوہ ساجدہ کا باپ، نوری، صلاح الدین وغیرہ کے کرداروں نے بھی ناول کی کہانی کو آگے بڑھایا ہے ۔

یہ تمام کردار تقسیمِ ہند کے بعد ہجرت کر کے پاکستان آئے ہیں ۔ سب کرداروں کا تعلّق متوسّط طبقے سے تھا، لیکن پاکستان آ کر سب کی معاشی اور معاشرتی حیثیت بدل گئی ۔ کوئی متوسّط طبقے سے ادنیٰ طبقے میں شامل ہو گیا اور کسی کا شمار ملک کے معزز اور صاحبِ حیثیت افراد میں ہونے لگا ۔

مہاجر کیمپ کے تمام مہاجرین کسی نہ کسی دکھ کو سینے سے لگائے ہوئے تھے ۔ اسی کیمپ میں ایک بوڑھا اپنی گم شدہ بیٹی کے غم میں پاگل ہو چکا تھا ۔ وہ اپنی بیٹی کو یاد کر کے خوب روتا اور کیمپ کے ہر فرد سے اپنی بیٹی کے بارے میں پوچھتا ۔ آخر ایک دن کیمپ کے رضا کار اسے پاگل خانے میں چھوڑ آئے ۔

ناول میں مالک کا کردار نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہے ۔ ناظم اور کاظم اس کے بیٹے ہیں بڑی امّاں ان کی بیوی، خالہ بی ان کی رشتے دار اور شادی سے قبل ان کی محبوبہ رہ چکی ہیں ۔ شادی کے کچھ سالوں کے بعد خالہ بی بیوہ ہو جاتی ہیں ۔ تو مالک خالہ بی اور ان کی بیٹی سلیمہ کو اپنے گھر لے آتے ہیں، اور خالہ بی اپنی بیٹی سے زیادہ ناظم اور کاظم پر توجہ دینے لگ جاتی ہیں ۔ جس سے سلیمہ خالہ بی سے نفرت کرنے لگ جاتی ہے ۔ مالک خالہ بی کو اپنی بیوی سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں لیکن امّاں سوائے صبر کرنے کے کچھ اور نہیں کر سکتی ۔ مالک خالہ بی سے شدید محبت کرنے کے باوجود ان سے شادی نہیں کرتے، لیکن ان کے ساتھ ایک شوہر کی طرح زندگی گزارتے ہیں اپنی اس غلطی کا انھیں بھی احساس تھا لیکن وہ اپنی روش پر قائم رہے، اور حالات سے فرار حاصل کرنے کے لیے انھوں نے کثرت سے شراب پینا شروع کر دی ۔ گھر میں جو بھی ہوتا مالک کو اس کی کبھی خبر نہ ہوتی ۔

جب وہ ہجرت کر کے پاکستان آئے تو انھوں نے ہر کام بہت چالاکی اور ہوشیاری سے کیا اور جھوٹے کلیم داخل کروا کے ایک کوٹھی حاصل کر لی ۔ مالک کا کردار ان لوگوں کی نشان دہی کرتا ہے جنھوں نے تقسیم کے بعد ناجائز طریقے سے یا لوٹ کھسوٹ سے دوسروں کی چھوڑی ہوئی جائیداد پر قبضہ کر لیا تھا، لیکن پھر بھی ان کی ہوس ختم نہ ہوئی تھی ۔

ناول میں ایک جگہ وہ دوسروں کو مرعوب کرنے کے لیے یہ جھوٹا بیان دیتے ہیں:

''مجھے تو اس کا دکھ ہے کہ اپنے آموں کے باغ کی ایک فصل بھی نہ دیکھی، اس کے ساتھ جو بنگلہ تھا اس میں ایک دن بھی رہنا نصیب نہ ہوا۔'' ☆ ۹۸

مالک کے علاوہ کاظم کا کردار بھی ان لٹیروں کی نمائندگی کرتا ہے جنھوں نے خود کو مظلوم اور لٹے پٹے مہاجرین ظاہر

کر کے دوسروں کی جائیداد کو اپنی ملک بنالیا۔

''اصلی مہاجر تو ہم لوگ ہیں۔ باقی رہے غربا تو وہاں بھی جھونپڑیوں میں رہتے تھے، فٹ پاتھ یا دکانوں کے تھڑوں پر سوتے تھے۔ ایسے لوگ یہاں بھی خود ہی اپنی جگہ بنالیں گے۔ حکومت بھی دراصل ہمارے جیسے لوگوں کی آباد کاری کا نعرہ لگا رہی ہے۔'' ☆۹۹

کاظم مقابلے کا امتحان پاس کر کے کمشنر بن جاتا ہے۔ وہ اپنے عہدے کا بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے، اور جائیداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ وہ اخلاقی پستیوں میں بھی گرتا چلا جاتا ہے اب اس کی ہوس صرف جائیداد جمع کرنے تک محدود نہ تھی، بلکہ وہ تاجی اور ساجدہ کو بھی اپنی ہوس کا نشانہ بنانا اپنا حق سمجھتا ہے لیکن کاظم سے ساجدہ اور تاجی دونوں کا ردِ عمل مختلف ہوتا ہے۔ ساجدہ کاظم کے خلاف احتجاج کیا جب کہ تاجی اپنے آپ کو کاظم کے خوشی کے لیے قربان کر دیتی ہے۔

تاجی ناول کا مظلوم ترین کردار ہے۔ اگرچہ بعض معاملات میں وہ بے باک ہو کر بولتی ہے لیکن جب کاظم اسے بار بار اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے تو تاجی سب کچھ برداشت کر لیتی ہے کیوں کہ وہ اس تلخ حقیقت کو سمجھتی کہ وہ تنہا بے بس اور مجبور ہے۔ اگر وہ کاظم سے بچنے کے لیے کہیں اور چلی گئی تو بھی اس کی عزت اور زندگی کی حفاظت کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔

تاجی کو کیمپ سے لانے کے بعد کاظم اور اس کے گھر والوں نے اسے گھر کی ملازمہ بنالیا۔ ملازمہ کا کام صرف کھانا پکانا اور گھر کی صفائی کرنا نہ تھا، بلکہ کاظم کی خوشی کا بھی خیال رکھتا تھا۔ تاجی کی حیثیت کاظم کے لیے ایک کھلونے سے زیادہ کچھ نہ تھی، لیکن اس کے باوجود وہ کاظم سے نفرت نہ کر سکی، بلکہ وہ کاظم کے جرم کا ذمّے دار بھی خود کو ٹھہراتی۔ ناول میں ایک جگہ وہ ساجدہ سے کہتی ہے:

''قصور میرا ہے باجی! پہلی بار جب کاظم نے کہا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے، تو میرا تن من سب پگھل گیا تھا۔ یہ محبت کیا چیز ہوتی ہے باجی؟ خالہ بی نے مجھے کتنی گالیاں دی تھیں کہ میں ان کے معصوم بیٹے کو بگاڑ رہی ہوں مگر ان کا افسر راجا جب چاہتا ہے مجھے رشوت کے مال کی طرح کھا لیتا ہے۔'' ☆۱۰۰

ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے تاجی کے کردار کو مناسب ترین الفاظ میں بیان کیا ہے:

کاظم نے مظلوم نوکرانی تاجی کی زندگی کو اس وقت تک داغدار کیا جب تک کہ وہ طبی وجوہ کی بنا پر نوجوانی ہی میں اذیّت ناک موت سے ہم کنار ہو گئی۔ ☆۱۰۱

ناظم ناول کا ہیرو ہے ابتدا میں اس کا کردار الجھا ہوا ہے، لیکن جیسے جیسے ناول کی کہانی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ ناظم کی شخصیت بھی واضح ہوتی جاتی ہے۔

ناظم کو پاکستان سے بہت محبت ہے وہ تحریکِ پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصّہ بھی لیتا ہے لیکن تقسیمِ ہند کے بعد ملک میں ناانصافی اور بے ایمانی دیکھ کر اسے بہت تکلیف پہنچتی ہے وہ ناجائز طریقے سے دوسروں کی جائیدار پر قبضہ کرنے والوں کے سخت خلاف ہے۔ اسے ان سرکاری افسروں سے بھی سخت نفرت ہے جو لوگوں سے رشوت لے کر اور جھوٹے کلیم منظور کر کے فرش سے عرش تک پہنچا دیتے۔ ایک دن وہ تنگ آ کر محکمۂ بحالیات کی ملازمت چھوڑ دیتا ہے۔ اس بات پر اس کے گھر والے بہت ناراض ہوئے کاظم نے اس موقع پر کہا:

''آپ نہیں...چاہتے تھے کہ باغ اور دوسری کوٹھی ہم لوگوں کو مل جائے۔'' ☆۱۰۲

اس موقع پر ناظم اور کاظم کے تعلقات اس قدر خراب ہو جاتے ہیں کہ کاظم اسے گھر چھوڑنے کو کہہ دیتا ہے، ایک نقاد نے ناظم کے کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ناظم کا کردار بعض ترقی پسند ادیبوں اور ورکروں کی یاد دلاتا ہے جو پاکستان کے قیام کے ابتدائی سالوں میں نئے پاکستان کے ابھرتے ہوئے ڈھانچے سے خوش نہیں تھے، اور پاکستان کی سیاست و معاشرت پر کڑی تنقید کر رہے تھے۔ ☆۱۰۳

ساجدہ سے شادی کر کے ناظم الگ گھر میں چلا گیا، جہاں کچھ ہی عرصے کے بعد ناظم کو نئے پاکستان کی تشکیل اور حکومت کی مخالفت کرنے کے الزام میں اسے گرفتار کر لیا گیا۔ جہاں جیل کی صعوبتوں سے تنگ آ کر ناظم کو حکومت سے معافی مانگی پڑی اور اسے رہائی مل گئی۔

> ''میں جمہوریت، انصاف اور مساوات کا حامی ہوں، قلم اور زبان پر پابندیوں کے خلاف ہوں۔ حکومت پر تنقید کرتا ہوں...انھیں تو یہ بھی برا لگتا ہے کہ میں پاکستان کو ایک مثالی ملک بنانے کا خواب دیکھتا ہوں...انھیں ان باتوں سے سازش کی بو آتی تھی اور وہ سازش کا پتا چلانا چاہتے تھے...جب میں نے انھیں، یقین دلایا کہ میں بھی پاکستان کو من وسلوا سمجھ کر کھا جاؤں گا تو مجھ پر جو عذاب ابھی نازل ہونا تھا وہ ختم کر دیے گئے اور میں رہا ہو گیا۔'' ☆۱۰۴

جیل سے رہا ہونے کے بعد ناظم کی صحت اس حد تک خراب ہو چکی تھی ملازمت چھوڑنا پڑی جس کی وجہ سے اسے کئی معاشی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ اس موقع پر ساجدہ نے ناظم کا بھرپور ساتھ دیا۔ وہ اپنے گھر، شوہر اور بچّے سب کو سنبھالتی اس کے علاوہ اس نے ایک اسکول میں نوکری بھی کر لی۔

ساجدہ ناول کی ہیروئن ہے وہ بھی اپنے باپ کے ساتھ مہاجر کیمپ میں آئی تھی۔ مہاجر کیمپ ہی میں ناظم اور ساجدہ کے باپ کی دوستی ہو جاتی ہے۔ کیمپ میں ڈاکٹروں کی لاپروائی کی وجہ سے ساجدہ کے باپ کا علاج نہ ہو سکا اور وہ مر گیا، اور ناظم

اور سلمیہ ساجدہ کو اپنے گھر لے گئے۔

ناظم کے گھر والوں کو ساجدہ کا آنا اچھا نہ لگا۔ خالہ بی نے اعتراض کرتے ہوئے ناظم سے کہا:

''تم نے اس گھر کو خیرات خانہ سمجھ رکھا ہے تم کو یہ بھی خیال نہیں کہ اب تمھارے باپ کتنے تھک چکے ہیں۔ پہلے تمھاری ماں گھر کے کام کے بہانے تاجی کو اٹھا لائیں اور اب تم تمھیں پتا ہے آٹا کتنا مہنگا ہو رہا ہے۔'' ☆۱۰۵

ناظم کے گھر والوں نے پاکستان میں آکر غیر قانونی اور ناجائز طریقوں سے اپنی حیثیت کو بالکل بدل لیا تھا، اور اب وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے خاص طور پر کاظم، خالہ بی اور مالک کسی کو اپنانے یا ٹھکرانے سے پہلے اس کی معاشی حیثیت کا اندازہ لگاتے۔ انھوں نے ساجدہ سے بھی اس کے ماضی کے بارے میں پوچھا تو ناظم نے اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی، لیکن ساجدہ نے سب کچھ بہت سچائی کے ساتھ بتاتے ہوئے کہا:

''میرے ابا کپڑے کی دکان پر منشی کا کام کرتے تھے۔ وہ ساری زندگی ایک ہی دکان پر کام کرتے رہے۔'' ☆۱۰۶

ساجدہ کی مالی حیثیت جاننے کے بعد خالہ بی اسے گھر کی ملازمہ کا درجہ دینا چاہتی تھی لیکن ساجدہ تاجی کی طرح جھکنے والوں میں سے نہ تھی۔ وہ خالہ کے سامنے مقابلے کے کھڑی ہوگئی۔

مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں یہاں رہ کر اپنی تعلیم پوری کرلوں گی۔ رہ گئے برتن، تو خالہ بی آپ بھی میرے ساتھ اُٹھوائیے۔ ☆۱۰۷

اگر چہ سلیمہ، بڑی اماں، ناظم اور کسی حد تک تاجی سے بھی اس کی دوستی ہوگئی تھی اور کچھ عرصے کے انتظار کے بعد اسے ایک کالج میں بھی داخل کرا دیا گیا، لیکن اس کے باوجود وہ صلاح الدین جس سے وہ ہجرت کے دوران بچھڑی تھی، کو ایک لمحے کے لیے بھی نہ بھول سکی۔ اس کی یاد اسے ہمیشہ پریشان رکھتی۔ وہ اکثر سوچتی کہ اسے مہاجر کیمپ ہی میں رہ کر صلاح الدین کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔

ساجدہ نے ناظم کے گھر میں ایک نوکرانی کی حیثیت سے نہیں، بلکہ گھر کے ایک فرد کی طرح رہتی تھی۔ کاظم بھی ان سب باتوں سے باخبر تھا لیکن اس کے باوجود اس کے لیے تاجی اور ساجدہ دونوں برابر تھیں۔ وہ ساجدہ کو سوائے منشی کی بیٹی کے سوا کچھ اور نہیں سمجھتا تھا۔ ایک دن کاظم ساجدہ کے کمرے میں بھی اپنی ہوس مٹانے کی نیت سے گیا، لیکن ساجدہ کا رویہ تاجی سے بالکل مختلف تھا وہ ایک جرأت مند اور باہمت لڑکی تھی اس لیے اس نے کاظم کا مقصد پورا نہ ہونے دیا، اور اس کے خلاف بھرپور احتجاج کرتے ہوئے کہا:

''کاظم! یہ تاجی کا کواٹر نہیں، میرے کمرے سے نکل جاؤ، تم غلط جگہ پر آ گئے ہو... اس نے کاظم کا گریبان پکڑلیا اور اتنی زور سے دھکا دیا کہ اس کا سر زور سے دیوار سے ٹکرا گیا۔'' ☆۱۰۸

کاظم کے سنبھلنے سے پہلے ہی وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ کاظم کی اس غلطی پر ناظم کو بڑی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ ناظم ساجدہ کو تحفظ دینے کے لیے اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ ساجدہ کو بھی تحفظ کی ضرورت تھی لیکن صلاح الدین کو بھول جانا اس کے بس میں نہ تھا۔ اس ساجدہ نے ناظم کو ساری بات سچ سچ بتا دی اور اس سے درخواست کی کہ وہ صلاح الدین کو تلاش کرنے میں اس کی مدد کرے۔ ناظم نے اخبار میں اشتہار دیا:

ساجدہ بنت محمد رمضان مرحوم... صلاح الدین ولد علاء الدین کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ جہاں بھی ہے اس پتے پر آ کر ملیں۔ ☆۱۰۹

ساجدہ نے اپنی شرط کے مطابق آٹھ روز تک صلاح الدین کا انتظار کیا، لیکن اس کا صلاح الدین سے رابطہ نہ ہو سکا۔ اس کے بعد وہ ناظم سے شادی کے لیے تیار ہو گئی۔

ساجدہ کے برعکس صلاح الدین ساجدہ کو فراموش کر چکا تھا۔ جب ساجدہ دو بچوں کی ماں بن چکی تو ایک دن کاظم کے گھر اس کی ملاقات صلاح الدین سے ہوئی، لیکن وہ اس صلاح الدین سے بہت مختلف تھا جس سے وہ ہجرت کے دوران بچھڑی تھی اسے اب ساجدہ سے کوئی دل چسپی نہ رہی وہ صرف اس بات پر خوش تھا کہ وہ کمشنر کی بھاوج ہے۔

''یہ بھی خوب رہی میں تو کمشنر صاحب کے لیے بڑی دور سے سفارش ڈھونڈ کر لایا ہوں واہ یہ تو اپنے گھر کی بات ہے۔'' ☆۱۱۰

اس نے اپنا تعارف یوں کرایا:

''میں سرگودھا میں رہتا ہوں... وہاں میری بہت سی زمینیں ہیں دس مربعوں میں تو صرف باغ ہیں۔ بڑے اچھے مالٹے ہیں... خالص ریڈ بلڈ میری بیوی کو بھی جہیز میں پچیس مربع ملے ہیں۔ ہم دونوں اپنے علاقے کے بڑے زمیں دار ہیں۔'' ☆۱۱۱

سلیمہ ناول کا معاون کردار ہے۔ سلیمہ کا کردار ''آنگن'' کے کردار ''عالیہ'' سے ملتا جلتا ہے۔ سلیمہ بھی عالیہ کی طرح گھر کے ناخوشگوار ماحول سے رنجیدہ رہتی۔ اسے اس بات پر بھی شدید شرمندگی کا احساس ہوتا کہ اس کے گھر والوں نے ناجائز طریقوں سے دوسروں کی جائیداد پر قبضہ کر کے اپنی حیثیت کو بدل لیا ہے۔ وہ اکثر سوچتی ہے:

''تقسیم سے پہلے جب ہم تین کمروں کے سرکاری کوارٹر میں رہتے تھے، تو اس سے کہیں بہتر تھے۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی کوئی زبان نہ کھولتا تھا، خاندان اور پڑوس کے خیال سے کوئی

بھی اونچی آواز میں نہ بولتا تھا۔‘ ☆۱۱۲

سلیمہ کو اس بات پر بھی شدید شرمندگی کا احساس ہوتا کہ اس کی ماں (خالہ بی) مالک کی بیوی نہیں پھر بھی وہ مالک کے ساتھ ایک بیوی کی طرح زندگی گزار رہی ہے اور اماں بی جو مالک کی بیوی ہیں۔صبر سے سب کچھ برداشت کر رہی ہیں۔اسے اپنی ماں سے سخت نفرت تھی۔

ناظم اور ساجدہ کے ساتھ سلیمہ کے اچھے تعلقات تھے، لیکن ان کے گھر سے جانے کے بعد سلیمہ نے بھی گھر چھوڑ کر ہوسٹل میں رہنا شروع کر دیا۔کبھی کبھی وہ گھر والوں سے ملنے آتی تو سب سے لاتعلق اور بے زار رہتی۔اس کے اس رویے پر خالہ بی کو سخت تکلیف پہنچتی وہ اس سے بات کرنے کو ترس جاتیں۔

اس سے جب بھی وہ بات کرتیں تو ان کے لہجے میں انتہائی لجالت ہوتی مگر ان کی بات کا جواب دینے کے بجائے سلیمہ کو بہت سے غیر ضروری کام یاد آ جاتے۔☆۱۱۳

خالہ بی کے علاوہ اسے مالک سے بھی نفرت ہے جس نے اسے اور اس کی ماں کو نہ صرف اپنے گھر میں پناہ دی تھی، بلکہ اس کی ماں کو اپنی بیوی سے زیادہ اہمیت دی تھی، لیکن ان میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ اس کی ماں سے شادی کرتے۔

ناول کا ایک اور کردار ’’انوری‘‘ بھی ہے جو ساجدہ کی بچپن کی سہیلی تھی۔تقسیمِ ہند سے پہلے اس کا کام لوگوں کے گھروں کا پانی بھرنا تھا۔پاکستان میں ہجرت کرنے کے بعد ان کی مالی حیثیت بالکل بدل گئی ایک دن جب وہ ساجدہ کو کالج میں ملی تو اس نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا، لیکن ساجدہ کے بے حد اصرار پر اس نے ڈرتے ڈرتے اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ ’’انوری‘‘ ہی ہے۔

’’اللہ نے پاکستان بنایا تو ہمارے دن پھرے، یہاں کوئی کسی کو نہیں جانتا۔‘‘ ☆۱۱۴

ساجدہ نے اگرچہ کاظم کے ساتھ ایک پر وقار محفوظ زندگی گزاری تھی لیکن اس کا المیہ یہ تھا کہ وہ صلاح الدین کو بھول نہ پائی وہ ناظم کی بیوی تھی لیکن وہ اپنی تصوراتی دنیا میں صلاح الدین کے ساتھ زندگی گزار رہی تھی۔

نیلم فرزانہ اس ناول کے کرداروں کے بارے میں کہتی ہیں:

زمین کی ساجدہ اور سلیمہ بہت حد تک ’’آنگن‘‘ کی عالیہ ہی کا روپ ہیں ان کے احساسات اور ان کا شعور عالیہ کی یاد دلاتا ہے۔زمین میں یہ دونوں کردار جس انجام کو پہنچتے ہیں وہ ان کے اسی شعور کا نتیجہ ہوتا ہے جو آنگن میں عالیہ کے انجام کا سبب بنا۔☆۱۱۵

حالاں کہ ناول ’’آنگن‘‘ اور ’’زمین‘‘ فسادات کے موضوع پر لکھے گئے ہیں اور ان کے کرداروں کا تعلق متوسط طبقے سے ہے، لیکن ان کی ذہنی سطح، خیالات اور رویّے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔’’آنگن‘‘ کی عالیہ اگرچہ ’’زمین‘‘ کی ساجدہ کی

طرح حساس ہے لیکن دونوں کے رویے ایک دوسرے سے مختلف ہیں ۔عالیہ میں خوداعتمادی کی کمی ہے وہ سب سے بہت کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن جرأت کی کمی اور لڑائی جھگڑے کے خوف سے وہ کچھ کہہ نہیں پاتی ۔اسے کسی خاص شخص سے محبت نہیں لیکن اس کے ذہن میں ایک آئیڈیل کا تصور ہے۔آئیڈیل کی خصوصیات اسے جمیل کیمپ کے ڈاکٹر اور صفدر میں نظر نہیں آتی اور وہ تنہا زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔

جب کہ ''زمین'' کی ساجدہ عالیہ کے برخلاف پُراعتماد اور باہمت لڑکی ہے۔ہجرت کے بعد اسے مالک کے گھر میں پناہ لینا پڑتی ہے لیکن وہ وہاں اپنی حیثیت منوا لیتی ہے ہجرت کے بعد وہ صلاح الدین سے بچھڑ جاتی ہے اپنے تحفظ کے لیے اسے ناظم سے شادی کرنا پڑی،لیکن عالیہ کی طرح تنہائی اس کا مقدر نہ بنی اس کے ساتھ ناظم اور اس کے بچے تھے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے''زمین'' کے کرداروں کا''آنگن'' کے کرداروں سے موازنہ کرتے ہوئے کہا ہے:

آنگن میں چھمی ایسی طبیعت رکھنے والی لڑکی تھی اور زمین میں اس کا سایہ تاجی کی شکل میں موجود ہے۔☆۱۱۶

آنگن کی ''چھمی'' زمین کی ''تاجی'' کی طرح ماں باپ کی محبت سے محروم، ناسمجھ اور غیر تعلیم یافتہ تو ہے،لیکن دونوں کی زندگی گزارنے کا انداز ایک دوسرے سے مختلف ہے''چھمی'' اپنی بات منوانے کے لیے ہر جائز اور ناجائز طریقہ آزماتی ۔اپنے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کا وہ بلا لحاظ ہر چھوٹے اور بڑے سے بدلہ لیتی ۔جمیل کو اپنانے کے لیے وہ اپنی شادی کے بعد بھی کوشش کرتی رہی،اور آخر میں وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی۔

''زمین'' کی تاجی ناسمجھ،غریب، ماں باپ کے سائے سے محروم ہونے کی وجہ سے کاظم کے گھر میں اس کے ساتھ کی جانے والی تمام زیادتیوں کو برداشت کر لیتی ہے۔گھر کے کاموں کے علاوہ اسے خالہ بی کی ڈانٹ پھٹکار اور کاظم کے جنسی تشدد سب کچھ ڈھیٹ بن کر سہنا پڑا۔ناول میں ایک جگہ وہ خود اِس بات کا اعتراف کرتی ہے:

''جب اللہ میاں نے غریبوں کو پیدا کیا تھا...،تو ان سے شرم وحیا چھین لی تھی ، لمّاں کہتی تھی غریب آدمی شرم کرے تو پیٹ کہاں سے بھرے۔'' ☆۱۱۷

مجموعی طور پر یہ ناول مہاجرین کے مختلف رویّوں کا آئینہ دار ہے جو مثبت اور منفی دونوں طرح کے ہیں۔

ناول میں عورت کی معاشرتی حیثیت کو نمایاں طور پر دکھایا گیا ہے خاص طور پر تاجی کا کردار ناول کے موضوع کے لحاظ سے اہم ترین کردار ہے۔جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت چاہے آزاد ملک کے معاشرے کی کیوں نہ ہو، اگر وہ کم زور اور بے بس ہے تو لوگ اسے اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنے کے بعد چھوڑ دیں گے۔تاجی جس کی ماں نے دوسری شادی کر کے اسے اس اُمید پر آزاد مسلم ملک پاکستان بھیج دیا تھا کہ اپنے ملک میں وہ بالکل محفوظ رہے گی اور کوئی بھی شریف مسلمان مرد اس

سے شادی کر لے گا۔لیکن پاکستان میں کاظم نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو ہندوستان میں کوئی سکھ یا ہندو مذہبی اور نسلی تعصب کی وجہ سے اس کے ساتھ کرتا۔

ناول میں دوسری حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ قیامِ پاکستان کے ابتدائی سالوں میں جن لوگوں نے ملک کی باگ ڈور سنبھالی، یا مختلف اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہوئے ان میں سے بیش تر افسران نے مہاجرین کے مسائل کو حل کرنے اور ملک کی ترقّی کے لیے سوچنے کے بجائے غیر قانونی طریقوں سے اپنی حیثیت بدلا، اور بعض مہاجرین ایسے تھے جنھیں ان کی حیثیت کے مطابق جائیداد وغیرہ نہ مل سکی اور وہ لوگ صرف روحانی طور پر ہی زخمی نہ ہوئے، بلکہ وہ معاشی طور پر بھی تنگ دستی کا شکار ہوئے۔ یہ پاکستانی معاشرے کی بدنصیبی کی ابتدا تھی۔

خدا کی بستی

شوکت صدیقی کا یہ ناول قیامِ پاکستان کے ابتدائی برسوں کے حالات کے بارے میں لکھا گیا ہے یہ وہ دور تھا جب بیش تر مہاجرین معاشی مسائل کا شکار ہو گئے تھے۔

جب کہ مقامی لوگوں نے پاکستان سے چلے جانے والوں کی مال و دولت پر قبضہ کر کے اپنی حیثیت کو بالکل بدل لیا تھا۔ مقامی لوگوں کے علاوہ بعض مہاجرین بھی ایسے تھے جنھوں نے تقسیمِ ہند اور ہجرت سے بھر پور فائدہ اٹھایا اور جھوٹے کلیم داخل کر کے راتوں رات امیر ہونے کا خواب پورا کیا۔

اور یوں ملک میں نو دولتیوں کا ایک نیا طبقہ پیدا ہو گیا جو محبت اور ہمدردی کے ہر جذبے سے عاری تھا یہ طبقہ اپنی اغراض پوری کرنے کے لیے کسی کی عزتِ نفس کا خیال نہ رکھتا۔ دولت کے سہارے وہ زمینوں کے علاوہ غریب عوام کو بھی اپنی ملکیت بنا لیتے۔

ان سارے حقائق کو ذہن میں رکھ کر شوکت صدیقی نے ایک بہت اچھا ناول تخلیق کیا۔ جسے ۱۹۶۱ء میں آدم جی ایوارڈ بھی ملا۔ ناول کا پلاٹ وسیع اور پھیلا ہوا ہے۔ ناول میں کئی کردار اور واقعات ہیں جن کا آپس میں گہرا ربط ہے۔

> ''خدا کی بستی'' میں معاشرے کی جن کش مکشوں کو پیش کیا گیا اس میں میرے نزدیک ان کا سب سے اہم نکتہ بدی کا مسئلہ ہے۔ ایک خاص دورِ حیات سے منسلک ہوتے ہوئے بھی شوکت صدیقی کے فن کی خوبی یہ ہے کہ کرداروں کا عمل اور واقعات کا بہاؤ ہمیں خود بخود زندگی کے سیلِ رواں سے آشنا کرتا ہے۔ اور قصّے کے اتار چڑھاؤ سے لگاؤ زندگی کے خیر و شر کی صورت میں ڈھل جاتا ہے۔☆۱۱۸

ناول کے تمام واقعات میں شروع سے لے کر آخر تک تجسس اور دلچسپی برقرار ہے ناول کے کرداروں کا لب ولہجہ ان کے ماحول کے عین مطابق ہے جرائم پیشہ لوگوں کی زبان اور بعض مخصوص الفاظ کو انھوں نے گہرے مشاہدے کے بعد لکھا ہے۔ مثلاً:

''خو،تم کدھر جاتا؟ تمھارا باہر جانے کا منادی ہے!'' ☆۱۱۹

''یار بڑی غضب کی لونڈیا ہے، جی چاہتا ہے کہ بس سالی کو بیٹھے دیکھا کروں۔'' ☆۱۲۰

''تم اپنا ٹین پاٹ یہاں سے گول کرو۔'' ☆۱۲۱

اس ناول کی زبان کے بارے میں عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ غیر شائستہ ہے۔ ان کا یہ انداز منٹو والا ہے۔ انھوں نے بھی کرداروں کے ماحول، ذہنی سطح اور پیشہ وغیرہ کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے مخصوص لب ولہجہ کو استعمال کیا ہے۔

ڈاکٹر حنیف فوق نے ''خدا کی بستی'' کے بارے میں رائے دی ہے:

شوکت صدیقی نے ''خدا کی بستی'' میں ناول کی تکنیک سے بھر پور فائدہ اٹھایا ہے موضوع پلاٹ، کردار نگاری، بیان، مکالمہ، واقعاتی، بیانیہ اور احساساتی آہنگ پھر سب سے بڑھ کر نظارۂ زندگی کی صلاحیت نے ایک مربوط، منظم اور معنوی اعتبار سے پُر کار ہئیت کی تخلیق کی ہے۔ ☆۱۲۲

ناول میں مختلف ماحول اور اس سے وابستہ فضا دکھائی گئی ہے۔ ناول میں معاشرے کا غریب اور مظلوم طبقہ ذہنی اور جذباتی کش مکش میں مبتلا دکھایا گیا ہے۔ معاشی الجھنوں کی وجہ سے ایسے کردار بھی ایک دوسرے سے الجھ جاتے ہیں جن کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔

امیر اور عیّاش طبقے کی غیر اخلاقی سرگرمیاں، ان کے گھروں، دفتروں اور غیر قانونی کاموں کے مختلف ٹھکانوں کے ماحول کو بھی ناول میں نمایاں طور پر دکھایا گیا ہے۔

ناول میں کئی کردار ہیں۔ ہر کردار اپنی جگہ اہم ہے اور کہانی کو آگے بڑھا رہا ہے یہ کردار مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود ناول کے کسی نہ کسی موڑ پر یہ کردار آپس میں ملتے ہیں۔ ناول کے آدھے کردار ظالم اور آدھے مظلوم ہیں۔

ناول کا آغاز سلطانہ اور اس کے خاندان سے ہوتا ہے یہ خاندان ہجرت کر کے پاکستان آیا تھا یہاں آ کر انھیں معاشی بدحالی کی وجہ سے کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔

گھر کی گزر بسر کے لیے سلطانہ اور اس کی بیٹی گھر بیٹھے بیڑیاں بناتیں اور نوشا ایک ورکشاپ میں کام کرتا تھا، اور جو بھی کماتا وہ صرف اپنی ذات پر خرچ کرتا۔ جب کہ سلطانہ جو بھی کماتی وہ اس کے اخراجات کے حساب سے بہت کم تھا۔

نیاز نے جب تک سلطانہ کی بیٹی کو نہیں دیکھا تھا اس وقت تک سلطانہ کو کرائے کی فوری وصولی کے سلسلے میں بہت تنگ

کیا۔ نیاز سلطانہ کی خوب صورت بیٹی سے بہت متاثر ہوا، اور اس نے اپنی برائے نام رشتے داری نبھانے کے بہانے ہر روز ان کے گھر میں آنا شروع کر دیا اس نے نہ صرف گھر کا کرایہ لینا چھوڑ دیا، بلکہ گھر کے دوسرے اخراجات بھی پورے کرنا شروع کر دیے۔ اپنی دولت کی نمائش اور چاپلوسی سے اس نے بہت جلد سلطانہ اور اس کے گھر والوں کو شیشے میں اتار لیا۔ نیاز نے دل ہی دل میں سلطانہ کی بیٹی سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا، لیکن سلطانہ کی دل جوئی بھی اس انداز میں کی کہ وہ نیاز کی نیکی اور خلوص پر شک نہ کر سکی۔

> ان ہی دنوں ایک اور مصیبت یہ نازل ہوئی کہ بیڑی کے کارخانے میں ہڑتال ہوئی آمدنی کا سلسلہ اچانک منقطع ہو گیا۔ یہ بہت بڑی مار تھی ایسی ٹھوکر لگی کہ وہ اف بھی نہ کر سکی... چند ہی دنوں میں فاقہ کشی کی نوبت آ گئی۔ ☆۱۲۳

ان حالات سے نیاز نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور وہ سلطانہ کے اور بھی قریب ہو گیا۔ اب سلطانہ کو نیاز کا اپنے گھر میں آنا بہت اچھا لگتا اس خوشی کے پیچھے اس کی معاشی ضروریات کی تکمیل اور نیاز کی جھوٹی محبت پر یقین شامل تھا۔

نیاز ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت سلطانہ پر بہت مہربان ہو گیا اور یہ مہربانی اس حد تک بڑھی کہ اس نے سلطانہ سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔

شادی کے بعد کچھ دن بہت اچھے گزرے۔ نیاز سلطانہ اور انو کا بھی بہت خیال رکھتا۔ سلطانہ کی بیٹی کے ساتھ اس کا رویہ بہت محتاط قسم کا تھا۔ سلطانہ کی محبت اور خدمت سے متاثر ہو کر کبھی کبھی نیاز بھی اپنے دل میں سلطانہ کے لیے سچی محبت محسوس کرتا لیکن جلد ہی محبت کے جذبے پر شیطانیت غالب آ جاتی۔

اس نے سلطانہ سے شادی کرنے کا منصوبہ بنایا اور سلطانہ کی ماں کی زندگی کی انشورنس کروائی اور اس کی موت کا انتظار کرنے لگا ایک دن سلطانہ کی ماں کو موسمی بخار ہوا تو نیاز نے ڈاکٹر خیرات اللہ عرف ڈاکٹر موٹو کی خدمات حاصل کیں۔

ڈاکٹر موٹو کا کردار ان نام نہاد ڈاکٹروں کی نمائندگی کرتا ہے جنھوں نے قیامِ پاکستان کے بعد غلط بیانی سے کام لے کر اپنی حیثیت کو بدل لیا تھا۔

> اب اس نے اپنے نام کے ساتھ ایک بوگس ڈگری بھی لگا لی تھی اور ٹھاٹھ کے ساتھ ڈاکٹری کر رہا تھا... وہ کئی سنگین مقدمات میں ملوث ہو چکا تھا اور ہر بار جیل جانے سے بال بال بچ گیا تھا۔ ☆۱۲۴

ڈاکٹر موٹو نے سلطانہ کو ایک خطرناک بیماری میں مبتلا بتا کر خوب ڈرایا اور علاج کے لیے اسے انجکشنوں کا کورس تجویز کیا۔ انجکشن لگانے سے سلطانہ کی حالت ٹھیک ہونے کے بجائے بگڑتی گئی۔ ایک دن جب سلطانہ نے انجکشن لگانے سے انکار

کیا تو نیاز نے تھپڑوں اور لاتوں سے اس کی بہت پٹائی، لیکن اسے بہت جلد احساس ہوا اس طرح سارا معاملہ بگڑ جائے گا۔ سلطانہ نیاز سے متنفر ہونے کے باوجود اس کی ذرا سی خوشامد سے اس کی ساری زیادتیاں بھول گئی۔

بات یہ تھی کہ بیماری نے اس کو بالکل اپاہج کر کے ڈال دیا تھا۔ اب وہ گھر میں بیٹھ کر محنت مزدوری کرنے کے بھی قابل نہ رہی تھی نیاز کے جانے کے بعد گھر کا دھند کس طرح چلے گا... یہ احساس بڑا ڈراونا تھا۔☆ ۱۲۵

نیاز نے سلطانہ کی سب سے بڑی کم زوری کا فائدہ اٹھایا اور خود کو سلطانہ کی بیٹی کی شادی کے لیے فکرمند ظاہر کیا اور سلطانہ نے صرف نیاز کی خوشی کے لیے پھر سے انجکشن لگوانے شروع کر دیے جس سے سلطانہ کو ایک دن بہت خطرناک دورہ پڑا۔ سلطانہ کا انتقال ہو گیا۔

سلطانہ کے مرنے کے بعد نیاز کو پچاس ہزار ملے جس سے اس کی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں آئیں وہ سلطانہ اور انور کو لے کر ایک کوٹھی میں چلا گیا اب وہ اپنی کار پر دکان جاتا۔

سلطانہ کے ساتھ اس کا رویّہ نرم اور محتاط تھا جب کہ وہ انو کو بات بات پر ڈانٹتا اور مارتا سلطانہ سارے حالات سے واقف ہونے کے باوجود سوائے صبر کرنے کے کچھ اور نہ کر سکی انو جب نیاز کی برداشت سے بالکل باہر ہو گیا تو اس دن اسے بری طرح مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا۔ گھر سے نکل کر انو ہیجڑوں کے قابو میں آ گیا، اور پھر گلی گلی اور محلّہ محلّہ وہ تالیاں بجاتا ہوا نظر آتا۔ انو کے جانے کے بعد نیاز سلطانہ کی دلجوئی کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا، لیکن سلطانہ پھر بھی اس سے بےزار رہتی کیوں کہ وہ جانتی تھی انو نیاز ہی کی وجہ سے گھر چھوڑ کر گیا ہے، لیکن ماں کی وفات، نوشا اور انو کے گھر سے جانے کے بعد سلطانہ نیاز کی محتاج بن کر رہ گئی تھی رفتہ رفتہ نیاز بھی اس کے قریب آتا گیا اور مجبوراً سلطانہ کو بھی حالات سے سمجھوتا کرنا پڑا۔

آخر ایک دن سلطانہ نے نیاز کے ناجائز بچّے کو جنم دیا۔ اس کی خوشی میں وہ بھول گئے کہ دونوں کے درمیان جو رشتہ ہے اس کے مطابق وہ اولاد پیدا کرنے کا حق نہیں رکھتے۔ ان ہی دنوں نیاز کا ایک اور جرم بھی سامنے آ گیا نیاز اور خان بہادر نے میونسپلٹی کی جو دو منزلہ عمارت بنوائی تھی وہ ایک دن تیز بارش کی وجہ سے ٹوٹ کر نیچے آ گئی اور کئی دیواریں منہدم ہو گئیں۔

عمارت کو جو بھی نقصان ہوا تھا اس کے ذمّے دار نیاز اور خان بہادر دنوں تھے، لیکن خان بہادر نیاز سے بھی بڑا مجرم تھا اس نے پہلے پولیس کو رشوت دے کر نیاز کو گرفتار کروا دیا اور خود بچ گیا لیکن جلد ہی نیاز کے سچ اگلنے کے ڈر سے اس کی ضمانت دے کر اسے رہا کروا لیا۔

خان بہادر نیاز کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا چکا تھا لیکن اس سے پہلے ہی نوشا نے اسے اپنی ماں کا قاتل اور سلطانہ کی تباہی کا ذمّے دار ہونے کی وجہ سے قتل کر کے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

نیاز کے قتل کے بعد خان بہادر نے اپنے دوست فیاض کو نیاز کا چھوٹا بھائی ظاہر کیا۔ وہ سلطانہ کے گھر میں رہنے لگا۔ رفتہ رفتہ وہ گھر کے ہر معاملے میں مداخلت کرنے لگا۔ اس نے نیاز کا قیمتی سامان اٹھا کر اپنے کمرے میں رکھ لیا اور ایک دن سلطانہ کے کمرے کی بھی چابیاں مانگیں۔ سلطانہ کے انکار کرنے پر اس نے اپنے ساتھی کرم الٰہی کے ساتھ مل کر سلطانہ کو بری طرح مارا پیٹا یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہوگئی۔

سلطانہ کو خان بہادر پر بہت اعتماد تھا وہ اس کی مدد سے نیاز کی جائیداد حاصل کرنا چاہ رہی تھی لیکن خان بہادر نے اسے بہت تکلیف دہ حقیقت سے آگاہ کرتے ہوئے کہا:

> ''...سچ پوچھو تو تمھاری حیثیت نیاز کی داشتہ سے زیادہ نہیں...تمھارا نیاز کی جائیداد پر کوئی حق نہیں بنتا... نیاز کو تمھارے باپ کی حیثیت سے دیکھا جائے تب بھی سوتیلی اولاد کے رشتے سے اس کے ترکے میں تمھارا کوئی حصہ نہیں ہوسکتا رہ گیا وہ بچہ وہ بھی نیاز کی ناجائز اولاد ہے اس کا بھی حق نہیں بنتا۔'' ☆۱۲۶

سلطانہ کو اپنے نوکر کے ذریعے پتا چلا کہ وہ اس کے بیٹے کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا چکے ہیں تو سلطانہ نے اپنا گھر چھوڑ کر اپنے خانساماں کے ساتھ رہنا شروع کر دیا، لیکن خانساماں کے گھر والے بھی سلطانہ کو زیادہ دن برداشت نہ کر سکے، اور جب سلطانہ خودکشی کرنے کا ارادہ کر چکی تھی۔ اس کی پڑوسن نے اسے ایک فلاحی ادارے ''اسکائی لارک'' میں نوکری دلوادی اور وہیں سلطانہ کی رہائش کا بھی بندوبست ہوگیا، اور پھر اسکائی لارک کے ایک ممبر نے سلطانہ اور اس کے بچے کے بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس سے شادی کر لی۔

اس منزل تک پہنچنے تک سلطانہ کو جن تکلیف دہ اور عبرت ناک مراحل سے گزرنا پڑا وہ سلطانہ کے حوصلے کا کمال ہے، اور اسے جس انداز سے بیان کیا گیا ہے وہ شوکت صدیقی کا کمال ہے۔

سلطانہ کا کردار ناول کا مظلوم ترین کردار ہے۔ ناول کی ابتدا سے لے کر علی احمد سے شادی تک سلطانہ اپنے اور پرائے سب کے ظلم سہتی رہی۔

ڈاکٹر حنیف فوق نے سلطانہ کے کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> خدا کی بستی میں سب سے اہم کردار سلطانہ کا ہے جو کئی بار لٹتی ہے۔ یہاں تک کہ اپنے سوتیلے باپ کے ہاتھوں بھی لوٹی جاتی ہے...الگ الگ وقفوں میں دونوں بھائیوں مفارقت کے صدمے سہتی، ماں کی رقابت برداشت کرتی، اپنے چاہنے والوں کے ہاتھوں مایوس ہوتی، نئی اُمیدیں باندھتی اور اپنے خوابوں کو چکنا چور ہوتے دیکھتی۔ ناجائز بچے کو جنم دے کر سوتیلے باپ

کی داشتہ کہلائی اور اس کے قتل کے بعد غاصبوں کا لذیذ شوق بنتی ہے، لیکن اس کی نسائیت کبھی نہیں مرتی اور جب علی احمد کی بیوی بن کر وہ پیار بھری ازدواجی زندگی گزارنے لگتی ہے تو اس کی فطری دل آویزی چمک اٹھتی ہے۔ ☆۱۲۷

نوشا، شامی اور راجا کے کردار معاشرے کے غریب طبقے کے نوعمر لڑکوں کی ترجمانی کرتے ہیں جنھیں معاشرے کے بااثر اور جرائم پیشہ لوگ کچھ پیسوں کے عوض اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

نوشا ۲۰ روپے کے عوض ایک ورکشاپ میں کام کرتا تھا۔ اس کمائی میں سے وہ کچھ پیسے اپنی ماں کو دیتا اور باقی پیسے اپنی سیر و تفریح کے لیے رکھ لیتا۔ کچھ ہی عرصے کے بعد نیاز نے نوشا کو ورکشاپ سے پرزے چوری کر کے اس کے ہاتھ فروخت کرنے کا مشورہ دیا۔ نوشا کے جھجکنے پر اس نے حوصلہ دیا اور انعام کے طور پر اسے پہلے ہی کچھ پیسے دے کر نوشا کو راضی کر لیا۔

نوشا نے غور کیا جب سے اس جیب میں رقم رہنے لگی ہے شامی اور راجا دونوں کے انداز میں خوشامد آ گئی تھی اب وہ اس کی ہر بات مان لیتے تھے رفتہ رفتہ وہ ان کا سرغنہ بنتا جا رہا تھا۔ ☆۱۲۸

ایک دن نوشا چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا اور ورکشاپ کے مالک نے اسے نہایت ظالمانہ طریقے سے مار کر نوکری سے فارغ کر دیا۔

شامی اخبار بیچتا تھا اور کبھی کبھی اپنے باپ کی دکان پر بھی کچھ دیر کے لیے بیٹھ جاتا اور باپ سے کسی نہ کسی بات پر لڑ کر ناراض ہو جاتا۔

راجا کا کردار بھی معاشرے کے مظلوم طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ راجا کا باپ اور بھائی فسادات میں مارے گئے تھے۔ وہ اپنی ماں اور بشیرا کے ساتھ پاکستان آیا تھا۔ بشیرا راجا کو بہت مارتا تھا۔ ایک دن راجا کی ماں اسے یتیم خانہ چھوڑ آئی۔ جہاں کا ملا راجا اور دوسرے لڑکوں کو بھیک مانگنے پر مجبور کرتا ایک دن راجا وہاں سے بھاگ گیا لیکن بھیک مانگنا اس کے مقدر میں لکھا جا چکا تھا۔ اس لیے اسے ایک بوڑھے اور لنگڑے فقیر کے ساتھ مل کر بھیک مانگنا پڑی۔

راجا کو اپنی ماں سے سخت نفرت تھی وہ اکثر کہا کرتا تھا:

”...اب اس کے پاس جا کر کیا کروں گا۔ سالی رنڈی پنا کرتی ہے۔ کبھی مل گئی تو خدا قسم، قتل کر دوں گا!“ ☆۱۲۹

ایک دفعہ بوڑھے فقیر کو انسدادِ گداگری کے قانون کے تحت گرفتار کر لیا گیا جس سے راجا کی آمدنی کا ذریعہ بھی ختم ہو گیا۔ تینوں لڑکے بے روزگار ہونے کی وجہ سے سارا دن گلیوں میں مارے مارے پھرتے یا تاش کھیل کر وقت گزارتے۔ ایک دن مجید نے اپنی آمدنی میں اضافے کے لیے انھیں مشورہ دیا کہ کچھ پیسوں کے عوض وہ اس کی دکان سے قریبی

علاقوں میں جا کر سائیکلوں کے ٹائر پنکچر کیا کریں۔ چوری پکڑے جانے کے ڈر سے تینوں نے انکار کر دیا لیکن نیاز کی طرح مجید نے بھی ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا:

''بس ٹائر میں جا کر ذرا پن ہی تو چبھونا ہے اور کون سا تم کو بڑا ڈاکا ڈالنا ہے۔'' ☆۱۳۰

اس کام میں تینوں کو بہت مزا آیا وہ جہاں سائیکل کھڑے دیکھتے اس کے ٹائر فوراً پنکچر کر دیتے۔ ایک دن وہ ٹائر پنکچر کرتے ہوئے پکڑے گئے اور لوگوں نے ان کی خوب پٹائی کی۔ جب وہ سب کی نظروں میں مشکوک ہو گئے تو مجید نے انھیں نوکری سے فارغ کر دیا۔

گھر والوں کی نفرت اور بے روزگاری سے تنگ آ کر تینوں نے گھر اور شہر چھوڑ کر کراچی جانے کا فیصلہ کیا۔ شامی تو آدھے راستے ہی سے واپس آ گیا جب کہ راجا اور نوشا کراچی پہنچ گئے۔

کراچی ریلوے اسٹیشن پر ہی ان کا واسطہ رحمٰن سے پڑ گیا وہ انھیں شاہ جی کے پاس لے گیا جہاں نوشا اور راجا کا پندرہ سو روپے میں سودا ہو گیا۔

ایک دن نوشا اور راجا کو شاہ جی نے ان کی نوکری کے بارے میں بتایا:

''یہ (نورے) تم دونوں کوٹھیوں میں لے جائے گا... وہاں جا کر جھوٹ موٹ... تھوڑی سی اپنی مصیبت بھی بیان کرنا تا کہ آسانی سے ملازمت مل جائے جو تنخواہ دیں اسی پر کام شروع کر دینا۔'' ☆۱۳۱

راجا کو کوٹھی میں کام کرتے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا کہ نورے نے راجا کو شاہ جی کا پیغام دیا:

''...اب تم یہ پتا لگانے کی کوشش کرو کہ بی بی زیور اور نقدی کہاں کہاں رکھتی ہیں جب بھی موقع لگے... جن بکسوں اور الماریوں میں قیمتی سامان رکھا ہوا ہو ان کو بھانپ لینا۔'' ☆۱۳۲

راجا کے لیے یہ بڑا کڑا وقت تھا وہ شاہ جی سے بہت خوف زدہ تھا کوٹھی والوں سے اتنی محبت پا کر انھیں دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا۔

راجا نے نورے کو جب کسی بات کا بھید نہ دیا تو وہ اسے شاہ جی کے پاس لے گیا۔ جہاں شاہ جی نے اسے بہت سخت قسم کی جسمانی سزائیں دے کر بات منوائی۔

کوٹھی سے چوری کرنے کے بعد راجا کو دوبارہ کام کرنے سے بھی منع کر دیا گیا۔ راجا اور نوشا ایک بار پھر شاہ جی کے قیدی بن گئے۔ جہاں سے وہ ایک دن فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ کچھ دن ایک مزار پر رہنے کے بعد وہ دوبارہ کوٹھی میں چلے گئے اور انھیں سارے حالات سے آگاہ کیا کوٹھی والوں نے انھیں پولیس کے حوالے کر دیا نوشا اور راجا کو دو دو سال شاہ جی

اور اس کے ساتھیوں کو چار چار سال کی قید ہوگئی۔

جیل میں راجا ایک جلدی بیماری میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ہسپتال بھیج دیا گیا۔ راجا کے جانے کے بعد نوشا کی دوستی پوکر سے ہوگئی۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد پوکر نوشا کو بھی اپنے ساتھ جیب کتروں کے اڈے پر لے گیا۔ جیب کتروں کے سردار پیڈرو نے نوشا کو بھی اپنی شاگردی میں لینے کی رسم ادا کی، اور نوشا کو جیب تراشی کے مختلف گر سکھائے جب نوشا کی تربیت ہوگئی تو اسے عملی میدان میں بھیج دیا گیا۔

ایک دن نوشا کو بھیک مانگتے ہوئے راجا ملا۔

> اس کی دو آنکھیں بند تھیں۔ سکڑا ہوا جسم کسی سڑی ہوئی لاش کی طرح گھناؤنا نظر آ رہا تھا اس کے بدن پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں جگہ جگہ پھنسیاں تھیں۔ جن سے رطوبت بہہ رہی تھی۔☆۱۳۳

راجا آتشک کے مرض میں مبتلا تھا اگر چہ جیل والوں نے اسے علاج کے لیے ہسپتال بھیجا تھا، لیکن ہسپتال میں جگہ نہ ہونے کے باعث راجا کا علاج نہ ہو سکا تھا اور راجا نے مجبوراً بھیک مانگنا شروع کر دی۔ راجا کو اس حالت میں دیکھ کر نوشا کو بے حد تکلیف ہوئی۔ نوشا نے اسے نئے کپڑے لا کر دیے، اسے روز کھانا کھلاتا اور ایک مکان کی دیوار کے ساتھ اسے سائبان بنا کر دیا۔ وہ اس کا علاج کروانا چاہتا تھا۔

> اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ پوکر کے ساتھ جیب تراشی کروانے کے علاوہ اکیلا بھی کاری گری کے ہاتھ دکھانے لگا اور اس رقم کو اُستاد پیڈرو سے پوشیدہ رکھتا اسے ڈھائی سو روپے کی ضرورت تھی تاکہ وہ راجا کا علاج کرا سکے۔☆۱۳۴

جب وہ راجا کے لیے پیسے بچا کر رکھتا یا اس کا خیال رکھتا تو نوشا کو بے حد خوشی اور سکون کا احساس ہوتا اور وہ سوچتا کہ وہ صرف ایک جیب کترا ہی نہیں، بلکہ وہ کسی دکھی انسان کا دوست اور مددگار بھی ہے۔

نوشا کے مقصد کی کامیابی سے پہلے ہی اُستاد پیڈرو کو پتا چل گیا کہ نوشا ساری رقم اسے نہیں دیتا اُستاد پیڈرو نے اسے مار پیٹ کر جیب کتروں کے گروہ سے خارج کر دیا۔

کچھ دن مارا مارا پھرنے کے بعد نوشا نے ایک موٹر ورکشاپ میں نوکری کر لی، اور باعزت زندگی گزارنے کا عہد کیا۔ رہائش کا مسئلہ پیش آیا تو اسے اپنا پروفیسر دوست یاد آیا جس نے نوشا کو راہِ راست پر آنے کا مشورہ دیا تھا۔ نوشا میں مثبت تبدیلی دیکھ کر پروفیسر بہت خوش ہوا اور اس نے اسے اپنے پاس رکھ لیا، لیکن وہاں بھی نوشا کچھ اپنی غلطیوں اور اخلاقی کمزوریوں کی وجہ سے اور کچھ پروفیسر کی بیٹی کی غلطیوں کی وجہ سے زیادہ عرصہ نہ رہ سکا۔

پروفیسر نے اپنی بیٹی کی غلطیوں پر تو پردہ ڈال دیا اور سارا الزام نوشا پر لگا دیا۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تم ابھی تک جرائم پیشہ ہو۔ اپنی بربادی کا انتقام تم معاشرے سے لو۔ تم مجھ سے اس کا بدلہ نہیں لے سکتے۔ تم سزا یافتہ جیب کترے ہو۔ اٹھائی گیرے ہو۔ میں تم کو اس بات کا ہرگز حق نہیں دے سکتا کہ تم میری بیٹی کے ساتھ فلرٹ کرو۔☆۱۳۵

مسلسل پریشانیوں اور ناکامیوں کے بعد نوشا مایوس ہو چکا تھا۔ آخر ایک دن تنگ آ کر اس نے کراچی چھوڑ دیا۔ اپنے شہر میں جا کر اس کی ملاقات سب سے پہلے شامی سے ہوئی۔ شامی کی زندگی کا انجام بھی نوشا اور راجا سے مختلف نہ تھا۔ ٹی بی کا مریض ہونے کے باوجود وہ سائیکل رکشا چلاتا اور اخبار بیچتا۔

نوشا کے جانے کے بعد اس کے گھر میں جو کچھ ہوا تھا اس کی ساری تفصیل اسے شامی کے ذریعے معلوم ہوتی۔ اس کے گھر کی تباہی و بربادی کا ذمّے دار نیاز تھا۔ اپنی ماں، بہن اور بھائی کا بدلہ لینے کے لیے نوشا نے نیاز کو قتل کر کے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔

سلمان کا کردار بھی متوسّط طبقے کے ایک بے روزگار نوجوان کی نمائندگی کرتا ہے، اور گھر والے دونوں اسے ٹھکرا چکے ہیں۔ گھر والوں سے ناراض ہونے کے بعد اسے تعلیم مکمل کرنے کے لیے نہ تو کہیں مناسب ملازمت ملی اور نہ ہی کہیں اور اسے پیسوں کا بندوبست ہو سکا کھانے پینے کے لیے بھی اسے اپنے استعمال کی چیزیں فرخت کرنی پڑیں۔ آخر ایک ایک روز وہ ایک فلاحی ادارے ''اسکائی لارک'' سے منسلک ہو گیا، اور تعلیمِ بالغاں کے منصوبے پر اپنے فرائض انجام دینے لگا۔ کچھ عرصے کے بعد خان بہادر کی زیادتیوں اور اسکائی لارک کے بعض ارکان کے ساتھ ذاتی تلخیوں کے باعث اُس نے اسکائی لارک سے علیحدگی اختیار کر لی، اور اپنے گھر واپس چلا گیا۔

گھر والوں نے اس کی شادی رخشندہ سے کر دی۔ رخشندہ کے گھر والوں نے سلمان کی ملازمت کا بھی بندوبست کر دیا۔ رخشندہ ایک سیدھی سادی اور باوقار قسم کی بیوی تھی لیکن جب سلمان کے بوس جعفری نے ان کے گھر آنا شروع کیا تو وہ سلمان سے زیادہ رخشندہ سے بے تکلف ہو گیا اور اکثر ایسا ہونے لگا کہ سلمان کے دفتر سے لوٹنے سے پہلے ہی رخشندہ اور جعفری کہیں نہ کہیں جا چکے ہوتے۔

اس کی حیثیت جعفری کے مقابلے میں گھٹ کر دوسرے درجے پر آ گئی تھی جعفری کی موجودگی میں وہ احساسِ کمتری میں مبتلا رہتا۔☆۱۳۶

جعفری سے ناراض ہونے کی صورت میں اسے ملازمت جانے کا ڈر تھا۔ وہ عجیب ذہنی کش مکش میں مبتلا تھا۔ ایک دن سلمان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے رخشندہ کو جان سے مارنے کی دھمکی دے کر جعفری سے ملنے سے منع کیا۔ موت کے ڈر سے رخشندہ نے جعفری سے ملنا تو چھوڑ دیا لیکن وہ اس دن کے بعد رخشندہ اور جعفری بہت بے چین اور پریشان رہے انتقاماً

ایک دن جعفری نے سلمان کو دفتر میں بلا کر کہا:

''آپ کے خلاف آرڈی سیکشن سے بڑی سخت شکایت آئی ہے آپ بالکل لاپروا ہوتے جارہے ہیں۔ میں آپ کو آخری وارننگ دے رہا ہوں اس کے بعد اگر آپ کو دفتر چھوڑنا پڑا تو آپ کو حیران نہیں ہونا چاہیے۔'' ☆۱۳۷

نہ چاہتے ہوئے بھی سلمان نے رخشندہ کو جعفری سے ملنے کی اجازت دے دی۔

پھر ایک وقت ایسا آیا جب رخشندہ کو اپنی تفریح کے لیے نہیں، بلکہ اپنی ترقی کے لیے کمپنی کے ڈائریکٹر کو پیش کیا۔ یہ سارا کھیل سلمان اور اس کے دوست نے ایک کلب میں دیکھا۔ سلمان کا دوست جو رخشندہ اور سلمان کے رشتے سے ناواقف تھا۔ اس نے یقین سے کہا:

''اسی ہفتے تم سن لینا سلمان کو پروموشن مل گیا۔ اتنی بڑی رشوت پر تو سلطنت مل سکتی ہے...اُستاد ترقی کرنا چاہتے تو وہ تکنیک سیکھ لو سب سے آسان نسخہ ہے۔'' ☆۱۳۸

رخشندہ اور کمپنی کے ڈائریکٹر کی ملاقات کے ایک ہفتے بعد ہی جعفری کی ترقی ہوگئی اور وہ کمپنی کا منیجر بن گیا۔ جعفری کی ترقی کو سلمان نے اپنی توہین سمجھا اسے جعفری اور رخشندہ دونوں سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ اس نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور رخشندہ کو طلاق دے کر دوبارہ اسکائی لارک سے منسلک ہوگیا۔ یہاں پر کچھ دن تو بہت اچھے گزرے اس کے بعد اس کی ملاقات سلطانہ سے ہوئی جو کبھی اس کی محبوبہ رہ چکی تھی، لیکن اب وہ علی احمد کی بیوی تھی غرض یہ کہ سلمان بھی مسلسل حادثوں کا شکار ہونے کی وجہ سے ناول کا المیہ کردار بن گیا۔

''خدا کی بستی'' میں شوکت صدیقی نے پاکستانی معاشرے بالخصوص قیامِ پاکستان کے ابتدائی دنوں کے معاشرتی ماحول کو دکھایا ہے جو دو طبقوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔

ایک طرف کم زور، بے بس اور بدحال مہاجرین اور دوسرے غریب لوگ ہیں جب کہ دوسری طرف ظالم، جابر اور نو دولتیے ہیں۔

امیر طبقہ ظالم بھی ہے اور قانون شکن بھی، لیکن زندگی کی خوشیاں، آسائشیں اور کامیابیاں ان کے قدم چوم رہی ہیں۔ غریب طبقے کے پاس سچائی، ایمان داری اور محبت کے جذبات ہیں انھیں ہر لمحے اپنی عزت جانے کا خوف ہے، لیکن اسی طبقے کے لوگ جب امیر طبقے کے محکوم بنتے ہیں تو وہ جرائم کی دلدل میں دھنس جاتے ہیں۔

نوشا، شامی اور راجا اور انو غریب طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں جو شریفانہ اور باعزت زندگی گزارنا چاہتے تھے لیکن تقدیر اور حالات نے ان کا ساتھ نہ دیا، شوکت صدیقی نے ناول میں کئی جگہ اتنے متاثر کن مکالمے لکھے ہیں کہ ان کرداروں کی دلی

کیفیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

نیاز، خان بہادر علی، ڈاکٹر موٹو اور شاہ جی معاشرے کے گم راہ طبقے کے نمائندے ہیں جو کئی جرائم میں ملوث ہیں اور دوسروں کو بھی برائی کی طرف مائل کرتے ہیں۔

خان بہادر جیسے لوگ مسجد تعمیر کروا کے اسلام کے علمبردار بھی کہلاتے ہیں۔ تعلیمی اداروں اور دوسری تقریبات میں بطورِ مہمانِ خصوصی جاتے ہیں۔ یہ لوگ فلاحی اداروں میں بھی کام کرتے ہیں لیکن اپنی شہرت اور نیک نامی کے لیے انسانی ہمدردی اور خوفِ خدا سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔

نیاز جیسے لوگ اپنی خوشی اور عیش کے لیے کسی کی زندگی اور عزت کی پروا نہیں کرتے ڈاکٹر موٹو جیسے مسیحا آج بھی خدا کی بستیوں میں اپنے شکار کی تلاش میں رہتے ہیں ان تمام برائیوں کے باوجود وہ معاشرے کے باعزت اور معزز شہری ہیں۔

نیاز مقدمے کے سلسلے میں بھی ایک طرف اثر و رسوخ رکھنے والا خان بہادر ہے اور دوسری طرف غیرت مند بے بس نوشا ہے جو مذہبی نقطۂ نظر سے حق بجانب ہے لیکن معاشرے کی ناانصافی اور دولت کی طاقت اسے مجرم ٹھہرا کر عمر قید کی سزا سناتی ہے۔

سلطانہ اور اس کی ملازمہ اس بات کی گواہ تھیں کہ نیاز کے قتل ہونے سے پہلے ہی اسے زہر دیا جا چکا تھا، لیکن کچھ پیسوں کے عوض اسے اپنے بیان بدلنے میں کوئی اعتراض نہ تھا۔

> مگر دوسری ہی پیشی میں خادمہ اپنے بیان سے منحرف ہو گئی۔ خان بہادر نے ایک ہزار روپے دے کر اسے منا لیا تھا۔☆ ۱۳۹

سلطانہ کو نوشا کی بہن ہونے کی وجہ سے کوئی اہمیت نہ دی گئی۔

گم راہ کرداروں میں شاہ جی، خان صاحب، رحمٰن اور جعفری بھی شامل ہیں جو غریب اور بے سہارا بچّوں کو اپنے ساتھ مجرمانہ پیشوں میں ملوث کر لیتے ہیں۔ شاہ جی جیسے کردار بچّوں کو اغوا بھی کرتے ہیں ان کی تجارت بھی کرتے ہیں اور انھیں مجرم بنا کر جیل تک بھی پہنچاتے ہیں لیکن کوئی ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا ہے۔ کیوں کہ ٹھکانے لگانے والے خود ان کے محافظ ہیں۔

اسی طرح اُستاد پیڈرو بھی ایک گھناؤنے کاروبار میں ملوث ہے اور وطن کے معصوم بچّے جو مستقبل کے معمار بھی ہیں انھیں جیب تراشی کی تربیت اسے کسی کا ڈر یا خوف نہیں کیوں کہ پوچھ گچھ کرنے والے ان کے اپنے بندے ہیں ناول میں اس حقیقت کو کردار کے ذریعے یوں بیان کیا ہے:

> ’’...جا کے تھانے میں رپٹ لکھوا دیجیو کہ اُستاد پیڈرو جیب کتروں کا اڈہ چلاتا ہے تجھے بھی قسم ہے جو جا کے نہ کہیو پر یہ سن لو کہ دو ہزار روپے مہینے نقد کھلاتا ہوں...تو یہ سمجھ رہا ہے کہ میں اُستاد کا کچھ بگاڑ سکتا ہوں۔‘‘ ☆ ۱۴۰

جعفری کا قابلِ نفرت کردار دفتروں میں کام کرنے والے ان افسروں کی نمائندگی کر رہا ہے جو خواتین کو اپنی ترقی اور تفریح کے لیے استعمال کرتے ہیں ان کی ترقی اور کامیابی حاصل ہونے تک ان کے دل کیا گزرتی ہے اور کتنے گھر تباہ ہوتے اس سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

منفی کرداروں کے علاوہ انھوں نے فلاحی تنظیم ''فلک پیا'' اور اس کے کارکنوں کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ دنیا میں ابھی اچھے اور نیک لوگ موجود ہیں۔ خاص طور پر علی احمد کا سلطانہ کو اس کے ناجائز بچے سمیت قبول کر لینا اس کے حوصلے، اعلیٰ ظرفی اور خدا ترسی کی عمدہ مثال ہے۔

بلاشبہ یہ ناول ہر لحاظ سے بہترین ناولوں میں سے ہے لیکن ناول پر بعض نقادوں نے اعتراض بھی کیے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر احسن فاروقی کا کہنا ہے:

''خدا کی بستی'' تو اشتراکی طرزِ ناول نگاری کی بھی سطحی پیروی ہے۔☆۱۴۱

جب کہ ڈاکٹر عبدالسلام کا خیال ہے:

فلک پیا کا سماجی یونٹ بنانے کا پروگرام اشتراکی نظام کی کمیوں کی یاد تازہ کر دیتا ہے مگر اس کائی لارک جو پروگرام بناتے ہیں اور ایثار و عمل کا جو جذبہ پیش کرتے ہیں ان میں اشتراکیوں کے بجائے جماعت اسلامی کی جھلک زیادہ نظر آتی ہے۔☆۱۴۲

دونوں کے خیالات سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ بے سہارا اور ضرورت مندوں کی مدد کرنے کا جذبہ کسی خاص گروہ یا جماعت کی میراث نہیں، بلکہ کوئی بھی شخص جو حساس دل کا مالک ہے وہ دوسروں کی تکالیف کو محسوس بھی کرے گا، اور ان کی مدد بھی کرے گا۔ سہیل بخاری نے سلطانہ کے کردار پر اعتراض کیا ہے:

سلطانہ کی ماں کا بیٹی کی جگہ نکاح کے لیے اپنے کو آپ کو نیاز کے سامنے پیش کرنا خلافِ فطرت ہے۔ ماں کے سامنے سلطانہ کا سلمان کے پاس جانے کی تجویز پیش کرنا اور ماں کا روٹھے ہوئے نیاز کو منانا بھی غیر حقیقی ہے۔☆۱۴۳

سہیل بخاری کا دوسرا اعتراض یہ ہے:

ایک طرف تو واقعات یہ بتاتے ہیں کہ وہ ابتدا سے آخر تک نیاز کی طرف مائل رہی ہے۔ دوسری طرف وہ سلمان کے گھر جا کر اس سے شادی کی درخواست کرتی ہے اور نڈھال ہو کر شاہد کے کندھے پر سر ٹکا لیتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعاتی تنظیم کی سخت گرفت نے کرداروں کو نیم جاں اور غیر مستقل بنا دیا ہے۔☆۱۴۴

سلطانہ اور نیاز کی عمر اور شکل وصورت میں زمین آسمان کا فرق تھا، اور سلطانہ اور سلمان ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اس وجہ سے سلطانہ کی ماں اپنی بیٹی کا نیاز سے بچانے کے لیے اپنا نکاح نیاز سے کرنا چاہتی تھی۔ نیاز سلطانہ سے بہت محبت سے پیش اتا اور اس کی مالی امداد بھی کرتا تھا اور یہ انسانی فطرت ہے کہ انسان دوسروں کی محبت اور توجہ پا کر خوش ہوتا ہے روٹھے ہوئے نیاز کے سامنے سلطانہ کو پیش کرنا بھی سلطانہ کی ماں کی خودغرضی اور محبت کو کھونے کے ڈر کو ظاہر کرتی ہے، لیکن یہ بات خلاف فطرت نہیں، بلکہ افسوس ناک بات ہے اس لیے غربت کو برائی کی ماں کہا جاتا ہے۔

سہیل بخاری کے دوسرے اعتراض کا جواب ان کے اعتراض ہی میں موجود ہے:

...اور نڈھال ہوکر شاہد کے کندھے پر سر ٹکا دیتی ہے۔ ☆۱۴۵

سلطانہ اور اس کے خاندان کے تمام افراد حالات کے ستائے ہوئے ہیں۔ انھیں صرف مالی پریشانیاں ہی نہیں تھیں، بلکہ اپنے تحفظ کے لیے کسی سہارے کی بھی ضرورت تھی، اور ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔ سلطانہ کی ماں کو نیاز اپنا سہارا لگا جب کہ سلطانہ محبت اور سہارے کی تلاش میں کئی بار بھٹکی۔

ڈاکٹر حنیف فوق نے لکھا ہے:

اپنے چاہنے والوں کے ہاتھوں مایوس ہوئی کئی اُمّیدیں باندھتی اور اپنے خواب چکنا چور ہوتے دیکھتی۔ ☆۱۴۶

مجموعی طور پر اس ناول کے بارے میں اعتراض بہت کم ہوئے اور اس کے موضوع، کردار اور طرزِ تحریر کو سراہنے والے زیادہ ہے۔ ''آدم جی ایوارڈ'' اس بات کا ایک ثبوت ہے۔

اپنے ناول کے ذریعے وہ معاشرے کی جن برائیوں کو بیان کرنا چاہ رہے تھی اسے انھوں نے نہایت کام یابی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ امیر اور غریب کے فرق، بے روزگار نوجوانوں کا بھٹک جانا اور معاشرے کی ناانصافیاں بہت جرأت اور سچائی سے بیان کی ہیں۔ ان کی یہ عبارت ان کے پورے ناول کا نچوڑ ہے:

نوشا جیل میں اور پھانسی کے پھندے کے سائے میں کھڑا تھا اور خان بہادر کے فرزندانِ ارجمند بیرونی ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے اور اپنے مستقبل کی روشن صبح کی دہلیز پر کھڑے تھے اپنی اپنی قسمت ہے۔ یہ خواص اور عوام کا فرق ہے۔ خواص خان بہادر فرزند علی پیدا کرتے ہیں اور عوام نوشا، راجا اور شامی اور انور کو جنم دیتے ہیں ان میں کوئی قتل کر کے جیل جاتا ہے۔ کوئی کوڑھی بن کر ایڑیاں رگڑتا ہے موت کا انتظار کرتا ہے کوئی تپ دق میں مبتلا ہوکر خوف تھوکتا ہے اور رکشہ کھینچتا ہے اور کوئی ہیجڑوں کے ساتھ تالیاں پیٹتا کر کوٹھے مٹکاتا ہے۔ ☆۱۴۷

افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ شوکت صدیقی نے ۱۹۶۱ء کے پاکستانی معاشرے کی جن برائیوں کی نشاں دہی کی تھی وہ برائیاں ختم ہونے کے بجائے روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔

امیر اور غریب کا فرق اب بھی باقی ہے نوشا، شامی، راجا اور انو جیسے کردار آج بھی ہمارے معاشرے بالخصوص کچی آبادیوں میں موجود ہیں جو بچپن ہی میں زندگی کے تلخ حقائق اور غمِ روزگار سے آشنا ہو جاتے ہیں، اور ان کی ساری زندگی حالات کا مقابلہ کرتے کرتے گزر جاتی ہے۔ یہ اچھی زندگی گزارنے اور تعلیم حاصل کرنے کے خواب تو دیکھ سکتے ہیں، لیکن خوابوں کو حقیقت بنانا اس کے بس سے باہر تھے۔

دفتروں کی حالت بھی غیر اطمینان بخش ہے۔ جعفری جیسے لوگ آج بھی اپنے ماتحتوں کو بلیک میل کرتے ہیں اور ان کے ماتحتوں کی بیگمات یا دفتروں کی دوسری لڑکیوں کو محبت کے جال میں پھنسا کر ان کی عزت اور گھر تباہ کر دیتے ہیں۔

اس ناول کا نام شوکت صدیقی نے ''خدا کی بستی'' رکھا ہے یہ ایک ایسی بستی ہے جہاں ظالم پھول رہے ہیں اور مظلوم پس رہے ہیں اور ظالموں کا پھلنا پھولنا جاری ہی رہتا ہے۔ آخر خدا کی بستی میں خدا کا قانون نافذ نہیں ہوتا اور اگر خدا کی یہی قانون ہے جو ناول خدا کی بستی میں جاری وساری ہے تو پھر انسان انصاف کی اُمید کس سے وابستہ کرے۔

ناول میں ادنیٰ، متوسط اور اعلیٰ درجے کے بے شمار افراد اور کردار زیرِ بحث آئے ہیں۔ شیطنت شوکت صدیقی کے نزدیک کسی ایک طبقہ سے مخصوص نہیں ادنیٰ درجے کے لوگ، اعلیٰ درجے کے لوگوں کے ساتھ مل کر شیطانی سرگرمیوں میں برابر کے شریک رہتے ہیں۔

دراصل جب معاشرے سے انصاف اور قانون اٹھ جائے تو وہی کردار پھولتے پھلتے ہیں جو خدا کی بستی میں پھلتے پھولتے ہیں ناول کی اشاعت چالیس سال بعد بھی ہمارا معاشرہ اس سے شاید بری ہوگیا ہے جو چالیس سال قبل شوکت صدیقی نے دکھایا تھا۔

بستی

انتظار حسین کا یہ ناول ماضی کی یادوں اور قیامِ پاکستان کے بعد کے حالات اور مسائل کے بارے میں ہے ناول میں مختلف حالات کا بھی سامنا کرتے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد تقسیم پاکستان اور سقوط ڈھاکہ کے الم ناک واقعے کو بھی بیان کیا گیا ہے ناول کے آغاز میں قابیل کے ہابیل کو قتل کرنے کا ذکر کر کے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسانوں نے آپس کی نفرت اور حسد کی وجہ سے ہر زمانے میں ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

چوں کہ ناول کے آغاز اور انجام میں انسانوں کی آپس کی نفرت اور حسد کو ہی نمایاں طور پر دکھایا گیا ہے۔ اس لیے ناول

کی فضا سوگوار ہے۔

اگر چہ ناول کا پلاٹ وسیع ہے لیکن اس میں بعض جگہ ربط کی کمی ہے۔ ناول نگار نے بعض مسائل کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے اور بعض جگہ وہ بہت تیزی سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ مثلاً ناول کے آغاز میں مصنف نے ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک کا ذکر کیا ہے لیکن اس کے بعد کے حالات کے بارے میں انھوں نے کچھ نہیں لکھا۔ اسی طرح ڈھاکہ علیحدہ ہونے پر انھوں نے پاکستانی عوام کے تأثرات کو بیان کیا ہے، لیکن ناول کی کردار طاہرہ بتول جو ڈھاکہ میں صابرہ اور ذاکر کے خاندان سے علیحدہ ہوگئے ہیں ان کے جذبات و احساسات کو ناول نگار نے فراموش کر دیا ہے جس سے ناول میں توازن برقرار نہ رہا۔

ناول کے اہم کردار ابا جان، اماں جان، ذاکر، طاہرہ، صابرہ اور بتول ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ ذاکر ناول کا مرکزی کردار ہے۔

تقسیمِ ہند کے نتیجے میں یہ خاندان بکھر جاتا ہے اماں، ابا اور ذاکر پاکستان میں آ جاتے ہیں۔ طاہرہ شادی کے بعد ڈھاکہ چلی جاتی ہے اور کچھ عرصے کے بعد بتول بھی ڈھاکہ کو اپنا ٹھکانا بنا لیتی ہے جب کہ صابرہ ہندوستان میں تنہا رہ جاتی ہے۔

تقسیمِ ہند کے بعد ذاکر اپنے والدین کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آ گیا۔ یہاں آ کر انھیں رہنے کے لیے کرائے پر ایک معمولی مکان ملا۔ ذاکر کے والد اس پر بھی اللہ کے شکرگزار تھے ذاکر کا پاکستان آ کر ایک کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہو گیا۔ معاشی مسائل کو ذاکر اور اس کے والد نے کبھی اہمیت نہ دی البتہ پرانے وطن اور ساتھیوں کی یادوں نے انھیں ہجرت کے کرب سے آشنا کیا۔

> اسے اپنے کمرے کا خیال آیا دیواروں والا کمرہ جس میں ایک چارپائی تھی۔ کتابوں سے بھری ایک میز...ایک لیمپ جس کی دھیمی روشنی میں وہ رات گئے تک پڑھا کرتا تھا میرا کمرہ آج کی رات خالی پڑا ہوگا اس بڑے اور روشن کمرے اسے اپنا چھوڑا ہوا خستہ حال کمرہ بہت یاد آیا...پھر اس نے اپنے مُنہ پر چادر لے لی اور رو دیا۔ ☆۱۴۸

ذاکر کے دل میں گھر، محلّے، دوستوں اور یادوں کے علاوہ ''صابرہ'' کی یاد بھی شامل تھی۔ جس سے وہ تقسیمِ ہند کے بعد رابطہ نہ رکھ سکا۔ ایک طویل عرصے کے بعد اپنے دوست سریندر کے ذریعے اسے صابرہ کی خبر ملی اور جب اس نے صابرہ سے رابطہ کرنے کا سوچا تو وہ ۱۹۷۱ء کے بعد کا زمانہ تھا، اور پاکستان اور ہندوستان کی ڈاک پر پابندی لگ چکی تھی۔

ذاکر کے والد بھی ''روپ نگر'' کی گلیوں اور محلّوں سے تو نکل آئے لیکن وہاں کی یادوں سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکے انھیں اس بات کا بے حد ملال تھا کہ انھوں نے آخر بار اپنے بزرگوں کی قبروں پر فاتحہ خوانی نہ کی۔

ذاکر کی ماں بھی ''روپ نگر'' کو فراموش نہ کر پائی تھی، اور پچیس سال گزرنے کے بعد بھی اسے روپ نگر والے گھر کی کوٹھری کی چابی سنبھال کر رکھی ہوئی تھی ان کی یادوں کا محور وہی کوٹھری اور اس میں رکھا ہوا سامان تھا۔ جس کی اسے اب بھی ایسے فکر تھی جیسے اس نے لوٹ کر وہیں جانا ہے۔

> زمانے کا کیا ہے وہ تو گزرتا ہی رہتا ہے مگر کوٹھری کی چابی کھوگئی تو غضب ہو جائے گا۔ ہماری تو ساری جدی پشتی چیزیں اسی میں بند ہیں میرا سارا جہیز... جب ذاکر پیدا ہوا تھا تو... چاندی کی رکابیوں میں بالوشاہیں برادری میں بانٹی تھیں اس وقت کی بچی ہوئی رکابیں... کربلائے معلی سے کفن منگایا تھا وہ... اسی ٹرنک میں رکھا ہے جس میں بڑے ابا کی مدینۂ منورہ والی جانماز اور خاکِ شفا کی سجدہ گاہ... بڑی اماں کی پٹاری اور رحل رکھی ہے۔☆۱۴۹

ماضی پرستی کے حوالے سے ناول کے کردار افضال کی نانی کا ہندوستان لوٹ کر جانے کی شدید خواہش کو ناول نگار نے بڑے دل چسپ اور متاثر کن انداز میں پیش کیا ہے:

> ''ایک دن لجاجت سے اس نے مجھ سے کہا کہ کاکا، اتنا ویلا ہو گیا۔ اب تو باڑھ اتر گئی ہوگی۔ مجھے تو گھر لے چل، میں نے کہا، کہ میری نانی باڑھ ادھر اتر گئی مگر اس طرف چڑھ گئی ہے۔ اس نے مجھے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا بس ایک لفظ کہا، 'اچھا' اور مرگئی۔'' ☆۱۵۰

قیامِ پاکستان کے ابتدائی دنوں میں صبر وقناعت پر صرف ذاکر کے گھر والوں تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ بہت سے مہاجرین ایسے تھے جنھوں نے مادّی آسائشوں کو پس پشت ڈال کر ایک دوسرے کے دکھ بانٹے اور جہاں تک ہو سکا ایک دوسرے کی مدد کر کے مہاجر اور انصار کی یاد تازہ کی۔

> ...جب پاکستان ابھی نیا نیا تھا، ان دنوں قافلے کالے کوسوں چل کر یہاں پہنچ رہے تھے روز کوئی قافلہ شہر میں داخل ہوتا اور گلیوں محلّوں میں بکھر جاتا جیسے جہاں سر چھپانے کے لیے کونہ مل گیا وہاں پسر گیا۔ جیسے کشادہ مکان میسّر آجاتا وہ پہلے اپنی خوشی سے پھر مروت میں آنے والوں کو پناہ دیتا چلا جاتا یہاں تک کہ کشادہ مکان تنگ نظر آنے لگتا... وہ مل کر ان سب پیچھے رہ جانے والوں کو ایک ملال کے ساتھ یاد کرتے۔ دل ان کے بھر آتے اور آنکھیں ڈبڈبانے لگتیں پھر آنکھیں پونچھتے اور اگلے دنوں کی سوچتے کہ یہاں کیسے گزر بسر کرنی ہے۔☆۱۵۱

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا مہاجرین کے زخم بھی بھرتے گئے اور ساتھیوں کی محبت دوستی اور ماضی پرستی کی جگہ مادّہ پرستی نے لے لی۔ روپے پیسے اور امارت کی دوڑ میں وہ آپس کی محبت بے غرضی اور خلوص سب کو فراموش کر بیٹھے۔

اس حقیقت کو ناول میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

...دیکھتے دیکھتے شام نگر کے مکان کشادہ سے تنگ ہوتے چلے گئے اور دلوں کی گنجائش کم تر ہوتی چلی گئی...قافلوں کا تانتا ٹوٹ چکا تھا بس کبھی کوئی اکا دکا فرد، کبھی کوئی چھوٹا موٹا خاندان آ نکلتا، شام نگر میں بھٹکتا پھرتا کہیں سر چھپانے کی جگہ نہ ملتی...زندگی کی ضرورتیں کہ ہجرت میں مختصر ہوتے ہوتے تن ڈھانکنے اور پیٹ بھرنے تک محدود ہوگئی تھیں اب... بڑھتی اور پھیلتی چلی جا رہی تھیں جن مکانوں نے کئی کئی خاندانوں کو پناہ دی تھی اب وہ مکان باقی خاندانوں سے گلوخلاصی کر کے کسی ایک خاندان کی رہائش گاہ تھے...کوئی مکین پھیلتے پھیلتے اپنی حدود سے نکل کر دوسرے کی حدود میں پھیلنے پر مائل نظر آتا۔ دوسری طرف مزاحمت ہوتی۔ تو تکار، پھر ایک کا ہاتھ اور دوسرے کا گریبان۔ لڑنے والے پہلے اندر لڑتے پھر لڑتے لڑتے باہر نکل آتے ہمسائے پہلے تو تماشا دیکھتے پھر بیچ بچاؤ کرتے۔ کوئی پھرتیلا مکین بھاگ دوڑ کر کے پورا مکان اپنے نام کرا لیتا۔ ☆۱۵۲

ذاکر کے گھر والوں نے بھی بعد میں آنے والے مہاجرین کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی ذاکر اور اس کے والد کے لیے ماضی کی یادیں ہی سب سے بڑا سرمایہ تھیں۔ البتہ ذاکر کی والدہ کبھی کبھی اپنی کم مائیگی پر جلتی کڑھتی۔ یہ احساس اس وقت شدت اختیار کر جاتا جب وہ دوسرے مہاجرین کی پاکستان آ کر غیر قانونی طریقوں سے کایا پلٹتی دیکھتیں۔ انتظار حسین نے ذاکر کی والدہ کی اس کیفیت کو شریفین اور ذاکر کی والدہ کے ان مکالموں کے ذریعے واضح کی ہے:

''دلہن بی! میں ابھی منشی مصیب حسین کا گھر دیکھ کر آ رہی ہوں۔ حویلی ہے حویلی۔ تم نے یہ کیا ڈیڑھ بالشت کا مکان الاٹ کرایا ہے۔''

''میّا الاٹ کہاں کرایا ہے! ہم تو کرائے کے مکان میں پڑے ہیں۔''

''کرائے کے مکان میں؟ دلہن بی ہوش کی دوا لو۔ نگوڑے نگھروں نے حویلییں الاٹ کرالیں، حویلی والے کرائے کے مکان میں پڑے ہیں...تمھارے پاکستان میں تو بہت آپا دھاپی ہے۔ لوگوں کے خون کیسے سفید ہوگئے ہیں میں تو دیکھ کر حق دق رہ گئی۔'' ☆۱۵۳

ناول کے اس اقتباس سے پاکستان آ کر مہاجرین کی معاشی حیثیت میں تضاد کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور بعض مہاجرین کا مختلف طریقوں سے جائیداد املاک پر قابض ہونے اور بعض مہاجرین کا حق دار ہوتے بھی محروم رہنے کی تلخ حقیقت سامنے آتی ہے۔

مہاجرین ابھی ماضی ہی میں کھوئے ہوئے تھے اور پاکستان ابھی ترقی کے مراحل ہی میں تھا کہ پہلے ۱۹۶۵ کی جنگ ہوئی اور اس کے بعد ۱۹۷۱ء کی جنگ نے نہ صرف ملک میں خوف اور دہشت پھیلایا، بلکہ ملک میں تباہی بھی مچائی اور بنگالیوں کی غدّاری سے ملک کی تقسیم وجود میں آئی اور ڈھاکہ پاکستان سے علیحدہ ہوگیا، اور اب مہاجرین ہندوستان میں رہ جانے والے ساتھیوں کے علاوہ ڈھاکے کے رشتے داروں کو بھی کرتے اور ڈھاکہ کے ساتھ ہندوستان کی یادیں بھی تازہ ہو جاتیں، جنگ کے بعد پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات مزید کشیدہ ہو گئے اور مہاجرین کا اپنے ہندوستانی رشتے داروں سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہ سکا۔

> تقسیم در تقسیم اس ناول کا موضوع ہے...جس نے ہجرت کے بعد پاکستان میں اپنے مسائل کو الم ناک صورت میں بیان کیا ہے۔☆۱۵۴

قیامِ پاکستان کے بعد پاکستانی عوام کے آپس کے جھگڑوں اور فرقہ بندی وغیرہ پر بھی انتظار حسین نے اس ناول کے ذریعے اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ ان حالات میں کہیں سے دھماکوں کی، کہیں سے گولی چلنے کی، کہیں سے توڑ پھوڑ کی، کہیں سے آگ لگنے کی اور کبھی کسی کو اغوا کرنے کی خبروں سے لوگوں میں خوف و ہراس پھیل جانے کے بارے میں بھی تفصیلات بیان کی ہیں۔

> سڑک دور تک خالی تھی اور بھری ہوئی تھی یہاں سے وہاں تک ...ٹوٹی پھوٹی اینٹیں، کاروں کے شیشے کی کرچیاں، ادھ جلے ٹائر، ٹریفک سگنل...اپنی بتیوں سے محروم...کھڑے تھے، کتنے خمیدہ ہو گئے تھے، خاموشی گزرے ہوئے شور کی غماز...جتنا بڑا ہنگامہ ہوتا ہے اس کے بعد اتنی ہی گہری خاموشی ہوتی ہے۔☆۱۵۵

مسلمانوں کے فرقے وارانہ جھگڑے صرف سڑکوں اور بازاروں تک ہی محدود نہ رہتے، بلکہ مسجدوں کی ویرانی سے بھی اندازہ ہوجاتا کہ مذہب کی بنیاد پر آزادی حاصل کرنے والے مسلمان اب اپنے ہی ملک میں مذہبی فرقے بنا رہے ہیں۔

> کوچے ویران، گلیاں سنسان، دریچے بند، دروازے مقفل، مسجد ہوحق کرتی تھی وہ جب امامت کے لیے کھڑا ہوا تھا تو نمازی صف بہ صف صحن مسجد کی آخری حد تک کھڑے تھے جب سلام پھیرنے کے بعد اس نے مڑکر دیکھا تو صفیں صاف مسجد خالی۔ وہ مسجد میں نمازیوں کے جلو میں داخل ہوا تھا اور اکیلا مسجد سے رخصت ہوا۔☆۱۵۶

ناول میں سب سے زیادہ متاثر کن چیز نوجوان نسل کی پاکستان سے محبت، امن کی خواہش اور ملک کو خوب سے خوب تر بنانے کا خواب اور اس خواب کے پورے ہونے کی اُمید ہے۔

''... پاکستان ایک امانت ہے تم دونوں میرے بازو بن جاؤ میں اس امانت کو سنبھالتا ہوں نہیں تو
یہ چوہے پاکستان کو کتر کتر کر اس کا برادہ بنا دیں گے۔'' ☆۱۵۷

''پاکستان میں پھول بہت کم ہو گئے ہیں جب ہی تو لوگ بدصورت ہوتے چلے جا رہے ہیں، اور نفرت پھیلتی چلی جا رہی ہے میں نے سوچا کہ ان بدبختوں کی صورتوں کو مسخ ہونے سے بچایا جائے۔

''پھر تیار ہو جا، پاکستان کو خوب صورت بنانا ہے۔'' ☆۱۵۸

انتظار حسین نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں ماضی پرستی کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے، لیکن اس ناول میں انتظار حسین نے تقسیمِ ہند کے بعد کی جانے والی ہجرت اور پاکستان میں آ کر مہاجرین کے مختلف حالات، مسائل اور ہجرت کے کرب کی تصویر کشی کی ہے اور پھر ۱۹۷۱ء میں پاکستان کی تقسیم کے بعد بنگال کے قیام اور مہاجرین کی دوسری ہجرت کے کرب کو بھی بیان کیا ہے۔

نوجوان کے پاکستان کے بارے میں مختلف خیالات اور اس کی تعمیر یا تخریب میں مختلف کردار کے بیان سے ناول کو منفرد حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

❁ ❁ ❁

حوالہ جات:

☆۱　''پت جھڑ کی آواز''،قرۃ العین حیدر،مکتبۂ اُردو ادب، لاہور، سنہ ندارد،ص۱۸۹
☆۲　''پت جھڑ کی آواز''،محولۂ بالا،ص۱۹۸
☆۳　''پت جھڑ کی آواز''،محولۂ بالا،ص۱۹۸
☆۴　''پت جھڑ کی آواز''،محولۂ بالا،ص۹۹-۱۹۸
☆۵　''ترقی پسند افسانے میں عورت کا تصور''،خورشید زہرا عابدی، جے آر آفسیٹ پرنٹرز، ۱۹۸۷ء،ص۲۰۶
☆۶　''پت جھڑ کی آواز''،محولۂ بالا،ص۶۷-۶۶
☆۷　''پت جھڑ کی آواز''،محولۂ بالا،ص۶۸
☆۸　''پت جھڑ کی آواز''،محولۂ بالا،ص۸۰
☆۹　''یاد کی اِک دھنک جلے''،قرۃ العین حیدر، رفعت پبلشرز، لاہور، سنہ ندارد،ص۱۳۴
☆۱۰　''یاد کی اِک دھنک جلے''،محولۂ بالا،ص۱۳۴
☆۱۱　''یاد کی اِک دھنک جلے''،محولۂ بالا،ص۱۳۶
☆۱۲　''یاد کی اِک دھنک جلے''،محولۂ بالا،ص۱۳۶
☆۱۳　''یاد کی اِک دھنک جلے''،محولۂ بالا،ص۱۵۶
☆۱۴　''گلی کوچے''، انتظار حسین، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۷۸ء،ص۱۹۶
☆۱۵　''گلی کوچے''،محولۂ بالا،ص۱۸
☆۱۶　''گلی کوچے''،محولۂ بالا،ص۲۱
☆۱۷　''گلی کوچے''،محولۂ بالا،ص۲۶
☆۱۸　''اپنا گھر''،مسعود اشعر،مشمولہ: ماہ نامہ ''شب خون'' الہ آباد، جون ۲۰۰۳ء،ص۳
☆۱۹　''اپنا گھر''،محولۂ بالا،ص۱۷
☆۲۰　''اپنا گھر''،محولۂ بالا،ص۱۶
☆۲۱　''اپنا گھر''،محولۂ بالا،ص۵
☆۲۲　''اپنا گھر''،محولۂ بالا،ص۴

☆۲۳　''اپنا گھر''،محولۂ بالا،ص ۶

☆۲۴　''اپنا گھر''،محولۂ بالا،ص ۵

☆۲۵　''اپنا گھر''،محولۂ بالا،ص ۶

☆۲۶　''اپنا گھر''،محولۂ بالا،ص ۶

☆۲۷　''اپنا گھر''،محولۂ بالا،ص ۶

☆۲۸　''اپنا گھر''،محولۂ بالا،ص ۶

☆۲۹　''اپنا گھر''،محولۂ بالا،ص ۷-۶

☆۳۰　''اپنا گھر''،محولۂ بالا،ص ۵

☆۳۱　''اپنا گھر''،محولۂ بالا،ص ۱۵

☆۳۲　''اپنا گھر''،محولۂ بالا،ص ۱۶-۱۵

☆۳۳　''اپنا گھر''،محولۂ بالا،ص ۱۳

☆۳۴　''اپنا گھر''،محولۂ بالا،ص ۱۵-۱۴

☆۳۵　''اپنا گھر''،محولۂ بالا،ص ۱۷

☆۳۶　''اپنا گھر''،محولۂ بالا،ص ۱۷

☆۳۷　''اپنا گھر''،محولۂ بالا،ص ۱۷

☆۳۸　''اپنا گھر''،محولۂ بالا،ص ۱۷

☆۳۹　''اپنا گھر''،محولۂ بالا،ص ۷

☆۴۰　''اپنا گھر''،محولۂ بالا،ص ۷

☆۴۱　''ڈار سے بچھڑے''،سیّد محمد اشرف،مشمولہ:''نیا اُردو افسانہ''،مرتبہ: گوپی چند نارنگ،اُردو اکادمی،دہلی ۱۹۸۸ء،ص ۱۲۸

☆۴۲　''ڈار سے بچھڑے''،محولۂ بالا،ص ۱۲۹

☆۴۳　''ڈار سے بچھڑے''،محولۂ بالا،ص ۱۲۹

☆۴۴　''ڈار سے بچھڑے''،محولۂ بالا،ص ۱۲۹

☆۴۵　''ڈار سے بچھڑے''،محولۂ بالا،ص ۱۳۰

☆۴۶　''ڈار سے بچھڑے''،محولۂ بالا،ص ۱۴۷

☆۴۷　''ڈار سے بچھڑے''، محولہٗ بالا، ص ۱۴۷

☆۴۸　''ڈار سے بچھڑے''، محولہٗ بالا، ص ۱۳۴

☆۴۹　''ڈار سے بچھڑے''، محولہٗ بالا، ص ۱۴۱

☆۵۰　''ڈار سے بچھڑے''، محولہٗ بالا، ص ۱۴۲

☆۵۱　''بدن کا طواف''، امراؤ طارق، صبا پبلیکیشنز، کراچی، ۱۹۸۱ء، ص ۱۱۶

☆۵۲　''امراؤ طارق، شخصیت اور فن''، مہ ناز ضمیر، مکتبۂ جلیسانِ ادب، حیدرآباد، ۱۹۹۸ء، ص ۲۹

☆۵۳　''بدن کا طواف''، محولہٗ بالا، ص ۱۳۶

☆۵۴　''بدن کا طواف''، محولہٗ بالا، ص ۱۴۰

☆۵۵　''اُردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار''، نیلم فرزانہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۲ء، ص ۲۳۳

☆۵۶　''ہاؤسنگ سوسائٹی''، قرۃ العین حیدر، چوہدری اکیڈمی، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۷۸

☆۵۷　''ہاؤسنگ سوسائٹی''، محولہٗ بالا، ص ۳۹

☆۵۸　''ہاؤسنگ سوسائٹی''، محولہٗ بالا، ص ۸۲

☆۵۹　''ہاؤسنگ سوسائٹی''، محولہٗ بالا، ص ۸۸

☆۶۰　''ہاؤسنگ سوسائٹی''، محولہٗ بالا، ص ۹۸

☆۶۱　''ہاؤسنگ سوسائٹی''، محولہٗ بالا، ص ۱۲۶

☆۶۲　''ہاؤسنگ سوسائٹی''، محولہٗ بالا، ص ۸۵

☆۶۳　''ہاؤسنگ سوسائٹی''، محولہٗ بالا، ص ۷۵-۷۴

☆۶۴　''ہاؤسنگ سوسائٹی''، محولہٗ بالا، ص ۱۲۵

☆۶۵　''ہاؤسنگ سوسائٹی''، محولہٗ بالا، ص ۱۲۰

☆۶۶　''ہاؤسنگ سوسائٹی''، محولہٗ بالا، ص ۱۲۴

☆۶۷　''ہاؤسنگ سوسائٹی''، محولہٗ بالا، ص ۱۱۳

☆۶۸　''ہاؤسنگ سوسائٹی''، محولہٗ بالا، ص ۱۳۲

☆۶۹　''ہاؤسنگ سوسائٹی''، محولہٗ بالا، ص ۱۳۹

☆۷۰　''ہاؤسنگ سوسائٹی''، محولہٗ بالا، ص ۱۶۰

☆۷۱ ''ہاؤسنگ سوسائٹی''، محولہ بالا، ص۱۶۲

☆۷۲ ''ہاؤسنگ سوسائٹی''، محولہ بالا، ص۸۷-۱۷۴

☆۷۳ ''ہاؤسنگ سوسائٹی''، محولہ بالا، ص۸۷

☆۷۴ ''شہاب نامہ''، قدرت اللہ شہاب، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، طبع یازدہم۱۹۹۲ء، ص ۲۸ - ۳۲۷

☆۷۵ ''یا خدا''، قدرت اللہ شہاب، لاہور اکیڈمی، لاہور، طبعِ سیزدہم ۱۹۹۱ء، ص ۲۵

☆۷۶ ''یا خدا''، لاہور اکیڈمی، محولہ بالا، ص ۲۸

☆۷۷ ''یا خدا''، لاہور اکیڈمی، محولہ بالا، ص ۴۸

☆۷۸ ''یا خدا''، لاہور اکیڈمی، محولہ بالا، ص ۴۷

☆۷۹ ''یا خدا''، لاہور اکیڈمی، محولہ بالا، ص ۴۹

☆۸۰ ''یا خدا''، لاہور اکیڈمی، محولہ بالا، ص ۵۷

☆۸۱ ''یا خدا''، لاہور اکیڈمی، محولہ بالا، ص ۸۹

☆۸۲ ''یا خدا''، لاہور اکیڈمی، محولہ بالا، ص ۶۲ -۶۱

☆۸۳ ''یا خدا''، لاہور اکیڈمی، محولہ بالا، ص ۶۷-۶۶

☆۸۴ ''یا خدا''، لاہور اکیڈمی، محولہ بالا، ص ۶۷

☆۸۵ ''یا خدا''، لاہور اکیڈمی، محولہ بالا، ص ۶۸

☆۸۶ ''یا خدا''، لاہور اکیڈمی، محولہ بالا، ص ۵۸

☆۸۷ ''یا خدا''، لاہور اکیڈمی، محولہ بالا، ص ۸۳-۸۲

☆۸۸ ''یا خدا''، لاہور اکیڈمی، محولہ بالا، ص ۸۱

☆۸۹ ''یا خدا''، لاہور اکیڈمی، محولہ بالا، ص ۸۱

☆۹۰ ''یا خدا''، لاہور اکیڈمی، محولہ بالا، ص ۸۴

☆۹۱ ''یا خدا''، لاہور اکیڈمی، محولہ بالا، ص ۸۴

☆۹۲ ''یا خدا''، لاہور اکیڈمی، محولہ بالا، ص ۸۸

☆۹۳ ''یا خدا''، لاہور اکیڈمی، محولہ بالا، ص ۸۹

☆۹۴ ''یا خدا''، لاہور اکیڈمی، محولہ بالا، ص ۹۰

☆۹۵ ''معیار''، ممتاز شیریں، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص۱۷۳

☆۹۶ ''یا خدا''، لاہور اکیڈمی، محولہ بالا، ص۹۳

☆۹۷ ''زمین''، خدیجہ مستور، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص۶

☆۹۸ ''زمین''، محولہ بالا، ص۴۷

☆۹۹ ''زمین''، محولہ بالا، ص۴۸

☆۱۰۰ ''زمین''، محولہ بالا، ص۱۳۸

☆۱۰۱ ''اُردو ناول کے بدلتے تناظر''، ڈاکٹر ممتاز احمد خان، ویلکم بک پورٹ، کراچی، طبعِ اوّل جولائی ۱۹۹۳ء، ص۱۶۱

☆۱۰۲ ''زمین''، محولہ بالا، ص۸۰

☆۱۰۳ ''اُردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار''، محولہ بالا، ص۲۵۲

☆۱۰۴ ''زمین''، محولہ بالا، ص۳۸

☆۱۰۵ ''زمین''، محولہ بالا، ص۳۸

☆۱۰۶ ''زمین''، محولہ بالا، ص۴۹

☆۱۰۷ ''زمین''، محولہ بالا، ص۱۵۰

☆۱۰۸ ''زمین''، محولہ بالا، ص۱۰۰

☆۱۰۹ ''زمین''، محولہ بالا، ص۱۰۹

☆۱۱۰ ''زمین''، محولہ بالا، ص۱۸۲

☆۱۱۱ ''زمین''، محولہ بالا، ص۱۸۲

☆۱۱۲ ''زمین''، محولہ بالا، ص۸۳

☆۱۱۳ ''زمین''، محولہ بالا، ص۱۳۷

☆۱۱۴ ''زمین''، محولہ بالا، ص۸۵

☆۱۱۵ ''اُردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار''، محولہ بالا، ص۲۵۲

☆۱۱۶ ''اُردو ناول کے بدلتے تناظر''، محولہ بالا، ص۱۵۹

☆۱۱۷ ''زمین''، محولہ بالا، ص۱۳۱

☆۱۱۸ ''شوکت صدیقی، ایک مطالعہ''، ڈاکٹر حنیف فوق، مشمولہ: ماہ نامہ ''قومی زبان'' کراچی، اپریل ۱۹۹۸ء، ص۹۲

☆۱۱۹ ''خدا کی بستی''،شوکت صدیقی،مکتبۂ نیا راہی،کراچی ۱۹۵۹ء،ص ۱۶۷

☆۱۲۰ ''خدا کی بستی''،محولۂ بالا،ص ۱۷۷

☆۱۲۱ ''خدا کی بستی''،محولۂ بالا،ص ۵۰۹

☆۱۲۲ ''خدا کی بستی اور اُردو ناول نگاری''،ڈاکٹر حنیف فوق،مشمولہ:ماہ نامہ ''دائرے'' کراچی،
سال نامہ،فروری مارچ ۱۹۷۹ء،ص ۵۷

☆۱۲۳ ''خدا کی بستی''،محولۂ بالا،ص ۱۴۷

☆۱۲۴ ''خدا کی بستی''،محولۂ بالا،ص ۱۱۵

☆۱۲۵ ''خدا کی بستی''،محولۂ بالا،ص ۳۱۹

☆۱۲۶ ''خدا کی بستی''،محولۂ بالا،ص ۵۸۱

☆۱۲۷ ''خدا کی بستی اور اُردو ناول نگاری''،محولۂ بالا،ص ۶۲

☆۱۲۸ ''خدا کی بستی''،محولۂ بالا،ص ۱۳۳

☆۱۲۹ ''خدا کی بستی''،محولۂ بالا،ص ۱۳۳

☆۱۳۰ ''خدا کی بستی''،محولۂ بالا،ص ۱۲۲

☆۱۳۱ ''خدا کی بستی''،محولۂ بالا،ص ۱۲۲

☆۱۳۲ ''خدا کی بستی''،محولۂ بالا،ص ۱۲۲

☆۱۳۳ ''خدا کی بستی''،محولۂ بالا،ص ۴۹۰

☆۱۳۴ ''خدا کی بستی''،محولۂ بالا،ص ۴۹۳

☆۱۳۵ ''خدا کی بستی''،محولۂ بالا،ص ۵۴۵

☆۱۳۶ ''خدا کی بستی''،محولۂ بالا،ص ۵۹۱

☆۱۳۷ ''خدا کی بستی''،محولۂ بالا،ص ۶۲۱

☆۱۳۸ ''خدا کی بستی''،محولۂ بالا،ص ۶۲۷

☆۱۳۹ ''خدا کی بستی''،محولۂ بالا،ص ۴۴۹

☆۱۴۰ ''خدا کی بستی''،محولۂ بالا،ص ۵۱۰

☆۱۴۱ ''اُردو ناول کے بدلتے تناظر''،محولۂ بالا،ص ۱۲۰

☆۱۴۲ ''اُردو نثر کا فنی ارتقا''، مرتبہ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص ۷۷

☆۱۴۳ ''ناول نگاری''، سہیل بخاری، مکتبۂ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۳۴۸

☆۱۴۴ ''ناول نگاری''، محولہٗ بالا، ص ۳۴۸

☆۱۴۵ ''ناول نگاری''، محولہٗ بالا، ص ۳۴۸

☆۱۴۶ ''خدا کی بستی اور اُردو ناول نگاری''، محولہٗ بالا، ص ۶۲

☆۱۴۷ ''خدا کی بستی''، محولہٗ بالا، ص ۶۵۱

☆۱۴۸ ''بستی''، انتظار حسین، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، سنہ ندارد، ص ۹۰

☆۱۴۹ ''بستی''، محولہٗ بالا، ص ۹۰

☆۱۵۰ ''بستی''، محولہٗ بالا، ص ۲۴۶

☆۱۵۱ ''بستی''، محولہٗ بالا، ص ۹۲

☆۱۵۲ ''بستی''، محولہٗ بالا، ص ۹۵

☆۱۵۳ ''بستی''، محولہٗ بالا، ص ۱۰۰

☆۱۵۴ ''اُردو ناول پر تقسیمِ ہند کے المیے کے اثرات''، ڈاکٹر محمد نسیم، اُجالا آفسیٹ، پٹنہ، ۲۰۰۲ء، ص ۷۸

☆۱۵۵ ''بستی''، محولہٗ بالا، ص ۲۴۹

☆۱۵۶ ''بستی''، محولہٗ بالا، ص ۲۴۴

☆۱۵۷ ''بستی''، محولہٗ بالا، ص ۱۲۸

☆۱۵۸ ''بستی''، محولہٗ بالا، ص ۲۰۱

❁ ❁ ❁

محاکمہ

محاکمہ

برِصغیر میں انیسویں صدی کے اواخر میں جب کانگریس کا قیام عمل میں آیا تو اس کی حیثیت ایک نیم سماجی جماعت کی سی تھی۔ دھیرے دھیرے اس نے سیاسی مطالبات شروع کیے اور ہوم رول کی شکل میں برِصغیر کے سیاسی ڈھانچے میں مقامی عنصر کو شامل کرنا تھا۔

ابتدا ہی سے ہندوستان میں ہندوؤں کی غیر معمولی اکثریت کی بنا پر کانگریس کے مطالبات چاہے وہ سماجی ہوں یا سیاسی ان میں مسلمانوں کے منفرد حقوق کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ اس صورتِ حال سے مسلمانوں کو جو پہلے ہی پس ماندہ اور انگریزوں کے غضب و انتقام کا شکار تھے ایک طرح کی مایوسی پیدا ہوئی۔

اس مایوسی کا فائدہ انگریزوں نے اٹھایا اور اس وقت کے وائسرائے نے مسلمانوں کے ایک وفد سے ملاقات کر کے ان کو اپنے مطالبات پیش کرنے کے لیے اکسایا اور یوں ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔

ایک عرصے تک کانگریس اور مسلم لیگ میں مفاہمت کی ایک فضا رہی اور کانگریس کے ارکان مسلم لیگ کے بھی رکن ہوتے تھے اور یہ بھی ہوتا تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس ایک ہی شہر میں ایک ہی وقت میں منعقد ہوتے۔

دراصل ۱۹۰۵ء میں تقسیمِ بنگال اور اس کے سلسلے میں ہندوؤں کے رویّے نے مسلمانوں کو دہشت زدہ کر دیا تھا اور وہ یہ سمجھنے لگے تھے کہ ہندوستان آزاد ہوگا تو اس کی قیادت عظیم ہندو اکثریت کے ہاتھوں میں آجائے گی اور ان کی مذہبی، سماجی اور سیاسی امور پر ہندو اکثریت چھا جائے گی۔ اس لیے وقتاً فوقتاً مسلمانوں کی طرف سے ایسے مطالبات ہوتے رہے جو اُن کی ملی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھے۔ ہوا یہ کہ ہندوؤں نے اپنی عظیم اکثریت کے زعم اور اپنی روایتی تنگ نظر کے سبب مسلمانوں کے بعض جائز اور برحق مطالبات کی بھی شدّت سے مخالفت کی اور اس مخالفت کے باعث ہندو اور مسلمانوں میں ایک مغائرت اور دوری پیدا ہوگئی آہستہ آہستہ بڑھتی گئی۔

تحریکِ خلافت کے دنوں میں مسلمان بہت پر جوش انداز میں خلافت عثمانیہ کی حمایت کر رہے تھے۔ ہندو لیڈر شپ

نے دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کی اس لاحاصل تحریک کی حمایت کی۔تحریکِ خلافت کے دنوں میں جو ہندو مسلم ہم آہنگی پیدا ہوئی۔اس کو برقرار رکھنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہ ہوسکی نتیجہ یہ ہوا کہ تحریکِ خلافت کی ناکامی کے بعد مسلمان گہرے صدمے سے دوچار ہوئے اور ان کی سیاست کا رخ اپنے ملّی تحفظات کے لیے شدید تر ہوتا گیا۔ جب کہ ہندوؤں نے آزادی کی منزل کو قریب پاتے ہوئے مسلمانوں کو نظرانداز کرنے کی پالیسی اختیار کیے رکھی۔نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں قوموں کی سیاسی سرگرمیاں متوازی طور پر جاری رہیں،اور یہ سفر ایسے متوازی خطوط پر جاری رہا جو کبھی نہیں ملتے۔

مسلمانوں نے جب یہ یقین کرلیا کہ ہندو اپنی اکثریت کے زعم میں انھیں ان کے دینی،سماجی اور سیاسی حقوق سے یکسر روگردانی کرر ہے ہیں تو انھوں نے ایک علاحدہ وطن کا مطالبہ شروع کردیا۔۱۹۴۰ سے ۱۹۴۷ء تک دورع برِصغیر کی سیاست میں علیحدگی پسندی،ہندو مسلم دشمنی اور فرقہ وارانہ تنگ نظری کو فروغ میں بہت اہم دور رہا۔

دنیا میں متعدد ملک تقسیم ہوئے ہیں لیکن ہندوستان کی تقسیم جیسا واقعہ دنیا میں کبھی رونما نہیں ہوا۔تقسیم کے نتیجے میں جان،مال اور عزت دآبرو کا جس بڑے پیمانے پر زیاں ہوا ایسا صرف جنگوں میں ممکن ہے مرنے اور لاپتا ہونے والے مرد اور بے آبرو کی جانے والی عورتوں کی تعداد لاکھوں میں پہنچتی ہے۔جائیدادیں برباد ہوئیں اور املاک نذرِ آتش کی گئیں کروڑوں افراد نے ترکِ وطن کر کے اجنبی معاشرے میں وطن اختیار کیا۔آزادی کے باوجود افسردگی،دل شکستگی،رنج و غم،پریشانی اور بدحالی نے دونوں طرف کے مہاجروں کو آلیا،اور غم و اندوہ سے بھرا ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جو سسکیوں اور آہوں سے مملو تھا۔

اس ماحول میں جب انسان جانوروں سے بدتر ہوگیا تھا اُردو کے ادیبوں،شاعروں اور دانشوروں نے مساوات اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل پر اظہارِ خیال کیا۔شاعری ہمارے موضوع سے متعلق نہیں۔اُردو کے افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں نے تقسیم کے دوران ہونے والی انسانیت سوز حرکتوں پر اپنے اپنے انداز میں اظہارِ خیال کیا اور تخلیقی سطح پر پہنچ کر ایسے افسانے اور ناول لکھے جو نہ صرف اُردو ادب میں اہمیت کے حامل ہیں،بلکہ بین الاقوامی سرمایۂ ادب میں بھی ان کا وزن محسوس کیا جاتا ہے۔

جن افسانہ نگاروں نے فسادات اور ہجرت کے مسائل پر توجہ دی ان میں سب سے اہم نام سعادت حسن منٹو، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کا ہے۔اس کے علاوہ کرشن چندر،مہندر ناتھ،بلونت سنگھ،احمد ندیم قاسمی،خواجہ احمد عباس، رام لعل،عصمت چغتائی،راجندر سنگھ بیدی،حیات اللّٰہ انصاری،اشفاق احمد،رامانند ساگر نے بھی فسادات کے موضوع پر متعدد افسانے لکھے۔

ان افسانہ نگاروں نے فسادات کے مختلف مسائل بالخصوص قتل و غارت گری،خواتین کی بے حرمتی وغیرہ کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔کرشن چندر کے افسانوں کا مجموعہ ''ہم وحشی ہیں'' میں افسانہ ''ایک طوائف کا خط'' کے سوا تمام افسانے قتل

وغارت گری اور ہندو مسلم تعصب کی نشان دہی کرتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو کے افسانچوں کا مجموعہ ''سیاہ حاشیے'' کے بیش تر افسانچے بھی فرقہ وارانہ فساد کے موضوع پر لکھے گئے ہیں۔

خواتین کے اغوا اور بے حرمتی کے موضوع پر سعادت حسن منٹو نے سب سے زیادہ افسانے لکھے ان افسانوں میں ''شریفن''، ''کھول دو''، ''عزت کے لیے''، ''ڈارلنگ''، ''بسم اللہ'' اور ''۱۹۱۹ کی ایک بات'' میں مغویہ اور بے آبرو ہونے والی خواتین کے کرب کو بیان کیا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کا مشہور افسانہ ''لاجونتی'' ایک بازیافتہ سکھ عورت کے کرب اور نفسیاتی کیفیات کے بارے میں ہے بلونت سنگھ کا افسانہ ''پہلا پتھر'' میں پاکستان سے ہندوستان آنے والی سکھ خواتین کے ساتھ ہندوستان کے مقامی سکھوں کے ظلم اور زیادتیوں کو پیش کیا ہے۔ رامانند ساگر کے افسانے ''اور انسان مر گیا'' اور مہندر ناتھ کے افسانے ''پاکستان سے ہندوستان تک'' میں ان بازیافتہ ہندو خواتین کی داستان بیان کی گئی ہے جنھیں ان کے گھر والوں نے ان کی بے بسی اور مجبوریوں کو سمجھنے کے باوجود انھیں گناہ گار اور قابلِ نفرت سمجھا اور انھیں دل سے کبھی قبول نہ کیا۔ حیات اللہ انصاری نے اپنے افسانے ''شکر گزار آنکھیں'' میں ایک ایسی عورت کی کہانی قلم بند کی ہے جس نے اپنی عزت و آبرو بچانے کے لیے اپنی زندگی قربان کر دی۔

نفرت اور تعصب کی فضا میں بعض ایسے ہندو، سکھ اور مسلمان بھی موجود تھے جنھوں نے صرف انسان بن کر سوچا اور ایک دوسرے کی جان، مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی۔ اس حقیقت کو بھی مدِ نظر رکھتے ہوئے ہمارے افسانہ نگاروں نے افسانے لکھے جن میں احمد ندیم قاسمی کا افسانہ ''پرمیشر سنگھ''، عصمت چغتائی کا ''جڑیں''، بلونت سنگھ کا ''کالے کوس'' اور ''تعمیر'' کرشن چندر کا ''ایک طوائف کا خط'' اور اس موضوع پر منٹو نے افسانے ''سہائے''، ''رام کھلاون'' اور ''آخری سلیوٹ'' لکھے۔

قیامِ پاکستان کے بعد ملک کے حالات ایسے نہ رہے کہ مہاجرین آزادی کی خوشی منا سکتے۔ خاندان، گھر بار اور جائیداد وغیرہ کھونے کے بعد ان کے پاس سوائے یادوں کے کچھ اور نہ رہا۔ اس موضوع پر قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین نے کئی افسانے لکھے جن میں قرۃ العین حیدر کے افسانے ''پت جڑ کی آواز'' اور ''جلاوطن'' کو شہرت حاصل ہوئی جب کہ انتظار حسین کے افسانے ''اُستاذ'' اور ''قیوما'' قابلِ ذکر ہیں۔ وطن پرستی اور ماضی پرستی کے حوالے سے سعادت حسن منٹو کا افسانہ ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اپنے موضوع، کردار اور اسلوب کے لحاظ سے بہت منفرد اور تکلیف دہ افسانہ ہے۔

آزاد ملک میں مہاجرین کو صرف یادوں نے ہی پریشان نہ کیا، بلکہ انھیں رہائش، روزگار اور دوسرے کئی مسائل کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ شوکت صدیقی نے اس موضوع پر افسانے ''اندھیرا اور اندھیرا'' اور ''ہفتے کی شام'' لکھے۔ جس میں انھوں نے مہاجرین کے معاشی مسائل اور ان کی وجہ سے پیدا ہونے نفسیاتی الجھنوں کو بیان کیا ہے، یہی صورت قرۃ العین حیدر نے ''حسب نسب'' میں دکھائی ہے۔ جس میں افسانے کی کردار چھمی بیگم تقسیمِ ہند کے بعد بالکل نئے حالات کا سامنا کرنا پڑا اور کئی

نوکر اور نوکرانیوں پر حکم چلانے والی چھمی بیگم کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے دوسروں کی نوکر بننا پڑا۔

سیّد محمد اشرف ''ڈار سے بچھڑے'' میں ۱۹۷۱ء کے بعد ایک طرف مہاجرین کی ہندوستان کو دیکھنے کی تڑپ کا ذکر کیا ہے، اور دوسری طرف کچھ لوگوں کی معاشی مجبوریوں اور کچھ کی کاروباری مصروفیات کو بیان کیا ہے اس کے ساتھ ہی افسانے میں ان لوگوں کی بے بسی کو بھی پیش کیا گیا ہے جو لوگ سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے اپنے آبائی ملک جانے سے قاصر ہیں۔ احمد اشعر کا افسانہ ''اپنا گھر'' میں موجودہ دور میں مہاجرین کی دلی کیفیات، ہندوستان جا کر پھر سے پرانی یادوں کو تازہ کرنے اور بچھڑے ہوئے عزیزوں اور دوستوں کو ملنے کی خواہش کا ذکر کیا گیا ہے۔ افسانہ میں دوسری اہم چیز ان غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کو بیان کرنا ہے جو ستاون سال گزرنے کے بعد بھی ختم ہونے کے بجائے بڑھتی جارہی ہے۔

افسانہ نگاروں کے علاوہ ناول نگاروں نے بھی فسادات، ہجرت کے دوران پیش آنے والے مختلف حادثات اور قیامِ پاکستان کے بعد مہاجرین کے جذباتی، نفسیاتی، سماجی اور معاشی مسائل کو اپنے ناولوں میں پیش کیا۔

ان ناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، عبداللہ حسین، کرشن چندر، بلونت سنگھ، رامانند ساگر، عصمت چغتائی، قدرت اللہ شہاب اور انتظار حسین وغیرہ شامل ہیں۔

قتل و غارت گری کے موضوع پر کرشن چندر نے ناولٹ ''غدّار'' لکھا جس میں انھوں نے فسادات کے دوران مسلمانوں اور ہندوؤں کے مختلف رویّوں کو دکھایا ہے اور اپنے مخصوص انداز میں بعض جگہ مسلمانوں کو اور بعض جگہ ہندوؤں کو ظالم دکھا کر غیر جانب دار بننے کی کوشش کی ہے۔ اسی موضوع کو رامانند ساگر نے اپنے ناول ''اور انسان مر گیا'' میں پیش کیا ہے۔ رامانند ساگر نے بھی ناول میں خود کو غیر جانب دار ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ اس میں ناکام ہو گئے ہیں بلونت سنگھ کا ناولٹ ''کالے کوس'' ان سکھوں کی نمائندگی کرتا ہے جنھوں نے فسادات اور ہجرت کے دوران مسلمانوں کو تحفظ دیا اور بحفاظت پاکستان کی سرحد تک پہنچایا۔

عبداللہ حسین نے ناول ''اداس نسلیں'' میں پہلی جنگِ عظیم سے لے کر قیامِ پاکستان کے ابتدائی دنوں کے حالات اور واقعات کو بیان کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے تحریکِ پاکستان، تقسیمِ ہند، ہندو مسلم فسادات، ہجرت اور قیامِ پاکستان کے بعد کے حالات پر خاص توجہ دی ہے۔

خدیجہ مستور کا ناول ''آنگن'' تقسیم سے قبل مسلم لیگ اور کانگریس کے مختلف اختلافات اور عام افراد کی گھریلو زندگیوں میں ان کے اثرات کی نشان دہی کرتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' اور ''میرے بھی صنم خانے'' میں تقسیمِ ہند کے بعد نوجوان نسل کے ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کے بکھرنے کے دکھ کو پیش کیا ہے۔ ناول کے کرداروں کے لیے ان کا شاندار ماضی اور بچھڑے ہوئے دوستوں

کی یادیں ان کا سب سے بڑا سرمایہ ہے انتظار حسین کا ناول ''بستی'' بھی ماضی پرستی کے موضوع پر لکھا گیا ہے انھوں نے تقسیمِ ہند کے بعد ایک بکھرے ہوئے خاندان کی داستانِ غم بیان کی ہے۔

قدرت اللّٰہ شہاب کے ناولٹ ''یا خدا''، قرۃ العین حیدر کے ناولٹ ''ہاؤسنگ سوسائٹی''، اور خدیجہ مستور کے ناول ''زمین'' میں قیامِ پاکستان کے بعد مقامی لوگوں اور غلط کلیم داخل کروا کر یا دوسروں کی جائیداد پر قبضہ کر کے امیر طبقے میں شامل ہونے والے مہاجرین کی عیاشیوں اور دوسرے مہاجرین خاص طور پر بے بس اور تنہا خواتین کو ہوس کا نشانہ افسانے کا ذکر کیا گیا ہے۔شوکت صدیقی کا شاہ کار ناول ''خدا کی بستی'' اپنے موضوع اور انداز بیان کی وجہ سے دوسروں ممالک میں بھی شہرت حاصل کر چکا ہے۔اس ناول میں شوکت صدیقی نے قیامِ پاکستان کے بعد کے حالات لکھے ہیں۔مقامی لوگوں کی مہاجرین کے ساتھ ہر قسم کی زیادتیوں کو بیان کیا ہے۔اس کے ساتھ ہی پاکستانی معاشرے کی تمام برائیوں کی بھی نشان دہی کی ہے۔خاص طور پر ہمارے معاشرے کے طبقاتی نظام، امیر اور غریب کا فرق، اعلیٰ افسر سے لے کر معمولی کلرک بننے تک اثر ورسوخ اور رشوت خوری کے لین دین کا ذکر کیا گیا ہے۔

برِصغیر کی تاریخ کے اس وحشیانہ اور پرآشوب دور میں اُردو کے ادیبوں افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں نے انسانیت کی رسوائی کے اس کاروبار کو جس شدّت سے محسوس کیا اور جس قوت اور فن کارانہ انداز میں اس پر تنقید کی اور انسانیت کی شمع کو فروزاں رکھنے کے لیے ضمیر آدمیت کو جس طرح جھنجھوڑا وہ اُردو زبان وادب کا سرمایہ افتخار ہے۔اس عہد میں اور ان موضوعات پر جتنا وافر افسانوی ادب تخلیق ہوا وہ محض تعداد ہی میں نہیں، بلکہ معیار کے اعتبار سے بھی انتہائی بلند وارفع ہے اور اُردو زبان اس پر بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔

کتابیات

کتابیات

کتب:

☆۱ ''آزادی اور عوام''، احمد سلیم، نگارشات، لاہور

☆۲ ''آزادی کے بعد اُردو ناول''، ڈاکٹر ممتاز احمد خان، انجمنِ ترقیٔ اُردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۷ء

☆۳ ''آگ کا دریا''، قرۃ العین حیدر، مکتبۂ اُردو ادب، لاہور، سنہ ندارد

☆۴ ''آنگن''، خدیجہ مستور، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، سنہ ندارد

☆۵ ''اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب''، ڈاکٹر یونس حسنی، انجمنِ ترقیٔ اُردو پاکستان، کراچی، طبعِ اوّل ۱۹۷۶ء

☆۶ ''اُداس نسلیں''، عبداللہ حسین، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء

☆۷ ''ادیان و مذاہب کا تقابلی مطالعہ''، ڈاکٹر عبدالرّشید، طاہر سنز، کراچی، طبعِ اوّل ۱۹۸۶ء

☆۸ ''اُردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار''، نیلم فرزانہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۲ء

☆۹ ''اُردو ادب کی تحریکیں''، انور سدید، انجمنِ ترقیٔ اُردو پاکستان، کراچی

☆۱۰ ''اُردو ادب میں رومانوی تحریک''، ڈاکٹر محمد حسن، کاروانِ ادب، ملتان، ۱۹۸۶ء

☆۱۱ ''اُردو افسانہ تحقیق و تنقید''، انوار احمد، بیکن بکس، ملتان، طبعِ اوّل ۱۹۸۸ء

☆۱۲ ''اُردو مختصر افسانہ فنی و تکنیکی مطالعہ (۱۹۴۷ء کے بعد)''، ڈاکٹر نگہت ریحانہ، بک وائز، لاہور، بارِ اوّل ۱۹۸۸ء

☆۱۳ ''اُردو ناول آزادی کے بعد''، ڈاکٹر اسلم آزاد، سیمانت پرکاش، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء

☆۱۴ ''اُردو ناول اور تقسیمِ ہند''، عقیل احمد، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، طبعِ اوّل ۱۹۸۷ء

☆۱۵ ''اُردو ناول پر تقسیمِ ہند کے المیے کے اثرات''، ڈاکٹر محمد نسیم، اُجالا آفسیٹ، پٹنہ، ۲۰۰۲ء

☆۱۶ ''اُردو ناول بیسویں صدی میں''، ڈاکٹر عبدالسّلام، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، اکتوبر ۱۹۷۳ء

☆۱۷ ''اُردو ناول پر تقسیمِ ہند کے المیے کے اثرات''، ڈاکٹر محمد نسیم، اُجالا آفسیٹ، پٹنہ، ۲۰۰۲ء

☆۱۸　''اُردو ناول کے بدلتے تناظر''، ڈاکٹر ممتاز احمد خان، ویلکم بک پورٹ، کراچی، طبعِ اوّل جولائی ۱۹۹۳ء

☆۱۹　''اُردو ناول کی تنقیدی تاریخ''، سہیل بخاری، مکتبہ میری لائبریری، بارِ اوّل ۱۹۶۶ء

☆۲۰　''اُردو ناول میں طنز و مزاح''، شمع افروز زیدی، پروگریسو بکس، لاہور، ۱۹۸۸ء

☆۲۱　''اُردو نثر کا فنّی ارتقا''، مرتبہ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۹ء

☆۲۲　''اصولِ انتقادِ ادبیات''، پروفیسر عابد علی عابد، مجلسِ ترقّیٔ ادب، لاہور، طبعِ دوم مئی ۱۹۶۶ء

☆۲۳　''اصولِ تنقید''، محمد احسان الحق، علمی کتاب خانہ، لاہور، سنہ ندارد

☆۲۴　''امراؤ طارق، شخصیت اور فن''، مہ ناز ضمیر، مکتبہ جلیسانِ ادب، حیدر آباد، ۱۹۹۸ء

☆۲۵　''اندھیرا اور اندھیرا''، شوکت صدّیقی، رکتاب پبلشرز، کراچی، ۱۹۸۷ء

☆۲۶　''انقلاب ۱۸۵۷ء''، مرتبہ: پی سی جوشی، ترقّیٔ اُردو بیورو، نئی دہلی، دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۳ء

☆۲۷　''اور انسان مر گیا''، رامانند ساگر، مکتبہ شعر و ادب، لاہور، سنہ ندارد

☆۲۸　''بدن کا طواف''، امراؤ طارق، صبا پبلیکیشنز، کراچی، ۱۹۸۱ء

☆۲۹　''برقعے''، سعادت حسن منٹو، ظفر برادرز، لاہور، ۱۹۵۵ء

☆۳۰　''بستی''، انتظار حسین، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، سنہ ندارد

☆۳۱　''بہادر شاہ ظفر''، اسلم پرویز، انجمنِ ترقّی اُردو ہند، نئی دہلی

☆۳۲　''بیدی نامہ''، شمس الحق عثمانی، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی

☆۳۳　''پاکستان سے ہندوستان تک''، مہندر ناتھ، مکتبہ سلطانی، بمبئی، طبعِ اوّل مئی ۱۹۴۹ء

☆۳۴　''پاکستان کی قیمت''، منشی عبدالرحمان، جاوید اکیڈمی، ملتان، طبعِ اوّل جون ۱۹۸۳ء

☆۳۵　''پاکستان منزل بہ منزل''، شریف الدین پیرزادہ، گلڈ اشاعت گھر، کراچی، ۱۹۶۵ء

☆۳۶　''پاکستان منزل بہ منزل''، محمد علی چراغ، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء

☆۳۷　''پاکستان ناگزیر تھا''، سیّد حسن ریاض، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، اشاعتِ ششم، ۱۹۹۲ء

☆۳۸　''پت جھڑ کی آواز''، قرۃ العین حیدر، مکتبہ اُردو ادب، لاہور، سنہ ندارد

☆۳۹　''پہلا پتھر''، بلونت سنگھ، مکتبہ جدید، لاہور، طبعِ اوّل دسمبر ۱۹۵۹ء

☆۴۰　''پھندنے''، سعادت حسن منٹو، مکتبہ شعر و ادب، لاہور، دسمبر ۱۹۷۵ء

☆۴۱　''تاریخِ ادبِ ہندی''، ڈاکٹر وقار احمد رضوی، آگہی پبلی کیشنز، کراچی ۱۹۹۳ء

☆۴۲ ''تاریخِ پاکستان''، محمد علی چراغ، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، جولائی ۲۰۰۱ء

☆۴۳ ''تاریخِ پاکستان''، زاہد حسین انجم، نیو بک پیلس، لاہور

☆۴۴ ''تاریخ مذاہب''، رشید احمد، قلات پبلشرز، کوئٹہ، تیسرا ایڈیشن ۱۹۷۹ء

☆۴۵ ''تاریخِ مسلمانانِ پاکستان و بھارت'' (جلد اوّل)، سیّد ہاشمی فرید آبادی، انجمنِ ترقیِ اُردو پاکستان، کراچی، مئی ۱۹۸۷ء

☆۴۶ ''تحریکِ آزادی میں اُردو کا حصّہ''، ڈاکٹر معین الدین عقیل، انجمنِ ترقی اُردو پاکستان، کراچی، ۱۹۷۶ء

☆۴۷ ''ترقی پسند ادب''، علی سردار جعفری، انجمنِ ترقی اُردو ہند، علی گڑھ، طبع دوم ۱۹۵۷ء

☆۴۸ ''ترقی پسند ادب (پچاس سالہ سفر)''، مرتبہ: قمر رئیس، عاشور کاظمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، طبعِ دوم ۱۹۸۹ء

☆۴۹ ''ترقی پسند افسانے میں عورت کا تصور''، خورشید زہرا عابدی، جے آر آفسیٹ پرنٹرز، ۱۹۸۷ء

☆۵۰ ''ترقی پسند تحریک اور اُردو افسانہ''، ڈاکٹر محمد صادق، نعمانی پریس، دہلی، ۱۹۸۱ء

☆۵۱ ''تعارفِ مذاہبِ عالم''، ایس ایم شاہد، نیو بک پیلس، لاہور

☆۵۲ ''تمدّنِ ہند پر اسلامی اثرات''، ڈاکٹر تاراچند، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۴ء

☆۵۳ ''جب امرت سر جل رہا تھا''، خواجہ افتخار، خواجہ پبلشرز، لاہور، طبعِ چہارم اگست ۱۹۸۳ء

☆۵۴ ''جدّ وجہدِ پاکستان''، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ترجمہ: ہلال زبیری، شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۹۰ء

☆۵۵ ''جہاتِ جہدِ آزادی''، ڈاکٹر معین الدین عقیل، الوقار پبلیکیشنز، لاہور، مارچ ۱۹۹۸ء

☆۵۶ ''چغد''، سعادت حسن منٹو، مکتبۂ شعر و ادب، لاہور، سنہ ندارد

☆۵۷ 'حلقۂ اربابِ ذوق''، ڈاکٹر یونس جاوید، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، ۱۹۸۴ء

☆۵۸ ''حیاتِ قائدِ اعظم''، چودھری محمد خان عزیز، مقبول اکیڈمی، لاہور

☆۵۹ ''خالی بوتلیں، خالی ڈبّے''، سعادت حسن منٹو، مکتبۂ شعر و ادب، لاہور، سنہ ندارد

☆۶۰ ''خدا کی بستی''، شوکت صدیقی، مکتبۂ نیا راہی، کراچی ۱۹۵۹ء

☆۶۱ ''خواجہ احمد عبّاس کے شاہکار افسانے''، مرتبہ: شفیق الرحمٰن، ادبی ستون، لاہور، ۱۹۹۱ء

☆۶۲ ''خواجہ احمد عبّاس کے منتخب افسانے''، مرتبہ رام لعل، سیمانت پرکاشن، نئی دہلی، بارِ اوّل ۱۹۸۸ء

☆۶۳ ''داستان سے افسانے تک''، سیّد وقار عظیم، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۹۰ء

☆۶۴ ''راتوں کا شہر''، شوکت صدّیقی، رکتاب پبلیکیشنز، کراچی، طبعِ سوم مارچ ۱۹۸۹ء

☆۶۵ ''رام لعل شخصیت اور فن''، نریندر ناتھ سوز، سیمانت پرکاشن، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء

☆۶۶ ''رام لعل کی افسانہ نگاری''، ظہیر آفاق، شانِ ہند پبلیکیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء

☆۶۷ ''رام لعل کے شاہ کار افسانے''، مرتبہ: رضا جعفری، بک چینل، لاہور، ۱۹۹۱ء

☆۶۸ ''رام لعل کے منتخب افسانے''، رام لعل، سیمانت پرکاشن، نئی دہلی، ۱۹۹۳ء

☆۶۹ ''رودِکوثر''، شیخ محمد اکرام، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، چھٹی بار ۱۹۷۵ء

☆۷۰ ''روشنائی''، سجاد ظہیر، مکتبۂ دانیال، کراچی، ۱۹۸۶ء

☆۷۱ ''زمین''، خدیجہ مستور، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء

☆۷۲ ''زوالِ حیدر آباد کی اَن کہی داستان''، مشتاق احمد خان، آفتاب عالم پریس، لاہور، طبعِ اوّل جون ۱۹۸۶ء

☆۷۳ ''سعادت حسن منٹو''، انیس ناگی، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۸۹ء

☆۷۴ ''سقوطِ حیدر آباد''، ڈاکٹر معین الدین عقیل و ڈاکٹر عمر خالدی، بہادر یار جنگ اکادمی، کراچی، طبعِ اوّل ستمبر ۱۹۹۸ء

☆۷۵ ''سیاہ حاشیے''، سعادت حسن منٹو، مکتبۂ شعر و ادب، لاہور، سنہ ندارد

☆۷۶ ''شہاب نامہ''، قدرت اللّٰہ شہاب، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، طبعِ یازدہم ۱۹۹۲ء

☆۷۷ ''شعبرِ نگاراں''، سبطِ حسن، مکتبۂ دانیال، کراچی

☆۷۸ ''ظلمتِ نیم روز''، ممتاز شیریں، مرتبہ: آصف فرخی، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۰ء

☆۷۹ ''ظہورِ پاکستان''، چودھری محمد علی، مکتبۂ کارواں، لاہور، ۱۹۸۵ء

☆۸۰ ''عصمت چغتائی شخصیت اور فن''، ایم سلطانہ بخش، ورڈوِژن پبلشرز، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء

☆۸۱ ''غدّار''، کرشن چندر، نیا ادارہ، لاہور، بار دوم ۱۹۷۹ء، ص ۱۳۴

☆۸۲ 'فاطمہ جناح، حیات و خدمات''، آغا حسین ہمدانی، قومی کمیشن برائے تحقیقِ تاریخ و ثقافت، اسلام آباد، طبعِ اوّل ۱۹۷۸ء

☆۸۳ ''قائدِ اعظم اور اُن کا عہد''، رئیس احمد جعفری، مقبول اکیڈمی، لاہور، سنہ ندارد

☆۸۴ ''قرۃ العین حیدر، ایک مطالعہ''، مرتبہ: ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۲ء

☆۸۵ ''قرۃ العین حیدر کا فن''، عبد المغنی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء

☆۸۶ ''قمر زمانی بیگم''، مرتبہ: فرمان فتح پوری، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، بار دوم ۱۹۷۹ء

☆۸۷ ''کالے کوس''، بلونت سنگھ، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۶۸ء

☆۸۸ ''کچھ نئے اور پرانے افسانہ نگار''، ڈاکٹر اے بی اشرف، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء

☆۸۹ ''کرشن چندر، شخصیت اور فن''، جگدیش چندر ودھاون، شرکت پرنٹنگ پریس، طبعِ اوّل ۱۹۹۳ء، ص ۴۴۰

☆۹۰ ''کُلّیاتِ عصمت چغتائی''، تحقیق وترتیب: آصف نواز، مکتبۂ شعروادب، لاہور، سنہ ندارد

☆۹۱ ''کمپنی کی حکومت''، باری، نیاادارہ، لاہور، ۱۹۶۹ء

☆۹۲ ''گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ''، ترجمہ: عشرت علی صدیقی، اُردو اکیڈمی اتر پردیش

☆۹۳ ''گلی کوچے''، انتظار حسین، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۷۸ء

☆۹۴ ''لاجونتی''، راجندر سنگھ بیدی، نیاادارہ، لاہور، طبعِ دوم ۱۹۸۶ء

☆۹۵ ''مادرِ ملّت کا جمہوری سفر''، از ہر منیر، فرنٹیر پوسٹ پبلیکیشنز، اشاعتِ اوّل، ۱۹۹۳ء

☆۹۶ ''مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ''، چودھری غلام رسول، علمی کتاب خانہ، لاہور، ۱۹۹۴ء

☆۹۷ ''مسلم ثقافت ہندوستان میں''، عبدالمجید سالک، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، طبعِ سوم ۱۹۸۲ء

☆۹۸ ''معیار''، ممتاز شیریں، نیاادارہ، لاہور، ۱۹۶۳ء

☆۹۹ ''منٹو کے بہترین افسانے''، مرتبہ: اطہر پرویز، چودھری اکیڈمی، لاہور، سنہ ندارد

☆۱۰۰ ''منٹونامہ''، جگدیش چندرودھاون، ناشر جگدیش چندرودھاون، دہلی، ۱۹۸۹ء

☆۱۰۱ ''منٹو نوری نہ ناری''، ممتاز شیریں، مرتبہ: آصف فرخی، مکتبۂ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۵ء

☆۱۰۲ ''میرے بھی صنم خانے''، قرۃ العین حیدر، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء

☆۱۰۳ ''ناول نگاری''، سہیل بخاری، مکتبۂ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۶۶ء

☆۱۰۴ ''نمرود کی خدائی''، سعادت حسن منٹو، نیاادارہ، لاہور، طبعِ اوّل

☆۱۰۵ ''نیا اُردو افسانہ''، مرتبہ: گوپی چند نارنگ، اُردو اکادمی، دہلی ۱۹۸۸ء

☆۱۰۶ ''ہاؤسنگ سوسائٹی''، قرۃ العین حیدر، چوہدری اکیڈمی، لاہور، ۱۹۷۷ء

☆۱۰۷ ''ہم وحشی ہیں''، کرشن چندر، کتب پبلشرز، بمبئی، طبعِ دوم اپریل ۱۹۴۸ء

☆۱۰۸ ''ہندوصنمیات''، مہر عبدالحق، بیکن بکس، ملتان، بارِاوّل ۱۹۹۳ء

☆۱۰۹ ''ہندومسلم فسادات اور اُردو افسانہ''، شیخ محمد غیاث الدین، نگارشات، لاہور، ۱۹۹۹ء

☆۱۱۰ ''یاخدا''، قدرت اللہ شہاب، لاہور اکیڈمی، لاہور، طبعِ سیز دہم ۱۹۹۱ء

☆۱۱۱ ''یاد کی اِک دھنک جلے''، قرۃ العین حیدر، رفعت پبلشرز، لاہور، سنہ ندارد

☆۱۱۲ ''یزید''، سعادت حسن منٹو، مکتبۂ شعروادب، لاہور، ۱۹۹۱ء

☆۱۱۳ ''یہاں سے وہاں تک''، عصمت چغتائی، جواد برادر، لاہور، طبعِ اوّل، سنہ ندارد

رسائل:

☆۱۱۴ ''آجکل''، دہلی، ماہ نامہ، جنگِ آزادی نمبر، اگست ۱۹۵۷ء

☆۱۱۵ ''افکار'' کراچی، ماہ نامہ، احمد ندیم قاسمی نمبر، جنوری فروری ۱۹۷۵ء

☆۱۱۶ ''افکار'' کراچی، ماہ نامہ، جوبلی نمبر

☆۱۱۷ ''پاکستانی ادب'' (پانچویں جلد: تنقید)، فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج، راول پنڈی، جنوری ۱۹۸۲ء

☆۱۱۸ ''تحریر''، میر پور خاص، علمی وادبی کتابی سلسلہ: ۷، جنوری ۲۰۰۰ء

☆۱۱۹ ''چراغِ راہ''، کراچی، ماہ نامہ، نظریۂ پاکستان نمبر، ۱۹۶۰ء

☆۱۲۰ ''دائرے'' کراچی، ماہ نامہ، سال نامہ، فروری مارچ ۱۹۷۹ء، ص ۵۷

☆۱۲۱ ''ذہنِ جدید'' نئی دہلی، سہ ماہی، (فسادات کے افسانے: تجزیوں کے ساتھ)،

جلد: ۴، شمارہ: ۱۴، دسمبر ۱۹۹۳ء تا فروری ۱۹۹۴ء

☆۱۲۲ ''سیپ'' کراچی، سہ ماہی، دسمبر ۱۹۸۳ء، ص ۹۵

☆۱۲۳ ''شاعر'' بمبئی، ماہ نامہ، کرشن چندر نمبر، ۱۹۶۷ء

☆۱۲۴ ''شب خون'' الہ آباد، ماہ نامہ، جون ۲۰۰۳ء

☆۱۲۵ ''قومی زبان'' کراچی، ماہ نامہ، جولائی ۱۹۹۵ء، ص ۳۴

☆۱۲۶ ''قومی زبان'' کراچی، ماہ نامہ، جنوری ۱۹۹۸ء، ص ۴۹

☆۱۲۷ ''قومی زبان'' کراچی، ماہ نامہ، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۹۲

☆۱۲۸ ''نقوش'' لاہور، سہ ماہی، آپ بیتی نمبر، جلد دوم، جون ۱۹۶۴ء

☆۱۲۹ ''نقوش'' لاہور، سہ ماہی، منٹو نمبر

☆۱۳۰ ''نیا دور'' کراچی، سہ ماہی، فسادات نمبر، مارچ ۱۹۴۹ء

❀ ❀ ❀